مطالعہ قرآن حکیم کا

مُنتخب نِصاب

جلد اوّل

مدرس

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

مرتب

حافظ عاکف سعید حفظہ اللہ

مرکزی انجمنِ خدام القرآن لاہور

مطالعۂ قرآن حکیم کا

مُنتخب نِصاب

جلدِ اوّل

مدرس

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

مرتب

حافظ عاکف سعید حفظہ اللہ

حافظ خالد محمود خضر حفظہ اللہ

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

نام کتاب	:	مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب (جلد اول)
مدرس	:	ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ
مرتب	:	حافظ عاکف سعید حفظہ اللہ
ناشر	:	ناظم نشر واشاعت، مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور (شعبۂ مطبوعات) 36-K، ماڈل ٹاؤن، لاہور۔ فون: 042-35869501-3 فیکس: 042-35834000 ای میل: publications@tanzeem.org ویب سائٹ: www.tanzeem.org
مقام اشاعت	:	شعبۂ مطبوعات، انجمن خدام القرآن سندھ کراچی قرآن اکیڈمی یٰسین آباد، شارع قرآن اکیڈمی، بلاک 9، فیڈرل بی ایریا، کراچی۔ فون: 021-36806561 فیکس: 021-36337346 ای میل: publications@quranacademy.com ویب سائٹ: www.quranacademy.com
طبع اول	:	جنوری 2010ء بمطابق محرم الحرام 1431ھ
طبع ثانی	:	مئی 2010ء بمطابق جمادی الاول 1431ھ
تعداد	:	1100
ہدیہ	:	300 روپے

دیگر مکتبہ جات

KARACHI:
Phones : (+92-21) 3534 00 22, 3534 00 23

ISLAMABAD :
Phones : (+92-51) 443 44 38, 443 54 30

PESHAWAR :
Phones : (+92-91) 221 44 95, 226 29 02

QUETTA :
Phone : (+92-81) 284 29 69

HYDERABAD :
Phone : (+92-22) 265 29 57

GUJRANWALA :
Phones : (+92-55) 301 55 19, 389 16 95

LAHORE:
Phones : (+92-42) 3584 50 90, 3636 66 38

FAISALABAD :
Phone : (+92-41) 262 42 90

MULTAN :
Phones : (+92-61) 52 10 70, 814 92 12

JHANG :
Phone : (+92-47) 762 83 61

SUKKUR :
Phone : (+92-71) 563 10 74

HAROONABAD :
Phone : (+92-63) 225 11 04

ترتیب

عرض ناشر (طبع دوئم) 6

عرض ناشر (طبع اول) 7

عرضِ مرتب 8

حافظ عاکف سعید حفظہ اللہ

تقدیم 11

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

حصہ اول .... جامع اسباق

درس 1 18

لوازمِ نجات:

سورۃ عصر کی روشنی میں!

درس 2 43

نیکی کی حقیقت اور تقویٰ کا قرآنی معیار:

آیۃ البِر (یعنی سورۃ بقرۃ کی آیت ۱۷۷) کی روشنی میں!

درس 3 66

مقامِ عزیمت اور حکمتِ قرآنی کی اساسات:

سورۃ لقمان کے دوسرے رکوع کی روشنی میں!

درس 4 95

حظِّ عظیم:

سورۃ حٰم السجدۃ کی آیات ۳۰ تا ۳۶ کی روشنی میں!

حصہ دوم............ مباحثِ ایمان

درس 5 116

قرآن حکیم کے فلسفہ وحکمت کی اساس کامل:

سورۂ فاتحہ!

درس 6 152

ایمان کی تشکیل (Synthesis) عقل اور فطرت کا تقاضہ:

سورۂ آل عمران کی آیات ۱۹۰ تا ۱۹۵ کی روشنی میں!

درس 7 179

نور ایمان کے اجزاءِ ترکیبی :

نورِ فطرت اور نورِ وحی

سورۂ نور کے پانچویں رکوع کی روشنی میں!

درس 8 209

ایمان کے ظاہری اور باطنی ثمرات:

سورۂ تغابن کی روشنی میں!

درس 9 252

اثباتِ آخرت کے لیے قرآن کے استدلال کا حسین نمونہ:

سورۂ قیامہ!

حصہ سوم .... **مباحث عملِ صالح**

درس 10 302

تعمیر سیرت کی اساسات:

سورۂ مومنون اور سورۂ معارج کی روشنی میں!

درس 11 340

اللہ کے محبوب بندوں کی شخصیت کے خدوخال:

سورۂ فرقان کے آخری رکوع کی روشنی میں!

درس 12 375

عائلی زندگی کے اہم اصول:

سورۂ تحریم کی روشنی میں!

درس 13 408

اسلام کا معاشرتی اور سماجی نظام:

سورۂ بنی اسرائیل کی آیات ۲۳ تا ۴۰ کی روشنی میں!

درس 14 448

مسلمانوں کی سیاسی و ملّی زندگی کے رہنما اصول

اور اسی کے استحکام کے لئے اہم ہدایات:

سورۂ حجرات کی روشنی میں!

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرضِ ناشر (طبع دوئم)

انت ترید وانا اُرید   لکن اللہُ یفعل ما یُرید

ہم اور آپ مختلف خواہشات اور آرزؤں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے سرگرمِ عمل ہوتے ہیں البتہ ہوتا وہی ہے جو مشیتِ ایزدی میں مقدر ہو۔ اگست 2009ء کو بانی محترمؒ سے ایک اسکیم کے تحت تفصیلی ملاقات قرآن اکیڈمی کراچی میں منعقد ہوئی۔ اس میٹنگ کا ایجنڈا اصلاً بانی محترمؒ کے لٹریچر کی ازسرنو مجلد طباعت تھا اور ساتھ ہی غیر مطبوعہ بیانات و لیکچرز کو کتابی صورت میں شائع کرنے کا ایک طویل الذیل اور وسیع الاطراف منصوبہ زیرِ گفتگو آیا۔ حضرت ڈاکٹر صاحبؒ نے اس اسکیم سے اتفاق کا اظہار فرمایا اور ساتھ ہی یہ بھی ارشاد فرمایا کہ ''یہ کام تو ہونا ہی ہے اور اچھا ہے کہ میری زندگی میں شروع ہو جائے البتہ اس کی تکمیل میرے بعد ہی ہوسکے گی اور اللہ کے ہاں ہر کام کے لئے وقت معین ہوتا ہے۔''

13 اور 14 اپریل کی درمیانی شب یہ عظیم المرتبت خادمِ قرآن جہانِ فانی سے رحلت فرما گئے اور ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ ؎ قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

تاہم اس بات پر ہمیں اطمینان ہے کہ اس طویل المعیاد پروجیکٹ کا آغاز استادِ محترم کے سامنے ہو چکا تھا اور منتخب نصاب کی جلد اول آپ کی نگاہوں کے سامنے زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر آپؒ کے اطمینان کا باعث بنی۔

ہم اللہ کے حضور شکر وسپاس بجا لاتے ہیں کہ اس وقت آپ کے ہاتھوں میں منتخب نصاب جلد اول کا دوسرا ایڈیشن ہے جو پہلے ایڈیشن کی بے حد پذیرائی کی بنا پر پانچ ماہ کی قلیل مدت کے اندر شائع کیا جا رہا ہے۔ پہلا ایڈیشن — الحمدللہ — ہر اعتبار سے سراہا گیا اور پاکستان ہی نہیں بلکہ بیرون پاکستان بھی ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ ہمارے ایک کرم فرما جو سڈنی (آسٹریلیا) میں مقیم ہیں، نے اس کتاب کو انگریزی قالب میں ڈھال کر اس کے حلقۂ اثر کو مزید وسیع کرنے کے کام کا آغاز فرما دیا ہے اور امید ہے کہ — ان شاءاللہ — مستقبل قریب میں منتخب نصاب کے ان دروس کا انگریزی ایڈیشن بھی دستیاب ہوگا۔

مطالعہ قرآن حکیم کے منتخب نصاب کی جلد دوئم جو اس سلسلے کے بقیہ تین حصوں یعنی مباحث تواصی بالحق، مباحث تواصی بالصبر اور جامع سبق پر مشتمل ہے، ہر اعتبار سے تیار ہے اور جلد ہی قارئین کے لئے دستیاب ہوگی۔ چنانچہ اس طرح اس منتخب نصاب کی دو جلدوں میں تکمیل ہو جائے گی۔ ان شاءاللہ۔

دعا فرمائیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اس منصوبے میں برکت عطاء فرمائے اور اسے حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے لئے صدقۂ جاریہ بنائے۔

ناظم، شعبۂ مطبوعات
قرآن اکیڈمی یاسین آباد کراچی

8/مئی 2010ء بمطابق ۲۳ جمادی الاول ۱۴۳۱ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرضِ ناشر

(طبع اول)

''مطالعۂ قرآن حکیم کا منتخب نصاب'' کی پہلی جلد آپ کے ہاتھوں میں ہے جو معروف اسکالر اور مفکر و مدرسِ قرآن محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کے ان دروس پر مشتمل ہے جس کا آغاز 1952-53 ہی سے ہو گیا تھا اور جس کی اشاعت بھی کتابچوں کی شکل میں ہوتی رہی لیکن ایک عرصے سے اس بات کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی کہ اس منتخب نصاب کو یک جا مجلد شائع کر دیا جائے تا کہ اندرون ملک اور بیرون ملک بندگان خدا اس سے کماحقہٗ استفادہ کر سکیں ان دروس کی اثر پذیری کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے آڈیو کیسٹ DVD's اور CD's ہزاروں کی تعداد میں ریلیز ہوئیں اور کتابچوں کی صورت میں اس کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے محترم ڈاکٹر صاحب کی اس کاوش کو بے حد شرف قبولیت سے نوازا ہے اس پر ہم رب کریم کے شکر گزار ہیں اور دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ اسے مزید قبولیت عطا فرمائے۔

انجمن خدام القرآن کو اس سلسلہ کی پہلی جلد شائع کرنے کی سعادت حاصل ہو رہی ہے۔ یہ منتخب نصاب ان شاء اللہ چار جلدوں میں مکمل ہوگا۔ اس کی اشاعت کو جس حد تک کمپوزنگ کی اغلاط سے پاک ، دیدہ زیب اور اچھی اور مضبوط جلد کے ساتھ تیار کیا جا سکتا تھا وہ آپ کی خدمت میں پیش کر دی گئی ہے البتہ قارئین سے گزارش ہے کہ اس سلسلہ میں ہمیں اپنے مفید مشوروں سے ضرور آگاہ فرمائیں۔

اللہ سے دعا ہے کہ وہ ادارہ کی اس سعی کو قبول فرمائے اور جن رفقاء نے انتہائی محنت اور اخلاص کے ساتھ کوشش کی ہے اللہ تعالیٰ ان کے لئے اس سعی کو توشۂ آخرت اور صدقہ جاریہ بنا دے۔ آمین

ناظم مکتبہ

یکم محرم الحرام ۱۴۳۱ھ — انجمن خدام القرآن

عرضِ مرتب

قرآنِ حکیم' ربِّ کائنات کا نہایت بابرکت اور پُرعظمت کلام ہے جو نبی آخرالزماں محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعے نوعِ انسانی کو عطا ہوا۔ یہ دراصل نوعِ انسانی کے نام اللہ جل شانہٗ کے آخری اور کامل ترین پیغامِ ہدایت کا درجہ رکھتا ہے۔ بقول علامہ اقبال ؎

نوعِ انساں را پیامِ آخریں　　　حاملِ اُو رحمۃٌ للعالمیں

یوں تو قرآنِ حکیم پوری نوعِ انسانی کے لیے ہدایت کا خورشید تاباں بن کر نازل ہوا' اور اسی لیے اس کے بالکل آغاز ہی میں' یعنی سورۃ البقرۃ کے تیسرے ہی رکوع میں نوعِ انسانی سے براہِ راست خطاب'' یَا اَیُّھَا النَّاس '' کے الفاظ سے ہوا' تاہم اس میں انسانوں کے مختلف طبقات سے علیحدہ علیحدہ بھی خطاب کیا گیا ہے۔ مکی سورتوں میں خطاب کا اصل رُخ مشرکینِ عرب اور سردارانِ قریش کی جانب ہے کہ قرآنِ حکیم کے اوّلین مخاطب وہی تھے۔ مشرکینِ عرب جو کہ قبل ازیں آسمانی ہدایت سے محروم تھے' اور اسی بناء پر آخرت اور رسالت کے تصورات کے منکر تھے' لہٰذا اُن سے قرآن کا خطاب کرنا گویا نوعِ انسانی کے اُن تمام طبقات سے خطاب کے مترادف ہے جو آسمانی ہدایت سے بے بہرہ ہونے کے باعث توحید، آخرت اور رسالت کے صریحاً منکر ہیں اور ''ضَلَّ ضَلٰلاً بَعِیْدًا'' کے مصداق ہیں۔ نوعِ انسانی کا ایک قابلِ ذکر حصہ وہ بھی ہے جو سابقہ آسمانی کتابوں کا ماننے والا ہے یعنی یہود و نصاریٰ۔ اُن سے خطاب کا بھی خصوصی اہتمام قرآنِ حکیم میں جابجا نظر آتا ہے۔ ''یٰاَھْلَ الْکِتَاب'' کا پیرایۂ خطاب قرآن نے انہی کے لیے اختیار کیا ہے، اور نوعِ انسانی کا وہ طبقہ جو قرآنِ حکیم کو اللہ کی طرف سے کتابِ ہدایت اور نبی آخرالزماں ﷺ کو اللہ کا آخری نبی تسلیم کرتا

ہے' یعنی اُمت مسلمہ' اُن سے بھی خصوصی خطاب بکثرت و باہتمام ملتا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ ''یٰٓـاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا '' کے مخاطبین اُمت مسلمہ کے افراد ہیں' اور مدنی سورتوں میں خطاب کا اصل رخ مسلمانوں ہی کی جانب ہے۔ وہ تمام آیات جن میں خطاب براہِ راست مسلمانوں سے ہے' مسلمانوں کی دینی ذمہ داریوں' اخلاق و معاملات سمیت صراطِ مستقیم کے تمام عملی پہلوؤں کی تفصیلی وضاحت اور نبی اکرم ﷺ کے مشن یعنی ''شہادت علی الناس'' اور ''غلبۂ دینِ حق'' کے حوالے سے مسلمانوں کے فرائضِ منصبی اور اُس سے متعلق عملی معاملات کی وضاحت ورہنمائی پر مشتمل ہیں۔ انہی اُمور کی مزید تفصیل و وضاحت ہمیں نبی اکرم ﷺ کے اقوال و اعمال میں ملتی ہے جو ہمارے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ آج مسلمانوں کا المیہ یہ ہے کہ اُن کی عظیم اکثریت قرآن کو محض ایک مقدس کتاب کی حیثیت سے جانتی ہے' جس کو کسی معطر ریشمی جُزدان میں لپیٹ کر کسی طاق میں سجا دینے کو ہی منتہائے مقصود کا درجہ دے دیا گیا ہے۔ قرآن کی تعلیمات' نوعِ انسانی کے نام اس کے ابدی پیغام اور خود مسلمانوں کے لیے وہ تفصیلی پیغامِ ہدایت جو قرآن میں مذکور ہے' اُس سے آج کا انسان قطعی نابلد اور بے بہرہ ہے' اور ستم بالائے ستم یہ کہ اسے اس کی اہمیت کا سرے سے کوئی احساس نہیں۔

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا　　کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

قرآن سے دوری ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ آج پوری امت زوال و انحطاط سے دوچار ہے اور ذلت و رسوائی ملتِ اسلامیہ کا مقدر بنی ہوئی ہے

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر　　اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

والدِ محترم نے' جو بفضل اللہ تعالیٰ دورِ حاضر کے معروف داعی الی القرآن کے طور پر جانے جاتے ہیں' اسی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے 1966ء میں شہر لاہور میں درسِ قرآن کے حلقوں کا آغاز کیا تھا اور مسلمانوں کو اُن کی دینی ذمہ داریاں یاد دلانے اور دین کے ہمہ گیر اور جامع تصور کو دوبارہ اُجاگر

کرنے کی خاطر قرآنِ حکیم کے چند منتخب مقامات پر مشتمل ایک نصاب ترتیب دیا تھا۔ یہ قرآنی نصاب جس کا نقطۂ آغاز سورۃ العصر ہے، بحمد اللہ نہایت مؤثر اور مفید مطلب ثابت ہوا۔ اِس منتخب نصاب میں قرآنِ حکیم کے اُن مقامات کو باہتمام شامل کیا گیا ہے جن میں خطاب براہِ راست مسلمانوں سے ہے اور یوں مسلمانوں کی فکری و عملی رہنمائی پر مشتمل یہ جامع نصابِ قرآنی دروسِ قرآنی کی شکل میں بحمد اللہ بہت وسیع حلقے تک پھیلا۔ بعدازاں رفقاء و احباب کی طرف سے یہ مطالبہ زور پکڑنے لگا کہ اسے کتابی شکل میں بھی شائع کیا جائے۔ عرصہ ہوا، اس منتخب نصابِ قرآنی کے دروس کی اسٹوڈیو ریکارڈنگ کراچی کے ایک صاحبِ ذوق شخصیت لطف اللہ خان صاحب نے بڑے اہتمام سے کی تھی، جو چوالیس کیسٹوں میں مکمل ہوئی۔ چنانچہ راقم السطور نے اللہ کی نصرت و تائید کے بھروسے پر کیسٹ سے اُن دروسِ قرآنی کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کر کے اور ضروری Editing کے بعد ماہنامہ میثاق میں اُن کی سلسلہ وار اشاعت کے کام کا آغاز کیا۔ علومِ قرآنی کے طالبان کی سہولت کے لیے ہر کیسٹ پر مشتمل ایک الگ کتابچہ شائع کرنے کا بھی اہتمام کیا گیا اور اب ایک اور دیرینہ مطالبے کو پورا کرنے کی خاطر ان کو جمع کر کے کتابی صورت میں شائع کرنے کا اہتمام کیا جا رہا ہے جس کے لیے میں اپنے بزرگ ساتھی محترم عبدالرزاق کوڈ واوی صاحب اور اُن کے نوجوان معاون عزیزم اویس پاشا کا ممنونِ احسان ہوں جن کی شبانہ روز محنت کے نتیجے میں یہ مقدس اور بابرکت کام پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ **جزاھم اللہ احسن الجزاء**

خاکسار **عاکف سعید** عفی عنہ

قرآن اکیڈمی ڈیفنس کراچی

۲۶ر دسمبر ۲۰۰۹ء

تقدیم

اصلاً قرآن حکیم کے ایک ادنیٰ طالب علم اور حقیر سے خادم —— لیکن عرفِ عام میں ایک مدرس و مبلغ قرآن کی حیثیت سے راقم کا تعارف اس وقت بہت بڑے پیمانے پر ہو چکا ہے —— اور اس بات میں ہرگز کوئی مبالغہ نہیں ہے کہ آج دنیا میں جہاں کہیں بھی اردو زبان بولی یا کم از کم سمجھی جاتی ہے وہاں کے مسلمانوں بالخصوص جدید تعلیم یافتہ لوگوں میں سے جو لوگ اپر مڈل کلاس اور لوئر ایلیٹ کلاس سے تعلق رکھتے ہیں اور جن میں دین و مذہب سے بھی عملی نہ سہی کچھ ذہنی و جذباتی لگاؤ موجود ہے' ان کے گھروں میں مولانا مودودی مرحوم کی تفہیم القرآن کا حسین اور دیدہ زیب set بھی لازماً بک شیلف کی زینت بنا ہوتا ہے—— اور میرے قرآن حکیم کے دروس اور دیگر دینی و مذہبی اور سیاسی و ملی موضوعات پر خطابات کے آڈیو اور ویڈیو کیسٹوں' اور اب سی ڈیز (C.D.s) اور ڈی وی ڈیز (D.V.D.s) کا بھی معتدبہ اسٹاک موجود ہوتا ہے۔

یہ قرآنی دعوت جواب تحریک رجوع الی القرآن یا تحریک تعلم و تعلیم قرآن کی صورت اختیار کر چکی ہے اس کی بنیاد کا پتھر مطالعۂ قرآن حکیم کا ایک منتخب نصاب تھا جس کے بعض اسباق کے دروس تو میں زمانہ طالب علمی (۵۳۔۱۹۵۲ء) ہی سے دیتا چلا آ رہا تھا جو بالعموم پسند کیے جاتے تھے —— لیکن ۱۹۶۵ء میں جب میں اس تحریک کے آغاز کے ارادے سے لاہور واپس آیا (واضح رہے کہ ۱۹۵۴ء میں کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور سے ایم بی بی ایس سے فراغت کے بعد میں والدین کے پاس منٹگمری' حال ساہیوال منتقل ہو گیا تھا) تو اس تحریک کی آبیاری سات سال تک تو میں نے تن تنہا کی (یعنی نہ پشت پر کوئی ادارہ تھا نہ تنظیم یا جماعت) لیکن پھر اس کے بطن سے اوّلاً ۱۹۷۲ء میں مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کی ولادت ہوئی اور پھر ۱۹۷۵ء میں تنظیم اسلامی منصۂ شہود پر آئی۔ اس وقت سے میں نے نہ صرف یہ کہ بفضلہٖ تعالیٰ ایک جانب اِس منتخب نصاب کی 'چکی پیسنی' شروع کی (چنانچہ لاہور کے ایک معروف صحافی نے جب مجھ پر ایک نجی گفتگو میں قرآن کا قوّال

ہونے کی پھبتی چست کی تو میں نے اس پر ہرگز کوئی برا نہیں منایا بلکہ اسے ایک امر واقعہ کی حیثیت سے تسلیم کیا) اور دوسری جانب اس نصاب میں وقتاً فوقتاً اضافے کیے —— یہاں آگے بڑھنے سے پہلے مناسب ہے کہ اس نصاب کے تاریخی پس منظر اور مقاصد و مراحلِ تدوین جاننے کے لیے میری وہ تحریر پڑھ لی جائے جو میں نے اب سے تقریباً تیس سال قبل اس وقت سپردِ قلم کی تھی جب اس منتخب نصاب میں جو قرآنی آیات اور سورتیں شامل ہیں ان کے صرف باترجمہ متن کو ایک علیحدہ کتابی شکل میں شائع کیا گیا تھا تاکہ محفلِ درس میں شریک حضرات کے سامنے ان دروس کا متن بھی موجود رہے —— وھو ھذا:

''آغاز ہی میں یہ بات عرض کر دینی مناسب ہے کہ یہ نصاب راقم کا 'طبع زاد' نہیں ہے بلکہ اس کا اصل ڈھانچہ مولانا امین احسن اصلاحی کا تیار کردہ ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ۵۲۔۱۹۵۱ء میں جب راقم الحروف اسلامی جمعیت طلبہ لاہور و پنجاب کا ناظم تھا اس نے جمعیت کے زیر اہتمام طلبہ کے لیے دو تربیتی کیمپ منعقد کیے تھے ایک دسمبر ۱۹۵۱ء میں کرسمس کی تعطیلات میں اور دوسرا ۱۹۵۲ء کی تعطیلاتِ موسم گرما میں۔ ان تربیت گاہوں میں قرآن حکیم کا درس مولانا اصلاحی نے دیا تھا اور اس غرض سے انہوں نے ایک نصاب تجویز کیا تھا جو درج ذیل ہے:

(۱) انسان کی انفرادی زندگی کی رہنمائی کے لیے سورۂ لقمان کا دوسرا اور سورۃ الفرقان کا آخری رکوع۔

(۲) عائلی زندگی سے متعلق —— سورۃ التحریم مکمل۔

(۳) قومی، ملی اور سیاسی زندگی کی رہنمائی کے ذیل میں سورۃ الحجرات مکمل۔

(۴) فریضہ اقامت دین کے ذیل میں سورۃ الصّف مکمل۔

(۵) اور تحریک اسلامی سے متعلق مختلف مسائل میں رہنمائی کے ذیل میں سورۃ العنکبوت مکمل۔

راقم کی خوش قسمتی تھی کہ اسے بطور ناظم ان دونوں تربیت گاہوں میں شرکت کا موقع ملا اور یہ مقامات اس نے دوبار مولانا اصلاحی سے براہِ راست پڑھے اور راقم نے ان مقامات کو اس طرح اخذ کرلیا کہ ''بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ آیَۃً'' (پہنچاؤ میری جانب سے چاہے ایک ہی آیت) کے مصداق انہیں آگے پڑھانے کے لیے بھی کسی قدر اعتماد پیدا ہوگیا۔ چنانچہ زمانہ طالب علمی میں جمعیت کے اجتماعات میں بھی راقم مطالعہ قرآن کی ذمہ داری نبھاتا رہا۔ تعطیلات کے زمانے میں ساہیوال میں جماعت اسلامی کے اجتماعات میں بھی ان مقامات کا درس دیتا رہا اور

رمضان المبارک کے ایک تربیتی پروگرام میں مکمل نصاب بھی پڑھایا۔۱۹۵۴ء میں ملتان میں منعقدہ جمیعت کی ایک تربیت گاہ میں راقم نے پھر یہ نصاب اسی تدریج کے ساتھ پڑھایا۔ بعد میں جب ساہیوال میں 'اسلامی ہاسٹل' قائم کیا تو اس میں مقیم طلبہ کو بھی اس پورے نصاب کا درس دیا۔اس کے بعد جب راقم کراچی میں تھا تو وہاں بھی مقبولِ عام ہاؤسنگ سوسائٹی میں ایک حلقہ قائم کر کے اسی منتخب نصاب کا درس دیا۔ بعدۂ لاہور میں ''حلقہ ہائے مطالعہ قرآن'' کے اُس سلسلے کی اساس بھی اسی کو بنایا جس نے اللہ کے فضل وکرم سے ایک باقاعدہ تحریک کی صورت اختیار کرلی!

البتہ اس عرصے کے دوران وقتاً فوقتاً راقم اس بنیادی نصاب میں اضافے کرتا رہا۔جن سے اس نصاب کی ایک واضح بنیاد بھی قائم ہوگئی اور مختلف مقامات کے مضامین میں جو فاصلے تھے وہ بھی بہت حد تک پاٹ دیے گئے۔ ہوسکتا ہے کہ آئندہ بھی خود راقم یا کوئی اور شخص اس میں مزید اضافہ کرسکے۔ تاہم اس وقت راقم کا گمان ہے کہ ایک خاص نقطہ نظر سے قرآن حکیم کا جو انتخاب اس نصاب میں کیا گیا ہے وہ بہت حد تک مکمل بھی ہے اور نہایت مفید بھی۔

آگے چلنے سے پہلے اس ''خاص نقطہ نظر'' کی وضاحت بھی ہوجائے تو اچھا ہے۔ وہ نقطہ نظر یہ ہے کہ ایک مسلمان کے سامنے یہ بات بالکل واضح ہوجائے کہ اُس کے دین کے تقاضے اُس سے کیا ہیں اور اُس کا ربّ اس سے کیا چاہتا ہے؟ گویا دین کے تقاضوں اور مطالبوں کا ایک اجمالی لیکن جامع تصور پیش کرنا اس انتخاب کا اصل مقصود ہے' ویسے ضمناً اس سے خود دین کا ایک جامع تصور بھی آپ سے آپ واضح ہوجاتا ہے اور محدود مذہبی تصورات کی جڑیں خود بخود کٹتی چلی جاتی ہیں۔

ایک عرصے سے اس بات کی ضرورت محسوس ہورہی تھی کہ اس منتخب نصاب کو یکجا شائع کر دیا جائے۔لیکن بوجوہ یہ ارادہ پورا نہ ہوسکا۔اللہ تعالیٰ کی مشیت میں ہر کام کے لیے وقت معین ہے۔اللہ کا شکر ہے کہ اب اس کی صورت پیدا ہورہی ہے۔اللہ تعالیٰ ہی سے دعا ہے کہ وہ اسے لوگوں کے لیے مفید بنائے اور اسی سے اجروثواب کی اُمید ہے۔

خاکسار اسرار احمد عفی عنہٗ

اب صحیح تعداد تو یاد نہیں ہے لیکن ۱۹۶۵ء سے شروع ہونے والے تحریکی سفر کے دوران میں راقم نے اس منتخب نصاب کا کم از کم پچیس بار درس دیا ہے چنانچہ جیسے کہ اوپر عرض کیا گیا۔ لاہور کی مختلف آبادیوں میں حلقہ ہائے مطالعہ قرآن کی ہفتہ وار مجالس میں اس کا درس دیا گیا۔ پھر جامع مسجد

خضراء' سمن آباد میں مرکزی حلقہ درس قائم ہوا تو اس میں اتوار کی صبح کے ہفتہ وار دروس میں اس کی دوبارہ تکمیل کی گئی ـــــ اور پھر جب یہ مرکزی درس لاہور کے مرکز یعنی مسجد شہداء' مال روڈ' پر منتقل ہوا تو وہاں بھی اس کا دوبارہ درس دیا گیا' ایک بار اتوار کی صبح کی ہفتہ وار نشست میں اور پھر ایک بار مسلسل چالیس روز تک روزانہ مغرب اور عشاء کے مابین درس میں' پھر جب میری ۱۹۷۷ء میں خطابتِ جمعہ کی ذمہ داری مسجد دارالسلام' باغ جناح لاہور' میں منتقل ہوئی تو وہاں بھی آغاز اسی نصاب کے بیان سے ہوا۔ پھر بیرون لاہور جب بھی خطاب کی دعوت موصول ہوئی اسی نصاب کے مختلف اسباق بیان ہوتے رہے۔ ۱۹۷۱ء میں کراچی میں ماہانہ درس قرآن میں بھی اس کی تکمیل کی گئی اور اس کے ساتھ ساتھ کراچی کے ہر سفر کے دوران وہاں کی مساجد میں دروس اور خطاباتِ جمعہ میں بھی اسی کے اسباق بیان ہوتے رہے ـــــ اس کے علاوہ اس نصاب کے درس کے لیے کریش پروگرام کی حیثیت سے لاہور' کوئٹہ اور راولپنڈی میں ایک ایک ماہ کی ''قرآنی تربیت گاہوں'' میں یہ نصاب بیان ہوا ـــــ اور دو مرتبہ تو آٹھ آٹھ دنوں کی تربیت گاہوں میں کل نصاب مکمل کیا گیا جس کے لیے پہلے اور آخری اتوار کو کچھ وقفوں کے ساتھ آٹھ آٹھ گھنٹے کے دروس ہوئے اور دوران ہفتہ چار چار گھنٹے درس ہوا۔ اس نوعیت کا ایک کریش پروگرام لاہور میں مسجد خضراء سمن آباد میں ہوا۔ اور دوسرا جمعیت الفلاح ہال کراچی میں!

بیرونِ پاکستان اس نصاب کا بوٹا اوّل اوّل ۸۰۔۱۹۷۹ء میں ٹورنٹو (کینیڈا) میں لگا جب ان دو سالوں میں روزانہ شام کے درس کے مسلسل چودہ چودہ دن پروگرام ہوئے۔ جن میں اس نصاب کی تکمیل کی گئی ـــــ اور پہلی بار وہیں ان دروس کے آڈیو کیسٹ اعلیٰ معیار پر تیار کیے گئے جو پھر وہاں سے دنیا کے مختلف ممالک سے آئے ہوئے Immigrants کے ذریعے دور دراز کے ممالک تک پہنچے۔ (یہ کام لکھنؤ (بھارت) سے تعلق رکھنے والے انجینئر جناب سمیع اللہ خان صاحب نے کیا تھا اللہ انہیں اس کا اجر جزیل عطا فرمائے۔ آمین)

اس کے ساتھ ساتھ لاہور میں اولاً مسجد خضراء اور پھر مسجد شہداء میں پورے قرآن حکیم کا سلسلہ وار درس بھی دو بار مکمل ہوا ـــــ جس کے کچھ حصوں کی آڈیو اور آخری حصے کی ویڈیو ریکارڈنگ بھی محفوظ ہے ـــــ ان سب پر مستزاد بفضلہٖ تعالیٰ ۱۹۸۴ء سے ہم نے رمضان المبارک میں نماز تراویح کے ساتھ دورۂ ترجمہ قرآن کا آغاز کیا۔ جس میں ہر چار رکعتوں سے پہلے اُن میں پڑھے جانے والی آیاتِ قرآنی کا ترجمہ اور مختصر تشریح بیان کی جاتی ہے۔ ان میں سے گزشتہ پچیس سالوں میں سے کم از کم پندرہ بار تو یہ خدمت خود راقم نے سرانجام دی جن میں تین بار کراچی' ایک بار ملتان اور ایک بار

ابوظہبی کے پروگرام شامل ہیں —— اور اب یہ بات عام طور پر معلوم ہے کہ یہ پروگرام لاہور اور کراچی میں تو کئی کئی مساجد میں باقاعدہ ہو رہا ہے۔ اس کے علاوہ ملتان، جھنگ، فیصل آباد، اسلام آباد، پشاور اور جوہانسبرگ (ساؤتھ افریقہ) میں بھی جاری ہے —— گویا اب بحمد للہ دعوت رجوع الی القرآن کی یہ تحریک ملک گیر تو ہے ہی، اس کا چرچا بیرون ملک بھی موجود ہے۔

اور اس ''شجرۂ طیبہ'' کی ''اصلِ ثابت'' مطالعہ قرآن حکیم کا وہ منتخب نصاب ہی ہے۔ الحمد للہ کہ ایک آڈیو ریکارڈنگ مدراس (اب چنائی، بھارت) سے تعلق رکھنے والے ایک نہایت لطیف اور شائستہ مزاج کے حامل انسان لطف اللہ خان صاحب نے پورے اہتمام کے ساتھ اپنے گھر میں ایک ساؤنڈ پروف کمرے میں کی تھی، جو ایک ایک گھنٹے کے چوالیس آڈیو کیسٹس پر مشتمل ہے، اور اہتمام یہ کیا کہ کیسٹ کی ایک سائڈ جو نصف گھنٹہ پر مشتمل ہوتی ہے، اس میں درس کا ایک حصہ 'خود مکتفی' انداز میں آ جائے—— (برسبیل تذکرہ عرض ہے کہ جناب لطف اللہ خان صاحب اگرچہ حصولِ معاش کے ضمن میں تو ایک ٹریولنگ ایجنسی چلاتے تھے۔ لیکن ان کی زبردست hobby یہ تھی کہ اردو کے تمام مشاہیر شعراء اور خطباء کو اصرار کر کے اپنے گھر بلا کر ان کا کلام ان کی اپنی آواز میں ریکارڈ کرتے تھے —— چنانچہ ان کے پاس اس وقت دنیا کی سب سے بڑی vioce library موجود ہے!)—— اس ریکارڈنگ کی ایک خاص بات یہ ہے کہ چونکہ وہاں 'سامعین' کوئی نہیں ہوتے تھے، لہٰذا ان میں عوامی خطابت کا انداز بالکل نہیں ہے بلکہ سادہ ترین انداز میں اور اختصار کے ساتھ مطالب کا بیان ہے! ان کیسٹوں کو کافی عرصہ قبل ٹیپ سے اتار کر اور قدرے ایڈیٹنگ کے ساتھ چھوٹے چھوٹے کتابچوں کی شکل میں شائع کر دیا گیا تھا—— اور اب ہمارے ایک بزرگ رفیق اور کارکن نے ان کتابچوں کو تین جلدوں کی صورت میں شائع کرنے کا بیڑا اُٹھا لیا ہے —— جس کی پہلی جلد جو منتخب نصاب کے کل چھ حصوں میں سے پہلے تین حصوں پر مشتمل ہے آپ کے ہاتھ میں ہے۔

آخر میں اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ وہ میری خدمت قرآنی کو جو میری نسبت سے حقیر، لیکن قرآن کی نسبت سے بہت عظیم ہے، شرفِ قبول عطا فرمائے!—— اور خاص طور پر مطالعہ قرآن حکیم کے اس منتخب نصاب کو بڑے پیمانے پر دین کی اصل دعوت کی اشاعت کا ذریعہ بنا دے! آمین ثم آمین—— برسبیل تذکرہ یہ بھی عرض ہے کہ اب میرا پورا دورۂ ترجمہ قرآن جو ۱۹۹۸ء کے رمضان المبارک میں کراچی میں اعلیٰ معیار پر ریکارڈ کیا گیا تھا، اور جس کے آڈیو اور ویڈیو کیسٹ بڑے پیمانے پر پھیلے ہیں اس کی بھی اشاعت کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ چنانچہ پہلی جلد شائع ہو چکی ہے جو تعارف قرآن اور

عظمت قرآن پر مفصل گفتگو کے علاوہ سورۂ فاتحہ اور سورۂ بقرہ کے ''بیان'' پر مشتمل ہے —— !

اس کے بعد ایک ہی کام باقی رہ جائے گا اور وہ یہ کہ مطالعہ قرآن حکیم کے منتخب نصاب کا آخری درس جو میں نے قرآن آڈیٹوریم لاہور میں ہفتہ وار مجالس میں مکمل کیا تھا اور جس میں زیادہ مفصل تفسیری انداز ہے چنانچہ وہ ڈیڑھ ڈیڑھ گھنٹوں کے 105 کیسٹوں پر مشتمل ہے۔ البتہ اسے ٹیپ سے اتار کر طباعت و اشاعت کے کام کا ابھی آغاز بھی نہیں ہو سکا ہے اور غالباً یہ کام میری وفات کے بعد ہی ہو سکے گا —— تاہم ہر کام کے لیے اللہ تعالیٰ کے یہاں ایک وقت مقرر ہے لہٰذا مجھے کوئی تشویش نہیں ہے۔ فقط!

خاکسار اسرار احمد عفی عنہٗ

۲۱/ اکتوبر ۲۰۰۹ء

لاہور

حِصّہ اوّل

جَامِع اسباق

درس 1 تا درس 4

درس 1

لوازمِ نجات

سُورَۃُ العَصر کی روشنی میں

درس ۱

لوازمِ نجات

سورۃ العصر کی روشنی میں

نحمدہٗ ونصلی علٰی رَسولہِ الکریم ...... امَّا بَعد:

فَاَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ ۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿وَالۡعَصۡرِ ﴿۱﴾ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَفِیۡ خُسۡرٍ ﴿۲﴾ اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوۡا بِالۡحَقِّ وَتَوَاصَوۡا بِالصَّبۡرِ ﴿۳﴾﴾ ...... صدق اللّٰہ العظیم

مطالعۂ قرآنِ حکیم کے جس منتخب نصاب کا سلسلہ وار بیان ان نشستوں میں ہوگا اس کا نقطۂ آغاز سورۃ العصر ہے‘ بلکہ اس نصاب کا پورا تانا بانا بھی اسی سورۂ مبارکہ کے گرد گھومتا ہے۔ اس لیے کہ اس سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے نہایت اختصار لیکن انتہائی جامعیت کے ساتھ انسان کی نجات کے لوازم اور اس کی فلاح اور کامیابی کی شرائط کو بیان کر دیا ہے۔ یعنی ایمان‘ عمل صالح‘ تواصی بالحق اور تواصی بالصبر۔

ان چاروں لوازمِ نجات یا شرائطِ نجات کی تشریح و توضیح ہمیں قرآن حکیم کے دوسرے مقامات سے ملتی ہے — جن میں سے چیدہ چیدہ مقامات کو اس نصاب میں شامل کیا گیا ہے۔ چنانچہ یہ منتخب نصاب چھ حصّوں پر مشتمل ہے:

۱) پہلے حصّہ میں سورۃ العصر کے علاوہ چند اور مقامات ایسے شامل ہیں جن میں ان تمام لوازمِ نجات کا بیان جامعیت کے ساتھ آیا ہے۔

۲) دوسرے حصّہ میں ایمان کے مباحث کسی قدر تفصیل کے ساتھ آئے ہیں۔

۳) تیسرا حصّہ اعمالِ صالحہ کی تفاصیل پر مشتمل ہے۔ انفرادی سیرت و کردار‘ گھریلو اور عائلی زندگی‘ سماجی و معاشرتی زندگی سے متعلق ہدایات اور سب سے آخر میں مسلمانوں کی ملّی اور سیاسی زندگی سے متعلق ہدایت اور رہنمائی‘ اس تیسرے حصّہ کے مضامین ہیں۔

۴) چوتھا حصّہ تواصی بالحق کے اعلیٰ مراتب پر مشتمل ہے‘ یعنی شہادت علی الناس‘ غلبۂ دینِ حق اور اس کے لیے جِدّ وجُہد‘ جس کے لیے قرآن مجید کی جامع اصطلاح ''جہاد فی سبیل اللہ'' ہے‘ اس حصّہ

کے اہم مضامین ہیں۔
۵) پانچواں حصّہ قرآن حکیم کے اُن مقامات پر مشتمل ہے جو صبر و مصابرت کی تلقین سے متعلق ہیں۔
۶) چھٹا اور آخری حصّہ قرآن مجید کی ایک نہایت جامع سورۃ یعنی سورۃ الحدید پر مشتمل ہے کہ جس میں پھر اُن سب تعلیمات کو یکجا جامعیت کے ساتھ پیش کر دیا گیا ہے۔

چار تمہیدی باتیں

اس مختصر تمہید کے بعد اَب ہم اللہ کا نام لے کر سورۃ العصر پر غور و فکر کا آغاز کرتے ہیں۔ اس سورۂ مبارکہ کے بارے میں چار باتیں تمہیداً نوٹ کر لینی چاہئیں:

پہلی یہ کہ یہ سورۂ مبارکہ قرآن حکیم کی مختصر ترین سورتوں میں سے ہے۔ اس لیے کہ یہ کُل تین آیات پر مشتمل ہے' اور قرآن مجید میں کوئی سورۃ تین سے کم آیات پر مشتمل نہیں ہے' بلکہ عجیب حسنِ اتفاق ہے کہ کُل تین ہی سورتیں قرآن مجید میں ایسی ہیں جو تین تین آیات پر مشتمل ہیں۔ انہی میں سے ایک سورۃ العصر ہے' اور اتنی مختصر ہے کہ اس کی پہلی آیت صرف ایک لفظ پر مشتمل ہے' یعنی ﴿وَالْعَصْرِ ۝۱﴾

دوسرے یہ کہ ترتیبِ نزولی کے اعتبار سے یہ قرآن مجید کی اوّلین سورتوں میں سے ایک ہے۔ قرآن نے اپنے بارے میں سورۂ ھود کے آغاز میں یہ الفاظ ارشاد فرمائے کہ یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کی آیات پہلے محکم کی گئیں اور اس کے بعد اُن کی تفصیل بیان کی گئی۔ فرمایا گیا: ﴿كِتٰبٌ اُحۡكِمَتۡ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتۡ مِنۡ لَّدُنۡ حَكِيۡمٍ خَبِيۡرٍۙ ۝۱﴾۔ گویا ابتداءً قرآنِ مجید میں وہ سورتیں اور آیتیں نازل ہوئی ہیں جو انتہائی جامع ہیں اور اس کے بعد انہی کی تفصیل لمبی سورتوں میں وارد ہوئی ہے۔ اس اعتبار سے گویا سورۃ العصر کا شمار بھی ان انتہائی جامع سورتوں میں ہوتا ہے جو ابتدا میں نازل کی گئیں۔

تیسری بات یہ کہ اگر چہ ویسے تو پورا قرآن مجید عربی ادب کی معراج اور فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے معجزہ ہے' لیکن طالبانِ قرآن جانتے ہیں کہ قرآن مجید کے مختلف مقامات ادبیت اور فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے مختلف اور منفرد کیفیات کے حامل ہیں۔ گویا معاملہ وہی ہے کہ ع ''ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است''۔

اس پہلو سے غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ سورۃ العصر کی انفرادی شان یہ ہے کہ یہ سورۃ قرآن

حکیم میں سہل ممتنع کی ایک نہایت اعلیٰ مثال ہے۔ انتہائی دقیق اور اعلیٰ علمی مضامین نہایت سادہ الفاظ میں بیان ہوئے ہیں۔ کوئی بھاری بھرکم لفظ یا کوئی ثقیل اصطلاح اس سورۂ مبارکہ میں وارد نہیں ہوئی۔ تاہم اس کی سلاست کے پردوں میں علوم و معارف کے دریا موجزن نظر آتے ہیں۔ اس حقیقت پر غور و فکر کے نتیجے میں واقعہ یہ ہے کہ قرآن مجید کے اعجاز اور اُس کی عظمت کے سامنے انسان کا سر بے اختیار جھک جاتا ہے۔

جامع ترین سورۃ

تمہیدی امور میں سے چوتھی' آخری اور اہم ترین بات یہ ہے کہ یہ سورۂ مبارکہ قرآن مجید کی جامع ترین سورۃ ہے۔ اس لیے کہ قرآن مجید کا مقصدِ نزول ہدایت و رہنمائی ہے۔ اس دنیا میں زندگی بسر کرنے کا صحیح طریقہ بتانا اور صراطِ مستقیم اور سواء السبیل کی طرف رہنمائی کرنا قرآن مجید کا مقصدِ نزول ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اس اعتبار سے سورۃ العصر قرآن مجید کی جامع ترین سورۃ ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یہ ایک ایسے بیج کی مانند ہے کہ جس میں قرآن مجید کا پورا شجرۂ طیبہ موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں حضرت ابومزینہ دارمی رضی اللہ عنہ کی یہ روایت طبرانی کی ''معجم الاوسط'' میں اور امام بیہقی کی ''شعب الایمان'' میں منقول ہے کہ:

كَانَ الرَّجُلَانِ مِنْ اَصْحَابِ النَّبِيِّ ﷺ اِذَا الْتَقَيَا لَمْ يَتَفَرَّقَا حَتّٰى يَقْرَاَ اَحَدُهُمَا عَلَى الْآخَرِ سُوْرَةَ الْعَصْرِ ثُمَّ يُسَلِّمُ اَحَدُهُمَا عَلَى الْآخَرِ

''نبی اکرم ﷺ کے اصحاب رضی اللہ عنہم میں سے کوئی سے دو صحابہ جب بھی باہم ملاقات کرتے تھے تو وہ ایک دوسرے سے جدا نہ ہوتے تھے جب تک کہ ایک دوسرے کو سورۃ العصر سنا نہ لیں' اس کے بعد وہ ایک دوسرے کو سلام کرتے اور ایک دوسرے سے رخصت ہو جاتے۔''

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ صحابہ کرامؓ کو اس سورۂ مبارکہ کے ساتھ کس قدر قلبی اُنس تھا۔

ائمہ اربعہ میں سے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک قول اس سورۂ مبارکہ کے بارے میں ملتا ہے جسے حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں:

لَوْ تَدَبَّرَ النَّاسُ هٰذِهِ السُّوْرَةَ لَوَسِعَتْهُمْ

''اگر لوگ صرف اس ایک سورۃ پر غور و فکر کریں تو یہ ان کی ہدایت و رہنمائی کے لیے کافی ہو جائے۔''

امام شافعی کا ایک اور قول مفتی محمد عبدہٗ نے تفسیر پارہ ''عَـمَّ'' میں نقل کیا ہے' جس کی رو سے امام شافعیؒ فرماتے ہیں:

لَوْ لَمْ يُنَزَّلْ مِنَ الْقُرْآنِ سِوَاهَا لَكَفَتِ النَّاسَ

''اگر قرآن مجید میں سوائے اِس (سورۃ العصر) کے کچھ اور نازل نہ ہوتا تو لوگوں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے یہی کافی ہوتی۔''

اِن دو اقوال سے بآسانی اندازہ ہو جاتا ہے کہ امام شافعیؒ کی نگاہ میں اس سورۃ کی عظمت اور اس کا مقام کیا تھا!

دورِ حاضر میں بھی بہت سے اصحابِ علم وفضل نے اس سورۂ مبارکہ کی عظمت کو پہچانا ہے۔ چنانچہ مولانا عبدالباری ندوی نے اس سورۂ مبارکہ کی بنیاد پر ''مسلمانوں کا نظامِ تعلیم وتربیت'' کے عنوان سے ایک خاصی ضخیم کتاب تصنیف کی ہے۔ امام حمید الدین فراہیؒ نے اس سورۂ مبارکہ کو قرآن مجید کے جوامع الکلم میں سے شمار کیا ہے۔ میرا اپنا احساس یہ ہے کہ جہاں تک صراطِ مستقیم اور سواء السبیل کی نشاندہی اور انسان کے لوازمِ فوز وفلاح اور شرائطِ نجات کے بیان کا تعلق ہے' یہ سورۂ مبارکہ قرآن مجید کی جامع ترین سورۃ ہے۔ جس طرح توحید کے بیان میں سورۃ الاخلاص قرآن مجید میں نہایت اہمیت کی حامل ہے' اور اسی وجہ سے اُس کو قرآن مجید کی عظیم ترین سورۃ قرار دیا گیا ہے' بالکل اسی طرح قرآن مجید کے مقصدِ نزول یعنی لوگوں کی ہدایت و رہنمائی کے اعتبار سے اور صراطِ مستقیم کے سنگ ہائے میل کی نشاندہی کے اعتبار سے یہ سورۂ مبارکہ انتہائی جامعیت اور عظمت کی حامل ہے۔

عبارت کا تجزیہ

اس سورۂ مبارکہ پر اگر غور کیا جائے اور اس کا ترجمہ سامنے رکھا جائے تو یہ بات واضح ہو گی کہ اگرچہ اس کی آیات تین ہیں لیکن ان تینوں کو جوڑنے سے ایک سادہ جملہ (simple statement) وجود میں آتا ہے۔ اس لیے کہ اس کی درمیانی آیت ﴿إِنَّ الْإِنسَانَ لَفِي خُسْرٍ ﴿٢﴾﴾ نہ صرف یہ کہ عددی اعتبار سے اس سورۂ مبارکہ کی مرکزی آیت قرار پاتی ہے بلکہ مضمون کے اعتبار سے بھی مرکزی اہمیت کی حامل ہے۔ اس میں انسان کے خسارے اور گھاٹے' اور اس کی ہلاکت و بربادی کا ایک عجیب مایوس کن نقشہ سامنے آتا ہے۔ پہلی آیت ایک قَسم پر مشتمل ہے جس سے نہ صرف یہ کہ زورِ بیان میں اضافہ ہوا ہے بلکہ آیت ۲ میں بیان شدہ حقیقت میں مزید تاکید کا مفہوم بھی

پیدا ہو گیا ہے۔ یہ دونوں آیات مل کر ایک قاعدہ کلیہ کے بیان کی حیثیت اختیار کرتی ہیں جس سے ایک استثناء کو تیسری آیت بیان کر رہی ہے۔ گویا بالفاظِ دیگر پہلی آیت محض ایک قسم پر مشتمل ہے' اور سیدھی سی بات ہے کہ قسم کا مفہوم واضح نہیں ہو سکتا جب تک کہ یہ معلوم نہ ہو کہ وہ قسم کس بات پر کھائی جا رہی ہے۔ اسی طرح تیسری اور آخری آیت ایک استثناء پر مشتمل ہے اور اس استثناء کا مفہوم بھی واضح نہیں ہوتا جب تک کہ یہ معلوم نہ ہو کہ یہ استثناء کس سے کیا جا رہا ہے' وہ قاعدہ کلیہ کون سا ہے کہ جس سے یہ استثناء بیان ہو رہا ہے! اس طرح یہ تینوں آیات مل کر ایک سادہ جملے کی شکل اختیار کرتی ہیں:

﴿وَالْعَصْرِ ①﴾ ''زمانہ کی قسم ہے'' ﴿اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ②﴾ ''یقیناً تمام انسان گھاٹے اور خسارے میں ہیں'' ﴿اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ ''سوائے اُن کے جو ایمان لائے'' ﴿وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ ''اور انہوں نے نیک عمل کیے (بھلے عمل کیے)''

﴿وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ﴾ ''اور انہوں نے ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کی'' ﴿وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ③﴾ ''اور انہوں نے باہم ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کی۔''

اس جملے کو اگر ہم اپنے غور و فکر کا موضوع بنائیں' یا یوں کہہ لیجیے کہ اپنے لوحِ قلب پر اسے نقش کر لیں یا اپنے لوحِ ذہن پر کندہ کر لیں اور اس پر ذرا سا غور کریں تو چار باتیں بادنیٰ تأمل ہمارے سامنے آئیں گی۔

زورِ کلام —— تاکید کی انتہا

سب سے پہلی بات یہ کہ اس میں جو حقیقت بیان کی گئی ہے وہ انتہائی مؤکد پیرائے میں ہے۔ اس لیے کہ اوّلاً اس سورۂ مبارکہ کا آغاز ایک قسم سے ہو رہا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ قسم ہمیشہ تاکید کے لیے کھائی جاتی ہے۔ اگرچہ قرآن مجید کو اللہ کا کلام ماننے اور اس پر ایمان رکھنے والوں کے لیے محض اللہ کا فرمانا ہی انتہائی تاکید کا حامل ہے کہ ع ''مستند ہے ان کا فرمایا ہوا!'' لیکن جہاں اللہ تعالیٰ کسی بات کو مزید مؤکد کرنا چاہتے ہیں وہاں اس کے آغاز میں مضمون کی نسبت سے کسی قسم کا اضافہ فرما دیتے ہیں۔ ثانیاً آیت ۲ کا آغاز ایک حرفِ تاکید سے ہو رہا ہے۔ عربی زبان سے معمولی سی واقفیت رکھنے والے حضرات بھی جانتے ہیں کہ حرف ''اِنَّ'' تاکید کے لیے آتا ہے جس کا ترجمہ بالعموم ہوتا ہے تحقیق' یقیناً' بلا شک و شبہ۔ پھر اسی آیت میں لامِ تاکید کا اضافہ بھی ہوا ہے۔ ''لَفِیْ خُسْرٍ'' میں ''ل'' تاکید کا فائدہ دے رہا ہے۔ تاکید کے مزید کئی اسالیب بھی اس سورۂ مبارکہ میں اختیار کیے

گئے ہیں' لیکن اندیشہ ہے کہ یہاں اُن کا بیان کچھ ثقالت کا حامل ہو جائے گا۔ تاہم عربی دان حضرات جانتے ہیں کہ عربی زبان میں کسی کلام میں زور پیدا کرنے کے لیے جتنے ممکن اسالیب ہیں وہ سب کے سب اس مختصر سی سورۃ میں جمع کر دیے گئے ہیں' جو نحوی اعتبار سے ایک سادہ جملے پر مشتمل ہے۔

کامیابی اور ناکامی کا قرآنی معیار

دوسری بات جو اس سورۂ مبارکہ پر معمولی سے غور و فکر کے نتیجے میں سامنے آتی ہے' بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس جامِ حقیقت نما سے از خود چھلک رہی ہے' یہ ہے کہ اس میں انسان کی کامیابی اور ناکامی کا ایک معیار وارد ہوا ہے۔ ہر شخص جو اِس دنیا میں زندگی بسر کر رہا ہے' بھاگ دوڑ' سعی و جُہد اور محنت و مشقت کر رہا ہے' کامیابی کا کوئی نہ کوئی معیار اس کے سامنے ہے۔ اور اگر ہم تجزیہ کریں تو معلوم ہوگا کہ اکثر و بیشتر دنیا میں کسی انسان کی کامیابی کے جو معیارات معروف ہیں ان میں دولت و ثروت ہے' حیثیت و وجاہت ہے' شہرت و ناموری ہے یا کاروبار و جائداد ہے۔ ان چیزوں سے بالعموم کسی انسان کی کامیابی یا ناکامی کو ناپا جاتا ہے۔ لیکن اس سورۂ مبارکہ میں اس کے بالکل برعکس تصور سامنے آتا ہے کہ انسان کی کامیابی نہ دولت و ثروت سے ہے' نہ شہرت و ناموری سے ہے' نہ حیثیت و وجاہت سے ہے' نہ دُنیوی اقتدار و غلبے سے' بلکہ انسان کی کامیابی کے چار لوازم ہیں۔ یعنی ایمان' عمل صالح' تواصی بالحق اور تواصی بالصبر!

گویا اگر کسی انسان کے پاس نہ دو وقت پیٹ بھرنے کے لیے کچھ موجود ہو' نہ تن ڈھانپنے کے لیے مناسب لباس اسے میسر ہو' اور نہ سر چھپانے کے لیے کوئی چھت اسے حاصل ہو' لیکن ایمان کی دولت' عمل صالح کی پونجی اور تواصی بالحق اور تواصی بالصبر سے اس کا دامن بھرا ہوا ہو تو وہ انسان از روئے قرآن و از روئے سورۃ العصر ایک کامیاب انسان قرار پائے گا۔ اس کے برعکس کسی کے پاس خواہ نمرود اور فرعون کی سی بادشاہی ہو' قارون کا سا خزانہ ہو یا دنیا کی دوسری تمام نعمتیں انتہائی کثرت اور بہتات کے ساتھ جمع ہو گئی ہوں' لیکن اگر وہ دولتِ ایمان سے محروم ہے' اعمالِ صالحہ کی پونجی سے تہی دامن ہے' تواصی بالحق اور تواصی بالصبر سے عاری ہے تو وہ شخص از روئے سورۃ العصر ناکام ہے' خائب و خاسر اور نامراد ہے۔

اس حقیقت کو جان لینا شاید اتنا مشکل نہیں جتنا کہ اس پر دل کا جم جانا دشوار ہے۔ اس لیے کہ انسان اس دنیا میں اپنے گرد و پیش سے متأثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اگر کسی وقت کوئی چمکیلی شوخ

رنگ کی نئے ماڈل کی کار کسی کے پاس سے زناٹے کے ساتھ گزر جاتی ہے تو واقعہ یہ ہے کہ اعصاب میں ایک ارتعاش سا پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر کسی عالی شان محل کے سامنے سے گزر ہو جس میں زندگی کی تمام آسائشیں فراہم ہوں تو نفسِ انسانی اس سے تأثر قبول کرتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اِس دنیا میں رہتے ہوئے یہاں کی چمک دمک اور رونقوں سے متأثر ہونا انسان کی خِلقی کمزوریوں میں سے ایک ہے' لہٰذا ضرورت ہے کہ کامیابی و ناکامی کے اس قرآنی معیار کو ایک دفعہ مان لینے کے بعد اس کا بار بار اعادہ کیا جاتا رہے' اس حقیقت کی طرف وقفے وقفے سے ذہن کو منتقل کیا جاتا رہے اور اس کی بکثرت یاددہانی ہوتی رہے۔ یہی وہ بات ہے جو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے طرزِ عمل سے سامنے آتی ہے اور اس سوال کا واضح جواب ہمارے سامنے آتا ہے کہ آخر وہ کیوں ہر ملاقات کے موقع پر ایک دوسرے کو سورۃ العصر سنایا کرتے تھے! اسی لیے کہ یہ حقیقت ذہن میں مستحضر رہے کہ انسان کی کامیابی دولت و جائداد' دنیاوی اقتدار اور شہرت و ناموری سے نہیں ہے' بلکہ اس کی کامیابی کے لوازم بالکل دوسرے ہیں' یعنی ایمان' اعمالِ صالحہ' تواصی بالحق اور تواصی بالصبر۔

نجات کی کم از کم شرائط کا بیان

تیسری بات جو اِس سورۂ مبارکہ پر معمولی سے غور و فکر سے واضح ہو جاتی ہے' یہ ہے کہ اس سورۃ میں انسان کی کامیابی کے اعلیٰ مراتب کا ذکر نہیں ہے' بلکہ یہاں محض ادنیٰ درجے میں کامیابی کا بیان ہے۔ اس میں محض خسارے اور گھاٹے سے بچ جانے کی شرائط کو بیان کیا گیا ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ کم از کم لوازمِ نجات ہیں یا یوں کہہ لیجیے کہ یہ انسان کی کامیابی کی کم سے کم شرائط ہیں جن سے کم تر پر نجات کا کوئی تصور نہیں! اس لیے کہ اگر یوں کہا گیا ہوتا کہ ان لوگوں کو بڑے اعلیٰ مراتب نصیب ہوں گے جن میں مذکورہ بالا چاروں صفات موجود ہوں گی تو پھر امکانی طور پر یہ خیال ذہن میں آ سکتا ہے کہ کامیابیٔ محض کے حصول اور ناکامی سے بچنے کے لیے اس سے کم تر پر قناعت کی جا سکتی ہے۔ یعنی چار کی بجائے دو شرائط کو پورا کرنے پر بھی ہلکے درجے کی کامیابی کی امید کی جا سکتی ہے۔ لیکن یہاں جو اُسلوب اختیار کیا گیا اس سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ یہ انسان کی کامیابی کا کم سے کم تقاضا اور اس کی فوز و فلاح کے کم سے کم لوازم ہیں جو اس سورۂ مبارکہ میں بیان ہوئے۔

چاروں شرطیں لازمی ہیں!

چوتھی‘ آخری اور اہم ترین بات جو اِس سورۂ مبارکہ پر غور وفکر سے انسان کے سامنے آتی ہے‘ یہ ہے کہ یہاں جو لوازمِ نجات بیان ہو رہے ہیں اور جن سے انسان کی کامیابی کو مشروط قرار دیا گیا ہے وہ سب کے سب ناگزیر ہیں‘ ان میں سے کسی ایک کو بھی ساقط کرنے کا کسی کو کوئی حق نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہ کلامِ الٰہی ہے۔ اس کے بارے میں یہ گمان نہیں کیا جا سکتا (نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ ذٰلِکَ) کہ ع ’’بڑھا بھی دیتے ہیں کچھ زیبِ داستاں کے لیے‘‘ والا کوئی معاملہ اس میں کیا گیا ہو یا محض ردیف اور قافیے کی ضرورت کے تحت کچھ اضافہ کر دیا گیا ہو۔ اس کا ایک ایک حرف اپنی جگہ اٹل ہے‘ اس میں جو بات فرمائی گئی ہے وہ جوں کی توں حقیقت ہے‘ اس میں کسی قطع و برید اور کسی کمی و بیشی کی کوئی گنجائش ہے نہ امکان! اس لیے کہ یہ کلام اللہ ہے۔

دیکھئے‘ اگر کوئی معالج کسی مریض کو چار اجزاء پر مشتمل ایک نسخہ لکھ کر دے تو ظاہر ہے کہ وہ چاروں اجزاء ہی اس نسخہ کے لازمی اجزاء ہوں گے۔ بلکہ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک جزو میں اگر کوئی مضرت بخش پہلو ہو تو دوسرا جزو اس میں مصلح کی حیثیت سے شامل ہوتا ہے‘ لہٰذا اگر کوئی مریض اپنی مرضی سے اس نسخہ میں سے کسی جز و کو ساقط کر دے تو یہ بات طے شدہ ہے کہ اب یہ نسخہ اس معالج یا حکیم کا نسخہ نہیں رہا‘ بلکہ اب اس کی ذمہ داری اُس شخص پر ہے جس نے اس میں قطع و برید یا کمی بیشی کی ہے۔ عین ممکن ہے کہ اب وہ نسخہ نسخۂ شفا نہ رہے بلکہ نسخۂ ہلاکت بن جائے۔

ایک مغالطے کا ازالہ

قرآن مجید کی اس سورۂ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے انسان کی نجات کو چار شرائط سے مشروط کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ چاروں شرائط ناگزیر اور ضروری ہیں‘ ان میں سے کسی ایک شرط کو بھی ساقط کرنے کا کسی کو اختیار نہیں۔ یہ بات اس پہلو سے بہت اہم ہے کہ اس وقت اُمت مسلمہ عملی اعتبار سے جس تنزّل اور انحطاط کا شکار ہے اس کا ایک بڑا سبب بھی یہی ہے کہ ذہنوں میں یہ بات بٹھا دی گئی ہے کہ صرف ایمان ہی نجات کے لیے کافی ہے‘ بلکہ ایمان کا بھی صرف قانونی پہلو جو اقرارٌ بِاللِّسان سے متعلق ہے‘ انسان کو جنت کا حق دار بنانے کے لیے کافی ہے۔ یہ مغالطہ آج اُمت مسلمہ کی ایک عظیم اکثریت کے ذہنوں میں بیٹھ گیا ہے کہ کلمہ گو بہرحال نجات پا جائے گا‘ خواہ اس کلمے کے لیے جو اُسے وراثتاً مل گیا ہے‘ اس نے نہ تو کوئی محنت کی ہو‘ نہ ترک واختیار کے کسی مرحلہ سے اسے گزرنا پڑا ہو اور نہ

ہی کلمے کے عملی تقاضوں کو پورا کرنے کی جانب اس نے کبھی کوئی توجہ دی ہو۔ جب انسان کے ذہن میں یہ بات بیٹھ جائے کہ وہ تو بخشا بخشایا ہے اور نجات و کامیابی اس کا موروثی حق ہے اور اسے از خود حاصل ہے تو ظاہر ہے کہ پھر عملی کھکھیڑ مول لینے اور مشکلات اور دینی ذمہ داریوں کا بوجھ سنبھالنے کی کوئی ضرورت اسے محسوس نہیں ہوتی۔ اسی مغالطے نے اُمت مسلمہ کو عمل سے یکسر فارغ کر دیا۔ بقول علامہ اقبال: ؎

خبر نہیں کیا ہے نام اس کا خدا فریبی کہ خود فریبی؟
عمل سے فارغ ہوا مسلماں بنا کے تقدیر کا بہانہ!

جہاں تک تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کے حوالے سے عائد ہونے والی ذمہ داریوں کا تعلق ہے' اُمت مسلمہ بحیثیت مجموعی انہیں یکسر فراموش کر چکی ہے۔ دعوت الی اللہ' تبلیغ دین' امر بالمعروف و نہی عن المنکر' جہاد فی سبیل اللہ' شہادت علی الناس' یہ تمام فرائض تو گویا مسلمانوں کے تصورِ دین سے بالکل خارج ہو چکے ہیں۔ ان کے بارے میں تو یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ شاید یہ صرف ایک مخصوص طبقہ کی ذمہ داری ہے' عام مسلمان پر اس کا کوئی بوجھ ہے نہ وہ اس کے لیے مکلّف ہے۔ ان تمام تصورات کی ایک بھرپور نفی اس سورۂ مبارکہ کے چند الفاظ کے ذریعے کی گئی ہے۔ فرمایا:

﴿وَالْعَصْرِ ① اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ② اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ③﴾

یعنی زمانہ اس پر گواہ ہے کہ تمام انسان خسارے اور گھاٹے سے دوچار رہوں گے' ماسوائے ان کے کہ جو چار شرطیں پوری کریں: ایمان' عمل صالح' تواصی بالحق اور تواصی بالصبر۔

یہی وجہ ہے کہ امام رازیؒ نے اپنی مشہورِ زمانہ تفسیر میں سورۃ العصر کے ضمن میں یہ جامع الفاظ تحریر فرمائے ہیں:

اِعْلَمُوْا اَنَّ هٰذِهِ الْاٰيَةَ فِيْهَا وَعِيْدٌ شَدِيْدٌ' لِاَنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى حَكَمَ بِالْخَسَارِ لِجَمِيْعِ النَّاسِ' اِلَّا مَنْ كَانَ آتِيًا بِهٰذِهِ الْاَشْيَاءِ الْاَرْبَعَةِ: وَهِيَ الْاِيْمَانُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ وَالتَّوَاصِيْ بِالْحَقِّ وَالتَّوَاصِيْ بِالصَّبْرِ' فَدَلَّ ذٰلِكَ عَلٰى اَنَّ النَّجَاتَ مُعَلَّقَةٌ بِمَجْمُوْعِ هٰذِهِ الْاُمُوْرِ

''جان لو کہ اس آیت میں بڑی شدید وعید وارد ہوئی ہے' اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے خسارے' گھاٹے اور تباہی کا فیصلہ صادر فرما دیا ہے پوری نوعِ انسانی کے لیے' سوائے اُن کے جو اِن چار

چیزوں کا اہتمام کریں (ان چار شرائط کو پورا کریں) یعنی ایمان‘ عمل صالح‘ تواصی بالحق اور تواصی بالصبر۔ چنانچہ اس سے اس جانب رہنمائی ملتی ہے کہ نجات کا دار و مدار اِن چاروں چیزوں کے مجموعہ پر ہے‘‘۔

معقولیت کا تقاضا!

ان چار باتوں کے مابین جو منطقی ربط ہے اس کو ایک عام مثال سے بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ اس دنیا میں کسی بھی اہم معاملے میں جو کسی انسان کو پیش آئے‘ صحیح طرزِ عمل یہ ہو گا کہ انسان اس معاملے کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرے کہ حقیقت کیا ہے۔ پھر جب حقیقت اس پر منکشف ہو جائے تو ایک معقول انسان کی روش یہ ہو گی کہ وہ اسے قبول کرے‘ تسلیم کرے۔ اور اگر اس کے قبول کرنے میں کسی کی ناراضگی مول بھی لینی پڑتی ہو یا کچھ ذاتی نقصان برداشت کرنا پڑتا ہو تب بھی اسے قبول کرنے سے نہ رکے‘ اس لیے کہ وہ حقیقت اس پر منکشف ہو چکی ہے۔ اس کے بعد اگلا قدم یہ ہو گا کہ جس حق کو اس نے قبول کیا ہے اس کا اعلان بھی کرے‘ اس کی طرف لوگوں کو بلائے۔ اور آخری مرحلے کے طور پر اِس معاملہ میں خواہ اسے مخالفت کا سامنا ہو‘ خواہ اس کا تمسخر ہو اور خواہ اس کو جان کے لالے پڑ جائیں وہ اپنے موقف پر ڈٹا رہے اور اس کی طرف لوگوں کو بلاتا رہے۔

سقراط کا واقعہ ہمیں معلوم ہے کہ چند حقائق اس پر منکشف ہوئے۔ اس نے ان کو نہ صرف خود قبول کیا بلکہ ان کا اعلان بھی کیا۔ اس راہ میں اسے زہر کا پیالہ بھی پینا پڑا۔ لیکن اس نے اعتراف و اعلانِ حق سے منحرف ہونے کی بجائے اپنی زندگی کو قربان کر دینا مناسب سمجھا۔ ہر معقول اور صاحب سیرت و کردار انسان کے لیے یہی ایک روش ہے جو اسے اختیار کرنی چاہیے۔ جس مرحلہ پر بھی انسان اس معقول روش کو چھوڑ کر اپنی سیرت و کردار کے بودے پن کا مظاہرہ کرے گا تو وہ گویا اس بات کا ثبوت دے گا کہ وہ محض صورتاً ایک انسان ہے‘ حقیقی انسانیت سے بہرہ ور نہیں ہے۔

تو یہ وہ چند حقیقتیں ہیں کہ جو اِس سورۂ مبارکہ سے گویا از خود چھلک رہی ہیں۔ ذرا سے تأمل اور غور و فکر سے انسان اِن تک بآسانی رسائی حاصل کر لیتا ہے۔ الغرض یہ اِس سورۂ مبارکہ کی وہ بنیادی رہنمائی ہے جو بطریق تذکّر حاصل ہوتی ہے۔ اس کے بعد ہمیں ذرا مزید گہرائی میں اتر کر اس کے مضامین پر غور و فکر کرنا ہے۔

فہم قرآن کے دو درجے

اس مرحلہ پر یہ بات بھی ذہن میں بٹھا لیجیے کہ فہمِ قرآن کے دو درجے ہیں: ایک ہے تذکّر بالقرآن اور دوسرا ہے تدبّر بالقرآن۔

تذکر بالقرآن یہ ہے کہ قرآن مجید کی کسی آیت یا سورۃ سے اس کا اصل سبق اخذ کر لیا جائے۔ اس پہلو سے قرآن مجید ایک بہت آسان اور کھلی کتاب ہے۔ قرآن مجید خود دعویٰ کرتا ہے:

﴿وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ﴾ (القمر)

''ہم نے قرآن کو تذکّر (نصیحت اور یاددہانی) کے لیے آسان کر دیا ہے' تو ہے کوئی جو اس سے نصیحت اخذ کرنا چاہے؟''

تدبّر کے معنی غور و فکر کے ہیں۔ یعنی قرآن حکیم کے ایک ایک لفظ میں غوطہ زنی کرنا اور لغت و بیان کے ہر ہر پہلو کو مدّ نظر رکھتے ہوئے غور و فکر کا حق ادا کرنے کی کوشش کرنا۔ اس اعتبار سے حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید کی گہرائیاں اتھاہ ہیں۔ اس پر غور و فکر کا حق ادا کرنا کسی انسان کے بس میں نہیں۔ پوری پوری زندگیاں کھپانے کے باوجود کوئی انسان کبھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس نے اس قرآن کی گہرائیوں کو ناپ لیا ہے۔

نوعِ انسانی کا المیہ — ایک عظیم خسارے سے سابقہ

سورۃ العصر پر اگر بطریق تدبّر غور کیا جائے تو اس کی مرکزی اور درمیانی آیت سے نوعِ انسانی کی ایک عجیب اَلمیاتی (tragic) کیفیت سامنے آتی ہے۔ انسان کا بحیثیت انسان بڑا ہی دردناک انجام اس آیۂ مبارکہ کے ذریعے سامنے آتا ہے: ﴿اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ﴾

لفظ ''انسان'' پر ''ال'' کی صورت میں جو حرفِ تعریف داخل ہوا ہے یہ بلا اختلاف ''لامِ جنس'' ہے۔ گویا یہاں ''اَلْاِنْسَان'' سے تمام کے تمام انسان اور پوری نوعِ انسانی مراد ہے۔ ''لَفِيْ خُسْرٍ'' کا عام طور پر ترجمہ یوں کیا جاتا ہے کہ ''یقیناً خسارے میں ہے' گھاٹے میں ہے۔'' لیکن یہ بات جان لینی چاہیے کہ یہاں خسارے سے مراد کوئی دو چار لاکھ یا دو چار کروڑ کا خسارہ نہیں' بلکہ اس سے مراد ہے بربادی' تباہی اور ہلاکت۔ اسی لیے قرآن مجید اگرچہ کامیابی کے لیے متعدد الفاظ استعمال کرتا ہے' مثلاً فوز' فلاح' سعادت اور رشد وغیرہ' لیکن ان سب کی ضد قرآن مجید میں بالعموم ایک ہی لفظ ''خسران'' کو استعمال کرتا ہے: ﴿ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ﴾ (الحج)

سورۃ العصر میں نوعِ انسانی کے جس المیہ (human tragedy) کی طرف اشارہ ہو رہا ہے اسے دو مراتب میں سمجھا جا سکتا ہے۔ پہلے درجے میں ہم دیکھتے ہیں کہ اس دنیاوی زندگی کے دوران محنت ومشقت ہر انسان کا مقدر ہے۔ مختلف اعتبارات سے تکالیف اور مصائب کے پہاڑ اس پر ٹوٹتے رہتے ہیں' کسی پر کم اور کسی پر زیادہ۔ نوعِ انسانی کی ایک عظیم اکثریت ایسے افراد پر مشتمل ہے جو دن بھر کی کمر توڑ دینے والی محنت کرنے کے باوجود اپنے اور اپنی اولاد کے لیے زندگی کی بنیادی ضروریات بھی فراہم نہیں کر پاتے۔ اس پر مستزاد ہیں وہ صدمات کہ جن سے انسان دوچار رہوتا ہے۔ کبھی اولاد کی محبت اسے رلاتی ہے' کبھی مال کی تمنا اسے تڑپاتی ہے' کبھی ناکام آرزوئیں اس کے گلے کا ہار بنتی ہیں۔ طرح طرح کی مایوسیوں اور frustrations اور کئی نوع کی الجھنوں (conflicts) سے انسان دوچار رہوتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ نسیان اور بھول انسان کے لیے ایک بہت بڑی رحمت ہے۔ وقت کا مرہم انسان کے زخموں کو مندمل کر دیتا ہے۔ اس پر رنج وغم کے پہاڑ ٹوٹتے رہتے ہیں' لیکن وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ انہیں بھلا دیتا ہے اور وہ اس طرح زندگی کا یہ سفر جیسے تیسے طے کرتا ہے۔ لیکن اگر کوئی قلب حساس نوعِ انسانی کی اس کیفیت کا مشاہدہ کرے تو واقعہ یہ ہے کہ وہی صورت پیدا ہوگی جو گوتم بدھ کو درپیش ہوئی تھی' جس نے نوعِ انسانی کے اس المیہ کا مشاہدہ کر کے اپنا تاج وتخت اور سارا عیش وآرام تج کر اس بات پر کمر کس لی تھی کہ معلوم کرے گا کہ اس دکھ اور تکلیف کا اصل سبب کیا ہے' اور اس سے نجات پانے کی سبیل کون سی ہے! قرآن مجید نے ایک مقام پر اس تمام کیفیت کو نہایت جامعیت کے ساتھ یوں بیان فرمایا: ﴿لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِیۡ کَبَدٍ ؕ﴾ (البلد) ''ہم نے انسان کو محنت اور مشقت ہی میں پیدا کیا ہے۔'' یہ محنت ومشقت ہر انسان کا مقدر ہے۔(۱)

ممکن ہے بعض لوگ اس مغالطے کا شکار ہوں کہ شاید دولت مند لوگوں کے لیے کوئی تکلیف نہیں' وہ آرام اور آسائش ہی میں رہتے ہیں۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ جس قسم کی ذہنی اذیتوں اور جس نوع کی نفسیاتی پیچیدگیوں سے انہیں سابقہ پیش آتا ہے' بالعموم غرباء کو یا محنت کش لوگوں کو ان کا تجربہ بھی نہیں ہوتا۔

---

(۱) غالب نے اپنے ایک شعر میں اس حقیقت کی تعبیر بڑی خوبصورتی سے کی ہے۔

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں!

یہ تو تھا نوعِ انسانی کو درپیش المیے کا ابتدائی باب یا پہلا مرحلہ —— انسانی المیے کا نقطۂ عروج (climax) وہ ہوگا جب یہ ساری کمر توڑ دینے والی مشقتیں جھیل کر اور تمام تکلیفیں برداشت کر کے بالآخر انسان کی آنکھ اُس دوسری دنیا میں کھلے گی جہاں وہ اپنے آپ کو ایک بڑے محاسبے اور جواب دہی (grand accountability) کے لیے اپنے ربّ کے حضور کھڑا پائے گا۔ انسانی المیے کا یہ وہ پہلو ہے جو کسی حیوان کا مقدر نہیں ہے' کسی کولہو کے بیل یا کسی بار برداری کے جانور کو یہ کٹھن مرحلہ درپیش نہیں ہوگا۔ قرآن حکیم نے اس حقیقت کو یوں بیان فرمایا ہے: ﴿یٰۤاَیُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِيْهِ ۞﴾ (الانشقاق) ''اے انسان! تجھے یہ تمام دکھ جھیلتے اور مشقتیں سہتے ہوئے بالآخر اپنے ربّ کے حضور میں جا حاضر ہونا ہے''۔

یہ وہ مرحلہ ہے کہ جس کے احساس ہی سے نسل انسانی کے گلِ سرسبد کانپ کانپ جاتے رہے ہیں۔ سورۃ النور میں اس کی نقشہ کشی ان الفاظ میں کی گئی ہے: ﴿يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ ۞﴾ ''وہ (اہل ایمان) ڈرتے رہتے ہیں اس دن کے احساس اور اس دن کے خیال سے جس دن نگاہیں اور دل الٹ جائیں گے۔'' اسی احساس سے مغلوب ہو کر ابوبکر صدیق ؓ بڑے جذب کی کیفیت میں یہ فرمایا کرتے تھے کہ کاش میں درختوں پر چہچہاتی ہوئی ایک چڑیا ہوتا جس سے کوئی محاسبہ نہیں ہے' جسے کوئی جواب دہی نہیں کرنی' اور کاش کہ مَیں گھاس کا ایک تنکا ہوتا جو جلا کر راکھ کر دیا جاتا ہے لیکن اسے کسی محاسبہ اور پوچھ گچھ کا سامنا نہیں کرنا ہوگا۔ اسی سے ملتے جلتے الفاظ سورۃ النبأ کے اختتام پر وارد ہوئے ہیں کہ اُس روز کی سختیوں اور ہولناکی سے گھبرا کر انسان پکار اُٹھے گا: ﴿يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرٰبًا ۞﴾ ''اے کاش کہ میں مٹی ہوتا'' (کاش کہ شرفِ انسانیت مجھے عطا نہ ہوتا)۔ یہ ہے نوعِ انسانی کا وہ الم ناک مقدر اور ہلاکت خیز نصیب جس سے پوری نوع کو بحیثیت مجموعی دوچار ہونا ہے اور یہ ایک ایسی اٹل حقیقت ہے کہ جس پر اس سورۂ مبارکہ کی پہلی آیت میں قسم کھائی گئی ہے:

﴿وَالْعَصْرِ ۞﴾

قسم کا فائدہ!

یہاں یہ بات جان لینی چاہیے کہ قسم سے اصل مقصود شہادت اور گواہی ہوتی ہے۔ یعنی کسی کو اپنی بات پر گواہ کے طور پر پیش کرنے کے لیے اس کی قسم کھائی جاتی ہے۔ چنانچہ جب ہم کسی بات پر اللہ کی قسم کھاتے ہیں تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ میں یہ بات اللہ کو گواہ بنا کر کہہ رہا ہوں۔

قَسموں کے ضمن میں یہ حقیقت بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ انسان کا معاملہ یہ ہے کہ وہ ہمیشہ کسی عظیم ہستی کی قَسم کھاتا ہے۔ تبھی اس کے کلام میں زور اور تاکید کا مفہوم پیدا ہوتا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جو قَسمیں کھائی ہیں ان کا معاملہ مختلف ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ سے زیادہ مقدس اور عظیم تر وجود کسی کا نہیں ہے لہٰذا قرآن مجید کی قَسموں میں تقدس اور عظمت کا پہلو تلاش کرنا ایک غیر ضروری بات اور ایک لاحاصل سعی ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن حکیم میں جب کسی شے کی قَسم کھاتے ہیں تو وہاں محض گواہی پیش نظر ہوتی ہے۔ گویا ﴿وَالْعَصْرِ﴾ کا بامحاورہ ترجمہ ہوگا ''زمانہ گواہ ہے''۔ یعنی اگلی آیت میں جو حقیقت بیان کی جا رہی ہے اس پر زمانے کو بطور گواہ کے پیش کیا گیا۔

''عصر'' کی حقیقت

لفظ ''الْعَصْر'' پر بھی غور کیجیے! ''عصر'' کا ترجمہ بالعموم ''زمانہ'' کیا جاتا ہے' لیکن قابل غور بات یہ ہے کہ ''زَمَان'' بھی عربی زبان کا لفظ ہے اور وقت بھی۔ عجیب بات یہ ہے کہ پورے قرآن مجید میں لفظ ''زَمَان'' کا استعمال کہیں نظر نہیں آتا۔ البتہ ''وقت'' کا استعمال ایک دو مقامات پر مل جاتا ہے۔ اس ضمن میں قرآن مجید میں ''عصر'' اور ''دھر'' کے الفاظ کا استعمال زیادہ نظر آتا ہے۔

علم طبیعیات (Physics) سے دلچسپی رکھنے والے حضرات جانتے ہیں کہ آج انسان کی رسائی اس حقیقت تک ہوئی ہے کہ زمان و مکان دو متضاد حقیقتیں نہیں' بلکہ ایک وحدت ہیں اور باہم مربوط ہیں' بلکہ جیسا کہ آئن سٹائن (Einstein) نے کہا کہ زمان (time) دراصل مکان (space) ہی کی ایک جہت (dimension) ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ لفظِ عصر اور لفظِ دھر دونوں میں زمان و مکان کی وحدت کی طرف اشارہ موجود ہے' اگرچہ ان دونوں الفاظ میں ایک باریک سا فرق بھی ہے۔ لفظِ دھر میں زمانے کا پھیلاؤ اور اس کی مکانیت زیادہ پیش نظر ہے جبکہ لفظِ عصر میں اس کے مرور اور اس کی تیز رَوی کی جانب اشارہ ہے۔ عربی زبان میں تیز ہوا یعنی آندھی اور جھکڑ کو ''اعصار'' کہتے ہیں۔ اسی طرح دن کے اوقات میں عصر وہ وقت ہے جب دن تیزی سے ڈھل رہا ہوتا ہے' ختم ہوا چاہتا ہے۔

''وَالْعَصْر'' کا حقیقی مفہوم

اس پس منظر میں اب ''وَالْعَصْر'' کے مفہوم پر غور کیجیے! ترجمہ کچھ یوں ہوگا: ''تیزی سے

گزرنے والا زمانہ گواہ ہے۔‘‘اس آیۂ مبارکہ میں بڑا چونکا دینے کا انداز ہے۔انسان کو متوجہ کیا جا رہا ہے کہ یہ وقت جو بظاہر ٹھہرا ہوا نظر آتا ہے‘ درحقیقت بہت تیزی سے گزر رہا ہے۔تمہاری اصل پونجی یعنی مہلتِ عمر تیزی سے ختم ہو رہی ہے۔بقول شاعر : ؎

غافل تجھے گھڑیال یہ دیتا ہے منادی
گردوں نے گھڑی عمر کی اِک اور گھٹا دی!

ایک صاحب نے بڑی عمدہ تشبیہہ دی ہے کہ انسان کی مثال برف کے تاجر کی سی ہے کہ جس کا مالِ تجارت اگر بروقت فروخت نہ ہو تو نہ صرف یہ کہ منافع کا امکان باقی نہیں رہے گا بلکہ اُس کا اصل سرمایہ بھی پگھل کر ختم ہو جائے گا۔ انسان کا معاملہ بھی یہ ہے کہ اس کی اصل پونجی مہلتِ عمر ہے۔ اس کے ابدی مستقبل کا دار و مدار اسی پر ہے۔ جو کمائی بھی اس نے کرنی ہے اسی وقفۂ حیات میں کرنی ہے۔ بقول اقبال: ؎

سلسلۂ روز و شب تارِ حریرِ دو رنگ
جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبائے صفات

بہرکیف انسان کی یہ اصل پونجی اور اصل سرمایہ برف کی مانند پگھلتا چلا جا رہا ہے۔

یہی چونکا دینے کا انداز اس شعر میں بھی سامنے آتا ہے کہ: ؎

اٹھو وگرنہ حشر نہیں ہو گا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا!

لفظ ’’وَالْعَصْر‘‘ کے صوتی آہنگ اور صوتی کیفیت میں بھی چونکا دینے کی کیفیت موجود ہے۔ مزید غور کرنے پر یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ یہ زمانہ ایک ایسی مسلسل چادر کی مانند ہے جو ازل سے ابد تک تنی ہوئی ہے۔ چنانچہ یہ زمانہ مختلف قوموں کے عروج و زوال کا چشم دید گواہ ہے۔نوعِ انسانی جن جن مراحل سے گزری ہے‘ جو جو حالات اس کو پیش آتے رہے ہیں‘ یہ سب گویا زمانے کے سامنے کی چیزیں ہیں۔قومِ نوحؑ‘ قومِ ہودؑ اور قومِ صالحؑ کا جو انجام ہوا‘ قومِ لوطؑ اور قومِ شعیبؑ جس انجام سے دوچار ہوئے‘ آلِ فرعون جس طرح غرق ہوئے‘ان تمام بڑے بڑے واقعات کا چشم دید گواہ یہ زمانہ ہے۔اس زمانہ نے قوموں کو اُبھرتے اور گرتے بھی دیکھا ہے اور تمدنوں کو بنتے اور بگڑتے بھی دیکھا ہے۔ پھر یہ زمانہ قصۂ آدم و ابلیس کا چشم دید گواہ بھی ہے اور یہی زمانہ انسان کے آخری انجام کا بھی

عینی شاہد ہوگا۔ گویا اس پہلو سے بھی ﴿اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَفِیۡ خُسۡرٍ ۙ﴾ پر جو سب سے بڑی گواہی پیش کی جا سکتی ہے وہ اسی زمانہ کی ہے: ﴿وَالۡعَصۡرِ ۙ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَفِیۡ خُسۡرٍ ۙ﴾

روشنی کی ایک کرن

اب تیسری آیت پر توجہ کو مرکوز کیجیے! یہ تیسری آیت مایوسی کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں امید کی ایک کرن بن کر طلوع ہوتی ہے کہ اگرچہ بحیثیت مجموعی پوری نوعِ انسانی کا مقدر یہ ہے کہ وہ ہلاکت اور بربادی سے دوچار ہونے والی ہے لیکن اس قاعدہ کلیہ میں ایک استثناء موجود ہے' اس خسارے سے نجات کی ایک صورت ممکن ہے۔ اس تیسری آیت میں انسان کی رہنمائی ایک صراطِ مستقیم کی جانب کی گئی ہے جس پر چل کر وہ اپنے آپ کو اس ہلاکت خیز انجام سے بچا سکتا اور فوز وفلاح سے ہمکنار ہو سکتا ہے۔

اس صراطِ مستقیم یا سواء السبیل کے چار سنگ ہائے میل (mile stones) ہیں' یا یوں کہیے کہ اس کی چار منزلیں ہیں۔ اوّلین منزل ہے ایمان' دوسری ہے عمل صالح' تیسری ہے تواصی بالحق اور چوتھی ہے تواصی بالصبر۔

یہاں قرآن مجید نے جس انداز میں ان چار اصطلاحات کو بیان کیا ہے اور اُس کے لیے اس نے جو الفاظ اختیار کیے ہیں تو واقعتاً انہوں نے قرآن مجید کی بنیادی اصطلاحات کی صورت اختیار کر لی ہے۔ ان پر بطریق تدبر غور کرنے کے لیے ان کو دو دو کے دو جوڑوں میں تقسیم کرنا مناسب ہوگا۔ ہم پہلے ایمان اور عمل صالح اور ان دونوں کے باہمی تعلق پر غور کریں گے' پھر تواصی بالحق اور تواصی بالصبر اور ان کے باہمی رشتے پر توجہات کو مرکوز کریں گے اور پھر ان دونوں جوڑوں کے مابین موجود عقلی اور منطقی ربط کو سمجھنے کی کوشش کریں گے۔

''ایمان'' کا مفہوم

جہاں تک ''ایمان'' کے تفصیلی مباحث کا تعلق ہے' یعنی یہ کہ اس کا لغوی مفہوم کیا ہے' اس کا اصطلاحی مفہوم کیا ہے' ایمان کن کن امور کو ماننے کا نام ہے' اس دولت کے حصول کے ذرائع کون کون سے ہیں وغیرہ' تو یہ ان شاء اللہ اس ''منتخب نصاب'' میں اپنے مناسب مقام پر آئیں گے۔ یہاں صرف یہ جان لینا ضروری ہے کہ ایمان درحقیقت نام ہے اس کائنات کے بارے میں اُن بنیادی حقائق کو تسلیم کرنے کا جن کی خبر دی ہے انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام نے۔ انبیاء ہمیں بتاتے ہیں کہ اس کائنات

کے ان اصل اور اساسی حقائق تک‘ جو عام انسانوں کی نگاہوں سے پوشیدہ ہیں‘ ان کی رسائی ایک ایسے ذریعۂ علم کے واسطہ سے ہوئی ہے جو عام انسانوں کو حاصل نہیں‘ یعنی ’’وحی‘‘۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا وجود‘ اس کی صفاتِ کمال‘ بعث بعد الموت‘ حساب کتاب‘ جزا و سزا اور جنت و دوزخ‘ یہ وہ امور ہیں کہ جن تک رسائی انسان اپنے حواس کے ذریعے سے حاصل نہیں کر سکتا۔ ان حقائق کے بارے میں حتمی خبر ہمیں انبیاء کرام علیہم السلام نے دی ہے۔ ان کی دی ہوئی خبروں کی تصدیق کرنے اور ان کو تسلیم کر لینے کا نام ایمان ہے۔

ایمان کے دو درجے ہیں ــــــ ایک درجہ یہ ہے کہ زبان سے ان باتوں کو مان لیا جائے۔ اسی کو ’’**اقرارٌ باللّسان**‘‘ کہا جاتا ہے۔ یہ ایمان کا اوّلین یا یوں کہیے کہ قانونی درجہ ہے کہ جس نے زبان سے ان حقائق کو مان لیا گویا وہ ان لوگوں سے ممیّز ہو گیا جو ان امور کو نہیں مان رہے۔

ایمان کا دوسرا درجہ ’’**تصدیقٌ بالقلب**‘‘ ہے۔ یعنی وہ کیفیت کہ ان امور پر ایک پختہ یقین قلبِ انسانی میں پیدا ہو جائے۔ ایمان کی اصل روح یہی ہے۔ گویا ایمان فی الحقیقت **اقرارٌ بالّلسان** اور **تصدیقٌ بالقلب** کے مجموعے کا نام ہے۔ قلبی یقین کے نتیجے میں انسان کا عمل لازماً متاثر ہوتا ہے۔ بالفاظِ دیگر اگر کسی بات پر انسان کو یقین ہو تو اس کا عمل اس کے خلاف نہیں ہو گا۔ ہمیں یقین ہے کہ آگ جلاتی ہے‘ لہٰذا ہم آگ میں ہاتھ ڈالنے کے لیے تیار نہیں! بلکہ یقین تو دُور کی بات ہے‘ بسا اوقات محض ظن بھی انسان کے عمل پر اثر انداز ہوتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ تمام سانپ زہریلے نہیں ہوتے‘ لیکن محض اس ظن کی بنیاد پر کہ شاید یہ سانپ جس سے ہمیں سابقہ پیش آیا ہے‘ زہریلا ہو‘ ہم ہر سانپ سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ اگر دل میں اللہ کا یقین ہو‘ آخرت کا یقین ہو‘ جزا و سزا اور محاسبۂ اُخروی کا یقین ہو تو اس کا ایک نتیجہ لازماً مترتب ہوتا ہے۔ اور وہ نتیجہ ہے کہ جسے قرآن ’’عمل صالح‘‘ کے الفاظ سے تعبیر کرتا ہے۔ اس کا عمل درست ہو جائے گا‘ وہ اللہ تعالیٰ کے احکامات پر عمل پیرا ہو گا‘ حلال پر اکتفا کرے گا‘ حرام سے اجتناب کرے گا‘ معصیت کے قریب نہیں پھٹکے گا۔ یہ تمام کیفیات حقیقی ایمان کے نتیجے میں لازماً پیدا ہوں گی۔

ایمان اور عمل صالح کا باہمی تعلق

یہ بات جان لینی چاہیے کہ ایمان اور عمل صالح قانون کے درجے میں اگرچہ دو جداگانہ حقیقتیں ہیں لیکن حقیقت کی سطح پر یہ دونوں ایک وحدت بن جاتے ہیں۔ یہ اس طرح باہم لازم و ملزوم ہیں کہ

ایک کو دوسرے سے جدا کرنا ممکن نہیں! یہ ہے وہ بات جو نبی اکرمﷺ کی متعدد احادیث کے ذریعے وضاحت سے سامنے آتی ہے۔ مثلاً ایک حدیث میں‘ جسے امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے اور جس کے راوی حضرت ابو ہریرہؓ ہیں‘ حضورﷺ کے یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں:

((لَا یَزْنِی الزَّانِیْ حِیْنَ یَزْنِیْ وَھُوَ مُؤْمِنٌ وَلَا یَسْرِقُ السَّارِقُ حِیْنَ یَسْرِقُ وَھُوَ مُؤْمِنٌ وَلَا یَشْرَبُ الْخَمْرَ حِیْنَ یَشْرَبُھَا وَھُوَ مُؤْمِنٌ))(۱)

’’کوئی زانی حالت ایمان میں زنا نہیں کرتا‘ کوئی چور حالتِ ایمان میں چوری نہیں کرتا‘ کوئی شرابی حالت ایمان میں شراب نہیں پیتا۔‘‘

جس وقت کوئی شخص یہ کام کرتا ہے وہ دلی یقین کسی سبب سے زائل ہو چکا ہوتا ہے۔ اگر وہ دلی یقین موجود ہوتا تو ان افعال کا صدور ممکن نہ ہوتا۔ جب ہم چوراہے پر کسی ٹریفک کانسٹیبل کو کھڑا دیکھتے ہیں تو بلا ارادہ بھی ہماری گاڑی ٹھیک جگہ پر جا کر رک جاتی ہے‘ اس لیے کہ ہمیں معلوم ہے کہ یہاں کے نظم و نسق کا محافظ اور ذمہ دار شخص ہمیں دیکھ رہا ہے۔ اگر یہ یقین ہو کہ اللہ موجود ہے اور مجھے دیکھ رہا ہے تو کیسے ممکن ہے کہ میں اس کے کسی حکم کی خلاف ورزی کروں۔

ایمان اور عمل صالح کے باہمی لازم و ملزوم ہونے کا تعلق ایک اور متفق علیہ حدیث مبارکہ سے بھی سامنے آتا ہے۔ رسول اللہﷺ ارشاد فرماتے ہیں:

((وَاللّٰہِ لَا یُؤْمِنُ ‘ وَاللّٰہِ لَا یُؤْمِنُ ‘ وَاللّٰہِ لَا یُؤْمِنُ))

’’خدا کی قسم وہ شخص مؤمن نہیں‘ خدا کی قسم وہ شخص مؤمن نہیں‘ خدا کی قسم وہ شخص مؤمن نہیں۔‘‘

صحابہ کرامؓ لرز اٹھے ہوں گے۔ انہوں نے بہت ڈرتے ہوئے سوال کیا: ’’لِمَنْ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ؟‘‘ کہ حضور! یہ آپؐ کس کے بارے میں ارشاد فرما رہے ہیں؟ جواباً آپﷺ نے فرمایا:

((اَلَّذِیْ لَا یَاْمَنُ جَارُہٗ بَوَائِقَہٗ))(۲)

’’وہ شخص کہ جس کی ایذا رسانی سے اس کا پڑوسی امن میں نہیں۔‘‘

---

(۱) صحیح البخاری‘ کتاب الحدود‘ باب لا یشرب الخمر۔ مزید برآں بخاری میں متعدد مقامات پر یہ حدیث وارد ہوئی ہے۔ وصحیح مسلم‘ کتاب الایمان‘ باب بیان نقصان الایمان بالمعاصی ونفیه عن المتلبس بالمعصیة......(الفاظ صحیح مسلم کے ہیں)

(۲) صحیح البخاری‘ کتاب الادب‘ باب اثم من لا یأمن جاره بوایقه ۔ وصحیح مسلم‘ کتاب الایمان‘ باب بیان تحریم ایذاء الجار۔

یہ ہے تعلق ایمان اور عمل صالح کا' اور یہ ہے تعلق ایمان اور اخلاقِ صالحہ کا۔ ایک اور حدیث میں جو رسول اللہﷺ کے خادمِ خاص حضرت اَنس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' آپﷺ کے مندرجہ ذیل الفاظ نقل ہوئے ہیں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

قَلَّمَا خَطَبَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلَّا قَالَ : ((لَا اِيْمَانَ لِمَنْ لَّا اَمَانَةَ لَهٗ وَلَا دِيْنَ لِمَنْ لَّا عَهْدَ لَهٗ)) (۱)

''شاذ ہی کبھی ایسا ہوا ہوگا کہ رسول اللہﷺ نے کوئی خطبہ ارشاد فرمایا ہو اور اس میں آپؐ نے یہ الفاظ ارشاد نہ فرمائے ہوں: ''جس شخص میں امانت نہیں ہے اس کا کوئی ایمان نہیں ہے اور جس میں ایفاءِ عہد نہیں ہے اس کا کوئی دین نہیں ہے۔''

معلوم ہوا کہ ایمان اور عمل صالح کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ایمان اگر حقیقی اور فی الواقع قلبِ انسانی میں جاگزیں ہو گیا ہو تو ممکن نہیں ہے کہ انسان کی سیرت و کردار میں اس کی جھلک نظر نہ آئے۔ ایک اعتبار سے یہ وہی بات ہے جو سقراط نے کہی تھی کہ علم نیکی ہے اور جہالت بدی ہے۔ ایمان نام ہے علم حقیقت کا۔ انسان کے عمل کی درستی اس کا لازمی نتیجہ ہے۔

''تواصی'' کا مفہوم

اب آیئے آخری دو الفاظ کی طرف' یعنی ﴿وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ③﴾۔ الفاظ کے اس جوڑے میں لفظ ''تَوَاصَوْا'' دوبار آیا ہے۔ مناسب ہوگا کہ پہلے اس پر غور کر لیا جائے! یہ لفظ ''وصیت'' سے بنا ہے اور وصیت عربی زبان میں ہر اُس بات کو کہتے ہیں جو تاکید کے ساتھ کہی جائے۔ اردو زبان میں صرف کسی شخص کے انتقال کے وقت کی کہی ہوئی باتوں کو وصیت کہا جاتا ہے' لیکن عربی میں اس کا اطلاق ہر ایسی بات پر ہوتا ہے جو کسی بھی موقع پر تاکیداً کہی جائے۔ یہاں اس سورۂ مبارکہ میں یہ لفظ بابِ تفاعل میں آیا ہے۔ ''تواصی'' باب تفاعل سے مصدر ہے' اور اس باب کا خاصہ یہ ہے کہ اس میں جو الفاظ آتے ہیں ان میں ایک تو مبالغے کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے' یعنی کسی کام کو اہتمام کے ساتھ سرانجام دینا' اور دوسرے ان میں شراکت کا مفہوم شامل ہو جاتا ہے۔ یعنی باہم مل جل کر کسی کام کو سرانجام دینا۔ تو ''تواصی'' کا مفہوم یہ ہوگا کہ انتہائی اہتمام کے ساتھ باہم ایک دوسرے کو کسی بات کی تلقین کرتے رہنا۔ یہ تلقین ''حق'' کی بھی ہوگی اور ''صبر'' کی بھی. ﴿وَتَوَاصَوْا

(۱) مسند احمد' باقی مسند المکثرین ' باب مسند انس بن مالك۔

بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ﴿۳﴾

’’حق‘‘ ——— ایک وسیع المفہوم لفظ

’’حق‘‘ عربی زبان کا ایک وسیع المفہوم لفظ ہے۔ اس کے چار بنیادی مفاہیم بیان کیے جاتے ہیں: (۱) ہر وہ شے حق ہے جو فی الواقع موجود ہو۔ اس کے برعکس جو شے حقیقتاً موجود نہ ہو بلکہ محض سراب کی مانند نظر آ رہی ہو اُسے باطل کہا جائے گا۔ (۲) اسی طرح ہر وہ شے حق ہے جو عقلاً مسلّم ہو (۳) جو اخلاقاً واجب ہو' اور (۴) اسی طرح وہ شے بھی حق کہلائے گی جس میں کوئی مقصدیت پائی جائے۔

یہاں قرآن مجید نے لفظ ’’حق‘‘ استعمال کر کے تواصی بالحق کے مفہوم کو انتہائی وسعت دی ہے۔ چھوٹی سے چھوٹی حقیقت کے اعتراف و اعلان اور اُس کی تلقین اور تبلیغ سے لے کر اس کائنات کے بڑے سے بڑے حقائق کا ادراک و اعتراف اور ان کی تلقین و تبلیغ' یہ سب چیزیں تواصی بالحق میں شامل ہوں گی۔ گویا اگر کوئی شخص کسی دوسرے کی کچھ رقم جو اُس کے ذمے قرض تھی' ادا نہ کر رہا ہو اور آپ جا کر اس سے کہیں کہ بھلے آدمی! فلاں کی رقم واپس کر دو تو یہ بھی تواصی بالحق میں شامل ہوگا۔ اسی طرح اگر آپ نے کسی ایسے بچے کو جو اپنے والدین کے حقوق ادا نہیں کر رہا' یہ تلقین کی کہ اپنے والدین کا ادب کیا کرو' ان کا کہنا مانا کرو تو یہ بھی تواصی بالحق ہی کی ایک شکل ہے۔ اسی طور پر اس کائنات کی سب سے بڑی حقیقت کا اعلان و اعتراف کہ اللہ ہی خالق اور مالک ہے' اُس کا حق ہے کہ اُسی کی اطاعت کی جائے' اُس کا حق ہے کہ اُسی کا قانون نافذ ہو' تواصی بالحق کی بلندترین منزل ہے۔

تواصی بالحق اور تواصی بالصبر لازم وملزوم

تواصی بالحق کے ساتھ جڑا ہوا لفظ ہے ’’تواصی بالصبر‘‘ ——— یہ بات عام طور پر معروف ہے کہ سچ کڑوا ہوتا ہے (اَلْحَقُّ مُرٌّ)۔ اگر حق کی کوئی چھوٹی سی بات بھی کہی جائے تو بالعموم مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جیسا کہ میں نے مثال دی تھی کہ کسی شخص کو اگر کسی دوسرے شخص کا قرض ادا کرنا ہو اور آپ اس سے کہیں کہ بھلے آدمی اس کی رقم ادا کر دو' تو عین ممکن ہے کہ آپ کو یہ تیز و تند جواب ملے کہ آپ کون ہوتے ہیں ہمارے معاملے میں دخل دینے والے؟ تو حقیقت یہ ہے کہ حق کی کسی چھوٹی سی چھوٹی بات کا اعلان بھی آسان نہیں ہے۔ اس راہ میں لوگوں کی مخالفت کا سامنا کرنا ہوگا۔ بالخصوص بڑے حقائق کے اعلان' ان کی تبلیغ اور ان کی اشاعت تو بہت ہی صبر آزما کام ہے۔

یہ اس کے بغیر ممکن نہیں کہ انسان ہر نوع کے مصائب جھیلنے کے لیے ذہناً تیار ہو جائے اور جان لے کہ جس کام کا اس نے عزم کیا ہے وہ کانٹوں بھرا بستر ہے' پھولوں کی سیج نہیں!

ایمان اور عمل صالح کا تواصی بالحق اور تواصی بالصبر سے ربط

اب تک ہم نے سورۃ العصر میں بیان شدہ نجات کی چار شرائط کو دو دو کے دو جوڑوں میں تقسیم کر کے دیکھ لیا ہے کہ ایک طرف ایمان اور عمل صالح لازم وملزوم ہیں اور دوسری طرف تواصی بالحق اور تواصی بالصبر بھی باہم لزوم رکھتے ہیں۔ اب ان دو جوڑوں کے مابین جو رشتہ اور تعلق ہے اسے بھی سمجھ لیں تو بات پوری ہو جائے گی۔

یہ فطرت کا عام اصول ہے کہ کوئی شے نہ ماحول سے متأثر ہوئے بغیر رہ سکتی ہے نہ اسے متأثر کیے بغیر۔ برف میں جو خنکی ہے وہ اپنے ماحول میں لازماً سرایت کرے گی اور آگ کی حرارت اپنے ماحول کو لازماً گرم کر دے گی۔ یہی معاملہ اخلاقیات کے میدان میں ہے۔ اگر کسی انسان میں عمل صالح حقیقتاً پیدا ہو جائے تو وہ لازماً ماحول میں اثر ونفوذ کرے گا اور اس سے نیکی اور بھلائی لازماً پھیلے گی۔ گویا عملِ صالح کا فطری نتیجہ تواصی بالحق ہے۔

انسانی اخلاقیات میں یہ اصول اور بھی شدت کے ساتھ کارفرما ہوتا ہے۔ اگر اجتماعی ماحول خراب ہے تو اس کی خرابی لازماً افراد کی زندگیوں میں سرایت کرے گی۔ اور اس سے بچنے کی ایک ہی راہ ممکن ہے کہ ماحول کو تبدیل کر دیا جائے یا کم از کم اس کو تبدیل کرنے کی جدوجہد مسلسل جاری رکھی جائے۔ اس طرح اگر ماحول نہ بھی تبدیل ہو تو کم از کم وہ فرد ''جارحیت بہترین دفاع ہے'' (Offence is the best defence) کے اصول پر عمل پیرا ہو کر اپنا دفاع ضرور کر لے گا۔ اسی لیے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے :

> ((مَنْ رَأَى مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهِ ' فَإِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهِ ' فَإِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهِ ' وَذٰلِكَ اَضْعَفُ الْاِيْمَانِ)) (۱)
>
> ''تم میں سے جو کوئی کسی برائی کو دیکھے تو اس کا فرض ہے کہ اسے بزورِ بازو (نیکی سے) بدل دے' پھر اگر اس کی قوت نہ رکھتا ہو تو زبان سے ضرور منع کرے' اور اگر اس کی بھی طاقت نہ رکھتا ہو تو کم از کم دل سے ضرور مدافعت کرے (یعنی دل میں ضرور بُرا جانے اور اس کو نہ روک سکنے

---

(۱) صحیح مسلم' کتاب الایمان' باب بیان کون النهی عن المنکر من الایمان......

پر متأسف ہو) اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔''

پھر تواصی بالحق انسان کی شرافت کا بھی لازمی تقاضا ہے۔ اس لیے کہ جو حق کسی انسان پر منکشف ہوا ہے اور جسے خود اس نے اختیار کیا ہے اس کی انسان دوستی کا لازمی تقاضا ہے کہ اسے دوسروں کے سامنے بھی پیش کرے تاکہ زیادہ سے زیادہ انسان اس سے نفع اندوز ہوں اور اس کی برکتوں سے متمتع ہوسکیں۔ اسی لیے آنحضورﷺ نے فرمایا کہ: ((لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یُحِبَّ لِاَخِیْهِ مَا یُحِبُّ لِنَفْسِهٖ))(۱) یعنی تم میں سے کوئی شخص مؤمن نہیں قرار پاسکتا جب تک وہ اپنے بھائی کے لیے وہی کچھ پسند نہ کرے جو اپنے لیے کرتا ہے۔

اور آخری درجہ میں یہ انسان کی غیرت اور حمیت کا تقاضا بھی ہے کہ جس حق کو اُس نے خود قبول کیا ہے اس کا پرچار کرے' اس کا مبلّغ اور علم بردار بنے اور اس کا بول بالا کرنے کے لیے تن من دھن سے جدوجہد کرے۔

سیدھی سی بات ہے کہ اگر انسان ایک خاص طرز کو اختیار کرتا ہے اور ماحول کسی اور رنگ میں رنگا ہوا ہے تو فطری طور پر دو ہی صورتیں ممکن ہیں۔ ایک یہ کہ ع ''زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز'' کے مطابق خود بھی ماحول ہی کے رنگ میں رنگا جائے تاکہ دوئی ختم ہو جائے اور تصادم باقی نہ رہے' اور دوسرے یہ کہ ع ''زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز!'' کی روش اختیار کرکے اور ماحول سے ٹکر لے کر اسے اپنے رنگ میں رنگنے کی کوشش کرے۔ اب ظاہر ہے کہ ایک شریف' باوقار' غیور اور باحمیت انسان تو صرف ایک ہی راہ اختیار کرسکتا ہے' اور وہ دوسری ہے نہ کہ پہلی۔ وہ اس کو تو گوارا کر لے گا کہ ع ''بازی اگرچہ پا نہ سکا سر تو کھو سکا!'' کے مصداق اپنی جان دے دے' لیکن اسے ہرگز گوارا نہیں کرسکتا کہ تن آسانی اور عافیت کوشی کی راہ پر چل کر حق سے غداری کا مرتکب ہو جائے۔

الغرض — جس اعتبار سے بھی دیکھا جائے تو نظر یہی آتا ہے کہ ایمان' عمل صالح' تواصی بالحق اور تواصی بالصبر ایک جانب تو نجات کے ناگزیر لوازم ہیں اور دوسری جانب خود باہم لازم و ملزوم ہیں' بلکہ ان چاروں پر علیحدہ علیحدہ قدرے گہرائی میں اتر کر غور کرنے سے جو حقیقت منکشف ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ چاروں ایک ہی وحدت کے ناقابل تقسیم پہلو ہیں اور ایک ہی کل کے اجزائے غیر

---

(۱) صحیح البخاری' کتاب الایمان' باب من الایمان ان یحب لاخیه ما یحب لنفسه۔ وصحیح مسلم' کتاب الایمان' باب الدلیل علی ان من خصال الایمان ان یحب لاخیه المسلم ما یحب لنفسه من الخیر۔

منفک ہے۔ گویا ایمان، عمل صالح، تواصی بالحق اور تواصی بالصبر، بقول اقبال مرحوم ع ''یہ سب کیا ہیں فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں''۔ ایمان اگر حقیقی ہو جائے تو اس سے عمل صالح ضرور پیدا ہوگا۔ اور عمل صالح اگر پختہ ہو جائے تو لازماً تواصی بالحق پر منتج ہوگا۔ اور تواصی بالحق اگر واقعی اور حقیقی ہے تو تواصی بالصبر کا مرحلہ لازماً آ کر رہے گا۔ یہاں تک کہ اس کی عکسی صورت (converse proposition) بھی بالکل درست ہے۔ یعنی یہ کہ تواصی بالصبر کا مرحلہ نہیں پیش آیا تو یہ قطعی ثبوت ہے اس کا کہ دعوت پورے حق کی نہیں ہے، بلکہ اس کے صرف کسی بے ضرر سے جزو کی ہے، اور اگر دعوت کا مرحلہ نہیں آتا تو یہ حتمی ثبوت ہے اس کا کہ انسان کا اپنا عمل صحیح اور پختہ نہیں ہے، اور اگر عمل درست نہیں ہو رہا تو یہ یقینی ثبوت ہے اس کا کہ ایمانِ حقیقی ہی موجود نہیں۔

گویا سورۃ العصر نجات کی جس شاہراہ کی طرف راہنمائی فرماتی ہے اور انسانی کامیابی کے لیے جس صراطِ مستقیم کی نشان دہی کرتی ہے اس کے چار سنگ ہائے میل ہیں۔ پہلا ایمان، دوسرا عمل صالح، تیسرا تواصی بالحق اور چوتھا تواصی بالصبر۔

ایک کامل مثال — اُسوۂ محمد ﷺ

اس کی کامل اور مکمل مثال ہے محمدٌ رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ، جس میں یہ چاروں چیزیں اپنی بلندترین شان کے ساتھ بتمام وکمال موجود ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے سب سے پہلے اپنی اور کائنات کی حقیقت پر مطلع ہونا چاہا اور جب از روئے ﴿وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ۝٧﴾ (الضحیٰ) جبریل امین نے حقائق کا کامل انکشاف کیا تو اس کی تصدیق کی اور ایمان لے آئے۔ جیسے کہ قرآن مجید میں فرمایا گیا: ﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ﴾ (البقرۃ: ۲۸۵) ''ایمان لایا رسول اُس پر جو نازل کیا گیا اُس پر اُس کے ربّ کی جانب سے اور ایمان لائے اہل ایمان۔''

دوسری طرف آپ ﷺ کی زندگی اخلاقِ حسنہ کا کامل نمونہ اور خلق عظیم کا شاہکار تھی۔ جیسے کہ فرمایا گیا: ﴿وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۝٤﴾ (القلم) یعنی آپؐ یقیناً نہایت اعلیٰ اخلاق کے حامل اور اخلاق کے بلندترین مقام پر فائز ہیں۔

ایمان اور عمل صالح کے ان بنیادی تقاضوں کو بتمام وکمال پورا کرنے کے بعد پھر مسلسل تیئیس برس نبی اکرم ﷺ نے حق کی دعوت اور ذاتِ سبحانہ وتعالیٰ کی کبریائی کے اعلان ونفاذ کی اَن تھک جدوجہد میں صرف کیے اور اس راہ میں ہر تکلیف سہی‘ ہر مصیبت کو برداشت کیا‘ ہر مشکل کو جھیلا اور ہر مخالفت کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ چنانچہ شعب بنی ہاشم میں تین سال کی شدید ترین قید کی صعوبت بھی سہی‘ طائف کے بازاروں میں اوباشوں کی فقرہ بازی اور سنگ باری بھی برداشت کی‘ بدر اور اُحد میں خود اپنے دندانِ مبارک کے علاوہ اپنے قریب ترین اعزّہ اور عزیز ترین جاں نثاروں کی جانوں کا ہدیہ بھی بارگاہِ ربّانی میں پیش کیا اور تیئیس برس کی شبانہ روز محنت اور مشقت سے بالآخر حق کا بول بالا کر دیا اور خدا کے دین کو جزیرہ نمائے عرب میں غالب کر کے ہی رفیق اعلیٰ کی طرف مراجعت اختیار فرمائی۔ **فصلی اللّٰہُ علیه وعلی آله واصحابه وسلَّم تسلیماً کثیرًا کثیرًا**۔ گویا آنحضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ سورۃ العصر کی مجسم تفسیر ہے! فداہ ابی واُمّی۔

تو حضرات! یہ ہے سورۃ العصر کے مفہوم کی مختصر تشریح۔ اب آپ کو اچھی طرح سے اندازہ ہو گیا ہو گا کہ کیوں میں نے اسے قرآن مجید کی جامع ترین سورت قرار دیا تھا‘ اور کیوں امام شافعی رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ اگر لوگ غور وفکر سے کام لیں تو تنہا یہی مختصر سورت ان کی ہدایت ورہنمائی کے لیے کافی ہے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ ربّ العالمین OO

☆☆☆

درس 2

نیکی کی حقیقت

اور

تقویٰ کا قرآنی معیار

آیۃُ البِر

یعنی سُورَۃُ البَقَرَۃ کی آیت ۱۷۷ کی روشنی میں

درس ۲

نیکی کی حقیقت

اور

تقویٰ کا قرآنی معیار

آیۃُ البِرّ (یعنی سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۷۷) کی روشنی میں

نحمدہٗ ونصلی علٰی رَسولِہِ الکریم ...... امَّا بَعد:

فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْھَکُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰکِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِکَۃِ وَالْکِتٰبِ وَالنَّبِیّٖنَ ۚ وَاٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّہٖ ذَوِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ ۙ وَالسَّآئِلِیْنَ وَفِی الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوۃَ وَاٰتَی الزَّکٰوۃَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَھْدِھِمْ اِذَا عٰھَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیْنَ الْبَاْسِ ؕ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا ؕ وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴿۱۷۷﴾﴾

مطالعۂ قرآن حکیم کے جس منتخب نصاب پر اِس سلسلۂ مضامین میں گفتگو ہو رہی ہے اس کا پہلا درس سورۃ العصر پر مشتمل ہے اور دوسرا درس ''آیۂ بر'' پر مشتمل ہے جو سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۷۷ ہے اور مصحف میں دوسرے پارے کے چھٹے رکوع کے آغاز میں وارد ہوئی ہے۔ اس آیت کے بارے میں بعض ابتدائی اور تمہیدی باتوں پر غور کرنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے اس کا ایک رواں ترجمہ ہمارے سامنے آجائے۔ اس آیۂ مبارکہ کا رواں اور سلیس ترجمہ یہ ہوگا:

''نیکی یہی نہیں ہے کہ تم اپنے چہرے مشرق اور مغرب کی طرف پھیر دو' بلکہ اصل نیکی اس کی ہے

جو ایمان لایا اللہ پر' اور یومِ آخر پر' اور فرشتوں پر' اور کتابوں پر اور انبیاء پر۔ اور دیا اس نے مال اس کی محبت کے علی الرغم رشتے داروں کو' اور یتیموں کو' اور محتاجوں کو' اور مسافر کو' اور سائلوں کو اور گردنوں کے چھڑانے میں۔ اور قائم کی اس نے نماز اور ادا کی زکوٰۃ۔ اور پورا کرنے والے اپنے عہد کے جبکہ کوئی باہم معاہدہ کر لیں۔ اور بالخصوص صبر کرنے والے فقر و فاقہ میں' تکالیف و مصائب پر اور جنگ کے وقت۔ یہی ہیں وہ لوگ کہ جو واقعتاً راست باز ہیں' اور یہی ہیں وہ لوگ جو حقیقتاً متقی ہیں۔''

اس آیۂ مبارکہ کے بارے میں اس ترجمے کو ذہن میں رکھ کر اب چند باتیں نوٹ کیجیے:

۱) سب سے پہلی بات یہ کہ یہ ایک آیت ہے جبکہ اس منتخب نصاب میں پہلا سبق ایک سورۃ پر مشتمل تھا' لیکن یہ آیت اس کے مقابلے میں حجم کے اعتبار سے کئی گنا بڑی ہے۔ اس کے حوالے سے یہ بات ذہن نشین کر لیجیے کہ قرآن حکیم میں آیات چھوٹی بھی ہیں بڑی بھی۔ صرف ایک لفظ پر مشتمل بھی آیت ہے' جیسے: ﴿وَالْعَصْرِ ①﴾ آیت مکمل ہوگئی۔ بلکہ صرف حروفِ مقطّعات پر مشتمل بھی آیات ہیں' اور طویل آیات بھی ہیں کہ جن میں سے ایک کا اِس وقت ہم مطالعہ کر رہے ہیں۔ اسی طرح سورتیں چھوٹی بھی ہیں اور بڑی بھی۔ سورۃ العصر بہت مختصر ہے' جبکہ سورۃ البقرۃ ۲۸۶ آیات پر مشتمل اور اڑھائی پاروں پر پھیلی ہوئی ہے۔ یہ تمام امور اصطلاحاً توقیفی کہلاتے ہیں۔ یعنی ان میں کسی گرامر کے اصول کو یا کسی منطق کے قاعدے کو دخل نہیں ہے۔ اسی طرح نہ یہ انسانی اجتہاد پر مبنی ہیں اور نہ ہی ان کا انسان کی سوچ یا قیاس پر مدار ہے' بلکہ یہ امور ہمیں نبی اکرم ﷺ کے بتانے سے معلوم ہوئے ہیں۔ گویا کہ یہ موقوف ہیں حضور ﷺ کے بتانے پر۔ ایسے تمام امور توقیفی کہلاتے ہیں۔

۲) دوسری بات یہ ہے کہ جہاں تک اس آیۂ مبارکہ کے مضامین کا تعلق ہے' اگر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اور سورۃ العصر کے مضامین میں بڑی گہری مناسبت اور مشابہت ہے۔ سورۃ العصر میں ہمارے سامنے انسان کی فوز و فلاح کے چار لوازم آئے تھے: (۱) ایمان (۲) عمل صالح (۳) تواصی بالحق اور (۴) تواصی بالصبر۔ اب ذرا اس آیت پر غور کیجیے۔ سورۃ العصر میں ایک جامع اصطلاح عنوان کے طور پر آئی تھی ''ایمان''۔ یہاں پانچ ایمانیات کا ذکر ہے: ﴿وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ﴾۔ اس کی تشبیہ ایک کلی کی سی ہے جو ابھی کھلی نہ ہو۔ اس میں پتیاں تو ہوتی ہیں لیکن نمایاں نہیں ہوتیں۔ وہ کھلتی ہے اور پھول بنتا ہے تو

پتیاں ظاہر ہو جاتی ہیں۔اسی طرح لفظ ’’ایمان‘‘ میں یہ تمام مضامین موجود ہیں‘ لیکن سورۃ العصر میں وہ ایک بند کلی کی مانند ہیں۔اس آیۂ مبارکہ میں ہم نے دیکھا کہ وہ کلی کھِل گئی‘ پھول سامنے آگیا اور پانچ پتیاں نمودار ہوگئیں۔گویا ایمان کسے کہتے ہیں؟ اللہ پر ایمان‘ ملائکہ پر ایمان‘ یوم آخر پر ایمان‘ کتابوں پر ایمان‘ انبیاء پر ایمان۔

سورۃ العصر کا دوسرا جامع عنوان تھا ’’عملِ صالح‘‘۔ اس کی کوئی تفصیل وہاں ممکن نہیں تھی۔ یہاں اگر غور کریں تو عمل صالح کے اس جامع عنوان کے تحت تین ذیلی عنوان قائم کیے جا سکتے ہیں۔سب سے پہلا ہوگا ’’انسانی ہمدردی اور خدمتِ خلق‘‘ کا عنوان۔یعنی انسان اپنے گاڑھے پسینے کی کمائی ہوئی اپنی دولت‘ جو اُسے طبعاً مرغوب اور محبوب ہے‘ اسے وہ اِس طبعی محبت کے علی الرغم اپنے ابنائے نوع کی تکلیف کو دُور کرنے میں صرف کر سکے۔دوسرا ذیلی عنوان بن جائے گا ’’عبادات یا حقوق اللہ‘‘ کا‘ جن میں نماز اور زکوٰۃ کا ذکر آ گیا۔تیسرا ذیلی عنوان ہوگا ’’معاملات‘‘ کا‘ اس لیے کہ ایفائے عہد کا بنیادی تعلق معاملاتِ انسانی سے ہے۔ہمارے تمام معاملات خواہ لین دین اور کاروبار کے قبیل سے ہوں‘ خواہ آجر و مستأجر کے تعلق کے ذیل سے‘ ان کی حیثیت معاہدوں کی سی ہوتی ہے۔اسی طرح شادی بھی ایک سماجی معاہدہ ہے۔گویا تمام انسانی معاملات کی اصل بنیاد عہد اور معاہدے پر قائم ہے۔لہٰذا اگر کسی معاشرے میں ایفائے عہد پیدا ہو جائے تو یوں سمجھئے کہ انسانی تعلقات کی stream lining ہو جائے گی اور جملہ انسانی تعلقات کا معاملہ درست ہو جائے گا۔

سورۃ العصر میں ’’عمل صالح‘‘ ایک جامع اصطلاح تھی۔ یہاں اس کے تین ذیلی عنوانات ہمارے سامنے آئے۔اس کی مثال بالکل ایسے ہے جیسے ایک درخت کے تنے سے تین بڑی بڑی شاخیں نکلیں۔گویا عمل صالح جو سورۃ العصر میں آیا‘ وہ تنے کی مانند ہے اور اس سے جو تین بڑی بڑی شاخیں اس سورۂ مبارکہ میں نکلتی نظر آ رہی ہیں وہ ہیں انسانی ہمدردی اور خدمتِ خلق‘ حقوق اللہ اور عبادات‘ اور معاملاتِ انسانی اور ایفائے عہد۔

سورۃ العصر کے آخر میں تواصی بالحق کا ذکر ہے‘ اور یہ آیت بھی ختم ہو رہی ہے ان الفاظ مبارکہ پر: ﴿وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ۭ﴾ ’’اور بالخصوص صبر کرنے والے فقر و فاقہ میں‘ تکالیف و مصائب پر اور جنگ کے وقت‘‘۔اور صبر کے مقامات یا مواقع میں سے بھی تین کا ذکر کر دیا گیا ہے‘ جیسے عمل صالح کے تین ذیلی عنوانات آئے تھے۔صبر کے تین مواقع میں سے پہلا

''البأساء'' ہے۔''بأساء'' کہتے ہیں فقر وفاقہ اور تنگی کو۔دوسرا ''الضَّرَّاء'' ہے۔یہ ضرر سے بنا ہے 'یعنی تکلیف' خواہ وہ جسمانی اذیت ہو' خواہ ذہنی کوفت۔پھر ظاہر ہے کہ صبر ومصابرت اور ثبات و استقلال کے اصل امتحان کا آخری میدان' میدانِ جنگ ہے' جہاں انسان جان کی بازی کھیلتا ہے اور نقدِ جان ہتھیلی پر رکھ کر اُس کو خطرے میں ڈالتے ہوئے میدان میں آتا ہے۔

گویا سورۃ العصر کے ساتھ اس آیت کے مضامین کا بڑا گہرا ربط ہے اور اسی مناسبت سے ہم نے اس منتخب نصاب میں اس کو سبق نمبر۲ کی حیثیت سے شامل کیا ہے۔

دوسری غور طلب بات یہ ہے کہ اس آیۂ مبارکہ کا اصل مضمون کیا ہے؟اس کا آغاز ہوتا ہے ﴿لَيۡسَ الۡبِرَّ اَنۡ تُوَلُّوۡا وُجُوۡهَكُمۡ قِبَلَ الۡمَشۡرِقِ وَالۡمَغۡرِبِ﴾ کے الفاظ سے۔یعنی ''نیکی یہی نہیں ہے کہ تم اپنے چہروں کو مشرق ومغرب کی طرف پھیر لو''۔گویا نیکی کے ایک محدود تصور کی نفی سے بات شروع ہوئی اور اس کے بعد نیکی کا ایک جامع اور مکمل تصور پیش کیا گیا کہ:﴿وَلٰـكِنَّ الۡبِرَّ مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَالۡمَلٰٓـئِكَةِ وَالۡكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الۡمَالَ......الآية﴾ لہٰذا یہی اس آیۂ مبارکہ کا اصل موضوع اور مضمون ہے۔

مضمون کی اہمیت

اب سب سے پہلے تو اس موضوع کی اہمیت پر غور کر لینا چاہیے! دیکھئے' جس طرح ہمارا مادّی وجود ہے' اس کے لیے کچھ چیزیں بنیادی لوازم کی حیثیت رکھتی ہیں' جن کے بغیر ہماری زندگی کا تسلسل برقرار نہیں رہ سکتا۔مثلاً ہوا' پانی اور غذا کے بغیر زندگی کا کوئی تصور نہیں۔بالکل اسی طرح انسان کی ایک معنوی زندگی ہے جس کے لیے اس کی انا یا خودی کا زندہ اور برقرار رہنا ضروری ہے' اور اس کے لیے یہ چیز لازمی ہے کہ ہر انسان نیکی کے کسی نہ کسی تصور کو اختیار کرے اور اس کے ذریعے اپنے ضمیر کو مطمئن کرے' خواہ وہ زندگی کے دوسرے پہلوؤں کے اعتبار سے کتنا ہی بُرا انسان ہو۔گویا یہ انسان کی ناگزیر مجبوری ہے کہ وہ نیکی کا کوئی نہ کوئی کھاتہ اپنی زندگی میں کھولے اور اپنے ضمیر کو مطمئن کرے کہ اگرچہ میرے اندر یہ اور یہ برائی ہے تاہم میں فلاں فلاں نیکی کے کام بھی تو کرتا ہوں۔مزید برآں وہ اپنی برائیوں کو justify اور rationalize بھی کرتا ہے کہ میں جس برائی میں مبتلا ہوں اس کے لیے میری یہ مجبوری ہے اور وہ مجبوری ہے' اور اس طرح وہ اپنے ضمیر کی خلش کو مٹاتا اور اپنے ضمیر کو مطمئن کرتا ہے۔چنانچہ ہمارے معاشرے کے جو طبقات اخلاقی اعتبار سے سب سے زیادہ گرے

ہوئے شمار ہوتے ہیں ان کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ نیکی کا کوئی نہ کوئی تصور اُن کے ہاں بھی موجود ہے۔ چنانچہ ڈاکوؤں‘ رسہ گیروں‘ جیب کتروں‘ حتیٰ کہ جسم فروشی کرنے والی فاحشہ عورتوں کے یہاں بھی ثواب اور پُن کے باقاعدہ کھاتے کھلے ہوتے ہیں۔

یہ تو مَیں نے اُن طبقات کی بات کی ہے جن کے بارے میں کسی کی رائے بھی اچھی نہیں ہے۔ اس سے ذرا آگے آیئے! تین طبقات آپ کو شرفاء میں ملیں گے کہ جن کے نیکی کے تصورات ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ مثلاً ہمارے ہاں ایک طبقہ کچھ کاروباری حضرات اور تاجر پیشہ لوگوں پر مشتمل ہے۔ یہ لوگ دیندار ہیں۔ نماز‘ روزہ‘ زکوٰۃ‘ حج وعمرہ‘ مدارسِ دینی کی خدمت‘ علماء کی خدمت وغیرہ امور میں یہ لوگ پیش پیش ہیں۔ لیکن‘ اِلاّ ماشاءاللہ‘ اس طبقے کی ایسی باتیں بھی سامنے آئیں گی کہ ٹیکس بچانے کے لیے غلط حساب کتاب بھی ہو رہا ہے‘ بلیک مارکیٹنگ اور اسمگلنگ بھی ہو رہی ہے‘ ذخیرہ اندوزی بھی ہے‘ ملاوٹ بھی ہے اور سودی معاملات میں بھی ملوث ہیں۔ اسی طریقے سے کبھی محسوس ہو گا کہ اگرچہ ویسے تو نمازی ہیں‘ حاجی ہیں‘ نیک بھی ہیں‘ لیکن ساتھ ہی بڑے کٹھور دل بھی ہیں‘ دل میں نرمی والی کیفیت موجود نہیں۔ گویا ایک ملغوبہ ہے کہ ایک طرف بھلائی ہے‘ نیکی ہے‘ خیر ہے‘ اور اس کے ساتھ بعض چیزیں وہ ہیں جو اخلاقی اور دینی اعتبار سے حددرجہ نامناسب ہیں۔ ایک دوسرا طبقہ جدید تعلیم یافتہ لوگوں کا ملے گا۔ وہاں یہ بات آپ کے سننے میں آئے گی کہ اصل نیکی تو یہ ہے کہ انسان اپنے فرائضِ منصبی صحیح طور پر ادا کرے۔ باقی رہا نماز‘ روزہ وغیرہ کا معاملہ تو یہ اس کا نجی اور ذاتی معاملہ ہے۔ اگر کوئی کرتا ہے تو اپنے لیے کرتا ہے‘ اگر نہیں کرتا تو بہرحال یہ بھی اس کا ذاتی معاملہ ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ تصورِ نیکی بالکل برعکس ہے اس تصورِ نیکی سے جس کا پہلے بیان ہوا۔

ایک اور عدم توازن اس صورت میں نظر آ جائے گا کہ اکثر لوگوں کی دین کے ظاہری اور رسمی پہلوؤں پر تو بڑی کڑی نگاہ ہے‘ اس کے بارے میں حساس بھی بہت ہیں‘ ذرا سی کمی بیشی کو بھی گوارا کرنے کو تیار نہیں‘ لیکن جو روحِ دین ہے‘ اصل تقویٰ ہے‘ اصل خدا ترسی ہے‘ اس پر بالکل کوئی توجہ نہیں۔ نیکی کے یہ مختلف تصورات آپ کو خود اپنے معاشرے میں ملیں گے۔

میں نے جس آخری بات کا ذکر کیا ہے اسی کے حوالے سے یہ آیۂ مبارکہ شروع ہوتی ہے۔ نماز کا ایک ظاہر ہے‘ اس میں آپ قبلہ رُو کھڑے ہوتے ہیں۔ یہ اس کے ظاہر کا ایک جزو ہے اور اس کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے۔ لیکن جب کچھ لوگوں میں ظواہر ہی کی اہمیت رہ جاتی ہے اور جو اصل روحِ

نماز ہے اس پر سے توجہ کم ہو جاتی ہے تو پھر وہ غیر متوازن کیفیت ظہور میں آتی ہے جو اصلاً مطلوب نہیں۔ اسی کو علامہ اقبال نے کہا: ؎

شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا سجود بھی حجاب' میرا قیام بھی حجاب!

اور: ؎

عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اوّلیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصورات!

اس تصورِ نیکی کی نفی سے بات شروع ہوئی اور اس نفی کے بعد اثبات آیا ہے کہ اصل نیکی کیا ہے اور نیکی حقیقتاً کسے کہتے ہیں!

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے' اس آیۂ مبارکہ میں نیکی کے ایک سطحی اور محدود تصور کی نفی سے بات شروع ہوئی اور پھر نیکی کا جامع اور ہمہ گیر تصور بیان فرمایا گیا۔ گویا اس آیت کا اسلوب وہی ہے جو ہمارے کلمۂ طیبہ کے پہلے جزو کا ہے۔ یعنی کلام کا آغاز نفی سے ہوتا ہے جو اثبات کی طرف رہنمائی کرتی ہے' جیسے لا الٰہ کی نفی سے بات شروع ہوئی اور اِلاَّ اللّٰہ کے اثبات پر ختم ہوئی۔ بعینہٖ یہی معاملہ اس آیۂ مبارکہ کا ہے کہ ''لَيْسَ الْبِرَّ '' سے نفی کا آغاز ہوا اور پھر ''وَلٰــكِنَّ الْبِرَّ '' سے ''هُمُ الْمُتَّقُوْنَ '' تک مثبت انداز میں نیکی اور تقویٰ کا معیار بیان فرما دیا گیا۔

''بِرّ'' کے لفظی معنی

اب لفظ ''بِرّ'' پر غور کیجیے جس کے معنی کو ہم نے نیکی کے لفظ سے تعبیر کیا ہے' لیکن اس لفظ کی اصل روح کیا ہے' اور نیکی سے اس کی مناسبت کیا ہے' اِن امور پر گہرے غور و فکر کی ضرورت ہے۔ اس کے حروفِ اصلیہ ہیں: ''ب . ر . ر''۔ اسی مادے سے لفظ ''بِـــــرّ'' بنا ہے اور اسی سے ایک دوسرا لفظ ''بَر'' بنا ہے۔ چنانچہ ''بحر و بر'' اردو میں عام طور پر مستعمل ہے اور تمام اردو دان جانتے ہیں کہ بَر کے معنی خشکی کے ہیں۔ لفظ ''بِــر'' اور ''بَــر'' میں جو قدرِ مشترک ہے پہلے اس کو سمجھ لیجیے۔ انسان جب سمندر میں ہوتا ہے تو ہچکولے لگتے ہیں' سمندری طوفان کا اندیشہ رہتا ہے اور انسان کو ایک تشویش لاحق رہتی ہے۔ اسے وہ اطمینان و سکون حاصل نہیں ہوتا جو خشکی پر ہوتا ہے' لیکن انسان جب ساحل پر اترتا ہے اور جیسے ہی اس کے پاؤں بَــر (خشکی) پر لگتے ہیں اطمینان و سکون کی ایک کیفیت اسے فی الفور

حاصل ہو جاتی ہے۔ یہی اطمینان وسکون اس لفظ کی اصل روح اور جان ہے۔ میں یہ عرض کر چکا ہوں کہ انسان کے وہ اعمال جو اسے قلبی سکون عطا کرتے ہیں' جو ضمیر کی خلش کو مٹاتے ہیں' جو تسکینِ باطنی کا موجب ہوتے ہیں' انہی کو ہم نیکی کے عنوان سے منسوب کرتے ہیں۔ انگریزی کی ایک نظم میں جس کا عنوان ''Charity'' ہے' یہ تصور اور تخیّل بڑی عمدگی سے بیان ہوا ہے:

Charities that soothe and heal and bless.
Are scattered over the feet of men like flowers.
No mystery is here no special boon.
For the high and not for the low.
The smoke ascends as high from the hearth of a humble cottage.
As from that of a haughty palace.

''وہ تمام نیکیاں اور بھلائیاں جو سکون بخشتی ہیں اور زخموں کو مندمل کرتی ہیں اور رحمت کا باعث بنتی ہیں' انسان کے قدموں پر پھولوں کی طرح بکھری ہوئی ہیں۔ اس معاملے میں نہ کوئی راز کی بات ہے اور نہ ہی کسی پر خصوصی نوازش وکرم' بلکہ ان کا معاملہ بالکل اس دھوئیں کی مانند ہے جو کسی غریب کی کٹیا کے چولہے سے بھی اسی طرح بلند ہوتا ہے جیسے کسی مغرور انسان کے محل کے آتشدان سے!''

گویا نیکی میں' خیر میں' بھلائی میں' خدمتِ خلق میں ایک عجیب تسکین بخش کیفیت ہوتی ہے' بالکل ایسی جیسے کہ کسی زخم پر مرہم کا پھایا رکھ دیا جائے۔ چنانچہ یہی قدرِ مشترک ہے ''بِـرّ'' اور ''بَـرّ'' کے مابین!

نیکی اور ایمان کا باہمی تعلّق

اس آیۂ مبارکہ پر تدبّر کے ضمن میں جو پہلی بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ نیکی کی بحث میں سب سے پہلے ایمان کا ذکر کیوں ہو رہا ہے۔ بظاہر یہ بات ہمارے عام تصورات کے اعتبار سے کچھ اَنمل اور بے جوڑ سی معلوم ہوتی ہے۔ اس لیے کہ ہم تو نیکی کا تعلق عمل سے سمجھتے چلے آ رہے ہیں' یہ ایمان کی بحث یہاں کیسے آ گئی! پھر یہ کہ یہاں صرف ایمان باللہ ہی نہیں' چند اور ایمانیات کا ذکر بھی شدّ ومدّ کے ساتھ ہو رہا ہے۔ قابلِ غور بات یہ ہے کہ ان ایمانیات کا نیکی کی بحث کے ساتھ کیا معنوی تعلق ہے!

سب جانتے ہیں کہ فلسفۂ اخلاق عمرانیات کا ایک مستقل اور نہایت اہم شعبہ ہے۔ مزید برآں اس فلسفۂ اخلاق میں دو سوالات بنیادی ہیں۔ پہلا یہ کہ اخلاقی اقدار کیا ہیں؟ اور آیا وہ مستقل اور دائم

ہیں یا اُن میں حالات کے بدلنے اور زمانہ کے گزر جانے سے کوئی تغیر و تبدّل ہوتا ہے؟ دوسرا بنیادی سوال اس سے بھی زیادہ اہم ہے اور وہ یہ کہ وہ قوتِ محرکہ کون سی ہے جو انسان کو نیکی پر کاربند رکھے' خواہ اس میں فوری طور پر نقصان یا تکالیف کا سامنا ہو؟ ہمارا مشاہدہ ہے کہ حسّاس اور طبّاع شاعر انسانی احساسات کو خوبصورتی سے بیان کرتے ہیں۔ چنانچہ اس جذبۂ محرکہ کے ضمن میں مرزا غالبؔ نے بڑی پیاری بات کہی ہے کہ: ؎

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت اِدھر نہیں آتی!

اور حالیؔ نے مجبوری اور لاچاری کی نیکی اور پارسائی پر نہایت خوبصورت پھبتی چست کی ہے کہ: ؎

رکا ہاتھ جب' پارسا ہو گئے ہم
نہیں پارسائی' یہ ہے نارسائی!

گویا سوال یہ ہے کہ شر اور شرارت پر قادر ہونے کے باوجود' جب کہ اس میں فوری لذت یا نفع بھی ہو' انسان کی طبیعت کو خیر اور زہد کی طرف لانے والی شے کون سی ہے؟ ایک شخص کو معلوم ہے کہ جھوٹ بولنا بُرا ہے' لیکن وہ دیکھ رہا ہے کہ جھوٹ بولنے پر مجھے کچھ نفع حاصل ہو سکتا ہے' اب وہ کون سی چیز ہے جو اسے جھوٹ بولنے سے باز رکھے اور سچ بولنے پر آمادہ کرے' خواہ سچ بولنے میں نقصان نظر آ رہا ہو؟

جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے اس ضمن میں قرآن حکیم کا فلسفہ یہ ہے کہ نیکی اور بدی کا بنیادی شعور فطرتِ انسانی میں موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جس طرح انسان کو ظاہری استعدادات دی ہیں' جیسے سماعت' بصارت' قوتِ گویائی' تعقّل اور اسی نوع کی دوسری استعدادات ہیں' ویسے ہی فطرتِ انسانی میں کچھ باطنی استعدادات بھی مضمر ہیں جن کو دے کر انسان دنیا میں بھیجا گیا ہے۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ فطری طور پر جانتا ہے کہ نیکی کیا ہے اور بدی کیا ہے۔ سورۃ الشمس میں اس کو اس طرح بیان کیا گیا ہے: ﴿وَنَفۡسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝ فَاَلۡهَمَهَا فُجُوۡرَهَا وَتَقۡوٰىهَا ۝﴾ ''اور شاہد ہے نفسِ انسانی اور جو اِس کو سنوارا اور بنایا (اور جو اِس کی نوک پلک درست کی)۔ پھر اس میں الہامی طور پر فجور و تقویٰ (خیر و شر) کا علم ودیعت کر دیا۔'' اسی لیے نیکی کے لیے قرآن مجید کی ایک کثیر الاستعمال اصطلاح ''معروف'' ہے' یعنی جانی پہچانی چیز' اور بدی کے لیے ''منکر'' ہے' یعنی اجنبی سی بات' جسے فطرتِ انسانی قبول نہیں کرتی اور اس سے اِباء کرتی ہے۔ قرآن مجید کے نزدیک یہ دائمی اَقدار

ہیں۔ چنانچہ سچ بولنا ہمیشہ سے نیکی تصور کیا گیا ہے اور آج بھی اسے نیکی سمجھا جاتا ہے۔ جھوٹ بولنے والے کا ضمیر یہ محسوس کر رہا ہوتا ہے کہ وہ ایک بُرا کام کر رہا ہے۔ خواہ وہ اپنے آپ کو کسی مجبوری کے حوالے سے قائل کر لے' لیکن دل کی گہرائی میں جانتا ہے کہ میں ایک بُرا کام کر رہا ہوں۔ الغرض یہ دائمی اور بدیہی اقدار ہیں۔ علامہ اقبال مرحوم کا یہ شعر نیکی اور بدی کے ان بنیادی تصورات کے ضمن میں صد فی صد راست آتا ہے کہ: ؎

زمانہ ایک' حیات ایک' کائنات بھی ایک
دلیلِ کم نظری قصۂ قدیم و جدید!

مادّی احوال بدلتے رہتے ہیں' سطحی سے تغیر و تبدّل ہوتے رہتے ہیں' تہذیب و تمدن میں ارتقاء ہوتا رہتا ہے' لیکن فطرتِ انسانی کے محکمات اور بدیہیات غیر متبدّل اور دائم و قائم ہیں۔

دوسری بات کے لیے میں مغربی فلاسفروں میں سے کانٹ کا حوالہ دوں گا۔ اس نے ''Critique of Pure Reason'' کے نام سے جو پہلی کتاب لکھی اس میں اس نے ثابت کیا کہ وجودِ باری تعالیٰ کے لیے اہل منطق نے جتنے دلائل فراہم کیے ہیں' ان کو خود منطق کاٹ دیتی ہے۔ اُن میں سے کوئی دلیل تنقید اور محاکمہ کا مقابلہ نہیں کر سکتی' اس کے سامنے کھڑی نہیں رہ سکتی۔ لیکن اس کے بعد اس نے دوسری کتاب ''Critique of Practical Reason'' لکھی۔ اس میں اس نے یہ بات پورے شدّ ومدّ کے ساتھ پیش کی کہ انسانی اخلاق کے لیے کوئی بنیاد نہیں ہے جب تک کہ وہ خدا کو نہ مانے۔ اس کے بغیر اخلاقیات کے لیے کوئی اساس ممکن نہیں۔ لہٰذا اگر انسان کو اخلاقی رویّہ اختیار کرنا ہے تو اسے خدا کو ماننا ہوگا' اس کے بغیر انسان کو کوئی اخلاقی تشخص اور تمکن حاصل ہو ہی نہیں سکتا۔

چنانچہ یہی ہے وہ حقیقتِ نفس الامری جو اس آیت میں بیان فرمائی گئی ہے کہ ایمان باللہ اور ایمان بالآخرۃ نیکی اور بھلائی کے لیے قوتِ محرکہ فراہم کرتے ہیں۔ قرآن انسان سے کہتا ہے کہ نیک بنو' اچھے اور بھلے کام کرو' کیونکہ اللہ کو نیک لوگ پسند اور محبوب ہیں۔ حدیث کہتی ہے کہ جملہ مخلوقات اللہ کے کنبے کے مانند ہیں' لہٰذا جو لوگ اللہ کی رضا کے جویا ہیں ان کو خدمتِ خلق کے لیے ہر دم کمربستہ رہنا چاہیے! الغرض نیکی کے لیے قوتِ محرکہ کا منبع اور سرچشمہ ہے ایمان باللہ۔ واضح رہے کہ یہ مثبت قوتِ محرکہ ہے' اس لیے کہ محبت ایک مثبت جذبہ ہے اور ایمان باللہ کا حاصل محبتِ الٰہی ہے۔ لیکن سب

جانتے ہیں کہ تمام انسان عقل وشعور کی سطح کے اعتبار سے برابر نہیں۔ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو محبت کے رمز آشنا نہیں ہوتے۔ ان کے لیے ضرورت ہے کسی اور قوتِ محرکہ کی جو ع

''نوارا تلخ تر می زن چوں ذوقِ نغمہ کمیابی!''

کے مصداق ایک تازیانے کا کام دے' اور وہ قوتِ محرکہ ہے ایمان بالآخرۃ' یعنی accountability کا احساس کہ ایک دن آنے والا ہے جب محاسبہ ہوگا' ہمیں ایک ایک عمل کی جوابدہی کرنی پڑے گی۔ اس ایمان بالآخرۃ کو آپ چاہیں تو ایمان باللہ کے مقابلے میں منفی قوتِ محرکہ کہہ سکتے ہیں' کیونکہ اس کی بنیاد محاسبۂ اُخروی کے خوف پر ہے۔

اِنَّما الاعمالُ بِالـنِّـیَّات

ہماری اب تک کی بحث کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ انسان کا جو عمل اِن دو محرکات پر مبنی نہ ہو وہ چاہے کتنا ہی بڑے سے بڑا نیکی کا کام نظر آئے' از روئے قرآن وحدیث وہ نیکی کا کام نہیں' بلکہ اس میں کوئی نہ کوئی دُنیوی غرض پوشیدہ ہوتی ہے' جب کہ تاکیدی ہدایت یہ ہے کہ ع ''سوداگری نہیں' یہ عبادت خدا کی ہے!'' کے مصداق نیکی کو کاروبار نہ بنالینا' نیکی سے دُنیوی منفعت کو مدِّ نظر مت رکھنا' نیکی کا فائدہ اس دنیا میں حاصل کرنے کی نیت نہ رکھنا۔ ایسا کریں گے تو اس نیت وارادے کے تحت نیکی کے جتنے کام کیے جائیں گے از روئے قرآن سب باطل ہو جائیں گے۔ اسی کو ہم اصطلاحِ دینی میں کہتے ہیں کہ کوئی نیکی خلوص واخلاص کے بغیر اللہ تعالیٰ کی جناب میں قبول نہیں۔ اس پر اسلام نے اتنا زور دیا ہے کہ بعض احادیثِ شریفہ تو ایسی ہیں کہ جن کو پڑھ کر انسان واقعتاً لرز اٹھتا ہے۔ البتہ سب سے جامع حدیث وہ ہے جس کے راوی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ہیں اور اکثر محدثین نے جو احادیثِ نبویؐ کے مجموعے مرتب کیے ہیں ان کا آغاز اسی حدیث سے کیا ہے۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں:

((اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ وَاِنَّمَا لِکُلِّ امْرِئٍ مَا نَوٰی))(۱)

''اعمال کا دارومدار (نیکیوں کا انحصار) نیتوں پر ہے اور انسان کو وہی کچھ ملے گا جس کی اس نے نیت کی ہو''۔

یعنی اگر ایک شخص نے ایک اچھا عمل کیا لیکن اس کے پیچھے کوئی بُری نیت تھی تو اُس کا عمل بھی بُرا شمار ہوگا اور اس کا نتیجہ بھی بُرا نکلے گا۔ (اگرچہ اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہ ہوگا کہ اگر انسان ایک برا عمل کرے

(۱) صحیح البخاری' کتاب بدء الوحی' باب بدء الوحی۔ وصحیح مسلم' کتاب الامارۃ' باب قولہ انما الاعمال بالنیۃ......

جس میں اس کی نیت اچھی ہو تو اس کو اس کا اجر ملنا چاہیے۔ اس لیے کہ حدیثِ مبارکہ میں ''اعمال'' کا لفظ استعمال ہوا ہے اور اعمال سے مراد نیکی کے اعمال ہیں۔ ''افعال'' کا لفظ آتا تو وہ دونوں کا احاطہ کر لیتا۔ مزید برآں نیت کا معاملہ اللہ کے ساتھ ہے۔ ہم اس پر اس کے ظاہر کے اعتبار سے برائی ہی کا حکم لگائیں گے۔ اس لیے کہ ہم دنیا میں صرف ظاہر پر ہی فیصلہ کر سکتے ہیں۔ البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ کوئی شخص کسی مخمصے میں ہو یا کسی ایسی مجبوری میں گرفتار ہو جس سے نکلنا اس کے لیے قطعاً ناممکن ہو تو اس کے لیے رعایت ہوسکتی ہے)۔ تو یہ ہے دونوں اعتبارات سے ایمان باللہ اور ایمان بالآخرۃ کا تعلق نیکی کی بحث سے۔

ایمان بالرّسالت اور اسوۂ حسنہ

بقیہ جو تین ایمانیات اس آیت میں مذکور ہیں' یعنی ملائکہ پر ایمان' کتابوں پر ایمان اور نبیوں پر ایمان' تو اگر ان تینوں کو بریکٹ کر لیا جائے تو ان کا حاصل ہوگا ''ایمان بالرسالت''۔ اس لیے کہ ملائکہ ذریعہ بنتے ہیں وحی لانے کا نبیوں اور رسولوں تک' اس وحی کا ریکارڈ ہے کتابوں کی شکل میں' اور جن پر وحی نازل ہوئی وہ انبیاء و رُسل ہیں۔ لہٰذا تینوں کو جمع کیجیے تو یہ ایمان بالرّسالت ہے۔ ایمان بالرسالت کا تعلق نیکی کی اس بحث کے ساتھ کیا ہے! اس کو بھی سمجھ لینا چاہیے۔ انسان کے اندر جس طرح دوسرے جذبات و داعیات ہوتے ہیں اسی طرح نیکی بھی ایک جذبہ ہے' اور جذبات و داعیات کے بارے میں ہمیں معلوم ہے کہ وہ اندھے ہوتے ہیں اور ان میں حدود سے تجاوز کا رجحان و میلان بالطبع پایا جاتا ہے۔ چنانچہ نیکی کے جذبہ کے ضمن میں بھی اس کا خطرہ موجود ہے کہ کسی وقت یہ ضرورت سے زیادہ مشتعل ہو کر حدِّ اعتدال سے تجاوز کر جائے اور نتیجتاً نیکی سے بدی ظہور میں آجائے۔ مثلاً ایک شخص پر نیکی کا اتنا غلبہ ہوا کہ اس نے دنیا کو چھوڑ دیا اور پہاڑوں کی کھوؤں اور غاروں میں جا کر دھونی رمائی کہ بس ربّ سے لو لگانی ہے۔ رہبانیت کا نظام اسی نیکی کے جذبہ کے حدِّ اعتدال سے تجاوز کی وجہ سے وجود میں آیا۔ لیکن ظاہر بات ہے کہ یہ رویّہ فطرت کے خلاف بغاوت ہے۔ فطرتِ انسانی میں جو داعیات ہیں یہ اُن سے دھینگا مشتی ہے۔ چنانچہ طبعِ بشری اور فطرتِ انسانی بسا اوقات انسان کو پچھاڑ دیتی ہے۔ نتیجتاً اس کا ایک ردِّعمل ظاہر ہوتا ہے۔ عیسائی راہب خانوں میں اسی ردِّعمل کے نتیجے میں جو کچھ ہوتا رہا ہے وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں' حالانکہ رہبانیت دراصل نیکی کے جذبہ کے حدِّ اعتدال سے تجاوز کے نتیجہ میں وجود میں آئی تھی۔

رہبانیت کی نفی ایک حدیث میں بڑی وضاحت سے بیان ہوئی ہے۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ ہی کے دوران صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے تین اشخاص ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انہوں نے نبی اکرم ﷺ کی نفلی عبادات کے بارے میں معلوم کیا کہ رات کو آپؐ کتنی نفلی نماز پڑھتے ہیں؟ مہینہ میں کتنے نفلی روزے رکھتے ہیں؟ رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ ایک کھلی کتاب کی مانند تھی' اس میں تصنّع کا کوئی شائبہ نہیں تھا۔ ازواجِ مطہراتؓ نے کسی بات میں مبالغہ نہیں کیا' جو صحیح صحیح بات تھی وہ بتادی۔ ان صحابہؓ نے اپنے آپ کو یہ کہہ کر مطمئن کر لیا کہ حضور ﷺ تو معصوم ہیں' آپؐ سے تو کسی خطا کا صدور ممکن ہی نہیں' آپ ﷺ کو تو اتنی نفلی عبادات کی بھی ضرورت نہیں جتنی آپ ﷺ کر رہے ہیں' یہ بھی آپ ﷺ کے لیے بہت ہے' لیکن ہمارے لیے یہ کافی نہیں ہے۔ چنانچہ ایک نے کہا کہ میں تو پوری رات نفلی نمازوں میں گزاروں گا' کبھی ناغہ نہیں کروں گا۔ دوسرے نے کہا کہ میں ہمیشہ روزہ رکھا کروں گا' کبھی ناغہ نہیں کروں گا۔ تیسرے نے کہا میں شادی اور گھر گرہستی کا کھکھیڑ مول نہیں لوں گا' اس سے تو اللہ سے لو لگانے اور تعلق استوار کرنے میں رکاوٹیں پیدا ہوتی ہیں' میں تو ساری عمر تجرّد کی زندگی بسر کروں گا۔ نبی اکرم ﷺ کو اس کی خبر پہنچی تو آپ ﷺ اپنی عادتِ شریفہ اور خُلق کریم کے خلاف ناراض ہوئے۔ آپ ﷺ نے اُن تینوں کو بلا بھیجا اور فرمایا کہ ''میں تم میں سے ہر ایک سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا ہوں' لیکن میں رات کو سوتا بھی ہوں اور نفلی نماز بھی ادا کرتا ہوں۔ میں نفلی روزے رکھتا بھی ہوں اور ناغہ بھی کرتا ہوں۔ میں نے شادیاں بھی کی ہیں اور میرے حبالۂ عقد میں متعدد ازواج ہیں''۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا: ((فَمَنْ رَّغِبَ عَنْ سُنَّتِیْ فَلَیْسَ مِنِّیْ))[1] ''(کان کھول کر سن لو! کسی کا عمل چاہے کتنے ہی نیکی کے جذبے کے تحت ہو' لیکن) جس کسی نے میری سنت اور میرے طریقے کو چھوڑ دیا (اور اس کے برعکس روش اختیار کی تو جان رکھو) اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں''۔ پس اس طرح ہمارے لیے نیکی کے معیارِ کامل ہیں جناب محمدٌ رسول اللہ ﷺ۔

ہمارے لیے ضروری ہے کہ نیکی کی بحث میں ایک اسوۂ حسنہ' ایک کامل نمونہ' ایک آئیڈیل اور ایک frame of reference ہمارے سامنے رہے جس میں نیکی کے تمام اعمال ایک توازن اور

(۱) صحیح البخاری' کتاب النکاح' باب الترغیب فی النکاح۔ وصحیح مسلم' کتاب النکاح' باب استحباب النکاح لمن تاقت نفسه الیه ووجد مؤنه۔

اعتدال میں سموئے ہوئے مل جائیں۔اسی کو ہم کسوٹی سمجھیں، ہر عمل کے بارے میں اس کی طرف رجوع کریں کہ یہ عمل اس معیارِ کامل میں کتنا ہے اور دوسرے اعمال کے ساتھ اس کا تناسب کیا ہے! یہ ہے وہ ضرورت جو ''ایمان بالرسالت'' سے پوری ہوتی ہے۔ یہ اسوۂ حسنہ و کاملہ وہ ہے جو ہمیں انبیاء و رُسل ؑ کی زندگیوں میں ملتا ہے اور اس مقدس جماعت میں کامل ترین اور افضل ترین ہیں جنابِ محمد ﷺ۔ ایک اسوۂ حسنہ و کاملہ یعنی تمام نیکیاں، تمام بھلائیاں، تمام خیرات وحسنات اگر ایک شخصِ واحد میں معتدل، متوازن اور جامعیت کے ساتھ دیکھنی ہوں تو وہ نمونہ اور کسوٹی ہیں حضرت محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

الغرض فلسفۂ اخلاق کے ساتھ ایمان کے ان تینوں اجزاء کا بڑا گہرا تعلق ہے۔ نیکی کی جڑ اور بنیاد کے ساتھ ایمان کا جو لازم وملزوم کا رشتہ ہے اس کے ناگزیر بیان کے لیے یہاں ایمان کا ذکر آیا ہے۔ اسے یہاں محدود مذہبی معنی اور تصور کے ساتھ محض برسبیل تذکرہ یا بطورِ تبرک نہ سمجھ لیجیے گا۔

آیۂ بر کے پہلے حصے کے حوالے سے حقیقتِ بر کے متعلق بعض مسائل پر اجمالاً گفتگو کے بعد اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ نیکی کی روحِ باطنی یعنی ایمان کا ظہور انسان کے عملی رویے اور اس کی سیرت وکردار میں جس صورت میں ہوتا ہے اس کو قرآن حکیم کس پیرائے میں اور کس ترتیب سے بیان کر رہا ہے۔ لیکن اس کے لیے مناسب ہوگا کہ ہم پھر سے اس آیۂ مبارکہ کے رواں ترجمہ پر نظر ڈالیں۔ آیۂ مبارکہ کا سلیس ترجمہ یہ ہے:

> ''نیکی صرف یہی نہیں کہ تم اپنے چہرے مشرق اور مغرب کی طرف پھیر دو، بلکہ اصل نیکی اس کی ہے جو ایمان لایا اللہ پر، اور یومِ آخرت پر، اور فرشتوں پر، اور کتابوں پر، اور انبیاء پر۔ اور دیا اس نے مال اس کی محبت کے باوجود رشتے داروں کو، یتیموں کو، محتاجوں کو، مسافر کو، مانگنے والوں کو اور گلوخلاصی میں۔ اور قائم کی اس نے نماز اور ادا کی زکوٰۃ۔ اور عہد کے پورا کرنے والے جب باہم کوئی معاہدہ کرلیں۔ اور بالخصوص صبر کرنے والے فقروفاقہ پر، اور تکالیف ومصائب میں اور جنگ کے میدان میں۔ یہی ہیں وہ لوگ کہ جو حقیقتاً سچے اور راست باز ہیں، اور یہی ہیں وہ لوگ جو واقعتاً متقی ہیں۔''

اس آیۂ مبارکہ میں ایمان یا جن ایمانیاتِ خمسہ کا بیان ہوا ہے، ان کا نیکی کی بحث کے ساتھ جو تعلق ہے اس پر کسی قدر غور وفکر ہم مکمل کر چکے ہیں۔ اب آئیے ہم دیکھیں کہ نیکی کی یہ روحِ باطنی

جب کسی انسان میں سرایت کر جائے یا جب ایمانِ حقیقی انسان کے قلب میں جاگزیں ہو جائے تو اس آیۂ مبارکہ کی رُو سے اس کے نتیجے میں اس انسان کی شخصیت‘ اس کی سیرت و کردار‘ اس کے معاملات‘ اس کے اعمال اور اس کے رویے میں کن کیفیات کا ظہور ہوتا ہے جن کو از روئے قرآنِ حکیم نیکی کے عملی مظاہر قرار دیا جا سکتا ہے!

انسانی ہمدردی

یہاں نوٹ کیجیے کہ اس آیۂ مبارکہ میں ایمانیات کے ذکر کے بعد نیکی کا جو مظہرِ اوّل بیان ہو رہا ہے وہ ’’خدمتِ خلق‘‘ اور ’’انسانی ہمدردی‘‘ ہے۔ اگرچہ آپ نے سن رکھا ہوگا اور یہ بالکل صحیح ہے کہ ارکانِ دین میں کلمۂ شہادت کے بعد رکنِ اوّل اور رکنِ رکین‘ جس کو عِمَادُ الدِّیْن (دین کا ستون) قرار دیا گیا ہے وہ اقامتِ صلوٰۃ ہے‘ لیکن اس آیۂ مبارکہ میں نماز کا ذکر مؤخر ہو گیا ہے اور اس سے بھی پہلے اپنے مال کو ابنائے نوع کی تکلیفوں کو رفع کرنے‘ ان کی احتیاجات کو دُور کرنے اور ان کی مصیبتوں سے انہیں نجات دلانے میں صرف کرنے کا ذکر نہایت اہتمام اور شدّ ومدّ کے ساتھ ہو رہا ہے۔

یہ معاملہ بہت اہم ہے اور واقعہ یہی ہے کہ جہاں کہیں نیکی کی حقیقت کی بحث ہوگی وہاں ترتیب وہ ہوگی جو اس آیۂ مبارکہ میں ہے‘ لیکن جہاں ارکانِ اسلام کی گفتگو ہوگی وہاں ترتیب وہ رہے گی جو مشہور حدیث میں بیان ہوئی ہے‘ جس کا مفہوم یہ ہے:

> ’’اسلام کی بنیاد پانچ ستونوں پر تعمیر کی گئی ہے: کلمۂ شہادت‘ نماز‘ زکوٰۃ‘ صومِ رمضان اور حج‘‘۔(۱)

یہاں چونکہ بحث نیکی کی حقیقت سے ہے لہٰذا یہاں اس کی مناسبت سے ترتیب قائم کی گئی ہے کہ انسان کے عملی رویّے میں نیکی کا ظہورِ اوّل ’’انسانی ہمدردی‘‘ کو قرار دیا گیا ہے۔ قرآن مجید اس بات پر جس قدر زور دیتا ہے اس کا اندازہ آپ سورۂ آل عمران کی آیت ۹۲ سے بخوبی لگا سکتے ہیں۔ اس میں یہ معاملہ بہت نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے۔ فرمایا:

﴿لَنۡ تَنَالُوا الۡبِرَّ حَتّٰی تُنۡفِقُوۡا مِمَّا تُحِبُّوۡنَ ۬ؕ﴾

’’تم نیکی کے مقام تک پہنچ ہی نہیں سکتے جب تک کہ تم خرچ نہ کرو (اللہ کی راہ میں) وہ چیز جو

(۱) صحیح البخاری و صحیح مسلم عن عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما۔

تمہیں محبوب ہے۔‘‘

یعنی وہ چیز نہیں جو دل سے اتر گئی ہو‘ نہ وہ چیز جو از کار رفتہ ہو گئی ہو‘ بلکہ وہ چیز جو محبوب ہو۔ اگر تم محبوب چیز یعنی مال اللہ کی راہ میں اپنے ابنائے نوع کی تکالیف رفع کرنے میں خرچ نہیں کر سکتے تو یہ بات جان لو کہ نیکی میں سے تم کو کوئی حصہ نہیں ملے گا اور تمہارا شمار اتقیاء وابرار میں نہیں ہو سکے گا!

یہ بات بھی جان لیجیے کہ ہر لفظ اور ہر اصطلاح کا ایک مفہوم ہوتا ہے اور اس کے کچھ مضمرات و مقتضیات ہوتے ہیں جو اس سے جدا نہیں کیے جا سکتے‘ خاص طور پر جو الفاظ اصطلاح کی حیثیت اختیار کر لیں تو ان کا ایک خاص مفہوم (connotation) معیّن ہو جاتا ہے۔ مثلاً اگر یہ کہا جائے کہ فلاں شخص عالم ہے تو لفظ عالم کا اپنا ایک مفہوم ہے۔ اسی طرح اگر یہ کہا جائے کہ کوئی زاہد ہے یا عابد ہے تو زاہد اور عابد کا اپنا اپنا جداگانہ مفہوم ہے۔ تو ہو سکتا ہے کہ ایک شخص عالم ہو‘ عابد ہو‘ زاہد ہو‘ لیکن از روئے قرآن وہ شخص نیک شمار نہیں ہو گا‘ نہ ہی اس کا شمار ابرار میں ہو گا جب تک اس کے اندر انسانی ہمدردی کا وصف اور بنی نوع انسان کی تکالیف کو دُور کرنے کا جذبہ موجود نہ ہو۔

اس آیت کے الفاظِ مبارکہ سے تو یہ بات نیکی کی بحث میں واضح اور مبرہن ہو کر سامنے آتی ہے ‘لیکن اپنی اہمیت کے اعتبار سے یہ مضمون قرآن مجید میں بعض دوسرے مقامات پر بھی مختلف اسالیب سے بیان ہوا ہے۔ اس لیے کہ قرآن مجید کا معاملہ تو یہ ہے ہی کہ ع ’’اِک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں‘‘۔ چنانچہ سورۃ اللّیل میں ارشادِ الٰہی ہے: ﴿اِنَّ سَعۡیَکُمۡ لَشَتّٰی ۴﴾ ’’(لوگو!) یقیناً تمہاری سعی و جہد (تگ و دَو اور بھاگ دوڑ) کے نتائج بڑے مختلف اور متضاد ہوتے ہیں‘‘۔ پھر اللہ ربّ العزت نے دو مختلف نتیجوں کا ذکر فرمایا: ﴿فَاَمَّا مَنۡ اَعۡطٰی وَ اتَّقٰی ۵ وَ صَدَّقَ بِالۡحُسۡنٰی ۶ فَسَنُیَسِّرُہٗ لِلۡیُسۡرٰی ۷﴾ ’’سو جس نے سخاوت اختیار کی‘ اور برائی سے بچا‘ اور بھلی بات کی تصدیق کی‘ تو اسے ہم رفتہ رفتہ بڑی آسانی کا اہل بنا دیں گے‘‘۔ گویا ایک راستہ وہ ہے جس کا پہلا قدم ہے ’’اعطاء‘‘ یعنی جُود وسخا۔ یہ راستہ آسانی کی طرف لے جانے والا ہے۔ اس کے برعکس راستہ وہ ہے جس کا پہلا قدم بخل ہے۔ فرمایا گیا: ﴿وَ اَمَّا مَنۡۢ بَخِلَ وَ اسۡتَغۡنٰی ۸ وَ کَذَّبَ بِالۡحُسۡنٰی ۹ فَسَنُیَسِّرُہٗ لِلۡعُسۡرٰی ۱۰﴾ ’’اور جس نے بخل سے کام لیا اور لاپروائی اختیار کی‘ اور بھلی بات کی تکذیب کی‘ تو اسے ہم رفتہ رفتہ کڑی سزا کا مستوجب بنا دیں گے‘‘۔ گویا یہ راستہ تنگی اور سختی کا راستہ ہے۔

اسی طرح سورۃ البلد میں فرمایا کہ ہم نے انسان پر کیا کیا اور کیسے کیسے احسانات کیے! از روئے

الفاظِ قرآنی: ﴿اَلَمۡ نَجۡعَلۡ لَّهٗ عَيۡنَيۡنِ ۙ﴿۸﴾ وَلِسَانًا وَّشَفَتَيۡنِ ۙ﴿۹﴾ وَهَدَيۡنٰهُ النَّجۡدَيۡنِ ﴿۱۰﴾﴾ ''کیا ہم نے اس کو دو آنکھیں نہیں دیں؟ اور ایک زبان اور دو ہونٹ نہیں دیے؟ اور اس کو دونوں راہیں (بِر وتقویٰ اور فسق وفجور کی راہیں) سجھا نہیں دیں؟'' لیکن یہ انسان بڑا اتھڑ دلا ثابت ہوا اور کم ہمت اور ناشکرا نکلا۔ فرمایا: ﴿فَلَا اقۡتَحَمَ الۡعَقَبَةَ ﴿۱۱﴾ وَمَاۤ اَدۡرٰىكَ مَا الۡعَقَبَةُ ﴿۱۲﴾ فَكُّ رَقَبَةٍ ﴿۱۳﴾ اَوۡ اِطۡعٰمٌ فِيۡ يَوۡمٍ ذِيۡ مَسۡغَبَةٍ ﴿۱۴﴾ يَّتِيۡمًا ذَا مَقۡرَبَةٍ ﴿۱۵﴾ اَوۡ مِسۡكِيۡنًا ذَا مَتۡرَبَةٍ ﴿۱۶﴾﴾ ''پس وہ گھاٹی عبور نہ کرسکا۔ اور کیا سمجھے تم کہ وہ گھاٹی کون سی ہے؟ (اب آگے اس گھاٹی کا ذکر ہے جس کا تعلق انسانی ہمدردی اور خدمتِ خلق میں اپنے مال کو خرچ کرنے سے ہے۔) کسی گردن کو چھڑا دینا (کسی کی گلو خلاصی کرا دینا)' یا کسی یتیم کو قحط کے ایام میں جب کہ اپنے لالے پڑے ہوئے ہوں' کھانا کھلا دینا جبکہ وہ قرابت دار بھی ہو' یا کسی مسکین کو کھانا کھلا دینا جب کہ وہ خاک میں رل رہا ہو''۔ یہ ہے مشکل وادی۔ اگر انسان اس کو عبور کرلے اور پھر شعوری طور پر ایمان لائے تو وہ نورٌ علٰی نُور والا ایمان ہوگا۔ چنانچہ اسی سورۃ البلد میں اس آیت سے آگے فرمایا: ﴿ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَتَوَاصَوۡا بِالصَّبۡرِ وَتَوَاصَوۡا بِالۡمَرۡحَمَةِ ﴿۱۷﴾﴾ ''پھر وہ شامل ہوا اُن لوگوں میں جو ایمان لائے' اور جنہوں نے ایک دوسرے کو صبر اور باہمی ہمدردی کی پُر زور تاکید کی!''......واضح رہے کہ تقریباً سورۃ العصر کا مضمون سورۃ البلد کی اس آیت میں بھی آگیا ہے۔ یہ گویا وہی بات ہے کہ ع ''اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں''۔

اس موقع پر چند احادیثِ نبویہؐ بھی پیشِ نظر رہیں جو علم وحکمت کے بڑے بڑے خزانے ہیں' جن میں اسی مفہوم کو نبی اکرم ﷺ نے ''کوزہ میں دریا بند کرنے'' کے انداز میں بیان فرمایا ہے۔ آپ ﷺ فرماتے ہیں: ((مَنۡ يُّحۡرَمِ الرِّفۡقَ يُحۡرَمِ الۡخَيۡرَ)) (۱) جو شخص دل کی نرمی سے محروم رہا وہ (کُل کے کُل) خیر سے محروم ہوگیا''۔ ایک اور حدیث میں نبی اکرم ﷺ فرماتے ہیں: ((مَنۡ لَّا يَرۡحَمُ لَا يُرۡحَمُ)) (۲) ''اللہ اس شخص پر رحم نہیں فرماتا جو انسانوں پر رحم نہیں کرتا''۔ ایک اور حدیث کے مطابق نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ((اَلۡخَلۡقُ عِيَالُ اللّٰهِ)) (۳) ''کُل کی کُل مخلوق اللہ کے کنبے

(۱) صحیح مسلم' کتاب البر والصلة والآداب' باب فضل الرفق۔ و سنن ابن ماجه' کتاب الادب' باب الرفق۔ و مسند احمد۔

(۲) صحیح مسلم' کتاب الفضائل' باب رحمته الصبیان والعیال وتواضعه وفضل ذلك۔

(۳) رواه البیهقی فی شعب الایمان۔ بحواله مشکوٰة المصابیح' کتاب الآداب' باب الشفقة والرحمة علی الخلق۔

کی مانند ہے''۔ لہٰذا اگر اللہ سے محبت ہے تو کیا اس کے کنبے یعنی مخلوق سے محبت نہیں ہو گی! حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''قیامت کے دن اللہ عزوجل فرمائے گا: اے آدم کے بیٹے! میں بیمار ہوا تو نے میری تیمارداری نہیں کی۔ وہ کہے گا: اے پروردگار! میں تیری تیمارداری کیسے کرتا جبکہ تو ربّ العالمین ہے؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: کیا تو نہیں جانتا کہ میرا فلاں بندہ بیمار ہوا اور تو نے اس کی تیمارداری نہیں کی؟ کیا تو نہیں جانتا کہ اگر تو اس کی تیمارداری کرتا تو مجھے اس کے پاس موجود پاتا!

اے آدم کے بیٹے! میں نے تجھ سے کھانا مانگا تھا' تُو نے مجھے کھانا نہیں کھلایا۔ وہ کہے گا: اے میرے ربّ! میں تجھ کو کھانا کیسے کھلاتا جب کہ تُو ربّ العالمین ہے؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: کیا تو نہیں جانتا کہ تجھ سے میرے فلاں بندے نے کھانا مانگا تھا' تو نے اس کو کھانا نہیں کھلایا؟ کیا تو نہیں جانتا کہ اگر تو اسے کھانا کھلاتا تو اس کھانے کو میرے پاس موجود پاتا!

اے آدم کے بیٹے! میں نے تجھ سے پانی مانگا تھا' تُو نے مجھے پانی نہیں پلایا۔ وہ کہے گا: پروردگار! میں تجھ کو کیسے پانی پلاتا جبکہ تُو تو ربّ العالمین ہے؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تجھ سے میرے فلاں بندے نے پانی مانگا تھا' تُو نے اس کو پانی نہیں پلایا تھا' اور اگر تُو اُس کو پانی پلا دیتا تو اپنے اس عمل کو میرے پاس موجود پاتا!''(۱)

اندازہ لگائیے کہ یہ اہمیت ہے ہمارے دین میں حاجت مندوں کی حاجت روائی کی!

خیرات وصدقات میں ترتیب

اب دیکھئے کہ ان الفاظِ مبارکہ ﴿ذَوِی الْقُرْبٰی وَالْيَتٰمٰی وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِی الرِّقَابِ ۚ﴾ میں ایک ترتیب بھی ہے اور وہ بڑی فطری ترتیب ہے۔ آپ کے قرابت دار یعنی آپ کے قریبی عزیزوں میں سے جو مشکل اور تکلیف میں ہوں سب سے پہلے آپ کے حسنِ سلوک کے مستحق وہ ہیں' پھر وہ یتیم جو آپ کے قریب کے معاشرے میں بے سہارا ہیں' پھر مسکین۔ مسکنت کہتے ہیں کم ہمتی کو۔ مسکین وہ ہیں جن کی ہمت جواب دے گئی ہو' جو اپنے پاؤں پر کھڑے نہیں ہو پا رہے ہوں' خود کفیل نہ ہوں۔ پھر وہ شخص جو حالتِ سفر میں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ کسی وجہ سے سفر میں محتاج ہو جائے۔ پھر وہ شخص جو دستِ سوال دراز کر رہا ہے۔ آپ کو کیا معلوم کہ کون سی احتیاج اسے لاحق ہوئی ہے جس کے باعث وہ اپنی خودی اور عزتِ نفس کو ہتھیلی پر رکھ کر آپ کے سامنے

---

(۱) صحيح مسلم' كتاب البر والصلة والآداب' باب فضل عيادة المريض۔

پیش کر رہا ہے! پھر وہ جس کی گردن کہیں کسی مخمصے میں پھنس گئی ہو۔ پچھلے زمانے میں یہ غلامی کا معاملہ تھا اور آج اس کے مصداق ہوں گے وہ لوگ جو قرض کے پھندے میں اس طرح پھنس جائیں کہ کتنے ہی ہاتھ پاؤں مار رہے ہوں لیکن اس سے نکل نہ پا رہے ہوں۔ تو یہ ترتیب بھی بڑی حکمت پر مبنی ہے۔ یہ خیال رہے کہ یہاں صدقاتِ نافلہ کا ذکر ہے۔ صدقۂ واجبہ زکوٰۃ ہے جس کا حکم آگے آ رہا ہے‘ اس کی مدّات سورۃ التوبۃ میں بیان ہوئی ہیں۔ حضرت فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے زکوٰۃ کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((اِنَّ فِی الْمَالِ حَقًّا سِوَی الزَّکٰوۃِ))[1] کہ لوگو! یہ مغالطہ نہ ہو کہ مال میں صرف زکوٰۃ کی ادائیگی ہے۔ یہ تو فرض ہے‘ اس کے علاوہ بھی تمہارے مال میں (حاجت مندوں کا) حق ہے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی توثیق کے لیے یہی آیۂ مبارکہ پڑھی۔

ایک مزید بات یہ بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ انفاقِ مال کی جن مدّات کا آیۂ مبارکہ کے اس حصے میں ذکر ہوا ہے‘ اس سے اصل مقصود انسانی ہمدردی اور ابنائے نوع کی خدمت کا جذبہ پیدا کرنا ہے۔ اب سوال ہے مقدار اور مواقع کا‘ پھر اِن میں اوّلیت اور ثانویت کا۔ ظاہر ہے کہ جس کی جتنی مقدرت ہے وہ اتنا ہی خرچ کر سکتا ہے۔ اس میں اوّلیت رشتہ داروں کو دی جائے گی۔ اقرباء کی ضرورت پوری کرنے کے بعد اگر کوئی مزید خرچ کرنے کی مقدرت رکھتا ہے تو وہ جتنا بھی اس دائرے میں آگے بڑھے گا اتنا ہی وہ اپنے لیے نیکی کا مزید ذخیرہ جمع کرتا چلا جائے گا۔

عبادات یا حقوق اللہ

اب آگے چلیے! فرمایا: ﴿وَاَقَامَ الصَّلٰوۃَ وَاٰتَی الزَّکٰوۃَ ۚ﴾ ''اور نماز قائم کرے اور زکوٰۃ ادا کرے''۔ صلوٰۃ کیا ہے‘ زکوٰۃ کیا ہے‘ ان کے لغوی معنی کیا ہیں‘ ہمارے دین میں اِن کا مقام کیا ہے‘ اس پر اس وقت گفتگو نہیں ہو گی۔ یہ موضوعات اس سلسلۂ مضامین میں موزوں وقت پر زیرِ گفتگو آئیں گے‘ البتہ یہاں اس بات کو نوٹ کیجیے کہ درحقیقت ان دونوں کا نیکی کی اس بحث سے گہرا ربط و تعلق ہے۔ اب تک دو باتیں سامنے آئی ہیں‘ ایک نیکی کی روحِ باطنی اور وہ ہے ایمان۔ ایک اسی روحِ باطنی کا مظہرِ اوّل اور وہ ہے خدمتِ خلق‘ ابنائے نوع کی تکالیف کو دُور کرنے میں اپنا مال صرف کرنا۔ اب دیکھیں کہ صلوٰۃ و زکوٰۃ کا ذکر لازم و ملزوم کے تعلق کے طور پر آیا ہے۔ نیکی کی روحِ باطنی

(۱) سنن الترمذی‘ ابواب الزکاۃ‘ باب ما جاء انّ فی المال حقا سوی الزکاۃ۔

یعنی ایمان کی آبیاری اور اسے تر و تازہ رکھنے والی چیز نماز ہے۔ اللہ سے تعلق قائم و دائم رہے‘ اس کی یاد مستحضر رہے‘ آخرت کی فکر دل میں موجود رہے‘ ان امور کی تذکیر اور یاد دہانی کے لیے اوّلین‘ اہم ترین اور مقدم ترین شے نماز ہے۔ گویا ایک ستون ہے جو ایمان کو تر و تازہ رکھنے کے لیے گاڑ دیا گیا ہے۔

زکوٰۃ کا معاملہ یہ ہے کہ وہ انفاقِ مال کے لیے دل سے مال کا شُح اور طمع دُور کرتی ہے اور بنی نوعِ انسان کی ہمدردی کے ضمن میں جن مدّات کا ذکر پہلے آ چکا ہے ان کے لیے دل کو کشادہ کرتی ہے۔ گویا زکوٰۃ وہ چیز ہے جو صدقاتِ نافلہ کے لیے starter کا کام انجام دیتی ہے۔ زکوٰۃ وہ چیز ہے جو فرض کر دی گئی ہے۔ اسے تو نصاب کے مطابق ہر سال ہر حال میں ادا کرنا ہے‘ لامحالہ دینا ہے۔ دینا نہ چاہو گے تو خالص اسلامی ریاست میں زبردستی لے لی جائے گی۔ زکوٰۃ کی فرضیت کی صورت میں آپ کے سامنے فزکس کا ’’static friction‘‘ کا اصول آئے گا۔ یعنی اگر کوئی چیز کھڑی ہو تو اس کو حرکت میں لانے کے لیے بہت قوت استعمال کرنی پڑتی ہے‘ چل پڑے تو اب ذرا سی قوت بھی اس کی حرکت کو برقرار رکھ سکے گی۔ لہٰذا انفاق کی راہ پر چلانے کے لیے ابتدائی محرک زکوٰۃ سے فراہم ہوتا ہے۔ دل پر مال کی محبت کی جو مہر لگی ہوئی ہے اسے توڑنے والی چیز زکوٰۃ ہے۔ اب جبکہ ایک کام کا آغاز ہو گیا تو پھر صدقاتِ نافلہ کے لیے بھی بند مٹھی کھل جائے گی۔ صدقاتِ نافلہ کی کوئی حد نہیں ہے۔ اس کے بارے میں قرآن مجید میں وہ آیت بھی آتی ہے کہ: ﴿وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۭ﴾ (البقرۃ:۲۱۹) ’’اور (اے نبیؐ!) یہ لوگ آپؐ سے پوچھتے ہیں کہ کتنا خرچ کریں‘‘۔ یعنی اس پر جو اتنا زور دیا جا رہا ہے تو اس کی آخری حد کیا ہے؟ فرمایا: ﴿قُلِ الْعَفْوَ ۭ﴾ ’’(اے نبیؐ!) کہہ دیجیے کہ جو بھی تمہاری ضرورت سے زائد و فاضل ہے (اس کو دے ڈالو)‘‘۔ اس موقع پر یہ بات واضح طور پر سامنے رہنی چاہیے کہ یہ اخلاقی سطح پر ترغیب و تشویق ہے‘ قانونی معاملہ نہیں ہے۔ قانون اور عبادت کے طور پر زکوٰۃ فرض ہے۔

بین الانسانی معاملات کی اصلاح کی کلید: ایفائے عہد

آگے چلیے! میں نے ابتدا میں عرض کیا تھا کہ معاملاتِ زندگی میں ایفائے عہد کی بڑی اہمیت ہے۔ ہمارے سارے معاملات معاہدوں (contracts) پر مبنی ہوتے ہیں۔ ایک مزدور کو آپ نے آٹھ گھنٹے کام کرنے کے لیے رکھا اور اس کی آپ نے ایک اجرت مقرر کی‘ یہ ایک معاہدہ ہے۔ اسی طرح اگر کسی کو ماہانہ مشاہرے پر ملازم رکھا گیا ہے تو وہ بھی ایک معاہدہ ہے کہ یہ فرائض ہیں جو اِن اوقات میں ادا کرنے ہیں‘ اور اس کے عوض تمہیں یہ تنخواہ ملے گی۔ پھر آپ کو معلوم ہے کہ

اِس وقت اکثر کاروبار contracts کی بنیاد پر ہی ہو رہے ہیں۔ سپلائی ہو' تعمیرات کا کام ہو' وغیرہ وغیرہ' یہ سب معاہدوں کی بنیاد پر چل رہے ہیں' بلکہ ہمارے جو سوشل معاملات ہیں وہ بھی اکثر و بیشتر معاہدے کی بنیاد پر چل رہے ہیں' چاہے وہ تحریری معاہدے نہ ہوں۔ چنانچہ شادی کو بھی ایک سماجی معاہدہ قرار دیا گیا ہے۔ نیکی کی بحث میں ایفائے عہد کی بڑی اہمیت ہے۔ دینی اور محاسبۂ اُخروی کے اعتبار سے اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی لگایئے کہ سورۃ الاسراء (بنی اسرائیل) میں امر کے صیغہ میں فرمایا گیا: ﴿وَاَوۡفُوۡا بِالۡعَهۡدِ ۚ اِنَّ الۡعَهۡدَ کَانَ مَسۡـُٔوۡلًا ﴿۳۴﴾﴾ ''اور پورا کرو عہد کو' بے شک عہد کی پوچھ گچھ ہوگی''۔

صبر و مصابرت

اب آخری بات فرمائی گئی: ﴿وَالصّٰبِرِیۡنَ فِی الۡبَاۡسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیۡنَ الۡبَاۡسِ ؕ﴾. یہاں ''الصَّابِرُوۡنَ'' نہیں کہا' بلکہ ''الصَّابِرِیۡنَ'' فرمایا جس کا تعلق نحوی اسباب سے ہے' جس کی تفصیل کا موقع نہیں ہے۔ اسی اسلوب کے تحت میں نے ترجمہ میں ایک لفظ کا اضافہ کیا تھا' وہ تھا ''خصوصاً''۔ گویا مفہوم ہوا: ''خاص طور پر ذکر ہے صبر کرنے والوں کا''۔ یہ صبر کس کس کام میں مطلوب ہے' اس کا بیان آگے آ گیا کہ فقر و فاقہ' تنگی اور جسمانی یا ذہنی اذیت اور کوفت کے مواقع پر' پھر نقدِ جان ہتھیلی پر رکھ کر میدانِ جنگ میں آ جانے کے مرحلے پر۔ اس بات سے ایک چیز آپ کے سامنے واضح ہو جانی چاہیے' وہ یہ کہ بڑا بنیادی فرق ہے ایک راہبانہ تصورِ نیکی میں اور قرآن مجید کے اس تصورِ نیکی میں جو اِس آیۂ مبارکہ میں بیان ہو رہا ہے۔ راہبانہ تصورِ نیکی میں نیک لوگ میدان چھوڑ کر اور معاشرہ سے فراریت اختیار کر کے غاروں اور کھوؤں میں یا کہیں گھنے جنگلات میں جا کر تپسیائیں کرتے ہیں۔ اسلام کا معاملہ یہ ہے کہ وہ لوگوں کو عین معاشرے اور تمدن کے منجدھار میں رکھ کر نیکی کی تلقین کرتا ہے۔ پھر یہ کہ پسپائی اور فراریت نہیں ہے' بلکہ بدی کے ساتھ کشاکش اور پنجہ آزمائی' اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کے ساتھ مقابلہ کرنے کا سبق اور تلقین ہے۔ نیکی کا دنیا میں بول بالا کرنے کے لیے مصائب جھیلنا' فقر و فاقہ برداشت کرنا' یہاں تک کہ جان کی بازی کھیل جانا اسلام کے نزدیک نیکی کی معراج ہے۔

خیرِ اعلیٰ

دنیا میں جو نظام ہائے اخلاق رائج ہیں ان سب میں ایک تصور ہوتا ہے کہ خیرِ اعلیٰ (Highest Good) یا (Summum Bonum) کیا ہے! سب سے اونچی نیکی کون سی ہے! تو قرآن حکیم کی

رو سے سب سے بلند‘ سب سے اونچی اور سب سے اعلیٰ نیکی یہ ہے کہ نیکی کی ترویج کے لیے‘ خیر کی تلقین کے لیے‘ حق کے غلبے کے لیے‘ اجتماعی نظامِ عدل وقسط کے قیام کے لیے‘ صداقت‘ دیانت اور امانت کی بالادستی کے لیے اپنی گردنیں کٹادو۔ چنانچہ اسی سورۃ البقرۃ میں چند رکوع پہلے یہ الفاظ آئے ہیں:

﴿وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ﴿۱۵۴﴾﴾

’’جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہو جاتے ہیں اُن کو مُردہ نہ کہو‘ بلکہ وہ زندہ ہیں‘ لیکن تم اس کا شعور و ادراک نہیں کر سکتے‘‘۔

اور یہ مضمون ختم ہوتا ہے ان الفاظِ مبارکہ پر:

﴿وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۵۵﴾ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۱۵۶﴾ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۟ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ﴿۱۵۷﴾﴾

’’اور (اے نبیﷺ!) بشارت دیجیے ان صبر کرنے والوں کو‘ کہ جب ان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم اللہ ہی کے ہیں اور اسی کی جانب ہمیں لوٹ جانا ہے۔ یہی ہیں وہ لوگ جن پر اُن کے ربّ کی عنایتیں اور رحمتیں ہیں‘ اور یہی ہیں ہدایت یافتہ و بامراد!‘‘

علامہ اقبال کا ایک شعر ہے کہ: ؎

محبت مجھے اُن جوانوں سے ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند!

میرا خیال ہے کہ علامہ اقبال نے یہ انداز قرآن حکیم کی اس آیت سے اخذ کیا ہے جو سورۃ الصّف میں آئی ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ﴿۴﴾﴾

’’یقیناً اللہ کو محبت اُن سے ہے (اللہ کے محبوب بندے وہ ہیں) جو اُس کی راہ میں جنگ کرتے ہیں صفیں باندھ کر گویا کہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں‘‘۔

﴿وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ؕ﴾ میں ضمناً وہ بات بھی سامنے آگئی جو اس آیۂ بر کے درس کے آغاز میں بیان کی گئی تھی کہ اس آیۂ مبارکہ میں اگرچہ تواصی بالحق کا لفظاً ذکر نہیں ہے لیکن طبعاً ذکر موجود ہے اور یہ بات خود بخود سامنے آرہی ہے۔ لیکن وہ لوگ جن کے اذہان وقلوب میں ایمان کی روشنی ہے‘ جو خادمِ خلق ہیں‘ جن کی کیفیت یہ ہے کہ: ؎

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیرؔ
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

جو لوگ نماز اور زکوٰۃ پر کاربند ہیں' جو ایفائے عہد پر کاربند ہیں' اُن کی جنگ کس مقصد کے لیے ہو سکتی ہے! یقیناً اُن کی جنگ نفسانیت کے تحت نہیں ہو سکتی' اُن کی جنگ ہوسِ ملک گیری کے لیے نہیں ہو سکتی' بلکہ فی سبیل اللہ (In the cause of Allah) ہی ہو سکتی ہے۔ بقول علامہ اقبال مرحوم: ؎

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مؤمن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی!

خاتمۂ کلام' راست بازی اور تقویٰ کا معیار

اس آیۂ مبارکہ کا اختتام ہوتا ہے ان الفاظ پر: ﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ۭ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ١٧٧؁﴾ ''یہی ہیں وہ لوگ جو حقیقتاً سچے اور راست گو و راست باز ہیں اور یہی وہ لوگ ہیں جو واقعتاً متقی (اللہ کی نافرمانی سے بچنے والے) ہیں''۔ یہاں حصر کا اسلوب ہے۔ یعنی اپنے دعوائے ایمان میں سچے صرف وہ لوگ ہیں جن کے قلوب میں حقیقی ایمان جاگزیں ہو اور جن کے اعمال میں نیکی کے ان اوصاف کا ظہور ہو رہا ہو جن کا اس آیۂ مبارکہ میں بیان ہوا' اور صرف یہی لوگ حقیقی متقی کہلانے کے مستحق ہیں۔

اس آیۂ مبارکہ کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ سورۃ العصر کے چاروں مضامین یہاں موجود ہیں۔ اس سورۂ مبارکہ میں کامیابی اور فوز و فلاح کے جن چار لوازم کا بیان ہوا اُن کو اس آیۂ مبارکہ میں ایک نئے اسلوب' نئے انداز' نئے پیرائے اور نئے سلسلۂ کلام (context) میں ایک نئی بحث کے ضمن میں واضح فرما دیا گیا۔ حقیقتِ واحدہ وہی ہے جو سورۃ العصر میں آئی' اسی کو ہم نے ایک مرتبہ ایک نئی رعنائی کے ساتھ پھر دیکھ لیا۔ حقیقتِ نیکی اور تقویٰ کا جو قرآنی معیار قرآن حکیم کی اس عظیم آیت کے حوالے سے ہمارے سامنے آیا' اس کا اصل فائدہ تب ہی حاصل ہوگا جب ہم یہ ارادہ اور عزم کر لیں کہ جو علم ہمیں قرآن و حدیث سے حاصل ہوا اُس پر ہم عملاً کاربند ہونے کی ہر ممکنہ کوشش کریں گے۔ اللہ ہمارا حامی و ناصر ہو!

❁❁❁

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ OO

درس 3

مقام عزیمت
اور
حکمت قرآنی کی اساسات

سُوۡرَۃ لقمٰنؑ کے دوسرے رکوع کی روشنی میں

درس ۳

مقامِ عزیمت اور حکمتِ قرآنی کی اساسات

سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع کی روشنی میں

نحمدہٗ ونصلی علٰی رَسولہِ الکریم ...... امّا بَعد:

فَاَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ ۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿وَلَقَدۡ اٰتَیۡنَا لُقۡمٰنَ الۡحِکۡمَۃَ اَنِ اشۡکُرۡ لِلّٰہِ ؕ وَمَنۡ یَّشۡکُرۡ فَاِنَّمَا یَشۡکُرُ لِنَفۡسِہٖ ۚ وَمَنۡ
کَفَرَ فَاِنَّ اللّٰہَ غَنِیٌّ حَمِیۡدٌ ﴿۱۲﴾ وَاِذۡ قَالَ لُقۡمٰنُ لِابۡنِہٖ وَہُوَ یَعِظُہٗ یٰبُنَیَّ لَا تُشۡرِکۡ بِاللّٰہِ ؕ
اِنَّ الشِّرۡکَ لَظُلۡمٌ عَظِیۡمٌ ﴿۱۳﴾ وَوَصَّیۡنَا الۡاِنۡسَانَ بِوَالِدَیۡہِ ۚ حَمَلَتۡہُ اُمُّہٗ وَہۡنًا عَلٰی
وَہۡنٍ وَّفِصٰلُہٗ فِیۡ عَامَیۡنِ اَنِ اشۡکُرۡ لِیۡ وَلِوَالِدَیۡکَ ؕ اِلَیَّ الۡمَصِیۡرُ ﴿۱۴﴾ وَاِنۡ جٰہَدٰکَ
عَلٰۤی اَنۡ تُشۡرِکَ بِیۡ مَا لَیۡسَ لَکَ بِہٖ عِلۡمٌ ۙ فَلَا تُطِعۡہُمَا وَصَاحِبۡہُمَا فِی الدُّنۡیَا
مَعۡرُوۡفًا ۫ وَّاتَّبِعۡ سَبِیۡلَ مَنۡ اَنَابَ اِلَیَّ ۚ ثُمَّ اِلَیَّ مَرۡجِعُکُمۡ فَاُنَبِّئُکُمۡ بِمَا کُنۡتُمۡ
تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۵﴾ یٰبُنَیَّ اِنَّہَاۤ اِنۡ تَکُ مِثۡقَالَ حَبَّۃٍ مِّنۡ خَرۡدَلٍ فَتَکُنۡ فِیۡ صَخۡرَۃٍ اَوۡ فِی
السَّمٰوٰتِ اَوۡ فِی الۡاَرۡضِ یَاۡتِ بِہَا اللّٰہُ ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَطِیۡفٌ خَبِیۡرٌ ﴿۱۶﴾ یٰبُنَیَّ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ
وَاۡمُرۡ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَانۡہَ عَنِ الۡمُنۡکَرِ وَاصۡبِرۡ عَلٰی مَاۤ اَصَابَکَ ؕ اِنَّ ذٰلِکَ مِنۡ عَزۡمِ
الۡاُمُوۡرِ ﴿۱۷﴾ وَلَا تُصَعِّرۡ خَدَّکَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمۡشِ فِی الۡاَرۡضِ مَرَحًا ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ
کُلَّ مُخۡتَالٍ فَخُوۡرٍ ﴿۱۸﴾ وَاقۡصِدۡ فِیۡ مَشۡیِکَ وَاغۡضُضۡ مِنۡ صَوۡتِکَ ؕ اِنَّ اَنۡکَرَ
الۡاَصۡوَاتِ لَصَوۡتُ الۡحَمِیۡرِ ﴿۱۹﴾﴾ (لقمٰن) ...... صدق اللّٰہ العظیم

مطالعہ قرآن حکیم کے جس منتخب نصاب کی تشریح اِن صفحات میں قسط وار شائع ہو رہی ہے اس کا پہلا درس سورۃ العصر پر اور دوسرا آیۃ البرّ پر مشتمل تھا۔ اب ہم اللہ کے نام سے اس سلسلے کے تیسرے درس کا آغاز کر رہے ہیں جو سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع پر مشتمل ہے۔ سورۂ لقمان مصحف میں

اکیسویں پارے میں شامل ہے اور اس کا دوسرا رکوع آٹھ آیات پر مشتمل ہے۔ تو آیئے اس کا ایک رواں ترجمہ سمجھ لیں‘ تا کہ رکوع کے مضامین بیک وقت ہماری نگاہوں کے سامنے آ جائیں۔

’’اور ہم نے لقمان کو دانائی عطا فرمائی کہ شکر کر اللہ کا‘ اور جو کوئی شکر کرتا ہے تو وہ شکر کرتا ہے اپنے بھلے کو‘ اور جو کوئی کفرانِ نعمت کی روش اختیار کرتا ہے تو اللہ غنی ہے (بے نیاز ہے‘ اور وہ آپ ہی اپنی ذات میں محمود ہے) ستودہ صفات ہے۔ اور یاد کرو جب کہ لقمان نے کہا اپنے بیٹے سے اور وہ اسے نصیحت کر رہے تھے کہ اے میرے بچے! اللہ کے ساتھ شرک نہ کیجیو‘ یقیناً شرک بہت بڑا ظلم (اور بہت بڑی ناانصافی) ہے۔ اور ہم نے انسان کو وصیت کی ہے اُس کے والدین کے بارے میں۔ اٹھائے رکھا اسے اس کی والدہ نے کمزوری پر کمزوری جھیل کر‘ اور اس کا دودھ چھڑانا ہے دو سالوں میں‘ کہ کر شکر میرا اور اپنے والدین کا۔ میری ہی طرف لوٹنا ہے۔ اور اگر وہ تجھ سے جھگڑیں اس بات پر کہ تو میرے ساتھ شریک ٹھہرائے جس کے لیے تیرے پاس کوئی علم نہیں ہے تو اُن کا کہنا مت مان اور دنیا میں ان کے ساتھ رہ معروف طور پر‘ اور پیروی کر اُس کے راستے کی جس نے اپنا رُخ میری طرف کر لیا ہو۔ پھر تم سب کو میری ہی طرف لوٹنا ہے اور میں تمہیں بتلا دوں گا جو کچھ تم کرتے رہے ہو۔ اے میرے بچے! خواہ وہ (یعنی نیکی یا بدی) رائی کے دانے کے ہم وزن ہو‘ اور خواہ وہ کسی چٹان میں ہو‘ خواہ آسمانوں میں ہو اور خواہ زمین میں ہو‘ اللہ اسے لے آئے گا۔ بے شک اللہ بہت باریک بین ہے‘ بہت باخبر ہے۔ اے میرے بچے! نماز قائم رکھ‘ نیکی اور بھلائی کا حکم دے‘ بدی اور برائی سے روک اور پھر صبر کر اُس پر کہ جو تجھ پر بیتے۔ یقیناً یہ بڑے ہمت کے کاموں میں سے ہے۔ اور اپنی گردن کو ٹیڑھا نہ کر (کج رُخی اختیار نہ کر) لوگوں کے لیے اور زمین میں اکڑ کر مت چل۔ اللہ کو مغرور لوگ اور شیخی خورے بالکل پسند نہیں۔ اپنی چال میں میانہ روی اختیار کر اور اپنی آواز کو پست رکھ‘ اس لیے کہ تمام آوازوں میں سب سے بڑھ کر ناپسندیدہ آواز گدھے کی آواز ہے‘‘۔

اس ترجمہ سے جو باتیں بادنیٰ تأمل سامنے آتی ہیں اور خاص طور پر اس منتخب نصاب کے اسباق کی ترتیب میں جن بنیادی امور کے پیش نظر اسے درسِ سوم کی حیثیت دی گئی ہے‘ مناسب ہے کہ سب سے پہلے انہیں سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ اس طرح ہم اِن شاء اللہ اِن آیات کے اصل سبق اور اُن کے لبِّ لباب کا جائزہ لے لیں گے۔

ترجمہ سے آپ نے محسوس کر لیا ہوگا کہ اِن آیات میں بھی وہی چار باتیں ایک نئے اسلوب اور ترتیب سے بیان ہو رہی ہیں جو اِس سے پہلے سورۃ العصر اور آیۂ بر میں آ چکی ہیں۔ اس لیے کہ اصل

ہدایت اور صراطِ مستقیم تو ایک ہی ہے اور اس کے سنگ ہائے میل تو وہی ہیں۔ فرق بقول شاعر صرف یہ ہے کہ ع ''اِک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں''۔ گویا مختلف اسالیب اور متنوع انداز سے ''راہِ ہدایت'' کو واضح کرنا ہی قرآن کا اصل مقصد ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ ہر جگہ وہ بنیادی مضامین نہ صرف ایک نئے رنگ کے ساتھ آئے ہیں' بلکہ موضوع اور سیاق وسباق بھی بدلا ہوا ہے اور بحث بھی نئی ہے۔

توحید

ذرا جائزہ لیجیے! یہاں ایمانیاتِ ثلاثہ کے ضمن میں ایمان باللہ کا ذکر بڑی وضاحت کے ساتھ آیا ہے' مثبت انداز میں بھی اور منفی انداز میں بھی! ایمان باللہ کا مثبت پہلو یہ ہے کہ اللہ کا شکر ادا کرو' اور ایمان باللہ کا منفی پہلو یہ ہے کہ اللہ کے ساتھ شرک نہ کرو۔ لہٰذا التزامِ شکرِ الٰہی اور اجتناب عن الشرک' یہ دونوں چیزیں اگر حاصل ہو جائیں تو گویا ایمان باللہ اور اس کی مطلوبہ کیفیات انسان کو بتمام وکمال حاصل ہو جائیں گی۔

رسالت

اس کے برعکس ایمان بالرسالت کا ذکر اس پورے رکوع میں آپ کو کہیں نہیں ملے گا۔ چنانچہ اس میں نہ کسی نبی کا ذکر ہے نہ کسی رسول کا' نہ وحی کا ذکر ہے نہ ملائکہ کا' اسی طرح کسی آسمانی کتاب کا بھی ذکر موجود نہیں ہے! اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں حکمت کی بنیادی باتیں' حکمتِ قرآنی کے بنیادی اصول ایک ایسی شخصیت کے حوالے سے بیان ہو رہے ہیں (یعنی حضرت لقمان) جو نہ نبی تھے' نہ رسول تھے' نہ ہی کسی نبی یا رسول کے اُمتی تھے۔ اُن کے ذکر سے مقصود یہ ہے کہ اس حقیقت کو اجاگر کیا جائے کہ اگر انسان فطرتِ سلیمہ اور عقلِ صحیح کی رہنمائی میں ذہنی سفر طے کرے گا اور حقیقت کا جویا اور متلاشی ہو گا تو وہ ازخود ایمان باللہ تک لازماً پہنچ جائے گا۔ لہٰذا یہاں نبوت ورسالت کا سرے سے کوئی ذکر نہیں ہے۔

معاد

البتہ ایمان بالآخرۃ' جس کا اصل جوہر اور اصل مآل جزائے اعمال یا مکافاتِ عمل ہے' یعنی یہ کہ انسان کے اعمال وافعال بے نتیجہ نہیں رہیں گے' بلکہ نیکی اور بدی کا بھرپور بدلہ مل کر رہے گا' تو اس کا ذکر یہاں نہایت بلیغ پیرائے میں موجود ہے۔ چنانچہ حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو جو نصائح کیں اُن

میں سے ایک اہم نصیحت یہ ہے کہ:

﴿یٰبُنَیَّ اِنَّهَا اِنۡ تَكُ مِثۡقَالَ حَبَّةٍ مِّنۡ خَرۡدَلٍ فَتَكُنۡ فِیۡ صَخۡرَةٍ اَوۡ فِی السَّمٰوٰتِ اَوۡ فِی الۡاَرۡضِ یَاۡتِ بِهَا اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَطِیۡفٌ خَبِیۡرٌ ﴿۱۶﴾﴾

''اے میرے بچے! نیکی یا بدی خواہ رائی کے دانے کے برابر ہو' اور پھر خواہ کسی چٹان میں چھپ کر کی گئی ہو' خواہ فضا کی پہنائیوں میں اور خواہ زمین کے پیٹ میں گھس کر (وہ ضائع نہیں ہوگی) اللہ اس کو لے آئے گا۔ بے شک اللہ بہت باریک بین' بہت باخبر ہے۔''

یہی اصل میں ایمان بالآخرۃ کا لبِّ لباب ہے کہ ع ''از مکافاتِ عمل غافل مشو!'' اعمال کا نتیجہ نکل کر رہے گا۔ لیکن دیکھ لیجیے کہ یہاں یومِ آخر' یوم القیامہ' جزاء وسزا اور جنت ودوزخ کا ذکر صراحت کے ساتھ موجود نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہ امور وہ ہیں جو صرف نبوت و رسالت کے ذریعے سے معلوم ہو سکتے ہیں۔ گویا یہاں ایمان بالآخرۃ کا بھی وہی پہلو مذکور ہے جس کا تعلق حکمت و دانائی سے ہے اور جس تک رسائی وحی' نبوت اور رسالت کے بغیر بھی صرف فطرتِ صحیحہ اور عقلِ سلیم کی رہنمائی میں ہو سکتی ہے!

حکمت کی اساس

واقعہ یہ ہے کہ حکمت کی اصل اساس یہ ہے کہ قلبِ انسانی میں خالق اور ربّ کی جو معرفت ودیعت شدہ لیکن خوابیدہ حالت میں ہے' انسان اس کی جوت کو اپنے قلب و ذہن میں جگا لے۔ گویا فطرت کی صحت اور فکر کی سلامتی کا لازمی نتیجہ ''شکر'' ہے۔ اور سلامتیٔ عقل اور درستیٔ فکر و نظر کا حاصل یہ ہے کہ انسان اپنے پروردگارِ حقیقی کو پہچان لے۔ بالفاظِ دیگر حکمت کا لازمی تقاضا ہے کہ یہ جذبۂ شکر اپنے اصل مالک' آقا' پالن ہار اور پروردگار کی ذات پر مرتکز ہو جائے۔ پھر یہی شکرِ الٰہی اس امر کو مستلزم ہے کہ ایسا انسان شرک سے بالکلیہ اجتناب اور توحید کا التزام کرے۔ لہٰذا لقمان حکیم نے' جن کو اللہ تعالیٰ نے دانائی اور حکمت عطا کی تھی' اپنی فطرتِ صحیحہ اور عقلِ سلیم کی روشنی میں ''توحید'' کی معرفت اور جذبۂ شکر سے سرشار ہونے کی سعادت حاصل کی۔ اسی لیے وہ اپنے بیٹے کو نہایت ہی دلنشین اور پیار بھرے انداز میں نصیحت کرتے ہیں کہ:

﴿یٰبُنَیَّ لَا تُشۡرِكۡ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّ الشِّرۡكَ لَظُلۡمٌ عَظِیۡمٌ ﴿۱۳﴾﴾

''اے میرے پیارے بچے! دیکھنا کہیں اللہ کے ساتھ (اُس کی ذات وصفات میں) کسی کو

شریک نہ ٹھہرالینا۔ یقیناً شرک بہت بڑا ظلم اور بہت بڑی ناانصافی ہے''۔

ادائے حقوق

ہم نے دیکھا تھا کہ سورۃ العصر اور آیۂ بر میں ایمان کے بعد اعمالِ صالحہ کا ذکر ہے۔ یہاں ان کے ضمن میں سب سے پہلی چیز جو سامنے آئی ہے وہ ادائے حقوق ہے اور اُن میں بھی اوّلین ذکر والدین کے حقوق کا ہے۔قرآن حکیم میں آپ کو کئی مقامات پر یہ اسلوب ملے گا کہ ادائے حقوق کے معاملے میں جہاں اللہ تعالیٰ کے اِس حق کا تذکرہ ہوگا کہ صرف اور صرف اُس کی عبادت کی جائے' شرک سے کلی اجتناب اور توحید کے کامل التزام کے ساتھ' وہاں اللہ کے اِس حق کے فوراً بعد والدین کے حقوق کا بیان ہوگا۔ جیسے یہاں ہم نے دیکھا کہ حضرت لقمان کی اپنے بیٹے کو اجتنابِ شرک اور التزامِ توحید کی نصیحت کے ذکر کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرمایا جا رہا ہے کہ:

﴿وَوَصَّیۡنَا الۡاِنۡسَانَ بِوَالِدَیۡہِ ۚ﴾ (آیت۱۴)

''اور ہم نے انسان کو نصیحت کی اس کے والدین کے بارے میں......''

اسی طرح سورۃ البقرۃ میں فرمایا:

﴿وَاِذۡ اَخَذۡنَا مِیۡثَاقَ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ لَا تَعۡبُدُوۡنَ اِلَّا اللّٰہَ ۟ وَبِالۡوَالِدَیۡنِ اِحۡسَانًا......﴾ (آیت۸۳)

''اور یاد کرو جب ہم نے بنی اسرائیل سے پختہ عہد لیا تھا کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا اور والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کرنا۔''

اسی طرح سورۃ الانعام میں فرمایا:

﴿قُلۡ تَعَالَوۡا اَتۡلُ مَا حَرَّمَ رَبُّکُمۡ عَلَیۡکُمۡ اَلَّا تُشۡرِکُوۡا بِہٖ شَیۡئًا وَّبِالۡوَالِدَیۡنِ اِحۡسَانًا ۚ﴾ (آیت۱۵۲)

''(اے نبیؐ! ان سے) کہہ دیجیے کہ آؤ میں تمہیں سناؤں کہ تمہارے ربّ نے تم پر کیا پابندیاں عائد کی ہیں! یہ کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ اور والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو۔''

سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا:

﴿وَقَضٰی رَبُّکَ اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّاۤ اِیَّاہُ وَبِالۡوَالِدَیۡنِ اِحۡسَانًا ؕ﴾ (آیت۲۳)

''اور تیرے ربّ نے فیصلہ کر دیا ہے کہ تم لوگ کسی کی عبادت نہ کرو مگر صرف اُس کی اور والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو۔''

والدہ کا خصوصی حق

اس رکوع میں جس کا ہم مطالعہ کر رہے ہیں' والدین کے حقوق کا ذکر کر کے والدہ کے حق کو نمایاں کیا گیا اور اپنے شکر کے ساتھ والدین کے شکر کی تاکید فرمائی گئی:

﴿وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ ۚ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ وَّفِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ ؕ اِلَيَّ الْمَصِيْرُ ⑭﴾

''اور ہم نے انسان کو وصیت کی اس کے والدین کے بارے میں۔ اٹھائے رکھا اسے اس کی والدہ نے کمزوری پر کمزوری جھیل کر اور اس کا دودھ چھڑانا ہے دو سالوں میں' کہ کر شکر میرا اور اپنے والدین کا' میری ہی طرف لوٹنا ہے''۔

والدین کے ساتھ حسنِ سلوک اصل میں ایک جامع عنوان ہے اس بات کا کہ اس دنیا میں انسان زندگی بسر کرتا ہے تو اس پر بہت سے لوگوں کے حقوق عائد ہو جاتے ہیں جنہیں اسے ادا کرنے کی فکر کرنی چاہیے۔ انہیں شریعت کی اصطلاح میں ''حقوق العباد'' کہا جاتا ہے اور ان میں سرفہرست والدین کے حقوق ہیں' اس میں قطعاً کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ انسان پر سب سے بڑا احسان تو بلاشک وبلاریب اللہ تعالیٰ کا ہے جو اُس کا خالق ہے' مالک ہے اور پروردگارِ حقیقی ہے۔ لیکن اللہ کے بعد انسان سب سے زیادہ زیر بارِ احسان ہے اپنے والدین کا جنہوں نے اسے پالا پوسا' اپنا پیٹ کاٹ کر اسے کھلایا پلایا' اپنے آرام کو تج کر اس کے آرام کی فکر کی' اس کی تکلیف پر بے چین ہوتے رہے۔ پھر اُن میں بالخصوص والدہ کا حق بہت فائق ہے۔ لہٰذا والدین کے ذکر کے بعد یہاں والدہ کا خاص طور پر ذکر آیا ہے' جس نے اسے ضعف پر ضعف برداشت کرتے ہوئے اپنے پیٹ میں اٹھائے رکھا۔ پیدائش کے بعد پھر وہ دو سال تک جونک کی طرح اس کی چھاتی سے چمٹ کر دودھ کی شکل میں اس کے جسم وجان کی توانائیاں چوستا رہا اور اس نے اپنی توانائیوں کو بہترین غذا بنا کر اس کے جسم میں اتارا' لہٰذا والدین بالخصوص والدہ کے اولاد پر یہ احسانات نہایت عظیم ہیں۔ چنانچہ انسانوں کے حقوق میں سرفہرست والدین کے حقوق ہیں۔

یہاں والدہ کے حقوق کے فائق ہونے کے ضمن میں دو مشہور احادیث کا ذکر مناسب رہے گا۔ ایک یہ کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''جنت ماں کے قدموں تلے

ہے''(۱)۔یعنی ماں کی خدمت اور اس کے ساتھ حسنِ سلوک انسان کے جنت میں داخل ہونے کے ذرائع میں سے ایک اہم ذریعہ ہے۔ دوسرے یہ کہ ایک مرتبہ ایک صحابیؓ نے حضور ﷺ سے دریافت کیا کہ ''میرے حسنِ سلوک کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے؟'' تو حضور ﷺ نے فرمایا: ''تیری ماں''۔صحابیؓ نے پھر پوچھا:''اس کے بعد؟'' جواب ملا: ''تیری ماں''۔صحابیؓ نے تیسری مرتبہ دریافت کیا:''اس کے بعد؟'' آپؐ نے پھر فرمایا:''تیری ماں''۔ چوتھی مرتبہ صحابیؓ کے سوال کے جواب میں ارشاد ہوا:''تیرا باپ''(۲)۔اس حدیث سے معلوم ہوا کہ باپ کے مقابلے میں ماں کا حق تین گنا فائق ہے۔

ایک لطیف نکتہ

یہاں ایک نکتہ قابل توجہ ہے اور وہ یہ کہ حضرت لقمان نے وصیت کرتے ہوئے بیٹے کو اللہ کا حق تو بتا دیا کہ ''اے میرے بچے! اللہ کے ساتھ شرک مت کرنا'' لیکن خود اپنے حقوق کو بیان کرنا انہیں زیب نہ دیتا تھا۔لہٰذا اس مضمون کی تکمیل اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے فرما دی اور حضرت لقمان کی نصیحتوں کے سلسلے میں ایک بات اپنی طرف سے داخل فرما دی جو والدین کے حقوق سے متعلق ہے۔ البتہ اس کے نتیجے میں ایک سوال خود بخود پیدا ہو گیا' یعنی یہ کہ اگر دونوں حقوق ایک دوسرے کے مقابل آ جائیں' اور باہم ٹکرا جائیں' یعنی ایک اللہ کا حق' دوسرے مخلوقات میں سے سب سے فائق والدین کا حق' اور خود والدین اپنی اولاد کو شرک پر مجبور کریں تو اس صورت میں اولاد کیا کرے؟ یہ ایک بالکل عملی مسئلہ ہے۔ نبی اکرم ﷺ پر جو لوگ ابتدا ہی میں ایمان لائے اُن میں متعدد نوجوان بھی تھے۔ان میں سے دو نوجوانوں حضرت سعد بن ابی وقاص اور حضرت مصعب بن عمیرؓ کا ذکر بہت مناسب ہے۔ان کے لیے سب سے بڑا عملی مسئلہ یہ کھڑا ہو گیا کہ اُن دونوں کی مائیں مشرک تھیں۔ وہ انہیں اپنے حقوق کا واسطہ دے کر مجبور کر رہی تھیں کہ اپنے آبائی دین کو ترک نہ کرو' اس میں واپس آ جاؤ۔ان نوجوانوں کی ماؤں نے بھوک ہڑتال اور مرن برت تک کی دھمکیاں دیں۔

---

(۱) سنن النسائی' کتاب الجھاد' باب الرخصة فی التخلف لمن له والدة۔ وسنن ابن ماجه' کتاب الجھاد' باب الرجل یغزو وله ابوان۔

(۲) صحیح البخاری' کتاب الآداب' باب من احق الناس بحسن الصحبة۔ وصحیح مسلم' کتاب البر والصلة والآداب' باب بر الوالدین وانھما احق به۔

اب ان سعادت مند، سلیم الفطرت اور صحیح العقل نوجوانوں کے سامنے یہ عملی سوال آیا کہ اب کیا کریں؟ —— ظاہر بات ہے کہ سعادت منداولاد کو فطری طور پر ماں باپ کے حقوق کا شعور ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے ان کے لیے ایک عملی پیچیدگی پیدا ہوگئی۔قرآن مجید نے اسی سیاق وسباق میں آگے اس کا حل پیش کر دیا:

﴿ وَاِنْ جٰهَدٰكَ عَلٰٓى اَنْ تُشْرِكَ بِىْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۙ فَلَا تُطِعْهُمَا ﴾

''اور اگر وہ تجھ سے جھگڑیں اس بات پر کہ تو میرے ساتھ شریک ٹھہرائے جس کے لیے تیرے پاس کوئی علم نہیں تو اُن کا کہنا مت مان''۔

البتہ یہ نہیں فرمایا کہ اس طرح ان کے سارے حقوق ساقط ہو گئے۔ایسا معاملہ نہیں ہے۔شرک پر مجبور کرنے کے ضمن میں تو اُن کی حکم عدولی کی جائے گی، لیکن ان کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم باقی اور برقرار رہے گا۔ چنانچہ فرمایا:

﴿ وَصَاحِبْهُمَا فِى الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا ۡ ﴾

''اور دنیا میں ان کے ساتھ رہ معروف طور پر (یعنی بھلے طریقے سے)''۔

لیکن اس کے ساتھ ہی بارِ دگر تنبیہ کر دی گئی کہ حسنِ سلوک میں اتباع یعنی پیروی شامل نہیں ہے۔ پیروی صرف اُس شخص کی کی جائے گی جس نے اپنا رُخ اللہ کی طرف کر لیا ہو! چنانچہ فوراً ہی ارشاد ہوا:

﴿ وَّاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَىَّ ۚ ﴾

''اور اتباع کرنا اُس کا جس نے اپنا رُخ میری طرف کر رکھا ہو''۔

مشرک والدین کا اتباع یا اُن کے نقشِ قدم کی پیروی نہ عقلاً لازم ہے نہ نقلاً واجب!

نگاہِ بازگشت

الحمد للہ کہ ہم نے اب تک اس رکوع کے نصف اوّل یعنی چار آیات کا طائرانہ جائزہ لے لیا ہے۔ آگے بڑھنے سے پہلے آیئے کہ ان کے مضامین پر نگاہِ بازگشت ڈال لیں۔ اس کی پہلی آیت میں حضرت لقمان کا تعارفی ذکر ہے۔دوسری آیت میں ان کی نصائح کا آغاز ہوا جن میں سے اوّلین اور اہم ترین نصیحت اجتناب عن الشرک کی پُرزور تاکید پر مشتمل تھی۔ بعد کی دو آیات میں اللہ تعالیٰ نے اس وصیت کا اپنی جانب سے ذکر فرما دیا جو جبلی طور پر بھی انسان کی طبیعت میں ودیعت کی گئی ہے اور اس کی توثیق الہام اور وحی کے ذریعے بھی ہوئی ہے۔ پھر اگر حقوق اللہ اور حقوق الوالدین میں ٹکراؤ

ہوتو ایک موحّد کو کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے‘اس کی ہدایت کر دی گئی۔ اس کے بعد پھر سے حضرت لقمان کی نصائح کا ذکر شروع ہوا جس میں دوسری نصیحت مکافاتِ عمل یعنی معاد سے متعلق ہے‘ اس کے بعد رکوع کے اختتام تک حضرت لقمان کی چند عملی نصیحتوں کا ذکر چلتا ہے۔

البتہ سورۃ العصر اور آیۃ البرّ کے مضامین کے ساتھ تقابل اور موازنہ کے حوالے سے بہتر ہوگا کہ مضمون مکمل ہو جائے اور چند اشارات کر دیے جائیں۔ آپ نے جان لیا کہ سورۃ العصر میں ایمان کی جامع اصطلاح اور آیۃ البر میں ایمانیات کی قدرے تفصیل مذکور تھی۔ اس کے مقابلے میں یہاں ایمان باللہ کا ذکر اللہ کے شکر اور اجتناب عن الشرک کی تاکید کی شکل میں آ گیا اور ایمان بالآخرۃ کا ذکر مکافاتِ عمل کے حوالے سے ہو گیا۔ پھر عملِ صالح کے ضمن میں بھی سورۃ العصر میں صرف ایک جامع عنوان وارد ہوا تھا جبکہ آیۂ بر میں عملِ صالح کے تین اہم گوشوں کی تفصیل مذکور تھی۔ بعینہٖ یہی معاملہ یہاں بھی ہے‘ حتیٰ کہ جیسے آیۂ بر میں انسانی ہمدردی کا ذکر مقدم تھا اقامتِ صلوٰۃ پر‘ یہاں بھی والدین کے حقوق کا ذکر پہلے آیا ہے اور صلوٰۃ کا ذکر بعد میں۔ اس کے بعد یہاں آپ مزید اعمالِ صالحہ شمار کریں گے تو آخری دو آیات میں تواضع‘ انکساری اور فروتنی کا معاملہ آئے گا۔ ’’صعر‘‘ اونٹ کی گردن کی ایک بیماری کو کہا جاتا ہے جس کی وجہ سے اس کی گردن ٹیڑھی ہو جاتی ہے۔ انسانوں میں جب تمکنت پیدا ہو جاتی ہے تو غرور کی وجہ سے چال میں اکڑ‘ اندازِ گفتگو میں بے اعتنائی اور کج ادائی آ جاتی ہے۔ حضرت لقمان کی نصائح کے ذریعے سے ان چیزوں سے روکا گیا‘ اس حوالے سے کہ اللہ تعالیٰ مغرور اور اترانے والے لوگوں کو بالکل پسند نہیں کرتا۔ مزید برآں عملی زندگی میں ہر اعتبار سے اعتدال اور توازن کی تاکید کی گئی۔

سورۃ العصر میں تیسری چیز تھی تواصی بالحق۔ یہاں اس کے ضمن میں ایک معین اصطلاح آ گئی ہے‘ یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر‘ چنانچہ اقامتِ صلوٰۃ کے تاکیدی حکم کے معاً بعد ارشاد ہوتا ہے:

﴿ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ ﴾

’’اور نیکی کا حکم دو اور بدی سے روکو‘‘۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہمارے دین کی بڑی اہم اصطلاحات ہیں‘ اتنی اہم کہ اُمّتِ مسلمہ کا مقصدِ تاسیس ہی اللہ تعالیٰ نے سورۃ آل عمران میں انہی اصطلاحات کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ:

﴿ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ

بِاللّٰہِ ؕ﴾ (آیت ۱۱۰)

''(اے مسلمانو!) تم وہ بہترین اُمت ہو جسے دنیا والوں کے لیے برپا کیا گیا ہے۔ تمہاری ذمہ داری ہے کہ نیکی کا حکم دو بدی سے روکو اور اللہ پر پختہ ایمان رکھو''۔

سورۃ العصر میں آخری چیز تھی تواصی بالصبر۔ یہاں حضرت لقمان کی نصیحتوں میں اس کا بیان آ گیا۔ آنجناب اپنے بیٹے سے کہتے ہیں کہ:

﴿ وَاصۡبِرۡ عَلٰی مَاۤ اَصَابَکَ ؕ اِنَّ ذٰلِکَ مِنۡ عَزۡمِ الۡاُمُوۡرِ ﴿۱۷﴾ ﴾

''اور صبر کر اُن مصائب پر جو (بالخصوص امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دینے پر) تجھے درپیش ہوں۔ یقیناً یہ (امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضے کی ادائیگی) بڑے ہمت اور حوصلے کے کاموں میں سے ہے۔''

نیکی کا حکم، نیکی کی تلقین اور بدی سے روکنا' اس پر نکیر' اس کو عام طور پر ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کیا جاتا۔ لہٰذا تمسخر واستہزاء' تضحیک وتوہین' مصائب وشدائد اور ابتلاء وامتحان اس راہ کے لوازم میں سے ہیں' ان کو جھیلنا اور برداشت کرنا ہوگا۔

یہ ہے اس رکوع کے مضامین کا خلاصہ جو بادنیٰ تأمل ہمارے سامنے آ گیا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی حکمت ودانائی کا وافر حصہ عطا فرمائے اور یہ حکمت ودانائی محض ذہن وفکر کی حد تک محدود نہ رہے بلکہ ہماری سیرت وکردار اور اخلاق ومعاملات میں رچ بس جائے اور ہماری شخصیت کا ایک جزوِ لاینفک بن جائے۔ آمین یاربّ العالمین!

آیاتِ مبارکہ کا بطریقِ تدبّر مطالعہ

قارئین کرام کو یاد ہوگا کہ سلسلۂ درس کے بالکل آغاز میں یہ عرض کیا گیا تھا کہ فہمِ قرآن کے دو درجے ہیں۔ ایک تذکر بالقرآن' یعنی آیات اور سورتوں کے مطالعے سے ان کا اصل سبق اور اُن کا لبِّ لباب حاصل کر لیا جائے' گویا بنیادی ہدایت اخذ کر لی جائے' دوسرا تدبر قرآن' یعنی قرآن مجید کی آیات اور سورتوں کی گہرائیوں میں غوطہ زنی کی جائے' ایک ایک لفظ پر تدبر وتفکر کا حق ادا کیا جائے' آیات کے باہمی ربط اور سورتوں کے داخلی اور خارجی نظم کا فہم حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ ہم نے سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع پر بطریق تذکر اختصار کے مدنظر جس حد تک ممکن ہو سکا وہ اساسی رہنمائی اخذ کر لی ہے جو اِس رکوع کے اصل سبق سے متعلق ہے۔ اب ہمیں اس رکوع پر بطریقِ تدبّر

غور کرنا ہے۔

یہ رکوع اس اعتبار سے بہت اہم ہے کہ اس میں حکمتِ قرآنی کی اساسات متعین ہوتی ہیں۔ ''حکمت'' کا لفظ اردو میں مستعمل ہے اور بالعموم اس کو ہم فلسفہ کے ساتھ جوڑ کر استعمال کرتے ہیں' یعنی فلسفہ وحکمت' لیکن یہ بات سمجھنا بہت ضروری ہے کہ فلسفہ اور حکمت میں ایک بڑا بنیادی فرق ہے۔ فلسفے کا دارومدار خالصتاً عقل پر ہے۔ چنانچہ فلسفہ منطق کے اصولوں پر آگے بڑھتا ہے' جبکہ حکمت کی اصل اساس بدیہیاتِ فطرت پر ہے اور اس عمارت کی تعمیر فطرت کے مسلّمات کی بنیاد پر ہوتی ہے' اگرچہ عقلِ سلیم اسے ایک ہنرمند معمار کی طرح اُوپر اٹھاتی ہے' بالکل ایسے جیسے قرآن حکیم میں کلمۂ طیبہ اور عملِ صالح کے باہمی ربط وتعلق کو واضح کیا گیا کہ:

﴿اِلَیۡهِ یَصۡعَدُ الۡكَلِمُ الطَّیِّبُ وَالۡعَمَلُ الصَّالِحُ یَرۡفَعُهٗ ؕ﴾ (فاطر: ۱۰)

''اسی کی جانب بلند ہوتے ہیں کلماتِ طیبات اور عمل صالح انہیں اُوپر اٹھاتا ہے۔''

واضح رہے کہ ہماری فطرت میں کچھ حقائق مضمر ہیں جنہیں ہم اپنے شعور کی تحتانی سطح پر محسوس کرتے ہیں' اور چاہے ہم ان کے لیے کوئی دلیل نہ دے سکیں لیکن فطرت کے ان مضمر حقائق کا ہم نہ انکار کر سکتے ہیں نہ ابطال۔ ان بدیہیاتِ فطرت کو بنیاد بنا کر جب تعقل وتفکر کا عمل آگے بڑھے تو اس طرح جو دولتِ عظمیٰ حاصل ہوگی وہ ''حکمت'' ہے۔ ذرا اِس لفظ ''حکمت'' کو بھی اچھی طرح سمجھ لیجیے۔ عربی زبان میں ''ح ک م'' کے مادے سے جو الفاظ بنتے ہیں ان سب میں آپ کو کسی شے کی پختگی اور مضبوطی کا مفہوم مشترک ملے گا۔ چنانچہ اسی سے لفظ استحکام بنا ہے جسے عام طور پر ہمارے یہاں استعمال کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ فلاں چیز مستحکم ہے' یعنی بہت پختہ اور مضبوط ہے۔ ''حکمت'' اصل میں انسان کی عقل وشعور کی وہ پختگی ہے کہ جس سے اس میں اصابتِ رائے پیدا ہو جائے' اس میں صحیح نتائج اخذ کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے' اس میں صحیح وغلط میں فرق وامتیاز کرنے کی اہلیت پیدا ہو جائے اور اسے صحیح حقائق تک رسائی حاصل ہو جائے۔ ان تمام اوصاف کو جمع کریں تو انسان میں جو قابلیت اور صلاحیت پیدا ہو گی وہ ''حکمت'' ہے۔ قرآن مجید میں سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۶۹ میں ''حکمت'' کو اللہ تعالیٰ نے اپنا ایک بہت بڑا انعام واحسان اور بہت بڑا افضل قرار دیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا:

﴿یُّؤۡتِی الۡحِكۡمَةَ مَنۡ یَّشَآءُ ۚ﴾

''اللہ تعالیٰ حکمت عطا فرماتا ہے جس کو چاہتا ہے۔''

اور:

﴿وَمَنۡ يُّؤۡتَ الۡحِكۡمَةَ فَقَدۡ اُوۡتِىَ خَيۡرًا كَثِيۡرًا ؕ﴾

''اور جسے حکمت عطا ہوگئی اسے تو خیرِ کثیر عطا ہوگیا۔''

گویا اسے نہایت قیمتی اور کمیاب شے مل گئی۔ چنانچہ ہمارے دین کی ایک اعلیٰ قدر حکمت ہے۔ یعنی عقل وشعور کی پختگی' دانائی' حقائق رسی کی صلاحیت' اصابتِ رائے' نیکی اور بدی میں تمیز کرنے کی اہلیت اور خیر وشر میں فرق کرنے کی قابلیت۔ جس کو اللہ تعالیٰ یہ سب کچھ عطا فرما دے اس پر اللہ تعالیٰ کے انعام' احسان اور فضل کا کیا کہنا! اس موقع پر مناسب ہے کہ حکمت کے ضمن میں نبی اکرم ﷺ کی ایک حدیث بھی بیان کردی جائے۔ آنحضور ﷺ فرماتے ہیں:

((اَلۡـكَلِمَةُ الۡحِكۡمَةُ ضَالَّةُ الۡمُؤۡمِنِ ' فَحَيۡثُ وَجَدَهَا فَهُوَ اَحَقُّ بِهَا)) (۱)

''حکیمانہ بات مؤمن ہی کی گمشدہ متاع کے مانند ہے' وہ اس کا سب سے زیادہ حق دار ہے جہاں کہیں بھی اسے پائے۔''

یعنی جیسے ہماری کوئی چیز کہیں کھوگئی ہو اور پھر وہ ہمیں کہیں نظر آئے تو ہم اس کی طرف لپکتے ہیں کہ یہ میری چیز ہے۔ اس فعل میں ہمیں کوئی رکاوٹ اور کوئی جھجک نہیں ہوتی۔ بالکل اسی نوعیت کا معاملہ مؤمن کا ہے کہ حکمت ودانائی اسے جہاں بھی نظر آئے گی وہ اسے لپک کر قبول کرلے گا' بالکل اسی طرح جس طرح کوئی شخص اپنی کسی گم شدہ چیز کو حاصل کرنے کے لیے لپکتا ہے۔ بلکہ حضور ﷺ کا ارشاد تو یہ ہے کہ مؤمن حکمت کا سب سے زیادہ مستحق ہے۔

حکمتِ قرآنی کی اساسِ اوّل: شکرِ خداوندی

سورۂ لقمان کے اس رکوع میں حضرت لقمان کی شخصیت کے حوالے سے گفتگو ہوئی' لیکن حکمتِ قرآنی کی دو اساسات کو متعین کردیا گیا۔ پہلی اساس ہے شکرِ خداوندی۔ یہاں مناسب ہوگا کہ لفظ ''شکر'' کو بھی اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ اگرچہ یہ لفظ اردو میں مستعمل ہے' لیکن اگر کسی سے پوچھا جائے کہ شکر کسے کہتے ہیں' اس کے معنی کیا ہیں' تو جواب ملے گا کہ شکر' شکر ہوتا ہے۔ اس کے لیے اکثر لوگ شاید کوئی دوسرا لفظ استعمال نہ کرسکیں۔ شکر کیا ہے! اس کی امام راغب اصفہانیؒ نے بڑی عمدہ

(۱) سنن الترمذی' کتاب العلم' باب ما جاء فی فضل الفقه علی العبادة۔ و سنن ابن ماجه' کتاب الزهد' باب الحکمة' عن ابی هریرة رضی اللہ عنہ۔

تشریح فرمائی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ’’شکر کے معنی ہیں کسی احسان و انعام کا ادراک وتصور اور اس کا اظہار واعتراف‘‘۔اس کے برعکس جو کیفیت ہے وہ ’’کفر‘‘ ہے۔اس رکوع کی پہلی آیت میں فرمایا گیا:

﴿ وَمَنۡ یَّشۡکُرۡ فَاِنَّمَا یَشۡکُرُ لِنَفۡسِہٖ ۚ وَمَنۡ کَفَرَ فَاِنَّ اللّٰہَ غَنِیٌّ حَمِیۡدٌ ﴿۱۲﴾ ﴾

’’اور جو شکر کرتا ہے اپنے بھلے کے لیے کرتا ہے اور جس نے کفر کیا تو بلاشبہ اللہ بے نیاز ہے اور اپنی ذات میں ستودہ صفات (اور از خود محمود) ہے۔‘‘

عام طور پر کفر کے معنی صرف انکار کے سمجھے جاتے ہیں۔ جیسے کوئی دین کی کسی بنیادی بات کا انکار کرے‘ توحید کا منکر ہو یا اللہ کی صفاتِ کمال کا منکر ہو‘اسی طرح رسالت کا منکر ہو یا ختمِ نبوت کا منکر ہو‘آخرت کا منکر ہو یا جنت اور دوزخ کا منکر ہو تو ایسا شخص کافر ہے۔ یہ بات اپنی جگہ صد فیصد صحیح ہے‘ لیکن لغوی اعتبار سے اصل میں کفر‘ شکر کی ضد ہے۔ یہ دونوں الفاظ ’’شکر وکفر‘‘ متضاد معنی کے حامل (antonyms) ہیں۔شکر یہ ہے کہ انسان کو نعمت کا احساس ہو اور وہ اس کا اظہار کرے۔اور کفر کے معنی ہیں چھپا دینا‘ دبا دینا‘ لہٰذا جب یہ شکر کے مقابلے میں آئے گا تو اس کا مفہوم ہوگا ناشکرا پن یا کفرانِ نعمت۔

آپ تھوڑے سے غور سے اس نتیجہ تک خود پہنچ جائیں گے کہ شکر فطرت کا جزوِ لاینفک ہے‘ بشرطیکہ فطرت صحیح ہو اور مسخ نہ ہوئی ہو۔ یہ بات اس حد تک درست ہے کہ یہ معاملہ صرف انسانوں تک محدود نہیں بلکہ حیوانات تک میں پایا جاتا ہے۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ اگر کوئی بھوکا پیاسا جانور ہو‘ آپ نے اس کے سامنے چارہ یا پانی رکھ دیا اور اس نے اپنی بھوک یا پیاس مٹائی تو اب وہ گردن اٹھا کر جب آپ کو دیکھے گا تو آپ کو اُس کی آنکھوں میں جذبۂ تشکر چھلکتا ہوا نظر آئے گا۔ یہ فطرت ہے اور اچھی طرح جان لیجیے کہ فطرت کی صحت کی علامت یہ ہے کہ انسان میں شکر کا جذبہ موجود ہو۔اگر یہ کیفیت ختم ہو جائے تو ایسا شخص ایک ناشکرا انسان ہوگا کہ اس کے ساتھ بھلائی کی جارہی ہو اور اسے احساس بھی نہ ہو کہ کسی نے اس کے ساتھ بھلائی کی ہے‘ اسے شعور تک نہ ہو کہ کسی نے اس کے ساتھ احسان اور حسنِ سلوک کا معاملہ کیا ہے۔ایسے شخص کے لیے حکم لگایا جائے گا کہ اس کی فطرت مسخ ہو چکی ہے یا بالفاظِ دیگر اس کی فطرت کے سوتے خشک ہو چکے ہیں۔عرب ابلتے چشمے کو ’العین الشکریٰ ‘‘ کہتے ہیں۔یعنی وہ چشمہ جس سے پانی ابل رہا ہے۔ پھر ’’دَابَّۃٌ شَکُوۡرٌ ‘‘ اس جانور اور اس حیوان کو کہتے ہیں کہ اگر اس کی ٹہل سیوا کی جائے‘ اچھا کھانے پینے کو دیا جائے تو وہ فربہ ہوتا ہے۔اس دیکھ بھال اور اچھی غذا کا اس

کے وجود میں ظہور ہوتا ہے تو اسے وہ دَابَّةٌ شَكُوْرٌ کہتے ہیں۔ لہٰذا شکر فطرت کے اس جذبے کو کہتے ہیں جو کسی نعمت اور کسی احسان پر انسان کے باطن سے ابھرتا ہے۔ اب اس فطری اساس پر عقلِ سلیم کے ذریعے اضافی تعمیر ہوگی۔ عقل کا وظیفہ کیا ہے؟ یہ کہ وہ اپنے محسنِ حقیقی کو پہچانے اور اس طرح اس کے شکر اور احسان مندی کے جذبے سے اس کا ذہن وقلب سرشار ہو جائے۔

ذرا غور فرمائیے کہ جب انسان عہدِ طفولیت میں ہوتا ہے تو اس کے ذہن کی دنیا ابھی اتنی محدود ہوتی ہے کہ وہ اپنے والدین ہی کے بارے میں یہ سمجھتا ہے کہ یہی میرے رازق ہیں، یہی میرے محافظ ہیں، یہی میرے دکھ درد محسوس کرنے والے ہیں، مجھے کوئی تکلیف ہو تو اسے یہی رفع کرنے والے ہیں، لہٰذا اس کا غیر شعوری جذبۂ شکر اپنے والدین کی ذات پر مرتکز رہتا ہے، لیکن جیسے جیسے فکرِ انسانی کا ارتقاء ہوتا ہے اور عقل اپنی ارتقائی منزلیں طے کرتی ہے، انسان کا شعور پروان چڑھتا ہے اور اس کے ذہن میں وسعت پیدا ہوتی ہے تو انسان کو معلوم ہوتا چلا جاتا ہے کہ میں تو بہت سوں کا زیرِ بارِ احسان ہوں۔ میرا وطن ہے، میری قوم ہے، میرے اعزہ واقرباء ہیں۔ یہ سب کے سب میرے محسن ہیں، میری بھلائی کے لیے سوچتے ہیں۔ میں درجہ بدرجہ ان سب کا زیرِ بارِ احسان ہوں۔ اسی طرح گویا جذبۂ شکر پھیل رہا ہے۔ پھر انسان یہاں تک سوچتا ہے کہ یہ زمین جس سے مجھے غذا حاصل ہو رہی ہے، یہ سورج جس سے یہ سارا نظام چل رہا ہے، فصلیں پک رہی ہیں، بارشیں ہو رہی ہیں جن سے مُردہ زمین زندہ ہو جاتی ہے تو میں ان میں سے ہر چیز کا زیرِ بارِ احسان ہوں۔ میری جو ضروریات پوری ہو رہی ہیں تو اس پوری کائنات کی ایک ایک شے میری ضروریاتِ زندگی کی بہم رسانی میں لگی ہوئی ہے۔ اس طرح یہ شکر پھیل کر کائنات کی وسعتوں کو اپنے اندر سمو لیتا ہے!

اس کے بعد اگر انسان ایک چھلانگ اور لگا لے، فکرِ انسانی اگر ایک قدم اور اٹھا لے تو وہ اس نتیجے تک پہنچ سکتا ہے کہ یہ تمام مظاہرِ فطرت اور ان میں جو تعدّد نظر آ رہا ہے، ان میں جو توافق اور نظم نظر آ رہا ہے، ان سب کا منبع اور سرچشمہ کوئی ایک ذات ہے۔ سورج میں جو تمازت ہے وہ اس کی اپنی نہیں، کوئی اور ہے جس نے اس میں یہ حرارت وتمازت رکھی ہے۔ کسی شے میں اگر کوئی وصف ہے تو وہ اس کا ذاتی نہیں، کسی کا عطا کردہ ہے۔ ایک خالق، ایک ربّ، ایک منعم ہے جس کے انعامات واحسانات کا یہ پورا سلسلہ اس کائنات میں پھیلا ہوا ہے۔ نتیجہ کیا نکلے گا! یہ کہ غور وفکر اور عقل کا یہ ذہنی سفر جب اس حد کو پہنچ جائے گا تو وہ شکر جو والدین کی ذات سے شروع ہو کر پھیلتا ہوا

کائنات کی وسعتوں کو محیط ہو گیا تھا‘ ایک ذات پر مرتکز ہو جائے گا اور وہ سمجھ لے گا کہ شکر کا مستحقِ حقیقی اللہ ہے۔ یہاں فطرت اور تعقل کے امتزاج سے جو کچھ حاصل ہوا ہے وہ معرفتِ توحیدِ باری تعالیٰ ہے جس کا نتیجہ شکرِ خداوندی ہے۔ اسی بات کو اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا:

﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ ؕ﴾

''اور بے شک ہم نے لقمان کو دانائی عطا کی اور حکمت سے نوازا کہ شکر کر اللہ کا''۔

معلوم ہوا کہ یہاں کلمہ ''اَنْ'' حکمت و دانائی کے لازمی و منطقی نتیجے کی جانب رہنمائی کے لیے آیا ہے۔ گویا وہ عقلیت سرے سے حکمت قرار ہی نہیں دی جا سکتی جس سے شکرِ خداوندی کی کیفیت قلب و ذہن میں پیدا نہ ہو۔

مزید برآں اس شکر کے تین درجے ہیں۔ امام راغبؒ نے بہت خوبصورتی سے اس مسئلہ پر بحث کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ شکر کا پہلا درجہ یہ ہے کہ نعمت کا احساس وادراک ہو۔ ظاہر بات ہے کہ اگر کسی بچے کے ہاتھ پر کوہِ نور ہیرا رکھ دیا جائے تو اسے معلوم ہی نہیں ہوگا کہ اسے کیا چیز دی گئی ہے! وہ اسے کانچ کا ٹکڑا سمجھے گا۔ لہٰذا جس درجے کا شکر اس میں پیدا ہونا چاہیے وہ پیدا ہی نہیں ہو سکتا‘ اس لیے کہ اسے شعور ہی نہیں ہے کہ مجھ پر کتنا بڑا احسان کیا گیا ہے! پس پہلا درجہ ہوگا نعمت کا کما حقہٗ ادراک و شعور۔ دوسرا درجہ ہوگا شکر باللّسان‘ یعنی زبان سے بھی منعم و محسن کی حمد و ثنا ہو‘ جسے ہم شکریہ ادا کرنا کہتے ہیں۔ جیسے ''thanks'' اور ''شُـــکــــرًا'' کہا جاتا ہے۔ یہ الفاظ متمدن و مہذب معاشرہ میں سب سے زیادہ کہے اور سنے جانے والے الفاظ ہوں گے۔ پھر تیسرا درجہ ہے شکر بالجوارح کا‘ یعنی اس نعمت کا حق اپنے پورے وجود سے ادا کرو۔ اگر کسی بچے کو اس کے والد نے بہت عمدہ کتاب لا کر دی‘ بچہ مہذب تھا‘ اس نے اپنے والد کا شکریہ ادا کر دیا‘ لیکن پھر اس نے اس کتاب کو طاقِ نسیان پر رکھ دیا اور اس سے کوئی استفادہ نہ کیا تو یہ ناشکرا پن ہے‘ ناقدری ہے۔ لہٰذا نعمت کا حق ادا کرنا بھی شکر کا تقاضا ہے۔

الغرض شکر تقاضائے فطرت ہے‘ اور عقلِ سلیم کا مآل یہ ہے کہ اپنے اصل محسن و منعم اور خالق و مالک کو پہچان لے۔ اور ان دونوں کے امتزاج سے اللہ کے شکر و امتنان کے جذبات کا چشمہ دل کی گہرائیوں سے ابلتا ہے اور اس کی حمد و ثنا کے زمزمے انسان کی زبان پر جاری ہو جاتے ہیں! پھر شکر خداوندی کا تقاضا ہے کہ انسان اللہ کا حق ادا کرے‘ اور اللہ کا سب سے بڑا حق وہ ہے جسے اگلی آیت

میں حضرت لقمان کی پہلی نصیحت میں بایں الفاظ بیان کیا گیا:

﴿یٰبُنَیَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ۖ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ ﴿۱۳﴾﴾

''اے میرے پیارے بچے! دیکھنا اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرانا' بلاشبہ شرک بہت بڑا ظلم (اور بہت بڑی ناانصافی) ہے۔''

انسان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو بے حد و حساب نعمتیں ملی ہیں' اس پر احسانات کی جو بارش ہوئی ہے تو انسان سے اس کی نعمتوں کا جو عظیم ترین حق مطلوب ہے وہ التزامِ توحید اور اجتناب عن الشرک ہے۔ یہ بہت اہم موضوع ہے۔

حکمتِ قرآنی کی اساس دوم

اس رکوع میں حکمتِ قرآنی کی جو دوسری بات آئی ہے اب اس پر غور کیجیے۔ وہ بات معروف اور منکر یعنی نیکی اور بدی کا تصور ہے۔ قرآن مجید ہمیں بتاتا ہے کہ فطرتِ انسانی میں نیکی اور بدی کی پہچان اللہ کی جانب سے ودیعت شدہ موجود ہے۔ انسان ان میں طبعاً امتیاز کرتا ہے' اس کی ضرورت نہیں ہے کہ انسان کو بتایا جائے کہ سچ بولنا اچھا ہے' جھوٹ بولنا برا ہے۔ انسان کی اپنی فطرت اس بات سے واقف ہے کہ سچائی نیکی ہے اور جھوٹ بدی ہے۔ وعدہ پورا کرنا نیکی ہے' وعدے کی خلاف ورزی کرنا بدی ہے۔ دیانت وصداقت اعلیٰ اقدار ہیں' خیانت وکذب برائیاں ہیں۔ ہمسائے کے ساتھ حسن سلوک خیر ہے' ہمسائے کو پریشان کرنا اور اسے اذیت پہنچانا شر ہے۔ چنانچہ قرآن نے نیکی کے جملہ اعمال ومظاہر کے لیے جو اصطلاح اختیار کی ہے وہ ہے ''معروف''۔ معروف کے معنی ہیں ''جانی پہچانی چیز''۔ اس کے برعکس بدی کے لیے قرآن کی اصطلاح ''منکر'' ہے۔ منکر اس چیز کو کہتے ہیں جو پہچان میں نہ آئے' جس سے انسان کی طبیعت کو نفرت اور اباء ہو۔ یہ قرآن حکیم کا اعجاز ہے کہ اس نے ان دو الفاظ کے حوالے سے حکمت کے نہایت اہم مسائل پر سے پردے ہٹا دیے ہیں اور ان کو مبرہن کر دیا ہے۔ قرآن بتاتا ہے کہ نہ صرف یہ کہ انسان اپنی فطرت سے جانتا ہے کہ نیکی کیا ہے بدی کیا ہے' خیر کیا ہے شر کیا ہے! بلکہ فطرتِ انسانی کا میلان نیکی کی طرف ہے۔ وہ اس کی فطرت کی جانی پہچانی چیز ہے۔ اس کا طبعی رجحان نیکی کی طرف ہے' بدی کی طرف نہیں۔ وہ بدی سے طبعاً نفرت کرتا ہے۔ یہ بالکل علیحدہ بات ہے کہ بالکل غیر معمولی حالات میں یا غلط ماحول سے متاثر ہو کر انسان بدی کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے' لیکن اس کی فطرت اسے متنبہ کرتی رہتی ہے اور اس کا ضمیر اس کو ٹوکتا رہتا ہے کہ تم غلط راستے

پر جا رہے ہو‘ اِلّا یہ کہ اس کی فطرت ہی مسخ ہو گئی ہو۔ الغرض یہ ہے حکمتِ قرآنی کی دوسری اہم اساس جس کا تعلق ایمان بالآخرۃ سے ہے۔

یہ بات اس منتخب نصاب میں آئندہ واضح ہو کر سامنے آئے گی کہ اگر نیکی نیکی ہے اور بدی بدی ہے تو نیکی کی جزا ملنی چاہیے اور بدی کی سزا۔ ع گندم از گندم بروید جو زِ جو۔ اگر گندم سے گندم اور جو سے جو پیدا ہوتے ہیں تو کیسے ممکن ہے کہ نیکی کی جزا اور بدی کی سزا نہ ملے جو بالعموم اس دنیا میں نہیں ملتی‘ لہٰذا اس کے لیے کسی دوسرے عالم کی ضرورت ہے۔ یا پھر یہ کہنا پڑے گا کہ نیکی اور بدی برابر ہیں‘ ان میں کوئی فرق و تفاوت نہیں ہے۔ لیکن فطرتِ سلیمہ اور عقلِ صحیحہ اس کو قبول نہیں کرتی۔ فطرت اور عقل کا فیصلہ یہ ہے کہ نیکی نیکی ہے‘ بدی بدی ہے اور نیکی کا نتیجہ اچھا اور بدی کا نتیجہ برا نکلنا چاہیے۔ مکافاتِ عمل کی یہی بات حضرت لقمان نے کہی: ’’اے میرے پیارے بچے! نیکی یا بدی خواہ رائی کے دانے کے برابر ہو‘ پھر خواہ وہ کسی چٹان میں کی گئی ہو یا کہیں فضا کی پہنائیوں میں کی گئی ہو یا کہیں زمین کے پیٹ میں گھس کر کی گئی ہو‘ اللہ اس کو لے آئے گا‘‘۔ یہ اعمالِ انسانی ضائع جانے والے نہیں۔ یہ ہیں وہ امور جن کو قرآن حکمت سے موسوم کرتا ہے اور جن تک انسان غور و فکر کے نتیجے میں از خود پہنچ سکتا ہے۔ اگر آپ ان کے لیے لفظ فلسفہ استعمال کرنا چاہیں تو یوں کہا جا سکتا ہے کہ قرآن حکیم کے فلسفہ کی عمارت ان اساسات پر تعمیر ہوتی ہے۔

چند امور کی وضاحت

حکمتِ قرآنی کی اساسات کے ضمن میں چند امور کی وضاحت ضروری ہے۔

۱) انسان پر اللہ تعالیٰ کا شکر تو فرض کے درجے میں ہے۔ جو شخص اللہ کے شکر کی روش اختیار کرے گا اس کی فطرت میں دوسرے محسنین کے شکر کی عادت اور خُو بھی یقیناً پیدا ہو گی۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے: ((مَنْ لَّمْ يَشْكُرِ النَّاسَ لَمْ يَشْكُرِ اللّٰهَ))(۱) ’’جو شخص انسانوں کا شکر ادا نہیں کرتا وہ اللہ کا شکر بھی ادا نہیں کرے گا‘‘۔ اس لیے کہ جس کنویں کا پانی خشک ہو چکا ہو اُس میں ڈول کوئی بھی ڈالے پانی نہیں نکلے گا۔ جس کی فطرت کے سوتے خشک ہو چکے ہوں اس میں سے شکر کا جذبہ نہ انسانوں کے لیے برآمد ہو گا نہ اللہ کے لیے۔

(۱) سنن الترمذی‘ کتاب البر والصلة‘ باب ما جاء فی الشكر لمن احسن اليك۔ ومسند احمد‘ کتاب باقی مسند المكثرين‘ باب مسند ابی هريرة رضی الله عنه۔

۲) اگر انسان کی فطرت میں شکر کا مادہ ہے اور احسان مندی کا جذبہ ہے تو اس کی اپنی شخصیت کا ارتقاء صحیح رُخ پر ہوگا۔ معاذ اللہ' اللہ کو شکر کی احتیاج نہیں ہے' کوئی اس کی حمد وثنا کرے نہ کرے وہ تو اپنی ذات میں غنی ہے' حمید ہے' از خود محمود ہے' ستودہ صفات ہے' اس کو شکر کی حاجت نہیں ہے۔ شکر کی ضرورت خود انسان کو ہے۔ یہ جذبہ اس کے اندر اگر موجود ہے تو اس کی شخصیت کا صحیح سمت میں ارتقاء ہوگا اور اس کی خودی اور سیرت کی تعمیر صحیح اساسات پر ہوگی۔

۳) امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ضمن میں انسان کو اپنی ذات اور اپنے نفس کو مقدم رکھنا ضروری ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ہم دوسروں کو تو نیکی کی نصیحت وتلقین کریں اور خود اُس پر عامل نہ ہوں۔ برائی پر ہم دوسروں کی نکیر کریں' ان پر تنقید کریں اور اپنی برائیوں پر نہ نظر ڈالیں نہ ان کو دور کرنے کی فکر کریں۔ سورۃ البقرۃ میں بنی اسرائیل کے جرائم میں جو فہرست بیان ہوئی ہے اس میں ایک جرم یہ بھی فرمایا گیا:

﴿اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَکُمْ﴾ (البقرۃ:٤٤)

''کیا تم لوگوں کو نیکی اور بھلائی کا حکم دیتے ہو (اور انہیں اس کی تلقین ونصیحت کرتے ہو) اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو!''

تو انسان میں یہ دونوں وصف بیک وقت مطلوب ہیں۔ وہ اپنی اصلاح کے لیے بھی کوشاں رہے اور دوسروں کو بھی اس کی تلقین کرتا رہے۔ یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے کے لیے مدد ومعاون ہوں گی۔

۴) ایک بات یہ بھی سمجھ لیجیے کہ عربی زبان میں ''امر'' جہاں حکم کے معنی میں آتا ہے وہاں تلقین' نصیحت اور مشورے کے لیے بھی آتا ہے۔ اس کے معانی کلام کے سیاق وسباق کے اعتبار سے متعین ہوتے ہیں۔

۵) آخری بات یہ کہ احادیثِ نبویہ میں سارا زور نہی عن المنکر پر ملتا ہے۔ اس کی حکمت بھی بادنیٰ تأمل سمجھ میں آتی ہے۔ جس معاشرے میں برائیوں کو گوارا کیا جائے' ان سے صرفِ نظر اور اعراض کیا جائے' ان کو روکنے اور مٹانے سے غفلت اختیار کی جائے تو معاشرے میں نیکیوں کے فروغ اور نشوونما کے لیے ماحول قطعی ناسازگار ہو جائے گا۔ اس کی مثال یہ ہے کہ کسی پھل پھول والے پودے کے ساتھ جو جھاڑ جھنکاڑ اُگ آتا ہے اگر باغبان اس کی صفائی نہ کرے تو زمین اور فضا سے

ملنے والی غذائیں اس پودے کے بجائے یہ جھاڑ جھنکاڑ ہڑپ کر جائیں گے اور پودے کو پنپنے اور نشوونما کے لیے غذا مہیا ہی نہیں ہو سکے گی۔

٦) معاشرے سے برائیوں کو دور کرنے کے حدیث میں تین درجے بیان ہوئے ہیں۔ مسلم شریف کی حدیث ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ رَآی مِنْکُمْ مُنْکَرًا فَلْیُغَیِّرْهُ بِیَدِهٖ ، فَاِنْ لَمْ یَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهٖ ، فَاِنْ لَمْ یَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهٖ))

یعنی تم میں سے جو کوئی بھی کسی برائی کو دیکھے تو پہلا درجہ عزیمت کا ہے کہ طاقت سے برائی کو روک دے۔ اگر اس کی استطاعت نہ ہو تو زبان سے تلقین کی جائے، نصیحت کی جائے کہ کیا کر رہے ہو، باز آ جاؤ۔ ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ حالات اتنے بگڑ جائیں کہ زبانوں پر تالے ڈال دیے جائیں، زبان بندی ہو جائے، تو دل میں یہ احساس ضرور رہے، صدمہ ضرور رہے کہ یہ کیا ہو رہا ہے! ایک شدید کرب کا احساس باقی رہے۔ یہ آخری درجہ ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ((وَذٰلِکَ اَضْعَفُ الْاِیْمَانِ)) (۱) ''اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے''۔ اگر برائیوں پر دل کی کڑھن بھی موجود نہ رہے تو معلوم ہوا کہ ایمان کی رمق بھی اندر باقی نہیں رہی ہے۔ یہ وہ درجہ ہے جس کے بارے میں علامہ اقبال نے کہا کہ: ؎

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا!
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

(۱) صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان کون النھی عن المنکر من الایمان ...... عن ابی سعید الخدری ؓ۔

حقیقت واقسامِ شرک

سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع میں حکمتِ قرآنی کی جو اساسات بیان ہوئی ہیں اور جس مقامِ عزیمت کی طرف رہنمائی فرمائی گئی ہے اس کے حوالے سے اختصار واجمال کے ساتھ رکوع کا لبِ لباب اور اس کا اصل حاصل بیان ہوگیا' فللّٰہ الحمد۔ اب اس رکوع کی آیت ۲ پر مزید غور کرنا مقصود ہے' کیونکہ اس میں اجتناب عن الشرک کی تاکید کے ضمن میں التزامِ توحیدِ باری تعالیٰ کا انتہائی تاکیدی حکم وارد ہوا ہے' اور ہر شخص جانتا ہے کہ ہمارے دین کی اصل جڑ بنیاد توحید ہی ہے۔ چنانچہ حضرت لقمان کی نصائح کے ضمن میں پہلی نصیحت بایں الفاظ بیان فرمائی گئی:

﴿یٰبُنَیَّ لَا تُشْرِکْ بِاللّٰہِ ؕ اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ ﴿۱۳﴾﴾

''اے میرے پیارے بچے! اللہ کے ساتھ شرک مت کر' یقیناً شرک بہت بڑا ظلم ہے''۔

اس سلسلے میں پہلی اور اہم ترین بات تو یہ جان لینی چاہیے کہ از روئے قرآن مجید ہمارے دین میں شرک سب سے بڑا گناہ اور ناقابل معافی جرم ہے۔ سورۃ النساء میں دو مرتبہ اس بات کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ آیت ۴۸ کے الفاظ ہیں:

﴿اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ ۚ وَمَنْ یُّشْرِکْ بِاللّٰہِ فَقَدِ افْتَرٰۤی اِثْمًا عَظِیْمًا ﴿۴۸﴾﴾

''اللہ تعالیٰ اس کو تو ہرگز معاف نہیں فرمائے گا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے' البتہ اس سے کمتر خطائیں اور تقصیریں جس کے لیے چاہے گا بخش دے گا۔ اور جس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا' اس نے تو بہت ہی بڑا جھوٹ گھڑا (اور بہت بڑے گناہ کا ارتکاب کیا)۔''

اسی سورۃ کی آیت ۱۱۶ میں یہ مضمون دوبارہ اس شان کے ساتھ وارد ہوا کہ آیت کا پہلا حصہ بعینہٖ وہی ہے جو آیت ۴۸ کا ہے' دوسرے حصے میں معمولی تغیر ہے' چنانچہ یہاں فرمایا:

﴿وَمَنْ یُّشْرِکْ بِاللّٰہِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِیْدًا ﴿۱۱۶﴾﴾

''اور جس نے بھی اللہ کے ساتھ شرک کیا وہ بلاشبہ گمراہی اور ضلالت میں بہت دُور نکل گیا۔''

گویا یہاں یہ بات مزید واضح ہوگئی کہ شرک میں ملوث ہونے والا انسان گمراہی میں اتنی دور نکل جاتا ہے کہ اس کے بعد اس کے لیے معافی اور بخشش کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا۔

قرآن حکیم کے مطالعہ سے دوسری اہم بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ گناہ اور یہ جرم بہت ہمہ گیر ہے اور اتنا عام ہے کہ اللہ کو ماننے والوں کی اکثریت بھی شعوری یا غیر شعوری طور پر اس میں ملوث ہو جاتی ہے۔ سورۃ یوسف میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ﴿۱۰۶﴾﴾

''اور نہیں ایمان لاتے ان میں سے اکثر لوگ اللہ پر مگر ساتھ ہی (کسی نہ کسی نوعیت کا) شرک بھی کرتے ہیں۔''

یعنی اکثر لوگ اللہ کو مانتے ہیں' اس پر ایمان لاتے ہیں' لیکن توحیدِ خالص کے ساتھ اللہ کو ماننا' اس پر ایمان رکھنا کسی کسی ہی کو نصیب ہوتا ہے۔ علامہ اقبال نے شرک کی اسی ہمہ گیری کی طرف بایں الفاظ اشارہ کیا ہے: ؎

براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے!
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنا لیتی ہیں تصویریں

تیسری اہم ترین بات یہ کہ شرک کی بہت سی اقسام ہیں اور یہ مرض بہت متنوع صورتوں میں ظہور کرتا ہے' بلکہ یہ بات بھی جان لینی ضروری ہے کہ ہر دَور کا ایک خاص شرک ہوتا ہے۔ اگر کوئی انسان اپنے دَور کے شرک کو نہ پہچان پائے تو ہوسکتا ہے کہ وہ سابقہ ادوار کے تمام شرکوں سے بچا ہوا ہو اور اپنے خیال میں وہ بہت بڑا موحّد بنا پھرتا ہو لیکن وہ لاعلمی میں اپنے دَور کے شرک میں ملوث ہو گیا ہو۔ میرے نزدیک اس دَور کا جو شرک سب سے عام اور سب سے زیادہ پھیلا ہوا ہے وہ مادّہ پرستی کا شرک ہے۔ ہمارے ہاں مادّے اور اس کی تاثیرات پر پورا یقین واعتماد کیا جاتا ہے لیکن ذاتِ باری تعالیٰ پر اتنا بھی توکل' یقین اور اعتماد نہیں ہے جو ایمانِ حقیقی کے لیے لازمی ولابدی ہے۔ اقبال نے اسے اس شعر میں بڑی خوبصورتی سے کہا ہے کہ: ؎

بُتوں سے تجھ کو امیدیں خدا سے نومیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے؟

ایمان اصل میں نام ہے اللہ پر توکل' اعتماد اور بھروسے کا' اور اس کی نفی کفر اور شرک ہے۔ لہٰذا

شرک کے بارے میں بہت حساس ہونے کی ضرورت ہے۔ فارسی زبان کا ایک شعر ہے: ؎

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من اندازِ قدت را می شناسم

یعنی ''تم چاہے کسی رنگ کا لباس پہن لو' کوئی بھیس بدل لو' میں تمہیں تمہارے قد سے پہچان لوں گا''۔ شرک کے معاملے میں بھی بالکل یہی کیفیت درکار ہے کہ یہ بیماری جس صورت میں بھی کسی دَور میں اور کسی معاشرے میں ظہور کر رہی ہو' نگاہ اتنی دُوررَس ہو کہ انسان پہچان لے کہ اس دَور میں شیطان نے شرک کو اس صورت میں جلوہ گر کیا ہے' تب ہی اس بات کا امکان ہے کہ انسان شرک سے اپنے آپ کو بچا سکے۔

چوتھی اہم بات جو درحقیقت ان تینوں باتوں کا منطقی نتیجہ ہے' یہ ہے کہ شرک سے کلیتاً بچنا آسان کام نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر قرآن مجید میں جب آتا ہے تو اکثر مقامات پر جہاں آ کر بات ختم ہوتی ہے وہاں یہ الفاظ آتے ہیں کہ: ﴿مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ﴾ ''آپ (یعنی ابراہیم علیہ السلام) مشرکوں میں سے نہ تھے''۔ حضرت ابراہیمؑ کی عظمتِ جلیلہ کو ذہن میں رکھیے۔ آنجنابؑ ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جدامجد ہیں' ابوالانبیاء ہیں' امام الناس ہیں اور خلیل اللہ ہیں۔ ہم درود میں بھی ان کی مثال پیش کرتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ یہ آخری سند ہے جو اللہ کی طرف سے کسی بندے کو عطا ہو جائے۔ یہ سب سے بڑا اور قیمتی سرٹیفکیٹ اور testimonial ہے جو اللہ کی طرف سے کسی کو دیا جائے کہ ''میرا یہ بندہ شرک کے ہر شائبہ سے پاک ہے''۔

اب ہمیں یہ سمجھنا ہوگا کہ شرک اصل میں کہتے کسے ہیں! شرک یعنی اشراک باللہ (اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کر دینا) کی اصل حقیقت کیا ہے جس کو اس آیۂ مبارکہ میں ظلمِ عظیم قرار دیا گیا ہے؟ عربی زبان میں ظلم کی تعریف ہے ''وَضْعُ الشَّیْءِ فِیْ غَیْرِ مَحَلِّہٖ '' یعنی کسی چیز کو اُس کے اصل اور حقیقی مقام سے ہٹا کر کسی اور جگہ رکھ دینا۔ یہ فعل ظلم کہلاتا ہے۔ ہر چیز کو اُس کے اصل وحقیقی مقام پر رکھیے' یہ عدل ہے' یہ انصاف ہے۔ اب غور فرمایئے تو یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ شرک میں دو چیزیں لامحالہ ہوں گی۔ یا اللہ کو اس کے مقامِ رفیع سے گرا کر مخلوقات کی صف میں لا کھڑا کیا جائے گا اور کوئی صفت جو صرف مخلوقات کے لیے ہوگی اس سے اللہ کو متصف کر دیا جائے گا' یا مخلوقات میں سے کسی کو اٹھا کر اللہ کے برابر لا بٹھایا جائے گا اور جو صفات صرف باری تعالیٰ کے لیے مختص ہیں ان سے کسی مخلوق کو متصف تسلیم کیا جائے گا۔ یہ دونوں صورتیں یکساں ''ظلم'' ہیں۔ یہ دونوں افعال ''وَضْعُ الشَّیْءِ فِیْ غَیْرِ

مَحَلِّهٖ'' کے ذیل میں آئیں گے۔ اللہ کو اس کی منفرد شانِ رفیع اور مقامِ جلیل سے گرانا بہت بڑا ظلم ہے اور مخلوق میں سے کسی کو اس کے اصل وحقیقی مقام سے اٹھا کر اللہ کا ہمسر' ہم پلہ' ند' ضد' کفو اور مدّ مقابل بنا دینا' یہ بھی بہت بڑا ظلم اور بہت بڑی ناانصافی ہے۔

شرک فی الذات

اب اختصار کے ساتھ شرک کی چند اقسام کو سمجھئے۔ اگرچہ اس کی تقسیمیں مختلف اعتبارات سے ہو سکتی ہیں' لیکن جس پہلو سے میں تقسیم آپ کے سامنے رکھوں گا مجھے توقع ہے کہ شاید آپ اسے بہت جامع اور نہایت قابل فہم پائیں گے۔ شرک کی تین موٹی موٹی قسمیں ہیں۔ پہلی ''شرک فی الذات'' ہے' یعنی اللہ کی ذات میں کسی کو شریک بنا دینا۔ یہ بدترین اور عریاں ترین شرک ہے۔ دوسری ''شرک فی الصفات'' ہے۔ یہ معاملہ کسی علمی مغالطے کے باعث بھی ہوسکتا ہے۔ تیسری ''شرک فی الحقوق'' ہے' یعنی اللہ کے حقوق میں کسی کو اس کا ساجھی بنا دینا۔ لہٰذا شرک کی یہ تین بڑی بڑی قسمیں پیشِ نظر رکھیے' پھر ان کو علیحدہ علیحدہ سمجھئے۔

شرک فی الذات یعنی ذاتِ باری تعالیٰ میں کسی کو شریک کر دینا' اس کی دو قسمیں ہیں۔ ان میں جو سب سے زیادہ مکروہ اور سب سے زیادہ گھناؤنی قسم ہے' عجیب ستم ظریفی ہے کہ یہ ان قوموں میں پیدا ہوئی جو اپنے آپ کو نبیوں اور رسولوں کی طرف منسوب کرتی ہیں۔ یہودیوں نے حضرت عزیر علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا قرار دیا۔ مشرکینِ عرب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نام لیوا تھے' انہوں نے فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں قرار دیا۔ عیسائیوں نے یہ ظلم ڈھایا کہ اللہ کے رسول حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا ہی نہیں صلبی بیٹا قرار دے دیا۔ اس شرک پر اللہ کا غضب بہت بھڑکتا ہے۔ سورۃ مریم کی آیات ۸۸ تا ۹۲ میں اِس کا اظہار اس انداز سے فرمایا گیا ہے:

﴿وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا ﴿٨٨﴾ لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا اِدًّا ﴿٨٩﴾ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ﴿٩٠﴾ اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا ﴿٩١﴾ وَمَا يَنْبَغِيْ لِلرَّحْمٰنِ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا ﴿٩٢﴾﴾

''انہوں نے کہا کہ رحمٰن نے کسی کو اپنا بیٹا بنا لیا ہے۔ لوگو! تم بہت گستاخی کی بات کر رہے ہو۔ (یہ گستاخی اللہ کی جناب میں اتنی شدید ہے کہ) آسمان پھٹ پڑنے کو ہے' زمین شق ہونے کو ہے اور قریب ہے کہ پہاڑ ایک دھماکے کے ساتھ زمین بوس ہو جائیں' (اس گستاخی پر) کہ

لوگوں نے رحمٰن کے لیے بیٹا تراش لیا۔ حالانکہ یہ بات رحمٰن کے شایانِ شان ہی نہیں ہے کہ وہ کسی کو اپنا بیٹا بنائے۔''

اس شرک فی الذات کی دوسری صورت پیدا ہوئی فلسفیانہ مذاہب میں۔ ان میں حلول اور تجسم کے عقیدے پیدا ہوئے جس کا مطلب ہے کہ اس پوری کائنات میں اللہ حلول کر گیا ہے۔ گویا اللہ ہی نے اس کائنات کی صورت اختیار کر لی ہے اور ہر شے اب اللہ کی ذات کا عین بن گئی ہے۔ یہ بھی اپنی نوع کا بدترین شرک ہے۔ پھر ایک اور عقیدہ ''اَوتار'' کا پیدا ہوا' یعنی خدا کسی انسانی شکل وصورت میں ظاہر ہو جاتا ہے یا کسی انسان میں حلول کر جاتا ہے۔ اَوتار کا عقیدہ بھی بدترین شرک فی الذات ہے۔

شرک فی الصفات

آگے چلیے! شرک فی الصفات کا معاملہ جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا' کچھ علمی نوعیت کا ہے' اس لیے کہ ہماری زبان میں الفاظ مشترک ہیں۔ جو الفاظ ہم اللہ کے لیے بطورِ صفت بولتے ہیں وہی مخلوقات کے لیے بھی بولتے ہیں۔ مثلاً اللہ بھی موجود ہے' ہم بھی موجود ہیں۔ اللہ بھی زندہ ہے' ہم بھی زندہ ہیں۔ اللہ بھی سنتا ہے' ہم بھی سنتے ہیں۔ اللہ بھی دیکھتا ہے' ہم بھی دیکھتے ہیں۔ اب اس لفظی اشتراک سے مغالطہ ہوسکتا ہے۔ لیکن ان صفات کا اطلاق جب اللہ پر ہوتا ہے تو مفہوم کچھ اور ہوتا ہے اور یہی صفات جب مخلوقات کے لیے استعمال ہوں گی تو ان کا مفہوم کچھ اور ہوگا۔ اس ضمن میں تین چیزیں پیشِ نظر رکھنی ضروری ہیں تاکہ اس معاملے میں مغالطے سے نجات حاصل ہو۔ ایک یہ کہ اللہ کا وجود بھی ذاتی ہے اور صفات بھی ذاتی ہیں' جبکہ ماسوی اللہ کا وجود بھی عطائی ہے اور صفات بھی عطائی ہیں۔ اس لیے کہ مخلوقات کو اللہ ہی نے وجود بخشا ہے اور صفات بھی عطا کی ہیں۔ دوسرے یہ کہ اللہ کا وجود بھی لامحدود ہے اور صفات بھی لامحدود ہیں جبکہ ماسوی اللہ کا وجود بھی محدود ہے اور صفات بھی محدود ہیں۔ تیسرے یہ کہ اللہ کی ہستی بھی قدیم ہے حادث نہیں' ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی' اسی طرح اس کی صفات بھی قدیم ہیں۔ اس کے برعکس معاملہ مخلوقات کا ہے' وہ خود بھی حادث ہیں اور ان کی صفات بھی حادث ہیں۔ ان تینوں چیزوں کا فرق اگر سامنے رکھا جائے تو پھر اس میں مغالطہ نہیں ہو گا' لیکن اگر اس میں ذرا سی بھی بے احتیاطی ہو جائے تو شرک کی صورت پیدا ہو جائے گی۔

شرک فی العبادۃ اور اس کی شاخیں

اب آیئے شرک کی تیسری قسم کی طرف' یعنی اللہ کے حقوق میں کسی کو ساجھی بنا دینا۔ اگر ہم اللہ

کے حقوق شمار کریں تو ہم اس کا اِحصاء نہ کر سکیں گے۔ لیکن ایک لفظ ایسا ہے کہ ''ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں'' کے مصداق اس میں سب حقوق آ جاتے ہیں' اور وہ لفظ ہے ''عبادت''۔ اللہ کی عبادت میں کسی کو شریک نہ ٹھہرایا جائے۔ لیکن اس لفظ عبادت کی قدرے تشریح ہوگی تو بات سمجھ میں آئے گی۔ اس ضمن میں قارئین کرام سے درخواست ہے کہ پانچ چیزیں گن کر ذہن نشین کر لیں۔ عبادت میں اہم ترین چیز ہے ''اطاعت''۔ توحید فی الاطاعت یہ ہے کہ اللہ کی اطاعت تمام اطاعتوں پر غالب آ جائے۔ بقیہ تمام اطاعتیں اللہ کی اطاعت کے تابع ہوں۔ اگر کسی کی اطاعت اللہ کی اطاعت کے برابر ہوگئی تو یہ شرک فی الاطاعت ہو جائے گا۔ تمام اطاعتیں اللہ کے تابع ہوں تو یہ توحید ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ((لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِیْ مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ))(۱) ''کسی مخلوق کی اطاعت نہیں ہوگی اس چیز میں کہ جس میں خالق کی معصیت لازم آ رہی ہو''۔ اللہ کی اطاعت کے تابع والدین کی اطاعت بھی ہے' اساتذہ کی بھی ہے' اولی الامر کی بھی ہے' حکام کی بھی ہے۔ کوئی اطاعت اللہ کی اطاعت سے آزاد نہ ہو۔ اگر آزاد ہوئی تو شرک فی الاطاعت لازم آ جائے گا۔ یہاں یہ نکتہ بھی نوٹ کر لیجیے کہ اللہ کی اطاعت جناب محمد رسول اللہ ﷺ کے واسطے سے ہوگی۔ قرآن مجید بھی ہمیں نبی اکرم ﷺ کے توسط سے ملا ہے۔

دوسری چیز ہے ''محبت''۔ تمام محبتیں اللہ کی محبت کے تابع ہو جائیں۔ کوئی محبت اللہ کی محبت کے ہم پلہ نہ ہو۔ ہمارے قلب کے سنگھاسن پر بالاترین محبت اللہ کی براجمان ہو۔ بقیہ تمام محبتیں اللہ کی محبت کے تابع ہو جائیں۔ اگر کسی اور کی محبت اللہ کی محبت کے برابر آ کر بیٹھ گئی تو جان لیجیے کہ یہی شرک ہے۔ یہ دو چیزیں ''اطاعت'' اور ''محبت'' بہت اہم ہیں۔ ان کی تفصیل میں جانے کا موقع نہیں ہے۔ بس یوں سمجھ لیجیے کہ یہ وہ اصول ہیں کہ جن کو انسان خود حالات پر منطبق کر سکتا ہے۔ اصول اگر ہاتھ میں آ جائیں تو ان کا اطلاق کر کے انسان تمام مسائل حل کر لے گا۔ ایک ضروری بات یہاں پھر نوٹ کر لیجیے کہ اطاعت اور محبت دونوں اعتبارات سے اللہ کے ساتھ اللہ کے رسول ﷺ بھی شامل ہیں۔ اللہ کی اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت تمام اطاعتوں پر غالب ہو تو یہ توحید ہے۔ کوئی اور اطاعت ان کے ہم پلہ ہوگئی یا بالاتر ہوگئی اور کوئی محبت ان کے برابر ہوگئی یا بڑھ گئی تو یہ شرک فی

(۱) سنن الترمذی' کتاب الجهاد عن رسول الله ﷺ' باب ما جاء لا طاعة لمخلوق فی معصية الخالق۔

الاطاعت اور شرک فی المحبت کی صورت ہوگی۔

تیسری چیز ہے دعا۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ((اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ)) (۱) ''دعا عبادت کا جوہر ہے''۔ایک اور حدیث میں ہے کہ: ((اَلدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ)) (۲) ''دعا ہی اصل عبادت ہے''۔ چنانچہ دعا اللہ کے سوا کسی سے نہیں کی جائے گی۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا: ﴿وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۘ﴾ (القصص:۸۸) ''اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو مت پکارو''۔ پکارو اسی کو، مانگو اسی سے۔ یہ ہے توحید فی الدعا۔ اور اگر اللہ سے بھی دعا کر رہے ہو، مانگ رہے ہو اور کسی اور سے بھی تو یہ شرک فی الدعا ہے۔

چوتھی چیز ہے اخلاص۔ اگر متذکرہ بالا تینوں باتوں میں ریاکاری کا کہیں شائبہ ہو گیا تو یہ بھی شرک ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ صَلّٰی یُرَائِیُ فَقَدْ اَشْرَكَ، وَمَنْ صَامَ یُرَائِیُ فَقَدْ اَشْرَكَ، وَمَنْ تَصَدَّقَ یُرَائِیُ فَقَدْ اَشْرَكَ)) (۳)

''جس نے دکھلاوے کے لیے نماز پڑھی وہ شرک کر چکا، جس نے دکھلاوے کے لیے روزہ رکھا وہ شرک کر چکا اور جس نے دکھاوے کے لیے صدقہ و خیرات کیا وہ شرک کر چکا۔''

یہ شرکِ خفی کہلاتا ہے جو نظر نہیں آتا۔ اقبال نے جو کہا ہے کہ ع

''ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنا لیتی ہے تصویریں!''

تو اس کا اطلاق اسی نوع کے شرک پر ہوتا ہے۔ حضور ﷺ نے تجزیہ کر کے بتا دیا کہ اگر ایک شخص نماز پڑھنے کھڑا ہوا اور اس نے دیکھا کہ کوئی مجھے دیکھ رہا ہے، اس لیے سجدہ طویل کر دیا تو اس نے شرکِ خفی کا ارتکاب کیا، چونکہ اس طرح اس کے سجدے کے مسجود دو ہو گئے۔ وہ اللہ کو بھی سجدہ کر رہا ہے اور جسے دکھا رہا ہے گویا اسے بھی سجدہ کر رہا ہے۔ معلوم ہوا کہ ریاء و سُمعہ یعنی عبادت دوسروں کو دکھانے یا سنانے کی نیت سے کرنا شرک فی الاخلاص ہے۔

خواہشِ نفس کی بلاقید پیروی بھی شرک ہے۔ قرآن مجید میں دو جگہ یہ مضمون آیا ہے:

﴿اَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـهَهٗ هَوٰىهُ ؕ﴾ (الفرقان:۴۳)

اور:

---

(۱) سنن الترمذی، کتاب الدعوات، باب منه۔

(۲) سنن الترمذی، کتاب تفسیر القرآن، باب ومن سورة البقرة۔

(۳) مسند احمد، کتاب مسند الشامیین، باب حدیث شداد بن أوس۔

﴿اَفَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـهَهٗ هَوٰىهُ﴾ (الجاثية:٢٣)

''(اے نبی!) کیا آپ نے اس شخص کے حال پر غور کیا جس نے اپنی خواہش کو اپنا معبود بنالیا؟''

یہاں لفظ ''الٰہ'' آیا ہے جو ہمارے کلمۂ توحید کے جزوِ اوّل کا لفظ ہے۔معلوم ہوا کہ صرف سامنے رکھی ہوئی مورتیاں ہی نہیں پوجی جاتیں' اندر کی نفسانی خواہشات کو بھی پوجا جاتا ہے۔

باطن کے اصنام میں مال و دولت کی وہ محبت بھی شامل ہے جس کے حصول میں حلال وحرام کی تمیز ختم ہو جائے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((تَعِسَ عَبْدُ الدِّيْنَارِ وَعَبْدُ الدِّرْهَمِ))[1]

''ہلاک ہو جائے (یا ہلاک ہوگیا) دینار ودرہم کا بندہ''۔

آنحضور ﷺ نے لفظ کون سا استعمال فرمایا! عبد۔اس لیے کہ جس شخص کے دل میں دولت کی محبت اتنی ہے کہ اسے کوئی غرض نہیں کہ حلال سے آئے یا حرام سے' جائز سے آئے یا ناجائز سے' صحیح راستے سے آئے یا غلط راستے سے' دولت کی اس طمع اور محبت کا مطلب ہے کہ دولت اس کا معبود ہے' چاہے وہ ہندوؤں کی طرح ''لکشمی دیوی'' کو نہ پوج رہا ہو۔شریعت کی قیود وحدود اور شرائط سے بے نیاز ہو کر دولت کی چاہت بھی شرک ہے۔

اس ضمن میں پانچویں اور آخری چیز یہ ہے کہ کچھ مراسمِ عبودیت ایسے ہیں جو صرف اللہ کے لیے خاص ہیں۔کسی کو بھی سجدہ نہیں ہوگا سوائے اللہ کے۔اس معاملے میں شیخ احمد سرہندیؒ کا جو مقام تھا اور ان کی جو عزیمت تھی' اسے علامہ اقبال نے خوب تعبیر کیا ہے :

گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے
جس کے نفسِ گرم سے ہے گرمیٔ احرار

سجدہ صرف اللہ کے لیے ہے۔اسی طرح رکوع بھی اللہ کے لیے خاص ہے' اس کے خلاف عمل شرک فی العبادۃ میں شمار ہوگا۔

یہاں موقع کی مناسبت سے شرک کی چند موٹی موٹی اقسام ہی بیان کی جاسکی ہیں' لیکن ان سے اندازہ ہوگیا ہوگا کہ شرک کا مسئلہ کتنا ہمہ گیر ہے۔ ہر مسلمان کو شعوری طور پر شرک سے بچنے کی فکر کرنی

(١) سنن ابن ماجه' كتاب الزهد' باب فی مسند المكثرين۔

چاہیے۔اس کی تیر بہ ہدف تدبیر یہ ہے کہ اللہ کی ذات پر ہمارا یقینِ محکم ہو۔ ہمارا جتنا توکل اور اعتماد اللہ کی ذات اور اس کی ربوبیت پر بڑھے گا اتنا ہی ہم اِن تمام چیزوں سے بچ سکیں گے۔ جیسے علامہ اقبال نے کہا ہے: ؎

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے!
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

اگر ہمیں التزامِ توحید اور اجتنابِ شرک کی سعادت نصیب ہو جائے تو یہ ہماری اُخروی کامیابی اور فوز و فلاح کے لیے کفایت کرے گی۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ○○

❁❁❁

درس 4

حَظِّ عظیم

سُوْرَۃ حٰم السجدۃ کی آیات ۳۰ تا ۳۶ کی روشنی میں

درس ٤

حَظِّ عظیم

سورۂ حٰم السّجدۃ کی آیات ۳۰ تا ۳۶ کی روشنی میں

نحمدہٗ ونصلی علٰی رسولہِ الکریم

امّا بعد فاَعُوذُ باللّٰہِ مِنَ الشَّیطٰنِ الرَّجِیمِ۔ بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ

﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا تَتَنَزَّلُ عَلَیۡہِمُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوۡا وَلَا تَحۡزَنُوۡا وَاَبۡشِرُوۡا بِالۡجَنَّۃِ الَّتِیۡ کُنۡتُمۡ تُوۡعَدُوۡنَ ﴿۳۰﴾ نَحۡنُ اَوۡلِیٰٓؤُکُمۡ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَفِی الۡاٰخِرَۃِ ۚ وَلَکُمۡ فِیۡہَا مَا تَشۡتَہِیۡۤ اَنۡفُسُکُمۡ وَلَکُمۡ فِیۡہَا مَا تَدَّعُوۡنَ ﴿۳۱﴾ نُزُلًا مِّنۡ غَفُوۡرٍ رَّحِیۡمٍ ﴿۳۲﴾ وَمَنۡ اَحۡسَنُ قَوۡلًا مِّمَّنۡ دَعَاۤ اِلَی اللّٰہِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِیۡ مِنَ الۡمُسۡلِمِیۡنَ ﴿۳۳﴾ وَلَا تَسۡتَوِی الۡحَسَنَۃُ وَلَا السَّیِّئَۃُ ؕ اِدۡفَعۡ بِالَّتِیۡ ہِیَ اَحۡسَنُ فَاِذَا الَّذِیۡ بَیۡنَکَ وَبَیۡنَہٗ عَدَاوَۃٌ کَاَنَّہٗ وَلِیٌّ حَمِیۡمٌ ﴿۳۴﴾ وَمَا یُلَقّٰہَاۤ اِلَّا الَّذِیۡنَ صَبَرُوۡا ۚ وَمَا یُلَقّٰہَاۤ اِلَّا ذُوۡ حَظٍّ عَظِیۡمٍ ﴿۳۵﴾ وَاِمَّا یَنۡزَغَنَّکَ مِنَ الشَّیۡطٰنِ نَزۡغٌ فَاسۡتَعِذۡ بِاللّٰہِ ؕ اِنَّہٗ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ﴿۳۶﴾﴾ ...... صدق اللّٰہ العظیم

’’یقیناً وہ لوگ جنہوں نے کہا کہ ہمارا ربّ اللہ ہے‘ پھر اس پر جم گئے‘ اترتے ہیں ان پر فرشتے (یہ کہتے ہوئے) کہ نہ غم کھاؤ اور نہ خوف‘ اور بشارت حاصل کرو اُس جنت کی جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔ ہم تمہارے مددگار رہیں دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی‘ اور تمہارے لیے وہاں وہ سب کچھ ہے جسے تمہارا جی چاہے اور تمہارے لیے وہاں وہ سب کچھ ہوگا جو تم طلب کرو گے۔ یہ مہمان نوازی ہوگی اُس (اللہ) کی طرف سے جو بڑا بخشش فرمانے والا‘ نہایت رحیم ہے۔ اور اس شخص سے بہتر بات کس کی ہو سکتی ہے جو اللہ کی طرف بلائے اور نیک عمل کرے اور کہے کہ میں بھی مسلمانوں ہی میں سے ہوں۔ اور (ہرگز) برابر نہیں ہے نیکی اور بدی۔ آپ (بدی کو) دفع کریں نہایت احسن طریقے سے تو (اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ) وہ شخص جس کے اور

آپ کے مابین عداوت تھی' (آپ کا) دلی دوست جیسا ہو جائے گا۔ اور یہ خوبی نہیں دی جاتی سوائے اُن لوگوں کے جنہوں نے صبر کیا' اور یہ اچھائی نہیں دی جاتی مگر بڑے نصیب والوں کو۔ اور اگر (کبھی) شیطان کی جانب سے تمہیں کوئی وسوسہ ورغلائے تو فوراً اللہ کی پناہ میں آ جاؤ۔ یقیناً وہ سب کچھ سننے والا' سب کچھ جاننے والا ہے''۔

مطالعۂ قرآن حکیم کے جس منتخب نصاب کا سلسلہ وار بیان ہدیۂ قارئین ہو رہا ہے اس کا پہلا حصہ قرآن حکیم کے چند ایسے مقامات پر مشتمل ہے جن میں انسان کی کامیابی اور نجات کی شرائط اور اس کی فوز وفلاح کے لوازم کا بیان نہایت جامعیت کے ساتھ ہوا۔ اس طرح ان مقامات کے مطالعے سے قرآن حکیم کے انسانِ مطلوب کی پوری سیرت وکردار کا ایک بھرپور اور مکمل نقشہ ابھر کر ہمارے سامنے آ جاتا ہے۔ چنانچہ اس مقام پر بھی جو اس حصے (جامع اسباق) کا آخری درس ہے' انسان کی تعمیر کردار اور اُخروی نجات کے چار لازمی اوصاف کا بیان آیا ہے۔ یعنی ایمان کا ذکر بھی موجود ہے ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کی صورت میں' اور ایمان کے ساتھ ہی اعمالِ صالحہ کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ یہاں ''عملِ صالح'' ایک مرتبہ تو لفظ ''استقامت'' میں اور دوسری مرتبہ جوں کا توں ''وَعَمِلَ صَالِحًا'' کی شکل میں مذکور ہے۔ ''تواصی بالحق'' کے ذیل میں یہاں ''دعوت الی اللہ'' کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے' اور آخر میں پھر ''صبر'' کا ذکر نہایت اہتمام اور شدّ ومدّ کے ساتھ کیا گیا ہے۔ گویا وہی چاروں مضامین جو سورۃ العصر میں بیان کیے گئے ہیں' ذرا مختلف پیرائے میں ''آیۂ بِرّ'' میں دوبارہ ہمارے سامنے آ جاتے ہیں۔ اس سے قدرے مختلف اسلوب کے ساتھ انہی چاروں مضامین کا بیان سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع میں ہوا ہے۔ اور پھر یہی مضامین ان زیر بحث آیات میں بھی ایک نئی شان کے ساتھ ہمیں دعوتِ فکر دیتے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں۔

اس مشابہت کے علاوہ ان چاروں مقامات میں ایک اور ربط بھی ہے اور وہ یہ کہ ان میں مضامین کا ایک تدریجی ارتقاء ہے۔ چنانچہ سورۃ العصر کو گویا base line قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس میں انسان کی کامیابی کے کم از کم لوازم کا بیان ہے' یعنی مجرّد نجات' ناکامی سے بچنے کی کم سے کم شرائط۔ پھر اس سے آگے نسبتاً بلند تر مقام سے ہمیں آشنا کیا گیا اور وہ مقام بِر وتقویٰ ہے جو آیۂ بِرّ میں ہمارے سامنے آیا۔ اس سے بھی ایک نسبتاً بلند تر منزل کا بیان جس کو ہم ''مقامِ عزیمت'' سے تعبیر کر سکتے ہیں' سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع میں آیا ہے۔ یعنی ''اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ'' کی صورت میں۔ اور ان چاروں امور

کے اعتبار سے واقعتاً بلند ترین منزلیں وہ ہیں جن کا ذکر ان آیاتِ مبارکہ میں ہو رہا ہے۔ اس کے لیے عنوان اگر انہی آیات میں مستعمل الفاظ سے لیا جائے تو وہ ''حَظٍّ عظیم'' ہوگا' یعنی بڑا نصیبہ' بہت ہی یاور بخت۔ اور اگر قرآن مجید کے ایک دوسرے مقام کے حوالے سے اس کا مرتبہ معین کیا جائے تو یہ درحقیقت مقامِ ولایت کا بیان ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اس مقام پر اِن چاروں چیزوں کی جو بلند ترین منازل ہیں اُن کا ذکر ہوا۔ یعنی ایمان کی آخری منزل' اس کا لبِّ لباب اور اصل حاصل اللہ کی وحدانیت و ربوبیت پر دل کا جم جانا' ٹھک جانا اور اس پر پورا وثوق اور اعتماد قائم ہو جانا' پھر اس پر استقامتِ فکری' نظری اور عملی کا ہونا۔ اسی طرح ''تواصی بالحق'' کا بلند ترین مقام اور اس کی بلند ترین منزل ''دعوت الی اللہ'' ہے۔ اللہ تعالیٰ جو اس کائنات کی سب سے بڑی حقیقت ہے اور جس ذاتِ باری تعالیٰ کے سوا ''الحق'' کا مصداق کوئی نہیں' از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ﴾ لہٰذا اس کی طرف دعوت' اس کی طرف بلانا گویا ''تواصی بالحق'' کی بلند ترین منزل ہے۔ اسی طرح صبر کے ضمن میں یہاں اس مقام کا بیان ہو رہا ہے جہاں صرف مخالفتوں کا برداشت کر لینا اور لوگوں کی طرف سے پیش آنے والی مصیبتوں کا جھیل جانا ہی کافی نہیں ہوتا' بلکہ گالیوں کے جواب میں دعائیں دینا اور لوگوں کی طرف سے ایذا رسانی کے جواب میں ان کی خیر خواہی اور بہی خواہی کا اظہار کیا جانا' اور پروردگار سے ان کے لیے ہدایت کی دعائیں مانگنا مطلوب ہوتا ہے۔ یہ ہے صبر کی بلند ترین منزل۔ گویا یہاں جن کیفیات اور صفات کا ذکر ہو رہا ہے انہیں ہر اعتبار سے انسانیت کی معراج قرار دیا جا سکتا ہے۔ ان صفات کا ایک مکمل نقشہ اور مصداقِ کامل تو یقیناً ہماری نگاہوں کے سامنے محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی شخصیتِ مبارکہ ہے' لیکن آپؐ کے بعد اس نقشے میں فِٹ آنے والے درحقیقت وہ لوگ ہیں جنہیں بالعموم اولیاء اللہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

یہ ہے ان مضامین کا اجمالی تذکرہ' جن کا تدریجی ارتقاء ہمارے منتخب نصاب کے حصہ اوّل میں ہو رہا ہے۔ اب آیئے اس کے ایک ایک جزو پر غور کرنے کی کوشش کریں!

فرمایا: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ﴾ ''یقیناً وہ لوگ جنہوں نے کہا کہ ہمارا ربّ اللہ ہے''، یعنی جو پہچان لیں کہ ہمارا مالک و آقا بھی اللہ ہے' ہمارا خالق و رازق بھی اللہ ہے' ہمارا مشکل کشا و حاجت روا بھی اللہ ہے۔ ﴿ثُمَّ اسْتَقَامُوْا﴾ ''پھر اس پر وہ جم گئے''۔ واقعہ یہ ہے کہ اللہ کی معرفت اتنی مشکل نہیں ہے۔ اگر انسان کی فطرت مسخ نہ ہو گئی ہو اور عقل کسی غلط رُخ پر نہ پڑ گئی ہو تو وہ عقلِ سلیم اور فطرتِ صحیحہ

کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی اجمالی معرفت تک پہنچ جاتا ہے‘ لیکن اللہ کو پہچاننے کے بعد اس کی ربوبیت اور الوہیت پر دل کا ٹھک جانا‘ یہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔

استقامت کا مفہوم

استقامت یہ ہے کہ انسان کو بظاہر کتنا ہی خطیر نفع یا بھاری نقصان کسی کی طرف سے نظر آ رہا ہو‘ لیکن وہ یقین رکھے کہ میرا نافع اور ضارّ اللہ کے سوا کوئی نہیں‘ یعنی ’’لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ ‘‘ اور’’لَا فَاعِلَ فِی الْحَقِیْقَةِ وَلَا مُؤَثِّرَ اِلَّا اللّٰهُ ‘‘۔تو یہ درحقیقت انسان کی کامیابی کی کڑی شرط بھی ہے اور معرفتِ الٰہی کی حقیقی اساس بھی۔ انسان اس عالمِ مادّی میں عالمِ اسباب میں رہتے ہوئے اور بدلتے ہوئے حالات سے متاثر ہوئے بغیر چٹان کی مانند اپنے اس یقین پر جما رہے کہ اللہ ہی کی قدرت ہر شے پر حاوی ہے‘ اور وہی حقیقی مؤثر ہے‘ اس کے اِذن کے بغیر ایک پتا تک جنبش نہیں کرتا‘ اور پھر اس پر انسان بالکل مطمئن ہو جائے اور اپنے معاملات اور اپنی ہر کوشش کو اللہ کے حوالے کر دے‘ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَاُفَوِّضُ اَمْرِیْۤ اِلَی اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بَصِیْرٌۢ بِالْعِبَادِ ۝۴۴﴾ (المؤمن) اور یہ بات دل میں بٹھا لے کہ میرے معاملات میرے اپنے ہاتھوں کی نسبت اُس ذات کے ہاتھوں میں کہیں زیادہ محفوظ ہیں جو ’عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ‘‘ ہے‘ جو ’بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ‘‘ ہے‘ جو میری مصلحتوں سے مجھ سے بڑھ کر واقف ہے اور میرا مجھ سے بڑھ کر خیر خواہ ہے‘ تو تب اسے تعلقِ بندگی میں رسوخ حاصل ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنی بے ثبات طبعی کیفیات کا محاسبہ بھی کر لے کہ میرا حال تو یہ ہے کہ میں ہر چیز سے فوراً تاثر قبول کر لیتا ہوں‘ اور اپنی کم علمی کے باعث کوئی ایسی چیز پسند کر بیٹھتا ہوں جو حقیقت میں میرے لیے مضر ہوتی ہے اور کسی ایسی چیز کو برا سمجھ بیٹھتا ہوں جس میں میری حقیقی منفعت مضمر ہوتی ہے‘ اور اللہ ہی ہے جو ہر خیر کو جانتا ہے اور جو ہر شر سے واقف ہے‘ وہی ہے جسے قدرت حاصل ہے۔ انسان اللہ ہی کے ’’قدیر‘‘ ہونے پر یقین رکھے اور اپنے آپ کو اس کی بارگاہ میں یوں بے بس و عاجز تصور کرے جیسے صوفیاء کہتے ہیں’ ’کَالْمَیِّتِ فِیْ اَیْدِی الْغَسَّالِ ‘‘یعنی انسان اللہ کی رضا پر اس طرح راضی رہے اور اس کی مرضی پر اپنے آپ کو اس طرح چھوڑ دے جیسے کہ میت (ایک مُردہ جسم) ایک غسل دینے والے کے ہاتھ میں لاچار ہوتی ہے۔ یہ ہے انسان کا اللہ کے ساتھ صحیح ربط و تعلق‘ اور یہ ہے وہ استقامت جو مطلوب ہے‘ ورنہ مجرد کہہ دینا کہ ’’میرا ربّ اللہ ہے‘‘ اتنا مشکل نہیں جتنا کہ ’’ثُمَّ اسْتَقَامُوْا ‘‘ کے تقاضے پورے کرنا مشکل ہے۔ اور استقامت کے تقاضے یہ

ہیں کہ عقیدہ میں' فکر میں' سوچ میں' نقطۂ نظر میں اور بدلتے ہوئے حالات میں' انسان کا دل بہراعتبار اللہ کی ربوبیت وقدرتِ مطلقہ پر جما رہے۔ یہ استقامت کا ایک پہلو ہے۔

استقامت کا دوسرا پہلو عملی ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان نے جس ذات کو مالک مان لیا ہے اس کے ہر ہر اشارے پر حرکت کرے' اس کی ہر مرضی کو پورا کرنے کے لیے ساری قوت صرف کر دے' اس کا ہر حکم اس کے لیے واجب التعمیل ہو' اس کے اشارے پر سب کچھ نچھاور کرنے پر بدل و جان آمادہ ہو۔ اس سے آگے انسان کی غیرت وحمیت کا تقاضا ہے کہ جو کچھ مالک کو پسند ہے اسے دنیا میں پھیلانے' رائج کرنے اور غالب کرنے کے لیے تن من دھن کی بازی لگا دے' جو اسے پسند نہیں ہے بندہ بھی اسے ناپسند کرے اور ہمیشہ اس سے نبرد آزما بھی رہے اور دنیا سے اس کا نام ونشان مٹانے کے لیے جان اور مال نچھاور کر دے۔ یہ ہے استقامتِ عملی۔ گویا اگر یوں کہا جائے کہ سورۃ العصر' آیۂ بِرّ اور سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع میں جتنے عملی پہلو ہمارے سامنے آئے ہیں وہ سب یہاں لفظ ''استقامت'' میں مضمر ہیں' تو یہ بات بالکل بجا ہوگی۔ اسی لیے میں کہا کرتا ہوں کہ اس لفظ استقامت میں ایک قیامت مضمر ہے۔ نبی اکرم ﷺ سے جب ایک صحابیؓ نے عرض کیا کہ حضور ﷺ! مجھے کوئی ایسی بات تعلیم فرما دیجیے کہ جس کے بعد قول وعمل کی راہ میں کسی دشواری سے دوچار نہ ہوں اور بے دھڑک راہِ ہدایت پر گامزن رہوں' تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((قُلْ آمَنْتُ بِاللّٰہِ ثُمَّ اسْتَقِمْ))(۱) ''کہو میں ایمان لایا اللہ پر' پھر (عملاً) اُس پر جمے رہو۔''

ایمان کا اعلیٰ ترین درجہ — مقامِ ولایت

حقیقت یہ ہے کہ اس آیۂ مبارکہ ﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا﴾ میں جس بلند مرتبہ ومقام کا اور جن کیفیات کا ذکر ہو رہا ہے قرآن مجید کے دوسرے مقامات پر اسی کو مرتبۂ ''ولایت'' سے تعبیر کیا گیا ہے' اس لیے کہ اس آیت میں آگے جو نویدِ جانفزا ''اَلَّا تَخَافُوۡا وَلَا تَحۡزَنُوۡا '' کے الفاظ میں دی جا رہی ہے قرآن مجید میں انہی الفاظ سے اولیاء اللہ کو خوشخبری سنائی گئی ہے۔ فرمایا: ﴿اَلَاۤ اِنَّ اَوۡلِیَآءَ اللّٰہِ لَا خَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ وَلَا ہُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ ﴿۶۲﴾ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَکَانُوۡا یَتَّقُوۡنَ ﴿۶۳﴾﴾ (یونس) یعنی حقیقی ایمان جنہیں میسر آ گیا ہو اور جو اللہ کے تقویٰ کو فی الواقع صحیح معنوں میں اپنی شخصیتوں میں جذب کر چکے ہوں' ان لوگوں کے لیے نہ تو کوئی خوف ہے اور نہ کوئی حزن۔ یہی درحقیقت ایمان کا

(۱) مسند احمد۔ سنن الترمذی اور سنن ابن ماجہ میں یہ الفاظ ہیں: ((قُلْ رَبِّیَ اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقِمْ))

ما حصل ہے۔ اس لیے کہ ایمان اَمن سے بنا ہے' اور اَمن کی ضد خوف بھی ہے اور غم بھی۔ گویا ایمان عطا کر کے غم وحزن سے انسان کو بالکلیہ آزاد اور بے نیاز کر دیا گیا ہے۔

مقامِ ولایت کی عظمت کا ذکر کرنے کے بعد اللہ ربّ العزت نے ان کے علوِ شان کو پھر یوں بیان کیا: ﴿تَتَنَزَّلُ عَلَیۡهِمُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ﴾ کہ ان پر ملائکہ کا نزول ہوتا ہے۔ ''تَتَنَزَّلُ'' عربی قواعد کی رو سے فعل مضارع کا صیغہ ہے' اور عربی میں فعل مضارع حال اور مستقبل دونوں کا جامع ہوتا ہے۔ گویا اس کا یہ ترجمہ بھی درست ہوگا کہ ''اترتے ہیں ان پر فرشتے'' اور یہ بھی صحیح ہوگا کہ ''اتریں گے ان پر فرشتے''۔ اور واقعہ یہ ہے کہ یہ دونوں مفہوم یہاں جمع ہیں۔ ملائکہ کا نزول اس بشارت اور اس نویدِ جانفزا کے ساتھ ہوتا ہے کہ: ﴿اَلَّا تَخَافُوۡا وَلَا تَحۡزَنُوۡا﴾ ''کہ نہ خائف ہوں اور نہ غمگین ہوں''۔ خوف وغم سے اب تمہارا کوئی تعلق نہیں. ﴿وَاَبۡشِرُوۡا بِالۡجَنَّۃِ الَّتِیۡ کُنۡتُمۡ تُوۡعَدُوۡنَ ﴿۳۰﴾﴾ ''اور خوشخبری حاصل کرو اُس جنت کی جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا رہا''۔

نزولِ ملائکہ —— کن مواقع پر؟

یہاں مفسرین کے مابین یہ مسئلہ زیر بحث رہا ہے کہ ملائکہ کے اِس نزول کا وقت کون سا ہے۔ ملائکہ کے نزول کا ایک وقت تو وہ ہے جو سب کے نزدیک مُجمع علیه ہے' اور وہ یہ کہ ملائکہ کا نزول بندۂ مؤمن پر' اللہ کے دوستوں پر' اللہ کے چاہنے والوں پر اُن کے انتقال سے متصلاً قبل ہوتا ہے' جبکہ وہ اِس عالَم سے اُس عالَم کو منتقل ہونے کی تیاری کر رہے ہوتے ہیں۔ گویا اُس عالَم کے سفیر ان کو خوش آمدید کہنے کے لیے اور اُن کا استقبال کرنے کے لیے اِس عالم میں پہنچے ہوتے ہیں۔ یہ چیز بعض روایات سے بھی ثابت ہے اور اللہ کے نیک بندوں کے انتقال کے وقت بعض حالات جو متواتر سننے اور مشاہدے میں آتے رہے ہیں' ان سے بھی ان کی تصدیق ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ اب تمہارے حزن اور خوف کا دَور ختم ہوا' تمہارے رنج ومحن کا دَور گزر گیا۔ اِس دنیا میں' جو تمہارا دار الامتحان تھا' جس میں تمہیں طرح طرح کی تکلیفیں اور طرح طرح کی آزمائشیں درپیش رہیں' قِسم قِسم کے مسائل سے سابقہ رہا' اب تم ان تمام الجھنوں سے چھوٹ گئے' لہٰذا اب خوشخبری حاصل کرو کہ اس کشمکشِ خیر وشر اور اس معرکۂ حق وباطل میں تم سرخرو اور کامیاب ہو کر عالمِ آخرت کی طرف کوچ کر رہے ہو۔ یہ مفہوم تو بالکل واضح اور متفق علیہ ہے۔

نزولِ ملائکہ کا دوسرا مفہوم جس کی طرف قرآن مجید کی بعض دیگر آیات سے رہنمائی ملتی ہے' یہ

ہے کہ بندۂ مؤمن پرُ اللہ کے دوستوں پرُ اللہ کے چاہنے والوں پر حیاتِ دُنیوی کے دَوران بھی مسلسل ملائکہ کا نزول ہوتا ہے۔ اس کو یوں سمجھنا چاہیے کہ یہ دنیا درحقیقت دارالامتحان ہے۔ یہاں خیر وشر کی ایک کشمکش اور ایک چومکھی جنگ لڑی جا رہی ہے۔ اس چومکھی جنگ کا ایک میدان انسان کے باطن میں ہے جس میں شر کے محرکات بھی ہیں اور خیر کے داعیات بھی۔ شر کے محرکات میں وہ نفس امّارہ بھی ہے جس کے بارے میں قرآن مجید خود کہہ رہا ہے: ﴿اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْءِ......﴾ (یوسف:۵۳) ''یقیناً یہ نفس (یعنی نفس امّارہ) برائی کی طرف راغب کرنے اور کھینچنے والا ہے۔'' لیکن اسی باطنی میدان میں خیر کے محرکات اور قلب وروح کے داعیات بھی ہیں' جو انسان کو بلندی اور عالمِ عُلوی کی طرف اور خیر اور بھلائی کی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ خیر وشر کی باطنی کشمکش ہے جس کا تجربہ ہر انسان کو ہے۔ گویا اس کی داخلی شخصیت کا ایک میدانِ کارزار ہے' جس میں ہر وقت یہ جنگ جاری رہتی ہے۔

پھر یہی معرکۂ خیر وشر خارج میں بھی برپا ہے۔ انسان کے خارجی ماحول میں خیر کی قوتیں بھی موجود ہیں اور شر کی قوتیں بھی۔ انسانوں ہی میں وہ لوگ بھی ہیں جو خیر کی طرف بلانے والے ہیں' جیسے اولیاء اللہ ہیں' مبلغینِ حق ہیں' داعیانِ حق ہیں اور وہ کہ جنہیں نائبینِ رسول ﷺ کہا جائے' جو رسول ﷺ کے منصبِ تبلیغ کو اپنا کر لوگوں کو خیر اور بھلائی کی دعوت دینے والے ہیں۔ اور انسانوں ہی میں وہ بھی ہیں کہ جو شر کے داعی ہیں اور برائی کی طرف پکارنے والے ہیں۔ یہ شیاطین انس ہیں۔ پھر غیر مرئی مخلوقات میں بھی خیر وشر کے طبقات موجود ہیں' جن میں سے ایک مخلوق تو وہ ہے جو شر کی طرف بلاتی ہے' جو برائی پر انسان کی پیٹھ ٹھونکتی ہے۔ اگر وہ بدی کا راستہ اختیار کرتا ہے تو یہ بڑھ چڑھ کر اس کی مدد کرتی ہے۔ یہ جنات شیاطین ہیں جو ابلیسِ لعین کی صُلبی ومعنوی ذُرّیت ہیں۔ دوسری غیر مرئی مخلوق ملائکہ ہیں' وہ نورانی وجود رکھنے والی ہستیاں ہیں۔ یہ خیر کی طرف بلانے والی اور اہلِ خیر کی ہمت افزائی کرنے والی ہیں اور ان کے لیے تثبیتِ قلبی کا ذریعہ بنتی ہیں۔ چنانچہ میدانِ بدر میں اور معرکۂ اُحد میں ملائکہ کا نزول قرآنِ حکیم کی نصوصِ قطعیہ سے ثابت ہے۔ بعض احادیث میں بھی ملائکہ کے نزول کا بڑا صریح اور صاف نقشہ کھینچا گیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ارشاد فرماتے ہیں:

((مَا اجْتَمَعَ قَوْمٌ فِیْ بَیْتٍ مِنْ بُیُوْتِ اللّٰہِ یَتْلُوْنَ کِتَابَ اللّٰہِ وَیَتَدَارَسُوْنَہٗ بَیْنَھُمْ اِلاَّ نَزَلَتْ عَلَیْھِمُ السَّکِیْنَۃُ وَغَشِیَتْھُمُ الرَّحْمَۃُ وَحَفَّتْھُمُ الْمَلَائِکَۃُ وَذَکَرَھُمُ اللّٰہُ فِیْمَنْ عِنْدَہٗ)) (۱)

(۱) صحیح مسلم' کتاب الذکر والدعاء والتوبة والاستغفار' باب فضل الاجتماع علی تلاوة القرآن والذکر۔ وسنن الترمذی وسنن ابی داؤد۔

''کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ کچھ لوگ اللہ کے گھروں میں سے کسی گھر میں اللہ کی کتاب کو پڑھنے اور باہم ایک دوسرے کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے جمع ہوں' مگر یہ کہ اُن پر اللہ کی سکینت کا نزول ہوتا ہے اور رحمتِ خداوندی انہیں اپنے سائے میں لے لیتی ہے' اور ملائکہ ان کے گرد گھیرا ڈال لیتے ہیں' اور اللہ تعالیٰ ملائکہ مقربین کی محفل میں اُن کا ذکر کرتا ہے۔''

معلوم ہوا کہ ملائکہ کا یہ نزول صرف انتقال کے وقت ہی نہیں ہوتا بلکہ مؤمنینِ صادقین' اللہ کے دوستوں اور اس کے چاہنے والوں پر حیاتِ دُنیوی کے دوران بھی مسلسل فرشتے اترتے ہیں۔ اس دوسرے مفہوم کی تائید یہ الفاظِ قرآنی بھی کر رہے ہیں: ﴿نَحۡنُ اَوۡلِیٰٓـؤُکُمۡ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَفِی الۡاٰخِرَۃِ ۚ﴾ ''ہم ہیں تمہارے ساتھی (تمہارے رفیق' تمہارے حمایتی' تمہارے پشت پناہ) دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت کی زندگی میں بھی''۔ یہ قول اُسی صورت میں زیادہ قابل فہم ہوگا جبکہ یہ حیاتِ دُنیوی سے متعلق ہو' یعنی اُس وقت جبکہ انسان فی الواقع اس کشمکش میں مبتلا ہو اور معرکۂ خیر و شر میں نبرد آزما ہو' اور ایسے کڑے وقت میں کوئی اس کی پیٹھ ٹھونکے اور اس کی ہمت افزائی کرے کہ ہم تمہارے ساتھی اور مددگار ہیں' تم اپنے آپ کو اس معرکے میں تنہا نہ سمجھو۔ تو اس دوسرے مفہوم کی تائید اِن الفاظِ مبارکہ سے زیادہ واضح ہو کر ہمارے سامنے آتی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ یہاں بتایا گیا ہے کہ اگر اللہ کی ربوبیت پر انسان کو وثوق حاصل ہو جائے اور اس پر اس کا دل جم جائے تو یہ وہ مقام اور مرتبہ ہے کہ دورانِ حیاتِ دُنیوی بھی ملائکہ کا نزول اس پر پیہم ہوتا رہتا ہے جس سے اسے انبساط حاصل ہوتا ہے' اس کے قلب کو تثبیت حاصل ہوتی ہے' اسے داخلی سکون اور اطمینان میسر آتا ہے اور اس کے قدموں میں جماؤ پیدا ہوتا ہے۔ جیسے کہ سورۃ الانفال میں فرمایا گیا: ﴿اِذۡ یُوۡحِیۡ رَبُّکَ اِلَی الۡمَلٰٓئِکَۃِ اَنِّیۡ مَعَکُمۡ فَثَبِّتُوا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا﴾ (آیت ۱۲) میدانِ بدر میں نازل ہونے والے فرشتوں کو اللہ کا حکم ہوا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں' پس تم اہل ایمان کے قدموں کو جما دو! یعنی ان کے دلوں کے اندر ایک قوت پیدا کر دو۔

آخرت میں اہل ایمان کے لیے اجر

رہا معاملہ آخرت کا تو اس کے متعلق ارشاد ہوتا ہے: ﴿وَلَکُمۡ فِیۡہَا مَا تَشۡتَہِیۡۤ اَنۡفُسُکُمۡ﴾ ''اور وہاں تو تمہارے لیے ہر وہ چیز (مہیا کر دی گئی) ہے جس کی خواہش تمہارے جی کریں گے''۔ تمہارے نفوس کا خالق جانتا ہے کہ اس میں کس کس چیز کی اشتہا ہے' اس میں کس کس چیز کی طلب مضمر ہے۔ اور اللہ نے جو تمہارا خالق و مالک ہے' تمہارے نفس کے جملہ تقاضوں کی بھرپور تسکین کا اہتمام

اُس جنت میں کر دیا ہے کہ جس کا تم سے وعدہ کیا جا تا رہا ہے۔ اس پر مزید فرمایا: ﴿وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ ﴿٣١﴾﴾ ''اور جنت میں ہر چیز جس کی تم تمنا کرو گے' وہ تمہاری ہو گی''۔ یعنی وہاں تم جو بھی مانگو گے' جو بھی طلب کرو گے حاضر کر دیا جائے گا۔

''اشتہا'' اور ''طلب'' کے مابین ایک لطیف سا فرق ہے۔ اشتہا نفسِ انسانی کے وہ تقاضے ہیں جو تمام انسانوں میں مشترک ہیں' جنہیں مشتہیاتِ نفس کہا جاتا ہے' یعنی ان چیزوں کی خواہش نفس کے اندر موجود ہے۔ جنت میں ان تقاضوں کی بھرپور تسکین کر دی جائے گی۔ اس لیے کہ اس دنیا میں بندۂ مؤمن اپنے نفس کی باگیں روک کر رکھتا ہے' اللہ کے حکم کے تحت نفس کی مرغوبات سے اپنے آپ کو دُور اور خود کو تھامے رکھتا ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ﴿٤٠﴾﴾ (النّٰزعٰت) ''اور جو اپنے ربّ کے سامنے کھڑا ہونے سے خائف رہا اور اس نے اپنے نفس کو (ناجائز) خواہشات سے روکے رکھا''۔ تو اس کا ایک منطقی نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ آخرت میں ان کے ان مشتہیاتِ نفسانیہ کو بھرپور تسکین فراہم کی جائے جس پر بندۂ مؤمن نے حیاتِ دُنیوی کے دوران قدغنیں بٹھائے رکھی تھیں۔ اور ''طلب'' یہ ہے کہ ہر انسان کے فکر اور شعور کی ایک سطح (Level of consciousness) ہے۔ اس کے اعتبار سے ہر شخص کی تمنا مختلف ہو گی' ہر شخص کچھ اور چاہے گا۔ اس اعتبار سے اس جملے میں ایک امکانی کیفیت رکھ دی گئی کہ: ﴿وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ ﴿٣١﴾﴾ ''اور جو کچھ بھی تم چاہو گے اس کو جنت میں تمہارے لیے پیش کر دیا جائے گا۔''

جنت میں سب سے بڑی بات اللہ تعالیٰ کی میزبانی ہے جس پر اس ذکرِ عالی کو ختم فرمایا گیا' یعنی: ﴿نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِيْمٍ ﴿٣٢﴾﴾ ''یہ اُس ہستی کی طرف سے (ابتدائی) مہمان نوازی ہو گی جو غفور بھی ہے' رحیم بھی''۔ اگر خطائیں ہیں تو وہ ان سے درگزر کرنے والا ہے' اگر کہیں کوئی قدم پھسل گیا تھا تو اس کو بخش دینے والا اور معاف فرمانے والا ہے' تاکہ اجر و ثواب میں کوئی کمی نہ رہ جائے۔ لہٰذا یہ اس کی طرف سے مہمان نوازی ہو گی اور تم مہمان ہو گے۔ یہاں بخشش اور رحم فرمانے کے ذکر میں ایک لطیف اشارہ بھی ہے اور وہ یہ کہ سب کچھ جس کا ذکر کیا جا رہا ہے یہ درحقیقت ''نُزُل'' ہے' یعنی پہلی اور اوّلین مہمان نوازی۔ اہل عرب ''نُزُل'' کا لفظ اس مہمان نوازی کے لیے استعمال کرتے ہیں جو کسی مہمان کے آتے ہی فوراً پیش کی جائے۔ گویا ''نَزِیل'' (نزول کرنے والا) یعنی اترنے والا جیسے ہی اپنی سواری سے اترے' اس کے سامنے ٹھنڈا یا گرم فوراً پیش کر دیا جائے۔ یہ ہے نُزُل' اور اس کے بعد

اہتمام ہوتا ہے ضیافت کا۔ تو یہ سب کچھ بھی نُــــزُل کے حکم میں ہے' اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو ضیافت ہونے والی ہے اس کا تو کوئی تصور بھی اس دنیا میں ممکن نہیں۔ جیسے نبی اکرم ﷺ نے جنت کی نعمتوں کے بارے میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ((اَعْـدَدْتُ لِعِبَادِیَ الصَّالِحِیْنَ مَا لَا عَیْنٌ رَأَتْ وَلَا اُذُنٌ سَـمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلٰی قَلْبِ بَشَرٍ))[1] ''میں نے اپنے نیک لوگوں کے لیے ایسی نعمتیں تیار کی ہیں کہ جو نہ کسی آنکھ نے کبھی دیکھیں' نہ کسی کان نے کبھی سنیں اور نہ کبھی کسی انسان کے دل پر اُن کا کوئی خیال یا احساس وارد ہوا''۔ وہ تو تمہارے حواس اور تمہارے تخیلات سے ماوراء نعمتیں ہیں۔ باقی جو کچھ تمہارے احساس وادراک میں آ سکتا ہے' وہ نُـزُل اور ابتدائی مہمان نوازی کے طور پر عطا کر دیا جائے گا۔ مطلب یہ کہ بخشش اور رحمت کے جامِ تسکین وفرحت تو مہمان کو آتے ہی پیش کر دیے جائیں گے' پھر ضیافت کا وہ لامتناہی سلسلہ ہوگا جس کا کوئی حساب ہے نہ کوئی حد۔

''دعوت اِلی اللہ'' کا فریضہ

سورۂ حٰم السجدۃ کی زیرنظر آیات کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے حصے میں تین آیات کا بیان ہوا' جن میں مرتبۂ ولایت کا ذکر ہوا ہے۔ دوسرے حصے کی بقیہ چار آیات میں اسی تصویر کا دوسرا رُخ سامنے آ رہا ہے' جس میں اصل مرکزیت ''دعوت الی اللہ'' اور اس راہ میں پیش آنے والی مصیبتوں پر صبر اور اس کی اعلیٰ ترین منزل کے بیان کو حاصل ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّـمَّنْ دَعَـآ اِلَی اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا﴾ ''اور اس شخص سے بہتر اور کس کی بات ہوگی جو اللہ کی طرف بلاتا ہو اور نیک عمل کرتا ہو''۔ یہاں یہ ذہن میں رہے کہ جہاں تک عمل کا تعلق ہے اس کا بھرپور ذکر پہلے حصہ میں استقامت کے ضمن میں ہو چکا ہے۔ یہاں درحقیقت عمل صالح کا ذکر اسی دعوت کی ایک ضرورت' اس کی تائید اور اس کے مؤثر ہونے کے لازمی تقاضے کے طور پر ہو رہا ہے۔ یعنی دعوت الی اللہ کا عمل بالکل غیر مؤثر رہے گا' بشرطیکہ اس گواہی کے طور پر داعی کی اپنی زندگی حسنِ اخلاق کا ایک نمونہ نہ بن جائے۔ اگر داعی اپنی دعوت کا ایک عملی نمونہ اپنی زندگی میں پیش نہ کرے تو درحقیقت اپنی دعوت کا اوّلین دشمن وہ خود ہوگا۔ یہاں آیت ﴿وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَی اللّٰهِ﴾ میں دراصل ''دعوت الی اللہ'' کو ایک فریضہ کے طور پر بیان کیا جا رہا ہے۔ اسے یوں سمجھئے کہ وہ لوگ جن کا ذکر ابتدائی

---

(۱) صحیح البخاری' کتاب بدء الخلق' باب ما جاء فی صفة الجنة وانها مخلوقة۔ وصحیح مسلم' کتاب الجنة وصفة نعیمها واھلها' باب۔

آیات میں کیا گیا' ان کے ہاں دُنیوی ساز و سامان' جائیداد' مال و متاع اور ظاہری چمک دمک کو پرِ کاہ کے برابر بھی حیثیت حاصل نہیں ہوتی' بلکہ ان کی زندگی میں ان کی بلند ترین خواہش اور تمنا صرف یہ ہوتی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ بندگانِ خدا کو خدا کے ساتھ جوڑ دیں' غافلوں کو اللہ کی جناب میں لا کر جھکا دیں اور بھولے بھٹکے ہوؤں کو سیدھے راستے پر لے آئیں۔ ان کی ساری عملی جدوجہد ایک ہی نقطے پر مرتکز ہوتی ہے کہ وہ اپنا سب کچھ خلقِ خدا کی ہدایت اور خلق کو خدا کی طرف بلانے میں صرف کر دیتے ہیں۔

﴿وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَی اللّٰہِ﴾ میں نطقِ انسانی کے مفید استعمال کی طرف بھی بلیغ اشارہ فرمایا جا رہا ہے' اور وہ یہ ہے کہ زبان ہر انسان کے پاس ہے' اس کا استعمال ہر شخص کرتا ہے۔ جو لوگ نسبتاً باصلاحیت ہوتے ہیں وہ کسی نہ کسی دعوت کے علم بردار بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کوئی کنبے اور قبیلے کی فلاح کا نعرہ لے کر اٹھتا ہے' کوئی قوم اور وطن کی عظمت کا نام لے کر اٹھتا ہے' کوئی عوام کے حقوق کا نعرہ لگاتا ہے' کوئی معاشی عدل اور معاشی انصاف کے لیے جدوجہد کرنے کا دم بھرتا ہے۔ کہیں وطن کی عظمت پر گردنیں کٹائی جاتی ہیں' کہیں اپنی قومی برتری کے لیے محنتیں اور مشقتیں کی جاتی ہیں اور ایثار و قربانی کا داعیہ پیدا کیا جاتا ہے۔ اس طرح نامعلوم کتنی دعوتیں دنیا میں دی جاتی ہیں' لیکن سب سے اچھی اور بہترین دعوت اس شخص کی ہو گی جو اللہ کی طرف بلا رہا ہو' اس اللہ کی طرف جو سب کا خالق و مالک ہے' جو سب کا رازق ہے' جو سب کا آقا ہے' جو سب کا حاکم ہے' جس کے حضور میں سب کو چار و ناچار حاضر ہونا ہے' جس کے قبضۂ قدرت میں کُل کائنات ہے' جس کے اِذن کے بغیر ایک پتا تک جنبش نہیں کرتا اور جو اصل ''الحق'' ہے' از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ﴾ اس کی طرف دعوت تواصی بالحق کی بلند ترین منزل ہے' یہ تمام دعوتوں سے بلند ترین دعوت ہے۔ بلاشبہ اس سے کم تر اور نچلی سطح پر اصلاحی دعوت (Reformation movement) اور محدود پیمانے پر خلقِ خدا کی خدمت کے کاموں کی بھی اپنی اپنی جگہ پر اہمیت و افادیت ضرور ہے' مگر دعوت الی اللہ ان سب سے بلند تر اور اعلیٰ ترین ہے۔

مقامِ دعوت کا پہلا تقاضا — عمل صالح

﴿وَعَمِلَ صَالِحًا﴾ ''اور جو نیک اعمال کرے۔'' اس دعوت کا اوّلین اور بنیادی تقاضا داعی کی اپنی زندگی کا صالحیت سے عبارت ہونا ہے' تا کہ وہ پورے انشراحِ صدر کے ساتھ کہہ سکے کہ جس بات کی طرف میں دعوت دے رہا ہوں کہ لوگو اللہ کی بندگی اختیار کرو' اللہ کی اطاعت کرو'

اللہ کو چاہو‘ اللہ سے شدید محبت کرو اور اللہ ہی کو اپنا مطلوب ومقصودِ حقیقی سمجھو‘ اُس دعوت کا مجسم پیکر میں خود ہوں۔ میں نے خود اللہ تعالیٰ کی بندگی کو عملاً اختیار کیا ہے۔ بالفاظِ قرآنی: ﴿اَنَــــا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ﴾ اور: ﴿اَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ اور: ﴿قَالَ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ﴾ میں نے خود اللہ تعالیٰ کو اپنا محبوب بنالیا ہے اور میں تمہیں بھی دعوت دیتا ہوں کہ اسی کی محبت سے اپنے دلوں کو آباد کرو۔

دوسرا تقاضا— غرور اور تکبر سے اجتناب

﴿وَقَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿٣٣﴾﴾ ’’اور وہ کہے کہ میں بھی مسلمانوں ہی میں سے ہوں۔‘‘ یعنی اس کے ذاتی تقویٰ وتدیّن اور دین پر عمل پیرا ہونے کے باوجود اس میں کوئی غرور اور تکبر نہ ہو۔ وہ یہ نہ سمجھے کہ میں کوئی شئے دگر ہوں۔ وہ یہ کہے کہ میں کسی پہلو سے بھی تم سے جدا‘ علیحدہ‘ بلند تر اور اعلیٰ نہیں ہوں‘ بلکہ میں بھی اللہ کے حضور گردن جھکانے والوں میں سے ہی ہوں۔ یہ درحقیقت ایک کلمۂ تواضع بھی ہے جو دعوت الی اللہ کی کامیابی کے لیے شرطِ لازم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کی طبیعت ہی کچھ ایسی ہے کہ تکبر سے اسے نفرت ہے اور وہ تکبر کرنے والوں سے دُور بھاگتا ہے۔ چنانچہ جیسے بجلی کا کرنٹ لگنے سے انسان دھکا کھا کر پیچھے کی طرف گر جاتا ہے اسی طرح جہاں کہیں بھی انسان کو دوسروں میں خود پسندی‘ عُجب‘ تکبر اور غرور کے آثار محسوس ہوں گے وہاں انسانوں میں بُعد اور دُوری ہوگی۔ اس کے برعکس جہاں کہیں تواضع اور انکساری ہوگی وہاں کشش ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کو بھی حکم دیا گیا کہ: ﴿وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٨٨﴾﴾ (الحجر) ’’اور (اے نبیؐ!) اہل ایمان کے لیے اپنے بازوؤں کو (اپنے شانوں کو) جھکا کر رکھئے‘‘۔ مطلب یہ ہے کہ جب اہل ایمان آپؐ کے پاس آئیں تو یہ محسوس کریں کہ رسولِ رحمت ﷺ کے دل میں ان کے لیے محبت‘ شفقت‘ مودّت اور رحمت موجود ہے۔ یہ دلوں کو موہ لینے والا انداز ہے‘ اور ظاہر بات ہے کہ اس میں تواضع کو بڑا دخل حاصل ہے۔ حدیث میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مابین بیٹھے ہوتے تو آپؐ کی کوئی امتیازی نشست نہیں ہوتی تھی‘ اور بسا اوقات آنے والوں کے لیے یہ طے کرنا مشکل ہوتا تھا کہ ان میں محمدؐ رسول اللہ ﷺ کون ہیں۔ اگر آپؐ کہیں تشریف لے جاتے اور صحابہ کرامؓ تعظیماً کھڑے ہوتے تھے تو آپؐ اس سے بھی منع فرماتے۔ آپؐ کبھی بھی اپنے لیے کوئی نمایاں حیثیت اور نمایاں مقام کے خواہاں نہیں ہوئے۔ بعض لوگوں نے اس سے بڑا عمدہ نکتہ نکالا ہے کہ آنحضور ﷺ کو دنیا میں جو عظیم کامیابی حاصل ہوئی اس کا ایک بڑا واضح‘ محسوس اور عقل میں آنے والا سبب یہ ہے کہ

آپؐ کا ''نزول'' بہت کامل ہے۔ آپؐ نے خالص انسانی سطح پر زندگی بسر کی' انسانوں میں گھل مل کر' ان کے اندر مل جل کر رہنا پسند فرمایا۔ اپنے لیے کوئی ایسا مقام کہ جہاں سے اترنے کے لیے انسان آمادہ نہ ہو' اور اس بلند مقام سے لوگوں کو بنظرِ استحقار دیکھ رہا ہو اور لوگوں تک رسائی میں تکلف ہو' (نعوذ باللّٰہ من ذٰلك) اس قسم کا کوئی نقشہ محمد عربی ﷺ کی شخصیتِ مطہرہ میں نظر نہیں آتا۔

تیسرا تقاضا — جداگانہ تشخص سے گریز

''اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ'' سے ایک اور رہنمائی یہ ملتی ہے کہ ہمارا تشخص اور پہچان صرف ''اسلام'' ہی ہونا چاہیے۔ لیکن ہمارا المیہ ہے کہ اُمت میں جو دعوت بھی اٹھی' اس کے داعی نے ابتداءً تو تفرقے کی مذمت کرتے ہوئے خالصتاً اسلام کی دعوت دی' لیکن بعد میں دعوت قبول کرنے والوں نے ایک فرقے کی شکل اختیار کر لی اور مسلمانوں سے جدا ہو گئے اور ان کا ایک علیحدہ تشخص قائم ہو گیا۔ گویا دعوتِ دین کے لیے اس بڑی احتیاط کو ملحوظ رکھنا نہایت ضروری ہے کہ جو شخص بھی اس راہ میں قدم بڑھائے' جو بھی دعوت الی اللہ کی ذمہ داری اٹھائے اور انبیاء و رُسل کے اس حق امانت کو ادا کرنے کے لیے آگے آئے' اس کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنا کوئی جداگانہ تشخص قائم نہ کرے' مسلمانوں سے کٹ نہ جائے اور مسلمانوں سے کوئی علیحدہ حیثیت اختیار نہ کرے' بلکہ جہاں تک ہو سکے شعوری طور پر اس کی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو پوری طرح مسلمانوں کے ساتھ identify کرے۔

''اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ'' میں ہمارے لیے یہ رہنمائی بھی موجود ہے کہ مختلف مسالک اور فرقوں کی طرف بلانا دعوت الی اللہ نہیں۔ دعوت الی اللہ صرف یہ ہے کہ اللہ کی بندگی' اس کی کامل اطاعت' اس سے انتہائی محبت اور اس کی معرفت سے اپنا وجود منور کرو اور اپنے قلوب و اذہان میں اجالا کرو اور اسی کی یاد سے دلوں کو راحت و سکون آشنا کرو۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ﴿۲۸﴾﴾ (الرعد) وہی تمہارا مطلوب و مقصود بن جائے' اسی کی رضا جوئی تمہاری زندگی کا نصب العین ہو' تمہارا جینا اور مرنا' تمہارا جاگنا اور سونا صرف اسی کے لیے ہو جائے۔ جیسے قرآن حکیم میں ایک اور مقام پر فرمایا گیا: ﴿اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۶۲﴾﴾ (الانعام)۔ اس سے تمہارا وہ تعلق قائم ہو جائے کہ تم اگر کسی سے محبت کرو تو صرف اسی کے لیے' کسی

سے نفرت رکھو تو اسی کے لیے۔ اسی کو دو جس کو دینے کا اس نے حکم دیا اور کسی سے روکو تو اس لیے کہ اس کو نہ دینا اللہ کو پسند ہے۔ یہ وہ بات ہے جو رسول اللہ ﷺ نے بایں الفاظ ارشاد فرمائی:

((مَنْ اَحَبَّ لِلّٰہِ وَاَبْغَضَ لِلّٰہِ وَاَعْطٰی لِلّٰہِ وَمَنَعَ لِلّٰہِ فَقَدِ اسْتَکْمَلَ الْاِیْمَانَ))[1]

''جس نے اللہ کے لیے محبت کی' اور اللہ کے لیے دشمنی رکھی' اور اللہ کے لیے کسی کو دیا اور اللہ کے لیے روکا تو اس نے ایمان کی تکمیل کر لی''۔

داعی کی شخصیت ـــــ ایک نظر میں

اب آئیے اس آیت مبارکہ کو ایک وحدت کی حیثیت سے دیکھتے ہیں: ﴿وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَی اللّٰہِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ﴿۳۳﴾﴾ اس سے بہتر بات اور کس کی ہو گی جو اللہ کی طرف بلاتا ہو' جس کی گواہی اس کا عمل دے رہا ہو' وہ خود اپنے عمل میں اللہ کا ایک مکمل بندہ نظر آ رہا ہو۔ اخلاقِ حسنہ کی ایک تصویر اس کے سراپا سے مترشح ہو' پھر وہ تواضع اور انکساری کے ساتھ خود اپنے آپ کو مسلمانوں ہی میں سے شمار کر رہا ہو۔ اس کی دعوت کسی جداگانہ فرقے یا جداگانہ مسلک کی طرف نہ ہو' بلکہ صرف اللہ کی طرف ہو۔ یہ ہے تواصی بالحق کی وہ بلند ترین منزل جس پر نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بعد اگر کچھ لوگ فائز نظر آتے ہیں تو یہ وہ پاکیزہ انسان ہیں جنہیں اولیاء اللہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے' وہ کبار صوفیاء جنہوں نے اپنے گھر بار تج دیے۔ سوچئے کہ معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ اجمیر میں کوئی تجارت یا کاروبار کرنے آئے تھے؟ ہرگز نہیں' بلکہ صرف اسی دعوت کی تڑپ انہیں اجمیر لائی تھی۔ اسی تڑپ کی بدولت کلمۂ توحید کی صدائیں خود اُن کے وجود کو سرمست اور بے خود کیے ہوئے تھیں' اور دوسری کوئی تمنا ان کے دل میں سرے سے باقی نہ رہی تھی۔ بقول مجذوب رحمۃ اللہ علیہ ؎

ہر تمنا دل سے رخصت ہو گئی
اب تو آ جا اب تو خلوت ہو گئی!

ایسے اولیاء اللہ نے اپنے دلوں میں صرف اللہ تعالیٰ کو بسایا تھا۔ صرف اللہ کی طرف لوگوں کو دعوت دینے کو انہوں نے اپنی کُل سعی وجہد کا مطلوب و مقصود بنایا تھا۔ اسی کے لیے ان کا جینا اور اسی کے لیے ان کا مرنا تھا۔ خلقِ خدا کی محبت اور اُن پر رحمت و شفقت اور مودّت ان کے پورے وجود میں سرایت

(۱) سنن ابی داوٗد' کتاب السنۃ' باب الدلیل علی زیادۃ الایمان ونقصانہ۔ وسنن الترمذی' کتاب صفۃ القیامۃ' باب منہ۔

کر چکی تھی۔ اس اعتبار سے ﴿وَمَنۡ اَحۡسَنُ قَوۡلًا مِّمَّنۡ دَعَاۤ اِلَی اللّٰہِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِیۡ مِنَ الۡمُسۡلِمِیۡنَ﴿۳۳﴾﴾ کے اس نقشے پر واقعتاً صرف اولیاء اللہ پورے اترتے نظر آتے ہیں۔

دعوتِ حق کی مخالفت ——ایک ناگزیر امر

یہاں یہ بات واضح رہنی چاہیے' جیسے کہ اس سے پہلے کے تین اسباق میں ہم دیکھ چکے ہیں' کہ حق کی دعوت خواہ کتنے ہی خلوص اور بے نفسی سے دی جائے اس کی مخالفت اور مزاحمت ضرور کی جائے گی' خواہ اس دعوت کے پیش کرنے والے ایسے لوگ ہی کیوں نہ ہوں جن کی نیتوں پر شک نہ کیا جا سکتا ہو۔ اس کا اس سے بڑھ کر اور ثبوت کیا ہو سکتا ہے کہ خود رسول اللہ ﷺ جنہیں ان کے کٹر دشمن اور ان کے خون کے پیاسے بھی ''الصادق'' اور ''الامین'' کہتے تھے' جن کی شخصیت پر کوئی داغ نہ دکھا سکا اور جن کے کردار پر کوئی انگلی نہ اٹھا سکا' انہیں بھی شدید مخالفت بلکہ اس سے بڑھ کر مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ آپؐ کے قریب ترین اعزّہ آپؐ کی جان کے درپے ہوئے۔ ابولہب جیسا قریبی رشتہ دار آپؐ کا دشمن بن گیا۔ اس کی بیوی نے آپؐ کے راستے میں کانٹے بچھائے۔ قریش کا پورا گھرانہ آپؐ کے اعزّہ و اقارب ہونے کے باوجود دشمن بنا۔

معلوم ہوا کہ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ کوئی دعوت واقعتاً حق کی ہو اور باطل اس کی راہ میں مزاحم نہ ہو۔ باطل کبھی بھی اسے lying down نہیں لے گا۔ اس کے باطل ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ وہ حق کا راستہ روکے' حق کے راستے میں موانع و مشکلات پیدا کرے۔ یہ دو اور دو چار کی طرح کا وہ اصول ہے جس سے کہیں کوئی استثناء نہیں۔ اگر محمد عربی ﷺ کے لیے استثناء نہ ہوا اور آپؐ کو اپنے جسم مبارک پر پتھراؤ جھیلنا پڑا' اپنے دندانِ مبارک شہید کرانے پڑے' اپنے انتہائی محبوب صحابہ رضی اللہ عنہم کی جانوں کا ہدیہ بارگاہِ ربّانی میں پیش کرنا پڑا۔ حضرت مصعب بن عمیرؓ جیسے جاں نثار ساتھی اور حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب جیسے محبوب چچا' خالہ زاد اور دودھ شریک بھائی اور ساتھ کے کھیلے ہوئے ہمجولی کی لاشیں اگر نبی اکرم ﷺ کے سامنے اس حال میں آئی ہیں کہ ناک کٹی ہوئی ہے' کان کاٹ لیے گئے ہیں' پیٹ چاک ہے اور کلیجے کو چبا لیا گیا ہے تو کیسے ممکن ہے کہ کسی دوسرے کے لیے یہ اٹل قانون توڑا جا سکے' لہٰذا مخالفت' مخاصمت' موانع' مشکلات اور آزمائشیں اس راہ کے سنگ ہائے میل ہیں۔ مخاطبین کی طرف سے جنہیں حق کی دعوت دی جا رہی ہو' استہزاء' تمسخر اور مخالفت بھی ہو گی اور ایذا رسانی بھی! وہ جان لینے کے درپے بھی ہوں گے اور گھر سے نکال باہر بھی کریں گے۔

مخالفت کی صورت میں داعی کے لیے ہدایات

اس تکلیف دہ کیفیت میں داعی الی اللہ کا مقام کیا ہوگا؟ اس کو ایک عجیب پُر حکمت قاعدہ کلیہ سے شروع کیا گیا جس سے داعی کی تربیت اور تالیف قلب کا انوکھا اور بڑا مؤثر اصول سامنے آتا ہے۔ فرمایا: ﴿وَلَا تَسۡتَوِی الۡحَسَنَۃُ وَلَا السَّیِّئَۃُ ؕ﴾ ''اور (دیکھو) نیکی اور بدی برابر نہیں ہوتیں''۔ نیکی نیکی ہے اور بدی بدی ہے۔ نیکی کی اپنی تاثیر ہے اور بدی کی اپنی تاثیر۔ اب کیسے ممکن ہے کہ یہ دونوں برابر ہو جائیں۔ ''لَا تَسۡتَوِی الۡحَسَنَۃُ وَلَا السَّیِّئَۃُ'' میں مبالغے کا ایک انداز حرفِ نفی ''لا'' کی تکرار سے بھی پیدا کیا گیا' حالانکہ بات یوں بھی پوری ہو جاتی کہ ''وَلَا تَسۡتَوِی الۡحَسَنَۃُ وَالسَّیِّئَۃُ'' کہ برابر نہیں ہیں نیکی اور بدی' لیکن ''لا'' کو مکرر لا کر تاکید کا رنگ پیدا کیا گیا۔ ﴿وَلَا تَسۡتَوِی الۡحَسَنَۃُ وَلَا السَّیِّئَۃُ ؕ﴾ سے نتیجہ یہ نکالا گیا ہے کہ نیکی کی دعوت کی راہ میں بدی ضرور آڑے آئے گی اور رکاوٹ بنے گی' مگر اس کا علاج بڑا دلنشیں تجویز فرمایا: ﴿اِدۡفَعۡ بِالَّتِیۡ ہِیَ اَحۡسَنُ﴾ ''تم بدی کو اُس نیکی سے دفع کرو جو بہترین ہو۔'' مخالفتوں کا جواب بڑے ہی احسن اور عمدہ طریق سے دو۔ ''اَحۡسَنُ'' اَفۡعَلُ کے وزن پر تفضیل کا صیغہ ہے جس کے معنی ہیں سب سے زیادہ خوبصورت اور بہترین۔ یعنی نہایت اعلیٰ اور سب سے عمدہ طور سے مخالفتوں کی مدافعت کرو۔ اگر تمہیں گالیاں دی جائیں تو جواب میں تمہارے لبوں پر دعا آ جائے۔ پتھروں کی بوچھاڑ ہو رہی ہو تو تمہاری جانب سے پھولوں کا ہدیہ پیش ہو جائے۔ تمہارے قتل کے منصوبے بنائے جائیں تو تم شب کی تنہائی میں اپنے ربّ کے حضور مخالفین کی ہدایت کی دعائیں مانگو۔ یہ ہے بہترین مدافعت اور ''اِدۡفَعۡ بِالَّتِیۡ ہِیَ اَحۡسَنُ'' کا اصل مفہوم۔

اس طور سے دفاع کا نتیجہ کیا نکلے گا؟ اس کا جواب دیا گیا ہے کہ: ﴿فَاِذَا الَّذِیۡ بَیۡنَکَ وَبَیۡنَہٗ عَدَاوَۃٌ کَاَنَّہٗ وَلِیٌّ حَمِیۡمٌ ﴿۳۴﴾﴾ ''پھر وہ شخص جس کے اور تمہارے درمیان عداوت (اور دشمنی) تھی ایسے ہو جائے گا جیسے گرم جوش دوست''۔ یعنی وہ لوگ جو کل تک تمہارے خون کے پیاسے تھے' تمہارے حمایتی' مددگار اور جاں نثار بن جائیں گے۔ سیرت کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ جن کی وجہ سے غزوۂ اُحد میں ستر مسلمانوں نے جامِ شہادت نوش کیا' جنہوں نے مسلمانوں کے فتح مند ہونے کے بعد یہ دیکھ کر کہ وہ درّہ جہاں محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے پچاس تیراندازوں کو متعین کیا تھا' خالی ہو گیا ہے' پورے کوہِ اُحد کا چکر کاٹ کر حملہ کیا اور مسلمانوں کی فتح شکست میں تبدیل

ہو گئی اور ستّر صحابہ رضی اللہ عنہم کے خون سے دامنِ اُحد کی زمین رنگین ہو گئی' پھر وہی خالد بن ولیدؓ ہیں جو مشرف بہ اسلام ہوئے اور ''سَیْفٌ مِّنْ سُیُوْفِ اللّٰهِ '' کا لقب پایا اور محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے جاں نثار بنے۔ اب جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا پسینہ گرے وہاں اپنا خون گرانے کو موجب سعادت سمجھنے لگے۔

یہ طرزِ عمل اور ''دفاعِ احسن'' صبر کی بلند ترین منزل ہے۔ اگرچہ صبر یہ بھی ہے کہ کوئی گالی دے اور انسان خاموش رہے' کوئی پتھر مارے اور انسان اس کو چپ چاپ جھیل لے' لیکن یہ صبر کی ابتدائی منزل ہے۔ جبکہ یہاں جن مقاماتِ عالیہ اور جن بلند مراتبِ صبر کا بیان ہوا ہے ان کے اعتبار سے صبر کی اعلیٰ ترین منزل بالکل مختلف اور جداگانہ ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ گالیوں کے جواب میں دعائیں دی جائیں' پتھروں کے جواب میں لوگوں کو پھول پیش کیے جائیں اور جو لوگ تمہارے قتل کے منصوبے بنا رہے ہوں پروردگار کے حضور میں ان کی ہدایت کے لیے دعائیں کی جائیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس اعتبار سے بھی اگر دیکھا جائے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بعد پوری تاریخ اُمتِ مسلمہ میں صبر کے کڑے معیار پر بھی کچھ لوگ پورے اترتے دکھائی دیتے ہیں تو وہ وہی لوگ ہیں جن کا ذکر کیا جا چکا ہے' یعنی صوفیاءِ کبار اور اولیاء اللہ۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے بدخواہوں کو دعائیں دیں' جن کے سینے انتہائی کشادہ تھے' جن کے دلوں میں لوگوں نے اپنے لیے شفقت ومودّت اور محبت و رحمت کا دریا موجزن پایا۔ ان کی انہی کیفیات اور طرزِ عمل کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ بابا فرید رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ پر نوے ہزار لوگ مشرف بہ اسلام ہوئے۔ اسی طرح حضرت معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کے ذریعے لاکھوں کی تعداد میں لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ سرزمینِ ہند میں اسلام پھیلا ہے تو انہی لوگوں کے طفیل' ورنہ بادشاہوں اور ہمارے حکمرانوں کا جو طرزِ عمل رہا ہے وہ اسلام سے برگشتہ کرنے میں تو ممد ہو سکتا تھا' اسلام کی طرف راغب کرنے میں نہیں' اِلّا ماشاءَ اللہ! چنانچہ چند شخصیتوں کے استثناء کے ساتھ پوری ہزار سالہ تاریخ میں عظیم اکثریت کا حال یہی رہا ہے کہ وہ لوگوں کو اسلام سے دُور کرنے کا موجب تو بنے ہیں' مگر اسلام کی طرف دعوت دینے میں اور اس کی طرف راغب کرنے میں ان کا کوئی حصہ نہیں۔ دعوت کا یہ سارا کام انہی لوگوں کے طفیل انجام پایا ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نقشِ قدم پر چلے۔ انہوں نے کبھی دُنیوی جاہ وحشمت کی حرص نہیں کی' بلکہ ان کی زندگیوں میں ایک ہی آرزو رہ گئی تھی اور وہ یہ تھی کہ خلقِ خدا کی ہدایت کا سامان کیا جائے۔ گویا یہ لوگ نوعِ انسانی کے لیے مجسم خیر خواہی تھے۔

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا

اس کے بعد فرمایا: ﴿وَمَا يُلَقّٰهَا اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا ۚ﴾ ''اس مقام تک نہیں پہنچ پاتے مگر وہی لوگ جنہوں نے صبر کیا''۔ یعنی صرف وہ لوگ اس مقام تک پہنچ سکتے ہیں جن میں تحمل و برداشت اور صبر کا بڑا ظرف ہوتا ہے' جو جھیل سکتے ہیں' جو اپنے نفس کے اندر اٹھنے والے طوفان کو روک سکتے ہیں اور جو فی الواقع صبر کے اعلیٰ مراتب پر فائز ہیں۔ ﴿وَمَا يُلَقّٰهَا اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ﴿٣٥﴾﴾ ''اور نہیں پہنچ پاتے اس مقام اور مرتبے کو مگر وہی جو بڑے نصیب والے ہیں''۔ جن کا نصیبہ بڑا یاور ہے' جو بخت آور ہیں۔ یہی وہ مقام ہے اور یہی وہ الفاظ ہیں جن کے حوالے سے میں نے عرض کیا تھا کہ اس مقام کو اگر ''حَظٍّ عَظِيْم'' سے تعبیر کیا جائے تو نہایت بہتر ہوگا' کیونکہ یہ خود اِن الفاظ کا ایک تقاضا ہے۔ اور اگر دوسرے مقامات کے ساتھ ربط و تعلق کے حوالے سے اسے ''مرتبۂ ولایت'' سے تعبیر کیا جائے تو بھی یقیناً درست ہے۔

مؤمن کے لیے انتباہ

اب اس درس کی آخری آیت پر توجہ کیجیے: ﴿وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿٣٦﴾﴾ ''اور اگر تمہیں شیطان کی طرف سے کوئی چوک لگ ہی جائے تو اللہ کی پناہ مانگ لو' یقیناً وہ سب کچھ سننے والا' سب کچھ جاننے والا ہے۔'' یہاں متوقع سنگین خطرے سے آگاہ کیا جا رہا ہے کہ اس اعلیٰ مقام پر پہنچ کر بھی یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ آدمی شیطان سے بالکل مأمون و محفوظ ہو گیا ہے اور وہ اب کبھی آدمی کے اندر کوئی اشتعال پیدا نہ کر سکے گا' بلکہ شیطان سے اب بھی سابقہ پڑ سکتا ہے۔ ہوسکتا ہے کوئی چوک اسے شیطان کی طرف سے لاحق ہو ہی جائے اور کبھی اس کے اندرونی جذبات اشتعال میں آ ہی جائیں۔ یعنی انسان جب تک اس کشمکش خیر و شر میں مبتلا ہے وہ شیطان سے محفوظ و مأمون نہیں ہے۔ بظاہر یہ بات اگرچہ نبی اکرم ﷺ سے مخاطب ہو کر کہی جا رہی ہے' لیکن درحقیقت اصل تخاطب آپؐ کے جاں نثاروں سے ہے۔ آپؐ کے نقش قدم پر چلنے والے آپؐ کے وہ اُمتی جو اس دعوت الی اللہ اور دعوت الی الخیر کی ذمہ داریوں کو قبول کریں' ان کو ہدایت دی جا رہی ہے: ﴿وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ﴾ کہ اگر کبھی تمہیں شیطان کی طرف سے کوئی چوک لگ ہی جائے' کہیں جذبات میں اشتعال اور غصہ آ ہی جائے تو تم فوراً بھانپ لو کہ درحقیقت یہ شیطان کی

جانب سے ایک چوک ہے۔ اب اس کا علاج اور تدارک یہ ہے کہ ﴿فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ط﴾ تو فوراً اللہ کی پناہ مانگ کر اس کی پناہ میں آ جاؤ۔ ﴿اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝۳۶﴾ ''وہ سب کچھ سننے والا' سب کچھ جاننے والا ہے''۔ وہ ہر دعا کو سنتا اور ہر اُس صورتِ حال سے واقفیت رکھتا ہے جس میں وہ دعا کسی کی زبان پر آ رہی ہے۔ کسی پیچیدہ صورتِ حال میں گرفتار ہو کر اگر کبھی انسان سے خطا اور لغزش سرزد ہو جائے تو وہ بخوبی جانتا ہے کہ اس خطا کا صدور کس بے چارگی کی حالت میں ہوا ہے۔

سیرتِ رسولؐ سے رہنمائی

نبی اکرم ﷺ کی سیرت کا بھی ایک نقشہ ہمارے سامنے آتا ہے جو کہ یومِ طائف سے متعلق ہے۔ ایک مرتبہ حضرت عائشہ ؓ نے رسول اللہ ﷺ سے یومِ اُحد کے حوالے سے سوال کیا کہ کیا آپ پر یومِ اُحد سے سخت دن بھی کوئی گزرا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''ہاں' طائف کا دن مجھ پر کہیں زیادہ سخت تھا''۔ اس دن معاملہ یہ سامنے آتا ہے کہ طائف کی گلیوں میں آپؐ کا جسم مبارک لہولہان ہوا' اوباش اور بدمعاش لوگوں نے آپؐ پر پتھراؤ کیا' فقرے چست کیے گئے' آپؐ کا مذاق اڑایا گیا اور بالکل وہ صورت ہوگئی کہ جو ہمارے ہاں کبھی گلیوں میں کسی دیوانے کے ساتھ ہوتی ہے کہ بچے تالیاں پیٹتے ہوئے اور کنکریاں مارتے ہوئے اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ بعینہٖ یہ نقشہ تھا محبوبِ ربّ العالمین اور سیّد الاوّلین والآخرین ﷺ کا۔ ایک دفعہ آپؐ زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے نقاہت کے باعث بیٹھ گئے تو دو اوباش آدمی آگے آئے' ایک نے ایک طرف بغل میں ہاتھ ڈالا اور دوسرے نے دوسری طرف اور اٹھا کر کھڑا کر دیا کہ چلو۔ اس قدر تکلیف دہ صورتِ حال سے رسولِ رحمت ﷺ کو طائف کی گلیوں میں سابقہ پڑا ہے۔ لیکن جب آپؐ وہاں سے واپس آئے تو آپؐ نے انتہائی دلدوز اور جگر کو چیر دینے والی دعا مانگی:

((اَللّٰهُمَّ اِلَيْكَ اَشْكُوْ ضُعْفَ قُوَّتِىْ وَقِلَّةَ حِيْلَتِىْ وَهَوَانِىْ عَلَى النَّاسِ......)) (۱)

''اے اللہ! میں تیری ہی جناب میں اپنی قوت کی کمی اور وسائل کی کمی اور لوگوں میں اپنی ذلت ورسوائی کا شکوہ لے کر آیا ہوں......''

اُس وقت ملک الجبال حاضر ہوا اور کہا: ''اللہ تعالیٰ نے مجھے بھیجا ہے' اور اگر آپؐ فرمائیں تو میں ان دونوں پہاڑوں کو آپس میں ٹکرا دوں جن کے مابین طائف کی یہ بستی آباد ہے' اور یہ لوگ جنہوں نے آپؐ کو ستایا ہے' پس کر سرمہ بن جائیں۔'' لیکن رسولِ رحمت ﷺ کی رحمت للعالمینی پر قربان جائیے

(۱) سیرت ابن هشام' بحواله تاريخ طبری' جلد۲' ص ۳۴۵۔

کہ فرمایا: ''نہیں' کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ ان کی آئندہ نسلوں کو ہدایت کی توفیق عطا فرما دے۔'' ایک نقشہ یہ ہے' لیکن ایک نقشہ وہ بھی ہے جو میدانِ اُحد میں سامنے آتا ہے کہ جب آپؐ پر غشی طاری ہوئی' آپ کے خود پر وہ تلوار پڑی کہ خود کو چیرتے ہوئے آپؐ کی پیشانی کی ہڈی میں سے گزر گئی اور اس نے آپؐ کے دو دانت بھی شہید کر دیے۔ اُس وقت نبی اکرم ﷺ کی زبان مبارک سے ایسے الفاظ نکل گئے کہ: ((كَيْفَ يُفْلِحُ قَوْمٌ خَضَبُوْا وَجْهَ نَبِيِّهِمْ بِالدَّمِ)) [1] ''وہ قوم کیسے فلاح پائے گی جس نے اپنے نبی (ﷺ) کے چہرے کو خون سے رنگ دیا!'' تو فوراً وحیٔ الٰہی نازل ہوئی اور فرمایا گیا:

﴿لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ اَوْ يُعَذِّبَهُمْ﴾ (آل عمران:۱۲۸)

''(اے نبیؐ!) آپؐ کے ہاتھ میں کوئی اختیار نہیں (اختیارِ مطلق اللہ کے ہاتھ میں ہے) وہ چاہے گا تو اپنی نظرِ کرم اُن کی طرف پھیر دے گا (انہیں معاف کر دے گا اور ہدایت اور ایمان لانے کی توفیق عطا فرمائے گا) اور چاہے گا تو اُن کو عذاب دے گا۔''

اس واقعہ میں ایک رہنمائی یہ ہے کہ ہوسکتا ہے کہ بڑے سے بڑے انسان کی زبان سے بھی کسی وقت کوئی ایسا جملہ نکل جائے جو اُس کے مقامِ اعلیٰ کے شایانِ شان نہ ہو۔ اس لیے یہ تعلیم فرمائی کہ: ﴿وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ؕ﴾ ''اور اگر کبھی شیطان کی طرف سے تمہیں کوئی چوک لگ ہی جائے تو فوراً اللہ کی پناہ طلب کرو''۔ اور ﴿اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۳۶﴾﴾ میں ایک اُمید دلائی گئی کہ ''اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا' سب کچھ جاننے والا ہے''۔ وہ درگزر فرمانے والا بھی ہے۔ اگر کسی وقت جذبات کی شدت میں ایسا کوئی جملہ زبان سے نکل بھی جائے تو اللہ تعالیٰ معاف فرما دینے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس مقامِ بلند تک پہنچنے کی ایک سچی آرزو دل میں پالنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

❁❁❁

(۱) مسند احمد۔ وسنن ابن ماجہ' کتاب الفتن' باب الصبر علی البلاء۔

حِصّہ دوئم

مبَاحثِ ایمَان

درس 5 تا درس 9

درس 5

قرآنِ حکیم کے فلسفہ و حکمت کی اساسِ کامل

سُورَةُ الفَاتِحَةِ

درس ۵

قرآن حکیم کے فلسفہ وحکمت کی اساسِ کامل

سورۃ الفاتحہ

نحمدہٗ ونصلی علٰی رَسولہِ الکریم
امَّا بَعد فَاَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ٥

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝ مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ ۝ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ ۝ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ ٥ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ ۝﴾ (آمین) صدق اللہ العظیم

اللہ تعالیٰ کے نام سے ہم اس سورۂ مبارکہ کے مطالب و مفاہیم سمجھنے کی کوشش کریں گے‘ جو ہماری نمازوں کا جزوِ لازم ہے اور جس کو خود اللہ تعالیٰ نے ’’القرآن العظیم‘‘ سے موسوم فرمایا ہے۔ دین سے ادنیٰ شغف رکھنے والے شخص کو بھی یہ سورۂ مبارکہ لازماً یاد ہوتی ہے۔ تاہم مناسب ہوگا کہ ہم اس سورۂ مبارکہ کے مطالب پر غور کرنے سے قبل اس کا سلیس اردو ترجمہ ذہن نشین کر لیں:

> ’’کُل شکر اور کُل ثناء اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا مالک اور پروردگار ہے۔ بہت رحم کرنے والا‘ نہایت مہربان ہے۔ جزا و سزا کے دن کا مالک و مختار ہے۔ (اے ربّ!) ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور کریں گے‘ اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں اور چاہیں گے۔ ہمیں سیدھی راہ کی ہدایت بخش‘ اُن لوگوں کی راہ کی جن پر تیرا انعام ہوا‘ جن پر نہ تیرا غضب نازل ہوا اور نہ ہی وہ گمراہ ہوئے‘‘۔ (آمین!)

چند تمہیدی اور بنیادی باتیں

سب سے پہلے مجھے اس سورۂ مبارکہ کے بارے میں چند تمہیدی اور بنیادی باتیں عرض کرنی ہیں اوراس کے مضامین کا اجمالی تجزیہ پیش کرنا ہے۔اللہ سے دعا ہے کہ قارئین کرام اِن کوگن کر اچھی طرح ذہن نشین فرمالیں اور انہیں ہمیشہ مستحضر رکھیں۔

سب سے پہلے نازل ہونے والی مکمل سورت

پہلی بات یہ ہے کہ یہ سب سے پہلی مکمل سورت ہے جو نبی اکرم ﷺ پر نازل ہوئی۔اس سے قبل متفرق آیات نازل ہوئیں۔مثلاً وہ پانچ آیات جو سورۃ العلق کے ابتداء میں شامل ہیں۔اوراس پر تقریباً اجماع ہے کہ وہ سب سے پہلی وحی ہے۔اکثر محققین کے نزدیک دوسری وحی وہ سات آیات ہیں جو سورۂ ''ن'' (جس کا دوسرا نام سورۃ القلم بھی ہے) کے آغاز میں شامل ہیں۔تیسری وحی سورۃ المزمل کی ابتدائی سات آیات ہیں اور چوتھی وحی سورۃ المدثر کی ابتدائی سات ہی آیات ہیں' جبکہ پانچویں وحی جو محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوئی وہ یہ سورۃ الفاتحہ ہے جو پہلی مکمل سورت ہے۔پھر حسن اتفاق دیکھئے کہ یہ سورۂ مبارکہ بھی سات ہی آیات پر مشتمل ہے۔

سورۃُ الفاتحہ کی عظمت

دوسری بات اس سورۂ مبارکہ کی عظمت کے بارے میں ہے۔اس ضمن میں ایک تو خود اللہ تعالیٰ کا اپنا فرمان ہے۔چنانچہ چودھویں پارے میں سورۃ الحجر میں یہ آیت وارد ہوئی ہے:

﴿وَلَقَدْ اٰتَیْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِیْمَ ﴿۸۷﴾﴾

''اور (اے نبیؐ!) بے شک ہم نے آپؐ کو عطا فرمائی ہیں سات دہرائی جانے والیاں (یعنی وہ سات آیات جو بار بار پڑھی جاتی ہیں' نماز کی ہر رکعت میں ان کا اعادہ ہوتا ہے) اور قرآنِ عظیم (عطا فرمایا)''۔

اس آیت کے بارے میں مفسرین کا تقریباً اجماع ہے کہ ''سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ'' سے مراد بھی سورۃ الفاتحہ کی سات آیات ہیں اور ''القُرآنَ العَظِیم'' بھی اسی سورۂ مبارکہ کو قرار دیا گیا ہے۔گویا اس

سورۂ مبارکہ کی عظمت یہ ہے کہ یہ بجائے خود ایک مکمل قرآن ہے' اور نہ صرف قرآن بلکہ ''قرآنِ عظیم'' ہے۔ سورۃ الحجر کا وہ مقام جس میں یہ آیۂ مبارکہ وارد ہوئی ہے' وہ ہے جہاں اللہ تعالیٰ نبی اکرم ﷺ کو صبر کی تلقین فرما رہے ہیں اور ساتھ ہی اپنا یہ احسان اور فضل بھی بیان فرما رہے ہیں کہ اے نبیؐ! ہم نے آپ کو اتنی بڑی نعمت عطا فرمائی ہے جتنی بڑی نعمت کسی اور کو نہیں دی' اور وہ ہے سورۃ الفاتحہ۔

اس سورۂ مبارکہ کی عظمت ایک حدیثِ رسولؐ سے مزید نکھر کر ہمارے سامنے آتی ہے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سے حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ کے بارے میں نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ((اَقْرَؤُ هُمْ اُبَیُّ بْنُ كَعْبٍ)) ''صحابہ رضی اللہ عنہم میں قرآن کے سب سے بڑے قاری (عالم) اُبی بن کعب ہیں''۔ ان سے ایک بار خود نبی اکرم ﷺ نے سوال کیا کہ ''اے اُبی! کیا میں تمہیں وہ سورت تلقین کروں جس کی مثل نہ تورات میں نازل ہوئی' نہ انجیل میں' نہ زبور میں اور نہ ہی قرآن مجید میں؟'' جواب میں حضرت اُبی بن کعبؓ نے سراپا اشتیاق بن کر عرض کیا: ''حضور ﷺ ضرور تلقین فرمایئے''۔ اس پر نبی اکرم ﷺ نے دوسرا سوال کیا: ''تم نماز میں کیا پڑھتے ہو؟'' حضرت اُبیؓ نے جواب میں سورۃ الفاتحہ کی تلاوت شروع کر دی تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''اُس ذات کی قسم جس کے دست قدرت میں میری جان ہے' یہی ہے وہ سورت جس کی مثل نہ تورات میں نازل ہوئی' نہ انجیل میں' نہ زبور میں اور نہ ہی قرآن میں اس کی مثل و نظیر موجود ہے' اور یہی سَبْعٌ مِّنَ الْمَثَانِیْ اور قرآن عظیم ہے جو مجھے عطا کیا گیا ہے!''(۱)

سورۃ الفاتحہ کے عظیم نام

تیسری بات اس سورۂ مبارکہ کے ناموں سے متعلق ہے۔ اس کا سب سے زیادہ مشہور و معروف اور زبان زدِ خاص و عام نام ''الفاتحة'' ہے جو ''ف ت ح'' مادہ سے بنا ہے۔ ''فَتَحَ يَفْتَحُ'' کے معنی ہیں کسی چیز کو کھولنا۔ لہٰذا ''الفاتحہ'' کے معنی ہوئے ''قرآن مجید کی افتتاحی سورت''۔ یہ نام گویا اس اعتبار سے ہے کہ یہ مصحف کی پہلی سورت ہے۔ سب جانتے ہیں کہ عربوں کا یہ خاص مزاج ہے کہ جس چیز سے انہیں خصوصی محبت ہوتی ہے وہ اس کے نام کثرت سے رکھتے ہیں۔ چنانچہ اس سورۂ مبارکہ کے بھی بہت

(۱) سنن الترمذی' کتاب فضائل القرآن' باب ما جاء فی فضل فاتحة الکتاب۔ اس مضمون کی متعدد احادیث صحیح بخاری میں بھی موجود ہیں۔ دیکھئے: صحیح البخاری' کتاب تفسیر القرآن' باب قوله وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ اور دیگر ابواب۔ عن ابی سعید بن المُعلّٰی۔

سے نام ملیں گے۔ اس کی عظمت کے اعتبار سے اسے ''اُمّ القرآن'' اور ''اساس القرآن'' بھی کہا گیا ہے۔ گویا یہ سورۂ مبارکہ قرآن مجید کے لیے جڑ' بنیاد اور اساس کے مرتبے اور مقام کی حامل سورت ہے۔ سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع کے درس میں بیان کیا گیا تھا کہ قرآن حکیم کی اپنی ایک حکمت اور اس کا اپنا ایک جداگانہ فلسفہ ہے۔ چنانچہ حکمتِ قرآنی کے لبِّ لباب' اس کے جوہر' اس کے خلاصے اور قرآن حکیم کے طرزِ استدلال کے اعتبار سے بھی اس سورۂ مبارکہ کو اساسی اہمیت حاصل ہے۔ اس سورۂ مبارکہ کو ''الکافیہ'' کا نام بھی دیا گیا ہے' یعنی یہ انسان کی فکری رہنمائی کے لیے کفایت کرنے والی سورت ہے۔ اس سورۂ مبارکہ کو ''الشافیہ'' کے نام سے بھی موسوم کیا گیا ہے' یعنی اس میں شفاء ہے۔

یہ بات بھی پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے پورے قرآن مجید کو بھی ''شفاء'' قرار دیا ہے۔ چنانچہ سورۂ یونس کی آیت ۵۷ میں فرمایا گیا:

﴿یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْکُمْ مَّوْعِظَۃٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ وَھُدًی وَّرَحْمَۃٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۵۷﴾﴾

''اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے ربّ کی طرف سے نصیحت آ گئی ہے' اور شفاء بھی دلوں کے امراض کے لیے' اور رہنمائی اور رحمت ان کے لیے جو اس پر ایمان لے آئیں''۔

سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۸۲ میں فرمایا گیا:

﴿وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا ھُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَۃٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۸۲﴾﴾

''اور ہم اتارتے ہیں قرآن میں سے جس سے روگ دفع ہوں اور رحمت ایمان والوں کے واسطے''۔

یہاں جس شفاء کا تذکرہ ہے اس کے متعلق یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اس سے ذہنی وفکری شفاء اور دل کے روگ جیسے حسد' کینہ' بغض' تکبر وغیرہ باطنی امراض مراد ہیں۔ گویا انسان کی سوچ کو درست کرنے والی کتاب' کتابِ الٰہی ہے اور باطن کے امراض کا مداوا بھی قرآن حکیم ہے۔ اس موقع پر ساتھ ہی یہ بات بھی پیشِ نظر رہے کہ انسان کے جسم اور ذہن میں بہت گہرا ربط ہے۔ ذہن وفکر مریض ہوں تو جسم پر بھی اس کے آثار ظاہر ہوں گے۔ قارئین کے علم میں ہوگا کہ آج کل کے دَور میں امراضِ ذہنی ونفسیاتی کا بڑا چرچا ہے۔ یہ دراصل فسادِ فکری کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ لہٰذا اگر فکر صحیح ہوگی' سوچ درست ہوگی تو لازماً انسان کو جسمانی تندرستی بھی حاصل ہوگی۔ ان اعتبارات سے پورا قرآن مجید بھی شفاء ہے اور یہ سورۂ مبارکہ بھی' کیونکہ یہ پورے قرآن کے خلاصے کی حامل سورت ہے۔ اس میں مؤمنوں کے لیے

ہدایت کے ساتھ ذہنی' فکری اور قلبی شفاء بھی موجود ہے۔ مزید برآں یہ کلام اللہ ہے' اس پر کامل واکمل یقین رکھنے والوں کے لیے اس میں جسمانی طور پر شفاء ہونا بھی مستبعد نہیں۔ سورۃ الفاتحہ کے جسمانی شفاء ہونے کا احادیثِ صحیحہ میں ذکر ملتا ہے۔

سورۃ الفاتحہ کا اسلوب اور انداز

چوتھی بات اس سورۂ مبارکہ کے اسلوب سے متعلق ہے۔ اگرچہ یہ کلامِ الٰہی ہے لیکن اس کا اسلوب دعائیہ ہے۔ گویا بندوں کو تلقین کی جا رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہونا چاہو تو اس طور سے ہو۔ مزید گہرائی میں اتر کر غور کریں تو درحقیقت انسان کی فطرتِ سلیمہ کی ترجمانی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس سورۃ کے جامع الفاظ کی شکل میں فرمائی ہے۔ گویا یہ سورۂ مبارکہ ترانۂ شکر و سپاس اور حمد و ثناء بھی ہے' اس میں اللہ کی ربوبیتِ کاملہ اور اس کے مالکِ ارض و سماء ہونے کا اقرار بھی ہے' اس کے رحمٰن اور رحیم ہونے کا یقین بھی ہے اور اس کے جزا و سزا کے دن کا مالک و مختارِ کُل' نیز اس کے عادل و منصف اور قادرِ مطلق ہونے کا ایقان بھی ہے۔ پھر اس میں صرف اسی کی بندگی و پرستش اور صرف اسی سے مدد و اعانت طلب کرنے کا قول و قرار اور عہد و میثاق بھی ہے۔ مزید برآں اس میں اسی سے صراطِ مستقیم پر گامزن کرنے اور منزل تک پہنچانے کی توفیق طلبی بھی ہے۔ چنانچہ اس میں اللہ تعالیٰ سے ان لوگوں کی راہ پر چلانے کی دعا بھی ہے جو نہ مغضوب ہوئے اور نہ گمراہ' بلکہ ان کا شمار اللہ تبارک و تعالیٰ کے محبوب اور انعام یافتہ بندوں میں ہوا۔

گویا اس سورۂ مبارکہ کو اس طرح قرآن مجید کے لیے ایک دیباچہ بنا دیا گیا اور بقیہ پورے قرآن مجید سے اس کا تعلق یہ ہوا کہ یہ تو ہے انسان کی فطرتِ سلیمہ کی پکار' اور اس کا جواب وہ ہے جو قرآن آگے پیش کر رہا ہے۔ انسان کی فطرت میں جس ہدایت اور سیدھے راستے کی طلب ہے وہ ''اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ'' کی دعا کی شکل میں سامنے آتی ہے۔ اس طلب اور دعائے ہدایت کا جواب ہے یہ پورا قرآن جو محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ سورۃ البقرۃ کا آغاز ان الفاظِ مبارکہ سے ہوتا ہے: ﴿الٓمّٓ ۝ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝﴾ ''ال م۔ یہ کتابِ الٰہی ہے' اس میں کوئی شک و شبہ کی بات نہیں' یہ خدا ترس لوگوں کے لیے ہدایت بن کر نازل ہوئی ہے''۔ اس طرح ایک طرف یہ سورۂ مبارکہ فلسفہ و حکمت کے اعتبار سے فطرتِ انسانی کی ترجمانی پر مشتمل ہے اور دوسری طرف قرآن مجید کے ساتھ اس کا ربط و تعلق تقریباً وہی ہے جو کسی کتاب کے

مقدمے یا دیباچے کا اصل کتاب کے ساتھ ہوتا ہے۔

نماز کا جزوِ لازم

پانچویں بات بہت اہم ہے۔ یقیناً یہ بات تمام قارئین کرام کے علم میں ہوگی کہ یہ سورۂ مبارکہ ہماری نماز کا جزوِ لاینفک ہے۔ نماز کی ہر رکعت میں اس کی تلاوت کی جاتی ہے۔ نبی اکرم ﷺ کی مشہور حدیث ہے' جو متفق علیہ ہے' یعنی جس کو امام بخاری اور امام مسلم رحمہما اللہ نے اپنی اپنی صحیح میں روایت کیا ہے کہ ((لَا صَلَاةَ لِـمَنْ لَّمْ يَقْرَأْ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ))[1] ''اس شخص کی کوئی نماز نہیں جس نے سورۃ الفاتحہ نہیں پڑھی''۔ ایک اور حدیثِ قدسی ہے جس کے راوی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں اور امام مسلمؒ اسے اپنی صحیح میں لائے ہیں۔ یہ حدیث طویل ہے جس پر ان شاء اللہ آگے گفتگو ہوگی۔ اس سے یہ بات واضح ہو کر سامنے آ جائے گی کہ اصل نماز سورۃ الفاتحہ ہی ہے۔ اس معاملے میں کسی بھی فقہی مسلک میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ سورۃ الفاتحہ ہماری نماز کا جزوِ لازم ہے۔

البتہ اس معاملے میں جو اختلاف ہے اسے چھٹی بات کے طور پر نوٹ کر لیجیے۔ یہ بات بھی یقیناً آپ کے علم میں ہوگی کہ ہمارے یہاں بعض بڑے جلیل القدر ائمۂ دین اور فقہائے کرام رحمہم اللہ کے مابین بعض مسائل میں کچھ اختلافات قدیم زمانے سے چلے آ رہے ہیں' ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جب کوئی شخص امام کے پیچھے با جماعت نماز پڑھ رہا ہو تو اس صورت میں اسے امام کے پیچھے سورۃ الفاتحہ پڑھنی چاہیے یا نہیں! ایک رائے یہ ہے کہ یہ سورت تو ہر شکل میں پڑھنی ہے' جہری رکعات میں بھی پڑھنی ہے اور سِرّی رکعات میں بھی۔ دوسری رائے اس کے بالکل برعکس ہے' اور وہ یہ کہ جب جماعت کے ساتھ نماز پڑھی جائے تو امام سورۃ الفاتحہ پڑھے لیکن مقتدی قطعاً نہ پڑھیں' نہ جہری رکعات میں نہ سِرّی رکعات میں۔ امام ہی کی قراءت مقتدیوں کی طرف سے سورۃ الفاتحہ کی قراءت شمار ہو جائے گی۔ جیسے ایک وفد کسی دربار میں حاضر ہوتا ہے تو اس وفد کا قائد یا ترجمان جو بات کرتا ہے وہ سب کی طرف سے شمار ہوتی ہے۔ البتہ ایک بین بین رائے بھی ہے' اور وہ یہ ہے کہ اگر جہری رکعت ہے تو امام بلند آواز سے سورۃ الفاتحہ کی قراءت کرے گا اور مقتدی سنیں گے اور اگر سِرّی رکعت ہے تو امام بھی خاموشی سے قراءت کرے گا اور مقتدی بھی اس کے پیچھے خاموشی سے پڑھیں گے۔ ان

(۱) صحیح البخاری' کتاب الاذان' باب وجوب القراءۃ للامام والمأموم…… الخ۔ وصحیح مسلم' کتاب الصلاۃ' باب وجوب قراءۃ الفاتحۃ فی کل رکعۃ ……الخ۔

آراء کے حاملین کے اپنے اپنے مسلک اور موقف کے لیے نہایت مضبوط اور مبسوط دلائل موجود ہیں۔

اس ضمن میں قارئین کرام کے سامنے جو بات اہمیت اور تاکید کے ساتھ لانی مقصود ہے وہ یہ ہے کہ ان معاملات کے ضمن میں ہمیں اپنے سینوں کو کشادہ رکھنا چاہیے۔ یہ اختلاف خلوص پر مبنی ہے۔ سب صحیح بات تک پہنچنا چاہتے ہیں اور جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے سب کے پاس اپنے اپنے موقف کے دلائل موجود ہیں۔ یہ فروعی اختلافات ہیں۔ دین کی اصل رُوح سے ان کا کوئی براہِ راست تعلق نہیں ہے۔ ہر رائے افضل ومفضول اور راجح ومرجوح کے اصول پر مبنی ہوتی ہے اور ہر رائے میں خطائے اجتہادی کا یکساں احتمال ہوتا ہے' جس کے متعلق اہل سنّت کا مجمع علیہ موقف یہ ہے کہ مبنی بر خلوص اجتہاد میں خطا پر بھی اللہ تعالیٰ کے یہاں اجر وثواب عطا ہوگا اور اگر اجتہاد صحیح ہو تب تو اس پر دوہرا اجر ملے گا۔ البتہ اس مسئلے کے ضمن میں خصوصی بات یہ ہے کہ اس میں ہرگز کوئی اختلاف نہیں ہے کہ سورۃ الفاتحہ ہماری نماز کا جزو لاینفک ہے۔ جب مسلمان انفرادی طور پر نماز پڑھ رہا ہو تو اسے لازماً ہر رکعت میں سورۃ الفاتحہ پڑھنی ہوگی۔ البتہ جب جماعت میں شامل ہو تو ایک رائے یہ ہے کہ امام کی سورۃ الفاتحہ کی قراءت تمام مقتدیوں کی طرف سے بھی کفایت کرے گی۔ دوسری رائے یہ ہے کہ مقتدی کو بھی ہر رکعت میں امام کے پیچھے یہ سورۃ پڑھنی ہوگی' اور ایک درمیانی رائے یہ ہے کہ مقتدی جہری نماز میں خاموش رہے گا' البتہ سرّی رکعت میں خود بھی سورۃ الفاتحہ پڑھے گا۔

تعدادِ آیات

ساتویں بات اس سورۂ مبارکہ کی آیات سے متعلق ہے۔ یہ چیز متفق علیہ ہے کہ اس سورت کی آیات کی تعداد سات ہے۔ جیسا کہ میں نے سورۃ الحجر کی آیت کے حوالے سے عرض کیا تھا کہ تمام مسالک کے نزدیک ''سَبۡعًا مِّنَ الۡمَثَانِیۡ'' کی مصداق یہ سورۂ مبارکہ ہے۔ لہٰذا آیات کی تعداد سات ہونے میں کوئی اختلاف ممکن نہیں۔ البتہ اس میں ایک اختلاف یہ ہے کہ بعض علمائے کرام ''بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ'' کو بھی اس میں شامل کرتے ہیں' جبکہ اکثر علماء ''بِسۡمِ اللّٰہِ ......'' کو سورۃ الفاتحہ کا جزو نہیں مانتے۔ ان کے نزدیک وہ بالکل علیحدہ ایک مستقل افتتاحی آیت ہے جو سورۃ البراءۃ (سورۃ التوبۃ) کے علاوہ ہر سورۃ کے آغاز میں لکھی جاتی ہے' لیکن اُس سورۃ کا جزو نہیں ہوتی۔ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ علماء اور قرّاء کے مابین خلوص سے بھی اختلافِ رائے ہوتا ہے' جس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اختلاف کی گنجائش بہرحال ہوتی ہے۔ اگرچہ وزنی رائے وہی معلوم ہوتی ہے جو امام ابو

حنیفہ ؒ کی ہے کہ اس سورۂ مبارکہ میں ''بسم اللہ'' شامل نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس رائے کی پشت پر دلیل وہ حدیثِ قدسی ہے جس کا قدرے تفصیل سے ذکر آگے آئے گا۔

تین حصوں پر مشتمل سورت

آٹھویں بات یہ ہے کہ اس سورۂ مبارکہ کے تین حصے ہیں۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ اگرچہ آیات سات ہیں لیکن نحوی اعتبار اور گرامر کے اصولوں کے لحاظ سے ان سات آیات سے مکمل جملے تین ہی بنتے ہیں۔ پہلی تین آیات: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝﴾ گرامر کی رو سے ایک ہی جملہ ہے اور نحوی اعتبار سے یہ ''جملہ اسمیہ خبریہ'' ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء اور شکر و سپاس ہے' اس کی صفاتِ رحمانی و رحیمی اور عدل وقسط کا بیان ہے۔ پھر چوتھی آیت جو اِس سورۂ مبارکہ کی مرکزی آیت ہے' خود ایک مکمل جملہ ہے' بلکہ اس کے مزید تجزیے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ایک آیت میں دو مکمل جملے موجود ہیں۔ بہرحال یہ ہے ''جملہ فعلیہ خبریہ''۔ یہ مرکزی آیت ہے: ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝﴾ ''(اے ربّ ہمارے!) ہم صرف تیری ہی بندگی و پرستش کرتے ہیں اور کریں گے' اور صرف تجھی سے مدد چاہتے ہیں اور چاہیں گے''۔ یہاں حصر کا اسلوب ہے اور عربی میں چونکہ فعل مضارع میں حال اور مستقبل دونوں کے معنی ہوتے ہیں' لہٰذا ان امور کا ترجمہ میں لحاظ رکھا گیا ہے۔ اس آیت میں ربّ اور بندے کے مابین ایک قول وقرار اور ایک معاہدہ و میثاق ہے۔ یہ مسلّمہ بات ہے کہ معاہدے میں دو فریق منسلک ہوتے ہیں' لہٰذا یہ ''جملہ فعلیہ خبریہ'' درحقیقت اللہ اور بندے کے درمیان عہد و پیمان ہے۔

تیسرا حصہ جو آخری تین آیات پر مشتمل ہے: ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۵ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝﴾ ''(اے ربّ ہمارے!) ہمیں سیدھی راہ کی ہدایت بخش' اُن لوگوں کی راہ کہ جن پر تو نے انعام فرمایا' جو نہ مغضوب ہوئے اور نہ گمراہ'' یہ بھی ایک ہی جملہ بنتا ہے اور نحو کے اعتبار سے یہ ''جملہ انشائیہ'' ہے۔ یہ ایک دعا ہے۔ اس میں ایک بندہ اپنے ربّ سے' جس کی وہ تحمید و تمجید کر چکا' جس کی ربوبیت' رحمانیت' رحیمیت اور عدالت کا اقرار کر چکا' پھر جس سے وہ عبادت و استقامت کا عہد بھی استوار کر چکا' اب وہ اسی ربّ سے اپنی فطرت کی پکار اور پیاس کی سیرابی کے لیے ''صراطِ مستقیم''، یعنی زندگی بسر کرنے کے لیے معتدل و

متوازن طرزِ زندگی اور راہِ عمل کی رہنمائی اور توفیق کا طلب گار اور مستدعی ہے۔

اس موقع پر نویں اور آخری بات سے قبل وہ حدیثِ قدسی ترجمہ کے ساتھ پیش کرنی مناسب ہے جس کا ذکر پہلے دو بار ہو چکا ہے اور جو امام مسلمؒ نے اپنی صحیح میں روایت کی ہے۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ ﷺ قَالَ اِنِّیْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ یَقُوْلُ : ((قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی : قَسَمْتُ الصَّلَاةَ بَیْنِیْ وَبَیْنَ عَبْدِیْ نِصْفَیْنِ وَلِعَبْدِیْ مَا سَاَلَ، فَاِذَا قَالَ الْعَبْدُ ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی: حَمِدَنِیْ عَبْدِیْ، وَاِذَا قَالَ ﴿الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ﴾ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی: اَثْنٰی عَلَیَّ عَبْدِیْ، وَاِذَا قَالَ ﴿مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ﴾ قَالَ مَجَّدَنِیْ عَبْدِیْ —— وَقَالَ مَرَّةً: فَوَّضَ اِلَیَّ عَبْدِیْ — فَاِذَا قَالَ ﴿اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ﴾ قَالَ هٰذَا بَیْنِیْ وَبَیْنَ عَبْدِیْ وَلِعَبْدِیْ مَا سَاَلَ، فَاِذَا قَالَ ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ﴾ قَالَ هٰذَا لِعَبْدِیْ وَلِعَبْدِیْ مَا سَاَلَ)) (۱)

حضرت ابو ہریرہ ؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ’’اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

’’میں نے نماز کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان دو برابر حصوں میں تقسیم کر دیا ہے (اس کا نصف حصہ میرے لیے اور نصف حصہ میرے بندے کے لیے ہے) اور میرے بندے کو وہ عطا کیا گیا جو اُس نے طلب کیا۔ جب بندہ کہتا ہے: ’’اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ‘‘ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میری حمد کی (میرا شکر ادا کیا)۔ جب بندہ کہتا ہے: ’’الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ‘‘ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میری ثناء کی۔ جب بندہ کہتا ہے: ’’مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ‘‘ تو اللہ فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میری بزرگی اور بڑائی بیان کی......‘‘

گویا یہ پہلا حصہ کُل کا کُل اللہ کے لیے ہے۔ آگے بڑھنے سے قبل قارئین اس مقام پر یہ بات نوٹ فرما لیں کہ اس حدیثِ قدسی میں ’’قَسَمْتُ الصَّلَاةَ بَیْنِیْ وَبَیْنَ عَبْدِیْ نِصْفَیْنِ ‘‘ کے بعد آیت ’’بسم اللہ‘‘ کا ذکر موجود نہیں، بلکہ ’’اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ‘‘ سے براہِ راست بات آگے بڑھتی ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ آیت ’’بسم اللہ‘‘ سورۃ الفاتحہ میں شامل نہیں ہے۔ اب حدیث کی طرف رجوع فرمایئے:

’’جب بندہ کہتا ہے: ’’اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ ‘‘ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ حصہ میرے اور میرے بندے کے مابین مشترک ہے اور میں نے اپنے بندے کو بخشا جو اُس نے مانگا‘‘۔

(۱) صحیح مسلم، کتاب الصلاۃ، باب وجوب قراءۃ الفاتحۃ فی کل رکعۃ ...... الخ

گویا یہ حصہ ایک معاہدہ ہے' قول وقرار ہے' عہد و میثاق ہے۔اس میں بندے نے''اِیَّاكَ نَعْبُدُ'' کہہ کر اللہ کی عبادت کا عہد کیا ہے اور''وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ'' میں کچھ طلب بھی کیا ہے' مدد بھی چاہی ہے۔اس کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ''یہ میرے بندے کے لیے ہے اور میں نے اپنے بندے کو دیا جو اُس نے مجھ سے طلب کیا''۔اب آخری حصہ رہ گیا۔فرمایا:

''جب بندہ کہتا ہے:''اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ '' تو اللہ فرماتا ہے کہ یہ حصہ (کُل کا کُل) میرے بندے کے لیے ہے اور میرے بندے نے جو کچھ مجھ سے طلب کیا وہ میں نے اُسے بخشا''۔

اس حدیث کی رو سے سورۃ الفاتحہ کے تین حصے بن جائیں گے۔ پہلا حصہ کلیۃً اللہ کے لیے ہے اور آخری حصہ کلیۃً بندے کے لیے' جبکہ درمیانی ومرکزی آیت:''اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ'' بندے اور اللہ کے مابین قول وقرار ہے۔گویا اس کا بھی نصفِ اوّل اللہ کے لیے اور نصفِ ثانی بندے کے لیے ہے۔اس طرح نصف نصف کی تقسیم بتمام وکمال پوری ہوگئی!

''آمین'' کی حیثیت

اس سورۂ مبارکہ کے بارے میں نویں اور آخری بات یہ ہے کہ اس سورۂ مبارکہ کے اختتام پر ''آمین'' کہنا مسنون ہے۔آمین کے معنی ہیں''اے اللہ ایسا ہی ہو''۔ یہ ابتدا ہی میں عرض کیا جا چکا ہے کہ اس سورۂ مبارکہ کا اسلوب دعائیہ ہے' لہٰذا دعا کے اختتام پر''آمین'' کہہ کر گویا بندہ پھر بارگاہِ الٰہی میں عرض کرتا ہے کہ''اے پروردگار! میں نے یہ استدعا اور یہ عرضداشت تیرے حضور پیش کی ہے' تو اسے شرفِ قبول عطا فرما۔اے پروردگار ایسا ہی ہو۔''

یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ سورۃ الفاتحہ کی تلاوت کے بعد تمام فقہی مسالک میں آمین کہنے کے مسنون ہونے پر اتفاق ہے۔فرق صرف یہ ہے کہ امام کے پیچھے جہری رکعت میں آمین اونچی آواز سے کہی جائے یا پست آواز سے' تو ان سب آراء رکھنے والوں کے پاس دلائل موجود ہیں۔ یہ بھی ایک فروعی اختلاف ہے۔اس میں جو متفقہ بات ہے وہ ہماری رہنمائی کے لیے کفایت کرتی ہے کہ سب کے نزدیک سورۃ الفاتحہ کی قراءت کے بعد''آمین'' کہنا مسنون ہے۔

ہم نے اس سورۂ مبارکہ کے بارے میں جو چند تمہیدی و بنیادی باتیں سمجھی ہیں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو ہماری نمازوں میں جان' خشوع وخضوع اور حضوریٔ قلب پیدا ہوجانے کا ذریعہ بنا دے۔اور

جب ہم اپنی نمازوں میں سورۃ الفاتحہ کی قراءت کریں تو اس کے مفہوم کو سمجھ کر ذہنی اور قلبی وابستگی کے ساتھ اس سورۂ مبارکہ کے الفاظ کو اپنی زبان سے ادا کریں اور دل کی گہرائیوں سے اس بات کے آرزومند ہوں کہ اس سورت کے ذریعے جس صراطِ مستقیم کی استدعا کی جاتی ہے، وہ ہمیں بالفعل حاصل ہو جائے اور ہمیں اس پر چلنے کی توفیق کی بھی بارگاہِ ربّانی سے ارزانی ہو—— آمین!

سورۃُ الفاتحہ کا جزوِ اوّل

سورۃ الفاتحہ کے سلیس و رواں ترجمے، اس کے بارے میں چند تمہیدی باتوں اور اس کے مضامین کے اجمالی تجزیے کے بعد اب ہم اس سورۂ مبارکہ کے تینوں حصوں کو علیحدہ علیحدہ قدرے گہرائی میں اتر کر سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ جیسے کہ اس سے قبل بیان کیا جا چکا ہے، اس سورۂ مبارکہ کا جزوِ اوّل تین آیات پر مشتمل ہے:

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝﴾

''کُل شکر اور کُل ثنا اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار اور مالک ہے، بہت رحم فرمانے والا، نہایت مہربان، جزا و سزا کے دن کا مالک و مختار ہے''۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ

نوٹ کیجیے کہ یہ سورۂ مبارکہ قرآن مجید کی افتتاحی سورت ہے اور اس کا ابتدائی کلمہ ہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۔ یہ کلمہ طیبہ نہایت عظیم اور بہت بلند مرتبت ہے۔ اس کے مفہوم کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلے لفظ ''حمد'' کو اچھی طرح جان لینا ضروری ہے۔ عام طور پر اس کا ترجمہ صرف ایک لفظ ''تعریف'' سے کر دیا جاتا ہے، حالانکہ تعریف بھی عربی کا لفظ ہے اور حمد بھی عربی کا لفظ ہے۔ اور یہ قاعدہ کلیہ ہے کہ کسی زبان کے دو الفاظ بالکل ہم معنی نہیں ہوتے، ان کے معنی و مفہوم میں لازماً کچھ نہ کچھ فرق ضرور ہوتا ہے۔ اگر گہرائی میں اتر کر دیکھا جائے تو لفظ ''حمد'' میں دو مفہوم شامل ہیں، ایک شکر اور دوسرا ثناء۔ شکر کا لفظ سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع کے ضمن میں تفصیلاً زیر بحث آ چکا ہے۔ وہاں واضح کیا جا چکا ہے کہ اگر فطرت اپنی صحت پر برقرار ہو تو اس کا تقاضا جذبۂ تشکر ہے اور اگر عقل صحیح نہج پر کام کر رہی ہو تو اس کا حاصل اپنے منعمِ حقیقی اور اپنے اصل مربی و محسن یعنی اللہ کو پہچان لینا ہے۔ فطرتِ

سلیمہ اور عقلِ صحیحہ دونوں کے امتزاج سے جو چیز حاصل ہوتی ہے اس کا نام ''حکمت'' ہے۔ لہٰذا حکمت کا لازمی تقاضا اللہ کا شکر ہے۔ یہی بات اس سورۂ مبارکہ کے ابتدائی کلمات میں آئی ہے کہ ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ''. لیکن حمد کا لفظ شکر سے زیادہ وسیع تر مفہوم کا حامل ہے۔ کسی کا شکر ایسی چیز پر ادا کیا جاتا ہے جس کا کوئی فائدہ شکر کرنے والے کی ذات کو پہنچ رہا ہو۔ لیکن ثناء اور تعریف کی جاتی ہے کسی بھی حسن و جمال یا کمال کی خواہ اس کا ہمیں کوئی فائدہ پہنچا ہو یا نہ پہنچا ہو۔ حمد کے لفظ میں یہ دونوں چیزیں جمع ہیں' یعنی شکر بھی اور ثناء بھی۔ لہٰذا ہم نے ترجمہ میں ان دونوں کو جمع کر دیا ہے کہ ''کُل شکر اور کُل ثناء اللہ کے لیے ہے''۔

ایک دوسرے پہلو سے غور کیجیے تو آپ اس نتیجے سے اتفاق کریں گے کہ یہ کلمۂ توحید ہے۔ ہم یہ بات جانتے ہیں کہ اس کائنات میں جہاں کہیں بھی کوئی مظہرِ حسن ہے' مظہرِ کمال ہے' مظہرِ جمال ہے اُن کے متعلق ہماری عقلِ صحیحہ یہ رہنمائی کرتی ہے کہ ان تمام محاسن و کمالات کا منبع اور سرچشمہ صرف اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذاتِ اقدس ہے۔ لہٰذا اصل تعریف اور ثناء ان اشیاء کی نہیں ہوتی بلکہ اللہ کی ہوتی ہے۔ کلمۂ توحید کا اقتضاء یہی ہے کہ موحّد کے شعور اور تحت الشعور سب میں یہ بات متحضر رہے کہ کائنات کی ہر نعمت' ہر چیز' ہر حسن' ہر جمال اور ہر کمال' الغرض کوئی بھی وصف کسی کا ذاتی نہیں' بلکہ اللہ کا ودیعت کردہ ہے۔ جیسے تصویر میں اگر کوئی حسن ہے تو وہ درحقیقت مصوّر کے کمالِ فن کی عکاسی ہے۔ تصویر کا اپنا کوئی حسن نہیں' نہ اس کا کوئی اپنا ذاتی کمال ہے۔ بالکل اسی طرح کسی مخلوق میں اگر کوئی حسن اور کمال ہے یا کوئی خوبی اور جمال ہے تو وہ حسن و کمال اور خوبی و جمال خالق کا ہے' نہ کہ مخلوق کا۔ چنانچہ اس کُل سلسلۂ کون و مکان میں جہاں کوئی حسن' کوئی کمال' کوئی خیر' کوئی خوبی اور کوئی جمال ہے یا کسی شے میں کوئی نفع رسانی کا پہلو ہے تو اس کا منبع و سرچشمہ ذاتِ باری تعالیٰ ہے۔ لہٰذا شکر کا سزاوارِ حقیقی اور تعریف و ثناء کا اصل مستحق اللہ تعالیٰ ہے۔

یہ کلمہ ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ'' اتنا عظیم اور اعلیٰ مرتبت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ یہ کلمہ آسمان و زمین کو اپنی برکات سے بھر دیتا ہے۔ حضرت ابو مالک اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی فرمانِ نبویؐ ہے:

((اَلطُّھُوْرُ شَطْرُ الْاِیْمَانِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ تَمْلَأُ الْمِیْزَانَ وَسُبْحَانَ اللّٰہِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ تَمْلَآنِ [اَوْ تَمْلَأُ] مَا بَیْنَ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ))(۱)

(۱) صحیح مسلم' کتاب الطھارۃ' باب فضل الوضوء۔

''صفائی نصف ایمان ہے اور کلمہ ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ'' میزان کو بھر دیتا ہے اور کلمات ''سُبْحَانَ اللّٰہِ'' اور ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ'' نہ صرف میزان کو پُر کر دیتے ہیں بلکہ آسمان وزمین کے مابین جو کچھ ہے (خلا، فضا) اس سب کو پُر کر دیتے ہیں''۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے انعام واکرام اور احسانات کے ضمن میں انبیاء و رُسل علیہم السلام اور صالحین کے جو کلماتِ شکر منقول ہوئے ہیں اور اس سلسلے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جن دعاؤں کی تعلیم و تلقین فرمائی ہے ان میں سے اکثر و بیشتر میں یہ کلمہ ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ'' استعمال ہوا ہے۔ طوالت سے بچنے کی خاطر دو مثالیں قرآن مجید اور دو مثالیں حدیث شریف سے پیش کرنے پر اکتفا کرنا ہوگا۔ سورۂ ابراہیم میں وارد ہے کہ جب بڑھاپے میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حضرت اسماعیل اور حضرت اسحٰق علیہما السلام جیسے صالح فرزند عطا فرمائے جو آگے چل کر منصبِ نبوت پر بھی سرفراز ہوئے تو اس احسان و انعام و نعمت اور کرم پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان پر ترانۂ شکر جاری ہوا کہ:

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ وَھَبَ لِیْ عَلَی الْکِبَرِ اِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ ط اِنَّ رَبِّیْ لَسَمِیْعُ الدُّعَآءِ ﴿۳۹﴾﴾

''کُل شکر اور ثناء اللہ کے لیے ہے جس نے مجھے بڑھاپے کے باوجود اسماعیل اور اسحٰق (علیہما السلام) عطا فرمائے۔ یقیناً میرا ربّ دعا کا سننے (اور قبول کرنے) والا ہے''۔

ایک اور مثال سورۃ الاعراف سے دیکھ لیجیے۔ جب مؤمنین صادقین کو حساب کتاب کے بعد جنت میں داخلے کا اِذن ملے گا تو اُن کی زبانوں پر کلمۂ شکر و سپاس اور تعریف و ثناء ان الفاظ میں جاری ہوگا کہ:

﴿وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ ھَدٰنَا لِھٰذَا قف وَمَا کُنَّا لِنَھْتَدِیَ لَوْ لَآ اَنْ ھَدٰنَا اللّٰہُ ج﴾ (آیت ۴۳)

''اور وہ کہیں گے کُل شکر اور کُل ثناء اُس اللہ کی ہے جس نے ہمیں اس کی ہدایت فرمائی (بلکہ یہاں تک پہنچا دیا) اور ہم خود ہدایت نہ پا سکتے (اور یہاں تک ہرگز نہ پہنچ پاتے) اگر اللہ ہی ہماری رہنمائی نہ فرماتا''۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سو کر اٹھنے کی یہ دعا تلقین فرمائی:

((اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَحْیَانَا بَعْدَ مَا اَمَاتَنَا وَاِلَیْہِ النُّشُوْرُ)) (۱)

(۱) صحیح البخاری، کتاب الدعوات، باب ما یقول اذا اصبح۔ وصحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء والتوبۃ والاستغفار، باب ما یقول عند النوم واخذ المضجع۔

''کُل شکر و ثناء اللہ کی ہے جس نے ہمیں زندہ کیا اس کے بعد کہ ہم پر موت طاری کر دی تھی اور (ایک دن اسی طرح) اس کی جانب لوٹ جانا ہے''۔

اور آپؐ نے اکل و شُرب کے بعد کی دعا ان الفاظ میں تلقین فرمائی:

((اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَجَعَلَنَا مُسْلِمِیْنَ)) (۱)

''کُل شکر اور ثناء اس اللہ کے لیے ہے جس نے ہمیں کھلایا اور پلایا اور ہمیں مسلمان بنایا۔''

رَبّ الْعَالَمِیْنَ

اب آگے باری تعالیٰ کی چند مزید صفاتِ کمال کا ذکر ہو رہا ہے۔ پہلی بات سامنے آتی ہے: ''رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ'' جو تمام جہانوں کا مالک اور پروردگار ہے۔ ''ربّ'' کے لفظ میں یہ دونوں مفہوم شامل ہیں۔ عرب گھر کے مالک کو رَبُّ الْبَیْتِ یا رَبُّ الدَّار کہتے ہیں۔ قرآن مجید میں ربّ کا لفظ مالک کے معنوں میں متعدد مقامات پر استعمال ہوا ہے۔ جیسے سورۃ القریش میں آتا ہے: ﴿فَلْیَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَیْتِ ۝۳﴾ ''پس عبادت کرو اِس گھر (حرم شریف) کے مالک کی''۔ پھر ربّ کا مفہوم پرورش کرنا' ترقی اور نشو و نما دینا بھی ہے۔ ایک مالک ایسا نا اہل اور نا کارہ بھی ہو سکتا ہے جو اپنی ملکیت کو لے کر بیٹھ رہے' اس کی ترقی اور نشو و نما کی اسے کوئی خاص پروانہ ہو' اور ایک مالک ایسا قابل و قادر ہوتا ہے کہ اس کی ملکیت میں جو چیزیں ہیں وہ ان میں سے ہر چیز کو اُس کی استعدادات کے مطابق پروان چڑھائے اور ہر شے کو اُس کے نقطۂ کمال تک پہنچانے کا سامان فراہم کرے! پس اللہ کی ذاتِ گرامی وہ ہے جو ہر شے کے نقطۂ عروج و کمال تک پہنچنے کے جملہ مقتضیات کو فراہم کرنے اور بہم پہنچانے والی ہے۔ ''عَالَمِیْنَ'' عالم کی جمع ہے۔ لہٰذا یہاں ربّ العالمین کا مفہوم ہو گا سارے جہانوں کی مخلوقات کا مالک اور پروردگار اللہ ہی ہے' آقا بھی وہی ہے اور پرورش کنندہ بھی وہی ہے۔

الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم

اگلی آیت میں اللہ تبارک و تعالیٰ کا ایک اور وصف ''الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم'' کے الفاظ میں بیان ہوا ہے۔ یہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے دو بڑے عظیم صفاتی نام ہیں۔ دونوں کا مادہ رحمت ہے۔ اسی رحمت سے

(۱) سنن الترمذی' کتاب الدعوات' باب ما یقول اذا فرغ من الطعام۔ وسنن ابی داوٗد' کتاب الاطعمۃ' باب ما یقول الرجل اذا طعم۔

''رحمٰن'' اور اسی سے ''رحیم'' بنا۔ ان دونوں کے فرق کو اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے۔ عربی زبان میں ''فَعْلَانُ'' کے وزن پر جب کوئی صفت آتی ہے تو اس میں ایسا نقشہ سامنے آتا ہے جیسے کسی شے میں جوش وخروش اور طوفانی اور ہیجانی کیفیت ہو۔ خود ہیجان بھی فَعْلان کے وزن ہی پر ہے۔ تشبیہہ کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ جیسے سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہو' اس میں زبردست ہلچل ہو۔ کسی صفت کی یہ کیفیت ہو تو عربی میں اسے اکثر فعلان کے وزن پر لایا جاتا ہے۔ مثلاً جب کہا جائے ''اَنَا عَطْشَانُ'' تو مفہوم ہوگا ''میں شدید پیاسا ہوں' یا پیاس سے مرا جا رہا ہوں''۔ ''اَنَا جَوْعَانُ'' کا مفہوم ہوگا ''میں بہت بھوکا ہوں' یا بھوک سے میری جان نکل رہی ہے''۔ ''ھُوَ غَضْبَانُ'' کا مطلب ہے ''وہ نہایت غصے اور طیش میں ہے''۔ ان امور کو سامنے رکھئے اور اب ''رَحْمٰن'' کے لفظ کو سمجھئے کہ اس کے معنی کیا ہوں گے! رحمٰن وہ ہستی ہے جس کی رحمت ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کے مانند ہے۔ جس کی رحمت میں انتہائی جوش وخروش ہے۔

البتہ ''فَعِیْل'' کے وزن پر جب کوئی صفت آتی ہے تو اس صفت میں اس کے دوام واستمرار کا مفہوم شامل ہوتا ہے۔ یعنی یہ وقتی جوش وخروش نہیں ہے بلکہ اس میں پائیداری واستواری اور مستقل مزاجی ہے۔ گویا اللہ کی رحمت کی شان یہ بھی ہے کہ اس میں دوام اور استمرار ہے' جیسے ایک دریا ہمواری کے ساتھ مسلسل بہہ رہا ہے' اس میں ہیجان نہیں ہے' سمندر کی طرح کا جوش وخروش نہیں ہے' لیکن بہاؤ کا ایک خاموش اور پُرسکون تسلسل ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کی یہ دونوں شانیں ہیں جو بیک وقت موجود ہیں۔ یعنی وہ بیک وقت رحمٰن بھی ہے' رحیم بھی ہے۔ اس بات کو ایک تشبیہہ سے مزید سمجھا جا سکتا ہے۔ فرض کیجیے کہ سڑک پر کوئی حادثہ ہو گیا ہے جس میں کئی افراد ہلاک ہو گئے ہیں اور فرض کیجیے کہ اس حادثے میں ایک ایسی عورت بھی ہلاک ہو گئی جس کی گود میں ایک دودھ پیتا بچہ بھی تھا۔ وہ بچہ زندہ ہے اور اپنی مُردہ ماں کی چھاتی سے چمٹا ہوا ہے۔ یہ کیفیت دیکھ کر کون انسان ہوگا جس کے دل میں رقت پیدا نہ ہو اور شفقت ورحمت کے جذبات موجزن نہ ہو جائیں! ہر انسان یہ چاہے گا کہ یہ بچہ جو بے سہارا ہو گیا ہے' میں اس کی کفالت اپنے ذمہ لے لوں' اس کی پرورش میں کروں۔ لیکن اگر وہ اس جوش میں یہ ذمہ داری لے بیٹھا' تو ہمارا مشاہدہ یہ ہے کہ اکثر وبیشتر یہ وقتی جوش بہت جلد ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ ہی دنوں کے بعد اسے محسوس ہو کہ میں یہ کیا غلطی کر بیٹھا! میرے اپنے بچے ہیں' میری بے شمار ذمہ داریاں پہلے سے موجود تھیں' اب اِن پر مستزاد یہ بوجھ میں نے خواہ مخواہ اپنے سر لے لیا۔ گویا وقتی طور پر وہ ہیجانی کیفیت جو اُس کے دل میں پیدا ہوئی تھی جس کے زیر اثر اس نے بے سہارا بچے کی

کفالت کی ذمہ داری لے لی تھی' اس میں دوام و استمرار نہیں تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی رحمت کی یہ دونوں شانیں بیک وقت ہیں۔ وہ بیک وقت رحمٰن بھی ہے اور رحیم بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ''الرَّحْمٰن'' اور ''الرَّحِیْم'' کے مابین حرفِ عطف ''وٗ'' نہیں آیا' بلکہ یہاں فرمایا: ''الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ'' یعنی اس میں یہ دونوں صفات' یہ دونوں شانیں بیک وقت بتمام وکمال موجود ہیں۔

ایک اعتراض اور اس کا جواب

اب ذرا اس بات پر غور کیجیے کہ یہ سورۃ الفاتحہ یعنی قرآن مجید کی بالکل ابتدائی سورت کی پہلی دو آیات ہیں' اور ان میں اللہ تعالیٰ کا جو تعارف ہمارے سامنے آتا ہے اس میں کون سی چیز غالب ہے؟ وہ ہے اُس کی ذات کا لائق حمد وثناء اور قابلِ شکر وامتنان ہونا اور اس کی ربوبیتِ عامّہ اور اس کی رحمتِ تامّہ! یہ ہے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ابتدائی تعارف جو قرآن نوعِ انسانی سے کراتا ہے۔ یہاں اس اعتراض کو بھی پیش نظر رکھ لیجیے جو بعض مستشرقین اور ان کی تقلید میں اکثر آریہ سماجیوں نے قرآن مجید اور اسلام پر کیا ہے' پھر اس اعتراض کے صحیح جواب کو بھی جان لیجیے۔ وہ کہتے ہیں کہ قرآن میں اللہ کے خوف پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے اور اسی کو زیادہ نمایاں کیا گیا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں خوف' تقویٰ' میدانِ حشر کے مصائب' جہنم کے عذاب اور اس کی روح فرسا تفصیلات کی بہت تکرار ہے' جبکہ ہمارے مذہب میں اللہ کی محبت اور اس کے شفیق ورحیم ہونے پر بہت زور ہے۔ یہ درحقیقت قرآن مجید پر بہتان ہے' اس لیے کہ قرآن مجید بالکل افتتاحی سورت میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا جو ابتدائی تعارف کرا رہا ہے وہ' معاذ اللہ' ثم معاذ اللہ' کسی خوفناک ہستی کا تعارف نہیں ہے' بلکہ ایک پروردگار اور پالن ہار' ایک سراپا رحمت وشفقت ذات' ایک شفیق اور ودود ہستی اور ایک رحمٰن ورحیم آقا کا تعارف کرا رہا ہے' جو تمام صفاتِ کمال سے متصف ہے اور جس کی ذاتِ اقدس میں تمام محاسن موجود ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ اس کا اصل اور حقیقی تعارف تو یہ ہے جو سورۃ الفاتحہ کی ان دو آیات میں بیان ہوا۔ البتہ یہ بات اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ سب لوگ محبت کے رمز آشنا اور قدر شناس نہیں ہوتے' اکثر لوگ پست ذہنی سطح ہی کے حامل ہوتے ہیں' جن کے بارے میں علامہ اقبال مرحوم نے کہا ہے : ؎

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

ایسے لوگوں کے لیے ضرورت ہے کہ انہیں خوف بھی دلایا جائے‘ اُن کے دلوں میں باز پُرس کا احساس بھی اُجاگر کیا جائے‘ ان کو عذابِ الٰہی سے خبردار بھی کیا جائے اور برے کاموں کی سخت سزا سے ڈرایا بھی جائے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں دونوں چیزیں یعنی اللہ تعالیٰ کے غفور‘ ستار‘ رحیم‘ رحمٰن‘ رؤف‘ وَدود ہونے کی شانیں بھی ملیں گی اور قہار‘ ذوانتقام‘ سریع الحساب ہونے کا ذکر بھی ملے گا۔

ابتدا میں نبی اکرم ﷺ کو جو احکام ملے ہیں ان میں آپ ﷺ کو اس طرح مخاطب کیا گیا ہے: ﴿یٰٓاَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝﴾ (المدثر) ’’اے لحاف میں لپٹ کر لیٹنے والے (ﷺ)! کھڑے ہوجاؤ (کمربستہ ہوجاؤ) اور لوگوں کو خبردار کرو‘‘۔ ایک اور جگہ فرمایا: ﴿وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ ۝﴾ (الشعراء) ’’اور (اے نبیؐ!) اپنے رشتہ داروں اور قریبی اعزّہ کو خبردار کیجیے‘‘۔ تو ابتدا میں انذار کا پہلو ضرور غالب رہا لیکن اصولاً قرآن مجید جس اللہ پر ایمان کی دعوت دیتا ہے وہ‘ معاذ اللہ‘ کوئی خوفناک ہستی نہیں‘ بلکہ محبت کرنے والی‘ اور محبت ہی نہیں پرستش کرنے کے لائق ہستی ہے‘ اس سے محبت کرو‘ اسے چاہو‘ اس سے لو لگاؤ۔ جیسے کہ سورۃ البقرۃ میں ارشاد ہوا: ﴿وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ ط﴾ (آیت ۱۶۵) ’’اور جو واقعتاً صاحبِ ایمان ہیں وہ تو سب سے زیادہ اور شدید محبت اللہ تعالیٰ کے ساتھ کرتے ہیں‘‘۔ اور اس محبت کی اساسات ہیں جو سورۃ الفاتحہ کی ابتدائی دو آیات میں ہمارے سامنے آئیں کہ اللہ تعالیٰ تمام محاسن و کمالات کا جامع ہے‘ منبع و سرچشمہ ہے‘ وہ کائنات کا ربّ ہے‘ مالک ہے‘ پروردگار ہے‘ پالن ہار ہے‘ وہ الرحمٰن ہے‘ الرحیم ہے۔ اس کی رحمت ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کے مانند بھی ہے اور استمرار اور دوام کے ساتھ بہنے والے دریا کے مانند بھی ہے۔

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ

تیسری آیت میں دوسرا رُخ آ رہا ہے جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے‘ یعنی انذار۔ فرمایا: ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝﴾ زندگی محض اس دنیا کی زندگی تک محدود نہیں ہے‘ بلکہ یہ زندگی ایک امتحان گاہ ہے‘ جس میں آزمائش ہوتی ہے کہ انسان کس طرح زندگی بسر کرتا ہے۔ جیسے سورۃ الملک میں فرمایا گیا: ﴿خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ط﴾ (آیت ۲) ’’موت اور زندگی کو اس (اللہ تبارک وتعالیٰ) نے پیدا ہی اس لیے کیا ہے کہ تم کو آزمائے (اور دیکھے) کہ تم میں کون اچھے عمل کرنے والا ہے‘‘۔ لہٰذا اس آزمائش اور امتحان کا لازمی تقاضا ہے کہ جزا و سزا کا ایک دن بھی ہو۔ اور وہ دن آ کر رہے گا جس دن لوگوں کو اپنے اعمال کا پورا پورا بدلہ ملے گا‘ ہر انسان کا محاسبہ ہوگا اور اسے جواب دہی

کرنی ہوگی۔ اس محاسبہ اور حساب کتاب کے نتیجے میں جزا یا سزا کے فیصلے صادر ہوں گے۔ یہ ہوگا ''یوم الدین''، جس کے متعلق ہم آیۂ بر کے درس میں پڑھ چکے ہیں۔ اس کے بارے میں سورۃ الذّٰریٰت میں فرمایا گیا: ﴿اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ ۝ وَّاِنَّ الدِّیْنَ لَوَاقِعٌ ۝﴾ ''جو وعدہ تم سے کیا جا رہا ہے وہ سچا ہے اور جزا وسزا واقع ہو کر رہے گی''۔ اس محاسبہ کے نتیجے میں یا جنت ہوگی ہمیشہ کے لیے یا آگ ہوگی دائمی۔ جیسا کہ نبی اکرم ﷺ کے ابتدائی خطبات میں سے ایک خطبہ کے آخر میں آتا ہے:

((وَاللّٰہِ لَتَمُوْتُنَّ کَمَا تَنَامُوْنَ ثُمَّ لَتُبْعَثُنَّ کَمَا تَسْتَیْقِظُوْنَ، ثُمَّ لَتُحَاسَبُنَّ بِمَا تَعْمَلُوْنَ، ثُمَّ لَتُجْزَوُنَّ بِالْاِحْسَانِ اِحْسَانًا وَبِالسُّوْءِ سُوْءً، وَاِنَّھَا لَجَنَّۃٌ اَبَدًا اَوْ لَنَارٌ اَبَدًا))

''اللہ کی قسم! تم سب (ایک دن) مرجاؤ گے جیسے (روزانہ) سو جاتے ہو، پھر یقیناً اٹھائے جاؤ گے جیسے (ہر صبح) بیدار ہو جاتے ہو، پھر لازماً تمہارے اعمال کا حساب کتاب ہوگا، پھر لازماً تمہیں بدلہ ملے گا اچھائی کا اچھا اور برائی کا برا (اور یہ اس شکل میں ہوگا کہ) وہ جنت ہے ہمیشہ کے لیے یا آگ ہے دائمی''۔

اس فیصلے اور جزا وسزا کے دن کا مالک ومختار صرف اللہ ہے۔ ''مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ''۔ اور اُس روز اللہ کے سوا کسی کے پاس کوئی اختیار نہیں ہوگا۔ چنانچہ ایک جگہ قرآن مجید میں الفاظ آئے ہیں کہ اُس روز ایک ندا ہوگی: ﴿لِمَنِ الْمُلْكُ الْیَوْمَ﴾ ''آج کے دن بادشاہی کس کی ہے؟'' اور پھر جواب میں فرمایا جائے گا: ﴿لِلّٰہِ الْوَاحِدِ الْقَھَّارِ﴾ (المؤمن:١٦) ''آج تمام اختیار اور کُل بادشاہی صرف اللہ کے لیے ہے جو الواحد ہے (تنہا ہے، یکتا ہے) اور پوری طرح سے قابو یافتہ اور مسلط ہے (مقتدرِ اعلیٰ ہے، جو چاہے کرے)''۔

یہ ہے اس سورۂ مبارکہ کا پہلا حصہ جس کے بارے میں حدیثِ قدسی کے حوالے سے یہ بتایا جا چکا ہے کہ ان کلمات کی تاثیر کا یہ عالم ہے کہ اِدھر بندہ کہتا ہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ اور اگر یہ دل سے نکلے ہوئے الفاظ ہوں تو فوراً اللہ تبارک وتعالیٰ جواب میں ارشاد فرماتا ہے: ''میرے بندے نے میرا شکر ادا کیا''۔ اور جب بندہ کہتا ہے ''الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ'' تو اللہ تعالیٰ جواب میں فرماتا ہے: ''میرے بندے نے میری ثناء کی''۔ جب بندہ کہتا ہے: ''مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ'' تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''میرے بندے نے میری بڑائی کا اعلان کیا اور میری عظمت بیان کی''۔

لفظ ''اللہ'' کی تحقیق

اس پوری بحث میں ایک دقیق لغوی وعلمی مسئلے کو جان بوجھ کر نہیں چھیڑا گیا' اور وہ ہے لفظ ''اللہ'' کی تحقیق۔ تاہم مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بارے میں چند بنیادی باتیں عام فہم انداز میں بیان کر دی جائیں۔

لغوی اعتبار سے لفظ ''اللہ'' کے بارے میں دو آراء ہیں۔ ایک یہ کہ یہ اسم جامد اور اسم علَم ہے' یعنی نہ اس کا کوئی مادہ ہے' نہ یہ کسی اور لفظ سے بنا ہے' بلکہ یہ اسمِ ذات ہے اُس ہستی کا جس نے اس سلسلۂ کون ومکان کو تخلیق فرمایا۔ لہٰذا اصل ضرورت اس اسم ہی کو حرزِ جاں بنانے اور دل پر کندہ کرنے کی ہے نہ کہ اس کے معنی کے کھوج کرید کی۔ دوسری رائے یہ ہے کہ یہ بھی باری تعالیٰ کے بقیہ تمام اسماءِ حُسنیٰ کے مانند صفاتی نام ہے اور لفظ ''الٰہ'' پر لام تعریف داخل کر کے بنا ہے اور اس کے معنی ہیں الٰہ حقیقی اور معبودِ برحق!

پھر خود ''الٰہ'' کے مادے کی تحقیق بھی ایک دقیق اور طوالت طلب معاملہ ہے' لیکن تین مفہوموں پر تقریباً اجماع ہے۔ ایک وہ ہستی جس کی طرف حاجت روائی اور مشکل کشائی کے لیے رجوع کیا جائے' دوسرے وہ ہستی جس کے بارے میں عقل حیران اور سرگشتہ ہو کر رہ جائے' اور تیسرے وہ ہستی جس سے والہانہ محبت ہو۔ اور اگر ذرا غور کیا جائے تو صاف نظر آ جائے گا کہ عوام الناس کی رسائی اکثر و بیشتر صرف پہلے مفہوم تک ہوتی ہے' جبکہ فلاسفہ کا تحیر اور لاادریت دوسرے مفہوم کے مظہر ہیں' اور صوفیاء تیسرے اور بلند ترین مفہوم سے سرشار ہوتے ہیں — واللہ اعلم!!

جزوِ ثانی: عبادت اور استعانت

اس سورۂ مبارکہ کا جزوِ ثانی ایک آیت پر مشتمل ہے۔ اور جیسا کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے' یہ ہر اعتبار سے اس سورت کی مرکزی آیت ہے' یعنی:

﴿اِیَّاكَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاكَ نَسۡتَعِیۡنُ ۝﴾

یہاں پہلی بات یہ نوٹ فرمایئے کہ اس آیت میں دو فعل استعمال ہوئے ہیں' ایک ''نَعۡبُدُ'' اور دوسرا ''نَسۡتَعِیۡنُ''. یہ دونوں فعل مضارع ہیں۔ آپ کے علم میں ہو گا کہ اردو کی طرح عربی وفارسی میں فعل کی

تین حالتیں ماضی' حال اور مستقبل نہیں ہوتیں' بلکہ صرف دو حالتیں ہوتی ہیں' ایک ماضی اور دوسری مضارع' اور فعل مضارع میں حال اور مستقبل دونوں زمانے شامل ہوتے ہیں' لہٰذا نَعْبُدُ کا ترجمہ یہ بھی ہوگا کہ ''ہم بندگی کرتے ہیں'' اور یہ بھی ہوگا کہ ''ہم بندگی کرتے رہیں گے''۔ اسی طرح نَسْتَعِیْنُ کا ترجمہ یہ بھی درست ہوگا کہ ''ہم مدد مانگتے ہیں'' اور یہ بھی صحیح ہوگا کہ ''ہم مدد مانگیں گے''۔

دوسری بات یہ نوٹ کر لیجیے کہ اگر یہاں ''نَعْبُدُكَ'' کا لفظ ہوتا تو اس کے معنی ہوتے کہ ''ہم تیری بندگی کرتے ہیں اور کریں گے''۔ لیکن چونکہ ضمیر مفعولی ''كَ'' کو فعل سے پہلے لایا گیا اور اس کے لیے ''اِیَّا'' کا اضافہ کیا گیا' یعنی ''اِیَّاكَ نَعْبُدُ'' تو اس میں ایک مزید تاکیدی مفہوم پیدا ہو گیا اور وہ یہ کہ ''ہم صرف تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور کریں گے''۔ اس کو قواعد کی رو سے حصر کا اسلوب کہا جاتا ہے۔ اس کو اس مثال سے سمجھا جا سکتا ہے کہ اگر یہ کہا جائے کہ ''زید عالم ہے'' تو اس سے ایک خاص مفہوم ذہن میں آئے گا' لیکن اگر یہ کہا جائے کہ ''زید ہی عالم ہے'' تو اس ''ہی'' کے اضافے سے مفہوم میں عظیم فرق واقع ہو جائے گا۔ اس لیے کہ جب یہ کہا گیا کہ ''زید عالم ہے'' تو دوسروں کے عالم ہونے کی نفی نہیں ہوئی۔ گویا دوسرے بھی عالم ہو سکتے ہیں۔ لیکن جب یہ کہا گیا کہ ''زید ہی عالم ہے'' تو اس میں حصر پیدا ہو گیا اور اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ ''علم'' صرف زید ہی کے پاس ہے' دوسروں سے ''علم'' کی نفی ہو گئی۔ لہٰذا ''اِیَّاكَ نَعْبُدُ'' میں اسی حصر کا مفہوم پیدا ہوتا ہے۔ اس کا ترجمہ اور حقیقی مفہوم ہوگا: ''ہم صرف تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور کریں گے''۔ اسی طرح ''اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ'' کا مفہوم ہوگا: ''ہم صرف تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں اور مانگیں گے''۔

تیسری بات یہ کہ اس آیت کا مرکزی لفظ ''عبادت'' ہے جس کا ہم اقرار بھی کر رہے ہیں اور عہد بھی کر رہے ہیں۔ اس لیے کہ ''ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں'' یہ اقرار ہے یا اظہارِ واقعہ ہے۔ اور ''ہم تیری ہی عبادت کرتے رہیں گے'' یہ ایک وعدہ' قول و قرار اور عہد و میثاق ہے۔

چوتھی اہم بات یہ ہے کہ عبادت کا حقیقی معنی و مفہوم کیا ہے؟ بدقسمتی سے اس لفظ عبادت کے بارے میں عوام الناس کے ذہنوں میں بڑا محدود تصور پایا جاتا ہے اور عام خیال یہ ہے کہ عبادت بس نماز' روزہ' حج اور زکوٰۃ کا نام ہے۔ چنانچہ جب بھی عبادت کا لفظ سامنے آتا ہے ذہن لامحالہ صرف ان عبادات ہی تک محدود ہو کر رہ جاتا ہے اور اس لفظ کی اصل عظمت اور وسعت سامنے نہیں آتی۔ اس لیے جان لیجیے کہ اس لفظ عبادت کا مادہ ''ع ب د'' ہے اور ''عبد'' غلام کو کہتے ہیں۔ غلامی کا وہ تصور جو کبھی دنیا میں رائج تھا' وہ

سامنے ہو تب اس لفظ کی اصل حقیقت سمجھ میں آتی ہے۔ جو شخص کسی کا عبد یعنی غلام ہوتا تھا وہ اپنے آقا کی ملکیت ہوتا تھا۔ اس کا کام اپنے مالک کے احکام کو بجالانا ہوتا تھا۔ آقا جو حکم دیتا تھا غلام کا فرض تھا کہ وہ بسر و چشم اس کی تعمیل کرے۔ اس کی اپنی کوئی مرضی نہیں ہوتی تھی۔ اس لیے کہ غلام تو مملوک ہوتا تھا' اس کا کام تو اپنے آقا کی مرضی پر چلنا تھا۔ اس کی پسند اور ناپسند اوّل تو رہنی ہی نہیں چاہیے تھی' اور اگر رہتی بھی تو اس کا فرض تھا کہ اسے پس پشت ڈال دے اور اپنے آقا کی پسند و ناپسند اور مرضی و ناراضی کو مقدم رکھے۔ پس معلوم ہوا کہ لفظ ''عبد'' میں جو تصور مضمر ہے وہ مکمل اور ہمہ تن' ہمہ وقت اور ہمہ جہت غلامی کا تصور ہے۔ فارسی میں اس کے لیے بہترین لفظ ''بندگی'' ہے۔ چنانچہ عبد کے مفہوم کے لیے بندہ کا لفظ عام طور پر مستعمل ہے۔ جیسے علامہ اقبال نے فرمایا ع

''تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیت ہے!''

یعنی یہ کہ انسانوں ہی میں سے کوئی آقا بن جائے اور کوئی بندہ' تو اس سے زیادہ غلط اور خلافِ انسانیت بات اور کوئی نہیں! اس کے برعکس نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''اے لوگو! تم سب اللہ کے بندے اور آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ''۔ تم سب اللہ کے بندے ہو' اس اعتبار سے برابر ہو' بھائی بھائی ہو' تم میں سے کوئی آقا اور غلام ہے ہی نہیں۔ حقیقی آقا اللہ ہے اور تم سب اس کے غلام ہو۔

بندگی کے اس ہمہ گیر تصور کو سامنے رکھ کر اس حقیقت کی جانب توجہ کی جائے تو پانچویں اہم بات یہ سامنے آئے گی کہ از روئے قرآن مجید غایتِ تخلیقِ جن و انس یہی عبادتِ ربّ ہے۔ چنانچہ سورۃ الذّٰریٰت میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ ﴿۵۶﴾﴾ ''میں نے جنوں اور انسانوں کو پیدا ہی اس لیے کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں''۔ یہ ہے ہماری غایتِ تخلیق۔ قرآن کریم کی اس آیت کی ترجمانی بڑی خوبصورتی سے شیخ سعدی رحمہ اللہ نے اس شعر میں کی ہے جو بہت سی مسجدوں میں لکھا ہوتا ہے کہ

زندگی آمد برائے بندگی
زندگی بے بندگی شرمندگی

چھٹی قابل غور بات یہ ہے کہ کوئی شے جس مقصد کے لیے بنائی گئی ہو وہ اگر اس مقصد ہی کو پورا نہ کرے تو ظاہر بات ہے کہ وہ بے کار قرار پائے گی اور ہم اسے کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر پھینک دیں گے۔ لہٰذا جب انسان کی تخلیق ہوئی ہی بندگی کے لیے ہے تو اگر وہ بندگی کی روش کو اختیار نہ کرے یا

اسے تج دے اور ترک کر دے تو معلوم ہوا کہ اس کے وجود کا اب کم از کم انسانی سطح پر کوئی مقصد نہیں رہا' اور اس کی زندگی محض حیوانی سطح کی زندگی ہے یا شاید اس سے بھی کم تر!

اس ضمن میں ساتویں اہم بات یہ ہے کہ جب ہم اللہ سے عہد کرتے ہیں کہ ''ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور کریں گے'' تو یہ ایک بہت بڑا عہد ہے اور اس کے بہت سے تقاضے ہیں' جن کو سمجھے اور جانے بغیر عبادت کا حق ادا نہیں کیا جا سکتا۔ (یاد رہے کہ یہ باتیں ہمارے سامنے شرک فی العبادت کی بحث کے ضمن میں پہلے بھی آ چکی ہیں۔ یوں سمجھئے کہ اب ان کا ایک دوسرے سیاق وسباق میں اعادہ ہو رہا ہے)

عبادت کا سب سے پہلا تقاضا اطاعت ہے۔ اگر یہ نہیں ہے تو عبادت کی اساس ہی منہدم ہو جاتی ہے۔ پھر بندگی کہاں ہوئی؟ مزید برآں اطاعت اگر کلی نہ ہو' بلکہ جزوی ہو تب بھی عبادت کی نفی ہو جاتی ہے۔ اس لیے کہ کسی غلام کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ اپنے آقا کے ایک حکم کو مانے اور ایک کو نہ مانے۔ غلام نے اگر آقا کے ایک حکم سے بھی سرتابی کی تو وہ مقامِ بندگی سے تجاوز کر گیا۔ لہٰذا اطاعت لازم ہے تمام احکامِ خداوندی کی' ہر آن اور ہر لحظہ! اور زندگی کا کوئی گوشہ بندگی سے خارج یا مستثنیٰ نہیں رہے گا۔ اسی لیے قرآن مجید میں فرمایا گیا: ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً﴾ (البقرۃ: ۲۰۸) ''اے اہل ایمان! (اطاعت اور) فرمانبرداری میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ''۔ گویا جزوی اطاعت مطلوب نہیں ہے کہ اللہ کی کچھ باتوں پر تو سرِ تسلیم خم ہو اور کچھ باتوں سے انحراف کیا جائے۔ اس پر اللہ کا غضب بہت بھڑکتا ہے۔ چنانچہ سورۃ البقرۃ کی آیت ۸۵ میں اس طرزِ عمل پر بڑی سخت وعید آئی ہے۔ فرمایا:

﴿اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰۤى اَشَدِّ الْعَذَابِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۸۵﴾﴾

''کیا تم ہماری کتاب (اور ہماری شریعت) کے بعض حصوں کو مانتے ہو اور کچھ حصوں کو نہیں مانتے؟ تو جو کوئی تم میں سے اس جرم کا ارتکاب کرے گا اس کی سزا اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اسے دنیا کی زندگی میں ذلیل وخوار کر دیا جائے' اور قیامت کے دن انہیں شدید ترین عذاب میں جھونک دیا جائے گا' اور اللہ اس سے بے خبر نہیں ہے جو تم کرتے ہو''۔

یہ ہے جزوی اطاعت پر اللہ تعالیٰ کے غیظ وغضب کا عالم! اس لیے کہ جزوی اطاعت حقیقت کے اعتبار

سے استہزاء اور تمسخر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس آیت کے آخر میں فرمایا: ''اور اللہ اس سے بے خبر نہیں ہے جو تم کر رہے ہو''۔ اس گمان میں نہ رہنا کہ وہ تمہارے کرتوتوں سے واقف نہیں ہے' بلکہ وہ تو العلیم' البصیر' اللّطیف اور الخبیر ہے۔ اس سے تمہارا کوئی عمل پوشیدہ نہیں ہے۔

آٹھویں اور اہم ترین بات یہ ہے کہ ایک اطاعت ہوتی ہے زبردستی کی' جیسے ہم انگریز کے غلام تھے اور ہم اس کی اطاعت پر مجبور تھے۔ اس اطاعت پر بھی لغوی طور پر لفظ عبادت کا اطلاق ہو جائے گا اور قرآن مجید میں ہوا ہے۔ چنانچہ آلِ فرعون نے بنی اسرائیل کو جس طریقے سے اپنی غلامی کے شکنجے میں کسا ہوا تھا' اس کے لیے قرآن مجید میں یہی لفظ عبادت آیا ہے۔ فرعون نے بڑے طنطنے اور غرور کے ساتھ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کے بارے میں کہا تھا: ﴿...... وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ ﴿٤٧﴾﴾ (المؤمنون) ''......جبکہ ان دونوں کی قوم ہماری عابد ہے'' یعنی ہماری غلام ہے۔ اسی طرح ایک موقع پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی فرعون سے فرمایا تھا: ﴿......اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ﴾ ''......کہ تو نے بنی اسرائیل کو اپنا عبد (اپنا غلام' اپنا محکوم اور مطیع) بنا لیا ہے''۔ لہٰذا اس نوع کی غلامی اور محکومی پر بھی لفظاً تو عبادت کا اطلاق ہو جائے گا لیکن اصطلاحاً اللہ کی جو عبادت مطلوب ہے۔ وہ زبردستی اور مجبوری کی اطاعت نہیں' بلکہ دلی آمادگی اور محبت کے ساتھ مطلوب ہے۔ اللہ کے احسانات و انعامات کا شعور و ادراک کرتے ہوئے کہ اس کے جذبۂ تشکّر سے قلب و ذہن سرشار ہو جائیں' ان احساسات و جذبات کے ساتھ جب اللہ کی بندگی ہوگی' اس کی کامل اطاعت ہوگی تب عبادت کا اصل تقاضا پورا ہوگا' جس کو ہمارے ائمۂ دین نے بڑی خوبصورتی سے یوں ادا فرمایا کہ اللہ کی جو عبادت مطلوب ہے' اس میں دو بنیادیں جمع ہونی چاہئیں: غَایَةُ الحُبّ مع غایة الذُّلّ وَالخُشوع یعنی ایک طرف اللہ کی انتہا درجہ کی محبت ہو اور دوسری طرف انتہا درجے میں اس کے سامنے تذلّل اور عاجزی اختیار کی جائے' اس کے سامنے ہمہ تن جھک جایا جائے' بچھ جایا جائے۔ جب یہ دونوں کیفیات — محبت اور تذلّل — جمع ہو جائیں گی تو عبادتِ ربّ اور بندگیٔ ربّ کے تقاضے کی تکمیل ہوگی۔ محبتِ الٰہی عبادت کے لیے کس قدر لازمی ہے' مولانا رومؒ نے اسے اپنے زمانے میں بڑی خوبی سے ادا کیا تھا کہ: ؎

شاد باد اے عشقِ خوش سودائے ما
اے طبیبِ جملہ علّت ہائے ما

اور اس دَور میں علامہ اقبال مرحوم نے اس کی اہمیت پر بڑی خوبصورتی سے روشنی ڈالی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ :ـ

عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اوّلیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصورات

محبتِ الٰہی عبادت کی روح ہے۔ اگر یہ روح نہیں ہے اور صرف خالی خولی اطاعت ہے' دل کی محبت کی چاشنی اس میں شامل نہیں ہے تو علامہ اقبال کے بقول معاملہ یہ ہوگا کہ :ـ

شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام!
میرا قیام بھی حجاب' میرا سجود بھی حجاب

لہٰذا ہمیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ محبت درحقیقت عبادت کی روح ہے۔

نویں بات یہ ہے کہ عبادت میں اطاعتِ کُلی و محبتِ حقیقی کے ساتھ جو تیسری چیز مطلوب ہے وہ اخلاص ہے۔ اس سے قبل سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع کے ضمن میں اقسامِ شرک کی بحث میں بھی یہ بات واضح ہو چکی ہے۔ آج پھر اس کا اعادہ کر لیجیے۔ عبادت کی قبولیت کی شرطِ لازم اخلاص ہے' یعنی اللہ کی بندگی پورے خلوص و اخلاص کے ساتھ ہونی چاہیے۔ اس میں کوئی ریاکاری نہ ہو اور اللہ کی رضا کے سوا کوئی اور چیز مطلوب و مقصود کے درجے میں نہ آ جائے۔ مطلوب صرف اللہ کی رضا اور اُخروی فلاح و نجات ہو۔ اگر یہ اخلاص و للّٰہیت موجود نہیں ہے' بلکہ کوئی ریاکاری ہے' یعنی لوگوں پر اپنی عبادت گزاری اور اپنے زہد و تقویٰ کی دھونس جمانی ہے اور اپنی نیکی کا رعب قائم کرنا ہے' یا شہرت مطلوب ہے' یا دنیا کی کوئی منفعت پیشِ نظر ہے تو یہ خلوص سے خالی عبادت اللہ تعالیٰ کے یہاں قبول نہیں ہوگی' بلکہ' جیسا کہ اس سے قبل واضح ہو چکا ہے' شرکِ خفی شمار ہوگی۔ جیسے ''اقسامِ شرک'' کی بحث میں نبی اکرم ﷺ کی حدیث بیان ہو چکی ہے کہ ''جس نے دکھاوے کے لیے نماز پڑھی وہ شرک کر چکا' جس نے دکھاوے کے لیے روزہ رکھا وہ شرک کر چکا' جس نے دکھاوے کے لیے صدقہ کیا وہ شرک کر چکا''۔ اس حدیث سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہمارے دین میں خلوص و اخلاص کی کس قدر اہمیت ہے اور ریا کی کتنی مذمت ہے کہ اس کے ڈانڈے شرک سے مل جاتے ہیں۔

اب آخری اور دسویں بات پر غور کیجیے کہ پوری زندگی میں پورے خلوص و اخلاص' شدید ترین قلبی محبت اور کامل اطاعت کے ساتھ عبادت کا حق ادا کرنا' واقعتاً یہ ہے کہ یہ کوئی آسان کام نہیں ہے' بلکہ

بہت مشکل کام ہے۔ اس میں سب سے پہلے تو انسان کا اپنا نفس ہی آڑے آتا ہے۔ مولانا روم نے کیا خوب کہا ہے کہ : ؎

نفسِ ما ہم کمتر از فرعون نیست
لیکن اُو را عون ایں را عون نیست

فرعون کے پاس حکومت تھی' لاؤ لشکر تھا' اس لیے اس نے زبان سے بھی خدائی کا دعویٰ کر دیا تھا۔ میرا نفس بھی اگرچہ فرعون سے کمتر نہیں ہے' البتہ اس کے پاس لاؤ لشکر نہیں ہے' اس لیے وہ خدائی کا زبانی دعویٰ تو نہیں کرتا لیکن اندر سے وہ کہتا یہی ہے کہ میں نہیں جانتا کہ اللہ کا حکم کیا ہے! بلکہ میری مرضی چلے گی۔ خود غور کیجیے کہ اذان کی آواز کان میں آ گئی ہے' گویا اللہ کا حکم ہے کہ نماز کے لیے آؤ۔ اِدھر نفس کہہ رہا کہ ابھی مزید سوتے رہو' مزید آرام کرو' یا جس دلچسپی میں مصروف ہو اسے جاری رکھو۔ اب فیصلہ کُن بات یہ ہو گی کہ ہم نے کس کا حکم مانا! اگر نفس کی خواہش کو کچلتے ہوئے ہم نے اللہ کا حکم مانا اور نماز کے لیے نکل کھڑے ہوئے تو واقعی ہم بندۂ ربّ ہیں۔ اگر نفس کی خواہش پر عمل کیا اور اللہ کے حکم کو پس پشت ڈال دیا تو ہم بندۂ نفس ہو گئے۔ یہی بات سورۃ الفرقان میں فرمائی گئی ہے:

﴿اَرَءَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـهَهٗ هَوٰىهُ ؕ اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَیْهِ وَكِیْلًا ﴿۴۳﴾﴾

''(اے نبیؐ!) کیا آپ نے اُس شخص کی حالت پر غور کیا جس نے اپنی خواہشِ نفس کو اپنا معبود بنا لیا؟ تو کیا آپ ایسے شخص کا ذمہ لے سکتے ہیں؟''

اسی حقیقت کو علامہ اقبال نے یوں ادا کیا : ؎

چو می گویم مسلمانم بلرزم
کہ دانم مشکلاتِ لا الٰہ را

یعنی ''میں جب یہ کہتا ہوں کہ میں مسلمان ہوں تو مجھ پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے' اس لیے کہ مجھے معلوم ہے کہ لا الٰہ الاّ اللہ کے تقاضوں پر پورا اترنا کتنا مشکل ہے!''

یہ ہے ربط و تعلق کہ جب بندہ کہے: ''اِیَّـاكَ نَـعْبُدُ '' تو اس پر ایک لرزہ طاری ہو جائے' اسے پورا احساس اور کامل شعور ہو کہ وہ کتنا بڑا قول و قرار کر رہا ہے۔ اس کیفیت میں اسے پناہ گاہ نظر آئے گی ''وَاِیَّـاكَ نَسْتَـعِیْنُ '' کے الفاظِ مبارکہ میں کہ اے اللہ! میں یہ وعدہ اور عہد تو کر رہا ہوں اور میں نے ارادہ اور عزم بھی کر لیا ہے کہ پوری زندگی تیری عبادت میں بسر کروں گا' لیکن میں

محض اپنی قوت اور طاقت کے بل پر اس ذمہ داری سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا اور اس عہد پر پورا نہیں اتر سکتا جب تک کہ تیری مدد شاملِ حال نہ ہو۔ میں اس عہد کے پورا کرنے میں تیری اعانت اور تائید و توفیق کا محتاج ہوں۔ تیری اعانت اور مدد شامل ہوئی تب ہی میں اس قول و قرار اور عہد و پیمان کو پورا کر سکوں گا۔ یہ تو ہے اصل ربط و تعلق ''اِيَّاكَ نَعْبُدُ'' کے ساتھ ''اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ'' کا۔ اضافی طور پر اس میں اخلاص فی الدّعاء کا مضمون بھی آ گیا' اس لیے کہ یہاں بھی حصر کا اسلوب ہے۔ گویا ہر نوع کی حاجت روائی اور مشکل کشائی کے لیے اللہ ہی سے مدد کی درخواست کی جائے' اسی سے اعانت طلب کی جائے' اسی کے جناب میں استغاثہ پیش کیا جائے۔ یہ توحید فی الدّعاء ہے' جس کا ذکر اس سے قبل اقسامِ شرک کی بحث کے ضمن میں ہو چکا ہے۔

اسی آخری بات کے ضمیمے کے طور پر یہ بات بھی نوٹ فرما لیجیے کہ ہر فرض نماز کے بعد جو اذکار نبی اکرم ﷺ کے معمول میں شامل تھے' ان میں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مروی آپ ﷺ کی یہ دعا بھی منقول ہے: ((رَبِّ اَعِنِّیْ عَلٰی ذِکْرِكَ وَشُکْرِكَ وَحُسْنِ عِبَادَتِكَ)) (۱) ''اے پروردگار! میری مدد فرما تا کہ میں تجھے یاد رکھ سکوں' تیرا شکر ادا کر سکوں اور تیری عبادت کا باحسن وجوہ حق ادا کر سکوں''۔

جزوِ ثالث: درخواستِ ہدایت

سورۃ الفاتحہ کا تیسرا حصہ اگرچہ تین آیات پر مشتمل ہے تاہم ان سے جملہ ایک ہی بنتا ہے۔ آیئے پہلے ان تین آیاتِ مبارکہ اور ان کے ترجمے پر ایک نظر ڈال لیں:

﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۵ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝﴾ (آمین یا ربّ العالمین)

''(اے ربّ ہمارے!) ہمیں ہدایت بخش سیدھی راہ کی' راہ اُن لوگوں کی جن پر تیرا انعام ہوا' جو نہ تو مغضوب ہوئے اور نہ گمراہ''۔ (اے تمام جہانوں کے مالک! ایسا ہی ہو)

پہلی تین آیات پر تدبّر سے ہم پر یہ حقیقت واضح ہو چکی ہے کہ ایمان باللہ یا توحید اور ایمان بالآخرۃ یا معاد تک ایک سلیم الفطرت اور سلیم العقل انسان فطرت و عقل کی رہنمائی میں از خود بھی رسائی حاصل کر سکتا ہے جس کے نتیجے میں اس کے باطن میں ایک بے پناہ جذبۂ تشکّر پیدا ہو جاتا ہے۔ چوتھی

(۱) سنن النسائی' کتاب السھو' باب نوع آخر من الدعاء۔

آیت سے معلوم ہوا کہ اسی جذبۂ تشکر سے جذبۂ عبادت اُبھرتا ہے۔اس سے آگے واقعہ یہ ہے کہ عقلِ انسانی خود اپنی محدودیت اور نارسائی کا اعتراف کرتی ہے کہ جہاں تک صراطِ مستقیم یعنی زندگی بسر کرنے کے معتدل و متوازن طریقے کا تعلق ہے' وہاں انسانی عقل بے بس اور محتاجِ ہدایت ہے۔ چنانچہ یہ ہے وہ مقام جہاں بندہ سراپا احتیاج بن کر ایک استدعا اور ایک درخواست اپنے مالک کے حضور پیش کرتا ہے کہ اے ربّ! ہماری رہنمائی فرما' یعنی ہمیں دکھا اور چلا اُس راستہ پر جس میں کوئی کجی نہ ہو' کوئی ٹیڑھ نہ ہو' افراط و تفریط کے دھکے نہ ہوں' جو ہمیں سیدھا تیری رضا تک پہنچانے والا اور آخرت کی کامیابی و کامرانی اور فوز و فلاح سے ہمکنار کرنے والا ہو۔

''ہدایت'' عربی زبان کا ایک نہایت وسیع المفہوم لفظ ہے۔اس میں یہ مفہوم بھی شامل ہے کہ راستہ دکھا دیا جائے' بتا دیا جائے' سمجھا دیا جائے' یہ مفہوم بھی شامل ہے کہ اس راستے پر ذہن اور قلب کو مطمئن کر دیا جائے' اور یہ مفہوم بھی شامل ہے کہ انگلی پکڑ کر اس راستے پر چلایا جائے اور بالآخر و بالفعل منزلِ مراد تک پہنچا دیا جائے۔ یہ ہدایت کے مختلف مراحل ہیں۔سورۂ محمد (ﷺ) میں فرمایا گیا: ﴿وَالَّذِیۡنَ اهۡتَدَوۡا زَادَهُمۡ هُدًی وَّ اٰتٰهُمۡ تَقۡوٰىهُمۡ ﴿۱۷﴾﴾ ''اور وہ لوگ جو ہدایت کے راستہ پر آئے اللہ نے ان کی ہدایت میں اضافہ کر دیا اور انہیں ان کے حصہ کا تقویٰ عطا فرما دیا''۔اسی طرح سورۂ مریم میں فرمایا گیا: ﴿وَیَزِیۡدُ اللّٰهُ الَّذِیۡنَ اهۡتَدَوۡا هُدًی ؕ﴾ (آیت ۷۶) ''اور اللہ ان لوگوں کی ہدایت میں اضافہ فرماتا ہے جو ہدایت اور راست روی کا راستہ اختیار کرتے ہیں''۔ یہ ہدایت مسلسل بڑھتی چلی جاتی ہے' اس میں ترقی ہوتی چلی جاتی ہے۔اللہ تعالیٰ اس کے تمام مدارج و مراحل مؤمنین صادقین کو طے کرا دیتا ہے یہاں تک کہ وہ اپنی منزلِ مراد تک جا پہنچتے ہیں اور جنت میں داخلے کے وقت ان کی زبانوں پر یہ ترانۂ حمد جاری ہو جاتا ہے: ﴿اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ الَّذِیۡ هَدٰىنَا لِهٰذَا ۟ وَمَا کُنَّا لِنَهۡتَدِیَ لَوۡ لَاۤ اَنۡ هَدٰىنَا اللّٰهُ ۚ﴾ (الاعراف:۴۳) ''تمام شکر و سپاس اور کُل تعریف و ثناء اللہ ہی کے لیے ہے جس نے ہمیں راستہ دکھایا اور ہمیں یہاں تک پہنچا دیا' اور ہم خود ہرگز راہ یاب نہ ہو سکتے اگر اللہ ہی ہماری رہنمائی نہ فرماتا''۔ واضح رہے کہ یہی عقلی بنیاد ہے ایمان بالرسالت کی' کیونکہ ہدایتِ الٰہی رسولوں ہی کے واسطے سے بنی نوعِ انسان تک پہنچتی ہے۔ چنانچہ سورۃ الاعراف کی اس آیت کے آخر میں کامیاب و بامراد مؤمنین کا یہ قول بھی نقل ہوا ہے: ﴿لَقَدۡ جَآءَتۡ رُسُلُ رَبِّنَا بِالۡحَقِّ ؕ﴾ ''ہمارے ربّ کے رسول واقعی

حق لے کر ہی تشریف لائے تھے''۔

یہاں یہ مغالطہ نہیں ہونا چاہیے کہ وہ شخص جو بنیادی حقائق تک خود پہنچ چکا ہے' جس نے اللہ کو پہچان لیا' اس کی توحید کو جان لیا' اس کی صفاتِ کمال کی معرفت حاصل کر لی' اس کی ربوبیت' رحمانیت ورحیمیت کا ادراک وشعور حاصل کر لیا' اس کے مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ہونے کا اقرار کر لیا' پھر اس کی بندگی اور پرستش کا عہد و پیمان کر لیا تو اسے تو گویا کُل ہدایت حاصل ہوگئی۔ اب اسے کون سی مزید ہدایت مطلوب ہے جس کے لیے وہ دعا کر رہا ہے کہ ''اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ''. یہاں انسان کی جس احتیاج کی طرف اشارہ کیا جار ہا ہے وہ یہ ہے کہ انسان اس دُنیوی زندگی کے مختلف معاملات میں جو نہایت پیچیدہ ہیں اور ان مسائل میں جو باہم گتھے ہوئے ہیں' ایک اعتدال کی روش اور ایک متوازن طرزِ عمل کا محتاج ہے اور اس کی یہ احتیاج ہمیشہ باقی رہے گی' اس لیے کہ تمدن کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ ان مسائل و معاملات کی پیچیدگیاں بھی مسلسل بڑھتی چلی جاتی ہیں اور حیاتِ انسانی کی یہ پیچیدگیاں اور ان کے گوناگوں تقاضے اور مطالبے اور ان کا آپس میں ٹکراؤ اور تصادم' یہ عقدہ ہائے لاینحل ہیں' اور کسی انسان کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ مجرد اپنی عقل اور تجربے کی بنیاد پر اِن جملہ سماجی و معاشرتی اور سیاسی و معاشی مسائل کا متوازن ومعتدل اور عادلانہ ومنصفانہ حل تلاش کر سکے' جس پر چل کر وہ حیاتِ دُنیوی کی برکتوں اور سعادتوں سے بھی پُر سکون طور پر ہمکنار ہو سکے' اور حیاتِ اُخروی میں بھی نجات اور فوز وفلاح حاصل کر سکے۔ یہ ہے درحقیقت انسان کی اہم ضرورت جس کے لیے سلسلۂ نبوت ورسالت اور انزالِ وحی وکتب کی ضرورت پیش آئی۔ اور یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ جہاں تک ایمان کے بنیادی تصورات کا تعلق ہے وہاں تک پہنچنے کے لیے انسان اپنی عقل اور فطرت سے بھی رہنمائی حاصل کر سکتا ہے' جیسا کہ سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع کے ذریعے یہ حقیقت ہمارے سامنے آ چکی ہے کہ انسان اپنی فطرتِ صحیحہ اور عقلِ سلیم کی رہنمائی میں توحید اور معاد تک رسائی حاصل کر سکتا ہے' لیکن زندگی کی پُر پیچ وادیوں میں سیدھی راہ کی تلاش' یہ انسان کے بس میں نہیں ہے۔ اس کے لیے وہ مجبور ہے کہ گھٹنے ٹیک کر اپنے مالک سے ہدایت کی درخواست کرے' اس لیے کہ واقعہ یہ ہے کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں اور یہی واحد ممکن راستہ ہے۔

اس بات کو انسانی تمدن کے چند پیچیدہ مسائل کی مثال سے اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔ اس ضمن میں اوّلین اور قدیم ترین مسئلہ یہ ہے کہ مرد اور عورت کے مابین حقوق و فرائض کا صحیح توازن کیا ہے۔ ہر باشعور انسان جانتا ہے کہ اس معاملے میں تاریخ انسانی میں شدید افراط و تفریط نظر آتی ہے۔ کسی معاشرے میں عورت بالکل بھیڑ بکری کی طرح ایک مملوکہ کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کے برعکس کہیں ہم دیکھتے ہیں کہ وہی عورت قلوپطرہ بن کر کسی ملک کی تقدیر کا فیصلہ کر رہی ہے اور اس کے لیے تباہی اور بربادی کا سامان فراہم کر رہی ہے۔ لہٰذا مرد اور عورت کے درمیان توازن و اعتدال اور عدل و انصاف عقل انسانی کے بس میں نہیں ہے۔ اس لیے کہ انسان لازماً مرد ہوگا یا عورت' اور ان میں سے ہر ایک صرف اپنی ہی مصلحتوں اور مفادات کو مدّنظر رکھنے پر مجبور ہے۔ گویا یہاں انسان اس فاطرِ فطرت کی رہنمائی کا محتاج ہے جس نے مرد کی تخلیق بھی کی ہے اور عورت کی بھی۔ جو دونوں کے عواطف اور میلانات کو بتمام و کمال جاننے والا ہے' جو تہذیب و تمدن میں دونوں کے حقوق و فرائض کا ایسا صحیح صحیح تعین کر سکتا ہے جس کی بدولت انسانی تمدن کی گاڑی دونوں پہیوں پر ہمواری کے ساتھ سیدھی راہ پر آگے بڑھ سکے۔

دوسری مثال فرد اور اجتماعیت کے باہمی تعلق و توازن سے متعلق ہے۔ اگر افراد کی انفرادی آزادی پر حدِّ اعتدال سے زیادہ زور ہوتا ہے اور ان کے حقوق کا ضرورت سے زیادہ لحاظ رکھا جاتا ہے تو پلڑا ایک جانب جھک جاتا ہے اور مادر پدر آزادی انتشار اور انارکی کا روپ دھار لیتی ہے۔ اس کے برعکس کہیں ایسا ہوتا ہے کہ اجتماعیت اس طور پر مسلط ہو جاتی ہے کہ اس کے نیچے فرد سسکنے لگتا ہے اور اس کے حقوق بالکل پامال ہو جاتے ہیں۔ اس کی آزادی اور حریت کو اجتماعیت کی بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے۔ ان دو انتہاؤں کے مابین توازن قائم رکھنا نہایت کٹھن ہے اور واقعہ یہ ہے کہ عقل انسانی اس کی صلاحیت نہیں رکھتی کہ وہ ایسے صحیح نقطۂ عدل کا تعین کر سکے کہ فرد کے حقوق بھی برقرار رہیں' اس کی انفرادی شخصیت کے صحت مند ارتقاء کے امکانات بھی روشن رہیں' لیکن اس کے ساتھ ساتھ فرد معاشرے کے لیے ایک مضر اور نقصان دہ عنصر کی حیثیت اختیار نہ کر سکے' بلکہ ان دونوں کے مابین ایک مبنی بر عدل اور کامل توازن والا نظام قائم ہو سکے۔ عمرانیات کی تاریخ سے ادنیٰ واقفیت رکھنے والے بھی اس سے واقف ہیں کہ انسانی عقل اور تجربات تا حال ایسا نظام قائم کرنے سے یکسر قاصر رہے ہیں اور ان کے تجویز کردہ نظام

لازماً افراط وتفریط کا شکار رہے ہیں۔

یہی معاملہ معاشی مسائل کا بھی ہے جنہوں نے خاص طور پر صنعتی انقلاب کے بعد ایک نہایت گھمبیر اور لاینحل عقدے کی صورت اختیار کر لی ہے۔ یعنی یہ کہ سرمایہ اور محنت کے مابین صحیح توازن کیسے قائم کیا جائے اور اقتصادی معاملات میں عدل واعتدال کے تقاضے کیسے پورے کیے جائیں۔ اس معاملے میں نقطۂ عدل وقسط کی تلاش میں نوعِ انسانی کتنی سرگرداں ہے اور کیسے کیسے تجربے کر رہی ہے' وہ روزِ روشن کی طرح ہمارے سامنے ہے۔ کہیں وہ انفرادی ملکیت کی نفئ کلی کا تجربہ کرتی ہے جس سے انسان کی شخصی آزادی اور اس کی آزاد شخصیت کچل کر رہ جاتی ہے۔ کہیں ایسا ہوتا ہے کہ سرمایہ ایک بہت بڑے ڈکٹیٹر کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور ایک سرمایہ دارانہ آمریت معاشرے پر مسلط ہو جاتی ہے' جس میں امیر' امیر تر اور غریب' غریب تر ہوتا چلا جاتا ہے اور کسانوں اور مزدوروں کے لیے ایک باعزت اور آسودہ زندگی بسر کرنا محال ہو جاتا ہے۔

یہ ہیں وہ تین پیچیدہ اور اُمّہات المسائل جن کے گوناگوں شعبوں اور پیچ در پیچ شاخوں اور پھر ان کے متضاد تقاضوں کو ایک متوازن ومعتدل نظام میں سمونے سے انسان قاصر ہے۔ اس لیے کہ ان کے حل کے لیے جب بھی انسان سوچے گا' اپنے قریبی ظروف واحوال میں رہ کر سوچے گا' اور اُن کا حل تلاش کرنے میں وہ اپنی ذات' گروہ یا طبقے سے بلند تر ہو کر معتدل اور منصفانہ راہ تلاش نہ کر پائے گا اور اس کی سوچ میں کہیں نہ کہیں کجی رہ جائے گی۔ اس کا جھکاؤ کسی نہ کسی طرف ہو جائے گا۔ نتیجتاً وہ صراطِ مستقیم اور سَوَاءَ السَّبِیۡل سے بھٹک جائے گا۔ قرآن مجید اس معتدل اور متوازن راستے کو مختلف ناموں سے تعبیر کرتا ہے۔ سورۃ الفاتحہ میں اسے صراطِ مستقیم کہا گیا ہے' یعنی سیدھا راستہ۔ کہیں اسے سَوَاءَ السَّبِیۡل کہا گیا ہے' کہیں صِرَاط السَّوِیّ کہا گیا ہے' یعنی برابری کا راستہ' جیسے خط استواء ہے جو ہمارے کرۂ ارضی کو دو برابر حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ پس سَوَاءَ السَّبِیۡل وہ راستہ ہوگا جس میں کامل توازن ہو' افراط و تفریط نہ ہو' کسی ایک جانب جھکاؤ نہ ہو جائے۔ کہیں اسے قَصۡدُ السَّبِیۡل سے تعبیر کیا گیا ہے' یعنی معتدل اور درمیانی راستہ جس میں نہ ایچ پیچ ہو نہ اونچ نیچ۔ کہیں اسے سُبُلُ السَّلام کہا گیا ہے' یعنی سلامتی کا راستہ جس میں امن وسکون ہو' ظلم وعدوان نہ ہو' تعدّی واستحصال نہ ہو۔

یہ ہے درحقیقت انسان کی وہ احتیاج جس کے لیے وہ گھٹنے ٹیک کر اپنے پروردگار کے

سامنے استدعا کرنے پر مجبور ہے کہ اے میرے ربّ! میں نے تجھے پہچان لیا' تیری توحید کو جان لیا' ادنیٰ درجے ہی میں سہی لیکن مجھے تیری صفاتِ کمال کی معرفت بھی حاصل ہوگئی۔ میں نے یہ بھی جان لیا کہ مجھے مرنے کے بعد تیرے حضور میں حاضر ہونا ہے۔ میں یہ بھی جان چکا ہوں کہ اس دن کامل اختیار صرف تیرے ہاتھ میں ہوگا۔ میں نے یہ ارادہ اور عزم بھی کر لیا ہے کہ میں تیری ہی بندگی اور پرستش کروں گا اور اس کے لیے میں تیری ہی اعانت و امداد کا محتاج ہوں' لہٰذا اب میں تجھ سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ زندگی بسر کرنے کا صراطِ مستقیم' صِـرَاط السَّـوِیّ' سواء السبیل اور سبیل السلام مجھ پر واضح فرما دے۔ مجھے اس کی ہدایت عطا فرما' اس کے لیے میرے دل کو اطمینان و انشراح بخش۔ مجھے اس پر چلنے کی توفیق دے اور اس پر چلاتے ہوئے مجھے میری کامیابی و کامرانی اور فوز و فلاح کی آخری منزل تک پہنچا دے۔ واضح رہے کہ یہی ایمان بالرسالت کی عقلی بنیاد ہے' کیونکہ اس ہدایتِ ربّانی کو انسانوں تک پہنچانے کے منصبِ جلیل پر رسولوں کی مقدس جماعت فائز ہوتی رہی ہے اور اس سلسلۃ الذّہب کی آخری کڑی ہیں خاتم النبیین' سیّد المرسلین' ہادئ آخر الزمان حضرت محمد رسول اللہ ﷺ۔

یہ ایک قاعدہ کلیہ ہے کہ جس چیز کی اہمیت و وقعت زیادہ ہوتی ہے اسے مزید واضح کیا جاتا ہے' چنانچہ انسان کے دل میں جس چیز کی محبت ہوتی ہے وہ اس کا ذکر کثرت سے کرتا ہے۔ لہٰذا اس صراطِ مستقیم کی اہمیت پر زور دینے کے لیے اس کی مزید وضاحت خود اُسی کی زبان سے کرائی جا رہی ہے کہ:

﴿اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ ۙ صِرَاطَ الَّذِيۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ ۵﴾

''(اے ربّ) ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت عطا فرما' ان لوگوں کے راستے کی جن پر تو نے انعام فرمایا''۔

یہ لوگ کون ہیں؟ اس سورۂ مبارکہ میں غایتِ اجمال و اختصار ہے۔ اس لیے یہاں ساری تفاصیل ممکن نہیں تھیں۔ لیکن قرآن مجید کی تفسیر کا یہ اصول پیشِ نظر رکھئے کہ اَلْقُرْآنُ یُفَسِّرُ بَعْضُهٗ بَعْضًا ''قرآن کا ایک حصہ دوسرے حصے کی تفسیر کرتا ہے''۔ اس کے مطابق اگر تلاش کیا جائے کہ ''اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ'' کی تفسیر قرآن مجید میں کہاں وارد ہوئی ہے تو سورۃ النساء کی یہ آیت سامنے آئے گی:

﴿وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا﴾

''اور جولوگ اللہ اوراس کے رسول کی اطاعت پر کار بند ہو جائیں گے تو ان کو معیت اور رفاقت نصیب ہوگی ان کی جن پر اللہ کا انعام ہوا' یعنی انبیائے کرام' صدیقین' شہداء اور صالحین۔ اور بہت ہی اچھے ہیں یہ رفیق (جو کسی کو میسر آ جائیں)''۔

یہ چار گروہ ہیں مُنْعَمْ عَلَيْهِمْ کے۔ یہ ہیں وہ لوگ جن پر اللہ کا انعام وفضل ہوا' یہ ہیں وہ لوگ جن کو اللہ نے اپنی نعمتوں سے نوازا۔ ان میں انبیاء کرام علیہم السلام سب سے بلند اور سب سے اونچے مرتبے پر فائز ہیں۔ ان کے بعد درجہ ہے حضراتِ صدیقین کا۔ ان کے بعد تیسرے نمبر پر آتے ہیں شہدائے کرام' پھر چوتھے نمبر پر عام مؤمنین صالحین ہیں۔ اس موقع پر نوکِ قلم پر دعا آ رہی ہے کہ اے ربّ ہمارے! ہمیں اِن منعم علیہم کے راستے کی ہدایت بخش' ہمیں ان کے راستے پر چلنے کی توفیق عطا فرما دے اور ہمیں ان کی رفاقت نصیب فرما! (آمین)

صراطِ مستقیم کی اس مثبت انداز میں وضاحت کے بعد ایک سلبی اور منفی انداز میں بھی وضاحت کی گئی:

﴿غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ﴾

''جو نہ مغضوب علیہم میں شامل ہیں اور نہ ہی گم کردہ راہ ہیں''۔

درحقیقت یہ دو کیفیات یا دو درجات ہیں جنہیں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ ایک درجہ مغضوب علیہم کا ہے جو بہت ہی ناپسندیدہ ہے اور گویا ﴿ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِيْدًا﴾ کا مصداق ہے۔ جب کوئی فرد یا کوئی قوم یا اُمت ہدایت کی راہ کو اپنے نفس کی شرارتوں کے باعث اور اپنی خواہشات وشہوات کا اتباع کرتے ہوئے جان بوجھ کر چھوڑ دے' صداقت وہدایت کی راہ سے جان بوجھ کر اعراض کرے' اس سے مُنہ موڑے تو اُن کو قرآن ''مغضوب علیہم'' قرار دیتا ہے' یعنی جن پر اللہ کا غضب نازل ہوا۔ گویا جو لوگ حق کو حق اور باطل کو باطل جان کر بھی اپنے تعصّبات کی وجہ سے 'یا اپنی خواہشاتِ نفس کی وجہ سے یا اپنے تکبر اور حسد کی بنیاد پر حق کو چھوڑ کر باطل کو اختیار کرتے ہیں تو وہ مغضوب علیہم ہیں۔

ایک دوسرا گروہ ان کا ہے جو مغالطوں میں مبتلا ہو کر گمراہ ہو جاتے ہیں۔ اس معاملے میں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے' جیسے ہم ''نیکی کی حقیقت'' کی بحث میں دیکھ چکے ہیں' کہ انسان غلط راستہ پر چل پڑتا ہے۔ اس کا کوئی اچھا جذبہ غیر معتدل ہو کر کسی غلط صورت میں ڈھل جاتا ہے۔ اس گروہ کے متعلق قرآن کہتا ہے: ''ضَآلِّيْنَ''' یعنی وہ لوگ جو بھٹک گئے' جو گم کردہ راہ ہیں' وہ

قافلہ جو اپنا صحیح راستہ بھول کر کسی دوسری جانب نکل گیا۔ لفظ ''ضَالّ'' کا ایک دوسری صورت پر بھی اطلاق ہوتا ہے کہ جو شخص ابھی تلاشِ حقیقت میں سرگرداں ہو' اس کے اندر طلبِ ہدایت موجود ہو' لیکن ابھی وہ غور و فکر کے مراحل طے کر رہا ہو۔ ایسے شخص کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہو جاتا ہے۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ کے بارے میں بھی سورۃ الضحیٰ میں یہی لفظ استعمال کیا گیا: ﴿وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ﴿۷﴾﴾ ''(اے نبیؐ!) آپؐ کو پایا آپ کے ربّ نے تلاشِ حقیقت میں سرگرداں تو آپ پر ہدایت کا راستہ کھول دیا''۔ آپؐ میں تلاشِ حقیقت کا جذبہ اس شدت کے ساتھ اُبھرا کہ آپؐ نے غارِ حرا کی خلوت گزینی غور و فکر اور سوچ بچار میں کُلّی انہماک کے لیے اختیار فرمائی' لہٰذا پروردگار کی جانب سے پردے اٹھا دیے گئے اور نزولِ وحی کا آغاز ہو گیا۔

الغرض ''ضالّین'' کا لفظ ''مغضوب علیہم'' کی بنسبت بہت ہلکا ہے۔ مغضوب علیہم وہ لوگ ہیں جنہوں نے شرارتِ نفس کے طفیل محض اپنی خواہشات و شہوات کے اتباع میں حق کو جان بوجھ کر ترک کر دیا اور ضالّین وہ ہیں جو یا تو کسی مغالطے کے باعث راہ حق سے بھٹک گئے ہیں یا ابھی تلاشِ حق میں سرگرداں ہیں۔ مفسرین کے نزدیک مغضوب علیہم کی سب سے بڑی مثال یہود ہیں' جنہوں نے جو ٹھوکریں کھائیں وہ کسی اندھیرے کے باعث نہیں کھائیں' بلکہ اُس وقت کھائیں جب سورج نصف النہار پر چمک رہا تھا۔ ان کے پاس اللہ کا کلام موجود تھا' اللہ کی ہدایت موجود تھی' اللہ کی شریعت موجود تھی' لیکن اپنی شرارتِ نفس کے باعث انہوں نے اس میں تحریفات کیں۔ اس کے بجائے کہ اپنے آپ کو اللہ کی منشاء کے مطابق ڈھال لیتے' انہوں نے اللہ کے کلام اور اس کے قانون کو اپنی خواہشات کے رُخ پر ڈھال لیا۔ یعنی وہی رویّہ ہے جو علامہ اقبال کے بقول ہمارے علمائے سُوء نے اختیار کیا کہ: ؎

خود بدلتے نہیں' قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق!

اگرچہ نبی اکرم ﷺ کے خاتم النبیین' اُمت مسلمہ کے آخر الاُمم اور قرآن کے ع ''نوعِ انساں را پیامِ آخریں!'' کے مصداق آخری کتاب ہونے کی برکت سے قرآن کا متن محفوظ و مصئون رہا اور تحریف جو بھی ہوئی صرف ترجمہ اور تفسیر میں ہوئی' جبکہ سابقہ اُمتیں' بالخصوص یہود اس معاملے میں بہت دُور نکل گئے تھے اور ان کے علماء نے تو اللہ کی کتاب میں لفظی تحریف تک بھی کر دی تھی۔ لہٰذا یہ ''مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ'' کے زمرے میں شامل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے متعلق قرآن کہتا ہے: ﴿ضُرِبَتْ

عَلَيۡهِمُ الذِّلَّةُ وَالۡمَسۡكَنَةُ وَبَاءُوۡ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ﴾ (البقرۃ:٦١) ''ان پر ذلت اور مسکنت تھوپ دی گئی اور وہ اللہ کا غضب لے کر لوٹے''۔ اس لیے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے حامل ہونے کے باوجود اپنی شرارتِ نفس کے باعث اس ہدایت سے روگردانی کی اور اپنی خواہشاتِ نفس کا اتباع کیا اور نبی اکرم ﷺ کی دعوت کی مخالفت میں پیش پیش رہے۔

سابقہ اُمم میں سے ''ضالّین'' کی نمایاں مثال نصاریٰ یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متبعین ہیں۔ اس لیے کہ محبت اور عقیدت کے غلو میں انہوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کا مقام اتنا بڑھایا کہ معاذ اللہ انہیں اللہ کا بیٹا قرار دے دیا۔ ساتھ ہی عملی طور پر انہوں نے رہبانیت کی بدعت اختیار کی جس کے متعلق سورۃ الحدید میں ارشاد ہوا: ﴿وَرَهۡبَانِيَّةَ ۨ ابۡتَدَعُوۡهَا مَا كَتَبۡنٰهَا عَلَيۡهِمۡ﴾ (آیت ٢٧) ''اور رہبانیت کی بدعت خود انہوں نے اختیار کی، ہم نے اسے ان پر لازم نہیں کیا تھا''۔ یہ درحقیقت ایک خلافِ فطرت نظام تھا جو انہوں نے خود اپنی مرضی سے اپنی نیکی کے جذبے میں حدِّ اعتدال سے تجاوز کرتے ہوئے، اپنے اوپر غیر فطری پابندیاں عائد کرتے ہوئے اختیار کر لیا تھا۔ ان میں کچھ لوگ تو ضرور ایسے باہمت نکلے جو اِن پابندیوں کو نباہ گئے، لیکن ان کی اکثریت ان پابندیوں کو نباہ نہ سکی۔ نتیجتاً جو کچھ ہو سکتا تھا وہ ہوا اور راہب خانوں کے تہہ خانوں میں ناجائز اولاد کے قبرستان آباد ہو گئے۔ یہ سارا معاملہ اس لیے ہوا کہ انہوں نے فطرت کے خلاف کام کیا۔ چنانچہ مفسرین کی اکثریت کے نزدیک سورۃ الفاتحہ میں ''مغضوب علیہم'' سے مراد یہود اور ''ضالّین'' سے مراد نصاریٰ ہیں۔ ویسے اس مفہوم کو عام رکھا جائے تب بھی کوئی حرج نہیں ہے، اگرچہ ان کی یہ دو نمایاں مثالیں صد فیصد درست ہیں۔

بہرحال یہ ہے سورۃ الفاتحہ کا وہ تیسرا حصہ جس کا تذکرہ اس حدیثِ قدسی میں بایں الفاظ ہو چکا ہے: هٰذَا لِعَبۡدِيۡ وَلِعَبۡدِيۡ مَا سَأَلَ ''یہ میرے بندے کے لیے ہے اور میں نے دیا اپنے بندے کو جو اُس نے طلب کیا''۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ حدیث قدسی اس سورۂ مبارکہ کے تجزیے میں بھی بہت مفید ہے اور اس کی عظمت کو بھی بتمام وکمال اور بحسن وخوبی ظاہر کر رہی ہے۔ یہ فطرتِ انسانی کی وہ ترجمانی ہے کہ اگر واقعتاً یہ الفاظ کسی شخص کی زبان سے گہرے شعور واحساس اور قلب وذہن کی گہرائیوں سے نکل رہے ہوں تو ان کی تاثیر وہی ہے جو اِس حدیث قدسی میں وارد ہوئی ہے کہ اِدھر بندہ ایک ایک جملہ کہتا ہے اُدھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا جواب ملتا چلا جاتا ہے۔ بقول علامہ اقبال : ؎

افلاک سے آتا ہے نالوں کا جواب آخر
کرتے ہیں خطاب آخر' اٹھتے ہیں حجاب آخر

سورۃ الفاتحہ کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ سورۂ مبارکہ قرآن حکیم کا ایک نہایت خوبصورت اور انتہائی موزوں مقدمہ اور دیباچہ ہے۔ فطرتِ انسانی کی وہ پیاس اور صراطِ مستقیم کی وہ احتیاج جس کی ترجمانی سورۃ الفاتحہ میں کی گئی ہے' اسی کی جانب رہنمائی کے لیے قرآن مجید نازل ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس سورۂ مبارکہ کے فوراً بعد وارد ہوتے ہیں یہ الفاظِ مبارکہ: ﴿الٓمّٓ ۝ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝﴾ یعنی یہ ہے وہ کتاب جو ہر شک وشبہ سے بالاتر ہے۔ یہ کسی فلسفی کے من گھڑت خیالات ونظریات اور ذہن انسانی کی تگ وتاز پر مبنی نہیں ہے۔ یہ ''الحق'' یعنی سراسر حق پر مبنی ہے۔ یہ کتاب ان لوگوں کی ہدایت ورہنمائی کے لیے نازل ہوئی ہے جن میں سیدھے راستے کی طلب اور پیاس موجود ہے۔ گویا یہ ہے اس سورۂ مبارکہ کا پورے قرآن مجید کے ساتھ تعلق۔ مزید برآں مباحثِ ایمان کے ذیل میں اس سورۂ مبارکہ کے مطالعہ سے یہ بات متعین ہو جاتی ہے کہ انسان اپنی عقل اور فطرت کی رہنمائی میں کہاں تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔ یہی ہے وہ بات جسے علامہ اقبال نے یوں بیان فرمایا: ؎

عقل گو آستاں سے دُور نہیں
اس کی قسمت میں پر حضور نہیں

عقل یقیناً آستان سے دُور نہیں ہے' اس کی رہنمائی میں انسان بہت کچھ حاصل کر سکتا ہے' لیکن جہاں وہ محتاج ہے وہ درحقیقت وہ ہدایت ورہنمائی ہے جو اسے اپنی زندگی کے گوناگوں اور مختلف پہلوؤں میں ہر ہر لحظہ اور ہر ہر قدم پر عمل کے لیے درکار ہے۔ اس کے لیے وہ ہدایتِ آسمانی کا بالکلیہ محتاج ہے۔ اسی لیے اس کی فطرت پکارتی ہے اور استدعا کرتی ہے: اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ. اس فطرت کی پکار کا جواب ہے پورا قرآن مجید۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی صراطِ مستقیم کی ہدایت بخشے اور اس پر استقامت عطا فرمائے۔ آمین!

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

❁❁❁

درس 6

ایمان کی تشکیل (Synthesis)
عقل اور فطرت کا تقاضہ

سُوۡرَۃ آلِ عِمۡرَان کی آیات ۱۹۰ تا ۱۹۵ کی روشنی میں

درس ٦

ایمان کی تشکیل (Synthesis)
عقل اور فطرت کا تقاضہ

سورۂ آلِ عمران کی آیات ۱۹۰ تا ۱۹۵ کی روشنی میں!

نحمدہٗ ونصلی علٰی رسولہِ الکریم

امّا بعد فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّھَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۰﴾
الَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِھِمْ وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ ھٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۹۱﴾ رَبَّنَآ اِنَّکَ مَنْ
تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَیْتَہٗ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۱۹۲﴾ رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِیًا یُّنَادِیْ
لِلْاِیْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّکُمْ فَاٰمَنَّا ۖ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَکَفِّرْ عَنَّا سَیِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ
الْاَبْرَارِ ﴿۱۹۳﴾ رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰی رُسُلِکَ وَلَا تُخْزِنَا یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ ؕ اِنَّکَ لَا تُخْلِفُ
الْمِیْعَادَ ﴿۱۹۴﴾ فَاسْتَجَابَ لَھُمْ رَبُّھُمْ اَنِّیْ لَآ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ اَوْ اُنْثٰی ۚ
بَعْضُکُمْ مِّنْ بَعْضٍ ۚ فَالَّذِیْنَ ھَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ وَاُوْذُوْا فِیْ سَبِیْلِیْ
وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُکَفِّرَنَّ عَنْھُمْ سَیِّاٰتِھِمْ وَلَاُدْخِلَنَّھُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ ۚ
ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰہِ ؕ وَاللّٰہُ عِنْدَہٗ حُسْنُ الثَّوَابِ ﴿۱۹۵﴾﴾ (آل عمران)...... صدق اللہ العظیم

اِن صفحات میں قرآن مجید کے جس منتخب نصاب کی مختصر اور عام فہم توضیح وتشریح کا سلسلہ چل رہا ہے اس کے ضمن میں بفضلہٖ تعالیٰ پانچ اسباق یعنی سورۃ العصر، آیۂ برّ، سورۂ لقمان کا دوسرا رکوع، سورۂ حٰمٓ السجدۃ کی آیات ۳۰ تا ۳۶ اور سورۃ الفاتحہ کی اجمال کے ساتھ تشریح ہو چکی ہے۔ اس سلسلے کا چھٹا سبق سورۂ آلِ عمران کے آخری رکوع کی ابتدائی چھ آیات (۱۹۰ تا ۱۹۵) پر مشتمل ہے۔ آیئے پہلے ہم ان آیاتِ مبارکہ کے ایک سلیس و رواں ترجمے پر نظر ڈال لیں تاکہ ان میں جو مضامین و مباحث آ رہے

ہیں ان کا ایک اجمالی نقشہ سامنے آ جائے۔ ان آیات کا ترجمہ ہے:

''یقیناً آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور رات اور دن کے الٹ پھیر میں ہوش مند (اور باشعور) لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں۔ وہ لوگ جو یاد رکھتے ہیں اللہ کو کھڑے اور بیٹھے اور اپنے پہلوؤں پر لیٹے ہوئے اور غور وفکر کرتے ہیں آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں۔ (وہ پکار اٹھتے ہیں کہ) اے ہمارے ربّ! تو نے یہ سب کچھ بے کار اور بے مقصد پیدا نہیں کیا ہے' تو اس سے پاک ہے' پس ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔ اے ربّ ہمارے! جسے تو نے آگ میں داخل کر دیا اسے تو تُو نے رسوا کر دیا' اور ایسے ظالموں کے لیے کوئی مددگار نہیں ہوگا۔ اے ربّ ہمارے! ہم نے ایک پکارنے والے کی پکار کو سنا کہ وہ ایمان کی دعوت دے رہا ہے کہ ایمان لاؤ اپنے ربّ پر' پس ہم ایمان لے آئے۔ سو اے ہمارے ربّ! ہمارے گناہوں کو بخش دے اور ہماری برائیوں کو ہم سے دُور فرما دے اور ہمیں نیکوکار بندوں کے ساتھ وفات دیجیو۔ اور اے ربّ ہمارے! ہمیں عطا فرما جس کا تو نے ہم سے وعدہ فرمایا ہے اپنے رسولوں کی وساطت سے' اور قیامت کے دن ہمیں رسوا نہ کیجیو۔ یقیناً تو اپنے وعدے کے خلاف کرنے والا نہیں ہے۔ پس ان کی دعا قبول فرمائی ان کے ربّ نے کہ میں تو کسی بھی عمل کرنے والے کے عمل کو ضائع کرنے والا نہیں ہوں' خواہ وہ مرد ہو خواہ عورت۔ تم سب ایک دوسرے ہی سے ہو۔ تو وہ لوگ جنہوں نے ہجرت کی اور جو اپنے گھروں سے نکال دیے گئے اور جنہیں میری راہ میں ایذائیں پہنچائی گئیں اور جنہوں نے جنگ کی اور جنہوں نے اپنی گردنیں کٹوا دیں' میں ان کی برائیوں کو لازماً ان سے دُور کر دوں گا اور اُن کو لازماً داخل کروں گا اُن باغات میں جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہوں گی۔ یہ بدلہ ہوگا اللہ کے خاص خزانۂ فضل سے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اچھا بدلہ تو اللہ ہی کے پاس ہے''۔

چند تمہیدی باتیں

اس سے پہلے کہ ہم ان آیاتِ مبارکہ میں وارد مضامین پر سلسلہ وار غور کریں' مناسب ہوگا کہ اب تک کے معمول کے مطابق چند تمہیدی باتیں سمجھ لیں۔

زیرِ نظر آیات کی عظمت وفضیلت

سب سے پہلی بات جو قرآن مجید سے ذہنی مناسبت پیدا کرنے میں مُمدّ ہے وہ یہ ہے کہ قرآن حکیم کی طویل سورتوں میں سے اکثر و بیشتر کے آغاز اور اختتام پر جو آیات وارد ہوتی ہیں وہ بالعموم

نہایت جامع ہوتی ہیں۔ یہ بات عام دُنیوی ادب کے اصول کے مطابق بھی ہے۔ جیسے کسی قصیدے یا غزل کے مطلع اور مقطع کو بہت اہمیت حاصل ہوتی ہے اور کسی قادر الکلام خطیب کے خطبہ کے افتتاحی اور اختتامی کلمات بڑی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں' اسی طرح قرآن مجید کی اکثر طویل سورتوں کے آغاز اور اختتام پر وارد ہونے والی آیات بھی بہت جامع ہوتی ہیں۔ انہیں اصطلاحاً فواتح وخواتیمِ سُوَر کہا جاتا ہے۔ چنانچہ سورۃ البقرۃ کی ابتدائی اور آخری آیات کی بڑی فضیلت وارد ہوئی ہے۔ یہی وصف بتمام وکمال سورۂ آل عمران کی زیرنظر آیاتِ مبارکہ میں موجود ہے۔

ان آیات کی عظمت وفضیلت کے بارے میں جو روایات وارد ہوئی ہیں ان میں سے دو کے ذکر پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ اِن دونوں روایات کو امام رازیؒ اپنی تفسیرِ کبیر میں لائے ہیں۔ پہلی روایت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے' جسے ان آیات کا شانِ نزول بھی کہا جا سکتا ہے۔ ان سے ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے یہ فرمائش کی کہ اے اُمّ المؤمنینؓ! مجھے آپ وہ واقعہ سنایئے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال و واقعات میں آپ کو سب سے پیارا لگا ہو۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے ایک گہرے احساس کے ساتھ یہ فرمایا کہ ''آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تو ساری ہی باتیں نہایت پیاری تھیں اور آپؐ کی تو ہر ادا دل آویز تھی' تاہم تم نے فرمائش کی ہے تو مَیں تمہیں ایک واقعہ سناتی ہوں۔ ایک شب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس تشریف لائے' لیکن اچانک آپؐ نے مجھ سے فرمایا: ''اے عائشہ! مجھے اجازت دو' میں اِس وقت اپنے اللہ کی عبادت کرنا چاہتا ہوں''۔ میں نے عرض کیا: حضورؐ! مجھے آپؐ کا قرب نہایت عزیز ہے' لیکن جو چیز آپؐ کو پسند ہو وہ اس سے بھی زیادہ محبوب ہے' لہٰذا آپؐ کو اجازت ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھنے کھڑے ہوئے اور آپؐ پر رقت طاری ہوئی اور آپؐ روتے رہے' یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی داڑھی مبارک آنسوؤں سے تر ہوگئی۔ پھر آپؐ نے بہت طویل سجدہ کیا' اس میں بھی گریہ طاری رہا جس کی بنا پر سجدہ گاہ تر ہوگئی۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کچھ دیر لیٹے رہے' لیکن وہ کیفیت آپؐ پر برقرار رہی' یہاں تک کہ صبح صادق ہوگئی اور آپؐ پر رقت اور گریہ کی وہی کیفیت طاری رہی۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ جب فجر کی نماز کی اطلاع دینے کے لیے حاضر ہوئے اور انہوں نے بھی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس کیفیت کو دیکھا تو انہوں نے عرض کیا: حضورؐ! آپؐ پر یہ رقت اور یہ گریہ کیسا؟ حالانکہ اگر بالفرض آپؐ سے کوئی خطا اور لغزش ہوئی بھی ہو تو اللہ تعالیٰ آپؐ کی تمام خطاؤں کو بخش دینے کا اعلان فرما چکا ہے۔ تو جواب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے بلال! میں کیوں نہ روؤں کہ آج کی شب میں میرے ربّ نے مجھ پر یہ آیات نازل فرمائی

ہیں''۔ پھر آپ ﷺ نے ان آیات کی تلاوت فرمائی: ﴿اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الۡاَلۡبَابِ ﴿۱۹۰﴾...... الخ﴾

دوسری روایت کے راوی حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔ وہ فرماتے ہیں: ''نبی اکرم ﷺ کے معمول میں یہ شامل تھا کہ جب آپؐ رات کے وقت تہجد کے لیے بیدار ہوتے تو آنکھ کھلتے ہی بے اختیار آپ ﷺ کی زبانِ مبارک پر یہ آیات جاری ہو جاتی تھیں''۔ اب آپ چشمِ تصور سے دیکھئے کہ اللہ کا محبوب بندہ پچھلی رات کو اٹھا۔ اوپر آسمان ہے' ستارے ہیں اور ماحول پر تاریکی اور سکون کی کیفیت طاری ہے۔ اِس وقت جو واردات قلب پر طاری ہو رہی ہے اس کی بہترین ترجمانی مندرجہ بالا آیاتِ مبارکہ سے ہو رہی ہے۔ معلوم ہوا کہ آنحضور ﷺ کو اِن آیاتِ مبارکہ سے خصوصی شغف تھا۔

آیاتِ مبارکہ کا موضوع: ''ترکیبِ ایمان''

دوسری قابلِ غور بات اِن آیات کا موضوع ہے۔ ان آیات کے لیے موزوں عنوان ''ترکیبِ ایمان'' ہے۔ یعنی یہ کہ ایمان کیسے وجود میں آتا ہے اور ایمانیاتِ ثلاثہ یعنی ایمان باللہ' ایمان بالآخرۃ اور ایمان بالرسالت میں باہمی ربط اور ترتیب کیا ہے' اور خاص طور پر یہ کہ ایمان کے ضمن میں قرآن کا اپنا مخصوص طرزِ استدلال کیا ہے! وہ کس انداز اور اسلوب سے ایمان باللہ کی دعوت دیتا ہے اور کن دلائل سے معاد یعنی آخرت کا اثبات کرتا ہے۔ پھر یہ کہ اس ایمان کے نتیجے میں انسانی شخصیت میں کیا کیفیات پیدا ہونی چاہئیں۔ یہ نہایت اہم موضوع ہے' اس لیے کہ کون نہیں جانتا کہ ہمارے دین کی جڑ اور بنیاد ایمان ہی ہے۔ لہٰذا آگے بڑھنے سے قبل مناسب ہے کہ ایمان کے بارے میں چند بنیادی امور ذہن نشین کر لیے جائیں۔

ایمان کے بارے میں چند بنیادی امور

ایمان چند ماورائی حقائق اور چند امورِ غیبی کو مان لینے کا نام ہے۔ لیکن اس ایمان کے دو درجے ہیں' ایک درجہ قانونی اور فقہی ایمان کا ہے جس کی بنیاد پر ہم اس دنیا میں ایک دوسرے کو مسلمان سمجھتے ہیں۔ اس کا سارا دارومدار ''اِقْرَارٌ بِاللِّسَان'' پر ہے۔ یعنی زبان سے اقرار کرنا کہ میں مانتا ہوں اللہ کو' اُس کی صفاتِ کمال کو' اُس کی توحید کو — میں مانتا ہوں آخرت کو' قیامت کو' بعث بعد الموت کو' حشر و نشر کو' حساب کتاب کو' جزا و سزا کو' جنت و دوزخ کو — اور میں مانتا ہوں نبوت و رسالت کو' ملائکہ کو' وحی کو'

کتابوں کو' نبیوں اور رسولوں کو اور حضرت محمد ﷺ کے خاتم النبیین والمرسلین ہونے کو۔ ان امور کا زبانی اقرار دُنیا میں ہمارے مسلمان ہونے کی بنیاد ہے۔ ایمان کا دوسرا رُخ' یا دوسرا پہلو یا دوسرا درجہ ہے حقیقی ایمان کا — اور وہ عبارت ہے قلبی یقین سے۔ یعنی ان تمام امور پر دل میں پختہ یقین پیدا ہو جائے۔ اس کا اصطلاحی نام ہے ''تصدیقٌ بالقلب''۔ اور واقعہ یہ ہے کہ آخرت میں کامیابی و کامرانی اور فلاح و نجات کا دار و مدار اس حقیقی و قلبی ایمان پر ہے۔

جہاں تک پہلے ایمان یعنی اقرارٌ باللّسان کا تعلق ہے' اس کے بارے میں گفتگو کی ہمیں خاص حاجت نہیں ہے۔ وہ تو ہمیں موروثی طور پر مل ہی گیا ہے۔ ہم مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہوئے تو وراثت میں یہ عقائد ہمیں منتقل ہو گئے۔ لیکن اصل چیز وہ یقینِ قلبی ہے جس پر آخرت میں نجات کا انحصار ہے۔ ہمیں اس کی فکر کرنی چاہیے۔ چنانچہ وہ یقینِ قلبی اور ایمانِ حقیقی ان آیات کا موضوع ہے۔

اس ضمن میں یہ نکتہ نوٹ کر لینا چاہیے کہ اگر ایک انسان جس نے مسلمان معاشرے میں آنکھ کھولی اور وہ دین کے اوامر و نواہی پر کاربند ہے تو چاہے ذہن' فکر اور شعور کی سطح پر اسے ان ماورائی حقائق اور امورِ غیبی کا حقیقی ادراک حاصل نہ ہو تب بھی اسلامی شعائر و احکام پر مسلسل عمل کرنے سے اس کو ایک نوع کے قلبی یقین کی کیفیت حاصل ہو جاتی ہے۔ اس لیے کہ جس طرح انسان کا باطن اس کے ظاہر پر اثر انداز ہوتا ہے اسی طرح اس کا ظاہری طرزِ عمل اور اس کا ظاہری رویہ بھی اس کے باطن پر عکس ڈالتا ہے۔ چاہے آپ اسے ایک غیر شعوری یقین کہہ لیں لیکن وہ ہوتی یقین ہی کی کیفیت ہے۔ تاہم ہمیں اِس وقت اس سے بحث نہیں ہے۔ ان آیات میں جو گفتگو ہو رہی ہے وہ اکتسابی اور شعوری ایمان کی ہے جس کو ایک ذہین و فطین اور صاحبِ شعور و ادراک انسان اپنے ذاتی غور و فکر کے نتیجے میں حاصل کرتا ہے۔ ایسے لوگوں کو اِن آیاتِ مبارکہ کی پہلی آیت میں ''اُولوا الالباب'' قرار دیا گیا ہے' یعنی ہوش مند لوگ' عقل سے کام لینے والے لوگ' صاحبِ خرد لوگ۔ ان لوگوں کے متعلق فرمایا گیا ہے:

﴿اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الۡاَلۡبَابِ ﴿۱۹۰﴾﴾

''یقیناً آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور رات اور دن کے الٹ پھیر میں نشانیاں ہیں ہوش مند (اور باشعور) لوگوں کے لیے''۔

اُولوا الالباب کے ذہنی و شعوری سفر کے ارتقائی مراحل

قارئین کرام ان آیاتِ مبارکہ کے ترجمے پر ایک نگاہ ڈال لیں تو یہ نکات ان کے سامنے آئیں گے کہ اس رکوع کی پہلی پانچ آیات میں ''اولوالالباب'' کے بارے میں اوّلین بات یہ سامنے آتی ہے کہ یہ لوگ کتابِ فطرت کے مطالعے اور مظاہرِ فطرت کے مشاہدے سے اللہ کی معرفت حاصل کرتے ہیں۔ ان کے ذہنی اور شعوری سفر کا دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ اللہ کو پہچان لینے کے بعد اُس کی ذاتِ اقدس سے ایک مضبوط ذہنی رشتہ وتعلق استوار کر کے مزید غور وفکر کرتے ہیں اور بقول علامہ اقبال خرد کی مزید گتھیاں سلجھاتے ہیں تو ان کی رسائی ایمان بالمعاد یعنی ایمان بالآخرۃ تک ہو جاتی ہے۔ گویا معرفتِ الٰہی اور مکافات ومجازاتِ عمل اور اس کے لیے ایک دوسری زندگی کے منطقی لزوم تک رسائی ان کے اپنے مطالعہ ومشاہدہ اور تعقل وتفکر کا حاصل ہوتی ہے۔ اس ارتقائی عمل کا تیسرا مرحلہ یہ ہے کہ جب کسی نبی کی دعوت ایسے لوگوں کے کانوں میں پڑتی ہے جو ان ہی امور پر مشتمل ہوتی ہے تو وہ والہانہ انداز میں اس پر لبیک کہتے ہیں۔

اس سبق کی آخری آیت (۱۹۵) میں ایسے لوگوں کے سیرت وکردار کی ایک جھلک دکھا دی گئی ہے کہ یہ لوگ بودے اور بزدل نہیں ہوتے' بلکہ جہاں عقل وشعور کے اعتبار سے پختہ ہوتے ہیں وہاں ان کا کردار اور ان کی سیرت بھی بہت مضبوط ہوتی ہے۔ چنانچہ جس بات کو عقل وفطرت اور ذہن و قلب سے حق سمجھ کر قبول کرتے ہیں اس کے لیے مال ومنال' اہل وعیال' اعزہ واحباب سب کچھ چھوڑنے حتیٰ کہ جانوں کا نذرانہ پیش کرنے کے لیے ہر دم تیار رہتے ہیں اور وقت آنے پر بالفعل جان ومال کی بازیاں کھیل کر دکھاتے ہیں!

اس درس کے ضمن میں تیسری اور آخری تمہیدی بات اس کا ہمارے سابقہ دروس سے ربط وتعلق ہے۔ اس سلسلۂ دروس کے نقطۂ آغاز یعنی سورۃ العصر میں انسان کی نجات اور فوز وفلاح کی چار ناگزیر شرائط سامنے آئی تھیں:- ایمان' عملِ صالح' تواصی بالحق اور تواصی بالصبر۔ یہی مضمون اپنی پوری جامعیت کے ساتھ مگر قدرے مختلف سیاق وسباق میں وارد ہوا تھا آیۂ بر میں بھی اور سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع میں بھی۔ اس تناظر میں یہاں ہم دیکھ رہے ہیں کہ ان چار لوازمِ نجات میں سے ایمان اور صبر یعنی پہلی اور آخری شرائط کے بارے میں گفتگو ہو رہی ہے۔ گویا درمیانی دو شرائط یہاں مقدر ہیں۔ پھر سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع میں حضرت لقمان کی شخصیت سامنے آ چکی ہے جو نہ نبی تھے اور نہ ہی کسی رسول کے اُمتی تھے' لیکن فطرتِ سلیمہ اور عقلِ صحیح کی رہنمائی میں وہ ایمان باللہ' التزامِ توحید اور

اجتناب عن الشرک کے علاوہ قانونِ مجازات و مکافاتِ عمل تک بھی پہنچ گئے تھے۔ یہی مضمون سورۃ الفاتحہ میں سامنے آ چکا ہے کہ ایک سلیم الفطرت اور صحیح العقل انسان اللہ تعالیٰ کی معرفت بھی حاصل کر لیتا ہے اور اسے جزا و سزا کا شعور بھی حاصل ہو جاتا ہے‘ لیکن پھر وہ زندگی کے پیچیدہ مسائل و معاملات میں تفصیلی رہنمائی کا محتاج ہوتا ہے‘ جس کے لیے وہ اپنے ربّ کے سامنے دستِ سوال دراز کرتا ہے کہ اے ہمارے ربّ! اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ’’ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت عطا فرما!‘‘ یہاں سے رسالت کی ضرورت کی دلیل قائم ہوتی ہے۔

سورۂ آل عمران کے آخری رکوع کی پہلی پانچ آیات اس اعتبار سے قرآن حکیم کے اہم ترین مقام کی حیثیت رکھتی ہیں کہ ان میں عقل و فطرت کی رہنمائی میں توحید اور معاد تک رسائی کے تدریجی عمل کے ان منطقی اور ارتقائی مراحل کا بیان نہایت اجمال کے ساتھ آ گیا ہے جو قرآن حکیم کی مکی سورتوں میں شرح و بسط کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔

زیر مطالعہ آیات کے بارے میں بعض تمہیدی باتوں کے بیان کے بعد اب ہمیں ان آیاتِ مبارکہ پر ذرا گہرائی میں غور و فکر کرنا ہے۔ اوّلاً ہم اپنی توجہات کو صرف تین آیات پر مرکوز رکھیں گے۔ اس کے لیے مناسب ہے کہ پہلے ان آیات کا ترجمہ ذہن نشین کر لیا جائے جو حسبِ ذیل ہے:

> ’’یقیناً آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور رات اور دن کے الٹ پھیر میں ہوش مند (اور باشعور) لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں۔ وہ لوگ جو بیٹھے اور کھڑے اور اپنے پہلوؤں پر (لیٹے ہوئے) ہر حال میں اللہ کو یاد رکھتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی تخلیق پر غور و فکر کرتے ہیں (وہ بے ساختہ پکار اٹھتے ہیں کہ) اے ربّ ہمارے! تو نے یہ سب کچھ بے کار اور بے مقصد پیدا نہیں کیا۔ تو اس سے پاک ہے (کہ کوئی کام بے کار اور بے مقصد کرے!) پس ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔ اے ربّ ہمارے! بے شک جسے تو نے آگ میں داخل کیا اسے تو تُو نے پوری طرح رسوا کر دیا‘ اور ایسے ظالموں کا یقیناً کوئی مددگار نہیں‘‘۔

’’اُولوا الالباب‘‘ کون ہیں؟

جیسا کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے کہ ان آیاتِ مبارکہ میں ایمان کی ’’ترکیب‘‘ کا بیان ہو رہا ہے‘ لیکن عوام کے تقلیدی ایمان کا نہیں‘ بلکہ ہوش مند اور صاحبِ عقل و شعور لوگوں کے اکتسابی اور شعوری ایمان کا۔ یہی وجہ ہے کہ پہلی آیت میں ’’اولی الالباب‘‘ کی اصطلاح وارد ہوئی ہے‘ یعنی

''الباب والے''۔ ''الباب'' جمع ہے ''لُبّ'' کی۔ لُب کسی چیز کے اصل جوہر کو کہتے ہیں۔ چنانچہ ہم عام بول چال والی اردو میں بھی کہتے ہیں کہ ''پوری بحث کا لُبِّ لباب یہ ہے''۔ گویا کسی شے کا اصل جوہر اس کا ''لُبّ'' کہلاتا ہے۔ اب غور کا مقام ہے کہ انسانیت کا اصل جوہر کیا ہے؟ آپ کو معلوم ہوگا کہ اہلِ منطق اور اہلِ فلسفہ نے انسان کو ''حیوانِ عاقل'' قرار دیا ہے۔ لہٰذا انسان کا خلاصہ اور اس کا اصل جوہر یا بالفاظِ دیگر اس کا لُبِّ لباب اس کی عقل ہے۔ پس اس آیتِ مبارکہ میں ''اولی الالباب'' سے وہ ہوش منداور باشعور لوگ مراد ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں اور خواہشات وشہوات کی بجائے عقل کی پیروی کرتے ہیں۔

فہمِ قرآن کا ایک اہم اور سنہری اصول یہ ہے کہ قرآن مجید کا ایک حصہ دوسرے حصے کی تفسیر کرتا ہے۔ چنانچہ اس اصول کو سامنے رکھ کر جب ہم نگاہ دوڑاتے ہیں تو عجب حسنِ اتفاق سامنے آتا ہے کہ زیرِ مطالعہ آیتِ مبارکہ سورۂ آلِ عمران کے بیسویں رکوع کی پہلی آیت ہے اور سورۃ البقرۃ کے بیسویں رکوع کی پہلی آیت میں بھی یہی مضمون بڑی تفصیل سے آیا ہے۔ سورۃ البقرۃ کی اس آیت کو اگر ''آیۃ الآیات'' سے موسوم کیا جائے تو نہایت مناسب ہوگا۔ اس لیے کہ اس ایک آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی متعدد نشانیاں جمع فرمادی ہیں اور مظاہرِ فطرت کی ایک طویل فہرست بیان فرمادی ہے:

﴿اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّهَارِ وَالۡفُلۡكِ الَّتِیۡ تَجۡرِیۡ فِی الۡبَحۡرِ بِمَا یَنۡفَعُ النَّاسَ وَمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنۡ مَّآءٍ فَاَحۡیَا بِهِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا وَبَثَّ فِیۡهَا مِنۡ كُلِّ دَآبَّةٍ ۪ وَّتَصۡرِیۡفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الۡمُسَخَّرِ بَیۡنَ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ ﴿۱۶۴﴾﴾ (البقرۃ)

''یقیناً آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور رات اور دن کے اُلٹ پھیر میں اور اُس کشتی میں جو سامان کو دریا میں لے کر چلتی ہے جس سے لوگوں کو نفع پہنچتا ہے اور وہ پانی کہ جو اللہ نے بلندی سے برسایا اور اس کے ذریعے سے زمین کو مُردہ ہو جانے کے بعد از سرِ نو زندہ کیا اور اس میں ہر قسم کی جاندار چیزوں کو پھیلا دیا' اور ہواؤں کے چلنے میں اور اُس بادل میں جو آسمان اور زمین کے مابین معلّق ہے' نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں''۔

دیکھئے یہاں آخر میں الفاظ آئے ''لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ'' جبکہ سورۂ آلِ عمران میں الفاظ آئے: ''لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الۡاَلۡبَابِ''. معلوم ہوا کہ اولوالالباب وہ لوگ ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں' جن کی عقل پر جذبات وشہوات اور تعصّبات کے پردے نہیں پڑے ہوتے' جو تفکر و تدبّر کرتے ہیں اور جن کا

شعور بیدار رہتا ہے۔

یہ بات بھی پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ ہر معاشرے میں اور ہر دَور میں انسانوں کی عظیم اکثریت تو ایسے لوگوں پر مشتمل ہوتی ہے جنہیں اگر ''دو ٹانگوں پر چلنے والا حیوان'' قرار دیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اس لیے کہ وہ جس ماحول میں آنکھیں کھولتے ہیں وہاں جو کچھ ہوتا دیکھتے ہیں وہی خود بھی کرنے لگتے ہیں۔ ان کی اپنی آزاد فکر اور سوچ نہیں ہوتی۔ وہ غور ہی نہیں کرتے کہ ہم کون ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟ ہماری زندگی کا مآل کیا ہے؟ مبدأ کیا ہے؟ معاد کیا ہے؟ خیر کیا ہے اور شر کیا ہے؟ علم کے قابلِ اعتماد ذرائع کون سے ہیں؟ اور اِس زندگی کا مقصد کیا ہے؟ لیکن ہر دَور اور ہر معاشرے میں کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن کا مزاج تقلیدی نہیں ہوتا۔ جو خود سوچتے ہیں اور خود کسی نتیجے تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ فلسفہ اور مذہب کے مابین جو اصل اور بنیادی سوالات مشترک ہیں وہ اُن کے بارے میں تفکر و تدبر اور غور وخوض کرتے ہیں۔ گویا وہ زندگی کا راستہ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر طے کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ہیں وہ لوگ جو اولوالالباب ہیں' ہوش مند ہیں' باشعور ہیں۔ یہ کسی سوسائٹی کی ذہین وفطین اقلیت ہوتے ہیں۔ اس آیتِ مبارکہ میں فرمایا جارہا ہے: ''یقیناً آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور رات اور دن کے الٹ پھیر میں نشانیاں ہیں ہوش منداور باشعور لوگوں کے لیے''۔ یعنی اگر یہ لوگ کتابِ فطرت کا مطالعہ کریں تو انہیں کائنات میں ہر چہار طرف نشانیاں نظر آئیں گی۔ نشانیاں کس کی؟ اس کی صراحت نہیں کی گئی۔ مراد ہے اللہ کی نشانیاں۔ یعنی کتابِ فطرت کا مطالعہ اور مظاہرِ قدرت کا مشاہدہ ایمان باللہ کے ذرائع ہیں' کیونکہ ان میں سے ہر ہر چیز ذاتِ باری تعالیٰ اور اُس کی توحید کی نشانی ہے۔

''آیت'' کا مفہوم

اس مرحلے پر ''آیت'' کا مفہوم سمجھنا ضروری ہے۔ آیت کے لغوی معنی ہیں ''نشانی''۔ اب غور کیجیے کہ ہم ''نشانی'' کسے کہتے ہیں! کسی شے' یا کسی شخص یا کسی ہستی کی نشانی وہ ہے کہ جس کو دیکھتے ہی ذہن بے اختیار اور بلا ارادہ اُس شے یا شخص یا ہستی کی طرف منتقل ہو جائے۔ فرض کیجیے کہ آپ کے پاس آپ کے کسی دوست کی ایک نشانی تھی۔ بہت عرصہ سے آپ کی اپنے اُس دوست سے ملاقات نہیں ہوئی' نہ کسی نوع کا ربط وتعلق رہا۔ اب آپ کا وہ دوست آپ کی یادداشت کے انبار میں گم ہو گیا ہے یا اس کی یاد شعور کی سطح سے محو ہو چکی ہے۔ لیکن کسی روز آپ کو اپنے سوٹ کیس یا کسی دوسرے

سامان میں وہ رومال یا قلم یا کوئی دوسری چیز اچانک نظر آ جاتی ہے جو آپ کے دوست نے اپنی نشانی کے طور پر آپ کو دی تھی تو اس نشانی کو دیکھتے ہی دفعتہً آپ کو اپنا وہ دوست یاد آ جاتا ہے۔ یہ ہے نشانی کا حقیقی مفہوم اور اس کی اصل غایت۔ قرآن مجید کے نزدیک اس کائنات کا ذرّہ ذرّہ اللہ کی نشانی ہے۔ یہ نشانیاں آفاق میں بھی ہیں اور اَنفس میں بھی۔ گویا یہ نشانیاں کائنات میں بھی ہر چہار طرف پھیلی ہوئی ہیں اور خود ہمارے اندر بھی موجود ہیں۔ جیسے کہ قرآن حکیم میں ایک مقام پر فرمایا گیا: ﴿سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ﴾ (حٰمٓ السجدة:٥٣) ''ہم عنقریب انہیں دکھائیں گے اپنی نشانیاں آفاق میں بھی اور خود اُن کے اپنے وجود میں بھی''۔ گویا اس کائنات کی وسعت اور انسان کے اپنے وجود کے باطن میں اللہ کی اَن گنت اور بے شمار نشانیاں موجود ہیں جن کو دیکھ کر اور جن پر غور و فکر کے نتیجے میں ایک صاحبِ عقل و خرد کو اللہ یاد آ سکتا ہے اور اس کی معرفت اس کے اپنے قلب کی گہرائیوں سے اُبھر کر اس کے شعور پر جلوہ آرا ہو سکتی ہے۔

قرآن کا طرزِ استدلال

یاد رکھیے کہ قرآن مجید ایمان باللہ اور معرفتِ خداوندی کے لیے اہلِ منطق کا راستہ اختیار نہیں کرتا۔ وہ اللہ کی ہستی کے اثبات کے لیے منطقی دلائل نہیں دیتا' بلکہ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے' قرآن حکیم بدیہیاتِ فطرت پر اپنے استدلال کی بنیاد قائم کرتا ہے۔ اس کا موقف یہ ہے کہ جیسے کسی نشانی کو دیکھ کر بے اختیار اور بلا ارادہ کوئی یاد آ جاتا ہے' ایسے ہی اس کائنات کا ذرّہ ذرّہ اللہ کی نشانی ہے۔ اس کو دیکھ کر ایک سلیم الفطرت انسان کو اللہ یاد آ جاتا ہے اور مزید غور و فکر سے اس کی تفصیلی معرفت حاصل ہو سکتی ہے۔ لیکن اگر آپ اسے کسی درجہ میں منطق کا جامہ پہنانا چاہیں اور اس کی کوئی عقلی توجیہہ کرنا چاہیں تو اس کا تجزیہ یوں ہوگا کہ یہ وجود' یہ سلسلۂ کون و مکان عقلاً مستلزم ہے ایک خالق کا۔ کوئی تو پیدا کرنے والا اور بنانے والا ہونا چاہیے۔ آپ سے آپ تو کوئی چیز وجود میں نہیں آتی۔ کوئی ہستی ہے جس نے اس کائنات کو وجود بخشا ہے۔ گویا یہ کائنات کا وجود خود ہی خالق کے وجود کے لیے دلیل ہے۔ البتہ یہ قطعی و حتمی دلیل نہیں ہے' اس لیے کہ جیسے لوہا لوہے کو کاٹتا ہے اسی طرح منطق خود منطق کو کاٹتی ہے۔ خالص منطق اس کا تقاضا کرے گی کہ خالق کا وجود ثابت کرنے کے لیے پھر ایک خالق کا وجود ہونا چاہیے۔ اس طرح یہ سلسلہ لامتناہی ہوگا' کیونکہ ایک خالق کے وجود کو ثابت کرنے کے بعد بھی یہ سوال باقی رہے گا۔ لہٰذا ہمارے بہت سے متکلمین نے یہ بات تسلیم کی ہے کہ محض منطق سے وجودِ باری

تعالیٰ کو ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ یہی سبب ہے اس امرِ واقعہ کا کہ قرآن مجید وجودِ باری تعالیٰ کے اثبات کے لیے منطقی طرزِ استدلال اختیار نہیں کرتا' بلکہ اپنے استدلال کی بنیاد بدیہیاتِ فطرت پر رکھتا ہے۔ وجودِ باری تعالیٰ کا علم فطرتِ انسانی میں ودیعت شدہ ہے۔ ایک سلیم الفطرت اور صحیح العقل انسان فطرت کی بنیاد پر جس چیز کو جانتا اور مانتا ہے اس میں عقلی مسلّمات کے اضافے سے حکمتِ قرآنی کا عمل مکمل ہو جاتا ہے۔ الغرض جہاں تک وجودِ باری تعالیٰ کا تعلق ہے' اس کا اِدراک تو ایک سلیم الفطرت انسان کے قلب کی گہرائیوں سے ازخود ابھرتا ہے یا آفاقی واَنفسی آیات کی تحریک سے اجاگر ہو کر شعور کی سطح پر جلوہ آرا ہوتا ہے۔ تاہم آیاتِ الٰہی پر غور وفکر کے نتیجے میں ایک سلیم العقل انسان کو اس واجب الوجود ہستی کی بنیادی صفات کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔

چنانچہ اوّلاً جب وہ مظاہرِ فطرت میں کامل توافق اور حد درجہ ہم آہنگی دیکھتا ہے تو اسے یقین ہو جاتا ہے کہ یہ پورا نظام کسی ایک ہی خالق کی تخلیق ہے اور وہی اس کا واحد مدبّر و منتظم بھی ہے۔ اس لیے کہ اگر اس تخلیق وتدبیر کے عمل میں ایک سے زائد ذہن یا ارادے اور مشیّتیں یا اختیارات کارفرما ہوتے تو اس عظیم اور لامتناہی کائنات میں کبھی نظم وضبط برقرار نہ رہ سکتا۔

اولوالالباب کے غور وفکر کا حاصل: معرفتِ ربّ

اسی رُخ پر مزید غور وفکر سے ان ہوش منداور باشعور لوگوں کو اس خالقِ کائنات اور مدبّر و منتظم حقیقی کی تین اساسی صفاتِ کمال کا علم ہوتا ہے۔ یعنی ایک یہ کہ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ گویا وہ ''قادرِ مطلق'' ہے اور اس کی قدرت سے کوئی شے خارج یا بعید نہیں ہو سکتی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ وسیع وعریض کائنات ہرگز وجود میں نہ آ سکتی جس کی وسعتوں اور پہنائیوں کا تاحال کوئی اندازہ انسان نہیں کر پایا ہے۔ دوسری یہ کہ اس کائنات کو پیدا کرنے والا ''بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ'' یعنی ہر چیز کا جاننے والا بھی ہے اور اس کے علم میں کہیں کوئی کمی اور نقص نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہ ممکن نہیں ہے کہ جس نے کسی چیز کو پیدا کیا ہو وہ اُس سے بے خبر یا ناواقف ہو' جیسے کہ سورۃ الملک میں فرمایا: ﴿اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ؕ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ۝۱۴﴾ ''کیا وہی نہ جانے گا جس نے پیدا کیا؟ وہ تو نہایت باریک بین بھی ہے حد درجہ باخبر بھی!'' تیسری یہ کہ اس کائنات کا پیدا کرنے والا ایک حکیمِ کامل بھی ہے' اس لیے کہ اس نے جو کچھ تخلیق فرمایا ہے اس میں ہر چیز حکمت سے پُر ہے اور کوئی چیز بے مقصد اور بلا غایت نہیں ہے' حتیٰ کہ گھاس کا ایک تنکا بھی بے کار اور عبث نہیں ہے۔ پس معلوم ہوا کہ کائنات کے مشاہدے اور اس پر غور و

فکر کے نتیجے میں ایک ہوش منداور باشعور انسان کا ذہن وجودِ باری تعالیٰ اوراس کی صفاتِ کمال تک پہنچ جاتا ہے۔ چنانچہ یہی مفہوم ہے سورۂ آل عمران کے بیسویں رکوع کی پہلی اور مختصر آیت اور سورۃ البقرۃ کے بیسویں رکوع کی پہلی اور طویل آیت کا جس کا پہلے حوالہ دیا گیا ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ سورۂ آل عمران کے آخری رکوع کی پہلی آیت کے مطابق مظاہرِ فطرت پر تفکر و تدبّر کے نتیجے میں ایک ہوش منداور باشعور انسان کے ہاتھ میں اس کائنات کی گتھی سلجھانے کے لیے الجھی ہوئی ڈور کا جو سرا آتا ہے وہ ہے معرفتِ ربّ' یعنی اس حقیقت کا شعور وادراک کہ اس کائنات کا ایک خالق ہے جو اپنی ذات میں یکہ وتنہا اور بے مثل و بے نظیر بھی ہے اور کمالِ علم' کمالِ قدرت اور کمالِ حکمت سے متصف بھی۔ ابھی اس الجھی ہوئی ڈور کو مزید سلجھانا ہے تو لازم ہے کہ وہ ہوش مند اور باشعور انسان الجھی ہوئی ڈور کے اس سرے کو ہاتھ سے نہ چھوڑے' ورنہ ساری محنت ضائع ہو جائے گی۔ چنانچہ یہی ربط ہے کہ اگلی آیت میں ان دانش مند لوگوں کا یہ وصف بیان ہوا اوران کی کیفیت کا یہ نقشہ کھینچا گیا کہ:

﴿اَلَّذِیۡنَ یَذۡکُرُوۡنَ اللّٰہَ قِیٰمًا وَّقُعُوۡدًا وَّعَلٰی جُنُوۡبِهِمۡ وَیَتَفَکَّرُوۡنَ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ۚ﴾

''وہ لوگ جو اللہ کو یاد رکھتے ہیں کھڑے ہوئے بھی' بیٹھے ہوئے بھی اور اپنے پہلوؤں کے بل (لیٹے ہوئے) بھی' اور (مزید) غور و فکر کرتے ہیں آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں''۔

اِن الفاظِ مبارکہ کا مفہوم و مدعا یہ ہوا کہ جب ان اولوالالباب نے کتابِ فطرت کے مطالعے' مظاہرِ قدرت کے مشاہدے اور اپنے غور وفکر اور تعقّل و تفکر سے اللہ کو پہچان لیا تو پھر وہ ہر دم اور ہر لحظہ اللہ کو یاد رکھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کے ذہن و قلب میں ہر آن متحضر رہتا ہے (اس لیے کہ ذکر اللہ کے معنی ''استحضار اللہ فی القلب'' ہیں' یعنی دل میں اللہ کی یاد موجود رہے) اور اس سرے کو مضبوطی کے ساتھ ہاتھ میں تھام کر وہ کائنات کے ''معمے'' کو مزید حل کرنے اور اس الجھی ہوئی ڈور کو مزید سلجھانے کی کوشش کرتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں غور وفکر اور تعقّل و تفکر کا عمل جاری رکھتے ہیں!

''ذکر وفکر'' کا باہمی ربط و تعلق

آگے بڑھنے سے قبل توجہ کو ذرا اِدھر مبذول کر لیا جائے تو مناسب ہوگا کہ یہاں ''ذکر وفکر'' جس طرح یکجا صورت میں سامنے آئے ہیں اس کی بڑی اہمیت ہے' کیونکہ انسان کے غور وفکر کا عمل صحیح رُخ

پر اُسی وقت آگے بڑھے گا جب یہ دونوں چیزیں بیک وقت موجود ہوں' اس لیے کہ یہ دونوں ایک گاڑی کے دو پہیوں کی مانند ہیں۔ گاڑی ایک پہیے پر نہیں چلے گی' بلکہ اس کے دونوں پہیوں کو لامحالہ حرکت کرنا ہوگی۔ گویا ذکر بھی ہو اور فکر بھی ہو' یہ دونوں ضروری اور لازمی ہیں۔ بدقسمتی سے ہمارا موجودہ المیہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں دو حلقے جدا جدا ہو گئے ہیں۔ کچھ لوگ وہ ہیں جو ذکر کے تو لذت آشنا ہیں لیکن فکر کے میدان میں قدم نہیں رکھتے' جبکہ کچھ لوگ وہ ہیں جو غور و فکر کی وادی میں تو سرگرداں رہتے ہیں لیکن ذکر کی لذت سے محروم رہتے ہیں' گویا دونوں چیزیں علیحدہ علیحدہ ہو گئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مطلوبہ نتائج پیدا نہیں ہو رہے۔ مولانا رومؒ نے اِس حقیقت کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا ہے: ؎

ایں قدر گفتیم باقی فکر کُن!
فکر اگر جامد بود رو ذکر کُن!

''اتنا تو ہم نے تمہیں بتا دیا' آگے خود سوچو' غور و فکر کرو' اور اگر فکر میں کہیں رکاوٹ پیدا ہو جائے اور تم محسوس کرو کہ وہ جامد ہو رہا ہے تو جاؤ اور مزید ذکر کرو!''

آگے فرماتے ہیں: ؎

ذکر آرد فکر را در اہتزاز
ذکر را خورشید ایں افسردہ ساز

''اس ذکر سے فکر میں ایک حرکتِ تازہ پیدا ہوگی اور وہ صحیح رُخ اور صحیح سمت میں آگے بڑھے گا۔ ذکر تو آفتاب کے مانند ہے' وہ فکر کی افسردگی کو دُور کرے گا''۔

یہی بات علامہ اقبال نے بڑی خوبصورتی سے کہی ہے: ؎

جز بہ قرآں ضیغمی روباہی است
فقرِ قرآں اصل شاہنشاہی است
فقرِ قرآں؟ اختلاطِ ذکر و فکر!
فکر را کامل نہ دیدم جز بہ ذکر!

''قرآن کے بغیر شیر بھی گیدڑ بن جاتا ہے۔ اصل شاہنشاہی قرآن کے تعلیم کردہ فقر میں ہے۔ جانتے ہو فقرِ قرآنی کیا ہے؟ یہ ذکر و فکر دونوں کے مجموعے سے وجود میں آتا ہے اور حقیقت یہی ہے کہ ذکر کے بغیر فکر مکمل نہیں ہو سکتا''۔

آیت زیر مطالعہ میں ذکر کی اہمیت کو انسان کی ان تین حالتوں کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے جن سے وہ امکانی طور پر دوچار رہتا ہے ——یعنی کھڑے ہوئے‘ جس میں چلنا آپ سے آپ شامل ہے۔ بیٹھے ہوئے‘ جس میں مشغول ہونا بھی شامل ہے‘ اور پہلوؤں پر لیٹے ہوئے‘ جس میں نینداور بیداری دونوں صورتوں کی استراحت شامل ہے۔ گویا یہ اولوالالباب اللہ کی یاد کا ہر حال میں اہتمام و التزام کرتے ہوئے کائنات کے عقدے کو حل کرنے کے لیے غور وفکر جاری رکھتے ہیں۔ واضح رہے کہ یہاں ذکر سے مراد یہ ہے کہ زبان سے اللہ کی تحمید‘ تسبیح‘ تہلیل اور تمجید کے کلماتِ مسنونہ کی ادائیگی بھی جاری رہے اور دل میں اللہ کے حاضر و ناظر‘ سمیع و بصیر‘ علیم وخبیر اور حفیظ ورقیب (نگران) ہونے کا یقین بھی موجود رہے۔ اور اس کیفیت کے دوام کے ساتھ ہی وہ کائنات کی تخلیق میں غور وفکر بھی کرتے رہتے ہیں۔

عقل وفطرت کا ایک تقاضا: مکافاتِ عمل

ذکر وفکر کے اس اختلاط سے وہ اولوالالباب جس نتیجے تک پہنچتے ہیں‘ اس کو آگے بایں الفاظ بیان فرمایا:

﴿رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿١٩١﴾﴾

’’(وہ پکار اٹھتے ہیں کہ) اے ہمارے ربّ! تو نے یہ سب کچھ بے مقصد (بلا غایت اور بے کار) پیدا نہیں کیا۔ تو پاک ہے (منزّہ ہے‘ اعلیٰ ہے‘ ارفع ہے اس سے کہ کوئی کارِ عبث کرے) پس ہمیں آگ کے عذاب سے بچا!‘‘

یہاں قدرے تشریح وتوضیح کی ضرورت ہے۔ ان اولوالالباب کے سامنے ان کے ذکر وفکر کے نتیجے میں جو حقیقتِ کبریٰ پورے جزم ویقین کے ساتھ ابھر کر آتی ہے وہ یہ ہے کہ جب اس کائنات کی کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ چیز بھی بے مقصد پیدا نہیں کی گئی ہے تو کیسے ممکن ہے کہ یہ کُل کائنات بحیثیتِ مجموعی اور خاص طور پر اس کا نقطۂ عروج یعنی انسان بے مقصد پیدا کیا گیا ہو اور اس کے افعال واعمال کا کوئی نتیجہ نہ نکلے؟ چنانچہ یہیں سے اُن کا ذہن مجازات ومکافاتِ عمل اور جزا وسزا کے تصور کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ یہ بات اس سے قبل سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع میں حضرت لقمان کی اپنے بیٹے کو نصیحت کے ضمن میں آ چکی ہے:

﴿يٰبُنَيَّ اِنَّهَا اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِيْ صَخْرَةٍ اَوْ فِى السَّمٰوٰتِ اَوْ فِى

الْاَرْضِ يَاْتِ بِهَا اللّٰهُ ﴾ (آیت ۱۶)

''اے میرے بچے! (اس حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کر لے کہ انسان کا کوئی عمل خواہ نیکی کا ہو یا بدی کا) خواہ وہ رائی کے دانے کے برابر ہو' پھر خواہ وہ کسی چٹان (کے پیٹ) میں گھس کر کیا گیا ہو' خواہ آسمانوں (کی پہنائیوں) میں خواہ زمین (کی وسعتوں) میں' اللہ اسے لا حاضر کرے گا۔''

لہٰذا عقل کا تقاضا یہ ہے کہ ع ''گندم از گندم بروید جو زِ جو'' کے مصداق نیکی کے نتائج اچھے نکلیں اور بدی کے نتائج برے نکلیں۔ لیکن ہم یہ دیکھتے ہیں کہ دنیا میں اکثر و بیشتر معاملہ الٹا ہوتا ہے۔ چنانچہ نیکوکاروں کے لیے یہاں مصائب و تکالیف ہیں اور بدکاروں اور حرام خوروں کے لیے عیش و آرام! آپ ذرا سی دیر کو فیصلہ کر کے دیکھ لیجیے کہ مجھے کسی حال میں جھوٹ نہیں بولنا۔ معلوم ہوگا کہ زندگی اجیرن ہوگئی ہے۔ اسی طرح ذرا حرام و حلال کی حدود پر کاربند ہونے کا فیصلہ کر کے دیکھ لیجیے' دو وقت کے کھانے کے لالے پڑ جائیں گے۔ اس کے برعکس جن لوگوں کے نہ کچھ اصول ہیں' نہ مستقل اقدار ہیں' نہ ہی وہ کسی قسم کی اخلاقی حدود و قیود کے پابند ہیں' بلکہ ان کو جہاں بھی موقع ملتا ہے وہ دست درازی سے نہیں چوکتے' ان کے یہاں عیش و آرام ہے' ان کے اور اُن کے اہل و عیال کے لیے تمام دُنیوی سہولتیں وافر مقدار میں مہیا ہیں۔ اِن حقائق و واقعات کے مشاہدے سے ہر باشعور اور حساس انسان کے ذہن میں چند سوالات ابھرتے ہیں کہ آیا یہ دنیا اور اس کی تخلیق ناقص ہے؟ یا یہ خیال کہ ''نیکی نیکی ہے اور بدی بدی ہے'' صرف ہمارے ذہن کی اختراع ہے جس کا حقیقتِ نفس الامری سے کوئی تعلق نہیں؟

ایک سلیم الفطرت اور صحیح العقل انسان اِن سوالات پر جس قدر غور کرتا ہے' اسے یہ محسوس ہوتا ہے کہ ایک جانب اس کی عقل پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ یہ عظیم کائنات ایک علیم و خبیر' عزیز و قدیر اور حلیم و دانا ہستی کی سنجیدہ اور با مقصد تخلیق ہے ـــــ اور دوسری جانب اس کی فطرت یہ قطعی اور حتمی فیصلہ کرتی ہے کہ نیکی و بدی اور خیر و شر کی اقدار حقیقی و واقعی بھی ہیں اور مستقل اور پائیدار بھی۔ گویا نیکی نیکی ہے اور بدی بدی ہے اور دونوں ہرگز برابر نہیں ہیں۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّیِّئَةُ ﴾ (حٰمٓ السجدة: ۳٤) ''اور ہرگز برابر نہیں ہے نہ نیکی اور نہ بدی!''

الغرض عقل اور فطرت دونوں کا تقاضا ہے کہ دنیا کی اس زندگی کے بعد ایک اور زندگی ہونی چاہیے جس میں اخلاقی نتائج بھرپور طور پر برآمد ہوں' چنانچہ نیکوکاروں کو ان کی نیکیوں کا بھرپور صلہ ملے

اور بدکاروں کو اُن کی بدی کی بھرپور سزا ملے۔ یہ بات سورۃ القلم میں بایں الفاظِ مبارکہ فرمائی گئی:

﴿اَفَنَجۡعَلُ الۡمُسۡلِمِیۡنَ کَالۡمُجۡرِمِیۡنَ ﴿۳۵﴾ مَا لَکُمۡ ۟ کَیۡفَ تَحۡکُمُوۡنَ ﴿۳۶﴾﴾

''کیا ہم فرماں برداروں اور مجرموں کو برابر کر دیں گے؟ تم لوگوں کو کیا ہو گیا ہے؟ تم کیسی (غیر معقول) رائے قائم کر رہے ہو؟''

چنانچہ یہ ہے ایمان باللہ سے ایمان بالآخرۃ تک کا عقلی سفر کہ جب اولوالالباب اللہ کو یاد رکھتے ہوئے تخلیقِ کائنات پر غور و فکر کرتے ہیں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ یہاں کوئی شے بے مقصد‘ بے کار‘ عبث اور بلا غایت نہیں ہے تو پھر کیسے ہو سکتا ہے کہ ہماری فطرت اور ہمارے باطن میں نیکی اور بدی اور برّ و تقویٰ اور فسق و فجور کا جو شعور موجود ہے وہ بے نتیجہ اور لاحاصل رہے۔ اس دنیا میں ان کا منطقی اور معقول نتیجہ نہیں نکل رہا‘ لہٰذا لازماً ایک دوسری زندگی ہونی چاہیے جس میں نیکی اور بدی کے بھرپور نتائج برآمد ہوں‘ نیکوکاروں کو جزا اور بدکاروں کو سزا ملے۔ جب یہ لوگ اس عقلی نتیجے تک پہنچ جاتے ہیں تو وہ اللہ کے سامنے گھٹنے ٹیک کر استدعا کرتے ہیں:

﴿رَبَّنَا مَا خَلَقۡتَ ہٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبۡحٰنَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۹۱﴾ رَبَّنَاۤ اِنَّکَ مَنۡ تُدۡخِلِ النَّارَ فَقَدۡ اَخۡزَیۡتَہٗ ؕ وَ مَا لِلظّٰلِمِیۡنَ مِنۡ اَنۡصَارٍ ﴿۱۹۲﴾﴾

''اے ربّ ہمارے! تو نے یہ سب کچھ بے مقصد پیدا نہیں کیا۔ تو پاک ہے (کہ کوئی عبث کام کرے) پس تو ہمیں (آخرت میں) آگ کے عذاب سے بچائیو۔ اے ربّ ہمارے! (اس آخرت کی زندگی میں) جسے بھی تو نے آگ میں جھونک دیا اسے تو بدرجۂ کامل ذلیل و رسوا کر دیا۔ اور (ہمیں اس بات کا یقین ہے کہ وہاں) ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ہو گا''۔

حاصلِ کلام یہ کہ اِن آیات میں خلاصہ ہے ایمان باللہ اور ایمان بالآخرۃ کے عقلی سفر کا۔ یہ قرآن حکیم کا وہ مظہری استدلال ہے جو قرآن مجید کی طویل مکی سورتوں میں تو نہایت شرح و بسط کے ساتھ طویل مباحث کی صورت میں سامنے آتا ہے‘ لیکن اس مقام پر اِن تین آیات میں جس جامعیت کے ساتھ سمو دیا گیا ہے اس کی کوئی دوسری نظیر میرے محدود مطالعے کی حد تک قرآن حکیم میں موجود نہیں ہے۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ اِن آیاتِ مبارکہ کی عظمت و جامعیت کا بیان ایک مختصر صحبت میں قطعاً ممکن نہیں ہے‘ تاہم امید ہے کہ ان گزارشات کے ذریعے ان کے جلال و جمال کی ایک ادنیٰ جھلک ضرور سامنے آ گئی ہو گی اور اصولاً یہ حقیقت منکشف ہو گئی ہو گی کہ اللہ پر ایمان اور آخرت پر ایمان کے ضمن میں قرآن حکیم کا اپنا مخصوص طرزِ استدلال کیا ہے اور وہ تلاشِ حق کے ضمن میں غور و فکر کے لیے کون سا

راستہ تجویز کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس راہ سے یقینِ محکم عطا فرمائے۔ آمین!

شعوری ایمان اور اُس کے لوازم

مذکورہ بالا تین آیات (۱۹۰ تا ۱۹۲) کے بارے میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ کا قول جو نہ صرف ایک بہت بڑے عالم، محقق اور مفسر تھے بلکہ نہایت عظیم مجاہد اور مردِ میدان بھی تھے' یہ ہے کہ ان میں ''ایمانِ عقلی'' کا بیان ہے۔ یعنی ایک سلیم الفطرت انسان جب اپنی عقلِ صحیح کی رہنمائی میں ذہنی و فکری سفر طے کرتا ہے تو کتابِ فطرت کے مطالعے اور مظاہرِ قدرت کے مشاہدے اور اپنے تعقّل و تدبّر اور تذکر و تفکر سے ایمان باللہ اور ایمان بالآخرۃ تک رسائی حاصل کر لیتا ہے۔

اب ہم اس سبق کی بقیہ تین آیات (۱۹۳ تا ۱۹۵) کا مطالعہ کرتے ہیں۔ حضرت شیخ الہند کے قول کے مطابق ان میں سے پہلی آیت (۱۹۳) میں ''ایمانِ سمعی'' کا ذکر ہے' یعنی وہ اولوا الالباب جو اپنے ذہنی و فکری سفر کے نتیجے میں اس مقام تک پہنچ جاتے ہیں جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ جب ان کے کانوں تک کسی نبی کی دعوت پہنچتی ہے جو انہی امور پر مشتمل ہوتی ہے کہ مانو اِس حقیقت کو کہ اس کائنات کا ایک خالق و مالک ہے جو ہر چیز پر قادر بھی ہے اور ہر چیز کا علم بھی رکھتا ہے' وہ العزیز بھی ہے اور الحکیم بھی ——اور مانو اِس حقیقت کو کہ انسان کی زندگی صرف اس دنیا کی زندگی نہیں ہے اور موت زندگی کے خاتمے کا نام نہیں ہے' بلکہ ؎

''موت اِک زندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے بڑھیں گے دَم لے کر!''

کے مصداق اصل زندگی تو موت کے بعد شروع ہوگی۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِیَ الْحَیَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ ۝۶۴﴾ (العنکبوت) ''اور اصل زندگی تو آخرت کی زندگی ہے' کاش کہ انہیں معلوم ہوتا''۔ اُس زندگی میں اس دنیا کی زندگی کے اعمال کے بھرپور نتائج نکلیں گے' چنانچہ یا ابدی عیش و آرام ہوگا یا ہمیشہ کی عقوبت و عذاب۔ ان امور پر مشتمل جب کسی نبی کی دعوت ان اولوا الالباب کے کانوں تک پہنچتی ہے تو فطری اور منطقی طور پر ایسے لوگوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ نبی کی دعوت پر والہانہ لبیک کہتے ہیں اور بالکل اس کیفیت کے ساتھ اس کی تصدیق کرتے ہیں جو اِس شعر

میں سامنے آتی ہے کہ: ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ ہی میرے دل میں تھا

اس موقع پر ان کے احساسات وجذبات کی جو کیفیت ہوتی ہے اسے الفاظ کا جامہ پہنا کر ایک دعا کی صورت میں ان آیاتِ مبارکہ میں ہمارے سامنے رکھ دیا گیا ہے کہ:

''اے ربّ ہمارے! ہم نے سنا ایک پکارنے والے (کی پکار) کو کہ وہ ایمان کی منادی کر رہا ہے کہ ایمان لاؤ اپنے ربّ پر' پس ہم ایمان لے آئے' تو اے ہمارے ربّ (ہماری اب تک کی زندگی میں جو خطائیں ہم سے سرزد ہوئی ہیں اور جو کوتاہیاں صادر ہوئی ہیں ان سے درگزر فرما اور) ہمارے گناہ معاف فرما دے اور ہم سے (ہمارے دامنِ کردار اور نامۂ اعمال کی) ہماری برائیوں کو دور فرما دے' اور جب تو ہمیں وفات دے تو (اپنے) نیکوکار بندوں کی معیت عطا فرمائیو! اے ربّ ہمارے! اور ہمیں وہ سب کچھ عطا کیجیو جس کا وعدہ تو نے ہم سے اپنے رسولوں کی وساطت سے کیا ہے اور قیامت کے دن ہمیں رسوانہ کیجیو! یقیناً تو اپنے وعدے کی خلاف ورزی کرنے والا نہیں''۔ (آیات ۱۹۳' ۱۹۴)

یہ ایک نہایت عظیم دعا ہے اور عجب حسن اتفاق ہے کہ سورۃ البقرۃ اور سورۂ آلِ عمران کے مابین جو بہت سے اُمور مشابہت کے ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے کہ سورۃ البقرۃ کے اختتام پر بھی ایک عظیم دعا وارد ہوئی ہے۔ اسی طرح یہ عظیم دعا ہے جو سورۂ آل عمران کے آخری رکوع میں وارد ہوئی ہے۔

اِس موقع پر دعا کی حقیقت اور اہمیت کو بھی سمجھ لیا جائے تو بہتر ہوگا۔ کسی سابقہ درس میں یہ احادیث بیان ہو چکی ہیں کہ دعا عبادت کا جوہر ہے' بلکہ دعا ہی عبادت ہے۔ درحقیقت دعا اس نسبت کو ظاہر کرتی ہے جو بندے اور ربّ کے مابین ہے اور عبد اور معبود کے مابین تعلق دعا ہی کے ذریعے استوار اور مستحکم ہوتا ہے۔ مزید برآں دعا ایمان اور یقین کا مظہرِ اَتم ہے' اس لیے کہ جب بندہ اللہ سے دعا کرتا ہے تو ثابت ہوتا ہے کہ وہ اللہ کو سمیع وبصیر اور مجیب الدعوات ہی نہیں' عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡر بھی سمجھتا ہے' تب ہی تو اس سے اپنی حاجت روائی اور مشکل کشائی کی استدعا کر رہا ہے۔

صِدّیقین کے ایمان کی کیفیت

یہاں فلسفۂ دین اور حکمتِ قرآن کے اعتبار سے سب سے اہم بات جو ذہن نشین کر لینی چاہیے

’وہ یہ ہے کہ یہ ہیں وہ لوگ جن کو اصطلاح میں ’’صدّیقین‘‘ کہتے ہیں‘ جو نبی کی دعوت کو قبول کرنے میں والہانہ پیش قدمی کرتے ہیں اور قطعاً کوئی توقف نہیں کرتے۔ گویا انہیں اس کے بارے میں کوئی اشتباہ لاحق ہی نہیں ہوتا‘ چنانچہ نہ وہ کوئی اعتراض وارد کرتے ہیں‘ نہ کوئی جرح کرتے ہیں۔ وہ یہ نہیں کہتے کہ آپ ہم کو دعوت دینے والے کون ہوتے ہیں؟ بلکہ ان کی کیفیت ایسی ہوتی ہے کہ جیسے کوئی نمازی وضو کر کے نماز کے لیے تیار بیٹھا ہو اور صرف انتظار کر رہا ہو کہ جیسے ہی اذان کی آواز کان میں پڑے وہ فوراً مسجد کا رُخ کرے۔ بالکل یہی کیفیت صِدّیقین کی ہوتی ہے‘ جن کی فطرت صالح ہوتی ہے‘ جن کی عقل سلیم ہوتی ہے‘ اور جو خود اپنے ذاتی غور و فکر کے نتیجے میں اُن نتائج کے آس پاس پہنچ چکے ہوتے ہیں جن کی دعوت وحی کے ذریعے سے انبیائے کرام اور رُسلِ عظام علیہم السلام تک پہنچتی ہے اور پھر اُن کے ذریعے اِن حضراتِ صدّیقین کے کانوں تک پہنچتی ہے۔

الغرض اِن صدّیقین کو نبی کی دعوت کے قبول کرنے میں نہ کوئی تذبذب‘ تأمل یا تردّد ہوتا ہے نہ کوئی پس و پیش‘ کیونکہ یہ تو خود ان کی اپنی فطرت کی پکار ہوتی ہے‘ اور ان حقائق پر مشتمل ہوتی ہے جو اِن کے اپنے باطن میں مضمر ہوتے ہیں اور وحی کا جامہ پہن کر نبی کے قلبِ اطہر پر وارد ہوتے ہیں اور اب نبی کی زبان سے ایک دعوت کی صورت میں ادا ہو کر ان کے کانوں میں پڑ رہے ہیں‘ بقول علامہ اقبال مرحوم: ؎

نکلی تو لبِ اقبال سے ہے‘ کیا جانیے کس کی ہے یہ صدا
پیغامِ سکوں پہنچا بھی گئی‘ دل محفل کا تڑپا بھی گئی!

لہٰذا وہ جس کیفیت کے ساتھ ایمان لاتے ہیں اس میں ایک والہانہ انداز ہوتا ہے‘ جیسا کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ’’میں نے جس کے سامنے بھی دعوت پیش کی اُس نے تھوڑی دیر کے لیے کچھ نہ کچھ توقف ضرور کیا‘ سوائے ابوبکر (رضی اللہ عنہ) کے کہ انہوں نے ایک لمحے کا توقف کیے بغیر فوراً میری تصدیق کر دی‘‘۔ اب آپ خود سوچیے کہ ایسا کیوں ہوا؟ معلوم ہوا کہ ان کو ان حقائق کے ادراک‘ شعور اور پہچاننے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ کون مسلمان ایسا ہو گا جو یہ بات نہ جانتا ہو کہ ’’واقعۂ معراج‘‘ کی تصدیق کے موقع پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بارگاہِ رسالت سے ’’صِدّیق‘‘ کا لقب اور خطاب ملا تھا! اور پوری اُمت کا اس پر اجماع ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ صدیقِ اکبر ہیں۔ مزید برآں مفسرین کا اس پر اجماع ہے کہ سورۃ الّیل کے آخری حصے میں شامل آیات بالخصوص حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی شان میں نازل

ہوئی ہیں' چنانچہ امام رازیؒ نے سورۃ الّیل کو سورۂ صِدّیق اکبرؓ قرار دیا ہے۔

یہ بات بھی پیشِ نظر رہے کہ تاریخی طور پر یہ ثابت ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی بعثت کے وقت اگرچہ پورے عرب میں بالعموم شرک اور جہالت کی شدید اور گہری تاریکیاں چھائی ہوئی تھیں اور مکّہ میں تو یہ ظلمت اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی اور عالَم یہ تھا کہ دنیا میں خدائے واحد کی عبادت کے لیے جو مرکز تعمیر ہوا تھا وہ اقبال کے ان الفاظ کے مصداق کہ ؎

''دنیا کے بُت کدوں میں پہلا وہ گھر خدا کا''

تین سو ساٹھ بُتوں کا استھان بنا ہوا تھا اور ہر سو شرک کے گھٹا ٹوپ اندھیرے چھائے ہوئے تھے' لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ فطرتِ انسانی بالکل مسخ ہو چکی تھی اور توحید کا نور بالکل ہی مٹ چکا تھا۔ اس لیے کہ اسی مکّہ کی سرزمین میں عین اسی وقت ابوبکرؓ بھی موجود تھے جنہوں نے ساری عمر کبھی شرک نہیں کیا۔ اس حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیجیے کہ نبی اکرم ﷺ پر ابھی وحی ٔنبوت کا آغاز بھی نہیں ہوا تھا لیکن جیسے خود نبی اکرم ﷺ پیدائشی طور پر موحّد تھے اسی طرح حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ بھی پہلے ہی سے موحّد تھے۔ ایسے ہی حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ بھی ابتدا ہی سے موحّد تھے اور ایسی اور بھی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ ایک صاحب زید بن عمرو بن نفیل تھے جن کا آنحضور ﷺ پر وحی کے آغاز سے قبل انتقال ہو گیا تھا۔ روایات میں ان کا حال یہ آتا ہے کہ کعبہ شریف کے پردے پکڑ پکڑ کر اللہ سے دعائیں کیا کرتے تھے کہ ''اے ربّ! میں صرف تیری عبادت کرنا چاہتا ہوں' میں ان تمام معبودانِ باطل سے اعلانِ براءت کر رہا ہوں جن کو اہلِ مکّہ پوجتے ہیں اور جن سے انہوں نے تیرے گھر کو آباد کر رکھا ہے' میں صرف تیری ہی پرستش اور صرف تیری ہی پوجا کرنا چاہتا ہوں لیکن میں نہیں جانتا کیسے کروں''۔ ان ہی کے صاحبزادے ہیں حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ جو یکے از عشرۂ مبشرہ ہیں اور جو حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے بہنوئی ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ زید جیسے موحّد کی آغوش میں تربیت پانے والے کی فطرت میں ان تمام حقائق کا موجود ہونا بالکل سمجھ میں آنے والی بات ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوںؓ نے رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے میں سبقت کی۔

روایات میں چند اور حضرات کا ذکر بھی ملتا ہے جو اپنی فطرتِ سلیمہ اور عقلِ صحیح نیز اپنے غور و فکر سے توحید اور معاد کی معرفت حاصل کر چکے تھے' لیکن ان کا انتقال نبی اکرم ﷺ پر آغازِ وحی سے قبل ہو چکا تھا۔ اس ضمن میں حضرت ورقہ بن نوفل کا ذکر بھی مناسب ہے جو اُسی مکّہ کی سرزمین میں پیدا ہوئے

تھے جہاں شرک کے گھٹا ٹوپ اندھیرے چھائے ہوئے تھے‘لیکن ان کی فطرتِ سلیمہ نے شرک سے انکار کیا اور انہیں مجبور کیا کہ اس ماحول سے نکل کر حقیقت کی تلاش کریں۔ چنانچہ وہ شام گئے‘ وہاں انہوں نے عبرانی زبان سیکھی اور عیسائیت اختیار کی اور پھر جب پہلی وحی کے بعد حضرت خدیجہ ؓ آنحضورﷺ کو اُن کے پاس لے کر گئیں تو انہوں نے فوراً تصدیق کی اور یہ فرمایا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ یہ وہی ناموس ہے جو حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام پر نازل ہوا تھا......اور کاش کہ میں اُس وقت تک زندہ رہوں جب آپ کی قوم آپ کو ستائے گی اور اس شہر سے نکلنے پر مجبور کر دے گی تو میں آپ ﷺ کی مدد کر سکوں۔ کچھ ہی دنوں کے بعد اُن کا انتقال ہو گیا۔

بہرحال یہ ہیں وہ اولوالالباب‘ ہوش منداور باشعور لوگ جو ایک جانب تعقّل و تفکر کی وادیاں طے کرتے ہیں اور دوسری جانب ان کی فطرت سلیم ہوتی ہے اور اس میں ودیعت شدہ حقائق روشن ہوتے ہیں۔ لہٰذا ایسے لوگ جب انبیائے کرام علیہم السلام کی دعوت سنتے ہیں تو کسی ردّ وقدح کے بغیر فوری طور پر اسے قبول کر لیتے ہیں۔ اس کی ایک مثال قرآن مجید میں اور بھی ہے۔ ساتویں پارے کی پہلی آیت ہے:

﴿وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ ۚ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿٨٣﴾﴾ (المائدۃ)

’’اور جب انہوں نے سنا جو نازل ہوا ہے رسول (ﷺ) پر تو تم دیکھتے ہو کہ معرفتِ حق (کے شدتِ تاثر) کی وجہ سے ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی ندیاں بہہ نکلی ہیں۔ (گویا معرفتِ حق کا اتنا گہرا اثر اُن کے قلوب پر ہوا اور جذبات کے اندر وہ کیفیت پیدا ہوئی کہ ان کی آنکھوں سے بے اختیار اشکوں کی جھڑی لگ گئی اور) ان کی زبان پر یہ الفاظ جاری ہو گئے کہ اے ہمارے پروردگار! ہم ایمان لے آئے‘ پس ہمارے نام بھی حق کے گواہوں میں درج فرما لے۔‘‘

اجابت از درِ حق......

اس کے بعد آیت ۱۹۵ میں بارگاہِ ربّ العزت کی طرف سے اس دُعا کی قبولیت کا اعلان ہو رہا ہے اور اس کے ضمن میں ایسے سلیم الفطرت اور سلیم العقل لوگوں کی عملی زندگی اور ان کی سیرت و کردار کی ایک جھلک بھی دکھائی گئی۔ پہلے تو قبولیت و اجابتِ دعا کی بشارت اور نوید بایں الفاظ مبارکہ سنائی گئی:

﴿فَاسْتَجَابَ لَھُمْ رَبُّھُمْ......﴾ ''پس اُن کے ربّ (اُن کے آقا' اُن کے مالک) نے اُن کی دعا قبول فرمالی''۔

یہ بالکل ایسی کیفیت ہے جیسی فارسی کے اس شعر میں بیان ہوئی ہے: ؎

بترس از آہِ مظلوماں کہ ہنگامِ دعا کردن
اجابت از درِ حق بہرِ استقبال می آید

اس شعر کا اردو ترجمہ شعر ہی کی صورت میں کیا گیا ہے: ؎

ڈرو مظلوم کی آہوں سے جب اٹھتی ہیں سینوں سے
قبولیت ہے کرتی خیر مقدم چرخ سے آ کر!

تو اِن صدیقین کی دعا کا جواب گویا فوری طور پر مل رہا ہے۔ اِدھر دعا زبان سے نکلی' اُدھر اسے شرفِ قبولیت عطا ہوگیا۔ فرمایا:

﴿فَاسْتَجَابَ لَھُمْ رَبُّھُمْ اَنِّیْ لَآ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ اَوْ اُنْثٰی ج بَعْضُکُمْ مِّنْ م بَعْضٍ ج﴾

''پس ان کی دعا کو قبول فرمایا اُن کے ربّ نے کہ میں تو تم میں سے کسی بھی عمل کرنے والے کے کسی عمل کو ضائع نہیں کرتا خواہ وہ (عمل کرنے والا) مرد ہو' خواہ عورت ہو۔ تم سب ایک دوسرے ہی سے ہو''۔

غور فرمایئے کہ آیت کے اس چھوٹے سے ٹکڑے میں مَرد اور عورت کے مابین اخلاقی' دینی اور روحانی مساوات کا اہم اصول بھی بیان فرما دیا گیا کہ دونوں جان لیں کہ اگرچہ تمہاری اصناف جدا جدا ہیں' لیکن یہ جسمانی اور نفسیاتی فرق و تفاوت تو تمدنی ضرورت کے تحت ہے' ورنہ انسان ہونے کے اعتبار سے جیسے تمہاری نوع ایک ہے اسی طرح سے تمہاری اخلاقی اور دینی حیثیت بھی یکساں اور مساوی ہے۔ دین میں' نیکی میں' خیر میں اور دین کے لیے مالی اور جانی قربانیاں دینے میں اور ان کے اجر و ثواب میں مَردوں اور عورتوں میں کوئی تفاوت نہیں ہے۔ مَردوں کے لیے بھی میدان کھلا ہے اور عورتوں کے لیے بھی۔ مَردوں کے اپنے اعمال ہیں' ان کی اپنی نیکیاں ہیں' ان کی اپنی کمائی ہے اور عورتوں کے اپنے اعمال ہیں' ان کی اپنی نیکیاں ہیں' ان کی اپنی کمائی ہے۔ دونوں کو میری بارگاہ سے ان کے ہر ہر عمل کا بھرپور بدلہ ملے گا۔ میں ان کا چھوٹے سے چھوٹا عمل بھی ضائع کرنے والا

نہیں ہوں۔

صدّیقین کے سیرت وکردار کی ایک جھلک

اب اسی آیت کے اگلے حصے کا مطالعہ کیجیے جس کے بارے میں اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ اس آیت میں پہلے تو اُن صدّیقین کو ان کی دعا کی اجابت وقبولیت کی بشارت ونوید سنائی گئی اور پھر افادۂ عام کے لیے ایسے حضرات کی عملی زندگی اوران کے سیرت وکردار کی ایک جھلک بھی دکھا دی گئی۔

﴿فَالَّذِیۡنَ ہَاجَرُوۡا وَ اُخۡرِجُوۡا مِنۡ دِیَارِہِمۡ وَ اُوۡذُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِیۡ وَ قٰتَلُوۡا وَ قُتِلُوۡا لَاُکَفِّرَنَّ عَنۡہُمۡ سَیِّاٰتِہِمۡ وَ لَاُدۡخِلَنَّہُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ ۚ ثَوَابًا مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰہِ ؕ وَ اللّٰہُ عِنۡدَہٗ حُسۡنُ الثَّوَابِ ﴿۱۹۵﴾﴾

''پس وہ لوگ جنہوں نے ہجرت کی' اور جو اپنے گھروں سے نکال دیے گئے' اور جنہیں میری راہ میں ایذائیں پہنچائی گئیں' اور جنہوں نے جنگ کی اور قتل کر دیے گئے (جنہوں نے میری راہ میں اپنی گردنیں کٹوا دیں) میں اُن کی برائیوں کو لازماً ان سے دُور کروں گا اوران کو لازماً داخل کروں گا ان باغات میں جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہوں گی۔ یہ بدلہ ہوگا اللہ کے پاس سے (اس کے خاص خزانۂ فضل سے) اور (واقعہ یہ ہے کہ) اچھا بدلہ تو اللہ ہی کے پاس ہے''۔

آیت کے اس حصے میں ''ہجرت'' اور ''اخراج مِن الدّیار'' کے الفاظ قابلِ توجہ ہیں۔ بظاہر تو یہ ہم معنی اور ہم مفہوم ہیں' ان کی مراد ایک ہی ہے' لیکن ''ہجرت'' ہمارے دین کی ایک وسیع المفہوم اصطلاح ہے۔اس کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ اللہ کے دین کی خاطر گھر بار' اہل وعیال اور اعزّہ واقارب سب چھوڑ کر کسی ایسی جگہ چلے جانا جہاں عبادتِ ربّ کا فریضہ انجام دینے میں غیر معمولی اور ناقابلِ برداشت مشکلات نہ ہوں۔لیکن اس کے دوسرے بھی متعدد مفاہیم ہیں۔ جیسے نبی اکرمﷺ سے پوچھا گیا: یَا رَسُوۡلَ اللّٰہِ اَیُّ الۡھِجۡرَۃِ اَفۡضَلُ؟ ''اے اللہ کے رسولﷺ! یہ فرمائیے کہ سب سے اعلیٰ وافضل ہجرت کون سی ہے''؟ اب جواب سنئے' حضورﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ: ((اَنۡ تَھۡجُرَ مَا کَرِہَ رَبُّکَ عَزَّوَجَلَّ)) ''یہ کہ تو ہر اُس چیز کو چھوڑ دے اور ہر اُس کام سے اجتناب کرے جو تیرے ربّ عزّ وجل کو پسند نہیں ہے''۔ لہٰذا یہاں اس لفظ کو اس کے عموم پر رکھا جائے تو کوئی حرج نہیں۔ اس طرح ﴿فَالَّذِیۡنَ ہَاجَرُوۡا﴾ کا مفہوم ہوگا کہ ''وہ لوگ جنہوں نے اللہ کی خاطر ہر اُس چیز کو تج دیا اور ہر اُس چیز سے ترکِ تعلق کر لیا جو اللہ کو پسند نہیں''۔کوئی چیز اُن کے لیے راہِ حق میں رکاوٹ نہ بن سکی اوراس راہ کی کوئی مشکل ان کے پاؤں کی بیڑی نہ بن سکی۔ وہ جب اپنے ربّ سے جڑے ہیں تو اس شان کے

ساتھ جڑے ہیں کہ جو چیز بھی اللہ کو ناپسند ہے اس سے کٹ گئے۔ ان کی کیفیت یہ ہوگئی ہے کہ:
اَلْحُبُّ لِلّٰہِ وَالْبُغْضُ لِلّٰہِ ''اگر کسی سے محبت ہے تو صرف اللہ کے لیے اور اگر کسی سے بغض وعداوت ہے تو صرف اللہ کے لیے''۔

آ گے بڑھیے: ﴿وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ﴾ ''اور جو اپنے گھروں سے نکالے گئے''۔ یہاں ایک اشکال کا رفع ہونا ضروری ہے۔ وہ یہ کہ اہل ایمان کو قریشِ مکّہ نے خود تو نہیں نکالا تھا۔ اہل ایمان نے خود دو بار حبشہ کی طرف اور آخری بار یثرب (مدینہ منورہ) کی طرف ہجرت کی تھی۔ قریش تو اُن کو روکنے کے درپے تھے۔ لیکن امرِ واقعہ یہ ہے کہ قریشِ مکّہ نے ان اہل ایمان پر مظالم وشدائد کی وہ حد کر دی تھی کہ ان کا مکّہ میں رہنا دوبھر اور اجیرن ہو گیا تھا۔ ان کے مظالم جن اہل ایمان کے لیے برداشت کی حدود سے نکل گئے تھے انہوں نے نبی اکرم ﷺ کی اجازت سے حبشہ کی طرف ہجرت کی تھی۔ اسی بات کو یہاں ان الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے: ﴿وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ﴾ ''اور وہ لوگ جو اپنے گھروں سے نکالے گئے''۔

آ گے فرمایا: ﴿وَاُوْذُوْا فِیْ سَبِیْلِیْ﴾ ''اور جنہیں میری راہ میں ایذائیں پہنچائی گئیں''۔ چنانچہ جو کچھ بیتا حضرت بلالؓ پر اور جو قیامت گزری حضرت خباب بن الارت اور بہت سے دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر' پھر جس بہیمانہ طریقے پر حضرت یاسر اور ان کی اہلیہ محترمہ حضرت سمیہ رضی اللہ عنہما شہید کیے گئے' ان تمام ایذاؤں اور مظالم وشدائد کا اندازہ کیجیے جس کے تصور ہی سے ایک حسّاس و دردمند دل لرز اٹھتا ہے' اور پھر سوچیے کہ ان حضرات کرامؓ نے کوئی جرم نہیں کیا تھا۔ زر' زن اور زمین کے جو جھگڑے دنیا میں مشہور ومعروف ہیں' ان میں سے کسی کے ضمن میں ان کا کسی سے کوئی تنازُع اور قضیہ نہیں تھا۔ اُن کا جرم کوئی تھا تو صرف یہ کہ انہوں نے کلمۂ توحید کو قبول کر لیا تھا اور محمدٌ رسول اللہ ﷺ کے دامن سے وابستگی اختیار کر لی تھی۔ مزید برآں خود نبی اکرم ﷺ جو اعلانِ نبوت ورسالت سے قبل قریش کی آنکھوں کا تارا تھے' جن کا ذکر وہ الصادق اور الامین جیسے اعلیٰ القاب کے بغیر نہیں کرتے تھے' وہ ان کے مخالف کس لیے اور کس وجہ سے تھے؟ یہاں ''فِیْ سَبِیْلِیْ'' کے الفاظ کے ذریعے ان تمام اہل ایمان کو خراجِ تحسین ادا کیا جا رہا ہے کہ وہ لوگ جو صرف میری خاطر مصائب کا نشانہ اور تشدّد وستم کا نوالہ بنے اور صرف میرے دین کی خاطر جاں گسل آزمائشوں کی بھٹیوں میں سے گزرے۔ واضح رہے کہ یہاں تک جن ایذاؤں کا ذکر ہوا ان کا تعلق مکی دَور سے ہے۔

اب آگے مدنی دَور کا ذکر آ رہا ہے۔ سورۂ آل عمران مدنی ہے۔ اس دَور میں جنگ اور قتال کا سلسلہ شروع ہوا۔ جنگ کیا ہے؟ آیۂ بر کے مطالعے کے دوران ہمارے سامنے یہ بات آ چکی ہے کہ نقدِ جان ہتھیلی پر رکھ کر اللہ کے دین کے غلبہ کے لیے ایک بندۂ مؤمن معرکۂ قتال اور میدانِ جنگ میں آ جائے تو یہ نیکی کی بلندترین چوٹی ہے۔ یہاں یہی بات ان الفاظ میں وارد ہوئی: ﴿وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا﴾ ''اور انہوں نے اللہ کی راہ میں جنگ کی اور قتل کر دیے گئے''۔ انہوں نے اللہ کی راہ میں اپنی گردنیں کٹوا دیں اور اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر دیا۔ پس جن لوگوں کا یہ مقام ہے' جن کے یہ مراتب ہیں' جن کے ایثار وقربانی کی یہ شان ہے تو ان کو بشارت ہو کہ ﴿لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ﴾ ''میں لازماً ان سے ان کی برائیاں دُور کر دوں گا''۔ بر بنائے بشریت کہیں کوئی لغزش ہو گئی ہو' کبھی جذبات کی رو میں آ کر کسی غلط حرکت کا صدور ہو گیا ہو تو اس سے ہم چشم پوشی فرمائیں گے' ان کو معاف کر دیں گے۔ ان کے دامنِ کردار پر اگر کوئی داغ دھبہ ہے تو ہم اسے دھو ڈالیں گے۔ ان کے نامۂ اعمال میں اگر سیاہی کے کچھ داغ ہیں تو ہم ان کو صاف کر دیں گے۔ یہاں جو پہلے ''لامِ مفتوح'' اور آخر میں ''نونِ مشدّد'' آیا ہے عربی زبان میں یہ تاکید کا سب سے بڑا اسلوب ہے۔ مفہوم ہو گا کہ ''میں لازماً دُور کر کے رہوں گا''۔

آگے فرمایا: ﴿وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْھٰرُ﴾ یہاں بھی تاکید کا وہی اسلوب ہے: ''اور میں لازماً ان کو داخل کر کے رہوں گا ان باغات میں جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہیں''۔ آیت کا اختتام ہوتا ہے: ﴿ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾ ''یہ بدلہ ہے خاص اللہ کے پاس سے''۔ یہاں پر جو ''مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ'' کے الفاظ آئے ہیں ان میں ایک خاص کیفیت ہے' یعنی مَیں اپنے خاص خزانۂ فضل سے انہیں نوازوں گا۔ یہ لوگ میرے مقربینِ بارگاہ ہوں گے' ان کو جو کچھ میں عطا کروں گا وہ اپنے خاص خزانۂ فیض سے عطا کروں گا۔ ﴿وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ ﴿١٩٥﴾﴾ ''اور (یہ جان لو کہ) اچھا بدلہ (اور عمدہ صلہ) صرف اللہ کے پاس ہے''۔ یہاں بھی حصر کا مفہوم موجود ہے۔ حصر کے اسلوب کے متعلق پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔ اس اسلوب سے ''صرف'' کا مفہوم پیدا ہوا۔ یعنی ''اچھا بدلہ تو صرف اللہ ہی کے پاس ہے''۔

اس میں ایک لطیف اشارہ ہے اس طرف کہ انسان محنتیں کرتا ہے' بھاگ دوڑ کرتا ہے تو کسی نہ کسی فائدہ' نفع اور بدلہ کو پیشِ نظر رکھتا ہے۔ اولاد پر انسان محنت کرتا ہے' اپنے آپ کو کھپاتا ہے' اس امید

میں کہ یہ ہمارے بڑھاپے میں ہمارا سہارا بنیں گے۔لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بڑھاپے میں اولاد کی طرف سے خلافِ توقع ایک غلط طرزِعمل سامنے آتا ہے۔انسان کو صدمے جھیلنے پڑتے ہیں۔ اولاد کے غلط طرزِعمل اور رویے کی وجہ سے انسان نفسیاتی و ذہنی کرب سے دوچار ہو جاتا ہے۔معلوم ہوا کہ صرف وہ محنت اور وہ کوشش لازماً نتیجہ خیز ہوگی جو اللہ کے لیے کی گئی ہو۔اس کا اچھا بدلہ مل کر رہے گا۔ ہر وہ ساعت لازوال اور غیر فانی ہو جائے گی جو اللہ کے لیے صرف کی گئی ہو اور اس کے دین کی خدمت میں لگائی گئی ہو۔اسی طرح ہر وہ پیسہ محفوظ ہو جائے گا جو اللہ کے دین کے لیے خرچ ہوا ہو۔یہ تمام مفاہیم اس آیۂ مبارکہ کے اختتامی الفاظ میں موجود ہیں۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَOO

❁❁❁

درس 7

نورِ ایمان کے اجزاءِ ترکیبی
نورِ فطرت اور نورِ وحی

سُوْرَۃُ النُّوْر کے پانچویں رکوع کی روشنی میں

درس ۷

نورِ ایمان کے اجزائے ترکیبی

نورِ فطرت اور نورِ وحی

سورۂ نور کے پانچویں رکوع کی روشنی میں

نحمدہٗ ونصلی علٰی رَسولہِ الکریم ...... امَّا بَعد:

فاَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیطٰنِ الرَّجِیم ۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿اَللّٰہُ نُوۡرُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ مَثَلُ نُوۡرِہٖ کَمِشۡکٰوۃٍ فِیۡہَا مِصۡبَاحٌ ؕ اَلۡمِصۡبَاحُ
فِیۡ زُجَاجَۃٍ ؕ اَلزُّجَاجَۃُ کَاَنَّہَا کَوۡکَبٌ دُرِّیٌّ یُّوۡقَدُ مِنۡ شَجَرَۃٍ مُّبٰرَکَۃٍ زَیۡتُوۡنَۃٍ لَّا
شَرۡقِیَّۃٍ وَّ لَا غَرۡبِیَّۃٍ ۙ یَّکَادُ زَیۡتُہَا یُضِیۡٓءُ وَ لَوۡ لَمۡ تَمۡسَسۡہُ نَارٌ ؕ نُوۡرٌ عَلٰی نُوۡرٍ ؕ
یَہۡدِی اللّٰہُ لِنُوۡرِہٖ مَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَ یَضۡرِبُ اللّٰہُ الۡاَمۡثَالَ لِلنَّاسِ ؕ وَ اللّٰہُ بِکُلِّ شَیۡءٍ
عَلِیۡمٌ ﴿ۙ۳۵﴾ فِیۡ بُیُوۡتٍ اَذِنَ اللّٰہُ اَنۡ تُرۡفَعَ وَ یُذۡکَرَ فِیۡہَا اسۡمُہٗ ۙ یُسَبِّحُ لَہٗ فِیۡہَا بِالۡغُدُوِّ
وَ الۡاٰصَالِ ﴿ۙ۳۶﴾ رِجَالٌ ۙ لَّا تُلۡہِیۡہِمۡ تِجَارَۃٌ وَّ لَا بَیۡعٌ عَنۡ ذِکۡرِ اللّٰہِ وَ اِقَامِ الصَّلٰوۃِ
وَ اِیۡتَآءِ الزَّکٰوۃِ ۪ۙ یَخَافُوۡنَ یَوۡمًا تَتَقَلَّبُ فِیۡہِ الۡقُلُوۡبُ وَ الۡاَبۡصَارُ ﴿٭ۙ۳۷﴾ لِیَجۡزِیَہُمُ اللّٰہُ
اَحۡسَنَ مَا عَمِلُوۡا وَ یَزِیۡدَہُمۡ مِّنۡ فَضۡلِہٖ ؕ وَ اللّٰہُ یَرۡزُقُ مَنۡ یَّشَآءُ بِغَیۡرِ حِسَابٍ ﴿۳۸﴾
وَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اَعۡمَالُہُمۡ کَسَرَابٍۭ بِقِیۡعَۃٍ یَّحۡسَبُہُ الظَّمۡاٰنُ مَآءً ؕ حَتّٰۤی اِذَا جَآءَہٗ
لَمۡ یَجِدۡہُ شَیۡئًا وَّ وَجَدَ اللّٰہَ عِنۡدَہٗ فَوَفّٰىہُ حِسَابَہٗ ؕ وَ اللّٰہُ سَرِیۡعُ الۡحِسَابِ ﴿ۙ۳۹﴾ اَوۡ
کَظُلُمٰتٍ فِیۡ بَحۡرٍ لُّجِّیٍّ یَّغۡشٰہُ مَوۡجٌ مِّنۡ فَوۡقِہٖ مَوۡجٌ مِّنۡ فَوۡقِہٖ سَحَابٌ ؕ ظُلُمٰتٌۢ
بَعۡضُہَا فَوۡقَ بَعۡضٍ ؕ اِذَاۤ اَخۡرَجَ یَدَہٗ لَمۡ یَکَدۡ یَرٰىہَا ؕ وَ مَنۡ لَّمۡ یَجۡعَلِ اللّٰہُ لَہٗ نُوۡرًا
فَمَا لَہٗ مِنۡ نُّوۡرٍ ﴿٪۴۰﴾﴾ ...... صدق اللّٰہ العظیم!

آج ہم قرآن حکیم کے منتخب نصاب کے ساتویں درس کا آغاز کر رہے ہیں جو مباحثِ ایمان کے ضمن میں تیسرا سبق ہے اور سورۃ النور کے پانچویں رکوع پر مشتمل ہے۔

سابقہ درس میں اولوالالباب یا صدّیقین کے شعوری اور اکتسابی ایمان کی وضاحت ایمانِ عقلی

اور ایمانِ سمعی کے تدریجی مراحل کے حوالے سے ہوئی تھی۔ سورۃ النور کی مشہور ''آیتِ نور'' (آیت ۳۵) میں اس ایمان کو ایک نور قرار دے کر اس کی اصل حقیقت کو اس کے دو اجزائے ترکیبی یعنی ''نورِ فطرت'' اور ''نورِ وحی'' کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے۔ اس آیۂ مبارکہ کا ترجمہ حسبِ ذیل ہے:

> ''اللہ ہی آسمانوں اور زمین کی روشنی ہے۔ اس کے نور کی مثال ایسے ہے جیسے ایک طاق ہو' اس میں ایک چراغ ہو' چراغ ایک شیشے (فانوس) میں ہو اور وہ شیشہ ایک چمک دار ستارے کی مانند روشن ہو' وہ چراغ جلتا ہو ایک ایسے مبارک زیتون کے درخت (کے تیل) سے جو نہ شرقی ہو نہ غربی۔ اس کا روغن بھڑک اٹھنے کو بے تاب ہو' خواہ اسے آگ نے چھوا تک نہ ہو۔ یہ روشنی ہے روشنی پر۔ اللہ ہدایت دیتا ہے اپنے نور کی جانب جس کو چاہتا ہے۔ اور اللہ مثالیں بیان فرماتا ہے لوگوں کے لیے' اور اللہ تو سب کچھ جاننے والا ہے۔ (یعنی وہ ہر شے کی حقیقت سے کماحقہٗ واقف ہے!)''

یہ آیۂ مبارکہ پورے قرآن مجید میں بھی ایک منفرد اہمیت کی حامل ہے۔ بالخصوص سورۃ النور میں تو اس کی حیثیت بالکل ایسے ہے جیسے ایک نہایت قیمتی اور خوبصورت انگوٹھی ہو' جس کے درمیان میں نہایت قیمتی نگینہ جڑا ہوا ہو۔ اس لیے کہ یہ سورۃ النور کے پانچویں رکوع کی پہلی آیت ہے اور سورۃ النور کُل نو رکوعوں پر مشتمل ہے۔ گویا پانچواں رکوع اس کے عین وسط میں واقع ہے' چار رکوع اس سے قبل ہیں اور چار اس کے بعد۔ اس رکوع میں ایمان اور اس کی اصل حقیقت کو تمثیلات کے پیرائے میں سمجھایا گیا ہے۔ چنانچہ پہلی آیت میں ''ایمان کی حقیقت'' اور اس کی ''ماہیت'' کے لیے تمثیل لائی گئی ہے کہ وہ ایک نور ہے' ایک روشنی ہے جس سے انسان کا قلب' اس کا سینہ اور نتیجتاً اس کا پورا وجود اور اس کی پوری شخصیت منور ہو جاتی ہے۔ پھر یہ کہ اس نور کے اجزائے ترکیبی دو ہیں۔ ایک وہ نورِ فطرت جو ہر انسان کی فطرت میں ودیعت شدہ ہے اور دوسرا نورِ وحی جس سے نورِ فطرت کی تکمیل ہوتی ہے۔

تمثیل یا تشبیہہ کا استعمال کیوں؟

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن حکیم میں تمثیلوں اور تشبیہوں کو اِس قدر کثرت سے کیوں استعمال فرمایا گیا ہے! یہ بات ہمیں جان لینی چاہیے کہ یہ معاملہ صرف قرآن مجید ہی کا نہیں ہے' بلکہ یہ تمام آسمانی کتابوں کا مشترک وصف ہے۔ خصوصاً انجیل میں تمثیلیں نہایت کثرت سے بیان ہوئی ہیں' جو نہایت اعلیٰ اور حد درجہ معنی خیز ہیں اور دنیا کی اکثر زبانوں کے کلاسیکل ادب میں ضرب المثل کے طور پر استعمال ہوتی ہیں۔ آسمانی ادب میں ان تمثیلوں کے بکثرت استعمال کا سبب یہ ہے کہ بعض

مضامین اتنے لطیف ہوتے ہیں اور فہم وادراک کی عمومی سطح سے اتنے بلند ہوتے ہیں کہ اوّلاً تو اُن کو صراحت کے ساتھ بیان کرنا ممکن ہی نہیں ہوتا۔ ثانیاً اگر انہیں عام انداز میں بیان کیا جائے تو ہوسکتا ہے کہ فائدے سے زیادہ نقصان ہو جائے اور عوام الناس کسی مغالطے میں مبتلا ہو جائیں۔ دوسری طرف ان لطیف اور ماورائی حقائق کا ایک اجمالی تصور انسان کی ہدایت ورہنمائی کے لیے ضروری اور ناگزیر ہے۔ لہٰذا آسمانی کتابوں میں ایسے حقائق کے ضمن میں تمثیل یا تشبیہ کا پیرایہ اختیار کیا گیا ہے' تا کہ اس سے ہر شخص اپنے فہم وشعور کی سطح کے مطابق استفادہ کرے۔ چنانچہ انجیل میں مذکور ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ایک حواری نے سوال کیا کہ ''استاد! آپ تمثیلوں میں گفتگو کیوں کرتے ہیں؟'' حضرت مسیحؑ نے جواب میں ارشاد فرمایا: ''تا کہ وہی سمجھیں جن کا سمجھنا مفید ہے''۔ حاصلِ کلام یہ کہ تمثیل کی احتیاج انسان کو ہے' اللہ کو نہیں۔ جیسے زیرِ مطالعہ آیت مبارکہ کے آخر میں فرمایا گیا :﴿وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿٣٥﴾﴾ ''اور اللہ مثالیں بیان فرماتا ہے لوگوں کے لیے' اور اللہ کو تو تمام چیزوں کا علم ہے''۔ اور یہ علم ''كَمَا حَقُّهٗ'' بھی ہے اور ''كَمَا هِيَ'' بھی۔ ہر شے کی اصل حقیقت اس پر روشن ہے۔ پس تمثیل کی احتیاج' معاذ اللہ' ثم معاذ اللہ' اللہ کو نہیں' بلکہ اس کی ضرورت اصلاً ہمیں ہے۔

اس کی ایک اور مثال بھی آپ کے سامنے آ جائے تو مناسب ہوگا۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ قانونِ اسلامی کی بنیاد صرف قرآن مجید پر نہیں ہے' بلکہ سنت رسول ﷺ بھی اس کی دوسری لازمی بنیاد ہے' تو بعض لوگ ناسمجھی کے باعث یہ اعتراض کر بیٹھتے ہیں کہ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ قرآن مجید کو سنت کی ضرورت ہے' گویا قرآن سنت کا محتاج ہے! معاذ اللہ' اصل بات یہ ہے کہ ہم قرآن مجید کو سمجھنے اور زندگی کے پیچیدہ مسائل ومعاملات میں عملی رہنمائی کے حصول کے لیے سنتِ رسول ﷺ کے محتاج ہیں۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا:

﴿وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ﴾ (النحل: ٤٤)

''اور (اے نبیؐ!) ہم نے آپؐ کی جانب یہ ذکر (یعنی قرآن مجید) نازل فرمایا ہے' تا کہ آپ ﷺ لوگوں کے لیے واضح کریں جو اُن کے لیے نازل کیا گیا ہے''۔

اس آیتِ مبارکہ کی رو سے قرآن کی تبیین' اس کی تشریح وتوضیح اور اس کے اوامر ونواہی پر عمل کا واضح اور روشن اسوہ اور نمونہ پیش کرنا' یہ تمام امور حضرت محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے فرمودات وارشادات نیز آپؐ کے عمل اور آپؐ کی سنت کی رہنمائی کے محتاج ہیں۔ بالکل یہی بات یہاں ہے کہ تمثیلوں کی

احتیاج اللہ کو نہیں ہے بلکہ انسان کو ہے۔ اللہ تو ہر شے سے واقف ہے' ہر شے کا علم رکھتا ہے۔

کیا اللہ کی ذات نور سے عبارت ہے؟

اب اس تمثیل پر غور کیجیے جو اس آیتِ مبارکہ میں بیان ہوئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ﴿اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط﴾ ''آسمانوں اور زمین کی روشنی اللہ ہی ہے''۔ ظاہر الفاظ سے یہاں ایک مغالطہ لاحق ہو جاتا ہے کہ شاید یہاں ''نور'' کا اطلاق باری تعالیٰ کی ذات پر ہو رہا ہے۔ اس مغالطے سے بچنے کی بڑی ضرورت ہے۔ ذاتِ باری تعالیٰ کے متعلق یہ بات ہمیں معلوم ہونی چاہیے کہ' بقول حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ' وہ وراء الوراء' ثم وراء الوراء' ثم وراء الوراء ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات کا علم ہمارے فہم و شعور' احساس و ادراک' فکر و نظر' حتیٰ کہ تصور و تخیل کی سرحدوں سے بہت دُور اور پرے ہے۔ بقول غالب: ع

''ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود!''

یا بقول شخصے: ع

''اے بروں از وہم و قیل وقالِ من!''

یا بقول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ: ''اَلعِجزُ عَن درکِ الذّاتِ اِدراکٌ'' یعنی اللہ کی ذات کے ادراک سے عاجز ہونے کا اقرار و اعتراف ہی اصل ادراک ہے۔ گویا ''معلومم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد!'' یعنی جب انسان یہ جان لیتا ہے کہ میں اللہ کی ذات کو نہیں جان سکتا تو یہی کمالِ عرفان ہے۔ یہی بات ایک دوسرے اسلوب سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمائی کہ: ''وَالبحثُ عن کُنہِ الذاتِ اِشراکٌ'' یعنی اللہ کی ذات کے بارے میں بحث اور کھود کرید سے انسان شرک اور فتنہ میں مبتلا ہو جائے گا۔ الغرض اس حقیقت کو ذہن نشین کرنا بہت ضروری ہے کہ آیتِ زیرِ درس میں وارد شدہ تمثیل اللہ کی ذات کے لیے نہیں بلکہ اس پر ایمان کی حقیقت کے بیان کے لیے ہے' گویا نور کے لفظ کا اطلاق ذاتِ باری تعالیٰ پر نہیں' ایمان باللہ پر ہے۔

اس ضمن میں امام رازیؒ نے اپنی تفسیر کبیر میں بڑی عمدہ بات کہی ہے کہ نور لامحالہ کوئی مادی شے ہے یا کوئی عارضی کیفیت' اور ان دونوں کی نسبت باری تعالیٰ پر نہیں ہے' جیسا کہ عہدِ حاضر کے بعض مفسرین و مترجمینِ قرآن نے گمان کیا ہے۔ اس کی ایک قطعی اور حتمی دلیل اس آیتِ مبارکہ کے الفاظ میں موجود ہے۔ چنانچہ اس میں دو مرتبہ ''نُوْرِہٖ'' کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ مرکب اضافی ہے۔ جب کسی

شے کی اضافت کسی کی طرف کی جاتی ہے تو وہ شے اس کا غیر ہوتی ہے۔ جیسے میں کہوں ''میرا قلم'' تو اس میں ''قلم'' علیحدہ ہے اور ''میں'' علیحدہ ہوں' اور نسبتِ اضافی میرے اور قلم کے مابین ہے۔ تو ''نُــورِہٖ'' کے معنی ہیں ''اس کا (یعنی اللہ کا) نور''۔ لہٰذا نور کا اطلاق ذاتِ باری تعالیٰ پر درست نہیں ہے۔ اس کی ایک دوسری دلیلِ قطعی سورۃ الانعام کی پہلی آیتِ مبارکہ میں موجود ہے' جس سے ثابت ہو جاتا ہے کہ نور سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات نہیں ہو سکتی۔ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ ط﴾

''تمام شکر و سپاس اور تمام ثناء و تعریف اس اللہ کے لیے ہے جس نے پیدا کیے آسمان اور زمین اور بنائے اندھیرے اور روشنی''۔

ثابت ہو گیا کہ نور ''مجعول'' یعنی بنائی ہوئی شے ہے اور ظاہر بات ہے کہ باری تعالیٰ کی ذاتِ گرامی کو مجعول نہیں کہا جا سکتا۔

اب نور کو سمجھئے! ہم جس نور سے واقف ہیں وہ ''نورِ خارجی'' ہے' یعنی خارجی روشنی۔ یہ نور یا روشنی اصل میں اشیاء کے ظہور کا ذریعہ بنتی ہے۔ فرض کیجیے کہ ہم سب ایک ایسے کمرے میں موجود ہیں جہاں برقی قمقموں کی روشنی کا سیلاب آیا ہوا ہے۔ کمرہ خوب روشن ہے اور جگمگا رہا ہے۔ اس صورت میں اس روشنی کے ذریعے ہم سب ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہیں' لیکن کسی سبب سے فیوز اُڑ جائے اور روشنی چلی جائے تو ہم ایک دوسرے کو دیکھ نہیں سکیں گے' درانحالیکہ ہم سب کی آنکھوں میں دیکھنے کی صلاحیت موجود رہے گی۔ گویا اشیاء کا ظہور بواسطۂ نور ہو رہا ہے۔ یہ ہے ہماری بصارتِ ظاہری جس کا ذریعہ بنتا ہے ایک مادی اور خارجی نور۔ اسی طرح ایک نورِ باطنی ہے جس سے حقائقِ اشیاء ظاہر ہوتے ہیں۔ جیسے نبی اکرم ﷺ کی ایک دعا منقول ہوئی ہے کہ: ((اَللّٰھُمَّ اَرِنِیْ حَقِیْقَةَ الْاَشْیَاءِ کَمَا ھِیَ)) ''اے اللہ! مجھے اشیاء کی حقیقت دکھا جیسی کہ وہ فی الواقع ہیں''۔ شاید اسی سے شاعر نے خیال مستعار لے کر کہا ہے: ؎

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا!

تو وہ جو ایک بصیرتِ باطنی ہے' اسے ایک نورِ باطنی کی ضرورت ہے اور وہ نورِ باطنی ہے نورِ معرفتِ

خداوندی۔ اسی نورِ معرفتِ خداوندی کا ذکر سورۃ البقرۃ میں آیت الکرسی کے بعد دوسری آیت میں ہے:

﴿اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ﴾ (آیت ۲۵۷)

''اللہ اہل ایمان کا دوست ہے' ان کو نکالتا ہے اندھیروں سے روشنی کی طرف''۔

گویا اللہ کو پہچان لیا تو اس کائنات کے جملہ حقائق کو نیہ روشن ہو جائیں گے اور حقائقِ تکوینی کے ساتھ ساتھ حقائقِ تشریعی بھی اپنے جملہ اَسرار وحِکم کے ساتھ منور ہو جائیں گے اور ہر شے کی حقیقت نظر آنے لگے گی۔ چنانچہ یہ جملہ حقائق منکشف ہو جائیں گے کہ آغاز کیا ہے اور اختتام کیا ہے؟ وجود کی ماہیت کیا ہے؟ موت کی حقیقت کیا ہے؟ خیر کی حقیقت کیا ہے؟ شر کی حقیقت کیا ہے؟ علم کسے کہتے ہیں؟ مجازات ومکافات کیوں ضروری ہیں؟ یہ ساری چیزیں انسان کو معلوم ہو جائیں گی اگر وہ اللہ کو جان لے اور اس کو پہچان لے۔ جس طرح ہماری بصارتِ ظاہری کے لیے نورِ خارجی ضروری ہے' اسی طرح بصیرتِ باطنی کے لیے نورِ معنوی ضروری ہے' جو عبارت ہے معرفتِ خداوندی یا ایمان باللہ سے۔

پہلی تمثیل: ''مَثَلُ نُوْرِهٖ'' کا مفہوم!

اب آگے چلیے! ارشاد فرمایا: ﴿مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ؕ﴾ ''اس کی روشنی کی مثال ایسے ہے جیسے ایک طاق ہو' اس میں ایک چراغ ہو''۔ یہاں جو ''نُوْرِهٖ'' (اس کی روشنی) کے الفاظ آئے ہیں ان کی تفسیر میں مختلف اقوال ملتے ہیں۔ متکلمین کی اکثریت نے اسے نورِ ہدایت قرار دیا ہے کہ یہ تمثیل نورِ ہدایت کے لیے ہے۔ بعض حضرات کی رائے ہے کہ یہاں نور سے مراد قرآن ہے' کیونکہ خود اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں متعدد مقامات پر قرآن کو ''نور'' سے تعبیر کیا ہے۔ ایک رائے یہ بھی ملتی ہے کہ یہاں نور سے مراد ہیں حضرت محمدٌ رسول اللہ ﷺ' اس لیے کہ آپ ﷺ کے بارے میں سورۃ الاحزاب کی آیت ۴۶ میں واضح طور پر فرمایا گیا کہ آپ ﷺ ایک روشن چراغ ہیں۔ ویسے ہم تینوں کو جمع کر لیں تو بھی کوئی حرج نہیں۔ اس لیے کہ ہدایت' قرآن اور رسول اللہ ﷺ مل کر ایک وحدت بن جاتے ہیں' جیسے سورۃ البیّنۃ میں ارشاد فرمایا:

﴿لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ مُنْفَكِّيْنَ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ ۙ﴾

''یہ سارے اہل کتاب اور یہ سارے مشرکین (اپنے کفر اور شرک سے) باز آنے والے نہ تھے جب تک کہ ان کے پاس ''بینہ'' نہ آ جاتی''۔

آ گے فرمایا کہ وہ ''البیّنة'' کیا ہے:

﴿رَسُوۡلٌ مِّنَ اللّٰہِ یَتۡلُوۡا صُحُفًا مُّطَہَّرَۃً ۙ﴿۲﴾ فِیۡہَا کُتُبٌ قَیِّمَۃٌ ؕ﴿۳﴾﴾

''ایک رسول' اللہ کی طرف سے جو پاک صحیفے پڑھ کر سناتا ہے' جن میں بالکل راست اور درست باتیں لکھی ہوئی ہیں''۔

گویا رسولِ خدا اور صحیفۂ خداوندی مل کر ایک وحدت بنتے ہیں اور اس طرح ''بیّنہ'' وجود میں آتی ہے' اور یہ ہے اللہ کی روشن دلیل' اللہ کی حجت' اللہ کی برہان۔

''مَثَلُ نُوۡرِہٖ'' کے ضمن میں دو صحابہؓ کی رائے بھی نہایت قابلِ غور ہے۔ یہ دونوں صحابہؓ وہ ہیں جن کی قرآن فہمی کے ضمن میں نبی اکرم ﷺ نے خصوصی فضیلت بیان فرمائی ہے۔ ان میں سے ایک ہیں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور دوسرے ہیں حضرت اُبی ابن کعب رضی اللہ عنہ۔ حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہاں ''مَثَلُ نُوۡرِہٖ'' سے مراد ہے ''مَثَلُ نُوۡرِ مَنۡ آمَنَ'' (مثال اس کے نور کی جو ایمان لایا) یعنی جو ایمان لے آئے اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نور عطا ہوتا ہے' اُس نور کی مثال یہاں بیان ہو رہی ہے۔ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہاں ''مَثَلُ نُوۡرِہٖ'' سے مراد ہے ''مَثَلُ نُوۡرِہٖ فِیۡ قَلۡبِ الۡمُؤۡمِنِ'' (اس کے نور کی مثال جو مؤمن کے قلب میں ہوتا ہے) گویا کہ یہاں مراد ہے نورِ ایمان۔ اس لیے کہ ہر شخص جانتا ہے کہ ایمانِ حقیقی کے نور کا محل و مقام قلب ہے۔ جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ الحجرات میں ایک جانب صحابہ کرامؓ کے بارے میں فرمایا کہ: ﴿وَلٰـکِنَّ اللّٰہَ حَبَّبَ اِلَیۡکُمُ الۡاِیۡمَانَ وَزَیَّنَہٗ فِیۡ قُلُوۡبِکُمۡ﴾ (آیت ۷) ''لیکن اللہ نے ایمان کو تمہاری محبوب ترین متاع بنا دیا ہے اور اسے تمہارے دلوں میں کھپا دیا ہے''۔ اور کچھ دوسرے لوگوں کے بارے میں فرمایا کہ: ﴿وَلَمَّا یَدۡخُلِ الۡاِیۡمَانُ فِیۡ قُلُوۡبِکُمۡ ؕ﴾ (آیت ۱۴) ''اور ابھی تک ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا''۔

قلبِ مؤمن میں جو نورِ ایمان پیدا ہوتا ہے آ گے اس کی تمثیل بیان کی گئی ہے کہ جیسے ایک طاق ہے۔ اب ذرا آپ غور کیجیے اور اپنے جسم کی ہڈیوں کے پنجر کو اپنے تصور میں لائیے تو سینے کی جو ہڈیاں اور پسلیاں ہیں وہ بالکل ایک طاق کے مانند ہیں۔ ''ڈایافرام'' جو ہمارے سینے کو معدے وغیرہ سے جدا کرتا ہے وہ اس کا فرش ہے اور اس پر قلب رکھا ہوا ہے۔ جب یہ قلب ایمان سے منور ہو جاتا ہے تو اب یہ ایک روشن چراغ کے مانند ہے کہ: ﴿کَمِشۡکٰوۃٍ فِیۡہَا مِصۡبَاحٌ ؕ﴾ ''جیسے ایک طاق ہو

(اور) اس میں ایک چراغ رکھا ہو''۔ ﴿اَلۡمِصۡبَاحُ فِیۡ زُجَاجَةٍ ؕ﴾ ''یہ چراغ ایک شیشے (فانوس) میں ہو''۔ ہم سب کا تجربہ ہے کہ اگر چراغ شیشے (فانوس) یا کسی قندیل میں نہ ہو تو چراغ کی لو ہوا سے اِدھر اُدھر منتشر ہوتی رہتی ہے۔ جب چراغ شیشے (فانوس) یا قندیل میں ہوتا ہے تو لو ایک مرکز پر مرتکز اور ایک جگہ قائم رہتی ہے جس سے روشنی بالکل یکساں اور ہموار طور پر اپنے ماحول میں سرایت کرتی ہے۔

اب آگے اس تمثیل کی اصل فصاحت و بلاغت آ رہی ہے:

﴿اَلزُّجَاجَةُ کَاَنَّهَا کَوۡکَبٌ دُرِّیٌّ یُّوۡقَدُ مِنۡ شَجَرَةٍ مُّبٰرَکَةٍ زَیۡتُوۡنَةٍ لَّا شَرۡقِیَّةٍ وَّلَا غَرۡبِیَّةٍ ۙ یَّکَادُ زَیۡتُهَا یُضِیۡٓءُ وَلَوۡ لَمۡ تَمۡسَسۡهُ نَارٌ ؕ﴾

''فانوس کی کیفیت یہ ہو جیسے چمکتا اور جگمگاتا ستارا' وہ چراغ جلتا ہوا ایک ایسے بابرکت زیتون کے درخت (کے تیل) سے جو نہ شرقی ہو نہ غربی' جس کا روغن آپ سے آپ بھڑک اٹھنے کے لیے تیار ہو' چاہے اسے آگ نے چھوا تک نہ ہو''۔

اس زیتون کے درخت کے متعلق حبر الاُمّہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ اس سے زیتون کا ایسا درخت مراد ہے جو کسی پہاڑی کی چوٹی پر ہے یا کسی میدان میں یک و تنہا کھڑا ہے۔ ایسے درخت پر صبح سے لے کر شام تک مسلسل دھوپ پڑتی ہے' گویا سورج کی حرارت و تمازت اثر انداز ہوتی ہے۔ اس کے برعکس اگر درختوں کا کوئی جھنڈ ہو تو اگر اس کے شرقی گوشے میں کوئی درخت ہوگا تو شام کی دھوپ اس کو نہیں ملے گی اور اگر غربی گوشے میں ہوگا تو صبح کی دھوپ سے محروم رہے گا۔ یہ ہے مفہوم ''لَا شَرۡقِیَّةٍ وَّلَا غَرۡبِیَّةٍ'' کا۔ حضرت ابن عباسؓ مزید فرماتے ہیں کہ ایسے درخت کے پھل کا تیل نہایت صاف و شفاف ہوتا ہے اور اس میں روشن ہونے کی استعداد بدرجۂ تمام و کمال موجود ہوتی ہے۔ آیت کے اس حصے میں زیتون کے اس درخت کے روغن کی یہ خصوصیت و کیفیت بیان ہوئی ہے کہ وہ اتنا صاف و شفاف ہے کہ بھڑکنے اور مشتعل ہونے کے لیے بے تاب ہے' مچل رہا ہے' چاہے اسے آگ نے چھوا تک نہ ہو۔ جدید دَور میں اگر ہم اس کی مثال دیں تو وہ پٹرول ہے۔ مٹی کے تیل سے بھی دِیا جلایا جاتا ہے' لیمپ اور لالٹین روشن کی جاتی ہے' سرسوں کے تیل سے بھی دِیا جلا لیا جاتا ہے' لیکن ان سب کے لیے بڑے جتن کرنے پڑتے ہیں۔ اس کے لیے بتی چاہیے' کپڑا چاہیے' تب وہ جلے گا۔ اس کو براہِ راست دیا سلائی دکھائیں تو وہ نہیں جلے گا۔ اس کے برعکس پٹرول کا معاملہ ہے کہ

دِیا سلائی اس سے ابھی دُور ہے' قریب بھی نہیں آئی' لیکن پٹرول خود آگے بڑھ کر آگ کو پکڑنے اور بھڑک اٹھنے کے لیے بے تاب ہے۔ گویا یہاں ع ''نغمے بے تاب ہیں تاروں سے نکلنے کے لیے!'' والا انداز ہے۔

نورِ فطرت اور نورِ وحی کا امتزاج

پس اسی روغن سے درحقیقت ایک سلیم الفطرت انسان کی مثال دی گئی ہے جس نے اپنی انسانیت کے جوہر اور اپنی فطرت کی سلامتی کو محفوظ رکھا' اس میں کثافتیں نہیں آنے دیں۔ چنانچہ اس میں نہ خواہشات وشہوات کی آلودگی پیدا ہونے دی اور نہ جاہلی عصبیتوں کے حجاب طاری ہونے دیے' بلکہ وہ اپنی اصل حقیقت پر سلامتیٔ طبع اور سلامتیٔ فطرت کے ساتھ قائم و برقرار رہا۔ ایسے سلیم الطبع انسان کی فطرت کا یہ صاف و شفاف روغن بھڑک اٹھنے کو تیار رہتا ہے۔ اور اگر نورِ وحی ذرا اس کے قریب آ جائے تو اس کا باطن جگمگا اٹھتا ہے۔ جیسے السّابقون الاوّلون صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے قلوب نورِ وحی سے فی الفور جگمگا اٹھے تھے اور ان کی فطرتِ سلیمہ نے فوراً تصدیق کر دی تھی کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے نبی و رسول ہیں۔

درحقیقت یہ مثال ان صدّیقین کے ایمان کی ہے کہ جو خود بے تاب ہوتے ہیں کہ جیسے ہی توحید و رسالت کی دعوت سامنے آئے اسے آگے بڑھ کر فی الفور قبول کر لیں۔ جیسے ہم نے مطالعۂ قرآن حکیم کے منتخب نصاب کے درس ششم کے ضمن میں سورۂ آل عمران کے آخری رکوع کی اس آیت کا بھی مطالعہ کیا تھا:

﴿رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا﴾ (آیت ۱۹۳)

''اے ہمارے ربّ! یقیناً ہم نے سنا ایک پکارنے والے (کی پکار) کو کہ دعوت دے رہا ہے ایمان کی کہ ایمان لاؤ اپنے پروردگار پر' پس ہم ایمان لے آئے''۔

گویا یہ ہے وہ نورِ ایمان جس کے اجزائے ترکیبی دو ہیں' ایک نورِ فطرت اور دوسرا نورِ وحی۔ اسی حقیقت کو اِس آیت میں آگے ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: ﴿نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ﴾ ''نور پر نور''۔ دو انوار سے مرکب ہو کر وہ نورِ ایمان وجود میں آتا ہے جس سے اوّلاً انسان کا قلب منور ہوتا ہے اور ایک روشن چراغ کی صورت اختیار کر لیتا ہے' پھر وہ طاق منور ہوتا ہے یعنی پورا سینہ روشن ہو جاتا ہے' جس کی جانب اشارہ ہے: ﴿اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ۝﴾ کے الفاظِ مبارکہ میں' پھر اِن انوار سے انسان کا

پورا وجود اور اس کی پوری شخصیت منور ہو جاتی ہے اور ایسے انسان کا وجود اپنی ذات میں خلقِ خدا کے لیے نورِ ہدایت بن جاتا ہے۔ چنانچہ اسی عمل کا بدرجۂ تمام وکمال ظہور ہوا ذاتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں کہ وہ مجسم نورِ ہدایت اور قرآن مجید کے الفاظ میں ''سِرَاجًا مُّنِیْرًا'' بن گئے۔

خلاصۂ کلام یہ واضح ہوا کہ ایمان درحقیقت ایک نور ہے جو دو انوار سے مرکب ہے' ایک نورِ فطرت اور دوسرا نورِ وحی۔ ان دونوں کے امتزاج سے جو ''نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ'' وجود میں آتا ہے اس کا محل ومقام ہے قلبِ انسانی۔ اور ظاہر بات ہے کہ جب انسان کا باطن اس نورِ ایمان سے منور ہو جائے گا تو اس کے آثار ونتائج ظاہر ہوں گے انسان کے رویے اور طرزِ عمل میں' اس کے اخلاق وکردار میں اور اس کی دلچسپیوں' امنگوں اور مشاغل میں۔ چنانچہ اس درس کی اگلی دو آیات (۳۶'۳۷) میں نورِ ایمان کے ان ہی آثار ومظاہر کا بیان ہے۔

ایمانِ حقیقی کے عملی مظاہر

ایمانِ حقیقی کے اِن عملی مظاہر کا ایک رُخ وہ ہے جس کی ایک جھلک درس ششم کے ضمن میں سورۂ آل عمران کی آیت ۱۹۵ میں دکھائی جا چکی ہے' یعنی ایثار وقربانی' صبر ومصابرت' ثبات واستقلال' ہجرت وشہادت اور جہاد وقتال فی سبیل اللہ —— اور دوسرا رُخ وہ ہے جو سورۃ النور کی آیات ۳۶ تا ۳۸ میں سامنے آتا ہے اور ذکر ومناجات' تضرّع واخبات' خوف وخشیت اور اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ پر مشتمل ہے۔ ان آیاتِ مبارکہ کا ترجمہ حسبِ ذیل ہے:

> ''(نورِ ایمان کی جلوہ گاہیں) اُن گھروں میں جن کے بارے میں اللہ نے حکم دیا ہے کہ ان کو بلند کیا جائے اور ان میں اس کے نام کی مالا جپی جائے۔ ان میں ایسے جواں مرد صبح کے وقت بھی اور شام کے اوقات میں بھی اللہ کی تسبیح کرتے ہیں' جنہیں کوئی کاروبار اور خرید وفروخت اللہ کی یاد اور نماز کے قیام اور زکوٰۃ کی ادائیگی سے غافل نہیں کر پاتی۔ (اور اس سب کے باوجود) وہ ایک ایسے دن (کے تصور) سے لرزاں وترساں رہتے ہیں جس میں دل اور نگاہیں سب الٹ جائیں گے۔ نتیجتاً اللہ انہیں ان کے اعمال کا بہترین بدلہ دے گا اور انہیں اپنے فضل سے مزید نوازے گا۔ اور اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب دیتا ہے!''

ان آیات میں پہلی بات تو یہ سامنے آئی کہ اس روئے ارضی پر خارجی اعتبار سے اس نورِ ایمانی کے سب سے بڑے مراکز مسجدیں ہیں۔ یہ اللہ کے وہ گھر ہیں جن میں اہلِ ایمان ہر روز پانچ مرتبہ جمع ہوتے ہیں۔ نورِ ایمان کا یہ ارتکاز اُن گھروں میں ہوتا ہے جن کے بارے میں اللہ نے حکم دیا ہے کہ

انہیں بلند کیا جائے' یعنی ان کا ادب اور تعظیم کی جائے اور اس میں اس کا نام لیا جائے' یعنی اس کے نام کی مالا جپی جائے۔ آیت کے اس حصے کے بارے میں حضرت عبداللہ بن عباس ؓ کا ایک بہت ہی عمدہ اور پیارا قول ہمیں ملتا ہے' وہ فرماتے ہیں: **اَلْمَسَاجِدُ بیوتُ اللّٰہِ فی الارض' وھی تضیءُ لاھلِ السماءِ کما تضیءُ النّجومُ لاھلِ الارض** ''مسجدیں زمین پر اللہ کے گھر ہیں اور وہ آسمان والوں کو اسی طرح چمکتی نظر آتی ہیں جیسے زمین والوں کو ستارے چمکتے نظر آتے ہیں''۔ حضرت ابن عباسؓ کے اس قول سے یہ بھی ظاہر ہے کہ اس نورِ ایمان کے' جس کا ذکر پہلی آیت میں ہوا تھا' سب سے بڑے مراکز اللہ کے یہ گھر ہیں' اور جن لوگوں کے دلوں میں وہ نورِ ایمان پیدا ہو جاتا ہے بلاشبہ ان کے قلبی اطمینان اور دلچسپیوں کا سب سے بڑا مرکز یہ مسجدیں ہی ہوتی ہیں۔ چنانچہ ایک حدیث میں نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ سات قسم کے اشخاص وہ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ حشر کے میدان میں خاص اپنے عرش کے سائے تلے جگہ دے گا' جبکہ کسی کو بھی کہیں سایہ میسر نہیں ہوگا۔ ان میں ایک قسم کے لوگ وہ بھی ہوں گے جن کے متعلق حضور ﷺ نے فرمایا: **((وَرَجُلٌ قَلْبُهُ مُعَلَّقٌ فِی الْمَسَاجِدِ))**(۱) ''اور وہ شخص جس کا دل مسجدوں میں اٹکا ہوا ہوتا ہے''۔ ایسا شخص مسجد سے مجبوراً باہر نکلتا ہے' کیونکہ اس کے گھر بار کی مصروفیات بھی ہیں' کاروبار کی ضروریات بھی ہیں اور دیگر حوائج ضروریہ بھی ہیں' لیکن مسجد کے باہر اس کی کیفیت ایسی ہوتی ہے جیسے مچھلی کو پانی سے نکال لیا گیا ہو۔ گویا وہ ایک ضرورت اور مجبوری کے تحت مسجد سے نکلتا ہے' ورنہ اس کا دل مسجد میں اٹکا رہتا ہے' اور وہ منتظر رہتا ہے کہ جیسے ہی پھر اذان کی آواز آئے وہ فوراً لپک کر مسجد کی طرف روانہ ہو جائے۔

یہاں بلند کرنے کا مفہوم کیا ہے؟ اس کے متعلق ایک رائے تو یہ ہے کہ اس کا مفہوم مجرد تعمیر کرنا ہے۔ تعمیر کے لیے بھی کنایتاً لفظ ''رفع'' قرآن مجید میں استعمال ہوا ہے۔ جیسے سورۃ البقرۃ میں آیا ہے:

﴿وَاِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰھٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَاِسْمٰعِیْلُ ؕ﴾ (البقرۃ:۱۳۷)

''اور (یاد کرو) جب اٹھا رہے تھے ابراہیم علیہ السلام خانہ کعبہ کی بنیادیں اور (ان کے ساتھ) اسمٰعیل علیہ السلام بھی''۔

ایک رائے یہ ہے کہ اس سے مراد مساجد کی تعظیم واحترام ہے' یعنی مسجد کو ہر نوع کی گندگی اور نجاست سے بھی پاک صاف رکھنا اور ہر قسم کے لغو کاموں اور لغو گفتگو سے بھی محفوظ رکھنا۔ یہ تو ہے ظاہری تعظیم و

(۱) صحیح البخاری' کتاب الاذان' باب من جلس فی المسجد ینتظر الصلاۃ ...... وصحیح مسلم' کتاب الزکاۃ' باب فضل اخفاء الصدقۃ۔

احترام۔ جیسا کہ بیت الحرام کے متعلق اسی سورۃ البقرۃ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَعَهِدْنَا اِلٰى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِىَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿۱۲۵﴾﴾

''اور ہم نے ابراہیم اور اسمٰعیل (علیہما السلام) سے یہ عہد لیا تھا کہ وہ میرے گھر کو پاک صاف رکھیں گے طواف کرنے والوں کے لیے اور اعتکاف کرنے والوں کے لیے اور وہاں رکوع و سجود (نماز) کے لیے آنے والوں کے لیے''۔

اس کے ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ مسجدیں نجاستِ معنوی یعنی شرک اور بدعت سے بھی پاک ہوں۔ از روئے الفاظِ قرآنی:

﴿وَاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا ﴿۱۸﴾﴾ (الجنّ)

''اور یقیناً مساجد صرف اللہ ہی کے لیے ہیں' پس اس کے ساتھ کسی اور کو مت پکارو''۔

مزید برآں الفاظ کے ظاہر سے یہ بھی متبادر اور مترشح ہوتا ہے کہ مسجد کی تعمیر بلند رکھی جائے تاکہ وہ دُور سے نظر آئے' اسے بستی میں نمایاں مقام حاصل ہو اور وہ اس بستی کا مرکز معلوم ہو۔ عربی بڑی فصیح و بلیغ زبان ہے۔ اس کے اکثر الفاظ معانی و مفاہیم کا گنجینہ ہوتے ہیں' لہٰذا میری رائے یہ ہے کہ یہاں ''تُرْفَعَ'' میں یہ تینوں مفاہیم شامل ہیں۔

آگے بڑھنے سے قبل ابھی اس آیۂ کریمہ (۳۶) کے پہلے حصہ پر ہی اپنی توجہات کو مرکوز کیجیے۔ فرمایا:

﴿فِىْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ......﴾

''ان گھروں میں کہ جن کے بارے میں اللہ نے حکم دیا ہے کہ انہیں بلند کیا جائے اور ان میں اس کے نام کا ذکر کیا جائے......''

یہاں ہمارے دین کی ایک جامع اصطلاح ''ذکر'' کا بیان ہوا ہے۔ اس اصطلاح میں ہر نوع کا ذکر آ گیا ہے۔ نماز خود ایک ذکر ہے۔ سورۂ طٰہٰ میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِىْ ﴿۱۴﴾﴾ ''نماز قائم کرو میرے ذکر (میری یاد) کے لیے''۔ جبکہ سورۃ الحجر میں فرمایا: ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴿۹﴾﴾ ''یقیناً ہم نے اتارا ہے یہ ''الذکر'' (یعنی قرآن مجید) اور بے شک ہم ہی اس کے محافظ (اور نگہبان) ہیں''۔ سورۂ ھود میں فرمایا:

﴿وَجَآءَكَ فِىْ هٰذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَّذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۲۰﴾﴾

''اور آیا (اے نبیؐ!) آپ کے پاس اس (قرآن) میں بلاشبہ 'الحق' اور نصیحت اور یاددہانی اہل ایمان کے لیے''۔

گویا خود قرآن حکیم ذکرِ کامل بھی ہے اور ذکرِ مجسم بھی۔ ایک بڑی پیاری حدیث ہے جس میں نبی اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا:

((مَا اجْتَمَعَ قَوْمٌ فِیْ بَیْتٍ مِنْ بُیُوْتِ اللّٰہِ یَتْلُوْنَ کِتَابَ اللّٰہِ وَیَتَدَارَسُوْنَہُ بَیْنَھُمْ اِلاَّ نَزَلَتْ عَلَیْھِمُ السَّکِیْنَۃُ وَغَشِیَتْھُمُ الرَّحْمَۃُ وَحَفَّتْھُمُ الْمَلَائِکَۃُ وَذَکَرَھُمُ اللّٰہُ فِیْمَنْ عِنْدَہٗ)) (۱)

''جب بھی کبھی کچھ لوگ اللہ کے گھروں میں سے کسی گھر میں جمع ہوتے ہیں' اللہ کی کتاب کی تلاوت اور اس کے درس وتدریس (اور افہام وتفہیم) کے لیے تو اُن پر سکینت کا نزول ہوتا ہے' رحمتِ الٰہی ان کو اپنے سائے میں لے لیتی ہے' فرشتے ان کے گرد گھیرا ڈال لیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کا ملأ اعلیٰ (یعنی ملائکۃ المقربین) کی محفل میں ذکر فرماتا ہے (کہ اِس وقت میرے کچھ بندے میرے گھر میں صرف میری کتاب کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے جمع ہوئے ہیں)۔''

ان گھروں کے بارے میں جنہیں اللہ نے بلند کرنے اور ان میں اپنے نام کا ذکر کرنے کا حکم دیا ہے' آگے ارشاد ہوتا ہے: ﴿یُسَبِّحُ لَہٗ فِیْھَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ﴿۳۶﴾﴾ ''ان گھروں میں صبح کے وقت اور شام کے اوقات میں اُس کی تسبیح کرتے ہیں''۔

یہاں صبح کے وقت کے لیے لفظ ''غُدُوّ'' آیا ہے۔ ''غُدُوّ'' مصدر ہے' اس کی جمع نہیں ہوتی' قرآن مجید میں یہ لفظ ہمیشہ واحد آتا ہے۔ آصَال' اَصِیل کی جمع الجمع ہے ''اَصِیل'' کی جمع ''اُصُل'' اور اس کی جمع ''آصَال'' ہے۔ ان دو الفاظ ''غُدُوّ'' اور ''آصَال'' میں اشارہ ہے اس طرف کہ صبح کے وقت تو فرض نماز ایک ہی ہے' لیکن شام کے اوقات میں یعنی سورج کے ذرا ڈھلنے کے بعد سے رات کے تاریک ہونے تک چار فرض نمازیں ہیں' جن کا سلسلہ ظہر کی نماز سے شروع ہو کر عشاء کی نماز پر ختم ہوتا ہے۔ اسی کی طرف سورۂ بنی اسراءیل کی اس آیت مبارکہ میں اشارہ ہے:

﴿اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْکِ الشَّمْسِ اِلٰی غَسَقِ الَّیْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ ط﴾ (آیت ۷۸)

''نماز کو قائم رکھو سورج کے ذرا ڈھلنے کے بعد سے لے کر رات کے تاریک ہونے تک' اور فجر

(۱) صحیح مسلم' کتاب الذکر والدعاء والتوبۃ والاستغفار' باب فضل الاجتماع علی تلاوۃ القرآن والذکر

کے وقت قرآن مجید کا پڑھنا''۔

"لدلوك الشمس الى غسق الليل''اس میں ظہر سے عشاء تک کی چار فرض نمازیں آ گئیں اور "قُرْاٰنَ الْفَجْرِ" سے مراد صلوٰۃ الفجر ہے۔اس طرح پانچ فرض نمازوں کا ذکر ہو گیا۔

دُنیوی مصروفیات میں اہل ایمان کا طرزِ عمل

اب ذرا دیکھئے' یہ کن لوگوں کا ذکر ہے؟ اور ان تسبیح وتحمید میں مشغول لوگوں کی اصل شان کیا ہے؟ فرمایا:

﴿رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ﴾

''وہ (جواں ہمت) لوگ جنہیں غافل نہیں کر سکتی کوئی تجارت اور نہ کوئی خرید وفروخت اللہ کے ذکر سے اور نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے سے''۔

پہلے تو یہ سمجھ لیجیے کہ یہاں ''رِجَال'' سے مراد صرف مرد ہی نہیں ہیں بلکہ اس میں خواتین بھی شامل ہیں اور یہاں یہ لفظ کنایہ کے طور پر آیا ہے' اور اس سے مراد ہیں باہمت مَردوزَن۔اس لیے کہ اس دنیا میں ایک بندۂ مؤمن کے لیے نمعلوم کتنے دباؤ' کتنے موانع' کتنی تحریضات اور کتنی ترغیبات ہیں جن سے اسے مقابلہ کرنا پڑتا ہے' اور اگر وہ اللہ کے ساتھ لو لگائے رکھنا چاہتا ہے تو اسے نہایت شدید اور چومکھی کشمکش سے سابقہ پیش آتا ہے۔لہٰذا اللہ کی یاد سے غافل نہ ہونے کے لیے بڑی مضبوط قوتِ ارادی کی ضرورت ہے' ورنہ کہیں تجارت انسان کو غافل کر دے گی اور کہیں کوئی نفع بخش سودا اپنے اندر ''گُم'' کر لے گا۔اس لفظِ ''گُم'' سے بے اختیار ذہن علامہ اقبال کے اس شعر کی طرف منتقل ہوتا ہے کہ: ؎

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گُم ہے
مؤمن کی یہ پہچان کہ گُم اس میں ہیں آفاق!

ایک خدا ناآشنا انسان دُنیوی مصروفیتوں اور دلچسپیوں میں گم ہو جاتا ہے' لیکن جن لوگوں کا قلب نورِ فطرت اور نورِ وحی سے منور ہو جاتا ہے اور وہ اللہ پر حقیقتاً اور واقعتاً ایمان لے آتے ہیں تو اُن کی جو کیفیت ہوتی ہے اسے ان الفاظِ مبارکہ میں بیان کیا گیا ہے:''ان (باہمت) لوگوں کو غافل نہیں کر پاتی کوئی تجارت اور نہ کوئی خرید وفروخت اللہ کی یاد سے اور نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے سے''۔ یہاں ''تجارت'' عام ہے اور ''بیع'' خاص ہے۔یہ عَطفُ الخاص علی العام کی ایک مثال ہے۔

ویسے بھی بیع میں فوری طور پر کوئی منفعت پیشِ نظر ہوتی ہے' جبکہ تجارت ایک وسیع تر اصطلاح ہے اور اس کا سلسلہ پھیلا ہوا ہوتا ہے اور اس میں غیر محسوس طور پر اونچ نیچ ہوتی رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں مضمون کی مناسبت سے تجارت پر بیع کا عطف کیا گیا ہے' اس لیے کہ جب کوئی سودا ہو رہا ہوتا ہے تو انسان محسوس کرتا ہے کہ اس سودے میں مجھے فوری طور پر کتنا نفع حاصل ہونے کی توقع ہے۔ لہٰذا یہ وسوسہ دل میں پیدا ہونا کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے کہ اگر اذان کی آواز آ گئی ہے تو کیا ہوا؟ ذرا یہ سودا پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے تو مسجد کی جانب روانہ ہو جاؤں گا اور اگر جماعت چلی بھی جائے تو میں علیحدہ نماز پڑھ لوں گا' لیکن اِس وقت یہ سودا چھوڑ نا گھاٹے کا معاملہ ہو جائے گا۔ لیکن ان باہمت لوگوں کا جن کے قلوب نورِ فطرت اور نورِ وحی سے روشن ہوتے ہیں' حال یہ ہوتا ہے کہ ان کو یہ بات اللہ کی یاد سے غافل نہیں کر پاتی۔ اس موقع پر سورۃ المنٰفقون کے دوسرے رکوع کی پہلی آیت ذہن میں لایئے جس میں فرمایا گیا کہ:

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْھِکُمْ اَمْوَالُکُمْ وَلَآ اَوْلَادُکُمْ عَنْ ذِکْرِ اللّٰہِ ۚ وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۹﴾﴾

''اے اہل ایمان! تمہیں تمہارا مال اور تمہاری اولاد اللہ کی یاد سے غافل نہ کرنے پائیں' اور جو کوئی یہ طرزِ عمل اختیار کرے گا تو یقیناً وہی خسارے میں رہنے والے ہیں''۔

اگر ان میں منہمک اور مشغول ہو کر اللہ کی یاد سے غافل ہو گئے تو جان لو کہ یہ بڑے خسارے کا سودا ہے۔ ان باہمت لوگوں کو کوئی تجارت اور خرید وفروخت نہ ذکرِ الٰہی سے غافل کر سکتی ہے نہ ہی نماز قائم رکھنے اور زکوٰۃ ادا کرنے سے روک سکتی ہے۔ گویا نہ انسان دُنیوی مصروفیات میں اتنا گم ہو جائے کہ اقامتِ صلوٰۃ کا اہتمام نہ رہے اور نہ مال کی محبت اس پر اتنی غالب آ جائے کہ زکوٰۃ ادا کرنی بھی دوبھر نظر آنے لگے۔ واضح رہے کہ زکوٰۃ تو اصلاً قلب ونفس پر سے مال کی محبت کی گرہ کھولنے کا ذریعہ ہے' ورنہ تزکیۂ نفس کے لیے تو نہ صرف یہ کہ ہر سال نصاب کے مطابق زکوٰۃ دینی لازم ہے بلکہ زکوٰۃ کے علاوہ بھی ابنائے نوع کی حاجت روائی اور مشکلات رفع کرنے کے لیے صدقاتِ نافلہ کا اہتمام لازم ہے۔ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((اِنَّ فِی الْمَالِ حَقًّا سِوَی الزَّکٰوۃِ)) (۱) ''بلاشبہ تمہارے مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی مستحقین کا حق ہے''۔ اور بطورِ استشہاد آپ ﷺ نے آیتِ برّ (سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۷۷) کا حوالہ دیا' جس کا مطالعہ ہم کر چکے ہیں۔ یعنی:

(۱) سنن الترمذی' ابواب الزکاۃ' باب ان فی المال حق سوی الزکاۃ۔

﴿...... وَاٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّہٖ ذَوِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ وَالسَّآئِلِیْنَ وَفِی الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوۃَ وَاٰتَی الزَّکٰوۃَ ۚ﴾

’’......اور (حقیقی نیکی اس کی ہے) جس نے دیا مال اس کی محبت کے علی الرغم قرابت داروں کو اور یتیموں کو اور مسکینوں کو اور مسافروں کو اور سائلوں کو اور گردنوں کے چھڑانے میں‘ اور قائم کی نماز اور ادا کی زکوٰۃ۔‘‘

آ گے فرمایا کہ مساجد سے اتنی محبت اور ذکر و شغل کے دوام اور صلوٰۃ و زکوٰۃ کے التزام کے باوصف ان باہمت لوگوں کا معاملہ یہ نہیں ہوتا کہ ان میں اپنی دین داری کا کوئی تکبر‘ کوئی عُجب‘ کوئی پندار اور کوئی گھمنڈ پیدا ہو جائے‘ بلکہ ان تمام حسنات اور اعمالِ صالحہ کے اہتمام کے باوجود ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ: ﴿یَخَافُوْنَ یَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِیْہِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ ﴿۳۷﴾﴾ ’’وہ اُس دن سے ڈرتے رہتے ہیں جس میں الٹ جائیں گے دل اور آنکھیں۔‘‘ یعنی وہ لرزہ براندام رہتے ہیں‘ کانپتے رہتے ہیں‘ لرزاں و ترساں رہتے ہیں اس دن کے خیال سے جس کی ہولناکی کا عالم یہ ہے کہ اُس دن دل الٹ جائیں گے اور آنکھیں پتھرا جائیں گی۔ یہ کنایہ اور استعارہ ہے قیامت کی ہیبت اور اس کے شدائد و مصائب کے لیے۔ وہ دن جس کے لیے سورۃ المزمل میں فرمایا: ﴿یَوْمًا یَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِیْبَا ﴿۱۷﴾﴾ ’’وہ دن کہ جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا‘‘۔ یہ باہمت لوگ اللہ سے لو لگانے اور ہر دم اس کی یاد کا التزام کرنے کے باوجود اُس دن کے تصور سے لرزاں و ترساں رہتے ہیں جس دن ہر ابن آدم عدالتِ خداوندی میں محاسبہ کے لیے کھڑا ہو گا۔

آ گے فرمایا: ﴿لِیَجْزِیَھُمُ اللّٰہُ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا﴾ ’’تا کہ اللہ تعالیٰ ان کو جزا دے ان کے بہترین اعمال کی‘‘۔ یہاں ابتدا میں جو حرفِ جار ’’لام‘‘ آیا ہے اسے لامِ عاقبت کہا جاتا ہے۔ گویا کہنا یہ مقصود ہے کہ اصحابِ ایمان و یقین کی ان کیفیات کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ اللہ تعالیٰ ان کو بہترین جزا دے گا۔ قرآن حکیم کے اکثر مترجمین نے ’’اَحْسَنَ‘‘ کی نسبت ’’جَزَاء‘‘ سے قائم کی ہے‘ یعنی اللہ انہیں ان کے اعمال کی بہت عمدہ‘ اعلیٰ اور احسن جزا دے گا۔ لیکن ایک رائے یہ بھی ہے کہ ’’اَحْسَنَ‘‘ کا تعلق ’’مَا عَمِلُوْا‘‘ سے ہے‘ اس لیے کہ قرآن حکیم کے بعض دوسرے مقامات پر (جیسے سورۃ النحل کی آیات ۹۶ اور ۹۷) اعمالِ صالحہ کی اُخروی جزا کے ذکر میں ’’اَحْسَنَ‘‘ کے ساتھ حرفِ جار ’’ب‘‘ بھی آیا ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ اہل جنت کے اجر کا فیصلہ اور اُن کے مرتبہ و مقام کا تعین ان کے بہترین اعمال کی

مناسبت سے کرے گا' اس لیے کہ اچھے سے اچھے انسان کے بھی تمام اعمال برابر اور مساوی قدر و قیمت کے حامل نہیں ہوتے' ان میں کچھ نہ کچھ فرق و تفاوت ضرور ہوتا ہے۔ پھر یہ کہ ہر انسان سے کچھ نہ کچھ کوتاہیاں اور خطائیں بھی ضرور سرزد ہو جاتی ہیں۔ عربی کا مشہور مقولہ ہے: اَلْاِنْسَانُ مُرَكَّبٌ مِنَ الْخَطأِ وَالنِّسْيَانِ یعنی انسان دو چیزوں کا پتلا ہے' اس سے غلطی کا ارتکاب اور خطا کا صدور بھی ہو جاتا ہے اور بھول چوک تو اس کی جبلت اور خمیر ہی میں شامل ہے۔ لہٰذا اس کے معنی یہ ہیں کہ ان اعمال میں سے جو بہترین اور چوٹی کے اعمال ہوں گے ان کے اعتبار سے حساب لگایا جائے گا اور ان کی جزا ان کے اعلیٰ ترین اعمال کی مناسبت سے مترتب ہوگی۔ کم تر درجے کے اعمال نظر انداز کر دیے جائیں گے اور جو کوتاہیاں اور خطائیں ہوں گی انہیں اللہ تعالیٰ اپنی شانِ غفاری و رحیمی سے ان کے نامۂ اعمال میں سے حذف کر دے گا۔ گویا انہیں اپنی شانِ ستاری سے ڈھانپ لے گا۔ جیسا کہ ہم سورۂ آل عمران کے آخری رکوع کے مطالعے کے دوران دیکھ چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ﴾ ''میں لازماً ان کی برائیوں کو اُن سے دُور کر دوں گا''۔ جس میں یہ بات بھی شامل ہے کہ حیاتِ دُنیوی کے دوران ان کے دامنِ کردار کے داغ دھبے دھو دے گا اور ان کے نفوس کا تزکیہ فرما دے گا۔ اور یہ بھی کہ آخرت میں ان کے نامۂ اعمال کی سیاہی کو دھو دے گا جس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ: ﴿وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ﴾ ''اور میں لازماً ان کو ان باغات میں داخل کروں گا جن کے دامن میں ندیاں بہہ رہی ہوں گی''۔ یا جیسے سورۂ ھود میں یہ اصول بیان فرمایا: ﴿اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ۭ﴾ (آیت ۱۱۴) ''یقیناً بھلائیاں برائیوں کو محو کر دیتی ہیں''۔ لہٰذا ان باہمت لوگوں کا آخرت میں جو مقام اور مرتبہ معین ہوگا وہ ان کے اعلیٰ اور احسن اعمال کی نسبت و مناسبت اور اعتبار سے ہوگا۔

آگے بڑھنے سے پہلے یہ اصول سمجھ لیجیے کہ جیسے دنیا میں اُجرت محنت و مشقت کی نسبت سے ملتی ہے' اسی طرح آخرت میں اجر اور جزا کا معاملہ تو اعمالِ صالحہ کی مناسبت سے ہی ہوگا' خواہ اعلیٰ ترین اعمال ہی کی مناسبت سے ہو۔ اس پر مزید ہے وہ فضل جو اللہ تعالیٰ خاص اپنی طرف سے عنایت فرمائے گا۔ چنانچہ فرمایا: ﴿وَيَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۭ﴾ ''اور اللہ تعالیٰ ان کو اپنے فضل سے مزید عطا فرمائے گا''۔ واضح رہے کہ یہ فضل کسی محنت کا صلہ نہیں ہوتا' بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی خصوصی دین ہے' لہٰذا یہ کسی حساب کتاب کی پابند نہیں ہے' بلکہ یہ اللہ کی شانِ جود و سخا کا ظہور ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ

يَّشَآءُ بِغَيۡرِ حِسَابٍ﴿۳۸﴾ ''اور اللہ تعالیٰ عطا کرتا ہے جس کو چاہتا ہے بلاحدّ وحساب''۔ گویا اس کا فضل بلانہایت ہے اور اس کی کوئی حد نہیں ہے۔

اس مقام پر تھوڑا سا توقف فرما کر آج کے سبق کو گزشتہ سبق سے ملا کر ایک حقیقی بندۂ مؤمن یا بقول اقبال ''مردِ مؤمن'' کی شخصیت کا مکمل نقشہ اپنے ذہن میں قائم کر لیجیے۔ ہمارا درس ششم سورۂ آل عمران کے آخری رکوع کی ابتدائی چھ آیات پر مشتمل تھا۔ اس میں بھی ایمان کی ترکیب بیان ہوئی ہے کہ ایمان باللہ' ایمان بالآخرۃ اور پھر ایمان بالرسالت کیسے وجود میں آتا ہے۔ اس کے بعد ایک جامع آیت میں بندۂ مؤمن کے سیرت وکردار کی تصویر کے ایک رُخ کی حیثیت سے سامنے لایا گیا ہے وہ نقشہ جس کے خدّ وخال ہیں سعی وجہد' ایثار وقربانی' جہاد وقتال اور صبر ومصابرت۔ چنانچہ وہاں الفاظ ہیں:

﴿فَالَّذِيۡنَ هَاجَرُوۡا وَاُخۡرِجُوۡا مِنۡ دِيَارِهِمۡ وَاُوۡذُوۡا فِىۡ سَبِيۡلِىۡ وَقٰتَلُوۡا وَقُتِلُوۡا﴾

''پس جن لوگوں نے (میرے لیے) ہجرت کی اور اپنے گھروں سے نکالے گئے اور جنہیں میری راہ میں ایذائیں پہنچائی گئیں (تکلیفیں دی گئیں) اور جنہوں نے (میرے لیے) جہاد وقتال کیا اور (میری راہ میں) قتل کر دیے گئے۔''

یہ ہے بندۂ مؤمن کے سیرت وکردار کی تصویر کا ایک رُخ' یعنی جدوجہد' کوشش ومحنت' کشمکش و تصادم' صبر وثبات' ایثار وقربانی' جہاد وقتال حتیٰ کہ جان کا نذرانہ پیش کر دینا۔ اسی تصویر کا دوسرا رُخ مساجد کے ساتھ ایک قلبی اُنس' ذکرِ الٰہی کے دوام اور ان کے ساتھ ساتھ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ پر مشتمل ہے' اور اس میں ذوق وشوق' ذکر وشغل اور انابت واطاعت پر مستزاد سونے پر سہاگے کی مثال ہے خوف اور خشیتِ الٰہی' جس کی تفصیل اوپر بیان ہو چکی ہے۔

جس طرح ہم کہتے ہیں کہ تصویر کے دو رُخ ہوتے ہیں اور تصویر کا صحیح تصور اُن دونوں رُخوں ہی سے مکمل ہوتا ہے' اسی طرح اگر بندۂ مؤمن کی شخصیت کا بھی صرف ایک رُخ سامنے رہے گا تو شخصیت بھی یک رُخی رہے گی۔ چنانچہ اسی کے مظاہر آج ہماری نگاہوں کے سامنے ہیں۔ اصل میں ایک مردِ مؤمن یا انسانِ مطلوب کی شخصیت کے یہ دونوں رُخ مطلوب ہیں اور اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ ایک بندۂ مؤمن کی شخصیت میں یہ دونوں رُخ بیک وقت موجود ہوں۔ چنانچہ ہمیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگیوں میں یہ دونوں رنگ بتمام وکمال اور بیک وقت نظر آتے ہیں اور اس کی گواہی دشمنوں تک نے دی ہے۔

عربی کا مشہور مقولہ ہے: اَلْــفَضْلُ مَا شَهِدَتْ بِهِ الْاَعْدَاءُ ''اصل فضیلت وہی ہے جس کی گواہی دشمن دیں''۔ چنانچہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں جب سلطنتِ کسریٰ سے مسلح تصادم ہوا تو ایرانی افواج کے جاسوسوں اور مخبروں نے مسلمان افواج کا خوب اچھی طرح جائزہ لے کر اپنے سپہ سالار کو جو رپورٹ دی تھی اس کے یہ الفاظ نہایت قابلِ غور ہیں اور اُن کی ذہانت و فطانت پر دلالت کرتے ہیں کہ: هُـمْ رُهْبَـانٌ بِـاللَّيْلِ وَفُرْسَانٌ بِالنَّهَارِ یعنی یہ عجیب لوگ ہیں' دن میں یہ شہسواروں کے روپ میں نظر آتے ہیں اور میدانِ جنگ میں دادِ شجاعت دیتے ہیں اور رات کے وقت یہی لوگ راہب بن جاتے ہیں اور مُصلّوں پر کھڑے نظر آتے ہیں' ان کے آنسوؤں سے ان کی سجدہ گاہیں تر ہو جاتی ہیں اور اسی طرح اپنے ربّ کے حضور الحاح وزاری میں اپنی راتوں کا بیشتر حصہ گزار دیتے ہیں۔

پس ایک بندۂ مؤمن کی مکمل شخصیت ''هُـمْ رُهْبَـانٌ بِـاللَّيْلِ وَفُرْسَانٌ بِالنَّهَارِ '' کے امتزاج ہی سے وجود میں آتی ہے۔ ہمارے سامنے ''فُرْسَانٌ بِالنَّهَارِ '' والا رُخ گزشتہ سبق میں آیا تھا اور ''رُهْبَانٌ بِـاللَّيْلِ '' کی صحیح تعبیر سطورِ بالا میں سامنے آئی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو' ادنیٰ درجے میں ہی سہی' اِن اوصاف کا جامع مصداق بننے کی توفیق عطا فرمائے جو اِن دو اسباق میں ہمارے سامنے آئے ہیں۔ آمین یا ربّ العالمین!

ظلمتِ کفر کے دو درجے

اب ہم اس رکوع کی آخری دو آیاتِ مبارکہ پر کسی قدر غور و تدبّر کرنے کی کوشش کریں گے۔ آیئے پہلے ان آیات کا ایک سلیس و رواں ترجمہ ذہن نشین کر لیں:

﴿ وَالَّـذِيْـنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُـهُمْ كَسَرَابٍ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً ۭ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَهٗ لَمْ يَـجِدْهُ شَيْـًٔا وَّوَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ ۭ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿٣٩﴾ اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِيْ بَـحْـرٍ لُّجِّيٍّ يَّغْشٰىهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ۭ ظُـلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ۭ اِذَآ اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا ۭ وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَـهٗ نُوْرًا فَمَالَـهٗ مِنْ نُّوْرٍ ﴿٤٠﴾﴾

''اور جن لوگوں نے کفر کیا ان کے اعمال ایسے ہیں جیسے دشتِ بے آب میں سراب (یعنی دھوپ میں چمکتی ہوئی ریت) جسے پیاسا پانی سمجھتا ہے۔ یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس پہنچتا ہے تو نہیں پاتا اسے کچھ بھی' البتہ اللہ کو اپنے پاس موجود پاتا ہے جو اُس کا پورا پورا حساب چکا دیتا ہے۔ اور اللہ کو حساب چکاتے دیر نہیں لگتی۔ یا اُن اندھیروں کے مانند جو کسی گہرے سمندر

میں ہوں جنہیں ڈھانپے ہوئے ہو موج اور اس کے اوپر ایک اور موج اور اس پر (سایہ کیے) ہوں بادل۔ (گویا) تاریکیاں ہیں تہ بہ تہ۔ جب وہ اپنا ہاتھ نکالتا ہے تو اسے بھی نہیں دیکھ پاتا۔ اور جسے اللہ ہی روشنی عطا نہ فرمائے تو اس کے لیے کوئی روشنی نہیں!''

ترجمے سے یہ بات واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ ان آیات میں کفر کی حقیقت کو ظاہر کرنے کے لیے دو تمثیلیں بیان ہوئی ہیں۔ یہ بالکل وہی اصول ہے جو عربی کے ایک مقولے میں سامنے آتا ہے کہ **تُعرفُ الْاَشیَاءُ بِاَضْدَادِھَا** ''اشیاء کی صحیح معرفت اُن کے اضداد کے حوالے سے حاصل ہوتی ہے''۔ یعنی کسی شے کی حقیقت کو ایک تو آپ خود اُس شے پر غور و فکر کر کے سمجھ سکتے ہیں اور دوسرے اس طور سے کہ اُس چیز کی ضد پر غور کیا جائے اور اس کی حقیقت کو سمجھا جائے' تو اس سے بھی اس شے کی حقیقت پر روشنی پڑے گی اور وہ منقح اور واضح ہو کر شعور و ادراک کی گرفت میں آجائے گی۔ جیسے ہم جانتے ہیں کہ دن کی اصل حقیقت رات کے پس منظر میں خوب نمایاں ہوتی ہے اور روشنی کی حقیقت تاریکی کے تقابل میں زیادہ اجاگر ہوتی ہے۔ اسی طرح ایمان کی حقیقت کو سمجھانے کے لیے ایک طرف تو سورۃ النور کی آیت ۳۵ میں نہایت فصیح و بلیغ تمثیل سامنے آچکی ہے جس میں ایمان کو ایک نور سے تشبیہہ دی گئی ہے جو مرکب ہے دو انوار سے' ایک نورِ فطرت اور دوسرا نورِ وحی۔ ان دونوں کے امتزاج سے نورِ ایمان وجود میں آتا ہے جس کا محل و مقام ہے قلبِ انسانی۔

اس کے بعد آیات ۳۶ تا ۳۸ میں ایمان کے اس نورِ باطنی کے انسانی شخصیت میں ظہور کی دو صورتوں میں سے ایک کو نہایت فصیح اور بلیغ الفاظ میں بیان کر دیا گیا۔ اسی حقیقتِ ایمان کو مزید اُجاگر کرنے کے لیے آیات ۳۹' ۴۰ میں ایمانِ حقیقی کے نور سے محروم انسانوں کی شخصیت کی جھلک دو تمثیلوں کے پیرائے میں دکھا دی گئی۔ مجرد الفاظ سے ظاہر ہے کہ ان تمثیلوں میں سے پہلی تمثیل میں کچھ روشنی اور تاریکی کے بین بین کی سی کیفیت سامنے آتی ہے' جبکہ دوسری تمثیل میں تاریکی اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی نظر آتی ہے۔ تاہم دقتِ نگاہ سے مشاہدہ کیا جائے تو اِن ظاہری الفاظ کے پردوں میں ہدایت و حکمت کے نہایت قیمتی موتی چھپے ہوئے ہیں۔

ان تمثیلوں پر غور کرنے سے قبل ایک بات اچھی طرح سمجھ لینی ضروری ہے اور وہ یہ کہ جیسے ایمان کی تمثیل میں بھی قانونی نہیں حقیقی ایمان کی ماہیت بیان کی گئی ہے اسی طرح یہاں کفر سے مراد قانونی اور ظاہری کفر نہیں بلکہ حقیقی اور واقعی کفر ہے' مبادا ہم یہ گمان کر لیں کہ یہاں صرف غیر مسلموں اور کھلے

کافروں کے متعلق بات ہو رہی ہے اور ہم مسلمانوں سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اگر یہ گمان اور مغالطہ لاحق ہو گیا تو ان آیاتِ مبارکہ میں قرآن حکیم کی جو ہدایت اور رہنمائی ہے' اس سے ہم محروم رہ جائیں گے۔ واضح رہے کہ جس طرح قانونی ایمان کا تعلق صرف ''قول'' سے ہے اور اس کی اساس شہادت پر ہے' یعنی ''اَشْھَدُ اَنْ لَا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰہِ'' اور حقیقی ایمان کا تعلق تصدیقٌ بالقلب سے ہے اور وہ عبارت ہے یقینِ قلبی سے' اسی طرح کفر کی بھی دو قسمیں اور دو درجے ہیں۔ ایک کفرِ قانونی اور ظاہری ہے' یعنی کھلم کھلا انکار اور ایک کفر باطنی اور مخفی ہے' یعنی ظاہر میں تو اقرار ہے لیکن باطن میں انکار چھپا ہوا ہے' چنانچہ قول کے مطابق عمل موجود نہیں ہے۔ اس کفرِ حقیقی کے بارے میں ہمارے ایک درویش' جن کا انتقال ہو چکا ہے' بڑے کیف کے عالم میں کہا کرتے تھے کہ ''جو دم غافل' سو دم کافر'' یعنی انسان کا جو وقت بھی غفلت میں بیتتا ہے وہ ایک نوع کے کفر میں گزرتا ہے' جیسے کہ گزشتہ صفحات میں علامہ اقبال مرحوم کے اس شعر کا حوالہ آیا تھا کہ: ؎

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مؤمن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

الغرض اگر کوئی مسلمان غفلت کے عالم میں ہو' اللہ کو بھولے ہوئے ہو' اللہ سے محجوب ہو گیا ہو' پردے میں آ گیا ہو تو یہ گمشدگی کی کیفیت ہے جو ایک نوع کا کفر ہے' اگرچہ اس پر کفر کا فتویٰ نہیں لگے گا۔ مزید برآں کفر کے ایک معنی ناشکرا پن بھی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہاں وہی مراد ہو۔ بہرحال یہاں کفر کے لیے جو تمثیلیں بیان ہو رہی ہیں وہ کفرِ حقیقی اور کفرِ معنوی کی ہیں' صرف کفرِ قانونی یا کفرِ فقہی کی نہیں۔ یہ وہ باطنی کیفیت ہے جس میں انسان کا قلب ایمان کے حقیقی نور اور حقیقی روشنی سے محروم ہو' قطع نظر اس سے کہ ظاہری اور قانونی طور پر وہ مسلمان ہو یا کھلم کھلا بھی کفر ہی کا اظہار کر رہا ہو۔

دوسری تمثیل۔ ایمانِ حقیقی سے محروم لوگوں کا انجام

اب اس کفرِ حقیقی و معنوی کی بھی دو کیفیات ہوسکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ کوئی شخص ایمانِ حقیقی کے لوازم یعنی اللہ کی ہستی اور توحید کے یقین' اُس کے ساتھ خلوص و اخلاص کے تعلق' آخرت کے یقین اور اُخروی فلاح کے حصول کے جذبے سے تو قطعاً محروم ہو لیکن کسی دوسرے جذبے یا سبب سے کوئی نیکی' کوئی بھلائی اور کسی نہ کسی نوع کا رفاہِ عام اور خدمتِ خلق کا کام کر رہا ہو' جیسے کسی نے کوئی یتیم خانہ کھلوا دیا ہو' یا کوئی کنواں کھدوا دیا ہو' یا کوئی شفا خانہ اور ہسپتال بنوا دیا ہو' یا رفاہی مقاصد کے لیے کوئی

فاؤنڈیشن قائم کر دی ہو یا کوئی خیراتی ادارہ قائم کر دیا ہو۔ اگر یہ سارے کام اللہ کی رضا جوئی اور آخرت کی فوز و فلاح کے حصول کے جذبے کے سوا کسی اور جذبۂ محرکہ کے تحت صادر ہو رہے ہیں تو ان اعمال کی حقیقت پہلی تمثیل میں بیان ہوئی ہے' یعنی:

﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۢ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً ۭ﴾

''اور جن لوگوں نے کفر کی روش اختیار کی ان کے اعمال ایسے ہیں جیسے دشتِ بے آب میں سراب جسے پیاسا پانی سمجھتا ہے''۔

یہ ایک نہایت فصیح و بلیغ تمثیل ہے' اس لیے کہ دنیا بھر میں یہ بات معروف و معلوم ہے کہ ایک لق و دق صحرا' ایک چٹیل میدان اور وسیع و عریض ریگستان میں ریت کا ایک حصہ اس طرح چمکتا ہے کہ دُور سے دیکھنے والے کو وہ پانی نظر آتا ہے اور پیاسا اسے پانی سمجھ کر اس کی طرف دوڑتا اور لپکتا ہے۔ یہاں ''ظــمــآن'' کا لفظ ''فعلان'' کے وزن پر آیا ہے۔ اسی وزن پر ''رحمان'' آتا ہے' یعنی وہ ہستی جس کی رحمت ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کے مانند ہو۔ چنانچہ ''ظــمــآن'' کے معنی ہوں گے وہ شخص جو پیاس سے مرا جا رہا ہو۔ اسے ریگستان میں دُور سے پانی نظر آ رہا ہے۔ اگرچہ وہ پانی نہیں ہے' محض سراب ہے' لیکن وہ اسے پانی سمجھ کر جس طرح بھی ہو گھسٹتا ہوا' سسکتا ہوا وہاں پہنچتا ہے' لیکن وہاں یہ صورت پیش آتی ہے کہ:

﴿حَتّٰٓى اِذَا جَاۗءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْـــًٔا﴾

''یہاں تک کہ جب وہ اس (سراب) کے پاس پہنچتا ہے تو نہیں پاتا اسے کچھ بھی''۔

اس کی حسرت کا اندازہ کیجیے کہ وہ گھسٹتا ہوا' سسکتا ہوا پانی کی اُمید میں وہاں پہنچتا ہے تو اس کو پانی نہیں ملتا' جبکہ وہ وہاں موت کو اپنا منتظر پاتا ہے۔ اور موت کیا ہے؟ وہ تو درحقیقت ''شاہدرہ'' ہے جس سے گزرنے کے بعد اسے اللہ کے سامنے حاضر ہونا ہے' لہٰذا فرمایا:

﴿وَّوَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ ۭ﴾

''اور وہ وہاں اللہ کو موجود پاتا ہے' پس وہ اس کا حساب چکا دیتا ہے''۔

آیت کے اس پورے حصے کا جس کا ہم نے اب تک مطالعہ کیا ہے' مطلب و مفہوم یہ ہے کہ ایسا شخص جب قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے حضور میں حاضر ہوگا تو اس کو تو گمان ہوگا کہ میں نے دنیا میں بڑے نیک کام کیے تھے' میں نے خیراتی ادارے قائم کیے تھے' میں نے فاؤنڈیشن قائم کیے تھے' میں نے یتیم خانے' شفاخانے اور ہسپتال بنوائے تھے اور متعدد رفاہِ عام کے کام کیے تھے' میں نے ان اداروں

کی بلا معاوضہ اعزازی طور پر بے شمار خدمات انجام دی تھیں۔ لہٰذا اسے ان اعمال پر بہت کچھ تکیہ ہوگا' ان کا سہارا ہوگا' لیکن جیسے ریگستان میں دُور سے چمکتی ہوئی ریت پیاسے کو پانی نظر آتی ہے' حالانکہ وہ سراب کے سوا کچھ نہیں ہوتا' ایسے ہی جب ایسا شخص عدالتِ خداوندی میں محاسبہ کے لیے کھڑا ہوگا تو اسے معلوم ہو جائے گا کہ چونکہ ان اعمال کی بنیاد ایمان پر نہ تھی' بلکہ وہ نورِ ایمان سے خالی اور محض ریاکاری کے جذبے کے تحت شہرت اور ناموری کے حصول کے لیے یا کسی دُنیوی منفعت اور مصلحت کے تحت یعنی انکم ٹیکس بچانے کے لیے یا الیکشن میں ووٹ لینے کے لیے یا سرکار دربار میں رسائی و پذیرائی کے لیے کیے گئے تھے' لہٰذا ان کی آخرت میں کوئی وقعت نہیں' بلکہ وہاں ان کی حیثیت کھوٹے سکّوں کی ہوگی۔ گویا یہ تمام اعمال وہاں سراب ثابت ہوں گے۔ جیسے دُور سے چمکتی ہوئی ریت پانی نظر آتی ہے جبکہ حقیقت میں پانی موجود نہیں ہوتا' ویسے ہی ان کے یہ اعمال جو ظاہری صورت کے اعتبار سے نیکی اور خیر کے اعمال نظر آتے ہیں' آخرت میں لاحاصل اور بے نتیجہ رہیں گے اور اللہ ان کا حساب چکا دے گا۔ اور اس کی شان یہ ہے کہ:

﴿وَاللّٰهُ سَرِيۡعُ الۡحِسَابِ ۝۳۹﴾

''اور اللہ جلد حساب چکانے والا ہے''۔

اُس کو حساب چکانے میں کوئی دیر نہیں لگی۔ واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ کا ایک صفاتی نام ''الحسیب'' بھی ہے۔ وہ قیامت کے دن ہر انسان کی دُنیوی زندگی کے تمام اعمال ہی نہیں بلکہ اس کی نیتوں' اس کے ارادوں اور اس کے محرکاتِ عمل کا بھی پورا حساب لے گا۔ اور اس کے لیے اللہ تعالیٰ کو کسی جمع تفریق کی ضرورت نہیں ہوگی جو ہمیں ہوتی ہے۔ اس کے کمپیوٹرز کا کوئی تصور انسان کر ہی نہیں سکتا۔ سورۃ الکہف میں نقشہ کھینچا گیا ہے کہ جب اعمال نامہ سامنے آئے گا تو مجرم لرز اٹھیں گے اور کہیں گے:

﴿يٰوَيۡلَتَنَا مَالِ هٰذَا الۡكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيۡرَةً وَّلَا كَبِيۡرَةً اِلَّاۤ اَحۡصٰهَا﴾ (الکہف: ۴۹)

''ہائے ہماری شامت! یہ اعمال نامہ کیسا ہے کہ اس نے کسی چھوٹی بڑی چیز کو چھوڑا ہی نہیں کہ جس کا احاطہ نہ کر لیا ہو!''

اس میں تو باریک ترین تفصیلات کو بھی نہیں چھوڑا گیا' چھوٹی سے چھوٹی اور معمولی سے معمولی بات بھی اس میں موجود ہے اور یہ بڑی سے بڑی بات کا بھی احاطہ کیے ہوئے ہے۔ یہی بات سورۃ الزلزال میں فرمائی گئی ہے:

﴿فَمَنۡ يَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ خَيۡرًا يَّرَهٗ ۝۷ وَمَنۡ يَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝۸﴾

''پس جو کسی کوئی ذرّے کے ہم وزن نیکی کرے گا اسے دیکھ لے گا (اپنے سامنے موجود پائے گا) اور جو کوئی کسی ذرّے کے ہم وزن بدی کمائے گا تو اسے بھی دیکھ لے گا''۔

یاد ہوگا کہ اس سلسلۂ دروس کے درس دوم یعنی آیۂ برّ میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ حقیقی نیکی کیا ہے:

﴿وَلٰـکِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِکَۃِ وَالْکِتٰبِ وَالنَّبِیّٖنَ ۚ﴾

''بلکہ حقیقی نیکی اس کی ہے جو ایمان لایا اللہ پر' یومِ آخر پر' فرشتوں پر' کتابوں پر اور نبیوں پر۔''

گویا کوئی عمل جس کی بنیاد میں ایمان نہیں ہے وہ حقیقتاً نیکی نہیں ہے چاہے بظاہر وہ نیکی کا کتنا ہی بڑا عمل نظر آتا ہو' حتیٰ کہ نماز' روزہ اور صدقہ وخیرات تک کے بارے میں نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ اگر ان کا مقصد ریا کاری ہو اور یہ کام شہرت کے حصول یا لوگوں پر اپنی دین داری کی دھونس جمانے کے لیے کیے جائیں تو عین شرک قرار پائیں گے۔ آپ ﷺ کا فرمانِ مبارک ہے:

((مَنْ صَلّٰی یُرَائِیْ فَقَدْ اَشْرَکَ وَمَنْ صَامَ یُرَائِیْ فَقَدْ اَشْرَکَ وَمَنْ تَصَدَّقَ یُرَائِیْ فَقَدْ اَشْرَکَ))

''جس نے نماز پڑھی دکھاوے کے لیے وہ شرک کر چکا' جس نے روزہ رکھا دکھاوے کے لیے وہ شرک کر چکا' اور جس نے صدقہ وخیرات کیا دکھاوے کے لیے وہ شرک کر چکا۔''

یعنی اگر اعمال کی بنیاد ایمانِ حقیقی پر ہے اور وہ خالصتاً اللہ کی رضا جوئی اور آخرت کی جزا طلبی کے جذبے کے تحت صادر ہو رہے ہیں تب تو وہ واقعتاً نیکی قرار پائیں گے اور موجبِ اجر وثواب ہوں گے' بصورتِ دیگر اُن کی حیثیت محض سراب کی سی ہے۔

قرآن مجید میں دو اور مقامات پر بھی یہ مضمون دو نہایت حسین وجمیل تمثیلوں کے پیرائے میں بیان ہوا ہے۔ چنانچہ ایک تو سورۃ النور کے فوراً بعد سورۃ الفرقان میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَقَدِمْنَآ اِلٰی مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰہُ ھَبَآءً مَّنْثُوْرًا ﴿۲۳﴾﴾

''اور (جنہیں یہ لوگ بڑے بڑے عمل سمجھ رہے ہیں اور جن پر انہوں نے تکیہ کیا ہوا ہے) ہم (قیامت کے دن) اُن کے اِن اعمال کی طرف بڑھیں گے اور انہیں غبار کی طرح (ہوا میں) اڑا دیں گے''۔

بلاتشبیہہ نقشہ بالکل وہی ہوگا جیسے ٹھوکر مار کر کسی چیز کو مشتِ غبار کی صورت ہوا میں اڑا دیا جاتا ہے۔ اس لیے کہ اُن کے اعمال کی بنیاد ایمان پر نہ تھی اور وہ خالصتاً اللہ کے لیے نہیں کیے گئے تھے۔ دوسری تشبیہہ سورۂ ابراہیم میں وارد ہوئی ہے:

﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ نِ اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ ؕ﴾ (آیت ۱۸)

''جن لوگوں نے اپنے ربّ سے کفر کیا ہے (جنہیں اپنے ربّ پر ایمان میسر نہیں ہے) اُن کے اعمال (نیکیاں) اس راکھ کے مانند ہیں جیسے کسی جھکڑ والے دن تیز ہوا اڑا کر لے جائے''۔

گویا ان کے لیے نہ کوئی جماؤ اور ٹھہراؤ ہے اور نہ ثبات و دوام۔ آگے ارشاد ہوتا ہے:

﴿لَا يَقْدِرُوْنَ مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰى شَيْءٍ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ۞﴾

''وہ اپنے کیے کا کچھ بھی پھل نہ پاسکیں گے۔ یہی پرلے درجے کی گمراہی ہے''۔

یعنی جسے وہ اپنی کمائی اور کسب سمجھ رہے ہوں گے اور اس پر اجر و ثواب کی امیدیں لگائے بیٹھے ہوں گے' اس میں سے اُن کے ہاتھ کچھ بھی نہ آسکے گا' اور واقعہ یہ ہے کہ یہی ہے بہت دُور کی گمراہی اور سب سے بڑی محرومی و ناکامی۔

الغرض کفر کا ایک درجہ تو یہ ہے کہ انسان حقیقی ایمان سے محرومی کے باعث خلوص و اخلاص سے تو تہی دست و تہی دامن ہو لیکن مضطرب ضمیر کے لیے جھوٹا اطمینان فراہم کرنے کی غرض سے' یا شہرت و عزت کے حصول کی خاطر یا کسی اور دُنیوی منفعت و مصلحت کے لیے نیکی کے کام سرانجام دے رہا ہو تو آیت زیرِ درس کی رو سے ایسی نیکیاں اور اس قسم کے اعمالِ خیر محض سراب کا درجہ رکھتے ہیں۔

اس سراب کے دھوکے میں گرفتار ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ایسے لوگ حقائق سے محجوب ہوتے ہیں اور فکر و نظر کی سطح پر مختلف النوع تاریکیوں اور اندھیروں میں بھٹک رہے ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کو ان تاریکیوں اور اندھیروں سے نکال کر ایمان کی روشنی میں لانا اُن حضرات کی ذمہ داری ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے نورِ ایمان سے بہرہ ور فرمایا ہو۔ جیسے سورۃ الحدید میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول جناب محمد ﷺ کے متعلق ارشاد فرمایا:

﴿هُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ عَلٰى عَبْدِهٖٓ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ﴾ (آیت ۹)

''وہی ہے (اللہ) جو اپنے بندے (ﷺ) پر (قرآن مجید کی) روشن آیات نازل فرماتا ہے' تاکہ وہ تمہیں (کفر و ناشکری کے) اندھیروں سے نکال کر (ایمان کی) روشنی میں لے آئے''۔

اب جن کی بھی آنکھیں کھل گئی ہوں اور جن کو بھی نورِ ایمان کی کوئی رمق میسر آگئی ہو یہ ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے ابنائے نوع کو ایمانِ حقیقی کی دعوت دیں' جیسا کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى يُحِبَّ لِاَخِيْهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهٖ)) (۱)

''تم میں سے کوئی بھی اُس وقت تک (حقیقی) مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لیے بھی وہی چیز پسند نہ کرے جسے وہ اپنے لیے پسند کرتا ہے''۔

لہٰذا اگر ایمانِ حقیقی کی روشنی کسی کو میسر آ گئی ہے تو اس کو عام کرنا اور اسے زیادہ سے زیادہ انسانوں تک پہنچانا اس کی ذمہ داری ہے اور یہ کام اس پر واجب اور فرض ہے!

تیسری تمثیل: کفر کا آخری اور انتہائی درجہ

کفر کا دوسرا یعنی آخری اور انتہائی درجہ یہ ہے کہ ایمان سے محرومی پر مستزاد ضمیر بھی بالکل مُردہ ہو چکا ہو اور نیکی اور بدی کی تمیز بھی سرے سے مفقود ہو چکی ہو۔ چنانچہ اب انسان کی شخصیت و کردار میں سوائے عریاں نفس پرستی کے اور کچھ نہ رہے اور نیکی اور بھلائی ملمع کے درجے میں بھی موجود نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ تیسری تمثیل میں یہ انتہائی کیفیت بیان ہوئی ہے کہ روشنی کی کوئی ایک کرن بھی موجود نہیں' بلکہ انتہائی تاریکی اور تہ بر تہ ظلمتیں ہیں۔ یعنی کامل خودغرضی ہے اور خواہشات و شہوات ہی کی پیروی ہے اور انسان ہوائے نفس ہی کا بندۂ بے دام بن کر رہ گیا ہے۔ کوئی جھوٹ موٹ کی نیکی اور دکھاوے کا خیر بھی موجود نہیں اور کوئی بھلائی خواہ وہ ملمع ہی کی نوعیت کی ہو' اس کی بھی کوئی کرن سیرت و کردار میں نظر نہیں آتی۔ یہ گویا ضلالت' گمراہی اور گراوٹ کی آخری انتہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کیفیت کو یوں تعبیر فرمایا گیا: ﴿ظُلُمٰتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ؕ﴾ ''تاریکیوں پر تاریکیاں ہیں''۔ اس ظلمتِ مطلق اور تاریکیٔ محض کے لیے جو تمثیل یہاں دی گئی ہے اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ایک فرانسیسی امیر البحر اِسی کی بنا پر ایمان سے مشرف ہو گیا تھا۔ اس لیے کہ اس نے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ نبی اکرم ﷺ نے زندگی بھر کبھی سمندری سفر نہیں کیا' جبکہ اس تمثیل کے بارے میں اس کا کہنا یہ تھا کہ یہ تمثیل صرف وہی شخص دے سکتا ہے جس کی بیشتر زندگی سمندر کے سفر میں گزری ہو اور اسے گہرے سمندر میں اکثر طوفانوں سے سابقہ درپیش آیا ہو اور اسے ذاتی تجربہ ہو کہ سمندر کی گہرائی میں اندھیرے کی کیا کیفیت ہوتی ہے' جبکہ موجوں پر موجیں چڑھی چلی آ رہی ہوں اور اوپر گہرے بادل بھی ہوں کہ ستاروں کی کوئی چمک بھی پانی میں منعکس نہ ہو رہی ہو۔ ایسی مکمل تاریکی کا کوئی تخیل و تصور کسی عام انسان کے لیے ممکن

(۱) صحیح البخاری' کتاب الایمان' باب من الایمان ان یحب لاخیه ما یحب لنفسه۔ وصحیح مسلم' کتاب الایمان' باب الدلیل علی ان من خصال الایمان ان یحب لاخیه۔

نہیں ہے' لہٰذا یہ تمثیل اور تشبیہہ یا تو وہی شخص دے سکتا ہے جسے عملاً کسی اندھیری رات میں جبکہ گہرے بادل بھی چھائے ہوئے ہوں' سمندر میں کسی طوفان سے سابقہ پیش آیا ہو اور پھر وہ قادر الکلام بھی ہو اور فصاحت و بلاغت سے بدرجۂ تمام و کمال بہرہ ور ہو! یا پھر ایسی تمثیل اور تشبیہہ صرف اللہ ہی بیان کر سکتا ہے جو کُل کائنات کا خالق و مدبّر ہے۔ لہٰذا اُس نے تسلیم کیا کہ قرآن مجید اللہ کا کلام ہے جو محمد ﷺ پر نازل ہوا۔ چنانچہ وہ ایمان لے آیا۔

اب ذرا تمثیل کے الفاظ پر توجہ مرکوز کیجیے۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَّغْشٰهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ؕ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ؕ اِذَاۤ اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا ؕ﴾

''یا جیسے وہ اندھیرے جو کسی گہرے سمندر میں ہوں جسے ڈھانپے ہوئے ہو موج' پھر اس کے اوپر چڑھی آ رہی ہو ایک اور موج' اور (پھر مطلع بھی صاف نہ ہو بلکہ) اس کے اوپر بادل (چھائے ہوئے) ہوں۔ (گویا) تاریکیوں پر تاریکیاں ہیں۔ جب وہ اپنا ہاتھ نکالتا ہے تو اسے بھی نہیں دیکھ پاتا''۔

گُھپ اندھیرے کے لیے ہماری زبان کا بھی محاورہ ہے ''ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دینا''۔ اس لیے کہ ایک انسان جب اپنا ہاتھ نکالتا ہے تو اسے سمت کا شعور تو حاصل ہوتا ہے اور خوب اندازہ ہوتا ہے کہ میرا ہاتھ کدھر ہے' لیکن اگر وہ اس کے باوجود اپنے ہاتھ کو بھی دیکھ نہیں پا رہا تو معلوم ہوا کہ انتہائی تاریکی ہے اور روشنی کی کوئی رمق بھی موجود نہیں! سبحان اللہ وبحمدہٖ' یہ ہے تمثیل کی معراج اور تشبیہہ کا کمال!

اب اس آیتِ مبارکہ کے آخری حصہ پر توجہ فرمائیے۔ ارشاد فرمایا:

﴿وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ ۝﴾

''اور جس کو اللہ ہی نے نور عطا نہ فرمایا ہو تو اس کے لیے کوئی نور نہیں''۔

نور تو اصل میں ایمان ہے' اگر ایمان میسر نہیں تو پھر نور کہاں؟ اس صورت میں تو تاریکیاں ہی تاریکیاں ہیں!!

اس درس کے آغاز میں عرض کیا گیا تھا کہ جیسے نورِ خارجی اشیاء کے ظہور کا ذریعہ بنتا ہے ویسے ہی نورِ باطنی حقائق کے ظہور کا ذریعہ بنتا ہے۔ گویا نورِ ایمان نہ ہو تو حقائق کا ادراک ممکن نہیں ہے۔ اسی کو

بصیرت یعنی باطنی مشاہدہ کہا جاتا ہے۔ رہی ہماری ظاہری بصارت تو وہ حیوانات کو بھی حاصل ہے۔ کسی عارفِ کامل نے کیا خوب کہا ہے: ؎

دم چیست؟ پیامے است! شنیدی نہ شنیدی؟
در خاکِ تو یک جلوۂ عام است نہ دیدی؟
دیدن دگر آموز! شنیدن دگر آموز !!

یعنی یہ سانس کی آمد و رفت کیا ہے؟ ایک پیغام ہے! تم سنتے ہو یا نہیں سنتے؟ اور تمہارا خاکی وجود ایک نور کی جلوہ گاہ بھی ہے! تم دیکھتے نہیں؟ تو تمہیں چاہیے کہ (حیوانی سمع و بصر سے بلند تر سطح پر) ایک دوسری ہی طرح کا دیکھنا بھی سیکھو اور سننا بھی! واقعہ یہ ہے کہ ایمانِ حقیقی کے بغیر انسان اس ''دیدن دگر'' اور ''شنیدن دگر'' سے محروم رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی یہ دعا تو بہت ہی مشہور ہے کہ: ((اَللّٰھُمَّ اَرِنِیْ حَقِیْقَۃَ الْاَشْیَاءِ کَمَا ھِیَ)) ''اے اللہ! مجھے اشیاء کی حقیقت دکھا جیسی کہ وہ فی الحقیقت ہیں!'' علاوہ ازیں صحیح بخاری' صحیح مسلم اور دیگر کتب حدیث میں یہ دعا بھی منقول ہے جو آنحضور ﷺ خاص طور پر فجر کی سنتوں اور فرضوں کے درمیان پڑھا کرتے تھے:

((اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ فِیْ قَلْبِیْ نُوْرًا وَفِیْ بَصَرِیْ نُوْرًا وَفِیْ سَمْعِیْ نُوْرًا وَعَنْ یَمِیْنِیْ نُوْرًا وَعَنْ یَسَارِیْ نُوْرًا وَفَوْقِیْ نُوْرًا وَتَحْتِیْ نُوْرًا وَاَمَامِیْ نُوْرًا وَخَلْفِیْ نُوْرًا وَاجْعَلْ لِیْ نُوْرًا وَفِیْ لِسَانِیْ نُوْرًا وَفِیْ عَصَبِیْ نُوْرًا وَلَحْمِیْ نُوْرًا وَدَمِیْ نُوْرًا وَشَعْرِیْ نُوْرًا وَبَشَرِیْ نُوْرًا وَاجْعَلْ فِیْ نَفْسِیْ نُوْرًا وَعَظِّمْ لِیْ نُوْرًا' اَللّٰھُمَّ اَعْطِنِیْ نُوْرًا))(۱)

''اے اللہ! میرے دل میں نور عطا فرما' میری بصارت میں نور عطا فرما' میری سماعت میں نور عطا فرما' اور میری داہنی جانب سے نور دے' میری بائیں جانب سے بھی نور عنایت کر' اور میرے اوپر سے نور دے' میرے قدموں تلے سے نور دے' اور میرے سامنے سے نور دے' میری پشت کے پیچھے سے نور دے' اور میرے لیے نور ہی نور کر دے! اور میری زبان میں نور بھر دے' اور میرے رگ وپے میں نور بھر دے' اور میرے گوشت میں نور بھر دے' اور میرے خون میں نور بھر دے' اور میرے بالوں میں نور بھر دے' اور میری کھال میں نور دے' اور میری جان کو نور سے

(۱) صحیح البخاری' کتاب الایمان' باب من الایمان ان یحب لاخیہ ما یحب لنفسہ۔ وصحیح مسلم' کتاب الایمان' باب الدلیل علی ان من خصال الایمان ان یحب لاخیہ۔

لبریز کر دے اور میرے نور کو فراخ و وسیع فرما دے اور مجھے نور ہی نور عطا کر!''

اس سبق کی پہلی آیت (۳۵) میں ہم پڑھ چکے ہیں: ﴿يَهْدِى اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ﴾ ''اللہ ہدایت بخشتا ہے اپنے نور کی جس کو چاہتا ہے۔'' اور چونکہ ہدایت کے مفہوم میں رہنمائی یعنی راستہ دکھا دینے سے لے کر منزلِ مقصود تک بالفعل پہنچا دینے کے جملہ مراحل داخل ہیں لہٰذا اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ اللہ رسائی عطا فرما دیتا ہے اپنے نور تک جس کو چاہتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں میں بھی یہ ولولہ، یہ اُمنگ اور یہ آرزو پیدا فرما دے کہ ہم بھی اُن خوش نصیبوں میں شامل ہوں جنہیں کفر و شرک، الحاد و زندقہ، مادہ پرستی، ریاکاری، منافقت اور قول و عمل کے تضاد کے اندھیروں سے نکل کر ایمان و یقین کی روشنی میں آ جانے کی توفیق مل گئی ہو! آمین یا ربّ العالمین!

وآخر دعوانا ان الحمد لِلّٰہِ ربّ العالمین

درس 8

ایمان کے ظاہری
اور
باطنی ثمرات

سُوْرَۃُ التَّغَابُن کی روشنی میں

درس ۸

ایمان کے ظاہری اور باطنی ثمرات

سورۂ تغابن کی روشنی میں

نحمدہٗ ونصلی علٰی رَسولہِ الکریم ...... امَّا بَعد:

فَاَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ ۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

آج ہم اللہ کے نام سے مطالعۂ قرآن حکیم کے اس منتخب نصاب کے آٹھویں درس کا آغاز کر رہے ہیں‘ جو اِن صفحات میں سلسلہ وار زیرِاشاعت ہے۔ جیسا کہ اس سے قبل وضاحت کی جا چکی ہے‘ اس منتخب نصاب کا حصہ دوم مباحثِ ایمانی پر مشتمل ہے‘ اور اس حصہ دوم کا یہ چوتھا درس ہے جو سورۃ التغابن پر مشتمل ہے۔ یہ سورۂ مبارکہ مصحف کے اٹھائیسویں پارے میں ہے اور دو رکوعوں اور اٹھارہ آیات پر مشتمل ہے۔ سورۃ العصر کے بعد یہ پہلی مکمل سورت ہے جو اِس منتخب نصاب میں شامل ہے۔

سورت کے مضامین کا اجمالی تجزیہ

میرے مطالعے اور غور و فکر کی حد تک قرآن مجید کی چھوٹی سورتوں میں ایمان کے موضوع پر جامع ترین سورت سورۃ التغابن ہے۔ یہاں اس بات کو دوبارہ ذہن میں مستحضر کر لیجیے کہ ان مباحث میں ایمان سے مراد قانونی اور فقہی ایمان نہیں ہے جس کی بنا پر ہم اس دنیا میں ایک دوسرے کو مسلمان سمجھتے ہیں‘ بلکہ یہاں ایمانِ حقیقی مراد ہے جو قلبی یقین سے عبارت ہے‘ اور سورۃ النور کی آیاتِ نور کے مطابق یہ ایمان ایک نور ہے جس سے انسان کا باطن روشن اور منور ہو جاتا ہے اور جس کا اصل محل و مقام قلب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مصحف میں سورۃ التغابن سے متصلاً قبل سورۃ المنافقون واقع ہے‘ اور منافقین کے بارے میں یہ بات سب جانتے ہیں کہ وہ بھی قانوناً مسلمان شمار ہوتے تھے اور دنیا میں ان کے ساتھ بالکل مسلمانوں کا سا سلوک ہوتا تھا‘ اگرچہ وہ ایمانِ حقیقی سے محروم ہوتے تھے۔ یعنی وہ حقیقتاً کافر تھے۔ اس طرح قرآن مجید میں سورۃ المنافقون کے فوراً بعد سورۃ التغابن کو لا کر گویا تصویر کے دونوں رُخوں کو یکجا کر دیا گیا‘ یا یوں کہہ لیجیے کہ ''تُعۡرَفُ الۡاَشۡیَاءُ بِاَضۡدَادِھَا'' کے اصول کے مطابق ''کفرِ حقیقی'' کے بالمقابل ''ایمانِ حقیقی'' کا آئینہ رکھ دیا گیا۔

سورۃ التغابن کی اٹھارہ آیات ہیں جو دو رکوعوں میں منقسم ہیں۔ یہ بڑی پیاری اور دلکش تقسیم ہے۔ پہلے رکوع کی دس آیات میں سے پہلی سات آیات میں ایمانیاتِ ثلاثہ کا ذکر ہے۔ یعنی ایمان باللہ اور صفاتِ باری تعالیٰ‘ ایمان بالرسالت اور ایمان بالآخرت یا ایمان بالمعاد۔ پھر اگلی تین آیات میں ایمان کی نہایت پُر زور دعوت ہے کہ یہ واقعی حقائق ہیں‘ ان کو قبول کرو‘ ان کو تسلیم کرو‘ انہیں حرزِ جاں بناؤ اور اِن پر یقین سے اپنے باطن کو منور کرو۔

دوسرے رکوع کی کُل آٹھ آیات ہیں۔ ان میں بھی یہی تقسیم ہے کہ پہلی پانچ آیات میں ایمان کے ثمرات اور ایمان کے نتیجے میں انسان کے فکر و نظر اور اس کی شخصیت میں جو تبدیلیاں رونما ہونی چاہئیں‘ ان کا بیان ہے۔ یعنی: (۱) تسلیم و رضا (۲) اطاعت و انقیاد (۳) توکل و اعتماد (۴) علائقِ دُنیوی کی فطری محبت کے پردے میں انسان کے دین و ایمان اور آخرت و عاقبت کے لیے جو بالقوۃ خطرہ مضمر ہے‘ اس سے متنبہ اور چوکس و چوکنا رہنا‘ اور (۵) مال اور اولاد کی فتنہ انگیزی سے ہوشیار و باخبر رہنا—— اور آخری تین آیات میں ایمان کے ان تقاضوں کو پورا کرنے کی نہایت زوردار اور مؤثر ترغیب و تشویق ہے‘ اور ان میں تقویٰ‘ سمع و طاعت اور انفاق فی سبیل اللہ کی اہمیت پر بہت زور دیا گیا ہے۔ اس طرح یہ سورۂ مبارکہ واضح طور پر چار حصوں میں منقسم ہے۔

ابتدائی چار آیات

اللہ تعالیٰ کی توحید اور صفاتِ کمال کا ذکر

اب آیئے اس سورۂ مبارکہ کے پہلے رکوع کے پہلے حصے کی جانب جو چار آیات پر مشتمل ہے۔ ان آیات پر کسی تفصیلی گفتگو سے قبل مناسب ہوگا کہ متن کی تلاوت کے ساتھ ان کا ایک رواں ترجمہ ذہن نشین کر لیا جائے۔

﴿يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ ۡ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ① هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ② خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ ۚ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ③ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَيَعْلَمُ مَا تُسِرُّوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ④﴾

''اللہ کی تسبیح بیان کرتی ہے ہر وہ شے جو آسمانوں میں ہے اور ہر وہ شے جو زمین میں ہے۔ (واقعہ یہ ہے کہ کُل کائنات کی) بادشاہی بھی اُسی کی ہے اور کُل شکر و سپاس اور تعریف و ثنا کا مستحقِ حقیقی بھی صرف وہی ہے۔ مزید برآں وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہی ہے جس نے تم سب کو تخلیق فرمایا' لیکن تم میں سے کچھ (اس کا) انکار کرنے والے ہیں اور کچھ (اس کو) ماننے والے ہیں' اور جو کچھ تم (اس دنیا میں) کر رہے ہو اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔ اس نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا فرمایا اور تمہاری نقشہ کشی کی اور تمہاری بہت ہی اچھی نقشہ کشی (اور صورت گری) فرمائی' اور (تمہیں) اسی کی طرف لوٹنا ہے۔ وہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور وہ جانتا ہے جو کچھ تم چھپاتے ہو اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو' اور اللہ سینوں میں پوشیدہ رازوں کا بھی جاننے والا ہے''۔

جیسا کہ ترجمہ سے ظاہر ہے' ان آیاتِ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی صفاتِ کمال کا بیان بڑے پُر جلال انداز میں ہوا ہے۔ اس موقع پر یہ اصولی بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ ایمان اصلاً ایمان باللہ کا نام ہے۔ اصولی' علمی اور نظری اعتبار سے ایمان باللہ ہی ایمان کی اصل جڑ اور بنیاد ہے۔ ایمان بالرسالت اور ایمان بالآخرت دونوں اصلاً اسی کی فروع ہیں۔ چنانچہ ایمان بالوحی' ایمان بالنبوت' ایمان بالکتب یا فی الجملہ ایمان بالرسالت اصل میں اللہ تعالیٰ کی صفتِ ہدایت کا مظہرِ اَتم ہے۔ اسی طرح بعث بعد الموت' حشر و نشر' حساب و کتاب' جزا و سزا اور جنت و دوزخ کی تصدیق یا فی الجملہ ایمان بالآخرت یا ایمان بالمعاد اللہ تعالیٰ کی صفتِ عدل اور اس کے اسم گرامی ''الحسیب'' کا مظہرِ اَتم ہے۔ گویا اللہ حساب لینے والا ہے اور حساب کے مطابق جزا و سزا دینے والا ہے۔ اور اس کی اسی شان کا کامل ظہور آخرت میں ہوگا۔ پس معلوم ہوا کہ اصل ایمان' ایمان باللہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سورۃ التغابن کے پہلے رکوع میں ایمان باللہ یعنی اللہ تعالیٰ کی توحید اور صفاتِ کمال کا بیان چار آیات میں ہوا ہے' جبکہ ایمان بالرسالت اور ایمان بالمعاد دونوں کو تین آیات میں سمو دیا گیا ہے۔

ان ابتدائی چار آیات میں ایمان باللہ کا بیان نہایت معجز نما اسلوب میں غایت درجہ اختصار لیکن حد درجہ جامعیت کے ساتھ ہوا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿یُسَبِّحُ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الۡاَرۡضِ ۚ﴾

''اللہ کی تسبیح کرتی ہے ہر وہ شے جو آسمانوں میں ہے اور ہر وہ شے جو زمین میں ہے''۔

''تسبیح'' کا معنیٰ و مفہوم

یہاں پہلے لفظ ''تسبیح'' پر غور کر لیا جائے۔ اگرچہ فوری طور پر اس کے جو عام معنی ذہن میں آتے ہیں وہ یہ اقرار ہے کہ اللہ پاک ہے۔ لیکن اس کا حقیقی مفہوم کیا ہے' اسے جاننا ضروری ہے۔ ''سَبَحَ' یَسْبَحُ ''، فعل لازم ہے اور اس کا مطلب ہے کسی چیز کا تیرنا' خواہ وہ چیز پانی کی سطح پر تیر رہی ہو' خواہ فضا یا خلا میں اپنے مدار پر اپنی سطح کو برقرار رکھتے ہوئے حرکت کر رہی ہو۔ چنانچہ آپ کو قرآن مجید میں یہ الفاظ ایک سے زائد مقامات پر ملیں گے کہ: ﴿كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ۝﴾ (الانبیاء) ''یہ تمام (اجرامِ سماویہ خلا میں) اپنے اپنے مدار میں تیر رہے ہیں''۔ اس سے فعل متعدی بنتا ہے سَبَّحَ یُسَبِّحُ جس کا مطلب ہے کسی شے کو ''تیرانا'' یا اسے اس کی سطح پر برقرار رکھنا۔ اس کا مصدر ''تسبیح'' ہے۔ گویا لفظ تسبیح کے لغوی معنی ہیں ''کسی کو اس کی اصل سطح پر برقرار رکھنا''۔ چنانچہ اللہ کی تسبیح یہ ہے کہ اس کا جو مقام بلند ہے' اس کی جو اعلیٰ وارفع شان ہے' اسے اس پر برقرار رکھا جائے' اور اس کی ذاتِ اقدس' صفاتِ اکمل اور شانِ ارفع کے ساتھ کوئی ایسا تصور شامل نہ کیا جائے جو اس کے شایانِ شان نہ ہو۔ گویا کسی بھی درجے کے ضعف' عجز' نقص' عیب یا محدودیت کا کوئی بھی تصور اُس کی ذات وصفات کے ساتھ شامل کرنے کے معنی یہ ہیں کہ انسان اسے اس کے مقامِ رفیع سے نیچے گرا رہا ہے۔ معاذ اللہ! پس تسبیح باری تعالیٰ کا مفہوم یہ ہوگا کہ اس بات کا اقرار واعتراف کیا جائے کہ اللہ ہر عیب سے' ہر نقص سے' ہر ضعف سے' ہر احتیاج سے منزہ وماوراء اور اعلیٰ وارفع ہے' گویا فی الجملہ ''اللہ پاک ہے''۔ واضح رہے کہ یہ معرفتِ الٰہی کا سلبی پہلو ہے کہ ہم نے یہ جان لیا کہ اللہ میں کوئی نقص نہیں' کوئی عیب نہیں' اسے کوئی احتیاج نہیں۔ وہ ان سب سے منزہ اور پاک ہے۔ معرفتِ الٰہی کے مثبت پہلو کا بیان ''وَلَهُ الْحَمْدُ'' کے الفاظ میں آئے گا جو آگے آ رہے ہیں!

اب قابل غور امر یہ ہے کہ کائنات کی ہر شے کس معنی ومفہوم میں اللہ کی تسبیح کر رہی ہے! یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو کوئی زبان دی ہو۔ جیسے کہ ہم جانتے ہیں کہ پرندوں کی بھی زبان ہے اور ان کی اپنی اپنی بولیاں ہیں۔ اسی طرح شجر وحجر میں بھی حس موجود ہے اور کوئی عجب نہیں کہ وہ بھی آپس میں مبادلۂ احساس کرتے ہوں۔ چیونٹی جیسی حقیر مخلوق کی گفتگو کا ذکر سورۃ النمل میں موجود ہے: ﴿قَالَتْ نَمْلَةٌ يّٰۤاَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ ۚ﴾ (آیت ۱۸) ''ایک چیونٹی نے کہا کہ اے چیونٹیو! اپنے بلوں میں گھس جاؤ''۔ لہٰذا یہ بات بعید از قیاس نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر شے کو کوئی زبان عطا

کی ہو' کیونکہ قرآن مجید میں ایک مقام پر یہ الفاظ بھی وارد ہوئے ہیں: ﴿اَنۡطَقَنَا اللّٰہُ الَّذِیۡۤ اَنۡطَقَ کُلَّ شَیۡءٍ﴾(حٰم السجدۃ:۲۱) ''(قیامت میں انسان کے اعضاء کہیں گے کہ) اُس اللہ نے ہمیں بھی گویائی عطا فرمادی ہے جس نے ہر شے کو گویائی بخشی''۔ میدانِ حشر میں انسان کے اعضاء جب اس کے خلاف گواہی دیں گے تو انسان پکار اٹھے گا کہ تم ہمارے جسم کا حصہ ہوتے ہوئے ہمارے خلاف گواہی کیوں دے رہے ہو؟ تو وہ جواب میں مذکورہ بالا بات کہیں گے۔ لیکن ظاہر بات ہے کہ کائنات کی ہر شے جو تسبیح لسانی کررہی ہے وہ ہمارے فہم سے ماوراء ہے۔ چنانچہ سورۂ بنی اسراءیل میں ارشاد فرمایا:

﴿تُسَبِّحُ لَہُ السَّمٰوٰتُ السَّبۡعُ وَالۡاَرۡضُ وَمَنۡ فِیۡہِنَّ ؕ وَاِنۡ مِّنۡ شَیۡءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمۡدِہٖ وَلٰکِنۡ لَّا تَفۡقَہُوۡنَ تَسۡبِیۡحَہُمۡ ؕ﴾ (آیت ۴۴)

''اُس (اللہ) کی تسبیح تو ساتوں آسمان اور زمین اور وہ ساری چیزیں کررہی ہیں جو آسمانوں اور زمین میں ہیں۔ اور کوئی شے ایسی نہیں ہے جو اُس کی تحمید کے ساتھ تسبیح نہ کررہی ہو' لیکن تم ان کی تسبیح کو سمجھ نہیں سکتے''۔

البتہ اس کائناتی اور آفاقی تسبیح کا ایک پہلو ایسا بھی ہے جو ہماری سمجھ میں آتا ہے جسے تسبیحِ حالی قرار دینا مناسب ہوگا۔ یعنی یہ کہ ہر شے اپنے وجود سے اعلان کررہی ہے' گویا زبانِ حال سے اس بات کی گواہی دے رہی ہے کہ میرا خالق' میرا مالک' میرا صانع' میرا مصوّر' میرا موجد' اور میرا مدبّر ایک ایسی ہستی' کامل ہے جس کے نہ علم میں کوئی کمی ہے' نہ قدرت میں کوئی کمی ہے اور نہ حکمت میں کوئی کمی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اگر کوئی تصویر نہایت اعلیٰ ہے' فنِ مصوری کا شہ پارہ ہے تو درحقیقت وہ تصویر اپنے وجود سے اپنے مصور کے کمالِ فن کو ظاہر کرتی ہے۔ تخلیق اگر کامل ہے تو اس سے اس کے خالق کا کمال ظاہر ہورہا ہے۔ لہٰذا یہ کُل کائنات' یہ جملہ مصنوعات اور یہ تمام مخلوقات اللہ تعالیٰ کی صفتِ تخلیق کے حد درجہ اکمل واتم اور صفتِ ''تصویر'' یعنی صورت گری کے نہایت حسین وجمیل مظاہر ہیں۔ سورۃ الحشر کی آخری تین آیاتِ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ کے سولہ اسمائے حسنیٰ آئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ کا ایسا حسین اور اتنا عظیم گلدستہ کسی اور مقام پر نہیں آیا ہے۔ ان سولہ اسمائے حسنیٰ میں سے تین الخالق' الباری اور المصور ہیں۔ یعنی اللہ تخلیق کی منصوبہ بندی فرمانے والا ہے' اس کو خارج میں ظاہر فرمانے والا ہے' اور اس کی آخری صورت گری اور نقشہ کشی کرنے والا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ کُل کائنات اور کُل موجودات کا الخالق' الباری اور المصور اللہ سبحانہ کی ذاتِ اقدس ہے۔ اور یہ تخلیق وتصویر کامل ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے سورۃ الملک میں چیلنج کے انداز میں ارشاد فرمایا:

﴿مَا تَرٰى فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ؕ فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۙ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ۳ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَیْنِ یَنْقَلِبْ اِلَیْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِیْرٌ ۴﴾

''تم رحمٰن کی تخلیق میں کوئی نقص تلاش نہ کر سکو گے۔ ذرا (چاروں طرف) نظر دوڑاؤ' کیا تمہیں کوئی رخنہ نظر آتا ہے؟ بار بار نگاہ دوڑاؤ' تمہاری نگاہ ناکام اور تھک ہار کر لوٹ آئے گی (اور تم ہماری اس تخلیق میں کوئی نقص وعیب نہ نکال سکو گے)۔''

تو سوچو کہ عیب ونقص سے مبرا ومنزہ کون ہے؟ وہ ہستی کہ جس نے ان سب کی تخلیق فرمائی اور جو اِس پوری کائنات کی خالق ومصور بھی ہے اور محافظ ومدبر بھی! الغرض یہ ہیں معانی ومفاہیم ﴿یُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ۚ﴾ کے!

لَـهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ کا مفہوم

اسی آیت مبارکہ میں آگے ارشاد فرمایا: ﴿لَـهُ الْمُلْكُ﴾ ''بادشاہی اُسی کی ہے''۔ یعنی اس پوری کائنات کا حقیقی حکمران وہی ہے۔ بقول علامہ اقبال مرحوم: ؎

سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اِک وہی باقی بتانِ آزری!

وہ قانوناً (de jure) بھی اس پوری کائنات کا بلاشرکتِ غیرے بادشاہ ہے۔ یعنی حکمرانی کا استحقاق بھی صرف اُسی کو حاصل ہے اور واقعتاً (de facto) بھی بادشاہی اُسی کی ہے۔ یعنی فی الواقع بھی بادشاہِ حقیقی اور حاکمِ مطلق صرف اسی کی ذات ہے۔ گویا ''لَـهٗ'' میں حرفِ جار ''لام'' لامِ استحقاق کے معنی بھی دے رہا ہے اور لامِ تملیک کے بھی۔ اگر صحیح نہج پر غور کیا جائے تو اس لازمی نتیجے تک پہنچے بغیر چارہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن مخلوقات کو کچھ اختیار بخشا ہے' جیسے جن وانس' ان کا اپنا پورا وجود بھی اللہ کے قانون میں جکڑا ہوا ہے۔ چنانچہ ہم اس بات پر قادر نہیں ہیں کہ اپنے جسم کے کسی حصے پر بالوں کی روئیدگی کو روک سکیں۔ ہمیں یہ اختیار حاصل نہیں ہے کہ جب چاہیں اپنے قلب کی حرکت کو روک دیں اور جب چاہیں اسے رواں کر دیں۔ اسی طرح ہم آنکھ سے سننے کا کام نہیں لے سکتے اور کان سے دیکھنے کا کام نہیں لے سکتے۔ معلوم ہوا کہ ہمارا اپنا وجود بھی ہمارے حکم کے تابع نہیں ہے' بلکہ اللہ تعالیٰ کے قوانینِ تکوینی وطبعی میں جکڑا ہوا ہے۔ گویا وہ بھی اسی بادشاہِ حقیقی کا حکم مان رہا ہے' جس کے لیے نہایت ایجاز واعجاز کے ساتھ فرمایا گیا ہے: ﴿لَـهُ الْمُلْكُ﴾ ''حقیقی بادشاہی صرف اسی کی ہے''۔ یہ

دوسری بات ہے کہ اپنے وجود کے ایک نہایت محدود اور حقیر سے حصے میں اختیار اور ارادے کی اس آزادی پر، جو تمام تر اللہ ہی کی عطا کردہ ہے، ہم اتنے از خود رفتہ ہو جائیں کہ اردو ضرب المثل کے مطابق ہلدی کی گانٹھ پا کر پنساری بن بیٹھیں اور اپنے آپ کو کلیتاً خود مختار سمجھنے لگیں!

آگے ارشاد فرمایا: ﴿وَلَـهُ الْحَمْدُ﴾ ''اور کُل حمد بھی اُسی کے لیے ہے''۔ لفظ ''حمد'' (جس کی تشریح اس سے قبل سورۃ الفاتحہ کے درس میں بیان ہو چکی ہے) مجموعہ ہے شکر و ثنا دونوں کا۔ گویا کُل شکر اسی کے لیے ہے اور کُل ثنا بھی اُسی کے لیے ہے۔ اس لیے کہ اس پورے سلسلۂ کون و مکاں میں جہاں کہیں کوئی خیر و خوبی، کوئی حسن و جمال اور کوئی مظہرِ کمال نظر آ رہا ہے اس کا سرچشمہ و منبع اللہ تعالیٰ ہی کی ذاتِ والا صفات ہے۔ لہٰذا تعریف کا حقیقی مستوجب و سزاوار اور مالک و مستحق بھی صرف وہی ہے۔ اسی طرح چونکہ ہمیں جو کچھ بھی حاصل ہو رہا ہے اور ہماری جو ضرورت بھی پوری ہو رہی ہے وہ چاہے بہت ہی طویل سلسلۂ اسباب کے تعلق و توسط سے ہو رہی ہو، لیکن اصل مسبّب الاسباب تو بہر حال اللہ تعالیٰ ہی ہے، لہٰذا شکر کی حقیقی مستحق بھی صرف اُسی کی ذات ہے۔

اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کا تصور

آگے ارشاد فرمایا: ﴿وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ①﴾ ''اور وہ ہر چیز پر قادر ہے''۔ اُس کے قبضۂ قدرت اور اختیار و اقتدار سے کوئی چیز باہر نہیں ہے! یہاں پہلی آیت ختم ہوئی۔ اس سے قبل ایک درس میں عرض کیا جا چکا ہے کہ معرفتِ الٰہی کے ضمن میں جہاں تک ذاتِ باری تعالیٰ کا تعلق ہے تو وہ ہمارے فہم و ادراک ہی نہیں ہماری قوتِ متخیلہ سے بھی وراء الوراء ثم وراء الوراء ہے۔ چنانچہ ہمارا اللہ تعالیٰ کو جاننا اور پہچاننا کُل کا کُل اس کی صفات کے حوالے سے ہے، اور ان کے ضمن میں بھی ہمارے فہم و شعور کا دائرہ بہت ہی محدود ہے۔ یعنی ہم یہ تو جانتے ہیں کہ اللہ سمیع ہے، بصیر ہے اور کلام فرماتا ہے، لیکن یہ نہیں جان سکتے کہ وہ کیسے سنتا ہے، کیسے دیکھتا ہے اور کیسے کلام کرتا ہے۔ اسی طرح ہم یہ تو جانتے ہیں کہ وہ علیم ہے، قدیر ہے اور حکیم ہے، لیکن ہم اس کا کوئی تصور تک نہیں کر سکتے کہ وہ کتنا علیم ہے، کتنا قدیر ہے اور کس قدر حکیم ہے۔ گویا صفاتِ باری تعالیٰ کے یہ مختلف پہلو بھی ہمارے ذہن و شعور اور فہم و ادراک سے ماوراء ہیں، اور ہمارے ذہن کے چھوٹے سے سانچے میں، جو نہایت محدود ہے، اللہ تبارک و تعالیٰ کی صفاتِ مطلقہ اپنی پوری شان کے ساتھ سما ہی نہیں سکتیں۔ لہٰذا ہمارے لیے واحد پناہ گاہ ایک لفظ ''کُل'' ہے۔ جیسے ﴿وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ (وہ ہر چیز پر قادر ہے) جس پر یہ پہلی آیتِ

مبارکہ ختم ہو رہی ہے' اور ﴿وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴾ (اور وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے) جس پر اس سورۂ مبارکہ کا پہلا رکوع ختم ہوتا ہے! — ہر صاحبِ ذوق اندازہ کر سکتا ہے کہ ان دونوں مقامات پر اصل زور لفظ ''كُلّ'' پر ہے۔

ایمان وکفر کی بحث

دوسری آیت کے آغاز میں فرمایا: ﴿هُوَ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ﴾ ''وہ (اللہ) ہی ہے جس نے تم سب کو پیدا فرمایا''۔ گویا پہلی آیت ایک پُر جلال تمہید کی حیثیت رکھتی ہے جس کے بعد ایمان اور کفر کی بحث شروع ہو رہی ہے' جس کے لیے نہایت فصیح و بلیغ اور حد درجہ لطیف پیرایۂ بیان اختیار فرمایا کہ ذرا غور کرو کہ اللہ تعالیٰ ہی کی ذاتِ والا صفات ہے جو تم سب کی خالق ہے۔ گوروں کو بھی اُسی نے پیدا کیا اور کالوں کو بھی' مشرق کے رہنے والوں کو بھی اور مغرب کے رہنے والوں کو بھی — تو پھر کتنی حیرت کی بات ہے کہ: ﴿فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ ؕ﴾ ''تو تم میں سے کوئی کافر ہے اور کوئی مؤمن!'' حالانکہ اُس نے ارادے اور اختیار کی جو تھوڑی سی آزادی تمہیں عطا فرمائی ہے وہ اصلاً ابتلاء و آزمائش اور امتحان کے لیے ہے۔ جیسا کہ سورۃ الملک میں ارشاد ہوا: ﴿الَّذِىْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ﴾ (آیت۲) ''(اللہ ہی ہے) جس نے موت و حیات (کے سلسلے) کو پیدا فرمایا تاکہ تم لوگوں کو آزمائے کہ کون ہے تم میں سے بہتر عمل کرنے والا''۔ یہی بات سورۃ الدھر میں اس اسلوب سے ارشاد ہوئی: ﴿اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ۝۳﴾ ''یقیناً ہم نے اس (انسان) کو (ہدایت کا) راستہ دکھا دیا' اب وہ (مختار ہے) خواہ شکر گزار بندہ بنے' خواہ ناشکرا اور انکار کرنے والا بن جائے!'' — اسی اختیار کا ظہور اس طرح ہو رہا ہے کہ کچھ لوگ اللہ کا کفر کرنے والے ہیں اور کچھ لوگ اس کو ماننے والے ہیں' لیکن ظاہر بات ہے کہ انسان کا رویہ اور اس کی روش بے نتیجہ نہیں رہے گی' بلکہ اس کا بھلا یا برا نتیجہ نکل کر رہے گا۔ لہٰذا اس آیت کے اختتام پر انسان کو مطلع اور خبردار کر دیا گیا کہ: ﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝۲﴾ ''اور جو کچھ تم کر رہے ہو اسے اللہ تعالیٰ دیکھ رہا ہے''۔ اس ارشاد میں بیک وقت ایک دھمکی بھی مضمر ہے اور ایک بشارت بھی۔ یعنی جو لوگ اس کے منکر' باغی اور سرکش ہوں گے' گویا ناشکرے ہوں گے' اور جو اس کے ساتھ شرک کریں گے ان کو وہ سزا دے گا۔ یہ ان الفاظِ مبارکہ کا دھمکی والا پہلو ہے۔ اور بشارت والا پہلو یہ ہے کہ جو اس کے شکر گزار ہوں گے' اس کے مطیع و فرماں بردار ہوں گے اور اس کی معرفت سے اپنے قلوب و اذہان کو

منور کریں گے ان کو وہ انعام واکرام سے نوازے گا۔ اس لیے کہ وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے اور سب کی روش سے آگاہ ہے!

کائنات اور انسان کی بامقصد تخلیق

اگلی آیت میں ارشاد فرمایا: ﴿خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ﴾ ''اُس نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا فرمایا''۔ یعنی اللہ نے یہ ساتوں آسمان اور یہ زمین جو پیدا فرمائے ہیں تو بے کار و بے مقصد اور بلا غرض وغایت پیدا نہیں فرمائے' بلکہ ''بالحق'' پیدا فرمائے ہیں' یعنی ایک مقصد کے ساتھ ان کی تخلیق فرمائی ہے۔ ''حق'' عربی زبان کا بڑا وسیع المفہوم لفظ ہے۔ اس کا اصل مفہوم ہے ''وہ چیز جو فی الواقع موجود ہو''۔ باطل کا لفظ حق کی ضد ہے' چنانچہ باطل اصلاً اس کو کہتے ہیں کہ جو نظر تو آئے' محسوس ومشہود تو ہو' لیکن حقیقتاً موجود نہ ہو' جیسے سراب۔ لیکن حق کے اس مفہومِ اصلی پر چند مفاہیم زائد ہیں۔ مثلاً حق ہر وہ چیز ہے جو عقلاً مسلّم ہو' اس کے مقابلہ میں باطل وہ چیز ہے جو عقلاً مسلّم نہ ہو۔ اسی طرح حق ہر وہ شے ہے جو اخلاقاً ثابت ہو اور اس کے مقابلہ میں باطل وہ ہے جو اخلاقاً ثابت نہ ہو۔ مزید برآں حق ہر وہ چیز ہے جو بامقصد ہو' جس کے پیچھے کوئی حکمت کارفرما ہو اور اس کے مقابلہ میں باطل وعبث ہر وہ فعل ہے جو بے مقصد ہو اور جس کی پشت پر کوئی حکمت نہ ہو۔ اس آیت میں لفظ ''حق'' اسی آخری مفہوم میں استعمال ہوا ہے اور کلام کا حاصل اور مدعا یہ ہے کہ اللہ نے یہ کائنات بے مقصد اور بغیر حکمت کے گویا باطل اور عبث نہیں بنائی۔ یہ مضمون سورۂ آل عمران کے آخری رکوع میں بھی بایں الفاظ آ چکا ہے: ﴿رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ج﴾ (آیت ۱۹۱) ''اے ربّ ہمارے! تو نے یہ سب کچھ باطل و بے مقصد نہیں بنایا!''

کائنات کی عمومی تخلیق کے ذکر کے بعد خاص طور پر تخلیقِ انسانی کا ذکر فرمایا گیا: ﴿وَصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ ج﴾ ''اور (اس نے) تمہاری نقشہ کشی کی اور تمہاری بہت ہی اچھی نقشہ کشی اور صورت گری فرمائی''۔ یعنی ذرا اپنی عظمت کو پہچانو' تم اس کُل سلسلۂ تخلیق کا نقطۂ عروج ہو' اللہ نے تمہیں اشرف المخلوقات بنایا اور تمہیں کیسی کیسی عمدہ واعلیٰ اور ظاہری وباطنی استعدادات سے نوازا۔ اس نے تمہاری تخلیق ''فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ'' یعنی ''نہایت اعلیٰ اور بہترین انداز'' پر کی۔ پھر تمہاری صورت گری کی اور ناک نقشہ عطا فرمایا اور کیا ہی عمدہ شکل وصورت سے نوازا۔ تو کیا یہ سب کچھ بے کار اور بے مقصد ہے؟ اور کیا ''نشستند' گفتند و برخاستند'' کے مانند تمہارا اس دنیا میں پیدا ہونا اور حیوانوں کی

طرح پیٹ اور جنس کے تقاضے پورے کر کے مر جانا ہی تمہاری کُل حقیقت ہے؟ نہیں' ایسا نہیں ہے' بلکہ:﴿وَاِلَیۡهِ الۡمَصِیۡرُ ﴿۳﴾﴾ ''اور اسی کی طرف (سب کو) لوٹنا ہے''۔ اور ظاہر ہے کہ لوٹنا جواب دہی کے لیے ہوگا۔ وہاں تمہارا محاسبہ ہوگا۔ تم محض حیوان نہیں ہو' تمہارا مرتبہ و مقام بہت بلند ہے' تم اشرف المخلوقات ہو۔ لہٰذا ع

''جن کے رتبے ہیں سوا اُن کی سوا مشکل ہے!''

کے مصداق تمہاری ذمہ داری بھی بہت زیادہ ہے اور تمہیں لازماً جواب دہی کرنی ہوگی۔ یہاں آپ نے دیکھا کہ مضمون تدریجاً ایمان باللہ سے ایمان بالآخرۃ کی طرف منتقل ہو گیا۔ قرآن حکیم میں اس مضمون کی دوسری نہایت حسین نظیر سورۃ المؤمنون کے آخر میں ہے کہ:﴿اَفَحَسِبۡتُمۡ اَنَّمَا خَلَقۡنٰکُمۡ عَبَثًا وَّاَنَّکُمۡ اِلَیۡنَا لَا تُرۡجَعُوۡنَ ﴿۱۱۵﴾﴾ ''کیا تم نے یہ گمان کیا ہے کہ ہم نے تمہیں عبث پیدا کیا ہے اور تم ہماری طرف لوٹائے نہ جاؤ گے؟''

صفتِ علم کے تین اَبعاد

چوتھی آیت میں اللہ تعالیٰ کی صفاتِ کمال کے ضمن میں صفتِ علم کا ذکر ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی جن دو صفات پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے وہ صفتِ قدرت اور صفتِ علم ہیں۔ چنانچہ﴿وَهُوَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ﴾ اور﴿وَهُوَ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ﴾ کے الفاظ قرآن حکیم میں بتکرار و اعادہ وارد ہوئے ہیں۔ ان میں سے صفتِ علم کے بیان میں سورۃ التغابن کی یہ چوتھی آیت اس اعتبار سے بڑی منفرد ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی صفتِ علم کو تین مختلف اسالیب سے بیان کیا گیا ہے' یا یوں کہہ لیجیے کہ ہماری تفہیم کے لیے اس مقام پر اللہ کے علم کے تین اَبعاد (dimensions) کو نمایاں کیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:﴿یَعۡلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ﴾ ''وہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے''۔ اب آپ غور کیجیے کہ بات مکمل ہو گئی' اس لیے کہ ''آسمانوں اور زمین'' سے مراد کُل کائنات ہے اور اس کے علم میں ہر شے کا علم شامل ہے' لیکن اس پر مزید اضافہ فرمایا: ﴿وَیَعۡلَمُ مَا تُسِرُّوۡنَ وَمَا تُعۡلِنُوۡنَ ؕ﴾ ''اور وہ جانتا ہے جو کچھ تم چھپاتے ہو (یا چھپا کر کرتے ہو) اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو (یا اعلانیہ کرتے ہو)''۔ یہ ایک دوسرے رُخ سے اللہ کے احاطۂ علمی کا بیان ہو گیا۔ لیکن پھر مزید تاکید اور زور کے لیے فرمایا:﴿وَاللّٰهُ عَلِیۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ ﴿۴﴾﴾ ''اور اللہ تعالیٰ دلوں کا حال تک جانتا ہے''۔ جو کچھ تمہارے سینوں میں مخفی ہے اور تمہارے تحت الشعور میں مضمر ہے وہ

سب بھی اللہ تعالیٰ پر عیاں ہے اور اللہ اس کا بھی جاننے والا ہے۔ ان الفاظِ مبارکہ میں اللہ کے احاطۂ علمی کے ایک تیسرے عرض کی جانب اشارہ ہے' اس لیے کہ بعض چیزیں تو وہ ہوتی ہیں جنہیں انسان جان بوجھ کر گویا شعوری ارادے کے ساتھ چھپاتا ہے' ان کا ذکر تو آیت کے دوسرے حصے میں ہو گیا۔ اور بعض چیزیں وہ ہیں جو انسان کے تحت الشعور میں مؤثر اور محرک عوامل کی حیثیت سے کارفرما ہوتی ہیں' اگرچہ انسان کو خود اُن کا شعور نہیں ہوتا۔ آیت کے تیسرے اور آخری حصے میں ان کا بھی احاطہ کر لیا گیا کہ تمہارے وہ اصل محرکاتِ عمل جن کا خود تمہیں شعور حاصل نہیں ہوتا' اللہ ان سے بھی باخبر ہے' اور یہ سب اصلاً شرح ہے ﴿وَهُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِيْمٌ﴾ کی! اس چوتھی آیت پر اللہ تعالیٰ کی توحید اور صفاتِ کمال کا بیان ختم ہوتا ہے۔

آغازِ درس میں اس سورۂ مبارکہ کا ایک تجزیہ پیش کیا جا چکا ہے کہ اس کی پہلی سات آیات میں ایمانیاتِ ثلاثہ یعنی ایمان باللہ' ایمان بالرسالت اور ایمان بالآخرت کا ذکر ہے اور اس کے بعد تین آیات میں ایمان کی پُرزور دعوت ہے۔ پہلے رکوع کی ان دس آیات میں سے چار آیات کا ہم مطالعہ کر چکے ہیں' اور اب ہم بقیہ چھ آیات کا مطالعہ کرتے ہیں۔ لہٰذا پہلے ہم ان کا سلیس و رواں ترجمہ ذہن نشین کر لیں:

﴿اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ز فَذَاقُوْا وَبَالَ اَمْرِهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝٥ ذٰلِكَ بِاَنَّهٗ كَانَتْ تَّاْتِيْهِمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالُوْٓا اَبَشَرٌ يَّهْدُوْنَنَا ز فَكَفَرُوْا وَتَوَلَّوْا وَّاسْتَغْنَى اللّٰهُ ط وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ۝٦ زَعَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ لَّنْ يُّبْعَثُوْا ط قُلْ بَلٰى وَرَبِّيْ لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ ط وَذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۝٧ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالنُّوْرِ الَّذِيْٓ اَنْزَلْنَا ط وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝٨ يَوْمَ يَجْمَعُكُمْ لِيَوْمِ الْجَمْعِ ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ ط وَمَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُّكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ وَيُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ط ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝٩ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ط وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝١٠﴾

''کیا نہیں پہنچ چکی ہے تمہیں خبر ان لوگوں کی جنہوں نے کفر کی روش اختیار کی تھی (تم سے) پہلے؟ تو وہ چکھ چکے اپنے کیے کی سزا اور ان کے لیے (آخرت کا) دردناک عذاب (مزید) ہے۔ یہ اس لیے ہوا کہ ان کے پاس ان کے رسول واضح اور روشن تعلیمات کے ساتھ آتے

رہے تو انہوں نے کہا کہ کیا انسان ہمیں ہدایت دیں گے؟ پس انہوں نے کفر کیا اور پیٹھ موڑ لی تو اللہ نے بھی استغناء اختیار فرمایا' اور اللہ تو ہے ہی غنی اور (اپنی ذات میں از خود) محمود۔ کافروں کو یہ مغالطہ لاحق ہو گیا ہے کہ انہیں (موت کے بعد) اٹھایا نہ جائے گا۔ (اے نبی ﷺ!) کہہ دیجیے: کیوں نہیں! اور مجھے میرے ربّ کی قسم ہے کہ تمہیں لازماً اٹھایا جائے گا' پھر تم کو جتلایا جائے گا جو کچھ تم کرتے رہے تھے۔ اور یہ چیز اللہ پر بہت آسان ہے۔ پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسولؐ پر اور اُس نور پر جو ہم نے نازل فرمایا (یعنی قرآن مجید)۔ اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔ جس دن وہ تم کو جمع کرے گا جمع ہونے کے دن (یعنی قیامت کے دن) وہ ہوگا (اصل) ہار اور جیت کے فیصلے کا دن۔ اور جو ایمان لائے گا اللہ پر اور نیک عمل کرے گا تو وہ اس سے اس کی برائیوں کو دور کر دے گا اور اسے داخل کرے گا ان باغات میں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی' وہ اس میں رہیں گے ہمیشہ ہمیش۔ یہی ہے بہت بڑی کامیابی۔ اور وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ہوگا اور ہماری آیات کو جھٹلایا ہوگا وہ ہوں گے آگ والے' وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ اور وہ بہت ہی برا ٹھکانہ ہے''۔

آیاتِ مبارکہ اور ان کے ترجمہ سے یہ بات سامنے آجاتی ہے کہ یہاں اوّلاً ایمان بالرسالت اور ایمان بالآخرت کا بیان نہایت ہی مؤثر اسلوب اور حد درجہ فصاحت و بلاغت سے ہوا ہے۔ اس اندازِ کلام کے اعجاز سے ہر وہ شخص لطف لے سکتا ہے جو عربی زبان کی تھوڑی سی بھی شُد بُد رکھتا ہو۔

دو آیات میں ایمان بالرسالت کا بیان

پہلے ایمان بالرسالت کے ضمن میں یہ عظیم حقیقت واضح کی جا رہی ہے کہ رسولوں کا معاملہ عام واعظین' ناصحین' مصلحین یا مبلغین کا سا نہیں ہے کہ چاہے لوگ ان کی بات مانیں چاہے نہ مانیں کوئی اہم فرق واقع نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس رسول تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آخری حجت بن کر آتے ہیں۔ لہٰذا ان کے انکار' ان سے اعراض اور ان کی تکذیب کے دو نتیجے نکل کر رہتے ہیں اور ان کا انکار کرنے والوں کو دو سزائیں مل کر رہتی ہیں۔ ایک اس دنیا میں عذابِ استیصال جس کے ذریعے پوری پوری قومیں ہلاک و برباد کر دی گئیں' جیسے قومِ نوحؑ' قومِ ہودؑ' قومِ صالحؑ' قومِ لوطؑ' قومِ شعیبؑ اور آلِ فرعون۔ ان قوموں کا ذکر قرآن مجید میں بار بار اسی اعتبار سے آیا ہے کہ ان کے پاس اللہ کے رسول ایسی واضح تعلیمات کے ساتھ آئے جو فطرتِ انسانی کے لیے جانی پہچانی تھیں۔ مزید برآں یہ رسول کھلے کھلے معجزات بھی لے کر آئے۔ ''بیّنات'' میں دونوں چیزیں یعنی واضح تعلیمات اور روشن معجزات

شامل ہیں۔ لیکن جب ان قوموں نے ان رسولوں کا انکار کیا اور ان کی دعوت کو ردّ کر دیا تو وہ نسیاً منسیاً کر دی گئیں۔ جیسے کہ قرآن مجید میں ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا گیا کہ: ﴿كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ؕ﴾ (ھود:۶۸ و ۹۵) ''وہ قومیں ایسے ہو گئیں جیسے کبھی دنیا میں تھیں ہی نہیں''۔ یہ وہ سزا ہے جو رسولوں کے انکار پر اس دنیا میں ملتی ہے۔ اس کے علاوہ ابھی ایک دوسری سزا باقی ہے اور وہ ہے آخرت کی سزا' یعنی جہنم! یہ مختصری تشریح وتوضیح ہے اس آیت مبارکہ کی:

﴿اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ۫ فَذَاقُوْا وَبَالَ اَمْرِهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝۵﴾

''کیا نہیں پہنچ چکی ہے تمہیں خبر ان کی جنہوں نے کفر کیا تھا پہلے؟ تو وہ اپنے کرتوتوں کی سزا کا ایک مزا (اس دنیا میں) چکھ چکے' اور ان کے لیے (آخرت میں دوسری سزا کے طور پر) دردناک عذاب تیار ہے''۔

اس جگہ ''استفہامِ تقریری'' کا اسلوب اس لیے اختیار کیا گیا کہ سورۃ التغابن مدنی سورت ہے۔ گویا قرآن مجید کا لگ بھگ دو تہائی حصہ جو مکی سورتوں پر مشتمل ہے' اس سے بہت پہلے نازل ہو چکا تھا جس میں ان اقوام کا ذکر بار ہا آ چکا تھا جو رسولوں کی دعوت کو ردّ کرنے کے جرم کی پاداش میں ہلاک کر دی گئی تھیں۔

رسالت کے ضمن میں اگلی آیت میں جو دوسری نہایت اہم بات بیان ہوئی وہ یہ ہے کہ رسولوں کے باب میں لوگوں نے جو سب سے بڑی ٹھوکر کھائی اور ان کو ماننے اور ان پر ایمان لانے میں جو سب سے بڑی رکاوٹ ان کے سامنے آ گئی وہ ان رسولوں کی بشریت تھی۔ ظاہر ہے کہ رسول انسان تھے' انسانوں کی طرح کھاتے پیتے تھے۔ وہ نبوت و رسالت پر فائز ہونے سے قبل دنیا میں کاروبار کرتے تھے' بازاروں میں چلتے پھرتے تھے' ان کو بھی وہ احتیاجیں لاحق ہوتی تھیں جو دوسرے تمام انسانوں کو لاحق ہوتی ہیں۔ جیسے خود نبی اکرم ﷺ نے مکہ میں چالیس برس کی عمر شریف تک کاروبار کیا ہے۔ چنانچہ مشرکین مکہ نبی اکرم ﷺ پر اجرائے وحی اور ظہورِ نبوت کے بعد اسی نوع کے اعتراضات وارد کیا کرتے تھے جن کا قرآن مجید میں مختلف اسالیب سے متعدد مقامات پر ذکر ہوا ہے۔ مثلاً سورۃ الفرقان میں اللہ تعالیٰ نے مشرکین مکہ کا یہ قول نقل فرمایا ہے: ﴿وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ ؕ﴾ (الفرقان:۷) ''اور (یہ مشرکین) کہنے لگے کہ اس رسول کی کیا

کیفیت ہے کہ کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے؟'' لہٰذا ہمیشہ یہی ہوا کہ رسولوں کی بشریت ان پر ایمان لانے میں بہت بڑی رکاوٹ بنتی رہی کہ یہ تو ہم جیسے انسان ہیں' ہماری ہی طرح کے ہاتھ پاؤں ان کے بھی ہیں اور ہماری ہی طرح کی ضروریات وحوائج ان کو بھی لاحق ہیں' پھر یہ کیسے ہماری ہدایت پر مأمور ہو سکتے ہیں؟ چنانچہ یہ ہے وہ سب سے بڑی ٹھوکر جو لوگوں نے نبوت و رسالت کے باب میں کھائی اور یہ ہے وہ سب سے بڑا حجاب جو رسالت کے باب میں لوگوں کے سامنے آیا' جسے کفر کے سرداروں اور وقت کے بڑے بڑے چودھریوں نے جن کی سیادت وقیادت کو رسول کی دعوتِ توحید سے خطرہ لاحق ہوتا تھا' لوگوں کو ورغلانے کا ذریعہ بنایا۔ انہوں نے لوگوں سے کہا کہ تم اپنے ہی جیسے انسان کو رسول مان کر ان کا اتباع کرو گے تو بڑے گھاٹے میں رہو گے۔ چنانچہ انہوں نے خود بھی رسولوں کی تصدیق سے انکار کیا اور عامۃ الناس کو بھی اس سے باز رکھا — اسی حقیقت کا ذکر ہے اگلی آیت مبارکہ میں کہ رسولوں کی دعوت سے انکار کا ایک اہم سبب ان کا انسان ہونا بھی رہا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهٗ كَانَتْ تَّاْتِيْهِمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالُوْٓا اَبَشَرٌ يَّهْدُوْنَنَا ۡ فَكَفَرُوْا وَتَوَلَّوْا وَّاسْتَغْنَى اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ۝﴾

''یہ اس لیے ہوا کہ ان کے پاس ان کے رسول واضح اور روشن تعلیمات اور معجزات کے ساتھ آتے رہے تو انہوں نے کہا کیا بشر ہمیں ہدایت دیں گے؟ پس انہوں نے کفر کیا اور پیٹھ موڑ لی تو اللہ نے بھی استغناء اختیار فرمایا' اور اللہ تو ہے ہی غنی اور (اپنی ذات میں ازخود) محمود (اور ستودہ صفات)''۔

یہاں آیت کے آخری الفاظ میں سمجھانے کا بڑا ہی پیارا انداز ہے۔ یعنی اللہ بے نیاز ہے' اس کو کسی کی احتیاج نہیں۔ کوئی اسے مان لے تو اس کی بادشاہی میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا اور کوئی انکار کر دے تو اس کی جلالتِ شان میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ یہ تو اس کا کرم' اس کا فضل اور اس کی عنایت ورحمت ہے کہ اس نے انسانوں کی ہدایت کے لیے ان ہی میں سے رسول مبعوث فرمائے' جنہیں اپنی ہدایتِ کاملہ سے سرفراز فرمایا اور جن پر اپنی کتاب نازل کی۔ اب اگر کوئی ناقدری کرے اور انکار واعراض کی روش اختیار کرے تو اس سے اللہ کا کچھ نہیں بگڑتا' اس لیے کہ ان سے اللہ کی کوئی غرض وابستہ نہیں ہے۔ البتہ اس کا فوری نقصان اور خسارہ ان ناشکروں اور نافرمانوں کو یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی نظرِ عنایت اور نگاہِ التفات کا رُخ ان کی جانب سے پھیر لیتا

ہے اور اپنی شانِ بے نیازی کا اظہار فرماتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ بے نیازی کا جامہ تو صرف اسی کی ذات پر راست آتا ہے' اس لیے کہ وہ ''الغنی'' بھی ہے اور ''الحمید'' بھی!

رسالت کے ضمن میں ایک گمراہی کے دو مختلف مظاہر

یہاں یہ بات بھی غور طلب ہے کہ رسالت کے باب میں ایک گمراہی کا ظہور تو اس طرح ہوتا ہے کہ لوگ رسول کی رسالت کو اس دلیل سے ردّ کر دیتے ہیں کہ یہ تو ہمارے ہی جیسا انسان ہے۔ گویا رسول کی بشریت قبولِ حق میں مانع ہو جاتی ہے' جس کا مفصل ذکر اس آیت میں آ گیا۔ لیکن یہ معاملہ یہیں پر ختم نہیں ہو جاتا' بلکہ اسی مرض کا ظہور رسولوں کی اُمتوں میں بعد میں ایک دوسری شکل میں ہوتا ہے اور وہ یہ کہ بہت سے لوگ محبت اور عقیدت کے غلو کے باعث نبیوں اور رسولوں کی بشریت کا انکار کر دیتے ہیں۔ گویا بنیادی طور پر مرض وہی ہے کہ بشریت اور نبوت و رسالت میں لوگوں نے بُعد اور تضاد محسوس کیا اور اس سبب سے ایک جانب منکروں اور کافروں نے رسول کی بشریت کی بنیاد پر اس کی رسالت کی نفی کر دی اور اس کی دعوت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا' اور دوسری جانب غالی اُمتیوں نے رسولوں کی رسالت کی بنیاد پر اُن کی بشریت کا انکار کر دیا' یہاں تک کہ بعض انبیاء و رُسل کو خدا کا بیٹا قرار دے کر الوہیت میں شریک کر دیا گیا۔ جیسے یہود کے ایک گروہ نے حضرت عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا قرار دیا' اور پال کے متبعین نے تو حد ہی کر دی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا صُلبی بیٹا قرار دے کر مستقل تثلیث ایجاد کر لی۔ گویا ذہنی مرض اور گمراہی ایک ہی ہے' البتہ اس کے ظہور کی شکلیں مختلف ہیں۔ یعنی رسولوں کی موجودگی میں بشریت کی بنیاد پر رسالت کا انکار اور بعد میں رسالت کی بنیاد پر بشریت کا انکار!

وقوعِ قیامت کا پُر زور اثبات

اس کے بعد ایمان بالآخرۃ یا ایمان بالمعاد کا بیان شروع ہوتا ہے' اور ساتویں آیت اسی مضمون پر مشتمل ہے۔ ایمان بالآخرۃ کی عقلی اور منطقی اساس تو ایمان باللہ کے ضمن میں تیسری آیت کے آخر ہی میں ''وَاِلَیۡہِ الۡمَصِیۡرُ'' کے الفاظِ مبارکہ میں قائم کر دی گئی تھی۔ اب یہاں بڑی فصاحت و بلاغت اور بڑے شدّ و مد کے ساتھ ایک آیت میں اس کے انکار کی پُر زور نفی اور اس کے وقوع کا نہایت تاکیدی اثبات کر دیا گیا۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: ﴿زَعَمَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اَنۡ لَّنۡ یُّبۡعَثُوۡا ؕ﴾ ''مغالطہ ہو گیا ہے اِن کافروں کو کہ ان کو دوبارہ اٹھایا نہ جائے گا''۔ زعم کا لفظ اردو میں بھی بے بنیاد خیال کے معنوں میں

مستعمل ہے۔ جیسے ہم کہتے ہیں کہ فلاں کو بڑا زعم ہے' یعنی اسے اپنے بارے میں مغالطہ ہے اور وہ اپنے آپ کو بہت کچھ سمجھتا ہے' درآنحالیکہ اس کی اصل حیثیت کچھ نہیں ہے اور وہ محض ایک خیالِ خام اور ایک بے بنیاد ظن میں مبتلا ہے۔ کفار اسی زعم اور خیالِ خام میں مبتلا تھے کہ مرنے کے بعد اُن کو دوبارہ اٹھایا نہ جائے گا۔ قرآن مجید میں کفار کے اس اعتراض اور استعجاب کو بہت سے مقامات پر مختلف الفاظ میں بیان کیا گیا ہے' اور خاص طور پر مکی سورتوں میں ان کے اس خیالِ خام کی نفی اور بعث بعد الموت کے اثبات کے لیے آفاق و انفس سے مفصل دلائل دیے گئے ہیں۔ یہاں ان دلائل و براہین کے اعادے کے بجائے نبی اکرم ﷺ کو حکم دیا جا رہا ہے کہ: ﴿قُلْ بَلٰى وَرَبِّىْ لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ ؕ﴾ ''(اے نبیؐ!) کہہ دیجیے کیوں نہیں' اور مجھے اپنے ربّ کی قسم ہے' تم لازماً اٹھائے جاؤ گے' پھر تم نے (دنیا میں) جو کچھ کیا ہے وہ لازماً تمہیں جتلا دیا جائے گا (تمہارے سامنے رکھ دیا جائے گا)''۔ اس اسلوب میں جو زور اور تاکید ہے اس کا صحیح اندازہ وہی لگا سکتے ہیں جو عربی زبان سے تھوڑی بہت واقفیت رکھتے ہوں۔ عربی زبان میں اس سے زیادہ تاکید کا کوئی اور اسلوب نہیں ہے کہ فعل مضارع سے پہلے لامِ مفتوح اور آخر میں نونِ مشدّد ہو۔ یہاں تاکید کا یہی اسلوب آیا ہے۔

اس آیت کے آخر میں ارشاد فرمایا: ﴿وَذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۝﴾ ''اور یہ چیز اللہ پر بہت آسان ہے''۔ یعنی بظاہر تمہیں بہت مشکل معلوم ہو رہا ہے' لیکن جب اللہ کو مان لیا جائے اور یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ وہ ہر چیز پر قادر ہے تو اس استعجاب کی گنجائش کہاں باقی رہتی ہے؟ جس قادرِ مطلق نے پہلے پیدا کیا تھا اس کے لیے دوبارہ پیدا کرنا بہت آسان ہے۔

جیسے کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے' اس آیت مبارکہ میں کوئی عقلی استدلال یا منطقی دلیل موجود نہیں ہے' بلکہ یہاں دراصل خطابی اور اذعانی دلیل کا اسلوب ہے۔ یعنی نبی اکرم ﷺ سے فرمایا جا رہا ہے کہ آپؐ پورے یقین و وثوق کے ساتھ اللہ کی قسم کھا کر اور اپنے ربّ کی شہادت پیش کرتے ہوئے ان منکرین سے کہہ دیجیے کہ ایسا لازماً ہو کر رہے گا اور تم لازماً محاسبہ کے لیے دوبارہ اٹھائے جاؤ گے۔ زیادہ گہرائی میں غور کیا جائے تو نظر آتا ہے کہ یہاں دراصل نبی اکرم ﷺ کی سیرت وشخصیت کا وزن بطورِ دلیل پیش کیا جا رہا ہے کہ غور کرو کہ یہ کون کہہ رہا ہے اور کس کی زبانِ مبارک سے یہ کلمات ادا کرائے جا رہے ہیں! اس کی سیرت اور اخلاق کا عالم کیا ہے! اس کی صداقت و امانت کے بارے میں تمہاری متفقہ رائے کیا ہے! وہ ''الصادق'' اور ''الامین'' شخص ہے جو قسم کھا کر بعث بعد الموت کی خبر

دے رہا ہے اور پورے یقین اور اذعان کے ساتھ دے رہا ہے۔ یعنی وہ فلسفیوں کی طرح یہ نہیں کہہ رہا کہ میرا گمان یہ ہے' یا میرا خیال یہ ہے' یا میری عقل یہ حکم لگاتی ہے' یا مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے' بلکہ پورے وثوق کے ساتھ خبر دے رہا ہے کہ ایسا ہو کر رہے گا۔ گویا یہ فلسفیانہ کلام نہیں ہے کہ جس میں کسی شک وشبہ کا امکان ہو' بلکہ اللہ کا کلام ہے جو رسول اللہ ﷺ کی زبان سے ادا ہو رہا ہے۔ لہٰذا اس میں شبہ کا ذرا بھی شائبہ موجود نہیں!

مزید برآں رسولوں کا معاملہ محض ''ایمان بالغیب'' کا نہیں ہوتا' بلکہ انہیں حیاتِ دُنیوی ہی میں ''ملکوت السّمٰوٰت والارض'' یہاں تک کہ جنت اور دوزخ کا مشاہدہ کرا دیا جاتا ہے تاکہ وہ لوگوں کو احوالِ آخرت کی جو خبریں دیں تو اپنے ذاتی مشاہدہ اور معائنہ کی اساس پر اور کامل یقین واذعان کے ساتھ دیں۔ پس معلوم ہوا کہ یہاں اگرچہ کوئی عقلی و منطقی دلیل موجود نہیں ہے' لیکن اس اسلوبِ بیان اور اندازِ کلام میں ایک بڑی عظیم اذعانی وایقانی دلیل مضمر ہے جس میں اصل وزن جناب محمدٌ رسول اللہ ﷺ کی سورج کے مانند روشن سیرت و شخصیت کا ہے۔ چنانچہ سیرت کی کتابوں میں ذکر موجود ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے جب کوہِ صفا پر کھڑے ہو کر اپنا پہلا دعوتی و تبلیغی خطبہ ارشاد فرمایا تو پہلے لوگوں سے دریافت کیا کہ تم نے مجھے کیسا پایا؟ گویا پہلے ان سے اپنی اس صداقت' امانت اور دیانت کی تصدیق و توثیق کرا لی جسے وہ بہت پہلے سے تسلیم کر چکے تھے' بعد میں دعوت پیش فرمائی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ مخاطبین یہ سوچیں کہ جس شخص نے کبھی جھوٹ نہ بولا ہو' جس کا شعار ہی صداقت وامانت ہو' جس نے کبھی کسی کو دھوکہ اور فریب نہ دیا ہو' کیا وہ اللہ پر جھوٹ باندھنے لگ جائے گا! کیا وہ پوری نوعِ انسانی کو فریب دینے پر آمادہ ہو جائے گا! پس حضور نبی اکرم ﷺ کی یہی سیرت وکردار اور آپ ﷺ کا یہی اخلاقِ حسنہ سورۃ التغابن کی ساتویں آیت کے پس منظر میں بطورِ دلیل پنہاں ہے۔

نبی اکرم ﷺ کی دعوت کے ابتدائی دَور کا ایک خطبہ بھی ملتا ہے جسے ''نہج البلاغہ'' میں نقل کیا گیا ہے اور جس میں بالکل وہی انداز' وہی اسلوب' فصاحت و بلاغت کا وہی معیار اور خطابت کی وہی شان ہے جو اِس آیتِ مبارکہ کا طرۂ امتیاز ہے۔ نبی اکرم ﷺ خود بھی اس کے مدعی ہیں کہ: ((اَنَا اَفْصَحُ الْعَرَبِ))[1] ''میں عرب کا فصیح ترین انسان ہوں''۔ اور واقعہ یہ ہے کہ آپ ﷺ کا یہ خطبہ اس دعویٰ کی بہت بڑی دلیل ہے۔ ارشاد فرمایا:

(۱) تلخیص الحبیر لابن حجر العسقلانی ۱۲۹۸/٤۔

((اِنَّ الرَّائِدَ لَا یَکْذِبُ اَھْلَہٗ ، وَاللّٰہِ لَوْ کَذَبْتُ النَّاسَ جَمِیْعًا مَا کَذَبْتُکُمْ ، وَلَوْ غَرَرْتُ النَّاسَ جَمِیْعًا مَا غَرَرْتُکُمْ ، وَاللّٰہِ الَّذِیْ لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ اِنِّیْ لَرَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ خَاصَّۃً وَاِلَی النَّاسِ کَافَّۃً ، وَاللّٰہِ لَتَمُوْتُنَّ کَمَا تَنَامُوْنَ ، ثُمَّ لَتُبْعَثُنَّ کَمَا تَسْتَیْقِظُوْنَ ، ثُمَّ لَتُحَاسَبُنَّ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ، ثُمَّ لَتُجْزَوُنَّ بِالْاِحْسَانِ اِحْسَانًا وَبِالسُّوْءِ سُوْءً ، وَاِنَّھَا لَجَنَّۃٌ اَبَدًا اَوْ لَنَارٌ اَبَدًا)) (۱)

''لوگو! تم جانتے ہو کہ رائد (قافلہ کا رہبر و رہنما) اپنے قافلے کو کبھی دھوکہ نہیں دیتا۔ اللہ کی قسم! اگر (بفرضِ محال) میں تمام انسانوں سے جھوٹ کہہ سکتا تب بھی تم سے کبھی نہ کہتا، اور اگر تمام انسانوں کو فریب دے سکتا تب بھی تمہیں کبھی نہ دیتا۔ اس اللہ کی قسم جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں! میں اللہ کا رسول ہوں تمہاری طرف خصوصاً اور پوری نوعِ انسانی کی طرف عموماً — اللہ کی قسم! تم سب یقیناً مر جاؤ گے جیسے (روزانہ) سو جاتے ہو، پھر یقیناً اٹھائے جاؤ گے جیسے (ہر صبح) بیدار ہو جاتے ہو۔ پھر لازماً تمہارے اعمال کا حساب کتاب ہو گا اور پھر لازماً تمہیں پورا پورا بدلہ ملے گا، اچھائی کا اچھا اور برائی کا برا، اور وہ جنت ہے ہمیشہ کے لیے یا آگ ہے دائمی''۔

اب تک کے مطالعے پر ایک نگاہِ بازگشت ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سات آیات میں ایمانیاتِ ثلاثہ یعنی توحید، رسالت اور آخرت کا بیان ہو گیا۔ چنانچہ توحید اور صفاتِ باری تعالیٰ کے ضمن میں چار آیات، رسالت کے موضوع پر دو آیات، اور آخرت یا معاد کے بارے میں ایک آیت وارد ہوئی۔ ان ایمانیاتِ ثلاثہ بالخصوص ایمان بالآخرت کی مزید تشریح ایک خطبۂ نبویؐ سے بھی ہمارے سامنے آ گئی۔ اب اگلی یعنی آٹھویں آیت سے ایمان کی پُرزور دعوت دی جا رہی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ﴿فَاٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَالنُّوْرِ الَّذِیْٓ اَنْزَلْنَا ط﴾ ''پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول (ﷺ) پر اور اس نور پر جو ہم نے نازل کیا (یعنی قرآن مجید)'' — ان الفاظ میں اوّلاً اللہ پر ایمان کی دعوت دی گئی اور پھر ایمان بالرسولؐ کے ساتھ اس نورِ ہدایت پر ایمان کو بھی شامل کر لیا گیا جو وحی اور کتاب کی صورت میں رسولؐ پر نازل کیا گیا۔ اور چونکہ بعد کی دو آیات (۹ اور ۱۰) میں ایمان بالآخرت کی زوردار دعوت آ رہی ہے لہٰذا آیت ۸ کے اختتام پر ایک بار پھر اللہ کی صفتِ علم کا حوالہ دے دیا گیا کہ: ﴿وَاللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ ۝۸﴾ ''اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس سے باخبر ہے!'' یعنی وہ تمہاری ہر ہر حرکت، ہر ہر عمل اور ہر ہر فعل ہی نہیں، تمہاری نیتوں اور ارادوں سے بھی باخبر ہے، یہاں تک کہ تمہارے تحت

(۱) بحوالہ جمھرۃ الخطب، ص ۵۔ وفقہ السیرۃ للالبانی، ص ۹۷۔

الشعور اور لاشعور بھی اس پر بالکل عیاں ہیں!

ہار اور جیت کے فیصلے کا دن

اگلی دو آیات (۹'۱۰) میں پھر ایمان بالآخرت کا بیان ہے۔ اس سے قبل آیت ۷ میں بھی ایمان بالآخرت کے اوّلین اور اہم ترین جزو یعنی بعث بعد الموت کا اثبات نہایت پُر زور انداز میں ہو گیا ہے۔ اب ان دو آیات میں اوّلاً آخرت کی اصل حقیقت اجمالاً بیان کی گئی' یعنی قیامت کا دن ہی ہار اور جیت' اور کامیابی و ناکامی کے اصل فیصلے کا دن ہے۔ جو اُس دن کامیاب قرار پائے گا وہی حقیقتاً کامیاب ہوگا اور جو اُس روز ناکام قرار دے دیا گیا وہی اصلاً ناکام ہو گیا۔ گویا جو اُس دن جیتا وہی جیتا اور جو اُس دن ہارا وہی ہارا! —— چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: ﴿يَوْمَ يَجْمَعُكُمْ لِيَوْمِ الْجَمْعِ ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ ؕ﴾ ''وہ دن کہ جس دن وہ (اللہ) تمہیں جمع کرے گا جمع ہونے کے دن (یعنی یوم قیامت) 'وہی ہے ہار اور جیت کے فیصلے کا اصل دن'' —— ''تغابن'' بنا ہے لفظ ''غبن'' سے۔ غبن کا لفظ ہمارے یہاں اردو میں بھی مستعمل ہے' یعنی کسی کو نقصان پہنچانا' کسی کا مال دبا لینا' مالک کی اجازت اور اس کے علم میں لائے بغیر اس کے مال میں تصرف کر لینا' یہ تمام مفاہیم لفظ غبن میں شامل ہیں۔ لیکن جب یہ لفظ باب تفاعل میں ''تغابن'' کی صورت اختیار کرتا ہے تو اس میں مزید بہت سے معانی و مطالب شامل ہو جاتے ہیں۔ ''تغابن'' کا لفظ اس کیفیت کو ظاہر کرتا ہے جو اِس دنیا کے جملہ معاملات میں معلوم و معروف ہے۔ یعنی یہ کہ اس دنیا میں جو باہمی معاملات ہوتے ہیں ان میں ہر فریق چاہتا ہے کہ وہ دوسرے سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائے یا بالفاظِ دیگر دوسرے کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچائے۔ دکان دار چاہے گا کہ گاہک سے زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کرے' جبکہ خریدار کی خواہش ہوگی کہ اسے داموں میں زیادہ سے زیادہ رعایت حاصل ہو۔ اسی طرح کاروبارِ دنیا کے ہر شعبے میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی ایک دوڑ لگی ہوئی ہے۔ پس ایک دوسرے کو زیادہ سے زیادہ زک پہنچانے کی کوشش کا نام ہے ''تغابن''۔

اس تغابن کا ایک ظہور تو دُنیوی معاملات میں ہر آن ہو رہا ہے کہ کسی کی جیت ہو رہی ہے اور کسی کی ہار' اور کسی کو نفع حاصل ہو رہا ہے اور کسی کو نقصان۔ لیکن اس دنیا کی ہار جیت بھی عارضی ہے اور نفع نقصان بھی عارضی ہے۔ ہار جیت کے فیصلے کا اصل دن یومِ قیامت ہے' اس لیے کہ اس دن کی جیت بھی ابدی ہوگی اور ہار بھی دائمی ہوگی' اور نفع بھی مستقل ہوگا اور نقصان بھی دائمی ہوگا۔ اس کے لیے یہاں فرمایا گیا: ﴿ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ﴾ کہ اصل میں تو وہاں جا کر کھلے گا کہ کون کیا تھا اور کس کی

حقیقت کیا تھی! اور کون بامراد ہوا اور کون نامراد! اور ہار کس کی ہوئی اور جیت کس کی! رہی اس دنیا کی ہار جیت اور کامیابی و ناکامی‘ تو یہ سب عارضی اور فانی ہیں۔ اصل تختہ واصل باقی‘ یعنی اصل بیلنس شیٹ تو قیامت کے روز سامنے آئے گی!

آگے اسی ہار جیت اور کامیابی و ناکامی کی تفصیل بیان ہوئی ہے:

﴿وَمَنۡ یُّؤۡمِنۡۢ بِاللّٰہِ وَیَعۡمَلۡ صَالِحًا یُّکَفِّرۡ عَنۡہُ سَیِّاٰتِہٖ وَیُدۡخِلۡہُ جَنّٰتٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَاۤ اَبَدًا ؕ ذٰلِکَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِیۡمُ ﴿۹﴾﴾

’’اور جو اللہ پر ایمان رکھے گا اور عمل کرے گا بھلے اور درست اللہ اس سے اس کی برائیوں کو دور فرمادے گا اور داخل کرے گا اسے ان باغات میں جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہوں گی‘ جن میں وہ ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔ یہی ہے بڑی اور اصل کامیابی‘‘۔

یہ جیت کی شرح ہوگئی‘ یعنی جنت میں داخلہ اور ہمیشہ کا خلود! گویا یہ ہے مستقل‘ واقعی اور حقیقی جیت! اس کے برعکس ہار کیا ہے؟ اسے آیت ۱۰ میں واضح فرمادیا گیا:

﴿وَالَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَکَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَاۤ اُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ النَّارِ خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَا ؕ وَبِئۡسَ الۡمَصِیۡرُ ﴿۱۰﴾﴾

’’اور جن لوگوں نے انکار کیا اور ہماری آیات کو جھٹلایا وہ آگ والے ہیں‘ جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے‘ اور وہ بہت ہی برا ٹھکانہ ہے‘‘۔

اس موقع پر ایک اور ضروری بات بھی سمجھ لینی چاہیے۔ وہ یہ کہ قرآن مجید میں جہاں کفر اور تکذیب دونوں جرائم کا ذکر ساتھ ساتھ ہوتا ہے وہاں کفر اس کیفیت کو ظاہر کرتا ہے کہ اللہ کی معرفت کی جو شہادتیں انسان کی اپنی فطرت اور اس کے اپنے باطن میں مضمر ہیں‘ انسان ان کو دبا دے‘ چھپا دے اور انہیں بروئے کار نہ آنے دے۔ اور تکذیب اس کے اوپر دہرا جرم ہے کہ جب رسول آئے‘ کتاب اتری‘ اور نورِ وحی نے حق کو بالکل روشن اور مبرہن کر دیا تو اس نے اسے جھٹلا دیا۔ اس طرح دو جرم جمع ہو گئے۔ گویا کفر اور تکذیب بالکل ہم معنی نہیں ہیں‘ بلکہ سورۃ النور کی آیت ۴۰ میں وارد الفاظ ﴿ظُلُمٰتٌۢ بَعۡضُہَا فَوۡقَ بَعۡضٍ ؕ﴾ کے مصداق ظلم پر مزید ظلم اور ایک جرم پر دوسرے جرم کے اضافے کے مترادف ہیں۔

خلاصۂ مباحث

سورۃ التغابن کے پہلے رکوع کی مختصر تشریح وتوضیح ختم ہوئی۔ اس رکوع میں سب سے پہلے اللہ کی ہستی‘ اس کی توحید اور اس کی صفاتِ کمال پر آیاتِ آفاقی کی شہادت کو اس پیرائے میں بیان کیا گیا ہے

کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اللہ کی تسبیح کر رہا ہے۔اور پھر اس کی جلالتِ شان اور اس کی بعض صفاتِ کمال خصوصاً ''قدرت'' اور ''علم'' کا بیان ہوا۔ پھر رسالت کے ذیل میں رسولوں کی تکذیب کرنے والی قوموں کے عذابِ الٰہی سے ہلاک ہونے کا بیان بھی آ گیا اور رسالت کے باب میں ان کی اصل گمراہی کی نشاندہی بھی کر دی گئی کہ انہوں نے بشریت اور نبوت و رسالت کو ایک دوسرے کی ضد خیال کیا۔اس کے بعد منکرینِ بعث بعد الموت کی شدت کے ساتھ تردید اور بعث بعد الموت' حشر و نشر اور جزا و سزا کا بیان اور اس حقیقت کی وضاحت ہوئی کہ اصل ہار جیت اور کامیابی و ناکامی کا فیصلہ قیامت کے دن ہوگا۔ساتھ ہی اللہ تعالیٰ' اُس کے رسول ﷺ اور قرآن مجید پر ایمان کی پُر زور دعوت بھی آ گئی۔اللہ تعالیٰ ہم سب کو حقیقی ایمان نصیب فرمائے' ہمارے قلوب و اذہان کو ایمان کے حقیقی نور سے منور فرمائے اور ہمیں آخرت کی فوز و فلاح سے بہرہ ور فرمائے۔آمین یا ربّ العالمین!

گزشتہ صفحات میں سورۃ التغابن کے پہلے رکوع کا مطالعہ مکمل ہو چکا ہے۔ چنانچہ اس رکوع کی کُل دس آیتوں میں سے پہلی سات آیات میں ایمانیاتِ ثلاثہ یعنی توحید' معاد اور رسالت کا بیان بھی ہو چکا ہے——اور بقیہ تین آیات میں ایمان کی نہایت مؤثر اور زوردار دعوت بھی آ چکی ہے۔اس رکوع کے مضامین کی تقسیم و ترتیب کے ضمن میں ایک نہایت حسین توازن ہمارے سامنے آتا ہے' اور وہ یہ کہ جہاں ایمان کے بیان میں چار آیات توحید کے لیے وقف ہیں اور رسالت اور معاد دونوں کو تین آیات میں سمو لیا گیا ہے' وہاں دعوتِ ایمان کے ضمن میں توحید و رسالت پر ایمان کی دعوت صرف ایک آیت میں آ گئی ہے' جبکہ ایمان بالآخرت کے لیے نہ صرف یہ کہ دو نہایت عظیم اور پُر جلال آیات کلیتاً وقف ہیں بلکہ اس کا ذکر ضمنی طور پر توحید و رسالت پر ایمان کی دعوت والی آیت کے اختتام پر بھی موجود ہے—— اور اس کا سبب وہی ہے جس کی جانب اس سے قبل بھی اشارہ کیا جا چکا ہے' یعنی یہ کہ اگرچہ علمی اور نظری اعتبار سے اصل ایمان' ایمان باللہ ہے' لیکن عملی اعتبار سے سب سے زیادہ مؤثر ایمان' ایمان بالآخرت ہے۔اس عکسی ترتیب کا ایک اضافی فائدہ یہ ہوا کہ چونکہ دوسرے رکوع میں ایمان کے عملی تقاضوں کا بیان آ رہا ہے' لہٰذا پہلے رکوع کے اختتام پر ایمان بالآخرت کی نہایت مؤثر تاکید اس کے لیے حد درجہ مناسب تمہید بن گئی!

ایمان کے پانچ بنیادی لوازم

اب ہم اللہ کے نام سے دوسرے رکوع کا مطالعہ شروع کرتے ہیں۔ یہ رکوع آٹھ آیات پر مشتمل ہے، جن میں سے پہلی پانچ آیات میں ایمان کے پانچ بنیادی نتائج کا ذکر ہے اور بقیہ تین آیات میں ان عملی تقاضوں کو بالفعل ادا کرنے کی تاکیدی دعوت ہے۔ لہٰذا پہلے ہم ابتدائی پانچ آیات کا مطالعہ کرتے ہیں، جن کا متن اور سلیس ورواں ترجمہ حسبِ ذیل ہے:

﴿مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَمَنْ یُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ یَهْدِ قَلْبَهٗ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ﴿۱۱﴾ وَاَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّیْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰی رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ ﴿۱۲﴾ اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ وَعَلَی اللّٰهِ فَلْیَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۳﴾ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ ۚ وَاِنْ تَعْفُوْا وَتَصْفَحُوْا وَتَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۴﴾ اِنَّمَاۤ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ؕ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗۤ اَجْرٌ عَظِیْمٌ ﴿۱۵﴾﴾

''نہیں نازل ہوتی کوئی مصیبت مگر اللہ کی اجازت سے۔ اور جو کوئی اللہ پر ایمان رکھتا ہے اللہ اس کے دل کو ہدایت دیتا ہے۔ اور اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔ اور اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو (اس کے) رسول (ﷺ) کی۔ پھر اگر تم نے روگردانی کی تو (جان رکھو کہ) یقیناً ہمارے رسول پر تو صرف صاف صاف پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے۔ اللہ وہ ہستی ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، پس اہل ایمان کو صرف اللہ پر بھروسہ کرنا چاہیے۔ اے اہل ایمان! یقیناً تمہاری بیویوں اور تمہاری اولاد میں سے بعض تمہارے دشمن ہیں، پس ان سے بچ کر رہو، اور اگر تم معاف کر دیا کرو اور چشم پوشی سے کام لو اور بخش دیا کرو تو بے شک اللہ بھی بخشنے والا رحم فرمانے والا ہے۔ بلاشبہ تمہارے مال اور تمہاری اولاد (تمہارے حق میں) فتنہ ہیں، اور اللہ ہی ہے جس کے پاس بڑا اجر ہے''۔

جیسا کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے، اس سورۂ مبارکہ کے دوسرے رکوع میں جو آیات ہیں ان میں نہایت جامعیت کے ساتھ ایمان کے مقتضیات و متضمنات، مضمرات و مقدرات اور ثمرات و نتائج

کا ذکر ہے۔ گویا ان مضمرات کو کھولا گیا ہے جو ''ایمان'' میں بالکل اسی طرح مخفی ہیں جیسے آم کی گٹھلی میں آم کا پورا درخت بِالقُوّہ (in potential) موجود ہوتا ہے' اس لیے کہ ''ایمان'' ایک خاص مابعد الطبیعیاتی فکر کا عنوان ہے جس سے انسان کا ایک خاص زاویۂ نظر بننا چاہیے اور انسان کے اندازِ فکر میں ایک مخصوص تبدیلی پیدا ہونی چاہیے' اور زاویۂ نگاہ اور طرزِ فکر کی اس تبدیلی کے نتیجے میں اس کی پوری زندگی میں ایک انقلاب آ جانا چاہیے۔ اگر یہ انقلاب بالفعل رونما نہیں ہوتا تو اس کا صاف مطلب یہ ہوگا کہ ابھی ایمان کا اقرار صرف نوکِ زبان تک محدود ہے اور اس نے انسان کی فکر میں جڑیں نہیں پکڑیں۔ اس بات کو اس مثال سے نہایت آسانی کے ساتھ سمجھا جا سکتا ہے کہ ایک تو ایسا ٹُنڈ منڈ درخت ہوتا ہے جس میں نہ پتے ہوتے ہیں' نہ پھول نہ پھل۔ اور ایک ایسا سرسبز و شاداب اور بار آور اور مثمر درخت ہوتا ہے جس میں خوبصورت پتے بھی ہیں اور حسین و دلفریب پھول یا میٹھے اور فرحت بخش پھل بھی۔ تو معاذ اللہ' ایمانِ حقیقی کسی ٹُنڈ منڈ درخت کے مانند نہیں ہوتا' بلکہ ایک سرسبز و شاداب اور مثمر و بار آور درخت کے مشابہ ہوتا ہے۔ چنانچہ جب ایمان اِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ سے آگے بڑھ کر تَصْدِیْقٌ بِالْقَلْبِ کی صورت اختیار کرتا ہے اور دل میں راسخ ہو جاتا ہے' گویا جب انسان کا باطن نورِ ایمان سے منور ہو جاتا ہے تو اس کے اثرات اور اس کے ثمرات و نتائج انسانی شخصیت میں لازماً ظاہر ہوتے ہیں۔

اس بات کو یوں کہہ لیجیے کہ اگر کوئی شخص سلیم الفطرت ہے' گویا اس کے قلب کی زمین صالح ہے' تو جب اس میں ایمان کا بیج جمتا اور پھوٹتا اور نشوونما پاتا ہے تو وہ رفتہ رفتہ ایک تناور درخت کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس درخت میں خوبصورت پتے بھی لگتے ہیں اور حسین و جمیل پھول بھی' جو وقت آنے پر خوش ذائقہ اور رسیلے پھلوں کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ ایمان کے اس شجرۂ طیبہ پر جن ثمراتِ طیبات کا ظہور ہوتا ہے ان میں سے پانچ کا ذکر ان پانچ آیات میں ہے۔ یعنی: (۱) تسلیم و رضا (۲) اطاعت و انقیاد (۳) توکل و اعتماد (۴) ان خطرات سے متنبہ اور چوکس و چوکنا رہنا جو علائقِ دُنیوی خصوصاً بیویوں اور اولاد کی فطری محبت کے پردے میں انسان کے دین و ایمان اور آخرت و عاقبت کے لیے بالقوہ مضمر ہوتے ہیں' اور (۵) مال و اولاد کے بارے میں آگاہ رہنا کہ یہ امتحان اور آزمائش کے ذرائع ہیں!

الغرض اگر کسی انسان کے دل میں ایمانِ حقیقی راسخ ہو جائے اور اس سے اس کا باطن منور ہو

جائے تو اس کے نتیجے میں اس کی پوری شخصیت میں ایک تغیر اور انقلاب واقع ہو جاتا ہے' جیسا کہ علامہ اقبال نے فرمایا: ؎

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود
جاں چوں دیگر شد جہاں دیگر شود

حضرت علامہ نے تو یہ بات قرآن مجید کے بارے میں کہی ہے' لیکن چونکہ قرآن منبعِ ایمان ہے' لہٰذا یہی بات ایمان کے بارے میں کہی جا سکتی ہے کہ جب ایمان انسان کے باطن میں سرایت کر جاتا ہے تو اس کے باطن میں ایک انقلاب آ جاتا ہے' اس کی سوچ بدل جاتی ہے' اس کا نقطۂ نظر تبدیل ہو جاتا ہے' اس کا زاویۂ نگاہ بدل جاتا ہے' اس کی اَقدار تبدیل ہو جاتی ہیں۔ الغرض اس کی پوری سیرت و شخصیت' اس کا ہر فعل و عمل' اس کی پسند و ناپسند کا معیار اور اس کی سعی و جُہد کا رُخ سب بدل کر رہ جاتے ہیں' اور فی الواقع ایک بالکل نیا انسان وجود میں آ جاتا ہے۔ علامہ اقبال کے محولہ بالا شعر کا دوسرا مصرع بہت معنی خیز بلکہ ذو معنی ہے' اس لیے کہ اس میں جہاں ایک جانب اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ جب انسان میں یہ باطنی تبدیلی آ جاتی ہے تو اس کے لیے تو کُل جہاں ہی تبدیل ہو جاتا ہے' وہاں اس عظیم حقیقت کی جانب بھی راہنمائی موجود ہے کہ افرادِ نوعِ انسانی کا یہ باطنی انقلاب ہی ایک عالمی انقلاب کا پیش خیمہ بنتا ہے!

سورۃ التغابن کی جو پانچ آیات اس وقت زیر مطالعہ ہیں' اِن میں اللہ تعالیٰ نے نہایت معجز نما اسلوب میں ان پانچ بنیادی تبدیلیوں کی نشاندہی کر دی ہے جو ایمان کے نتیجے میں انسان کے نقطۂ نظر' اس کے اندازِ فکر اور اس کے عملی رویے اور روش میں نمایاں اور ظاہر ہو جانی چاہئیں۔ اس طرح ان آیات کے ذریعے ہمیں ایک کسوٹی مہیا ہو جاتی ہے جس پر اپنے ایمان کو پرکھ سکیں۔ چنانچہ اگر یہ اثرات و ثمرات ہماری شخصیتوں میں ظاہر ہو گئے ہوں تو ہمیں اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ ایمانِ حقیقی کا نور ہمارے دلوں میں موجود ہے' اور اگر یہ ظاہر نہیں ہو رہے ہیں تو گویا یہ ایک تنبیہہ ہے کہ ہمیں سوچنا چاہیے کہ ہم کہیں ایمانِ حقیقی کی روشنی سے محروم تو نہیں ہیں!

ایمان کے پانچ اساسی ثمرات کا بیان ان آیاتِ مبارکہ میں جس حکیمانہ ترتیب کے ساتھ ہوا ہے اس کے صحیح فہم و شعور کے لیے پہلے اس حقیقت کو ذہن نشین کر لیں کہ اوّلاً ہر انسان اپنی انفرادی حیثیت میں انسانی معاشرے کی مکمل اکائی کا درجہ رکھتا ہے' اور ثانیاً اس کا اپنے معاشرے اور ماحول کے ساتھ

گہرا ربط و تعلق ہوتا ہے۔ پھر ایک فرد کی حیثیت سے بھی انسان کی شخصیت کے دو رُخ ہیں۔ یعنی ایک تو وہ خارجی حالات و واقعات اور تغیرات و حوادث ہیں جو اس پر اثر انداز ہوتے ہیں اور دوسرے وہ افعال و اعمال ہیں جو اس کے اعضاء و جوارح اور فی الجملہ پورے وجود سے ''صادر'' ہوتے ہیں۔ اسی طرح ہر فرد اپنے گرد و پیش اور معاشرے و ماحول سے دو قسم کے بندھنوں میں بندھا ہوا ہے' ایک علائقِ دُنیوی اور دوسرے مال و اسبابِ دُنیوی' جنہیں علامہ اقبال مرحوم نے نہایت خوبصورتی سے اس شعر میں سمو دیا ہے کہ: ؎

یہ مال و دولتِ دنیا' یہ رشتہ و پیوند
بتانِ وہم و گماں' لا الٰہ الاّ اللہ!

پھر دو آیات میں انسان سے صادر ہونے والے اعمال و افعال کے ضمن میں دو پہلوؤں سے ایمان کے اثرات کا بیان ہے ——— اور آخری دو آیات میں ''مال و دولتِ دنیا'' اور ''رشتہ و پیوندِ دُنیوی'' کے ضمن میں ایک مؤمن کے نقطۂ نظر کو واضح کیا گیا ہے۔

۱) تسلیم و رضا

سب سے پہلی بات مصائبِ دُنیوی کے بارے میں فرمائی گئی۔ فرمایا: ﴿مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَۃٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰہِ ؕ﴾ ''نہیں نازل ہوتی کوئی مصیبت مگر اللہ کی اجازت سے''۔ آیت کے اس چھوٹے سے ٹکڑے میں معانی و مفاہیم کا ایک خزینہ پنہاں ہے۔ اس کی قدرے تشریح و توضیح کی جائے تو وہ یہ ہو گی کہ اگر تم ایک علیم اور حکیم اللہ کو مانتے ہو کہ وہ ہر چیز پر قدرت بھی رکھتا ہے' اور یہ بھی تسلیم کرتے ہو کہ وہی اس کائنات کا اصل حکمران ہے اور اس کے اِذن کے بغیر ایک پتہ تک نہیں ہل سکتا' تو اس کا لازمی اور منطقی نتیجہ یہ ہے کہ کوئی مصیبت' کوئی تکلیف' کوئی نقصان' کوئی حادثہ' کوئی موت' کوئی افتاد اور کسی بھی قسم کے ناخوشگوار واقعات و حوادث اِذنِ خداوندی کے بغیر وارد اور ظہور پذیر نہیں ہو سکتے۔ اب جو چیز اُس اللہ کے اِذن سے ہو جو سمیع بھی ہے اور بصیر بھی' علیم بھی ہے اور خبیر بھی اور ان سب پر مستزاد کامل حکیم بھی' تو اس پر شکوہ و شکایت کیسی اور اس پر دل میں تکدّر کیوں؟

واضح رہے کہ یہاں اس صدمہ اور ملال کی بات نہیں ہو رہی جس کا فوری اور غیر اختیاری اثر طبیعت پر ہوتا ہے' بلکہ یہاں اس حقیقت کی جانب رہنمائی ہو رہی ہے کہ بندۂ مؤمن کا قلب ناخوشگوار واقعات و حوادث سے کوئی مستقل تأثر قبول نہیں کرتا۔ چنانچہ نہ اس کی زبان پر گلہ اور شکوہ آتا ہے اور

نہ ہی اس کے دل میں اپنے ربّ کی جانب سے کسی بدگمانی کا شائبہ پیدا ہوتا ہے‘ بلکہ ان مصائب و آلام پر بھی اس کا ردِّعمل بالکل وہی ہوتا ہے جو اس مصرعے میں بیان ہوا ہے کہ ع

’’ہر چہ ساقیٔ ما ریخت عین الطاف است‘‘ (میرے ساقی نے میرے پیمانے میں جو بھی ڈال دیا ہے وہ سراسر اس کا لطف و کرم ہے) اس لیے کہ توحید پر ایمان کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ انسان کو یہ یقین ہو کہ جملہ واقعات و حوادث خواہ وہ اس عالمِ اسباب و عِلل کے کتنے ہی طول طویل سلسلے کے نتیجے میں ظہور پذیر ہو رہے ہوں‘ چونکہ ان جملہ اسباب و علل کا آخری سرا اللہ کے ہاتھ میں ہے‘ لہٰذا مسبّبِ حقیقی اور مؤثرِ حقیقی اس کے سوا اور کوئی نہیں۔ لہٰذا ان حوادثِ دُنیوی پر ایک بندۂ مؤمن کا ردِّعمل یہی ہونا چاہیے کہ اگر میرے ربّ کو یہی منظور ہے تو میں بھی اس پر راضی ہوں۔ اسی کو مقامِ تسلیم و رضا کہتے ہیں جس کے بارے میں علامہ اقبال نے کہا ہے: ؎

برون کشید ز پیچاکِ ہست و بود مرا
چہ عقدہ ہا کہ مقامِ رضا کشود مرا

یعنی اس مقامِ رضا نے میرے کیسے کیسے عقدے حل کر دیے کہ میں اس پیچ و تاب سے بالکل نجات پا گیا کہ ایسا کیوں ہے اور ویسا کیوں نہیں ہے‘ اور یہ کیوں ہوا‘ وہ کیوں نہ ہوا؟

چنانچہ اسی کا ذکر ہے آیت کے بقیہ حصے میں کہ: ﴿وَمَنۡ یُّؤۡمِنۡۢ بِاللّٰہِ یَہۡدِ قَلۡبَہٗ ؕ وَاللّٰہُ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ ﴿۱۱﴾﴾ ’’اور جو کوئی اللہ پر ایمان رکھتا ہے اللہ اس کے دل کو ہدایت دیتا ہے‘ اور اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔‘‘ یعنی جب انسان قلبی ایمان و یقین کے نتیجے میں اس حقیقتِ نفس الامری کا ادراک حاصل کر لیتا ہے کہ اس کائنات اور عالمِ اسباب و علل میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ اذنِ خداوندی سے ہو رہا ہے‘ تو اللہ اس کے دل کو تسلیم و رضا کی ہدایت بخشتا ہے اور اسے قلبی اطمینان و سکون کی دولت سے نوازتا ہے۔ اور جب انسان اس مقامِ تسلیم و رضا پر پہنچ جاتا ہے تو اس کے احساسات فی الواقع یہ ہو جاتے ہیں کہ مجھے بھی وہی پسند ہے جو میرے ربّ نے میرے لیے پسند کیا ہے‘ وہ میرا مولیٰ ہے‘ آقا ہے‘ پروردگار ہے‘ خالق و مالک ہے اور مزید برآں میرا خیر خواہ ہے‘ جو میری مصلحتوں کو مجھ سے زیادہ جاننے والا ہے —— لہٰذا مجھے اس کا ہر فیصلہ بسر و چشم قبول ہے۔ گویا ع

’’سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے!‘‘

بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ ؎

نہ شود نصیبِ دشمن کہ شود ہلاکِ تیغت
سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی!

جب کسی بندۂ مؤمن کے دل میں راضی برضائے ربّ ہونے کی یہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے تو اسے سینکڑوں الجھنوں سے نجات مل جاتی ہے' اور اس کے نہاں خانۂ قلب میں نہ حزن و ملال مستقل طور پر ڈیرہ ڈال سکتے ہیں' نہ حسرتوں کے الاؤ سلگتے ہیں اور نہ ہی اسے گوناگوں قسم کی محرومیوں اور دل شکنیوں کے اس کرب سے سابقہ پیش آتا ہے جو بسا اوقات اختلالِ ذہنی کا سبب بنتا ہے اور اگر شدت اختیار کر جائے تو خودکشی تک پر منتج ہو جاتا ہے۔

۲) اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت

اب آیئے دوسرے رُخ یعنی ان اَفعال و اعمال کی طرف جو ہم سے صادر ہوتے ہیں' اور ان میں سے بھی اصلاً وہ جو ہمارے ارادے کے تابع ہیں۔ اس لیے کہ ہمارے جسم کے بہت سے اعضاء تو وہ ہیں جو اپنے فطری وظائف از خود ادا کرتے رہتے ہیں اور ان کے فعل میں ہمارے شعور اور ارادے کا دخل نہیں ہوتا۔ ایسے غیر ارادی افعال کے ضمن میں ظاہر ہے کہ ہماری کوئی اخلاقی مسئولیت نہیں ہے۔ لیکن ہماری زندگی کی اصل باگ ڈور جن ارادی اور اختیاری افعال و اعمال سے عبارت ہے ان کے ضمن میں ایمان کا جو لازمی نتیجہ نکلنا چاہیے اس میں مقدم ترین شے ہے اطاعت —— یعنی یہ کہ ہمارے اعضاء و جوارح سے کوئی عمل اللہ کے حکم کے خلاف صادر نہ ہو' اس لیے کہ اگر ہم اللہ پر ایمان لانے کے مدّعی ہیں اور ہم نے دلی یقین کے ساتھ اللہ کو مانا ہے تو ہم پر لازم اور واجب ہے کہ ہم کوئی ایسا کام اور کوئی ایسی حرکت نہ کریں جس سے اللہ کا کوئی حکم ٹوٹتا ہو یا اس کی نافرمانی کا ارتکاب ہوتا ہو۔ چنانچہ ہماری زبان سے کوئی ایسا لفظ نہ نکلے جو اللہ کو ناپسند ہو اور ہمارے ہاتھ پاؤں کسی ایسے کام کے لیے حرکت میں نہ آ جائیں جو حکمِ خداوندی کے خلاف ہو۔

پھر معاملہ صرف اللہ کا نہیں بلکہ اس کے رسول حضرت محمد ﷺ کا بھی ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ہدایت ہر انسان کے پاس براہِ راست نہیں بھیجی۔ اس دنیا میں ہدایتِ ربّانی کا ذریعہ رسول ہوتے ہیں' لہٰذا اللہ کی اطاعت اس کے رسولؐ کے واسطے سے ہی ممکن ہے۔ چنانچہ اطاعت کے باب میں اللہ اور اس کا رسولؐ باہم اس طرح جمع ہیں گویا وہ ایک وحدت ہیں۔ لہٰذا اگلی آیت کے پہلے حصے میں ارشاد ہوا: ﴿وَاَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ﴾ ''اور اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو (اس کے)

رسول (ﷺ) کی''۔ گویا مدعیانِ ایمان سے مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ جب تم نے مانا ہے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو تو اس ایمان کا لازمی نتیجہ یہ نکلنا چاہیے کہ تمہارے اعضاء و جوارح سے جو بھی اعمال و افعال صادر ہوں وہ سب کے سب اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ہوں۔ یہ ایمان کا دوسرا لازمی نتیجہ ہے۔

اطاعت کے حکم کے ساتھ ہی یہ تنبیہ بھی فرما دی کہ: ﴿فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ⑫﴾ ''پھر اگر تم نے روگردانی کی (پیٹھ موڑ لی، اعراض کیا) تو (جان رکھو کہ) ہمارے رسولؐ پر تو صرف صاف صاف پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے''۔ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی تعلیمات سے روگردانی اور ان کی تکذیب سے اللہ تعالیٰ کا کچھ نہیں بگڑتا، انسان خود اپنی عاقبت خراب کرتا ہے اور آخرت میں سزا و عذاب کا مستوجب قرار پاتا ہے۔ اسی طرح رسولؐ پر بھی سوائے صاف صاف پہنچا دینے کے اور کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ لہٰذا اگر رسولؐ نے اپنی یہ ذمہ داری پوری کر دی ہے تو وہ آخرت میں سرخرو ہوں گے، اس لیے کہ وہ تمہاری جانب سے جواب دہ نہیں، تمہیں اپنے اعمال و افعال کی خود جواب دہی کرنی ہوگی، اپنے بھلے برے، اپنے نفع و نقصان اور اپنی کامیابی یا ناکامی کے ذمہ دار تم خود ہوگے!

۳) توکل علی اللہ

ہمارے وجود سے صادر ہونے والے افعال و اعمال کا ایک دوسرا رُخ بھی ہے۔ چنانچہ اس کو بھی یہاں واضح کر دیا گیا۔ ارشاد ہوتا ہے: ﴿اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ⑬﴾ ''اللہ ہی وہ ذات ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، لہٰذا اہل ایمان کو صرف اللہ پر ہی بھروسہ رکھنا چاہیے!'' یعنی ایمان کے نتیجے میں ہمارا سارا بھروسہ، سارا تکیہ، سارا اعتماد اور سارا توکل اللہ کی ذات پر ہونا چاہیے، اگرچہ ہم اس اسباب و علل کی دنیا میں ساز و سامان اور ذرائع و وسائل سے مستغنی نہیں ہو سکتے اور اپنی امکانی حد تک ہمیں اسباب بھی فراہم کرنے ہوں گے، جیسے ایک دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ ......﴾ (الانفال: ۶۰) یعنی اپنے دشمن کے مقابلے کے لیے تیاری کرو اور مقدور بھر جو ساز و سامان فراہم کر سکتے ہو فراہم کرو۔ اور جیسے نبی کریم ﷺ نے تعلیم دی کہ ''پہلے اونٹ کو باندھو، پھر اللہ پر بھروسہ کرو''۔ جس کی بہترین ترجمانی مولانا روم نے اس مصرع میں فرمائی ہے ؏ ''بر توکل زانوئے اشتر بہ بند!'' چنانچہ اپنی استطاعت کے

مطابق دُنیوی اور مادی اسباب اور ساز وسامان فراہم کرنا ایمان کے منافی نہیں ہے‘ لیکن اگر یہ خیال ہو گیا کہ مجرد اِن اسباب و وسائل اور ساز وسامان سے کام ہو جائے گا‘ گویا اصل بھروسہ‘ اعتماد اور تکیہ اپنی محنت‘ اپنی تیاری اور اپنے ساز وسامان پر اور اصل توکل مادی اسباب و وسائل پر کیا تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ اللہ کی ذات سے ہماری نگاہیں ہٹ گئیں اور ہم اس سے محجوب ہو گئے‘ اس کی کمالِ قدرت کا یقین دل میں قائم نہیں رہا۔ حاصلِ کلام یہ کہ اس عالمِ اسباب میں محنت و کوشش اپنی جگہ ضروری ہے اور امکانی حد تک اسباب و وسائل کی فراہمی اور ان کا استعمال بھی لازمی ہے‘ لیکن توکّل صرف اور صرف اللہ کی ذات پر ہو گا۔ ان تین آیاتِ مبارکہ میں انفرادی سطح پر ایمان کے ثمرات ونتائج کا بیان مکمل ہو گیا۔

۴) طبعی محبتوں کے ضمن میں احتیاط

انسان اس دنیا میں تنہا نہیں رہتا۔ مدنیت اس کی جبلت اور طبیعت میں رچی بسی ہے۔ لہٰذا وہ اس دنیا میں بہت سے تعلقات میں جکڑا ہوا ہے جن کے کئی دائرے ہیں۔ ایک دائرہ اس کے والدین‘ بھائی بہن اور بیوی بچوں کا ہے۔ دوسرے دائرے میں رشتہ دار اور اعزّہ و اقارب ہیں۔ پھر کنبے اور قبیلے کا دائرہ اور اس کے بعد قوم کا دائرہ ہے اور بالآخر یہ سلسلہ پوری نوعِ انسانی تک پھیل جاتا ہے۔ ان سب کو ایک لفظ میں جمع کیا جائے تو وہ ہے ’’علائقِ دُنیوی‘‘۔ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں تمدن وتہذیب کی گاڑی کو چلانے کے لیے ان علائقِ دُنیوی کے ضمن میں بہت سی فطری محبتیں انسان کے دل میں ڈال دی ہیں۔ انسان کو والدین‘ بہن بھائیوں‘ بیوی‘ اولاد اور رشتہ داروں سے محبت ہوتی ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان محبتوں میں سب سے زیادہ قوی محبت بیویوں اور اولاد کی محبت ہے۔ اس طبعی محبت کی طرف اگلی آیت میں متنبہ فرمایا گیا کہ اگر اس میں حدِّ اعتدال سے تجاوز ہو جائے تو یہی محبت انسان کے لیے دشمنی کا روپ دھار لے گی۔ لہٰذا اس کے ضمن میں احتیاط کی ضرورت ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِکُمْ وَاَوْلَادِکُمْ عَدُوًّا لَّکُمْ فَاحْذَرُوْھُمْ ج﴾ ’’اے اہلِ ایمان! یقیناً تمہاری بیویوں اور تمہاری اولاد میں سے بعض تمہارے دشمن ہیں‘ پس ان سے ہوشیار رہو!‘‘

یہ انتباہ اس لیے ضروری ہے کہ فی الواقع ان محبتوں میں انسان کے لیے بالقوہ خطرہ موجود ہے‘ اس لیے کہ اگر آخرت نہ ہوتی اور حساب کتاب نہ ہوتا اور کوئی جواب دہی نہ ہوتی تب تو کوئی تشویش کی بات نہ ہوتی۔ اس صورت میں تو انسان کو کھلی چھٹی ہوتی کہ بیویوں کی فرمائشیں پوری کرے‘ خواہ

حلال سے کرے‘ خواہ حرام سے کرے‘ اولاد کو اچھے سے اچھا کھلائے اور پہنائے اور ان کو اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم دلانے کی فکر کرے‘ چاہے جائز ذرائع آمدنی سے ہو‘ چاہے ناجائز ذرائع آمدنی سے ہو — لیکن جب یہ حقیقت سامنے آ چکی ہے کہ یہ زندگی تو بہت عارضی اور مختصر ہے‘ اصل زندگی تو آخرت کی زندگی ہے جسے کبھی ختم نہیں ہونا اور اصل فیصلے کا دن تو قیامت کا دن ہے‘ یعنی وہی ہے ہار اور جیت کے فیصلے کا دن! پس اگر اس حقیقت کو جاننے کے بعد بھی تم نے اپنی بیویوں اور اولاد کی محبت سے مغلوب ہو کر اور ان کی خوشنودی کی خاطر اللہ کی حرام کردہ چیزوں میں مُنہ مارا‘ ناجائز آمدنیوں کا رُخ کیا اور ان کو عیش کرانے اور ان کی فرمائشیں پوری کرنے کے لیے تم نے حلال وحرام کی تمیز کو ختم کر دیا اور جائز و ناجائز کا خیال نہ رکھا تو جان لو کہ یہ تمہارے حق میں محبت نہیں‘ دشمنی ہے‘ اور اگر تم محتاط‘ چوکس اور چوکنے نہ رہے تو یہی بے جا محبت اور لاڈ پیار تمہاری عاقبت کی بربادی کا سبب بن جائے گا۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ کا ارشادِ مبارک ہے کہ: ’’بڑا ہی نادان ہے وہ شخص جس نے دوسروں کی دنیا بنانے کے لیے اپنی عاقبت تباہ و برباد کر لی‘‘۔

آیت کے دوسرے حصے میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿وَاِنۡ تَعۡفُوۡا وَتَصۡفَحُوۡا وَتَغۡفِرُوۡا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۱۴﴾﴾ ’’اور اگر تم معاف کر دیا کرو اور چشم پوشی سے کام لو اور بخش دیا کرو تو بے شک اللہ بھی بخشنے والا رحم کرنے والا ہے‘‘۔ آیت کے اس حصے میں جہاں فصاحت و بلاغت کا کمال سامنے آتا ہے وہاں صحیح اور معتدل رویّہ اختیار کرنے کی نہایت پُر زور اور مدلّل دعوت بھی سامنے آتی ہے۔ چنانچہ جہاں اس پر زور دیا گیا کہ تمہاری بیویوں اور اولاد میں سے بعض تمہارے حق میں بالقوہ دشمن ہیں‘ لہٰذا اپنا تحفظ کرو کہ کہیں ان کی محبت تمہیں جادۂ حق سے منحرف نہ کر دے اور تمہاری عاقبت تباہ نہ کرا دے‘ وہاں دوسری طرف اس کو متوازن کیا گیا کہ ایسا نہ ہو کہ تمہارے مزاج میں خشونت‘ درشتی اور سختی کا غلبہ ہو جائے اور گھر میدانِ جنگ کا سماں پیش کرنے لگے‘ اور محبت‘ شفقت اور نرمی کا ظہور بالکل نہ ہو۔ لہٰذا اس اعتبار سے تو ضرور چوکس اور چوکنے رہو کہ ان کی محبت کہیں غفلت میں تم سے دین کے خلاف کوئی کام نہ کرا لے‘ لیکن ان کی صحیح تربیت کے لیے محبت‘ شفقت اور نرمی لازمی ہے‘ لہٰذا عفو اور درگزر بھی ضروری ہے!

یہاں غور کیجیے کہ اس عفو و درگزر کے لیے دلیل کیا دی جا رہی ہے! اور پھر اس میں کتنی مؤثر اپیل مضمر ہے! —— یعنی یہ کہ اللہ بھی تو غفور اور رحیم ہے‘ ذرا سوچو کہ اللہ نے تم کو کتنی ڈھیل دے رکھی ہے۔

اپنے باطن میں جھانک کر دیکھو کہ کتنے مفاسد لیے پھر رہے ہو' لیکن اللہ پھر بھی چشم پوشی کیے ہوئے ہے اور تمہیں مہلت دے رہا ہے اور اس کی ربوبیت اور جُود وسخا کا سلسلہ جاری ہے' لہٰذا تم کو بھی چاہیے کہ اپنی بیویوں اور اولاد کے لیے یہی رویہ اختیار کرو۔

میرے نزدیک یہ آیت قرآن حکیم کے ان خاص مقامات میں سے ہے جہاں ذہنِ انسانی بے اختیار یہ بات تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ یہ اللہ کے سوا کسی اور کا کلام نہیں ہوسکتا' اس لیے کہ یہ توازن اور اعتدال صرف اللہ تعالیٰ ہی کے کلام میں ممکن ہے —— الغرض یہ آیتِ مبارکہ جملہ علائقِ دُنیوی کے ضمن میں ایک بندۂ مؤمن کے زاویۂ نگاہ اور اندازِ فکر کے ساتھ اس کے عملی رویے کو بھی متعین کر دیتی ہے۔ اس لیے کہ جب محبوب ترین علائق کے ضمن میں ہدایت مل گئی تو علائقِ دُنیوی کے دوسرے دائرے تو بہرحال ان کے مقابلے میں ثانوی حیثیت کے حامل ہیں۔

۵) مال اور اولاد فتنہ ہیں!

اس دنیا میں علائقِ دُنیوی کے ساتھ جس دوسری چیز سے انسان بندھا ہوا ہے وہ مال واسبابِ دُنیوی ہیں جن سے انسان کی حیاتِ دُنیوی کی ضروریات پوری ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں ایک دوسرے مقام پر (سورۃ النساء: ۵) انہیں حیاتِ دُنیوی کے بقاء اور قیام کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے' لہٰذا ان سے ایک طبعی اور قدرتی لگاؤ بھی انسان کی جبلّت کا جزوِ لاینفک ہے۔ لیکن اگر اس طبعی لگاؤ میں شدت پیدا ہو جائے اور یہ چیزیں فی نفسہٖ محبوب اور مطلوب ومقصود بن جائیں تو آخرت اور عاقبت کے اعتبار سے ان سے زیادہ مضر اور تباہ کن اور کوئی چیز نہیں ہوتی —— پھر اپنے دُنیوی مستقبل کے لیے انسان جس طرح پس انداز اور جمع شدہ مال پر تکیہ کرتا ہے ایسے ہی اولاد سے بھی امیدیں لگاتا ہے۔ لہٰذا اس مقام پر مال کے ساتھ اولاد کا ذکر دوبارہ کر دیا گیا کہ ہوشیار رہو کہ ان دونوں کی محبت تمہارے حق میں فتنہ ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: ﴿اِنَّمَآ اَمۡوَالُکُمۡ وَاَوۡلَادُکُمۡ فِتۡنَۃٌ ؕ﴾ ''بلاشبہ تمہارے مال اور تمہاری اولاد (تمہارے حق میں) فتنہ ہیں'' —— فتنہ کے لغوی معنی ''کسوٹی'' کے ہیں۔ یعنی وہ چیز جس پر پرکھ کر دیکھا جاتا ہے کہ سونا خالص ہے یا اس میں کھوٹ اور ملاوٹ ہے۔ چنانچہ اہل ایمان کو بتایا جارہا ہے کہ اس دنیا میں مال اور اولاد تمہارے لیے کسوٹی ہیں' یعنی تمہاری آزمائش کا ذریعہ ہیں اور ان پر تم کو پرکھا جارہا ہے کہ کہیں تم ان کی محبت سے مغلوب ہو کر اللہ کو بھول تو نہیں جاتے اور اس کے اوامر ونواہی سے بے پروا ہو کر اپنی عاقبت تو خراب نہیں کر لیتے ——!

اس آیت کا اختتام ان الفاظِ مبارکہ پر ہوتا ہے: ﴿وَاللّٰهُ عِنۡدَهٗۤ اَجۡرٌ عَظِيۡمٌ ۞﴾ ''اور اللہ ہی کے پاس ہے اجرِ عظیم!'' — گویا امیدیں وابستہ کرنی ہیں تو اللہ سے کرو' امیدوں کو بر لانے والا' توقعات کو پورا کرنے والا اور تمہاری محنت کی صحیح اجرت دینے والا تو حقیقت میں صرف اللہ ہی ہے۔ لہٰذا اپنی ذاتی صلاحیتوں اور قوتوں کے علاوہ اپنے مال اور اپنی اولاد کو بھی اسی کی راہ میں لگاؤ۔ عام طور پر انسان کی تمام توانائیاں اور اس کا کُل وقت یا زیادہ سے زیادہ وقت مال و دولت جمع کرنے کی خاطر صرف ہوتا ہے یا اولاد پر صرف ہو جاتا ہے' اور انسان توقع کرتا ہے کہ اولاد اس کے بڑھاپے کا سہارا بنے گی۔ جبکہ ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ انسان مال و اسبابِ دُنیوی کو صرف حیاتِ دُنیوی کی ضروریات پوری کرنے کا ذریعہ سمجھے اور اس سے دلی محبت نہ رکھے اور اولاد کی پرورش اور تعلیم و تربیت کو بھی اللہ کی طرف سے عائد شدہ ذمہ داری کی حیثیت سے ادا کرے' نہ کہ طبعی محبت کی بنیاد پر' یا اسے اپنے مستقبل اور بڑھاپے کا سہارا سمجھ کر —— اور اپنی سعی و جہد کا اصل مطلوب و مقصود اللہ کی رضا جوئی اور آخرت کی فلاح کو قرار دے۔

ایمان کے عملی تقاضے

اب ہم اللہ کے نام سے سورۃ التغابن کی آخری تین آیات پر توجہ مرکوز کرتے ہیں۔ اس سورۂ مبارکہ کے بارے میں یہ تأثر اس سے قبل بیان کیا جا چکا ہے کہ یہ ''ایمان اور اس کے ثمرات و مقتضیات'' کے موضوع پر قرآن مجید کی جامع ترین سورت ہے۔ اس سورت کے مضامین کی ترتیب اس اعتبار سے بڑی حسین ہے کہ اس کے پہلے رکوع میں ایمان کے تینوں اجزاء (ایمان باللہ' ایمان بالرسالت اور ایمان بالآخرت) کی نہایت جامع وضاحت اور ان پر ایمان لانے اور انہیں حرزِ جان بنانے کی زوردار دعوت ہے۔

دوسرا رکوع آٹھ آیات پر مشتمل ہے۔ ان میں سے پانچ آیات کا مطالعہ ہم کر چکے ہیں۔ ان میں ایمان کے ثمرات اور مضمرات کا نہایت جامع بیان ہمارے سامنے آ چکا ہے۔ اس کے بعد تین آیات جن پر یہ سورۂ مبارکہ مکمل ہوتی ہے' ایمان کے عملی تقاضوں کو بالفعل ادا کرنے کی دعوت پر مشتمل ہیں' جنہیں تین اہم اصطلاحات کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے۔ یعنی (۱) تقویٰ (۲) سمع و اطاعت اور (۳) انفاق فی سبیل اللہ اور اللہ کو قرضِ حسنہ دینا۔ آخر میں مضمون کی مناسبت سے اللہ

تعالیٰ کی چند صفاتِ کمال اور اسمائے حسنیٰ کا بیان ہے۔ تو آیئے پہلے ان آیات کا متن اور رواں ترجمہ ذہن نشین کر لیں!

﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا وَاَنْفِقُوْا خَيْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ ؕ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۶﴾ اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعِفْهُ لَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ شَكُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۷﴾ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۸﴾﴾

''پس اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جتنا تمہارے امکان میں ہو اور سنو اور اطاعت کرو اور خرچ کرو' یہی تمہارے حق میں بہتر ہے' اور جو کوئی اپنے جی کے لالچ سے بچا لیا گیا تو وہی ہوں گے جو آخری منزلِ مراد کو پہنچ سکیں گے۔ اگر تم اللہ کو قرضِ حسنہ دو تو وہ اسے تمہارے لیے دوگنا کرتا رہے گا اور تمہاری بخشش فرمائے گا' اور اللہ قدر دان بھی ہے نہایت علم والا بھی ہے۔ وہ کھلے اور چھپے سب کا جاننے والا ہے' زبردست' صاحبِ حکمتِ کاملہ ہے!''

جیسے اس سورۂ مبارکہ کی ابتدائی سات آیات میں ایمان کے بنیادی اجزاء کا بیان تھا اور پھر کلمہ ''ف'' سے پُرزور پیرائے میں دعوتِ ایمانی شروع ہوئی تھی' اسی طرح دوسرے رکوع کی پہلی پانچ آیات میں ایمان کے ثمرات و مضمرات کا بیان تھا اور اب پھر کلمہ ''ف'' ہی سے دعوتِ عمل شروع ہوتی ہے اور اس کے ضمن میں تھوڑا سا غور کرنے پر ایک نہایت حسین ربط نظر آتا ہے کہ ایمانیات میں اوّلین ایمان ہے ایمان باللہ۔ لہٰذا یہاں عمل کی دعوت اس بات سے شروع ہوئی کہ: ﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ ''پس اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جتنا بھی تمہاری حدِ استطاعت میں ہے'' —— گویا ایمان باللہ کا عملی تقاضا یہ ہے کہ انسان میں اللہ کا تقویٰ پیدا ہو جائے' اور تقویٰ بھی تھوڑا بہت نہیں' بلکہ امکانی حد تک' مقدور بھر۔ ایمان کے بیان میں دوسرے نمبر پر ذکر تھا ایمان بالرسالت کا' لہٰذا یہاں ایمان کا دوسرا عملی تقاضا بیان ہوا ''سمع و طاعت'' کے حوالے سے' جس کا نقطۂ آغاز عملی اعتبار سے رسول اللہ ﷺ کی ذات و شخصیت ہے۔ آخر میں ذکر تھا ایمان بالآخرت کا' جس کا اہم ترین عملی مظہر انفاق فی سبیل اللہ ہے' لہٰذا تیسرے نمبر پر ذکر ہوا انفاق اور اللہ کو قرضِ حسن دینے کا!

۱) تقویٰ

عام طور پر ''تقویٰ'' کا ترجمہ ''خوف'' یا ''ڈر'' کے الفاظ سے کر دیا جاتا ہے' حالانکہ یہ ''تقویٰ'' کے معنی و مفہوم کی صحیح اور کامل ترجمانی نہیں ہے۔ ڈر یا خوف ایک تو ہوتا ہے کسی خطرناک' خوفناک اور

ڈراوَنی شے کا‘ تو تقویٰ سے یہ ڈر مراد نہیں۔ اور ایک خوف اور ڈر وہ ہوتا ہے جس میں محبت کی آمیزش اور چاشنی بھی موجود ہوتی ہے‘ یعنی محبت بھرا خوف۔ یہ خوف تقویٰ کی کسی حد تک صحیح ترجمانی ہے۔ بغرضِ تفہیم مثال پیشِ خدمت ہے کہ جیسے آپ کو اپنے والد سے محبت ہے اور آپ نہیں چاہتے کہ آپ کے والد آپ سے ناراض ہوں یا آپ کے کسی کام سے ان کی دل شکنی ہو یا ان کے جذبات کو ٹھیس پہنچے۔ اس کا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ آپ کوئی ایسا کام نہیں کرتے جو آپ کے والد کو ناپسند ہو۔ گویا آپ اپنے والد کی ناراضی کے خوف سے اُن کاموں کے ارتکاب سے احتراز کرتے ہیں جو انہیں ناپسند ہوں‘ پس آپ کے اس محبت بھرے خوف کو ’’تقویٰ‘‘ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ گویا اللہ کا تقویٰ یہ ہے کہ انسان اپنی پوری زندگی میں پھونک پھونک کر قدم رکھے اور اس کے قلب اور ذہن پر ہر وقت یہ خیال مستولی رہے کہ میرے کسی قول اور میرے کسی عمل سے میرا خالق و مالک مجھ سے ناراض نہ ہو جائے‘ اور اسے ہر وقت یہ فکر دامنگیر رہے کہ کوئی ایسا کام نہ کر بیٹھوں جو میرے ربّ کو پسند نہ ہو۔ یہ کیفیت‘ یہ طرزِ عمل‘ یہ رویہ اور یہ اندازِ فکر تقویٰ کی اصل حقیقت ہے!

قرآن حکیم میں سورۂ آل عمران کی آیت ۱۰۲ میں تقویٰ کے ضمن میں یہ شدید تاکید آئی ہے کہ: ﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقٰتِہٖ......﴾ ’’اے اہل ایمان! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جتنا کہ اس کے تقویٰ کا حق ہے‘‘—— روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بڑے ہی مضطرب اور پریشان ہو گئے تھے کہ اللہ کا اتنا تقویٰ جتنا اس کا حق ہے‘ کون اختیار کر سکتا ہے!! بالکل ایسے جیسے کہ اللہ کی اتنی معرفت حاصل کرنا جتنی کہ اس کا حق ہے‘ کسی انسان کے بس میں نہیں ہے۔ چنانچہ رسولِ کامل اور عارفِ اعظم حضرت محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود فرماتے ہیں: ((مَا عَبَدْنَاکَ حَقَّ عِبَادَتِکَ وَمَا عَرَفْنَاکَ حَقَّ مَعْرِفَتِکَ)) ’’(اے اللہ!) ہم تیری بندگی نہ کر پائے جیسا کہ تیری بندگی کا حق ہے‘ اور ہم تجھے پہچان نہ سکے جیسا کہ تجھے پہچاننے کا حق ہے‘‘۔ تو اگرچہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں تو یہی گمان ہے کہ یہ کلمات آپؐ نے بر بنائے تواضع ارشاد فرمائے‘ لیکن کسی بھی دوسرے انسان کے بارے میں تو اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ اللہ کی ’’کماحقہٗ‘‘ معرفت کا حصول اس کے دائرۂ اختیار اور حدِّ امکان سے خارج ہے! یہی معاملہ تقویٰ کا ہے۔ اللہ کا اتنا تقویٰ جتنا اس کے تقویٰ کا حق ہے‘ یہ کسی انسان کے بس کی بات نہیں ہے‘ اس لیے کہ اس کا تقاضا تو یہ ہوگا کہ ہم ایک لمحہ کے لیے بھی اللہ کی یاد سے غافل نہ ہوں‘ اور ہر وقت شعوری طور پر چوکنے اور چوکس رہیں کہ ہمارے اعضاء و

جوارح سے کہیں اور کبھی کوئی ایسی حرکت صادر نہ ہونے پائے جو اللہ کے کسی حکم یا منشاء کے خلاف ہو۔ لہٰذا اس پر صحابہؓ کی تشویش بالکل بجا تھی۔ البتہ جب سورۃ التغابن کی یہ آیت نازل ہوئی کہ ﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ ''پس اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جتنا تمہارے امکان اور حدِ استطاعت میں ہے'' تب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو تسکین حاصل ہوئی!

واضح رہے کہ یہی بات سورۃ البقرۃ میں بھی ایک قاعدہ کلیہ کے طور پر وارد ہوئی ہے کہ: ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۭ﴾ (آیت ۲۸۶) ''اللہ کسی نفس کو مکلّف نہیں ٹھہراتا مگر اُس کی وسعت کے مطابق''۔ اور یہی اصول سورۃ المؤمنون میں بھی وارد ہوا ہے کہ: ﴿وَلَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ (آیت ۶۲) ''اور ہم کسی نفس کو مکلّف نہیں ٹھہراتے مگر اُس کی وسعت کے مطابق''۔ البتہ اس مقام پر تھوڑا سا توقف کر کے استطاعت' استعداد اور وسعت کے بارے میں ایک اصولی بات سمجھ لینی چاہیے اور وہ یہ کہ کسی انسان میں کتنی استطاعت و استعداد اور وسعت و طاقت ہے جس کے مطابق وہ مکلّف اور جواب دہ ہے' اس کا صحیح شعور و ادراک بسا اوقات اسے خود نہیں ہوتا۔ بنا بریں وہ اپنے آپ کو دین کے عملی تقاضوں کے ضمن میں رعایتیں دیتا چلا جاتا ہے اور دین کی جانب سے عائد ہونے والی مشکل اور کٹھن ذمہ داریوں سے خود کو بالکل ہی بری ٹھہرا لیتا ہے' حالانکہ اللہ تعالیٰ جو فاطرِ فطرت ہے' انسان کا خالق ہے اور اس کا علم کامل ہے' وہ خوب جانتا ہے کہ اس نے اس میں کتنی استطاعت' استعداد اور وسعت رکھی ہے۔ چنانچہ وہ ہر انسان کا اسی کے مطابق محاسبہ اور مؤاخذہ فرمائے گا۔ بلکہ اس معاملے میں واقعہ یہ ہے کہ ہم ع ''دیوانہ بکارِ خویش ہشیار!'' کے مصداق اپنے آپ کو دھوکہ دیتے رہتے ہیں کہ جب دین اور نیکی کے کام کی بات ہوتی ہے یا تبلیغ و دعوت کی بات ہوتی ہے یا دین کے دوسرے عملی تقاضے اور مطالبے ادا کرنے کی بات ہوتی ہے تو ہم عذر پیش کر دیتے ہیں کہ ہم میں اس کی استطاعت و استعداد نہیں ہے' جبکہ دنیا کے معاملات میں ہماری جولانیاں اظہر من الشمس ہوتی ہیں اور ہماری توانائیوں' ہماری تگ و دَو اور ہماری اہلیت و صلاحیت کا نتیجہ بھرپور طور پر سامنے آ رہا ہوتا ہے۔

حقیقت میں یہ ایک فریب ہے جو انسان اپنے آپ کو دیتا ہے۔ اس لیے کہ اگر ایک شخص دنیا میں پھل پھول رہا ہے' اس کے جوہر نمایاں ہو رہے ہیں اور وہ دُنیوی امور میں دوسروں سے آگے نکل رہا ہے اور ترقی پر ترقی کرتا چلا جا رہا ہے تو یہ استطاعت و استعداد کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ لامحالہ اس میں

ذہانت' صلاحیت' قوتِ کار' وسعتِ عمل اور جذبۂ محنت و مسابقت موجود ہے' تب ہی تو وہ آگے سے آگے نکلتا جا رہا ہے۔ لہٰذا صحیح روش اور درست رویہ یہ ہوگا کہ بِرّ وتقویٰ کے تقاضوں اور دینی ذمہ داریوں کی ادائیگی کے ضمن میں آگے بڑھنے کی شعوری طور پر اور امکان بھر کوشش کی جائے اور اس میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ رہنے دیا جائے اور اپنی امکانی حد تک نہ کوئی تساہل ہو اور نہ ہی کسی فراری ذہنیت کو بروئے کار آنے دیا جائے۔ البتہ یہ بات بالکل ظاہر و باہر ہے کہ اس سب کے باوجود انسان اتنا ہی آگے بڑھ سکے گا جتنی اللہ تعالیٰ نے اس میں استطاعت و وسعت رکھی ہے' اگرچہ جب تک انسان اس کے لیے شعوری طور پر عزمِ مصمم کے ساتھ کوشش نہیں کرے گا اُس وقت تک یہ ظاہر ہی نہیں ہو سکے گا کہ اس میں وسعت' صلاحیت اور استطاعت کتنی ہے! رہا محاسبۂ اُخروی کا معاملہ تو وہ یقیناً ہر شخص کی وسعت و استطاعت کی بنیاد ہی پر ہوگا جس کا صحیح علم اللہ کو حاصل ہے۔ چنانچہ وہ اسی کے مطابق فیصلہ فرمائے گا کہ کسی شخص نے اس وسعت و استعداد کے مطابق جو اسے دی گئی تھی' دین کے مقتضیات و مطالبات پورے کرنے کی کس حد تک محنت اور کوشش کی۔

تقویٰ کے مفہوم کی بہترین تعبیر کے ضمن میں دورِ خلافتِ فاروقیؓ کا ایک بڑا عجیب واقعہ ملتا ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایک بار اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم کی محفل میں یہ سوال کیا کہ ''تقویٰ'' کی جامع و مانع تعریف کیا ہے؟ اس کے جواب میں حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ نے جو وضاحت پیش فرمائی اس کا مفہوم یہ ہے کہ:

> ''امیر المؤمنین! جب کسی شخص کو جنگل کی ایسی پگڈنڈی سے گزرنے کا اتفاق ہو جس کے دونوں اطراف میں خاردار جھاڑیاں ہوں تو ایسی پگڈنڈی پر گزرتے وقت وہ شخص لامحالہ اپنے کپڑوں کو ہر طرف سے سمیٹ کر اُس راستہ کو اس طرح طے کرنے کی کوشش کرتا ہے اور سنبھل سنبھل کر پھونک پھونک کر قدم اٹھاتا ہے کہ اس کے کپڑے جھاڑیوں اور کانٹوں سے الجھنے نہ پائیں۔ اس احتیاطی رویّے اور بچ بچ کر چلنے کو ''تقویٰ'' کہتے ہیں۔''

فاروقِ اعظمؓ نے اس تعریف کی تصویب و توثیق فرمائی اور حضرت اُبی بن کعب کو داد دی۔ حقیقت اور امرِ واقعہ یہی ہے کہ اس دنیا میں ہم جو زندگی بسر کر رہے ہیں یہ بھی ایک سفر ہی ہے اور یہاں ہر چہار طرف گناہ' معصیت اور شہوات و لذّات کی نہایت خاردار جھاڑیاں موجود ہیں' چنانچہ ہر ہر قدم پر گناہ کی ترغیب ہے' معصیت کی تحریک ہے اور طرح طرح کے ظلم و اثم اور طغیان و عدوان کی دعوت موجود

ہے! اب اگر انسان ان جھاڑیوں سے بچ کر نکل جائے اور اپنے دامن کو اِن میں اُلجھنے نہ دے اور اس دُنیوی سفر کو اس طرح طے کرنے کی کوشش کرے کہ اس کے دامن پر معصیت کا کوئی داغ دھبہ نہ پڑنے پائے تو اس روش' اس رویے اور اس طرزِ عمل کو تقویٰ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ایمان کا اوّلین تقاضا ہے!

۲) سمع وطاعت

تقویٰ کے تاکیدی حکم کے بعد اس آیت میں دوسری بات فرمائی: ﴿وَاسۡمَعُوۡا وَاَطِیۡعُوۡا﴾ ''اور سنو اور اطاعت کرو''۔ اس سمع وطاعت کا تعلق بھی اصلاً تو ایمان باللہ ہی سے ہے' لیکن عملاً اس کا تعلق ایمان بالرسالت سے ہے' اس لیے کہ اگرچہ مطاعِ حقیقی تو اللہ ہی ہے' مگر اللہ کا نمائندہ اور اس کے اِذن سے بالفعل ''مطاع'' بن کر رسول آتا ہے۔ جیسے سورۃ النساء میں ارشاد فرمایا گیا: ﴿مَنۡ یُّطِعِ الرَّسُوۡلَ فَقَدۡ اَطَاعَ اللّٰہَ ۚ﴾ (آیت ۸۰) ''جس نے رسولؐ کی اطاعت کی درحقیقت اس نے اللہ کی اطاعت کی''——اور: ﴿وَمَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا لِیُطَاعَ بِاِذۡنِ اللّٰہِ ؕ﴾ (آیت ۶۴) ''اور نہیں بھیجا ہم نے کوئی رسول مگر اس لیے کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے''۔ رسول کی یہ اطاعت اصلاً مطلوب ہے ''سمع وطاعت'' کی شان کے ساتھ' یعنی بلا چون وچرا اور بلا پس وپیش! اس بات کو پورے شعور اور ادراک کے ساتھ سمجھ لینے کی ضرورت ہے کہ ایک اطاعت تو وہ ہوتی ہے جو آپ کے فہم' آپ کی سمجھ اور آپ کی پسند پر منحصر ہے' یعنی یہ کہ اگر کوئی حکم آپ کی سمجھ میں آ گیا یا آپ کو پسند آ گیا تو آپ نے مان لیا اور اطاعت کی روش اختیار کر لی' اور اگر وہ آپ کی سمجھ میں نہیں آیا یا آپ کو اچھا نہ لگا تو آپ نے اطاعت نہیں کی' بلکہ لاپروائی اختیار کی۔ اس رویّے اور طرزِ عمل کا تجزیہ کیجیے تو یہ نتیجہ سامنے آئے گا کہ یہ اطاعت اُس ہستی کی نہیں ہے جو حکم دے رہی ہے' بلکہ اپنی روح اور حقیقت کے اعتبار سے اور عقل ومنطق کی رُو سے یہ خود اپنی سمجھ یا اپنے جی کی اطاعت ہے' اور دونوں صورتوں میں آپ نے یا تو اپنی عقل کی' یا اپنے جی کی یا اپنی پسند کی اطاعت کی ہے۔ اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت تو اس شان کے ساتھ مطلوب ہے کہ جو بھی حکم ملے اس پر سرِ تسلیم خم کر دیا جائے' جو فرمان بھی سامنے آئے بجا لایا جائے' جس چیز سے بھی روک دیا جائے اس سے رک جایا جائے! اور اگر ان اوامر ونواہی کی حکمتیں بھی سمجھ میں آ جائیں تب تو کیا ہی کہنے ہیں' یہ تو ''نورٌ علٰی نور'' والی بات ہے'

لیکن اگر کسی حکم کی غرض و غایت یا حکمت و مصلحت سمجھ میں نہ آئے تب بھی مجرد ''سمع'' یعنی سن لینے سے ''طاعت'' یعنی فرماں برداری لازم آ جاتی ہے!

عملی اعتبار سے اس ''سمع وطاعت'' کا نقطۂ آغاز نبی ﷺ کی ذات اور شخصیت ہے' اس لیے کہ آپؐ ہی کو وحیٔ جلی کے ذریعے وہ حکمت عطا فرمائی گئی جس کی روشنی میں آپؐ نے اللہ کے کلام کی توضیح و تبیین اپنے فرامین و فرمودات کے ذریعے کی اور اس کا عملی نمونہ اپنی سیرت و کردار اور اپنے افعال و اعمال کے ذریعے پیش فرمایا۔ یہی وجہ ہے کہ آپؐ کے بارے میں وضاحت کر دی گئی کہ: ﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝﴾ (النجم) ''اور وہ (ہمارے رسولؐ) اپنی خواہش نفس سے نہیں بولتے۔ یہ تو ایک وحی ہے جو (ان پر نازل) کی جا رہی ہے''۔ اسی کی ترجمانی ہے فارسی کے اس شعر میں: ؎

گفتۂ اُو گفتۂ اللہ بود
گرچہ از حلقومِ عبداللہ بود

گویا رسول اللہ ﷺ کے احکام ان کی خواہشات پر مبنی نہیں ہوتے' بلکہ اللہ کی وحی پر مبنی ہوتے ہیں۔ تمہارا ذہن' تمہارا فکر' تمہاری عقل اور تمہاری سوچ محدود ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ ہر حکم کی حکمت و علّت تمہاری سمجھ میں آ جائے اور ہر حکم کی مصلحت تمہارے فہم کی گرفت میں آ سکے۔ لہٰذا اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت ''سمع وطاعت'' کی شان سے ہوگی' اور عقل انسانی کو ہرگز کوئی حق حاصل نہیں ہے کہ اس پر کسی قسم کی حدود و قیود عائد کرے۔ البتہ اللہ کے رسول ﷺ کے بعد کسی مسلمان ہیئتِ اجتماعیہ کے سربراہ' یعنی کسی حاکم یا امیر کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ ایسی مطلق اور غیر مشروط اطاعت کا مطالبہ کرے۔ چنانچہ ایسی ہر ''اطاعت'' کے ساتھ ''فی المعروف'' کی قید لازمی ہے۔ یعنی اب ہر اطاعت اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کے دائرے کے اندر اندر ہوگی' جیسا کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ((لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِيْ مَعْصِيَةِ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ))(۱) یعنی مخلوق میں سے کسی کی بھی اطاعت کسی ایسے معاملے میں نہیں کی جا سکتی جس میں خالق کی معصیت لازم آتی ہو۔ البتہ ''فی المعروف'' کی پابندی اور مشاورتِ باہمی کا حق ادا کرنے کے بعد اسلامی معاشرے اور نظمِ جماعت میں درجہ بدرجہ ڈسپلن کی شان ''سمع وطاعت'' والی ہی ہونی چاہیے' تاکہ معاشرہ اور ہیئتِ اجتماعی پوری طرح منظم اور چاق و چوبند رہے۔

---

(۱) سنن الترمذی' کتاب الجهاد عن رسول اللہ ﷺ' باب ما جاء لا طاعة لمخلوق فی معصیة الخالق۔ و مسند احمد۔ (الفاظ مسند احمد کے ہیں۔)

۳)انفاق فی سبیل اللہ

زیر مطالعہ آیت کی تیسری اور آخری بات کا تعلق ایمان بالآخرت سے ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:
﴿وَاَنۡفِقُوۡا خَیۡرًا لِّاَنۡفُسِکُمۡ ؕ﴾ ''اور خرچ کرو (اللہ کی راہ میں) اسی میں تمہاری بھلائی مضمر ہے!''
اللہ کی راہ میں خرچ کرنا غرباء' فقراء' مساکین اور یتامیٰ کے لیے بھی ہے اور اللہ کے دین کے لیے بھی!
اس کا ایمان بالآخرت کے ساتھ بڑا گہرا مگر لطیف تعلق ہے' اس لیے کہ جسے آخرت پر یقین حاصل ہو وہ جو مال اللہ کے لیے صرف کرے گا اس کے بارے میں اسے یہ اطمینان ہو گا کہ یہ مال محفوظ ہو گیا' گویا اللہ کے بینک میں جمع ہو گیا۔ اب یہ بات بالکل ظاہر و باہر اور حتمی و یقینی ہے کہ اگر کسی شخص نے اپنی صلاحیتوں اور توانائیوں کا بیشتر اور بہتر حاصل آخرت کے بینک میں جمع کرا دیا ہو تو ایسے شخص کی کیفیت موت کے وقت بالکل وہی ہو گی جو علامہ اقبال کے اس شعر میں بیان ہوئی ہے: ؎

نشانِ مردِ مؤمن با تو گویم
چو مرگ آید تبسّم بر لبِ اوست

یعنی مردِ مؤمن کی نشانی یہی ہے کہ جب موت کا وقت آتا ہے تو اس کے لبوں پر مسکراہٹ ہوتی ہے۔ اس لیے کہ اسے معلوم ہے کہ میں نے اپنے مال و دولت اور اپنی توانائیوں اور قوتوں کا بہت بڑا حصہ اللہ کے بینک میں جمع کرا رکھا ہے اور اب میں وہاں جا رہا ہوں جہاں میری بچت' میری کمائی اور میری توانائیوں کا حاصل جمع ہے۔ اناجیلِ اربعہ کے نام سے اِس وقت جو کتابیں موجود ہیں ان میں سے متی کی انجیل میں حضرت مسیح علیہ السلام کا ایک بڑا پیارا قول ملتا ہے کہ ''اپنا مال زمین پر جمع نہ کرو جہاں کیڑا بھی خراب کرتا ہے اور چوری ڈاکے کا بھی خوف ہے' بلکہ آسمان پر جمع کرو جہاں نہ کیڑا خراب کرتا ہے' نہ چوری کا خوف ہے' نہ ڈاکے کا اندیشہ ہے۔ اور میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جہاں تمہارا مال ہو گا وہیں تمہارا دل بھی ہو گا''۔ اس ضمن میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ایک واقعہ بھی بڑا عجیب اور پیارا ہے۔ ان کے یہاں ایک بکری ذبح ہوئی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دستی کا گوشت بہت مرغوب تھا تو سیدہ صدیقہؓ نے ایک دستی بچا کر رکھ لی اور باقی سارا گوشت غرباء و مساکین میں تقسیم کر دیا۔ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو آپؐ نے دریافت فرمایا: ((مَا بَقِیَ مِنۡهَا ؟)) ''اس بکری میں سے کیا بچا؟'' حضرت عائشہ صدیقہؓ نے عرض کیا: مَا بَقِیَ مِنۡهَا اِلاَّ کَتِفُهَا ''اس میں سے کچھ نہیں بچا سوائے ایک دستی کے''۔ اس پر

(۱) سنن الترمذی' کتاب صفة القیامة والرقائق والورع عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم' باب منه۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((بَقِيَ كُلُّهَا غَيْرَ كَتِفِهَا))(۱) ''پوری بکری بچ گئی سوائے اس دستی کے!'' یعنی اس دستی کو تو ہم کھالیں گے اور جو کھالیا گیا وہ تو خرچ ہو گیا' البتہ جو اللہ کی راہ میں دے دیا گیا وہ باقی رہنے والا ہے' وہ اصل بچت ہے۔ لہٰذا ایمان بالآخرت کے نتیجے میں انسان کے نقطۂ نظر میں یہ تبدیلی آنی چاہیے کہ جو کچھ اللہ کی راہ میں دے دیا ہے وہ حقیقی بچت ہے۔ یہی تعلیم و تلقین ہے ان الفاظِ مبارکہ میں کہ: ﴿وَاَنْفِقُوْا خَيْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ ؕ﴾ ''اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو' یہی تمہارے لیے بہتر ہے''۔

آگے متنبہ فرما دیا کہ اگر مال کی محبت تمہارے دل میں باقی رہی اور تمہیں اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے روکتی رہی تو یہ بخل ہے۔ ﴿وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ﴾ یعنی ''جو اس شُح سے' بخل سے' اپنے جی کے لالچ سے بچا لیا گیا'' وہی انفاق میں آگے بڑھ سکے گا' اور اس صورت میں وہ کامیابی و کامرانی اور فوز و فلاح سے ہمکنار ہو سکے گا۔ چنانچہ آیتِ مبارکہ کا اختتام ہوتا ہے ان الفاظِ مبارکہ پر: ﴿فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝۱۶﴾ ''پس یہی لوگ ہیں فلاح پانے والے''۔ فلاح کسی کے منزلِ مقصود پر پہنچ جانے کو کہتے ہیں۔ تو یہاں واضح فرما دیا گیا کہ جو اس شُحِ نفس سے' مال کی محبت اور جی کے لالچ سے بچا لیا گیا وہی آخری منزلِ مراد تک رسائی حاصل کر سکے گا!!

اگلی آیت میں انفاق پر ایک نہایت مؤثر اسلوب سے مزید زور دیا جا رہا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ﴿اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعِفْهُ لَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ؕ﴾ ''اگر تم اللہ کو قرضِ حسن دو تو وہ اسے تمہارے لیے دوگنا کرتا رہے گا اور تمہاری بخشش فرمائے گا''۔ اللہ کی راہ میں اگر انفاق کیا جائے' خرچ کیا جائے' مال لگایا اور کھپایا جائے تو اسے اللہ تعالیٰ ہماری حوصلہ افزائی اور قدر دانی کے لیے اپنے ذمے قرض سے تعبیر فرماتا ہے۔ واضح رہے کہ اللہ کی رضا کے لیے مال خرچ کرنے کی دو مدّات ہیں' ایک مدّ یہ ہے کہ اللہ کی مخلوق میں سے جو صاحبِ احتیاج ہیں' یعنی غرباء و فقراء' یتامیٰ و مساکین' بیوائیں اور ایسے لوگ جو کسی سبب سے معاشی جدّ و جہد میں پیچھے رہ گئے ہیں ان کی مدد کی جائے' اور دوسری مدّ یہ ہے کہ اللہ کے دین کی نصرت کے لیے خرچ کیا جائے۔ یعنی اس کے دین کی نشر و اشاعت اور دعوت کے لیے صرف کیا جائے اور دینِ حق کے غلبہ اور اقامت اور جہاد و قتال فی سبیل اللہ کی ضروریات کی فراہمی پر صرف کیا جائے۔

اگرچہ قرآن مجید میں اکثر و بیشتر مقامات پر ان دونوں مدّات کا ذکر مشترک انداز میں آتا ہے'

لیکن جا بجا ان کے لیے علیحدہ اصطلاحات بھی استعمال ہوتی ہیں۔ چنانچہ پہلی مدّ کے لیے بالعموم ''ایتاءِ مال'' اور ''صدقہ'' کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے اور دوسری مدّ کے لیے عموماً ''جہاد بالمال'' اور ''انفاق فی سبیل اللہ'' کی اصطلاحات اختیار کی جاتی ہیں' جیسے قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اس طرح کے الفاظ آتے ہیں: ﴿وَجَاهِدُوا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ ''اور جہاد کرو اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں''۔ اور اسی کو اللہ تعالیٰ اپنے ذمے قرض سے بھی تعبیر فرماتا ہے' حالانکہ اس کائنات میں جو کچھ بھی ہے وہ اللہ ہی کا ہے' جیسے کہیں فرمایا: ﴿وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ﴾ (الحدید: ۱۰) ''اور آسمانوں اور زمین کی وراثت اللہ ہی کے لیے ہے''۔ اور کہیں ارشاد ہوا: ﴿وَلِلّٰهِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ (المنفقون: ۷) ''اور آسمانوں اور زمین کے جملہ خزانے اللہ ہی کے لیے ہیں''۔ لیکن جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا' اللہ تعالیٰ اپنی راہ میں ہمارے اس انفاق کو اپنی قدر دانی کے اظہار اور حوصلہ افزائی کے لیے اپنے ذمہ قرضِ حسن قرار دیتا ہے۔ پھر دنیا کے قرضِ حسن میں تو صرف رأس المال کے واپس ملنے کی امید ہوتی ہے اور کسی اضافے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا' اس لیے کہ یہاں قرض پر اضافہ سود ہے جو ہمارے دین میں مطلقاً حرام ہے' لیکن انفاق کی شکل میں اللہ تعالیٰ کو جو قرضِ حسن دیا جاتا ہے اس کے بارے میں وہ وعدہ فرماتا ہے کہ وہ اسے بڑھاتا رہے گا اور اس میں اضافہ کرتا رہے گا۔ مزید برآں اس کی برکت سے تمہاری مغفرت فرمائے گا۔

اس آیت کے اختتام پر اللہ تعالیٰ کی صفات کا ایک نہایت حسین وجمیل جوڑا آیا ہے اور اس میں قرآن کے عام اسلوب کے مطابق نہایت گہرا معنوی ربط ہے۔ ارشاد فرمایا: ﴿وَاللّٰهُ شَكُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۷﴾﴾ ''اور اللہ شکور (یعنی قدردان) بھی ہے' حلیم (یعنی بردبار) بھی''۔ یعنی اگر تم اللہ کی راہ میں انفاق کرتے ہو' خرچ کرتے ہو تو وہ قدر افزائی فرمانے والا ہے' اور اس کے برعکس اگر بخل کرتے ہو' نفس کے شُحّ اور جی کے لالچ ہی میں مبتلا رہتے ہو اور اسی کا عطا کردہ مال اس کی راہ میں خرچ نہیں کرتے' بلکہ مال کو سینت سینت کر رکھتے ہو تب بھی وہ فوراً گرفت نہیں فرماتا' بلکہ ڈھیل دیتا ہے' کیونکہ وہ بڑا حلیم اور بڑا بُردبار ہے۔

اس سورۂ مبارکہ کی آخری آیت بھی بڑی عجیب اور بہت پیاری ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ﴿عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۸﴾﴾ ''(وہ اللہ) چھپے اور کھلے سب کا جاننے والا ہے' زبردست ہے' کمالِ حکمت والا ہے!'' آیت کے آخر میں پھر دو اسمائے حسنیٰ جوڑے کی صورت میں آئے ہیں'

یعنی وہ ''العزیز'' بھی ہے اور ''الحکیم'' بھی۔ گویا ایک جانب اللہ غالب ہے' زبردست ہے' مختارِ مطلق ہے' اس کے اختیارات پر کوئی تحدید نہیں ہے' لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ الحکیم بھی ہے' چنانچہ وہ جو کچھ کرتا ہے حکمت کے ساتھ کرتا ہے۔ پھر دیکھئے یہاں صفات واسماء کے دو جوڑوں یعنی ''شَکُوْرٌ حَلِیْمٌ'' اور ''اَلْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ'' کے درمیان اللہ تعالیٰ کی صفتِ علم کا بیان ایک نئی شان کے ساتھ آ گیا۔ یعنی وہ غائب وحاضر' چھپے اور کھلے سب کا جاننے والا ہے۔ اس میں ایک جانب اہل ایمان' اصحابِ برّ وتقویٰ اور طاعت وانفاق پر کاربند رہنے والوں کے لیے بشارت اور یقین دہانی مضمر ہے کہ وہ مطمئن رہیں کہ ان کی کوئی نیکی ضائع جانے والی نہیں ہے اور دوسری طرف اعراض وانکار کی روش اختیار کرنے والوں کے لیے تہدید وتنبیہہ بھی ہے کہ تمہاری کوئی حرکت اللہ سے پوشیدہ نہیں ہے اور وہ تمہیں کیفرِ کردار تک پہنچانے کے لیے کامل غلبہ واقتدار کا مالک ہے! اس لیے کہ وہ ''العزیز'' ہے۔ اور اگر وہ تمہاری گرفت فوری طور پر نہیں کر رہا بلکہ تمہیں مہلت اور ڈھیل دیے جا رہا ہے تو یہ اس کی حکمتِ کاملہ کا مظہر ہے' اس لیے کہ جہاں وہ ''العزیز'' ہے وہاں ''الحکیم'' بھی ہے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین oo

❁❁❁

درس 9

اثبات آخرت
کے لئے
قرآن کے استدلال کا حسین نمونہ

سُوۡرَةُ القِيَامَةِ

درس ۹

اثباتِ آخرت کیلئے قرآن کے استدلال کا حسین نمونہ

سورۃُ القیامۃ کی روشنی میں

نحمدہٗ ونصلی علٰی رَسولہِ الکریم ...... امَّا بَعد:

فَاَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ ۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

مطالعۂ قرآن حکیم کے جس منتخب نصاب کا سلسلہ وار درس اِن صفحات میں جاری ہے اس کا درسِ نہم سورۃ القیامۃ پر مشتمل ہے۔ یہ سورۂ مبارکہ دو رکوعوں اور چالیس آیات پر مشتمل ہے اور قرآن حکیم کے انتیسویں پارے کے آخری رُبع میں شامل ہے۔ مصحف کی ترتیب کے اعتبار سے اس سورۂ مبارکہ کا نمبر ۷۶ ہے۔

سورۃ التغابن پر ان دروس کی تکمیل ہو چکی ہے جن میں ایمانیاتِ ثلاثہ یعنی ایمان باللہ، ایمان بالآخرۃ اور ایمان بالرسالت کا بیان جامعیت کے ساتھ آیا ہے، لیکن چونکہ ہمارے دین کے اعتقادی نظام میں، یا یوں کہہ لیجیے کہ اسلام کی فکری ونظریاتی اساسات میں قیامت پر ایمان اور آخرت پر یقین کو بہت اہمیت حاصل ہے، لہٰذا مناسب سمجھا گیا کہ ایک درسِ خاص اسی موضوع پر اس منتخب نصاب میں شامل کیا جائے، اور اس میں ہرگز کوئی شک نہیں کہ قیامت اور آخرت کے موضوع پر قرآن حکیم کی نسبتاً چھوٹی سورتوں میں جامع ترین سورت سورۃ القیامۃ ہے۔

آخرت پر ایمان کی خصوصی اہمیت

اس سے قبل کہ ہم اس سورۂ مبارکہ کے مضامین اور مطالب پر غور کریں، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ایمان بالآخرت کی اہمیت کے بارے میں چند تمہیدی باتیں نوٹ کر لی جائیں۔

قیامت اور آخرت پر ایمان کی اہمیت کا اندازہ قرآن مجید کے ہر پڑھنے والے کو بآسانی ہو جاتا

ہے جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ قرآن حکیم کا شاید ہی کوئی صفحہ ایسا ہو جس میں آخرت کا ذکر خفی یا جلی انداز میں موجود نہ ہو۔ چنانچہ مصحف کے ہر صفحے پر کسی نہ کسی اسلوب سے بعث بعد الموت' حشر ونشر' حساب کتاب' جزا وسزا اور جنت ودوزخ میں سے کسی نہ کسی کا ذکر لازماً موجود ہے۔

جن مقامات کا مطالعہ ہم اس سلسلۂ درس میں کر چکے ہیں اگر ہم ان کا سرسری جائزہ لیں تو بادنیٰ تأمل نظر آ جائے گا کہ ان میں سے ہر ایک میں آخرت کا ذکر موجود ہے۔ ہمارا پہلا درس سورۃ العصر پر مشتمل تھا۔ اس میں ایک جامع اصطلاح کے طور پر ''ایمان'' کا ذکر آیا' لیکن اس کی کوئی تفصیل نہیں تھی۔ البتہ دوسرے ہی درس میں' جو سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۷۷ پر مشتمل ہے اور جسے ہم نے ''آیۂ بر'' سے موسوم کیا تھا' ایمانیات کی تفصیل کے ضمن میں ایمان باللہ کے فوراً بعد یوم الآخر پر ایمان کا ذکر ہے:
﴿وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ﴾ ''بلکہ حقیقی نیکی تو اس کی ہے جو ایمان لایا اللہ پر اور یومِ آخر پر''۔

ہمارا تیسرا درس سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع پر مشتمل تھا۔ اس میں ایک تو قانونِ مجازات و مکافاتِ عمل کا ذکر ہے جو بڑے جامع الفاظ میں حضرت لقمان کی وصیت میں آیا ہے:

> ﴿يٰبُنَيَّ اِنَّهَآ اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِيْ صَخْرَةٍ اَوْ فِى السَّمٰوٰتِ اَوْ فِى الْاَرْضِ يَاْتِ بِهَا اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ ⑯﴾
>
> ''اے میرے پیارے بچے! (اس حقیقت کو ذہن نشین کر لے کہ) انسان کے عمل کو (نیکی ہو یا بدی) خواہ وہ رائی کے دانے کے ہم وزن ہو' پھر خواہ وہ کسی غار یا چٹان کے اندر (چھپ کر) کیا جائے' خواہ وہ آسمانوں (فضاؤں اور خلاؤں) میں جا کر یا زمین (کی گہرائیوں) میں اُتر کر کیا جائے' اللہ اس کو (جزا وسزا کے دن) لے آئے گا۔ بے شک اللہ بہت باریک بین ہے' باخبر ہے''۔

اس کے علاوہ اس رکوع میں ایک جگہ یہ الفاظ آئے: ﴿اِلَيَّ الْمَصِيْرُ ⑭﴾ ''میری ہی طرف لوٹنا ہے''۔

اگلی آیت کے آخر میں الفاظ آئے:

> ﴿ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ⑮﴾
>
> ''پھر میری ہی طرف تم سب کو آنا ہے' پھر میں تم سب کو جتلا دوں گا جو کچھ تم کرتے رہے تھے''۔

ہمارا چوتھا سبق سورۂ حٰمٓ السجدۃ کی آیات ۳۰ تا ۳۶ پر مشتمل تھا' جس میں اہلِ ایمان کے لیے ان

کی استقامت کا انعام جنت کی شکل میں دینے کا وعدہ فرمایا گیا اور اس ضمن میں ارشاد ہوا:

﴿وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِيْ أَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُوْنَ ﴿٣١﴾﴾

''اور اس میں تمہارے لیے وہ سب کچھ ہے جسے تمہارا جی چاہے اور تمہارے لیے وہ سب کچھ بھی ہوگا جسے تم طلب کروگے''۔

پانچواں درس اساس القرآن سورۃ الفاتحہ پر مشتمل تھا' اس میں ایک عظیم آیت مبارکہ اسی حقیقتِ کبریٰ کے اظہار کے لیے وارد ہوئی' یعنی: ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ○﴾ ''جزاوسزا کے دن کا مالک''۔

چھٹا سبق سورۂ آل عمران کی آیات ۱۹۰ تا ۱۹۵ پر مشتمل تھا' اس میں آپ نے دیکھا کہ کس شدّ و مدّ کے ساتھ آخرت کا ذکر آیا:

﴿رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿١٩١﴾ رَبَّنَآ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ ۭ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿١٩٢﴾﴾

''اے ہمارے ربّ! تُو نے یہ (سلسلۂ کون ومکاں) فضول اور بے کار پیدا نہیں کیا ہے' تُو پاک ہے (منزہ ہے اس سے کہ کوئی بے مقصد اور عبث کام کرے)' پس ہمیں آگ کے عذاب سے بچا لے۔ اے ہمارے آقا! یقیناً جس کو تو نے دوزخ میں ڈال دیا اسے تو بالکل ذلیل اور رسوا کر دیا۔ اور ایسے ظالموں کے لیے کوئی مددگار نہیں ہوگا''۔

ذرا آگے چل کر الفاظ آئے: ﴿وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ﴾ (آیت ۱۹۴) ''اور (اے ہمارے ربّ!) ہمیں قیامت کے دن رسوانہ کیجیو''۔ پھر مزید آگے چل کر اللہ تعالیٰ نے اپنے فرماں بردار بندوں کو اِن الفاظ میں اطمینان دلایا:

﴿لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ﴾ (آیت ۱۹۵)

''میں لازماً ان کی برائیاں ان سے دور کردوں گا اور ان کو لازماً اُن باغات میں داخل کروں گا جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہیں''۔

اس سے بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے کہ قیامت کے وقوع اور اُخروی جزاوسزا کے یقینی ہونے پر کتنا زور ہے۔

اس کے بعد درس ہفتم یعنی سورۃ النور کے پانچویں رکوع میں قیامت کے دن کی ہولناکی کا نقشہ ان الفاظ میں سامنے آیا:

﴿يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ ﴿٣٧﴾﴾ (النور)

’’(اللہ کے نیک اور محبوب بندے) لرزاں وترساں رہتے ہیں اس دن کے خیال سے جس دن دل اور آنکھیں اُلٹ جائیں گے‘‘۔

درس ہشتم یعنی سورۃ التغابن میں تو بلاشک وشبہ یہ مضمون اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ گیا‘ چنانچہ اس سورۂ مبارکہ کی تیسری آیت ان الفاظ پر ختم ہوتی ہے: ﴿وَاِلَيۡهِ الۡمَصِيۡرُ﴾ ’’اور اسی (اللہ) کی طرف لوٹ جانا ہے‘‘۔ پھر ساتویں آیت میں پہلے تو منکرینِ قیامت کا یہ اعتراض یا مغالطہ نقل کیا گیا:

﴿زَعَمَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡۤا اَنۡ لَّنۡ يُّبۡعَثُوۡا ؕ﴾

’’ان منکرین کو یہ مغالطہ لاحق ہوگیا ہے کہ انہیں اٹھایا نہ جائے گا‘‘۔

پھر نبی اکرم ﷺ سے کہلوایا گیا:

﴿قُلۡ بَلٰى وَرَبِّىۡ لَتُبۡعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلۡتُمۡ ؕ﴾

’’(اے نبیؐ!) کہہ دیجیے: کیوں نہیں! مجھے میرے پروردگار کی قسم ہے کہ تم لازماً اٹھائے جاؤ گے اور پھر تمہیں لازماً جتلا دیا جائے گا جو کچھ تم کرتے رہے تھے‘‘۔

اور ذرا آگے چل کر فرمایا:

﴿يَوۡمَ يَجۡمَعُكُمۡ لِيَوۡمِ الۡجَمۡعِ ذٰلِكَ يَوۡمُ التَّغَابُنِ ؕ﴾ (آیت ۹)

’’(جان لو کہ) وہ دن‘ جس دن وہ تمہیں جمع کرے گا جمع ہونے کے دن‘ وہ ہے اصل ہار جیت کے فیصلے کا دن!‘‘

یعنی اُس روز جو کامیاب قرار دیا گیا وہی اصلاً کامیاب وکامران ہوا۔ پھر اس کامیابی کی وضاحت ان الفاظ میں فرمائی گئی کہ:

﴿...... يُكَفِّرۡ عَنۡهُ سَيِّاٰتِهٖ وَيُدۡخِلۡهُ جَنّٰتٍ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَاۤ اَبَدًا ؕ ذٰلِكَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِيۡمُ﴾

’’......اللہ اس سے اس کے گناہ جھاڑ دے گا اور اس کو ایسے باغات میں داخل کرے گا جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہوں گی‘ یہ لوگ ان میں ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔ یہی دراصل بڑی کامیابی ہے‘‘۔

اس کے برعکس جو ناکام قرار پائے گا اور نامراد رہے گا اس کے انجامِ بد کا بیان اگلی آیت میں وارد ہوا:

﴿وَالَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا وَكَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَاۤ اُولٰٓـئِكَ اَصۡحٰبُ النَّارِ خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَا ؕ وَبِئۡسَ الۡمَصِيۡرُ﴾

''اور جن لوگوں نے کفر وانکار کا راستہ اختیار کیا اور ہماری آیات کو جھٹلاتے رہے وہی لوگ دوزخ والے ہوں گے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اور وہ بہت برا ٹھکانہ ہے''۔

اس سرسری سے جائزہ سے اندازہ ہو گیا کہ اب تک ہم نے قرآن حکیم کے جن معدودے چند مقامات کا مطالعہ کیا ہے ان میں بھی کس قدر شدّ ومدّ کے ساتھ بعث بعد الموت' قیامِ قیامت اور آخرت کی کامیابی اور ناکامی کا ذکر آ چکا ہے۔

یہاں ایک نکتہ اور بھی نوٹ کر لیا جائے کہ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر یہ اہم تقابل سامنے آتا ہے کہ جہاں دوسرے ایمانیات کے لیے لفظ ایمان آیا ہے' وہاں آخرت کے لیے عموماً لفظ یقین استعمال ہوا ہے' جیسے سورۃ البقرۃ کے آغاز میں وحیِ الٰہی اور کتبِ سماویہ پر ایمان کا ذکر تو ان الفاظ میں آیا کہ:

﴿وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ج﴾ (آیت ۴)

''اور وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں اس پر بھی جو (اے نبیؐ!) آپ پر نازل کیا گیا اور اس پر بھی جو آپ سے پہلے نازل کیا گیا''۔

لیکن آخرت پر ایمان کا ذکر ہوا اِن الفاظ کے ذریعے کہ:

﴿وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝۴﴾

''اور وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں''۔

اس سے معلوم ہوا کہ ایمان بالآخرت میں وہ گہرائی اور شدت مطلوب ہے جسے ہم ''یقین'' سے تعبیر کرتے ہیں۔

یہ بات پہلے بھی عرض کی جا چکی ہے کہ اصولی' نظری اور علمی اعتبار سے ایمان اصل میں نام ہے ایمان باللہ کا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ''ایمانِ مجمل'' میں صرف ایمان باللہ کا ذکر ہے:

اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ كَمَا هُوَ بِاَسْمَائِهٖ وَصِفَاتِهٖ وَقَبِلْتُ جَمِيْعَ اَحْكَامِهٖ اِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ وَتَصْدِيْقٌ بِالْقَلْبِ

''میں ایمان لایا اللہ پر جیسے کہ وہ اپنے اسماء اور صفات سے ظاہر ہے' اور میں نے قبول کیے اس کے جملہ احکام' میں اقرار کرتا ہوں زبان سے اور تصدیق کرتا ہوں دل سے''۔

چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ ایمان بالآخرت اور ایمان بالرسالت دونوں ایمان باللہ کی فروع ہیں۔ چنانچہ ایمان بالآخرت اللہ تعالیٰ کی صفت عدل کا مظہر ہے اور ایمان بالرسالت اللہ تعالیٰ کی صفت ہدایت کا

تکمیلی ظہور ہے' لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی ایک نا قابلِ تردید حقیقت ہے کہ اگر عملی اور اخلاقی اعتبار سے غور کیا جائے تو سب سے مؤثر ایمان' ایمان بالآخرت ہے۔ اس لیے کہ اگر آخرت کا یقین ہوگا' مرنے کے بعد محاسبہ کے لیے جی اٹھنے کا یقین ہوگا' جزا و سزا کا یقین ہوگا' جنت و دوزخ کا یقین ہوگا تو انسان کے رویے میں عملی تبدیلی لازماً آئے گی' اور اگر ایمان بالآخرت میں کمی رہ گئی تو ایمان باللہ بھی ذات وصفاتِ باری تعالیٰ کی ایک علمی بحث بن کر رہ جائے گا اور ایمان بالرسالت بھی عشقِ رسول ﷺ کے محض زبانی دعووں کی صورت اختیار کر لے گا اور رسول اللہ ﷺ کی اطاعت اور اتباع کی نوبت نہیں آئے گی۔

اس مقام پر ضمناً یہ بھی جان لیجیے کہ قانونی' فقہی اور شرعی اعتبار سے اہم ترین ایمان' ایمان بالرسالت ہے۔ چنانچہ ایمان باللہ اسی وقت معتبر ہوگا جبکہ اللہ تعالیٰ کو اُن اسماء وصفات کے ساتھ مانا جائے جن کی خبر حضرت محمد ﷺ نے دی ہے' اور ایمان بالآخرت بھی تب ہی معتبر ہوگا جب بعث بعد الموت' حشر و نشر' حساب کتاب' وزنِ اعمال' جزا و سزا اور جنت و دوزخ کی ان تفاصیل کو مانا جائے جن کی خبر حضرت محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے دی ہے۔

اس بات پر زور دینے کی ضرورت اس لیے محسوس ہوتی ہے کہ بدقسمتی سے کچھ عرصہ سے ہمارے یہاں خود کو مسلمان کہلانے والا عقلیت زدہ لوگوں کا ایک مختصر سا گروہ یہ باور کرانے کی کوشش کر رہا ہے کہ آخرت حقیقی اور واقعی نہیں ہے بلکہ محض ایک نظریہ اور تصور ہے جس سے اصل مقصود دنیا میں عدل و انصاف کا قیام ہے' چنانچہ جنت و دوزخ اور جزا و سزا کا جو تصور قرآن مجید دیتا ہے اس سے مقصود صرف یہ ہے کہ اس دنیا میں انسان کی معاشرتی' سماجی' سیاسی' معاشی الغرض پوری اجتماعی زندگی عدل وقسط پر قائم ہو جائے اور انسان دنیا میں امن وسکون کے ساتھ بہتر سے بہتر طریق پر زندگی بسر کر سکے۔ یہ خیال اپنی اصل کے اعتبار سے خالص گمراہی اور زندقہ ہے۔ آخرت ہرگز صرف تصور اور محض نظریہ نہیں ہے' بلکہ ایک واقعہ ہے جو لازماً ظہور پذیر ہوگا۔ چنانچہ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر مختلف اسالیب سے اس بات پر زور دیا گیا ہے' جیسے سورۃ الذّٰریٰت میں فرمایا: ﴿اِنَّمَا تُوۡعَدُوۡنَ لَصَادِقٌ ۝ وَّاِنَّ الدِّیۡنَ لَوَاقِعٌ ۝﴾ ''جس (قیامت وآخرت) کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے وہ بالکل برحق ہے (سچ ہے) اور جزا و سزا لازماً واقع ہو کر رہے گی''۔ یا جیسے سورۃ المرسلات میں فرمایا: ﴿اِنَّمَا تُوۡعَدُوۡنَ لَوَاقِعٌ ۝﴾ ''جس چیز کی دھمکی تمہیں دی جا رہی ہے وہ لازماً واقع ہو کر رہے گی''۔ (یعنی نری دھمکی

اور خالی دھونس نہیں ہے!)

جو لوگ آخرت کو محض ایک تصور اور نظریہ قرار دے کر یہ امید بھی کرتے ہیں کہ اس سے اس دُنیا میں عدل وقسط پر مبنی ایک اجتماعی نظام وجود میں آ سکتا ہے وہ ایک شدید مغالطے میں مبتلا ہیں۔ اس لیے کہ محض تصور و نظریہ سے یہ مقصد ہرگز حاصل نہیں ہوسکتا۔ انسان کی سیرت‘ اس کے کردار‘ اخلاق اور اعمال و معاملات پر واقعی اور عملی اثر محض آخرت کے تصور یا نظریہ کا نہیں بلکہ صرف یقین کے درجے تک پہنچے ہوئے ایمان ہی کا پڑ سکتا ہے۔ چنانچہ اگر ایک معاشرے میں آخرت پر قلبی یقین رکھنے والے لوگ معتدبہ تعداد میں موجود ہوں گے تو اس کی برکت سے اور اس کے نتیجے میں اس دنیا میں مبنی بر عدل وقسط اجتماعی نظام بھی لازماً وجود میں آئے گا‘ لیکن ایمان بالآخرت کا اصل مقصود صرف ہماری دُنیوی بہبود نہیں ہے بلکہ اس کا اصل مطلوب محاسبۂ اُخروی میں سرخرو اور کامیاب و کامران ہونا ہے‘ اور یہ نصب العین ہماری دُنیوی فلاح و بہبود اور امن وسلامتی سے اس طرح مربوط و متعلق ہے کہ آخرت کی وہ تفاصیل جو قرآن اور حدیثِ رسولؐ میں بیان ہوئی ہیں اُن پر قلبی یقین اور اس کے مطابق اس دنیا میں اپنے رویے اور عمل کی اصلاح وتعمیر کے بغیر نہ دنیا میں نظامِ عدل وقسط قائم ہوسکتا ہے اور نہ اُخروی نجات حاصل ہوسکتی ہے۔ الغرض یوم قیامت ایک اٹل اور شدنی امر ہے اور آخرت ایک حقیقتِ کبریٰ ہے اور اس کا حتمی اور یقینی علم اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں اور اپنی کتابوں کے ذریعے سے ہمیں پیشگی عطا فرما دیا ہے‘ تاکہ ہمارے تمام اعمال کا اصل محرک اللہ تعالیٰ کی رضا کا حصول اور اُخروی نجات بن جائے‘ جس کے لیے قرآن حکیم دوٹوک انداز میں ہمیں آگاہ اور متنبہ کرتا ہے:

﴿فَاِذَا جَآءَتِ الطَّآمَّةُ الْكُبْرٰى ﴿٣٤﴾ يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ مَا سَعٰى ﴿٣٥﴾ وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرٰى ﴿٣٦﴾ فَاَمَّا مَنْ طَغٰى ﴿٣٧﴾ وَاٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ﴿٣٨﴾ فَاِنَّ الْجَحِيْمَ هِيَ الْمَاْوٰى ﴿٣٩﴾ وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ﴿٤٠﴾ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ﴿٤١﴾﴾ (النّٰزعٰت)

”پس جب قیامت کا ہنگامۂ عظیم برپا ہوگا‘ جو کچھ انسان نے دنیا میں کیا ہے اس دن وہ اس کو یاد کرے گا‘ اور دوزخ ہر دیکھنے والے کے سامنے بے نقاب کر دی جائے گی‘ تو جس نے (دنیا میں) سرکشی کی تھی اور دنیا کی زندگی کو آخرت پر مقدم رکھا تھا‘ تو یقیناً اس کا ٹھکانہ تو بس دوزخ ہی ہے‘ اور جو اپنے ربّ کے حضور کھڑا ہونے سے (یعنی محاسبہ کے لیے پیشی سے) ڈرتا تھا اور اپنے نفس کو بُری خواہشات سے روکتا رہا تھا تو لاریب اس کا ٹھکانہ جنت ہے“۔

انکارِ آخرت کی مختلف صورتیں

یہ بات بھی جان لیجیے کہ انکارِ قیامت اور انکارِ آخرت کی متعدد شکلیں قرآن مجید میں بیان ہوئی ہیں۔ چنانچہ منکرین کا ایک استبعاد اور استعجاب تو وہ ہے جو قرآن مجید میں متعدد مقامات پر مختلف اسالیب سے بیان ہوا ہے۔ اس کی صرف دو مثالیں پیش کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ سورۂ قٓ میں فرمایا:

﴿ءَ اِذَا مِتْنَا وَ كُنَّا تُرَابًا ۚ ذٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِيْدٌ ۝۳﴾

''(یہ کافر کہتے ہیں) کیا جب ہم مر جائیں گے اور مٹی میں مل کر مٹی ہو جائیں گے (تو دوبارہ اٹھائے جائیں گے؟) یہ لوٹنا بہت دور کی بات ہے''۔

سورۂ یٰسٓ میں، جسے نبی اکرم ﷺ نے قرآن مجید کا قلب قرار دیا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

﴿اَوَلَمْ يَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ ۝۷۷ وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِيَ خَلْقَهٗ ؕ قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ ۝۷۸﴾

''کیا انسان نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ ہم نے اسے نطفہ سے پیدا کیا، بایں ہمہ وہ کھلم کھلا جھگڑالو بن کر کھڑا ہو گیا۔ اور لگا ہماری نسبت باتیں بنانے اور اپنی تخلیق (اصل حقیقت) کو بھول گیا، کہتا ہے کہ کون (آدمی کی) ہڈیوں کو دوبارہ زندہ کرے گا جبکہ وہ بوسیدہ ہو گئی ہوں؟''

یہیں پر اگلی آیت میں فرمایا:

﴿قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ ؕ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمٌ ۝۷۹﴾

''(اے نبیؐ!) کہہ دیجیے کہ جس نے ان کو اوّل بار پیدا کیا تھا وہی اِن کو دوبارہ زندہ کرے گا۔ اور سب خلق اس کے علم میں ہے''۔

یہ تو منکرین کا استعجابی انداز سے انکار کا ذکر ہوا۔ ایک صاف اور صریح انکار بھی ہے کہ مرنے کے بعد کوئی جی اٹھنا نہیں ہے، کوئی آخرت نہیں ہے، زندگی بس اس دنیا ہی کی زندگی ہے۔ اس کو الحاد اور دہریت کہا جاتا ہے۔ اور یہ نہ سمجھئے کہ یہ صرف عہد حاضر کی ضلالت ہے، اس خیال کے لوگ اُس وقت بھی موجود تھے جب قرآن مجید نازل ہو رہا تھا، چنانچہ اُن کا قول سورۃ الجاثیہ میں نقل ہوا ہے:

﴿وَقَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ ۚ﴾ (آیت ۲۴)

''اور وہ کہتے ہیں کہ نہیں ہے کوئی زندگی سوائے ہماری اس دنیا کی زندگی کے، ہم خود ہی مرتے ہیں اور خود ہی جیتے ہیں اور ہمیں ہلاک کرنے والی کوئی چیز نہیں ہے سوائے گردشِ زمانہ کے''۔

اس قول میں انکارِ آخرت ہی نہیں، اللہ کا انکار بھی بین السطور موجود ہے۔ یہ خالص الحاد و دہریت ہے

جس کا پورا خلاصہ قرآن حکیم کی اس ایک آیت میں نقل کر دیا گیا ہے۔

انکار کی ایک تیسری شکل یہ ہے کہ نہ انکار ہو نہ اقرار' لیکن ظاہر ہے کہ اس کا عملی نتیجہ وہی نکلتا ہے جو صریح انکار کا ہے! قرآن مجید میں یہ شکل بھی کچھ لوگوں کے اس قول کی صورت میں بیان ہوئی ہے کہ:

﴿...... اِنۡ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّمَا نَحۡنُ بِمُسۡتَيۡقِنِيۡنَ﴿۳۲﴾﴾ (الجاثیة)

''(آخرت کا) کچھ گمان سا تو ہوتا ہے (کہ شاید واقع ہو)' لیکن اس پر ہمارا دل نہیں ٹھکتا (یقین حاصل نہیں ہوتا)''۔

ظاہر بات ہے کہ جب یہ شکل ہوگی تو انسان کا رویہ اور اس کا طرزِ عمل ان ہی لوگوں سے مشابہ اور مطابق ہوگا جو آخرت کو نہیں مانتے' اگرچہ منطقی طور پر یہ نہ صریح انکار ہے نہ واضح اقرار!

سب سے زیادہ خطرناک صورت یہ ہے کہ بظاہر پورے طور پر اقرار موجود ہو لیکن اس کے ساتھ کچھ ایسی باتیں مانی گئی ہوں جن کے نتیجے میں یہ اقرار اور یہ ایمان بالآخرت بالکل غیر مؤثر ہو جائے اور اس کا انسان کے عمل اور اس کے اخلاقی رویّے پر کوئی صحت مند اور صالح اثر مترتب نہ ہو۔ اس کی بھی تین شکلیں قرآن حکیم میں بیان ہوئی ہیں۔

سب سے پہلے شفاعتِ باطلہ کا تصور ہے کہ آخرت ہوگی تو سہی' لیکن ہماری کچھ دیویاں اور دیوتا ہیں' یا کچھ مقربینِ بارگاہِ خداوندی ہیں جو ہمیں وہاں سے چھڑا لیں گے۔ ﴿هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنۡدَ اللّٰهِ ؕ﴾ (یونس:۱۸) ''یہ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں''۔ ظاہر ہے کہ اس شکل میں بھی آخرت کا ماننا نہ ماننا برابر ہو گیا۔ واضح رہے کہ یہاں شفاعتِ باطلہ کا ذکر کیا جا رہا ہے' نہ کہ اُس شفاعت حقہ کا جس کا ثبوت قرآن اور حدیث دونوں سے ملتا ہے اور جو تین شرائط سے مشروط ہے —— یعنی اوّلاً یہ کہ یہ اسی کی جانب سے ہوگی جسے بارگاہِ خداوندی سے اِذن مل جائے' پھر اسی کے حق میں ہوگی جس کے لیے اجازت ہو اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مبنی برحق وانصاف ہوگی' نہ کہ عدل وقسط کے تقاضوں کو پامال کرنے والی۔

قرآن حکیم میں آخرت کے اس انکار مع الاقرار کی دوسری شکل یہ بیان ہوئی ہے کہ کچھ مرفۃ الحال اور دولت مند لوگ اپنی دولت مندی اور آسودہ حالی کو اپنے اس زعم کی دلیل بنا لیتے ہیں کہ ہم تو اللہ کے چہیتے ہیں' اور ہم پر اس دنیا میں بھی اللہ کا فضل ہو رہا ہے' چنانچہ اس نے ہمیں یہاں دولت دی ہے' شرف وعزت سے نوازا ہے' لہٰذا اگر آخرت واقع ہو ہی گئی تو وہاں بھی ہم شرف وعزت پائیں گے'

قطع نظر اس سے کہ ہمارے اعمال کیا ہیں! سورۃ الکہف میں دو افراد کے مکالمہ کے ضمن میں ایک ایسے ہی برخود غلط شخص کا قول نقل ہوا ہے کہ:

﴿وَمَا اَظُنُّ السَّاعَةَ قَـائِمَةً وَّلَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّىْ لَاَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا﴿٣٦﴾﴾

''(اوّل تو) مجھے یقین ہی نہیں ہے کہ قیامت کی گھڑی آنے والی ہے' اور اگر (بالفرض) مجھے اپنے پروردگار کی طرف لوٹا ہی دیا گیا تو میں لازماً وہاں پہنچ کر بھی اس سے بہتر پاؤں گا''۔

یہی بات سورۂ حٰمٓ السجدۃ میں ایک دوسرے اسلوب سے بیان فرمائی گئی ہے۔ وہاں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ رَحْمَةً مِّنَّا مِنْۢ بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ هٰذَا لِىْ ۙ وَمَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً ۙ وَّلَـئِنْ رُّجِعْتُ اِلٰى رَبِّىْۤ اِنَّ لِىْ عِنْدَهٗ لَلْحُسْنٰى ۚ فَلَـنُـنَـبِّئَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِمَا عَمِلُوْا ۫ وَلَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِيْظٍ﴿٥٠﴾﴾

''اور (انسان کا حال یہ ہے کہ) اگر ہم اسے اپنی رحمت سے (آسودگی سے) نوازتے ہیں کچھ تکلیف کے بعد جو اسے پہنچی ہو تو کہنے لگتا ہے کہ یہ تو میرا حق ہے ہی' اور (رہی قیامت' تو اوّل تو) مجھے یہ گمان (اور اندیشہ) ہے ہی نہیں کہ قیامت واقع ہونے والی ہے' تاہم اگر میں اپنے ربّ کی طرف لوٹا ہی دیا گیا تو بھی میرے لیے اُس کے ہاں اچھائی ہی اچھائی ہوگی۔ پس ہم لازماً جتلا دیں گے منکروں کو جو انہوں نے کیا ہے اور ہم انہیں لازماً چکھائیں گے ایک گاڑھا عذاب''۔

اس انکار مع الاقرار کی تیسری و آخری شکل جو سب سے زیادہ لطیف لیکن اتنی ہی زیادہ خطرناک بھی ہے' یہ ہے کہ شیطان انسان کو اللہ کی شانِ رحیمی اور شانِ غفاری کے حوالے سے دھوکہ دیتا ہے کہ وہ بڑا بخشن ہار ہے' بڑا نکتہ نواز ہے' لہٰذا وہ تمہیں معاف کر ہی دے گا۔ سورۃ الحدید میں تفصیلاً ذکر ہے کہ آخرت میں منافقین پکار پکار کر اہل ایمان سے کہیں گے کہ کیا ہم دنیا میں تمہارے ساتھ بحیثیت مسلمان شامل نہ تھے' پھر یہاں ہمیں تم سے کیوں جدا کر دیا گیا؟ تو اہل ایمان سے جواب دلوایا جائے گا کہ تم بظاہر تو مسلمان تھے لیکن اعمال کے اعتبار سے اور ایمان' بالخصوص ایمان بالآخرت کے لحاظ سے تم نے اپنے آپ کو ریب و تشکک اور تربص و تردّد میں مبتلا کر رکھا تھا۔ آیتِ مبارکہ کے آخری الفاظ ہیں:

﴿وَغَرَّتْـكُمُ الْاَمَانِىُّ حَتّٰى جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ وَغَرَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ﴿١٤﴾﴾

''اور تم کو تمہاری تمناؤں (پرمبنی من گھڑت خیالات) نے دھوکے میں ڈال رکھا تھا یہاں تک کہ اللہ کا حکم آ پہنچا (یعنی مہلتِ عمر تمام ہوئی) اور تمہیں خوب دھوکہ دیا اللہ پر (یعنی اس کی شانِ رحیمی وغفاری کے حوالے سے) اس بڑے دھوکہ باز (یعنی شیطان لعین) نے!''

مزید برآں آخری پارے کی ایک عظیم سورۃ یعنی سورۃ الانفطار کا تو مرکزی مضمون یہی ہے کہ: ﴿یٰۤاَیُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِیْمِ ۟﴾ ''اے انسان! تجھے کس چیز نے اپنے ربّ کریم کے بارے میں دھوکے میں ڈال دیا ہے؟'' اس لیے کہ جہاں وہ کریم ہے' رحیم ہے' غفور ہے وہاں وہ عادل ومنصف بھی ہے اور''قَآئِمٌ بِالْقِسْطِ '' بھی' اور''شَدِیْدُ الْعِقَابِ '' بھی ہے اور''سَرِیْعُ الْحِسَابِ '' بھی! حتیٰ کہ''عَزِیْزٌ ذُوانْتِقَامٍ '' بھی ہے' یعنی زبردست اور شدید انتقام لینے والا۔ (اے اللہ! ہم تیری اس شانِ انتقام سے تیری ہی رحمت کے دامن میں پناہ کے طالب ہیں!)

پس انکارِ آخرت کی یہ مختلف شکلیں ہیں۔ یہاں ان کا اختصار کے ساتھ تجزیہ اس لیے کر دیا گیا ہے کہ ہم بھی اپنے ذہنوں کا بھرپور جائزہ لیں اور اپنے دلوں کو ٹٹولیں۔ مبادا ہمارے قلوب واذہان اور فکر ونظر میں بھی اس قسم کے بے بنیاد وسوسوں اور موہوم خیالات کا عکس موجود ہو اور کہیں ایسا نہ ہو کہ بظاہر ہم مطمئن ہوں کہ ہم آخرت کے ماننے والے ہیں لیکن غیر محسوس طور پر ہمارے تحت الشعور میں اس قسم کے مغالطے موجود ہوں جن کا اس درس میں ذکر کیا گیا ہے۔

یہ تمام باتیں جو اَب تک پیش کی گئی ہیں' تمہیدی نوعیت کی ہیں۔ البتہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک اور اہم بات بھی اس موقع پر اجمالاً عرض کر دی جائے' اور وہ یہ کہ قیامت سے مراد کیا ہے؟ اس دنیا کا خاتمہ یا پوری کائنات کا خاتمہ؟ اس ضمن میں قرآن حکیم میں تین مراحل کا ذکر آتا ہے۔ ایک اس دنیا اور اس کے نوامیس وقوانین کے خاتمے کا مرحلہ ہے۔ دوسرا بعث بعد الموت کا مرحلہ ہے جس سے حیاتِ اُخروی کا آغاز ہوگا اور جزا وسزا کے فیصلے نافذ ہوں گے۔ تیسرا اس پوری کائنات کے آخری انجام کا مرحلہ ہے۔ تدبرِ قرآن کے ضمن میں یہ نکتہ بہت اہم ہے کہ قرآن حکیم زیادہ تر گفتگو پہلے دو مرحلوں کے بارے میں کرتا ہے۔ تیسرے مرحلے کے بارے میں کوئی تفصیلی وضاحت قرآن مجید میں موجود نہیں ہے' چنانچہ اس کے بارے میں ہم یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتے! پہلے مرحلے کو قرآن مجید بہت سے ناموں سے موسوم کرتا ہے۔ اس کے لیے سب سے زیادہ کثیر الاستعمال لفظ''اَلسَّاعَةُ'' ہے' یعنی وہ متعین گھڑی جب ایک بڑی ہل چل مچے گی' ایک بہت بڑی تباہی آئے گی' دنیا کا موجودہ نظام درہم برہم ہو جائے گا' اجرامِ فلکیہ ایک دوسرے سے ٹکرا جائیں گے اور پہاڑ دھنکی ہوئی روئی کے مانند ہو جائیں گے۔ یہ نقشہ ہے''اَلسَّاعَةُ'' کا۔ اسی کو اَلْقَارِعَةُ' اَلْحَآقَّةُ' اَلطَّآمَّةُ الْکُبْرٰی اور اَلصَّآخَّةُ وغیرہ جیسے الفاظ سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ دوسرا مرحلہ ہے بعث بعد الموت کا' جس کے بعد تمام اوّلین و

آخرین اور کُل جن و اِنس عدالتِ اُخروی میں حساب کتاب کے لیے پیش ہوں گے۔ قرآن حکیم کے متعدد مقامات سے معلوم ہوتا ہے کہ حشر کا وہ دن نہایت طویل بھی ہوگا اور حد درجہ ہولناک بھی' جیسے سورۃ المزمل میں فرمایا: ﴿یَوۡمًا یَّجۡعَلُ الۡوِلۡدَانَ شِیۡبَا ﴿۱۷﴾﴾ ''وہ دن جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا''۔ اور ہمارے ایک سابقہ درس (سورۃ النور) میں یہ الفاظ آ چکے ہیں کہ: ﴿یَوۡمًا تَتَقَلَّبُ فِیۡہِ الۡقُلُوۡبُ وَ الۡاَبۡصَارُ ﴿۳۷﴾﴾ ''وہ دن' جب دل اور نگاہیں سب کے سب اُلٹ جائیں گے!'' اس کے لیے بھی قرآن مجید میں متعدد الفاظ آتے ہیں' چنانچہ اسے ''یَوۡمُ الدِّیۡنِ'' بھی کہا گیا ہے اور ''یَوۡمُ الۡفَصۡلِ'' بھی' پھر اسی کو ''یَوۡمُ التَّغَابُنِ'' بھی قرار دیا گیا ہے اور ''یَوۡمُ الۡحِسَابِ'' بھی' لیکن اس کے لیے سب سے زیادہ کثیر الاستعمال نام ''یَوۡمُ الۡقِیَامَۃِ'' ہے' یعنی کھڑے ہونے کا دن' جس کی وضاحت ایک دوسرے مقام پر سورۃ المُطففین میں ان الفاظ سے کی گئی ہے:

﴿یَّوۡمَ یَقُوۡمُ النَّاسُ لِرَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ؕ﴿۶﴾﴾

''وہ دن جس میں تمام انسان پروردگارِ عالم کے سامنے کھڑے ہوں گے!''

قرآن کا عمومی اسلوب' مکی اور مدنی سورتوں کا فرق

سورۃ القیامۃ کے بارے میں چند تعارفی اور تمہیدی باتوں کے بعد اب ہمیں اس سورۂ مبارکہ کے مطالب و مفاہیم پر غور کرنا ہے۔ اس مقصد کے لیے مناسب ہے کہ پہلے ایک نظر اس پوری سورت کے سلیس اور رواں ترجمہ پر ڈال لیں' جو حسبِ ذیل ہے:

''نہیں! میں قسم کھاتا ہوں قیامت کے دن کی۔ اور نہیں! مجھے قسم ہے نفسِ ملامت گر کی۔ کیا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو جمع نہ کر سکیں گے؟ کیوں نہیں! ہم قادر ہیں اس پر کہ اس کی ایک ایک پور کو (ٹھیک جوڑ دیں اور) برابر کر دیں۔ بلکہ (اصل بات یہ ہے کہ) انسان اپنے آگے بھی فسق و فجور کو جاری رکھنا چاہتا ہے۔ پوچھتا ہے کب ہوگا قیامت کا دن؟— تو جب نگاہ چندھیا جائے گی' اور چاند بے نور ہو جائے گا' اور سورج اور چاند یکجا کر دیے جائیں گے' تو اس دن کہے گا یہی انسان کہ کہاں ہے بھاگ جانے کی جگہ؟— کوئی نہیں! کوئی ٹھکانا نہیں! اس روز تو تیرے ربّ ہی کے حضور میں جا ٹھہرنا ہے۔ اس روز جتلا دیا جائے گا ہر انسان کو ہر اُس چیز کے بارے میں جو اُس نے آگے بھیجی اور جو پیچھے چھوڑی۔ بلکہ انسان خود اپنے بارے میں (پورے طور سے) آگاہ ہے۔ خواہ وہ کتنے ہی بہانے بنائے۔ (اے نبی ﷺ!) آپ اس (قرآن) کے ساتھ تیزی سے اپنی زبان کو حرکت مت دیجیے کہ اسے جلدی سے حاصل کر لیں۔ تحقیق ہمارے

ذمے ہے اس کو جمع کرنا بھی اور اس کو پڑھوانا بھی۔ پس جب ہم اسے پڑھوائیں تو آپ اس پڑھنے کی پیروی کیجیے۔ پھر بلاشبہ ہمارے ہی ذمے ہے اس کی مزید تشریح اور توضیح بھی۔ کوئی نہیں! بلکہ (تمہارا اصل مرض یہ ہے کہ) تم لوگ دُنیا کی محبت میں گرفتار ہو اور آخرت کو نظر انداز کر دیتے ہو! بہت سے چہرے اُس دن تروتازہ ہوں گے۔ اپنے پروردگار کی طرف دیکھتے ہوئے— اور بہت سے چہرے اُس دن سوکھے اور اداس ہوں گے اور یہ گمان کر رہے ہوں گے کہ اب ان کے ساتھ کمر توڑ دینے والا سلوک ہونے والا ہے— کوئی نہیں! جب جان ہنسلیوں میں آ پھنسے گی' اور کہا جائے گا کہ ہے کوئی جھاڑ پھونک کرنے والا؟ اور انسان یہ سمجھ لے گا کہ اب (دنیا سے) جدائی کا وقت آ گیا ہے۔ اور پنڈلی پنڈلی سے لپٹ جائے گی۔ اُس روز تیرے ربّ ہی کی طرف ہانکے جانا ہے۔ پس نہ اس نے تصدیق کی اور نہ نماز پڑھی' بلکہ جھٹلایا اور پیٹھ موڑ لی۔ پھر چل دیا اپنے گھر والوں کی طرف اکڑتا ہوا۔ افسوس ہے تجھ پر' پس افسوس ہے۔ پھر افسوس ہے تجھ پر' پس پھر افسوس ہے— کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ اسے یونہی بے قید چھوڑ دیا جائے گا؟ کیا نہیں تھا وہ منی کی ایک بوند جو ٹپکائی گئی؟— پھر وہ تھا ایک لوتھڑا جسے اللہ نے بنایا اور سنوارا۔ پھر اسی میں سے بنا دیے جوڑے' نر اور مادہ — کیا وہ ہستی اس پر قادر نہیں کہ مُردوں کو زندہ کر سکے؟''
(یقیناً اے ہمارے ربّ! تو اس پر قادر ہے اور ہم اس پر گواہ ہیں!)

اس سورۂ مبارکہ کا جو مجموعی تأثر اور اس کے مضامین کا جو اجمالی نقشہ ہمارے سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ اس میں قیامِ قیامت اور جزا و سزا کے لیے مثبت استدلال کو تو صرف دو قسموں کی صورت میں بیان کر دیا گیا ہے' البتہ منفی طور پر منکرین قیامت کے موقف کا ابطال قدرے تفصیل سے کیا گیا ہے اور ان کے اعتراضات اور دلائل کی قلعی کھول دی گئی ہے۔ چنانچہ ایک طرف اُن کے استعجاب اور استبعاد کو دور کرنے کے لیے اللہ کی اس قدرتِ کاملہ کی طرف توجہ مبذول کرائی گئی ہے جس کا سب سے بڑا مظہر خود انسان کی اپنی پیدائش ہے' اور دوسری طرف منکرین قیامت کی گمراہی کا اصل سبب بھی بیان کر دیا گیا اور ان کے مرض کی اصل تشخیص بھی کر دی گئی' یعنی حبِّ عاجلہ (دنیا کی محبت) میں گرفتار اور فسق و فجور اور ظلم و تعدی کا خوگر ہو جانا' جس کی بنا پر انسان حساب کتاب اور جزا و سزا کے تصور تک سے بھاگتا ہے اور اس کبوتر کی مانند جو بلی کو دیکھ کر آنکھیں بند کر لیتا ہے' نہیں چاہتا کہ خواہ مخواہ قیامت' حشر و نشر' حساب کتاب اور جزا و سزا کے تصور سے اپنے موجودہ عیش کو مکدّر کرے۔ واقعہ یہ ہے کہ انسان چاہے زبان سے کچھ کہے' اس کے انکارِ قیامت کا اصل سبب وہی ہے جو اِس سورۂ مبارکہ میں ﴿بَلْ

یُرِیۡدُ الۡاِنۡسَانُ لِیَفۡجُرَ اَمَامَہٗ ۝۵ ﴾ ’’بلکہ (اصل بات یہ ہے کہ) انسان اپنے آگے بھی فسق وفجور کو جاری رکھنا چاہتا ہے‘‘ اور ﴿کَلَّا بَلۡ تُحِبُّوۡنَ الۡعَاجِلَۃَ ۝۲۰﴾ ’’کوئی نہیں! بلکہ تم لوگ دنیا کی محبت میں گرفتار ہو‘‘ کے الفاظِ مبارکہ میں بیان ہوا۔ ضمنی طور پر ایک نہایت لطیف پیرائے میں یہ حقیقت بھی کھول دی گئی کہ دعوتِ دین اور ابلاغ وتبلیغ حتیٰ کہ تحصیلِ علم کے معاملے میں بھی ’’عجلت پسندی‘‘ مناسب نہیں ہے۔

یہ تو اس سورۂ مبارکہ کے مضامین کا اجمالی تجزیہ ہوا۔ اب مناسب ہے کہ اس کے سلسلہ وار مطالعہ سے قبل قرآن حکیم کے عمومی اسلوب اور اس کی مکی اور مدنی سورتوں کے مزاج کے فرق کے ضمن میں بعض باتیں بطورِ تمہید عرض کر دی جائیں‘ جو اِن شاء اللہ فہمِ قرآن بالخصوص تدبرِ قرآن کے ضمن میں کلید کا کام دیں گی۔

قرآن مجید کے عمومی اسلوب کے بارے میں یہ بات جان لینی از حد ضروری ہے کہ قرآن حکیم عام دُنیوی تصنیفات کی مانند نہیں ہے۔ ہماری تصانیف اور تالیفات کا اپنا مخصوص انداز ہوتا ہے‘ ایک خاص ترتیب ہوتی ہے اور ایک معین نہج ہوتا ہے۔ چنانچہ اس میں ابواب ہوتے ہیں اور ہر باب میں مضمون کا ایک حصہ مکمل ہو جاتا ہے‘ پھر اُس کو اگلے باب میں دہرایا نہیں جاتا۔ جو لوگ قرآن حکیم کو دنیا کی عام تصنیفات وتالیفات پر قیاس کر کے پڑھنے کی کوشش کرتے ہیں انہیں دِقت کا سامنا بھی ہوتا ہے اور ناکامی بھی ہوتی ہے۔ اچھی طرح جان لیجیے کہ نہ قرآن مجید عام تصانیف وتالیفات کی مانند ہے‘ نہ اس کی سورتوں کی حیثیت کتاب کے ابواب کی ہے‘ نہ یہ مجموعۂ مضامین یا مجموعۂ مقالات کی حیثیت رکھتا ہے۔ بلکہ قرآن حکیم کا اسلوب خطبہ کا ہے اور قرآن مجید کی سورتیں گویا خطباتِ الٰہیہ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ کے حکم سے مصحف میں ایک خاص ترتیب کے ساتھ جمع کر دیا گیا ہے۔ لہٰذا قرآن کریم کو ہم ’’مجموعۂ خطباتِ الٰہیہ‘‘ سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

اب خطبہ کے اسلوب میں چند امور اس کے لازمی جزو کی حیثیت سے شامل ہوتے ہیں۔ ان امور کو سمجھ لیا جائے تو قرآن حکیم کے فہم میں بڑی آسانی ہو جائے گی۔

پہلی بات یہ کہ جب کوئی شعلہ بیان خطیب کوئی خطبہ دے رہا ہو تو اس میں بار بار خطاب کا رُخ بدلتا ہے‘ چنانچہ ابھی خطیب دائیں طرف مخاطب تھا اور گفتگو کر رہا تھا‘ پھر وہ بائیں جانب کے لوگوں کی طرف متوجہ ہو گیا‘ اب وہ ان سے گفتگو کر رہا ہے۔ اسی طرح اگرچہ اس کے مخاطب اس کے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں اور وہ ان سے گفتگو کر رہا ہوتا ہے‘ لیکن کبھی یہ گفتگو صیغۂ حاضر وخطاب میں نہیں

بلکہ صیغۂ غائب میں ہونے لگتی ہے' اور اس میں فصاحت و بلاغت کا ایک خاص رنگ اور تاثیر کی ایک خاص کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ جو لوگ موجود نہیں ہوتے' ان کو وہ موجود اور حاضر فرض کر کے ان سے صیغۂ خطاب و حاضر میں گفتگو شروع کر دیتا ہے اور دورانِ خطبہ یہ ''تحویلِ خطاب'' بار بار اور وقفہ وقفہ سے ہوتا رہتا ہے۔ مزید برآں خطبات میں عام طور پر مخاطبین کے اعتراضات کو نقل کیے بغیر اور ان کے سوالات کو بیان کیے بغیر اُن کے جوابات دے دیے جاتے ہیں' اور ان جوابات کا اسلوب و انداز ایسا ہوتا ہے کہ مخاطبین خواہ وہاں موجود ہوں خواہ نہ ہوں اور ان تک وہ باتیں بعد میں روایتاً پہنچیں' خود جان لیتے ہیں کہ یہ باتیں فلاں اعتراض کے جواب میں کہی جا رہی ہیں اور یہ تشریحات فلاں مسئلہ کی وضاحت میں پیش کی جا رہی ہیں۔

جیسا کہ اس سے قبل عرض کیا گیا تھا' خطبہ کے اس اسلوب و انداز کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو فہمِ قرآن میں بڑی مدد ملے گی۔ اور اگرچہ پورے قرآن کا اسلوب یہی ہے' تاہم بعض سورتوں میں یہ بہت نمایاں ہے۔ چنانچہ خطبہ کا یہ انداز اس سورۂ مبارکہ میں نہایت شدت کے ساتھ نمایاں ہے۔ یہاں ساری گفتگو منکرینِ قیامت سے ہو رہی ہے' کبھی صیغۂ حاضر میں ان سے براہِ راست خطاب ہے' کبھی ''الانسان'' کے حوالے سے بصیغہ غائب گفتگو ہو رہی ہے۔ درمیان میں چند باتیں نبی اکرم ﷺ سے خطاب کر کے فرما دی گئیں اور اس طرح تحویلِ خطاب کی نمایاں مثال سامنے آ گئی۔ پھر خطاب کا رُخ دوبارہ منکرینِ قیامت و آخرت اور مخالفینِ بعث بعد الموت کی طرف منتقل ہو گیا۔ لہٰذا خطابت کے اسلوب و انداز کے اعتبار سے یہ سورۂ مبارکہ اسلوبِ قرآنی کی نہایت اہم اور نمایاں مثال ہے۔

دوسری بات یہ کہ جیسے ایک اعلیٰ پائے کے خطیب کے ہر خطبے کا ایک مرکزی موضوع یا مرکزی خیال یا ایک عمود ہوتا ہے اور خطیب کی تمام گفتگو اس مرکزی خیال یا عمود کے گرد گھومتی ہے' اور اگرچہ وہ تمہید کے طور پر یا مختلف دلائل و شواہد کے ضمن میں ایسے مباحث پر بھی اظہارِ خیال کرتا ہے جن کا بظاہر اس کے خطبہ کے عمود یا مرکزی مضمون سے تعلق معلوم نہیں ہوتا' لیکن جب وہ بحث کو سمیٹتے ہوئے گفتگو کو ختم کرتا ہے تو خطبے کے تمام اجزاء اس خطبے کے مرکزی موضوع یا عمود سے مربوط نظر آتے ہیں۔ جیسا کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے کہ قرآن مجید کی ہر سورت ایک خطبۂ خداوندی کی حیثیت رکھتی ہے' چنانچہ قرآن حکیم کی ہر سورۂ مبارکہ کا اپنا معین مرکزی خیال' موضوع اور عمود ہے' اور نہ صرف یہ کہ پوری سورت اس مرکزی خیال یا عمود کے گرد گھومتی ہے بلکہ جس طرح ایک حسین و جمیل ہار میں ہر موتی

دوسرے موتی کے ساتھ منسلک ہوتا ہے اسی طرح سورت کی تمام آیات باہم بھی مربوط ہوتی ہیں اور بحیثیت مجموعی سورت کے مرکزی مضمون کے ساتھ بھی ان کا ربط قائم رہتا ہے۔

پھر یہی نہیں' بلکہ یہ بھی ایک عظیم حقیقت ہے کہ مصحف جس ترتیب کے ساتھ ہمارے پاس موجود ہے اس میں بھی گہرا ربط موجود ہے اور اس کی تمام سورتیں بھی باہم مربوط اور ایک خاص ترتیب کے سلسلے میں منسلک ہیں۔ قرآن مجید کا ہر قاری اور ہر طالب علم جانتا ہے کہ قرآن کی نزولی ترتیب بالکل مختلف تھی' لیکن نبی اکرم ﷺ نے اللہ کے حکم اور حضرت جبرائیل علیہ السلام کی رہنمائی میں جس ترتیب سے قرآن حکیم کو مرتب فرمایا اور اُمت کے حوالے کیا وہ یہی ہے جو ہمارے پاس موجود ہے' اور یہ لوحِ محفوظ کی ترتیب کے عین مطابق ہے۔ گویا یہی قرآن کی ازلی و ابدی ترتیب ہے! اس حقیقت کو اصطلاحاً ان الفاظ میں ادا کیا جاتا ہے کہ مصحف کی یہ ترتیب ''توقیفی'' ہے' یعنی جس کا علم نبی اکرم ﷺ کے بتانے پر موقوف ہے۔ اس لیے کہ مصحف کی یہ ترتیب خود آنحضور ﷺ نے اللہ کی اس ہدایت کے مطابق معین کی ہے جو حضرت جبرائیل علیہ السلام کے ذریعے سے آپؐ کو دی جاتی تھی۔ اب چونکہ اللہ حکیم ہی نہیں ''اَحکم الحاکمین'' ہے' لہٰذا قرآن حکیم کا ایک نہایت گہرا اور معنی خیز باطنی نظم ہے۔ اگرچہ قرآن کے اس داخلی نظام اور باطنی نظم کا فہم آسان کام نہیں ہے' بلکہ اس کی حکمتوں کے سمجھنے کے لیے بڑے عمیق غور و خوض اور گہرے تدبر و تفکر کی ضرورت ہے' اور اگرچہ فہم قرآن کے اس پہلو پر بھی الحمدللہ ہر دور میں مفید کام ہوتا رہا ہے لیکن قرآن مجید کے محاسن و عجائب' اس کے علوم و معارف اور اس کے حکم و عبر ایک اتھاہ سمندر کے مانند ہیں جو تا قیامِ قیامت کبھی ختم نہیں ہوگا۔ چنانچہ نظمِ قرآن کے ضمن میں بھی عہد حاضر کے ایک محقق مولانا حمید الدین فراہیؒ نے جن پہلوؤں کی نشاندہی کی ہے ان کی جانب پہلے توجہ نہیں ہو سکی تھی اور یقیناً آئندہ بھی اس کے مزید پہلو روشن ہوتے رہیں گے' لیکن یہ واضح رہنا چاہیے کہ جہاں تک انسانی زندگی کی عملی رہنمائی کا تعلق ہے اس کے نقطۂ نظر سے قرآن مجید نہایت سہل اور آسان کتاب ہے' جیسا کہ سورۃ القمر کی چار آیات (۱۷'۲۲'۳۲'۴۰) میں اللہ تعالیٰ نے بتکرار و اعادہ ارشاد فرمایا:

﴿وَلَقَدۡ یَسَّرۡنَا الۡقُرۡاٰنَ لِلذِّکۡرِ فَہَلۡ مِنۡ مُّدَّکِرٍ ﴾

''اور بلاشبہ ہم نے اس قرآن کو نصیحت اخذ کرنے کے لیے آسان کر دیا ہے' تو ہے کوئی نصیحت پکڑنے والا؟''

تیسری بات ابتدائی مکی سورتوں کے مخصوص امتیازی اسلوب و انداز سے متعلق ہے۔ اس لیے کہ مکی دَور کے بھی آخری حصے میں جو سورتیں نازل ہوئیں ان کا اسلوب ابتدائی مکیات سے مختلف اور مدنی سورتوں کے اسلوب سے مشابہ ہے۔ اگرچہ ظاہر ہے کہ یہ ''رنگِ دگر'' زیادہ پختگی اور گہرائی کے ساتھ مدنی سورتوں ہی میں ظاہر ہوتا ہے۔ ابتدائی مکیات اور بعد کی سورتوں کے مابین جو فرق و تفاوت ہے' اس کو یوں سمجھئے کہ ابتدائی مکی سورتوں میں خطابت کا رنگ اور انداز نہایت نمایاں اور بہت گہرا ہے۔ چنانچہ ان میں جوش و خروش بھی زیادہ ہے اور زجر و توبیخ اور انذار و تنبیہ بھی اس انداز کی حامل ہے جس کی بابت حالی نے اس شعر میں اشارہ کیا ہے کہ ؎

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادی
عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی!

چنانچہ اس کا کسی قدر اندازہ سورۃ القیامۃ کے ترجمے ہی سے ہو جاتا ہے کہ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ ایک شعلہ بیان خطیب نہایت پُرجلال اور پُرہیبت انداز میں خطبہ دے رہا ہے۔

ابتدائی مکی سورتوں کا ایک دوسرا امتیازی وصف یہ ہے کہ ان کی آیات چھوٹی چھوٹی ہیں' جبکہ بعد کی مکیات اور تقریباً تمام مدنی سورتوں میں آیات کا طول اور حجم مقابلتاً بہت زیادہ ہے۔ چنانچہ ہم ایک فوری تقابل کر سکتے ہیں۔ یہ سورۃ القیامہ ہے جو ابتدائی مکی سورتوں میں سے ایک ہے جس کا ہم فی الوقت مطالعہ کر رہے ہیں۔ اس سے متصلاً قبل ہم نے سورۃ التغابن کا مطالعہ مکمل کیا ہے جو مدنی سورت ہے۔ وہ بھی دو رکوعوں پر مشتمل ہے اور اس سورۃ القیامۃ کے بھی دو رکوع ہیں۔ مصحف میں اگر آپ ان دونوں کے حجم کا تقابل کریں گے تو سورۃ القیامۃ' سورۃ التغابن کے تین چوتھائی سے بھی کم ہے' لیکن سورۃ التغابن کی آیات کی تعداد اٹھارہ ہے اور سورۃ القیامہ کی آیات کی تعداد چالیس ہے۔ مزید برآں اکثر ابتدائی مکی سورتوں میں غنائیت اور ترنم بھی پایا جاتا ہے۔ چنانچہ ان میں قوافی کا لحاظ بھی نمایاں ہے اور بہاؤ بھی تیز ہوتا ہے۔ اس طرح ایک جانب جوش و خروش اور دوسری جانب تیزی و روانی' ان دونوں کے امتزاج سے زبردست اثر انگیزی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ تمام اوصاف ابتدائی مکی سورتوں میں بہت نمایاں ہیں' جبکہ آخری دَور کی مکیات اور بالخصوص مدنی سورتوں میں چند استثنائی مثالوں کو چھوڑ کر آپ ایک مختلف انداز اور رنگ پائیں گے۔ چنانچہ ان میں آیات بھی طویل ہوگئی ہیں' بہاؤ بھی تیز نہیں ہے' بلکہ مضمون بڑے پرسکون انداز میں بالکل ایسے آگے بڑھتا ہے جیسے کوئی دریا بہہ

رہا ہو۔ آیات کی طوالت کے باعث عام طور پر ان میں قوافی (فواصل) اور صوتی آہنگ کا بھی اتنا اہتمام نہیں رہتا جو ابتدائی مکیات کا خصوصی وصف ہے۔

سورۃ القیامۃ کے حوالے سے قرآن حکیم کے عظیم معجزہ ہونے کا ایک یہ پہلو بھی بآسانی سمجھ میں آ جاتا ہے کہ یہ فصاحت و بلاغت کی معراج اور عربی زبان و ادب کا عظیم ترین شاہکار ہے۔ قرآن مجید کا عربی زبان پر یہ عظیم احسان تو بالکل ظاہر و باہر ہے کہ مختلف علاقائی ''بولیوں'' سے قطع نظر ادبی اور کتابی عربی کی روایت کا تسلسل اسی کے دم سے قائم و دائم ہے' اور اس طرح قرآن حکیم عربی زبان کو گویا ایک ستون کی مانند تھامے ہوئے ہے۔ چنانچہ اب بھی عربی ادب میں قرآن مجید کو بالکل وہی مقام حاصل ہے جو اِس کے نزول کے وقت تھا' اور اس کی بنیاد کسی مذہبی عقیدے یا عصبیت پر قائم نہیں ہے' اس لیے کہ کثیر تعداد میں ایسے یہود و نصاریٰ آج بھی موجود ہیں جن کی مادری زبان عربی ہے اور اس کے باوجود کہ وہ قرآن حکیم کے اللہ کی طرف سے نازل شدہ ہونے پر یقین نہیں رکھتے' لیکن بایں ہمہ وہ بھی یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ قرآن مجید فصاحت و بلاغت کی معراج اور عربی ادب کا شاہکار ہے اور قرآن مجید کے اس وصف کے بارے میں ان کو بھی کوئی اشتباہ نہیں ہے۔ اور اگرچہ یہ بات تو بہت تفصیل طلب ہے' بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ایک مستقل اور وسیع موضوع ہے' کہ قرآن حکیم کے اعجاز کے کون کون سے رُخ اور کون کون سے پہلو ہیں' اور اس میں ہرگز کوئی شک نہیں ہے کہ اس کے معانی' اس کے مطالب' اس کے مفاہیم' اس کا طرزِ استدلال' اس کی اثر انگیزی' اس کی علمی رہنمائی' اس کی روحانی و اخلاقی تعلیم' پھر انسان کے پیچیدہ ترین عمرانی اور تمدنی مسائل کا جو متوازن و معتدل حل یہ پیش کرتا ہے اور انسانی زندگی کے لیے جو کامل اور عدل و قسط پر مبنی دستور یہ عطا فرماتا ہے وہ سب اپنی جگہ اعجازِ قرآنی کے اہم اور عظیم مظہر ہیں اور جیسے جیسے زمانہ گزرے گا اور نئے نئے حالات و واقعات سامنے آئیں گے اعجازِ قرآنی کے یہ پہلو مزید اُجاگر ہوں گے' لیکن اس میں بھی ہرگز کوئی شک نہیں ہے کہ قرآن کے نزول کے وقت اس کے اعجاز کا جو پہلو سب سے زیادہ مؤثر ثابت ہوا تھا وہ ہے اس کا اسلوب' ادبیت' خطابت' فصاحت' بلاغت' سلاست' حلاوت' تر و تازگی' چاشنی اور اس کا جوش و خروش! —— اور اس کے یہ تمام محاسن تاحال اسی طرح آفتابِ عالمتاب کی مانند قائم ہیں اور بحمد اللہ قرآن حکیم کے بارے میں ہر صاحبِ ذوق جانتا ہے کہ آج بھی نبی اکرم ﷺ کے یہ ارشادات صد فی صد درست اور ہر شائبہ سے پاک ہیں کہ: ((لَا یَشْبَعُ مِنْهُ الْعُلَمَاءُ وَلَا یَخْلَقُ عَلٰی کَثْرَةِ الرَّدِّ وَلَا تَنْقَضِیْ

عَجَائِبُهٗ))[1] ''اہلِ علم اس سے کبھی سیر نہ ہو سکیں گے' اور اس پر کثرت و تکرارِ تلاوت سے کبھی باسی پن طاری نہیں ہوگا (اس کے لطف اور اثر انگیزی میں کوئی کمی نہیں آئے گی) اور نہ ہی اس کے عجائبات (یعنی نئے نئے علوم و معارف) کا خزانہ کبھی ختم ہوگا''۔ گویا یہ قرآنِ مجید اور فرقانِ حمید ہمیشہ اسی طرح تابندہ' پائندہ اور تر و تازہ کلام رہے گا جس طرح اپنے نزول کے وقت تھا۔ قرآن مجید کے یہ ادبی محاسن اگرچہ اس کے ایک ایک لفظ میں نمایاں ہیں' لیکن ان کا جس شدت کے ساتھ ظہور ابتدائی مکی سورتوں میں ہوا ہے اس کا ادراک اور شعور تو ہم غیر عرب عامیوں کو بھی بہت حد تک ہو جاتا ہے۔ اور چونکہ سورۃ القیامہ اس کی ایک نہایت نمایاں مثال ہے لہٰذا اس سورۂ مبارکہ کے ضمن میں اس تمہیدی گفتگو میں قرآن حکیم کے عمومی اسلوب اور بالخصوص ابتدائی مکی سورتوں اور بعد میں نازل ہونے والی سورتوں کے مابین انداز اور اسلوب کے فرق کی جانب یہ اشارات کر دیے گئے۔ اب ہم اس سورۂ مبارکہ کا سلسلہ وار مطالعہ شروع کرتے ہیں۔

پہلی دو آیات: قیامت کے دن اور نفسِ ملامت گر کی قسم

﴿لَآ اُقۡسِمُ بِيَوۡمِ الۡقِيٰمَةِ ۝۱ وَلَآ اُقۡسِمُ بِالنَّفۡسِ اللَّوَّامَةِ ۝۲﴾

''نہیں! میں قسم کھاتا ہوں قیامت کے دن کی —— اور نہیں! میں قسم کھاتا ہوں نفسِ ملامت گر کی!!''

سورۃ القیامۃ کی ابتدائی دو آیتوں میں وارد شدہ قسموں میں اللہ تعالیٰ نے اس تمام استدلال کو کمال ایجاز و اعجاز کے ساتھ سمو دیا ہے جو اثباتِ آخرت اور وقوعِ قیامت کے ضمن میں طویل مکی سورتوں میں شرح و بسط اور اطناب و تفصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے۔

اِن دونوں قسموں کے نفسِ مضمون پر کلام سے قبل اس حرفِ نفی ''لَا'' کے بارے میں وضاحت مناسب ہے جو دونوں قسموں سے متصلاً قبل اور دونوں آیتوں کے شروع میں آیا ہے۔ یہ قرآن حکیم کا ایک خاص اسلوب ہے جو اس سورۂ مبارکہ کے علاوہ قرآن مجید کی چھ مزید سورتوں (اَلْوَاقِعَة' اَلْحَاقَّة' الْمَعَارِج' التَّكْوِيْر' الْاِنْشِقَاق اور اَلْبَلَد) میں بھی وارد ہوا ہے' اور اس کے بارے میں اگرچہ بعض دوسری آراء اور تاویلات بھی موجود ہیں' تاہم بہترین رائے یہ معلوم ہوتی ہے کہ اگرچہ رسم الخط کے اعتبار سے تو ''لاءِ متصل'' نظر آتا ہے' لیکن واقعتاً ''لاءِ منفصل'' ہے' یعنی حرفِ نفی ''لَا'' علیحدہ ہے

(۱) سنن الترمذی' کتاب فضائل القرآن عن رسول اللہ ﷺ' باب ما جاء فی فضل القرآن۔

اور ''اُقْسِمُ'' علیحدہ۔ تاہم چونکہ عربی زبان میں چونکہ انگریزی کی طرح علامتیں اور اوقاف نہیں ہیں لہٰذا یہ فرق اسلوبِ بیان اور مضمون کے سیاق وسباق پر غور کرنے ہی سے سمجھ میں آتا ہے۔ اسے یوں بآسانی سمجھا جا سکتا ہے کہ جب ایک خطیب خطبہ شروع کرتا ہے تو اس کے سامنے اس کے جو سامعین ومخاطبین ہوتے ہیں' ان کے ذہنوں میں کچھ اشکالات' اعتراضات اور سوالات ہوتے ہیں۔ چنانچہ خطیب ان کی تردید سے اپنی گفتگو کا آغاز کرتا ہے اور کہتا ہے ''لَا'' یعنی ہرگز نہیں! تمہارے خیالات غلط ہیں' تمہارے اشکالات باطل ہیں' تمہارے اعتراضات بے وزن ہیں—— اور پھر اپنے موقف کو بیان کرنے سے قبل اپنے یقین واذعان کے اظہار کے لیے کوئی قسم کھاتا ہے جس کے لیے لفظ ''اُقْسِمُ'' استعمال کرتا ہے' جیسے یہاں قسم کھائی گئی۔ یعنی ''میں قسم کھاتا ہوں قیامت کے دن کی''۔ گویا قیامت اتنی یقینی' اتنی حتمی اور اتنی قطعی ہے کہ میں اس کی قسم کھا رہا ہوں۔ اسی طرح دوسری آیت پڑھئے: ''اور نہیں! میں قسم کھاتا ہوں نفسِ ملامت گر کی''۔ یہ آغاز خود بتا رہا ہے کہ یہ انداز واسلوب خطیبانہ ہے۔ جیسے ایک خطیب پہلے سے جانتا ہے کہ اس کے سامنے جو سامعین وحاضرین موجود ہیں اور اس کے جو مخاطبین ہیں' ان کے ذہنوں میں کیا کیا وسوسے' کیا کیا اشکالات اور کیا کیا اعتراضات ہیں' اور وہ کن کن وجوہ اور اسباب کی بنیاد پر قیامِ قیامت اور وقوعِ آخرت کو بالکل ناممکن اور بعید از قیاس سمجھ رہے ہیں۔ لہٰذا خطیب ان کے تمام اشکالات' اعتراضات اور وسوسوں کی نفی وتردید کے لیے لاءِ نفی سے اپنے خطبے کا آغاز کر رہا ہے۔

۱) قیامت کی قسم!

اور اب توجہ کو مرتکز کیجیے ان دو قسموں کے نفسِ مضمون پر۔ ان میں سے پہلی قسم ہے خود قیامت کے دن کی۔ گویا اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ تمہارے ذہنوں میں شبہات واشکالات ہیں' تمہارے دلوں میں وسوسے ہیں کہ دنیا کے آغاز سے لے کر قیامِ قیامت تک پیدا ہونے والے تمام انسان کیسے دوبارہ اٹھائے جا سکیں گے اور انہیں دوبارہ کیسے زندہ کیا جا سکے گا؟ پھر ان سب انسانوں کے جملہ اعمال و افعال اور وہ بھی جملہ تفصیلات کے ساتھ کہاں محفوظ ہوں گے؟ مزید برآں ان اعمال وافعال کی پشت پر کارفرما نیتیں اور ارادے کس کے علم میں ہوں گے؟ لہٰذا یہ محاسبہ اور جزا وسزا کا معاملہ کیسے ظہور پذیر ہو سکے گا؟ لیکن یہ وقوعِ قیامت اس قدر یقینی' قطعی اور حتمی ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ''میں اس دن کی قسم کھاتا ہوں''۔ یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اس میں دلیل کون سی ہے؟ اس لیے کہ اگر کوئی

شخص کوئی دعویٰ پیش کرے اور اس سے اس دعوے کے لیے کوئی دلیل طلب کی جائے تو جواب میں وہ اس پر صرف قسم کھانے پر اکتفا کرے تو یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ عقلی اور منطقی اعتبار سے اس نے کوئی دلیل پیش نہیں کی۔ لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس اسلوب اور اصول میں بھی ایک دلیل مضمر ہے، اور وہ دلیل ہوتی ہے خود متکلم کی شخصیت کی۔ اگر کوئی صاحبِ کردار انسان جس پر اعتماد کیا جاتا ہو، جس کی صداقت کی گواہی دی جاتی ہو، جب وہ کوئی بات کہتا ہے اور قسم کھا کر کہتا ہے تو اُس کے قسم کھانے سے اس کی بات میں نمایاں وزن پیدا ہو جاتا ہے جو درحقیقت اور اصلاً اس شخص کی اپنی شخصیت کا ہوتا ہے۔ اب غور کیجیے کہ یہاں قسم کھانے والا کون ہے! ان لوگوں کے نزدیک جو قرآن مجید کو اللہ کا کلام تسلیم کرتے ہیں، قسم کھانے والا خود اللہ ہے۔ لہٰذا قرآن مجید کو اللہ کا کلام ماننے والے صاحبِ ایمان پر تو اس کا لازمی اثر یہ پڑے گا کہ اس کا دل لرز جائے گا اور وہ کانپ اٹھے گا کہ قیامت کا دن اتنا یقینی، حتمی اور قطعی ہے کہ خود خالق کون و مکاں نے اس کی قسم کھائی ہے۔

رہے وہ لوگ جو قرآن مجید کو اللہ کا کلام نہیں مانتے، تو وہ بھی اس قسم کو لامحالہ منسوب کریں گے جناب محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی طرف۔ اور اس صورت میں بھی اس قسم کی تاثیر ختم نہیں ہوگی بلکہ باقی رہے گی، اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ کی شخصیتِ مبارکہ اور سیرتِ مطہرہ کا وزن اس کی پشت پر پھر بھی موجود رہے گا کہ یہ قسم وہ کھا رہا ہے جس کی صداقت و امانت کی گواہی اس کے دشمنوں تک نے دی ہے۔ یہ مضمون اس سے قبل سورۃ التغابن کی آیت ۷ کے الفاظِ مبارکہ ﴿قُلْ بَلٰى وَرَبِّىْ لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ ؕ﴾ ''(اے نبیؐ!) کہہ دیجیے: کیوں نہیں! اور مجھے میرے ربّ کی قسم ہے کہ تم لازماً دوبارہ اٹھائے جاؤ گے، پھر تم لازماً جتلا دیے جاؤ گے جو کچھ تم (دنیا میں) کرتے رہے ہو'' کی تشریح و توضیح کے ضمن میں بیان ہو چکا ہے۔ چنانچہ سیرتِ مطہرہ کا اہم واقعہ ہے کہ جب نبی اکرم ﷺ کے بارے میں اسلام کے سب سے بڑے دشمن ابوجہل سے یہ پوچھا گیا کہ ''کیا تمہارا گمان یہ ہے کہ محمدؐ جھوٹ بولتے ہیں؟'' تو اس نے کہا: ''ہرگز نہیں! انہوں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا''۔ پھر جب پوچھنے والے نے پوچھا کہ ''پھر تم ان کی تصدیق کیوں نہیں کرتے اور ان پر ایمان کیوں نہیں لاتے؟'' تو اس نے بڑی صفائی کے ساتھ اقرار کیا کہ: ''اصل معاملہ یہ ہے کہ ہمارے اور بنوہاشم کے مابین ایک مسابقت اور مقابلہ جاری ہے۔ انہوں نے لوگوں کو کھانے کھلائے تو ہم نے ان سے بڑھ کر کھلائے، انہوں نے مہمان نوازیاں کیں تو ہم نے ان سے بڑھ کر کیں، ہم اب تک کاندھے سے کاندھا ملائے

چلے آ رہے ہیں۔ اب اگر ہم ان کے ایک فرد کی نبوت کو تسلیم کر لیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم ہمیشہ کے لیے ان کے تابع ہو جائیں گے اور یہ بات مجھے کسی طور پر بھی گوارا نہیں''۔ معلوم ہوا کہ ابوجہل جیسا دشمنِ خدا و رسول بھی حضرت محمدؐ رسول اللہ ﷺ پر جھوٹ کا الزام نہیں لگا سکا۔ یہی وجہ ہے کہ جب رسول کریم ﷺ کو حکم ہوا: ﴿فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ﴾ (الحجر: ۹۴) ''پس اب (اے نبیؐ!) آپ برملا اور ڈنکے کی چوٹ کہیے وہ بات جس کا آپؐ کو حکم ملا ہے''۔ اور آپؐ پہلے ''خطابِ عام'' کے لیے کوہِ صفا پر کھڑے ہوئے تو چونکہ اُس زمانے میں رواج تھا کہ اگر کوئی اہم خبر لوگوں کو پہنچانی مقصود ہوتی تھی تو خبر پہنچانے والا کسی بلند مقام پر بے لباس ہو کر کھڑا ہو جاتا تھا اور نعرہ لگاتا تھا ''وَاصَبَاحَاہ'' (ہائے وہ صبح جو آنے والی ہے!) چنانچہ لوگ اس کی آواز سن کر اور جن تک آواز نہیں پہنچتی تھی وہ دور سے یہ دیکھ کر کہ ایک ''ڈرانے والا'' پہاڑی پر کھڑا ہے' اس کے گرد جمع ہو جاتے تھے۔ لہٰذا رسول اللہ ﷺ نے اس رواج میں یہ ترمیم فرماتے ہوئے کہ کپڑے نہیں اتارے' اس لیے کہ یہ بات کسی طرح بھی آپؐ کے شایانِ شان نہ تھی اور آپؐ تو حیا کا پیکر اعظم تھے' باقی سارا معاملہ معمول کے مطابق کیا اور کوہِ صفا پر کھڑے ہو کر آواز بلند فرمایا: ''وَاصَبَاحَاہ''۔ اور جب آپؐ کی یہ ندا سن کر اور آپؐ کو کوہِ صفا پر کھڑا دیکھ کر لوگ آپؐ کے گرد جمع ہو گئے تو آپؐ نے دعوت پیش کرنے سے پہلے لوگوں سے سوال کیا: ''لوگو! تم نے مجھے کیسا پایا؟'' مجمع نے بیک زبان تسلیم کیا کہ آپؐ سچے بھی ہیں اور امانت دار بھی! لہٰذا جو لوگ قرآن مجید کو منزل من اللہ نہیں مانتے اور اُن کے نزدیک اس کلام کے متکلم خود محمد (ﷺ) ہیں' ان کے لیے رسول اللہ ﷺ کی شخصیت کا پورا وزن اور پورا زور اس قسم کی پشت پر موجود ہے کہ ﴿لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ ①﴾ ''نہیں! مجھے قسم ہے قیامت کے دن کی''۔ یعنی میں قیامت کے وقوع کو اتنا یقینی' قطعی اور حتمی مانتا ہوں کہ اس کے یقینی اور شدنی ہونے پر خود اسی کی قسم کھاتا ہوں!

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے' سورۃ التغابن کی آیت ۷ میں نبی اکرم ﷺ سے جو قسم کھلوائی گئی تھی اس کا بھی یہی مفاد اور انداز تھا۔ اصطلاح میں اس کو ''دلیل خطابی'' کہا جاتا ہے جس میں دلیل کی حیثیت متکلم کے اپنے یقین واثق اور اس کی اپنی بے داغ شخصیت اور اعلیٰ سیرت کو حاصل ہوتی ہے اور جس کے ذریعے متکلم کا یقین اور اذعان مخاطبین میں منتقل ہوتا اور سرایت کرتا ہے۔

۲) نفسِ ملامت گر کی قسم!

اب آیئے دوسری دلیل کی طرف۔ ارشاد فرمایا گیا: ﴿وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ②﴾ ''اور

نہیں! میں قسم کھاتا ہوں نفسِ ملامت گر کی‘‘۔اس بات کو ایک آفاقی و عالمی حقیقت کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ انسان کے باطن میں ایک حقیقت پوشیدہ ہے جسے ضمیر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ انسان جب کوئی برا کام کرتا ہے تو اسے اندر سے ضمیر کی خلش کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ تم نے یہ اچھا نہیں کیا۔ اس لیے کہ بُرے سے بُرا انسان بھی یہ جانتا ہے کہ برائی برائی ہے اور بدی بدی ہے' اور اگرچہ مختلف اسباب اور محرکات کے تحت وہ کسی برائی کا ارتکاب کر رہا ہوتا ہے' لیکن عین اُس وقت بھی وہ یہ جانتا ہے کہ یہ کام برا ہے اور اسے یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ اس کا ضمیر اُسے اندر ہی اندر کچوکے دے رہا ہے۔اسی احساس اور اسی کیفیت کو اِس آیت مبارکہ میں ''نفسِ لوّامہ'' قرار دیا گیا ہے اور آیتِ مبارکہ میں اس کی قسم کھائی گئی ہے۔اس لیے کہ نفسِ انسانی کی یہ مضمر حقیقت جو عالمی اور آفاقی سطح پر مسلّم سچائی کی حیثیت رکھتی ہے' وقوعِ قیامت پر سب سے زیادہ قوی اور سب سے زیادہ مؤثر دلیل ہے' جسے قرآن حکیم نے اسلوب اور الفاظ کے فرق اور تنوع کے ساتھ بہت سے مقامات پر' کہیں اجمال اور کہیں تفصیل کے ساتھ' بیان کیا ہے۔

اس دلیل کا اگر کسی قدر تفصیلی تجزیہ کیا جائے تو بات کچھ یوں بنتی ہے کہ ہر انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے نیکی اور بدی کو پہچانتا ہے' ان میں تمیز کرتا اور اُن کے فرق و تفاوت کو خوب جانتا اور پہچانتا ہے۔ گویا یہ پہچان اور یہ شعور فطرتِ انسانی میں ودیعت شدہ ہے۔ چنانچہ آخری پارے کی سورۃ الشّمس میں فرمایا گیا: ﴿وَنَفۡسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝ فَاَلۡهَمَهَا فُجُوۡرَهَا وَتَقۡوٰىهَا ۝﴾ ''اور گواہ ہے نفسِ انسانی اور جیسا کہ اسے بنایا اور سنوارا' پھر اس میں فجور و تقویٰ (برائی اور اچھائی اور بدی اور نیکی کا علم) الہامی طور پر ودیعت کر دیا''۔ چنانچہ ہر شخص جانتا ہے کہ جھوٹ بولنا برائی ہے اور سچ بولنا اچھائی ہے' وعدہ خلافی برائی ہے اور ایفائے عہد بھلائی ہے' کسی کو دھوکہ دینا شر ہے اور کسی کی صحیح رہنمائی کرنا خیر ہے' ظلم و استحصال اور تعدّی و حق تلفی بدی کے کام ہیں' جبکہ عدل و انصاف' ہمدردی و خیر خواہی اور خدمتِ خلق نیکی کے کام ہیں۔ یہ سب عالمی اور آفاقی سچائیاں ہیں اور ان کے ضمن میں کہیں بھی انسانوں کے مابین کوئی اختلاف نہیں ہے۔

یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ اس کے حقیقت ہونے پر سب سے بڑا گواہ ہمارا اپنا ضمیر' ہمارا اپنا نفس ملامت گر اور ہمارا اپنا ذاتی احساس ہے' کہ اگر کسی سبب سے ہم سے کوئی غلط حرکت سرزد ہو جاتی ہے یا کسی برے کام کا ارتکاب ہو جاتا ہے تو ہمارا اپنا ضمیر ہمیں ملامت کرتا ہے کہ تم نے یہ بُرا کام کیا ہے۔

اس سلسلے میں اُن معدودے چند لوگوں کا معاملہ ذہن سے نکال دیجیے جن کی فطرت بالکل ہی مسخ ہو چکی ہو، جن کے دل پتھر بن گئے ہوں، جن کا ضمیر مردہ ہو چکا ہو، جو اتنے کٹھور دل ہو چکے ہوں کہ انسانیت کی کوئی رمق بھی ان میں باقی نہ رہی ہو اور جن کی خودغرضی اور مفاد پرستی جملہ اخلاقی اقدار پر مسلط ہو چکی ہو۔ ان لوگوں کی حیثیت ان استثناءات کی ہے جو قواعد وکلیات کو مزید ثابت اور مؤکد کرتے ہیں۔ ورنہ قاعدہ کلیہ یہی ہے کہ فطرتِ انسانی نیکی اور بدی اور خیر وشر کے مابین واضح طور پر فرق اور تمیز کرتی ہے۔ فطرتِ انسانی کی اس بدیہی حقیقت پر اگر عقلِ سلیم کے اس مسلّمہ اصول کا اطلاق کیا جائے کہ ع ''گندم از گندم بروید، جوز جو!'' تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان کو نیک اعمال کا اچھا صلہ ملنا چاہیے اور بد اعمالیوں کی سزا ملنی چاہیے، جبکہ فی الواقع جو صورت ہمارے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ اس دنیا کی زندگی میں نیکی کا بدلہ بھلائی کی صورت میں اکثر وبیشتر تو بالکل ملتا ہی نہیں، اور اگر ملے بھی تو نیکی کی مناسبت سے نہیں ملتا۔ اسی طرح بدی کی سزا اکثر وبیشتر ملتی ہی نہیں، اور اگر ملتی بھی ہے تو جرم کے تناسب کے ساتھ نہیں ملتی۔ مثلاً ہٹلر کا نام ذہن میں لائیے جس کی ہوسِ اقتدار اور جوع الارض کی وجہ سے لاکھوں انسان مارے گئے، لاکھوں خواتین بیوہ ہوئیں، کروڑوں بچے یتیم ہو گئے، ہزاروں افراد اپاہج ہو گئے، لاکھوں گھر تباہ وبرباد ہو گئے اور اُن کے مکین بے خانماں ہو گئے۔ نوعِ انسانی کے اعتبار سے دیکھا جائے تو اندازہ لگانا مشکل ہو جاتا ہے کہ کتنا بڑا اور ہولناک جانی ومالی نقصان نوعِ بشر کو مجموعی طور پر ہٹلر کی ہوسِ ملک گیری اور نسلی برتری کے زعمِ باطل کے باعث پہنچا! اب اگر ہٹلر گرفتار ہو جاتا اور اس کے جسم کا ایک ایک ریزہ بھی کر دیا جاتا تو کیا اسے اپنے جرائم کی پوری سزا مل جاتی؟ ہم دیکھتے ہیں کہ اس نے ایک گولی سے خود اپنی زندگی ختم کر لی اور وہ اپنے جرائم کی دُنیوی سزا سے بالکل بچ گیا۔

معلوم ہوا کہ اس اعتبار سے یہ دنیا ناقص ہے۔ یہاں قوانینِ طبیعیہ تو پورے طور پر بروئے کار آ رہے ہیں۔ آپ اگر آگ میں انگلی ڈالتے ہیں تو وہ جل جاتی ہے، آپ کوئی سمِ قاتل اور زہرِ ہلاہل کھائیں گے تو مر جائیں گے، لیکن لوگ جھوٹ بولتے ہیں تو کوئی گزند نہیں پہنچتا، زبان پر چھالا تک نہیں پڑتا، لوگ حرام خوریاں کرتے ہیں تو سب رچ پچ جاتا ہے، کسی نوع کے دردِ شکم تک سے سابقہ پیش نہیں آتا، لوگ حق تلفیاں کرتے ہیں، رشوتیں لیتے ہیں، جبر واستحصال اور ناجائز ذرائع سے دولت جمع کرتے ہیں تو اس طرح جو جتنا مال دار اور دولت مند ہوتا ہے معاشرے میں اس کی اسی اعتبار سے عزت بڑھتی چلی جاتی ہے، حالانکہ اکثر لوگ جانتے ہیں کہ اس کی دولت مندی اور مال داری کی حقیقت کیا ہے اور

کن ناجائز ذرائع سے اس نے دولت حاصل کی ہے۔ الغرض ایسے لوگ دنیا میں گل چھرے اڑاتے ہیں‘ عیش کرتے ہیں‘ آسودہ حال رہتے ہیں‘ صاحبِ عزت وشرف سمجھے جاتے ہیں‘ جن کے کوئی اصول نہیں ہیں‘ جو جائز و ناجائز‘ حرام وحلال اور خیر وشر کی تمیز اور اس بات کا رتی بھر لحاظ رکھے بغیر کہ ان کے اس طرزِعمل سے قومی وملی مفادات اور ملکی معیشت کو کتنا مہلک نقصان پہنچ رہا ہے‘ ہر نوع کی جعل سازی سے دن رات دولت سمیٹنے میں لگے رہتے ہیں۔ اس کے برعکس ایسے لوگوں کے لیے زندگی کی ناگزیر ضروریات فراہم کرنا بھی مشکل ہو جاتا ہے جو جائز اور ناجائز میں امتیاز کریں‘ حلال اور حرام میں فرق کریں‘ صحیح اور غلط کا لحاظ رکھیں اور اخلاق کی اعلیٰ اقدار کا پاس کریں۔

اب یا تو یہ مانا جائے کہ یہ دُنیا نری اندھیر نگری اور چوپٹ راج ہے اور یہ تخلیق عبث اور بے مقصد ہے‘ ورنہ ایک دوسری زندگی کو ماننا لازم ٹھہرے گا‘ جس میں جزا وسزا کا قانون بھرپور طور پر بروئے کار آئے۔ یاد ہوگا کہ بالکل یہی بات سورۂ آل عمران کے آخری رکوع کے مطالعہ کے دوران سامنے آ چکی ہے کہ: ﴿رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿١٩١﴾﴾ ’’اے ہمارے ربّ! تو نے یہ سب کچھ بے مقصد (بے کار اور عبث) پیدا نہیں کیا۔ تو اس سے پاک ہے (تو اس سے اعلیٰ وارفع اور منزہ ومبرا ہے کہ کوئی کام بے کار و بے مقصد کرے! تیری تخلیق کا یہ محکم نظام اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ نیکی کی جزا اور بدی کی سزا ملے گی۔) پس (اے ہمارے ربّ!) ہمیں آگ کے عذاب سے بچائیو!‘‘ لہٰذا عقل ومنطق کی رو سے بدیہی طور پر لازم آتا ہے کہ اگر خیر خیر ہے اور شر شر ہے‘ نیکی نیکی ہے اور بدی بدی ہے تو ایک دوسری زندگی لازماً ہونی چاہیے جس میں ان اعمال کے پورے نتائج ظاہر ہوں‘ نیکی کا بھرپور صلہ اور پورا پورا بدلہ ملے اور بدی کی بھرپور سزا ملے۔ الغرض یہ ہے قرآن حکیم کا بدیہیاتِ فطرت پر مبنی استدلال جو وہ ع ’’اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں‘‘ کے مصداق مختلف اسالیب سے متعدد مقامات پر‘ کہیں تفصیل کے ساتھ اور کہیں اجمال کے ساتھ‘ پیش کرتا ہے۔ مثلاً سورۃ القلم میں ارشاد فرمایا گیا: ﴿اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ ﴿٣٥﴾ مَا لَكُمْ ۣ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ﴿٣٦﴾﴾ یعنی سوچو تو سہی‘ کیا ہم اپنے فرماں برداروں اور مجرموں کو برابر کر دیں گے؟ کیا تم لوگوں کی مت ماری گئی ہے کہ ایسا حکم لگاتے ہو؟ —— اگر واقعتاً کوئی اور زندگی نہیں ہے اور نہ کوئی آخرت ہے نہ محاسبہ‘ نہ جزا وسزا تو مجرم اور باغی تو مزے میں رہے کہ انہوں نے دنیا میں اس پر عمل کیا کہ ع ’’بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست‘‘۔ گویا عقلی اور منطقی طور پر ان لوگوں کی روش

زیادہ درست اور مناسب ہے جنہوں نے خیر وشر کے مابین کوئی امتیاز نہیں کیا' جنہوں نے جائز و ناجائز اور حلال وحرام کے درمیان کوئی تمیز نہیں کی۔ لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو پھر خود ہماری عقل تقاضا کرتی ہے کہ دوسری زندگی ہونی چاہیے جس میں انسان کو اپنے اعمال کی بھرپور جزا یا پوری پوری سزا مل جائے۔

بہرحال یہ ہے خلاصہ اس پورے استدلال کا جس کو یہاں پر صرف ایک قسم کے اسلوب سے پیش کیا گیا ہے: ﴿وَلَآ اُقۡسِمُ بِالنَّفۡسِ اللَّوَّامَةِ ؚ۲﴾ ''اور نہیں! میں قسم کھاتا ہوں نفسِ ملامت گر کی''۔ یہاں ذرا وہ بات بھی ذہن نشین کر لیجیے جو سورۃ العصر کے سبق کے ضمن میں عرض کی گئی تھی کہ قسم کا اصل مقصد گواہی اور شہادت ہے۔ گویا وقوعِ قیامت پر ایک تو خود یومِ قیامت گواہ ہے' گویا ''آفتاب آمد دلیلِ آفتاب''، اور اگر وقوعِ قیامت پر کوئی اضافی گواہی مطلوب ہی ہے تو تمہارا اپنا ضمیر' تمہارا اپنا نفسِ ملامت گر گواہی دے رہا ہے کہ نیکی نیکی ہے' بدی بدی ہے' لہٰذا اس کا بھرپور بدلہ جزا یا سزا کی صورت میں ملنا چاہیے جو اِس دنیا میں نہیں ملتا' چنانچہ اس کے لیے ایک دوسرا عالم ہونا عین عقل کا تقاضا ہے۔

مناسب ہوگا کہ اس مقام پر اُس شخص کا حوالہ بھی دے دیا جائے جسے جدید مغربی فلسفے کا باوا آدم قرار دیا جاتا ہے' یعنی کانٹ' جس نے اپنے فلسفہ میں اخلاقی قانون کو بڑی اہمیت دی ہے۔ چنانچہ اس نے اپنی پہلی کتاب ''تنقیدِ عقلِ خالص'' (Critique of Pure Reason) میں تو یہ ثابت کیا تھا کہ وجودِ باری تعالیٰ کو کسی منطقی دلیل سے ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن پھر اپنی دوسری کتاب ''تنقیدِ حکمتِ عملی''(Critique of Practical Reason) میں یہ بات ثابت کی کہ وجودِ باری تعالیٰ کے اثبات پر سب سے بڑی دلیل انسان کے اندر کا اخلاقی قانون ہے جو اُس کے باطن اور اس کی فطرت میں ودیعت شدہ موجود ہے۔ یہ خیر وشر اور نیکی و بدی کی تمیز کہاں سے آئی؟ خالص مادّے میں یہ شعور کیسے پیدا ہو گیا؟ انسان کے سوا حیوانات میں یہ شعور موجود نہیں ہے۔ حیوانات صرف جبلت کے تحت زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہ انسان کی شان ہے کہ وہ اخلاقی شعور رکھتا ہے اور خیر کی قدر و قیمت کو جانتا ہے اور بدی اور شر سے طبعاً نفرت کرتا ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ خدا کی ہستی پر دو دلیلیں سب سے زیادہ قوی ہیں۔ ایک تو ہمارے اوپر یہ ستاروں بھرا آسمان خدا کی ایک عظیم نشانی ہے اور دوسری نشانی وہ اخلاقی قانون وشعور ہے جو فطرتِ انسانی میں مضمر اور ودیعت شدہ ہے۔ واضح رہے کہ کانٹ نے اخلاقی قانون کو اللہ تعالیٰ کے وجود کے اثبات کے لیے بطورِ دلیل استعمال کیا ہے' جبکہ قرآن مجید اسے وقوعِ قیامت کی دلیل کے طور پر پیش کرتا ہے۔

منکرینِ آخرت پر ردّ و قدح

سورۃ القیامۃ کی ابتدائی دو آیات میں وارد شدہ قسموں کے بعد‘ جن کے بارے میں یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ ان میں اثباتِ آخرت اور وقوعِ قیامت کے لیے قرآن مجید کا مثبت استدلال جامعیت کے ساتھ سمو دیا گیا ہے‘ منکرینِ آخرت کے اعتراضات اور شبہات کی ترجمانی کرتے ہوئے فرمایا گیا:

﴿اَیَحۡسَبُ الۡاِنۡسَانُ اَلَّنۡ نَّجۡمَعَ عِظَامَہٗ ؇﴾

’’کیا انسان کا خیال یہ ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو ہرگز جمع نہیں کر سکیں گے؟‘‘

پھر فرمایا:

﴿بَلٰی قٰدِرِیۡنَ عَلٰۤی اَنۡ نُّسَوِّیَ بَنَانَہٗ ؇﴾

’’کیوں نہیں! ہم قادر ہیں اس پر کہ اس (انسان) کی ایک ایک پور کو برابر اور درست کر دیں‘‘۔

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے‘ اس اسلوب میں اصل وزن متکلم کی شخصیت کا ہوتا ہے‘ یعنی یہ کہ یہ بات کون کہہ رہا ہے! پھر یہ کہ وہ کس یقین سے کہہ رہا ہے اور کس اذعانی کیفیت کے ساتھ کہہ رہا ہے کہ یقیناً ہم کو اِس پر کامل قدرت حاصل ہے کہ ہڈیاں تو ہڈیاں ہم انسان کی انگلیوں کی ایک ایک پور اور اس کے ایک ایک ریشے کو درست کر دیں اور از سرِ نو بنا دیں۔ بظاہر تو یہ صرف ایک دلیل خطابی ہے‘ لیکن غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ اس میں ایک عقلی اور منطقی دلیل بھی مضمر ہے۔ اور وہ یہ کہ مخاطب اس بات پر غور کرے کہ آیا وہ اللہ کو بھی مانتا ہے یا نہیں؟ اگر وہ اللہ ہی کو نہیں مانتا تو اس سے بعث بعد الموت اور قیامت و آخرت کے بارے میں گفتگو بے کار اور لا حاصل ہے۔ ایسے شخص سے تو پہلے وجودِ باری تعالیٰ کے بارے میں گفتگو ہوگی۔ لیکن اگر وہ اقرار کرتا ہے کہ وہ اللہ کو مانتا ہے تو سوال یہ پیدا ہوگا کہ کیا وہ اللہ کو ہر چیز پر قادر مانتا ہے؟ اگر اس نے اللہ کو ’’القدیر‘‘ اور ’’القادر‘‘ مانا ہے تو اب اس کا اعتراض از خود ختم ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ اگر اللہ ہر چیز پر قادر ہے تو پھر تمہارا اعتراض کس بات پر ہے؟ تمہارے تمام شکوک و شبہات کے غبارے کی ہوا تو اللہ کو قادرِ مطلق تسلیم کرنے کے بعد خود بخود نکل جاتی ہے‘ اس لیے کہ جو ہستی ہر چیز پر قادر ہے وہی ہے جو مُردوں کو دوبارہ زندہ کر سکے گی۔

دوسری دلیل انسان کے مشاہدات سے دی گئی ہے۔ یہ دلیل اس سورۂ مبارکہ کی آخری آیات (۳۶ تا ۴۰) میں وارد ہوئی ہے جہاں اس استفہامِ انکاری کے بعد کہ ’’کیا انسان نے یہ سمجھ رکھا ہے

کہ اسے یوں ہی چھوڑ دیا جائے گا؟'' انسان کو متوجہ کیا گیا ہے کہ وہ ذرا اپنی تخلیق کے اس حصہ پر غور کرے جو اُس کے علم میں ہے' یعنی رحمِ مادر میں جنین کے ارتقائی مراحل جن سے اللہ کی قدرتِ کاملہ اور اس کی تخلیقی قوتوں کا کسی درجے میں اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے کہ ہر انسان جانتا ہے کہ اس کا آغاز ایک گندے پانی کی بوند سے ہوا۔ پھر اُس نے ایک لوتھڑے کی شکل اختیار کی۔ پھر اسی لوتھڑے کے اندر سے یہ تمام اعضاء و جوارح' یہ سماعت و بصارت' یہ شعور و ادراک' یہ عقل و فہم' یہ غور و فکر کی استعداد اور حسّی معلومات سے نتائج اخذ کرنے کی صلاحیت' الغرض انسان کی حیران کن مشینری وجود میں آئی' اور اس کی تخلیق بھی ہوئی اور تسویہ بھی ہوا' اور اس کی نوک پلک سنواری گئی۔ مزید برآں اسی گندے پانی کی بوند سے کسی کو مرد بنا دیا کسی کو عورت' حالانکہ کوئی بڑی سے بڑی خوردبین بھی یہ فرق نہیں کر سکتی کہ رحمِ مادر میں نشوونما پانے والا ''نطفۂ اَمشاج''' یعنی مرد کے نطفہ اور عورت کے بیضہ کے اتحاد و امتزاج سے وجود میں آنے والا واحد خلیہ نر ہے یا مادہ۔ پھر ذرا انسان غور کرے کہ مَرد اور عورت کا جسمانی نظام ایک دوسرے سے کس قدر مختلف ہے' اور اس پر بھی مستزاد اُن کی نفسیاتی ساخت اور میلانات و رجحانات کے مابین کتنا فرق و تفاوت ہے! اور یہ سب کچھ اس گندے پانی کی بوند سے تخلیق کیا گیا ہے جس کا نام زبان پر لانا بھی کوئی شائستہ اور مہذب انسان پسند نہیں کرتا۔ اللہ کی یہ ساری خلّاقی تمہاری نگاہوں کے سامنے ہے۔ کتنی حیرت کی بات ہے کہ اس سب کے باوجود تمہیں یہ وسوسہ لاحق رہتا ہے اور تم یہ اعتراض کرتے ہو کہ انسان کے مر جانے اور مٹی میں مل کر مٹی ہو جانے' یا جل کر راکھ ہو جانے یا کسی درندے یا مچھلی کی غذا بن جانے کے بعد اسے دوبارہ کیسے اٹھایا جا سکتا ہے اور کیسے دوبارہ زندہ کیا جا سکتا ہے؟ کیا وہ اللہ جس کی خلّاقی کا یہ عالم ہے کہ وہ گندے پانی کی ایک بوند سے انسان جیسی اشرف المخلوقات ہستی تخلیق فرما دیتا ہے' اس پر قادر نہیں ہوگا کہ مُردوں کو دوبارہ زندہ کر سکے؟ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿اَیَحۡسَبُ الۡاِنۡسَانُ اَنۡ یُّتۡرَکَ سُدًی ﴿۳۶﴾ اَلَمۡ یَکُ نُطۡفَۃً مِّنۡ مَّنِیٍّ یُّمۡنٰی ﴿۳۷﴾ ثُمَّ کَانَ عَلَقَۃً فَخَلَقَ فَسَوّٰی ﴿۳۸﴾ فَجَعَلَ مِنۡہُ الزَّوۡجَیۡنِ الذَّکَرَ وَ الۡاُنۡثٰی ﴿۳۹﴾ اَلَیۡسَ ذٰلِکَ بِقٰدِرٍ عَلٰۤی اَنۡ یُّحۡیِۦَ الۡمَوۡتٰی ﴿۴۰﴾﴾

''کیا انسان نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ اس کو (بلا باز پرس) یونہی چھوڑ دیا جائے گا؟ کیا (ابتدا میں) وہ منی کا ایک قطرہ نہ تھا جو (رحم مادر میں) ٹپکایا گیا تھا؟ پھر وہ خون کا ایک لوتھڑا بنا جسے پھر (اللہ نے

انسان کی شکل میں) تخلیق فرمایا' پھر (اس کا) تسویہ فرمایا (اس کی نوک پلک سنواری)' پھر اس سے مرد اور عورت کی دو جنسیں بنائیں۔ کیا وہ ہستی اس پر قادر نہیں ہے کہ مُردوں کو زندہ کر سکے؟''

الغرض یہ ہے وہ انسان کے مشاہدے پر مبنی منطقی دلیل جو منکرین قیامت کے وسوسے اور ان کے استبعاد کا قطعی ابطال اور ان کے جملہ اعتراضات کی نفی کر دیتی ہے۔

واضح رہے کہ اثباتِ آخرت اور وقوعِ قیامت کا مثبت استدلال تو وہ تھا جو اس سورۂ مبارکہ کے آغاز میں وارد شدہ دو قسموں میں سے دوسری قسم میں اجمال کے ساتھ بیان کر دیا گیا تھا کہ انسان کا ضمیر یا نفسِ لوّامہ شاہد ہے کہ فطرتِ انسانی نیکی اور بدی میں امتیاز کرتی ہے۔ اب ایک جانب عقل انسانی مطالبہ کرتی ہے کہ ع ''گندم از گندم بروید' جوز جو!'' کے مطابق نیکی کی بھرپور جزا اور بدی کی پوری پوری سزا ملنی چاہیے' اور دوسری جانب مشاہدہ یہ بتاتا ہے کہ اس دنیا میں فی الواقع ایسا نہیں ہو رہا' بلکہ بسا اوقات معاملہ برعکس ہوتا ہے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ یہ دنیا ناقص ہے' چنانچہ ایک دوسری زندگی ہونی چاہیے جس میں نیکی اور بدی کا بھرپور بدلہ ملے۔ عقل کے اس مطالبے اور فطرت کے اس تقاضے کے مقابلے میں منکرین آخرت و قیامت کی جانب سے صرف ایک منفی دلیل پیش کی گئی۔ یعنی صرف یہ استبعاد اور استعجاب کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ جب انسان مٹی ہو کر مٹی میں مل جائے اور اس کی ہڈیاں بھی گل سڑ جائیں تو اسے دوبارہ اٹھا لیا جائے!

اس کا ایک جواب تو خطابی انداز میں دیا گیا کہ: ﴿بَلٰی قٰدِرِیۡنَ عَلٰۤی اَنۡ نُّسَوِّیَ بَنَانَہٗ ۝۴﴾ ''کیوں نہیں! (ہم تو) اس کی انگلیوں کی پوروں تک کو درست کرنے پر قادر ہیں''۔ جس میں یہ منطقی دلیل بھی مضمر ہے کہ جب تم اللہ کو مانتے ہو اور اسے ہر چیز پر قادر جانتے ہو تو اب تمہارے پاس اعتراض کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی' اور دوسرا جواب انسان کی رحم مادر میں جنین کی حیثیت سے تخلیق کے حوالے سے دیا گیا۔ کس کے لیے ممکن ہے کہ اس ہستی کی قدرت اور تخلیقی قوت کا اندازہ کر سکے جو ایک گندے پانی کی بوند سے انسان جیسی عظیم مخلوق پیدا فرما دیتا ہے؟ کیا وہ قادرِ مطلق تمہیں مرنے کے بعد دوبارہ زندہ نہ کر سکے گا؟ ظاہر بات ہے کہ اس سوال کا جواب ہر سلیم الفطرت اور سلیم العقل انسان اثبات میں دے گا۔ چنانچہ یہی بات ہمیں نبی اکرم ﷺ نے اس طرح تلقین فرمائی کہ آپؐ کی عادت مبارکہ تھی کہ آپؐ اس سورۃ کے اختتام کے بعد فرمایا کرتے تھے: ((بَلٰی وَعِزَّۃِ رَبِّنَا)) ''کیوں نہیں! ہمارے ربّ کی عزت کی قسم! (ہم اس پر گواہ ہیں کہ وہ مُردوں کو زندہ کر سکتا ہے)''۔

انکارِ آخرت کے اسباب

اس سورۂ مبارکہ میں دوسرا اہم مضمون یہ سامنے آیا کہ اگر منکرین کا یہ اعتراض منطق اور عقل کی رو سے بالکلیہ باطل اور قطعاً بے وزن ہے تو پھر ان کے انکار کا اصل سبب کیا ہے اور یہ قیامت وآخرت کے منکر کیوں ہیں' اس کو تسلیم کیوں نہیں کرتے؟ اس کے تین نہایت اہم اور بنیادی سبب بیان کیے گئے۔

۱) فسق وفجور کی عادت: اس کا پہلا سبب یہ ہے کہ جب انسان فسق وفجور کا عادی ہو جاتا ہے اور اسے حرام خوری کی عادت پڑ جاتی ہے' وہ حرام کی کمائی سے حاصل ہونے والی عیش کا خوگر ہو جاتا ہے اور لذت کوشی اس کی گھٹی میں رچ بس جاتی ہے تو ان سب کا چھوڑنا آسان نہیں ہوتا۔ اب اگر وہ آخرت کو مانے تو اسے حلال وحرام میں تمیز کرنی پڑے گی اور جائز وناجائز کے فرق کو ملحوظ رکھنا پڑے گا۔ چنانچہ جس طرح کبوتر جب بلی کو دیکھتا ہے تو اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہے (حالانکہ اس طرح سے بلی معدوم نہیں ہو جاتی)' اسی طرح وہ لوگ جو فسق وفجور کے عادی ہو چکے ہیں اور اس کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہیں' بلکہ اس کو جاری رکھنا چاہتے ہیں' وہ آخرت ہی کا انکار کر دیتے ہیں۔ انہوں نے اپنے لیے اسی میں عافیت سمجھی ہے کہ روایتی کبوتر کی مانند قیامت وآخرت کی طرف سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ گویا منکرین قیامت وآخرت کے انکار کا اصل سبب منطقی ہے نہ عقلی' بلکہ صرف یہ ہے کہ وہ اپنی حرام خوری اور فسق وفجور کی روش اور لااُبالیانہ طرزِ زندگی کو جاری رکھنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ نہایت جامع الفاظ میں ارشاد فرمایا: ﴿بَلْ یُرِیْدُ الْاِنْسَانُ لِیَفْجُرَ اَمَامَهٗ ۝۵﴾ یعنی ان کے اعراض وانکار کی اصل وجہ یہ ہے کہ وہ اپنی فسق وفجور کی روش کو جاری رکھنا چاہتے ہیں!

۲) دُنیا کی محبت: آخرت اور قیامت کے انکار کا دوسرا سبب دُنیا کی حد سے بڑھی ہوئی محبت ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا:

﴿كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ ۝۲۰ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ ۝۲۱﴾

''ہرگز نہیں! بلکہ تم لوگ عاجلہ سے محبت رکھتے ہو اور آخرت کو چھوڑ دیتے ہو!''

یعنی تمہاری گمراہی کا اصل سبب یہ ہے کہ تم عاجلہ کی محبت میں گرفتار ہو' اور اس کے پرستار بن گئے ہو۔ لفظ ''عاجلہ'' عجلت سے بنا ہے' اس سے مراد ''دُنیا'' ہے۔ اس لیے کہ اس کا نفع بھی فوری اور نقد ہے اور نقصان بھی فوری اور نقد ہے۔ اس کی لذتیں بھی بالفعل محسوس ہوتی ہیں اور اس کی کلفتیں بھی فوری اثر

کرنے والی ہوتی ہیں۔تم اس عاجلہ سے دل لگائے ہوئے ہو اور آخرت کی زندگی کو نظر انداز اور فراموش کیے ہوئے ہو۔ یہاں عاجلہ کا لفظ استعمال کر کے اس حقیقت کی جانب توجہ مبذول کرا دی گئی کہ اس دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ جو لوگ فوری لذتوں کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہوتے اور فوری آسائشوں کو قربان نہیں کر سکتے' وہ آگے نہیں بڑھ سکتے۔ اس کے برعکس جنہیں آگے بڑھنا ہوتا ہے اور جو دُور اندیش اور دُور بین ہوتے ہیں وہ فوری راحت و آرام کو تج دیتے ہیں اور سخت محنت کرتے ہیں یہاں تک کہ راتوں کو جاگتے ہیں تاکہ اپنے دُنیوی کیریئر کو روشن بنا سکیں۔ بالکل اسی طرح جو لوگ دنیا کی فوری لذت اور عیش و راحت کو قربان کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے' جو اس عاجلہ (دُنیا) کی محبت میں گرفتار ہو جاتے ہیں اور اس عروسِ ہزار داماد کی زلف گرہ گیر کے اسیر ہو کر رہ جاتے ہیں' اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ آخرت سے غافل رہتے ہیں اور اللہ کی جناب میں محاسبہ کے لیے کھڑے ہونے کو فراموش کر دیتے ہیں' وہ اُخروی زندگی میں لامحالہ ناکام اور خائب و خاسر ہو کر رہیں گے۔ لیکن افسوس کہ انسان مختصر سی حیاتِ دُنیوی میں تو مستقبل سے غافل نہیں ہوتا' لیکن آخرت کی ابدی زندگی سے غافل رہتا ہے اور حیاتِ دُنیوی کو اِس انداز سے بسر کر دیتا ہے کہ: ؎

اب تو آرام سے گزرتی ہے
آخرت کی خبر خدا جانے!

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دو حکیمانہ اشعار میں دنیا میں کامیابی اور ناکامی کا نقشہ نہایت خوبصورتی کے ساتھ کھینچ دیا ہے کہ: ؎

يَغُوصُ الْبَحْرَ مَنْ طَلَبَ اللُّؤْلِي
وَمَنْ طَلَبَ الْعُلٰى سَهِرَ اللَّيَالِي
وَمَنْ طَلَبَ الْعُلٰى مِنْ غَيْرِ كَدٍّ
اَضَاعَ الْعُمُرَ فِيْ طَلَبِ الْمَحَالِي

''جو موتیوں کا طالب ہوتا ہے لامحالہ سمندر میں غوطے لگاتا ہے۔ اور جو بلند مقام حاصل کرنا چاہتا ہے وہ راتوں کو جاگتا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص بغیر محنت و مشقت کے بلند مقام حاصل کرنا چاہتا ہے وہ اپنی عمر ناممکن چیز کی خواہش میں ضائع کر دیتا ہے۔''

گویا بقول حالی مرحوم: ؎

تن آسانیاں چاہیں اور آبرو بھی
وہ قوم آج ڈوبے گی گر کل نہ ڈوبی!

افسوس کہ دنیا میں ایسے انسان تو پھر بھی بہت سے مل جاتے ہیں جو دنیا کے حصول کے لیے محنت ومشقت بھی کرتے ہیں اور راحت وآرام کو بھی تج دیتے ہیں' لیکن آخرت کی کامیابی کے حصول کے لیے اس طرزِ عمل کے اختیار کرنے والے بہت ہی کم ہیں!

۳) تکبر وتمرّد: اس سورۂ مبارکہ میں انکارِ قیامت وآخرت کا جو تیسرا اہم سبب بیان کیا گیا ہے وہ تکبر ہے۔ ارشاد فرمایا گیا:

﴿فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰى ۝۳۱ وَلٰـكِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ۝۳۲ ثُمَّ ذَهَبَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ يَتَمَطّٰى ۝۳۳﴾

''پس اس نے نہ تصدیق کی اور نہ نماز ادا کی۔ بلکہ جھٹلایا اور روگردانی کی۔ پھر اکڑتا ہوا اپنے گھر والوں کی طرف چل دیا''۔

یہاں یہ بات پیشِ نظر رہے کہ تابعین کرامؒ میں سے جن حضرات کو تفسیر قرآن سے خصوصی شغف تھا' وہ کہتے ہیں کہ اگرچہ یہ الفاظ عام ہیں اور ان میں ایک عام متکبر انسان کی نقشہ کشی کی گئی ہے' لیکن یہاں معین طور پر ابوجہل مراد ہے۔ یہ بات عرض کی جا چکی ہے کہ ابوجہل کے اعراض وانکار اور کفر و تکذیب کا سب سے بڑا سبب تکبر تھا۔ وہ نبی اکرم ﷺ کے سامنے نیچا ہونے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اسی لیے اس نے تصدیق نہیں کی۔ ''فَلَا صَدَّقَ'' میں اس کی اسی روش کا ذکر ہے۔ اس لیے کہ اگر وہ رسول اللہ ﷺ کی تصدیق کرتا جو خبر دے رہے تھے وقوعِ قیامت کی اور جو مدّعی تھے اللہ کے نبی اور رسول ہونے کے' تو آپؐ کی تصدیق کے لازمی معنی یہ ہوتے کہ وہ آپؐ کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتا اور آپؐ کی اطاعتِ کُلی قبول کرتا ہے' اور اس کے لیے اس کی متکبرانہ طبیعت آمادہ نہیں تھی۔ اسی طرح جو شخص نماز پڑھتا ہے وہ ہمہ تن اللہ کے سامنے جھکتا ہے' جس کا نقطۂ آغاز ہے ادب کے ساتھ جھک کر کھڑے ہونا' اور پھر درمیانی مقام ہے حالت رکوع' اور اس کی انتہا ہے حالت سجدہ۔ اب بہت سے انسان اتنے سرکش اور متمرد ہوتے ہیں کہ ان کی اکڑی ہوئی گردنیں اللہ تعالیٰ کے سامنے بھی جھکنے کے لیے تیار نہیں ہوتیں۔ الغرض تصدیق اور نماز کی راہ میں رکاوٹ اور انکار وتکذیب پر آمادہ کرنے والی اہم چیز ہے تکبر وتمرد' جس کا نقشہ کھینچ دیا گیا ان الفاظِ مبارکہ سے کہ: ﴿ثُمَّ ذَهَبَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ يَتَمَطّٰى ۝۳۳﴾ ''پھر

وہ چل دیا اپنے گھر والوں کی جانب اکڑتا اور اینٹھتا ہوا!''

تین ہولناک مناظر کی نقشہ کشی

اب اس سورۂ مبارکہ کے مضامین کے تیسرے اہم حصے کی جانب توجہ منعطف کیجیے جو تین مواقع کی منظر کشی پر مشتمل ہے' جن کی ایسی کامل تصویرِ لفظی پیش کر دی گئی ہے کہ نگاہوں کے سامنے پورا نقشہ آ جاتا ہے۔ چنانچہ ایک نقشہ ہے ''اَلسَّاعَةُ'' کا' یعنی وہ بڑی ہلچل جو اس کائنات کے نظام میں آنے والی ہے' جس کے بارے میں سورۃ الحج میں ارشاد فرمایا گیا: ﴿یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۚ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَیْءٌ عَظِیْمٌ ①﴾ ''اے لوگو! اپنے پروردگار (اور اپنے آقا) کا تقویٰ اختیار کرو (اور اس کی نافرمانی سے بچو)' واقعہ یہ ہے کہ ''اَلسَّاعَةُ'' کا زلزلہ بڑی خوفناک چیز (اور بہت ہولناک واقعہ) ہوگا!'' یہ قیامت کی آمد کا پہلا نقشہ ہے جسے قرآن مجید یہاں ''اَلسَّاعَةُ'' سے موسوم کرتا ہے۔ اسی کو دوسرے مقامات پر اَلْقَارِعَةُ' اَلْحَاقَّةُ' اَلطَّاغِیَةُ' اَلصَّاخَّةُ اور اَلطَّآمَّةُ الْكُبْرٰی بھی فرمایا گیا۔ اُس ''اَلسَّاعَةُ'' کا نقشہ اس سورۂ مبارکہ میں یوں کھینچا گیا:

﴿فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ ⑦ وَخَسَفَ الْقَمَرُ ⑧ وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ⑨﴾

''پس جب نگاہ چندھیا جائے گی' اور چاند بے نور ہو جائے گا' اور سورج اور چاند ایک کر دیے جائیں گے''۔

معلوم ہوتا ہے کہ کششِ ثقل کا جو باہمی نظام ہے' اس کا معاملہ درہم برہم ہو جائے گا اور یہ بڑے بڑے کُرّے ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرائیں گے اور چاند سورج میں دھنس جائے گا۔ تو یہ اس ''اَلسَّاعَةُ'' کے ابتدائی احوال ہیں۔ جب یہ کیفیت نظر آئے گی تو یہی انسان جو اِس وقت اکڑ رہا ہے' بڑے متکبرانہ انداز میں چیلنج کر رہا ہے کہ: ﴿یَسْـَٔلُ اَیَّانَ یَوْمُ الْقِیٰمَةِ ⑥﴾ ''(تحدّی کے ساتھ) پوچھتا ہے کہ کب ہوگا قیامت کا دن؟'' اس روز اس کا یہ حال ہوگا کہ ﴿یَقُوْلُ الْاِنْسَانُ یَوْمَئِذٍ اَیْنَ الْمَفَرُّ ⑩﴾ ''یہ انسان کہہ رہا ہوگا کہ ہے کوئی جائے فرار؟ (ہے کوئی پناہ گاہ؟)'' جواباً اللہ تعالیٰ کی طرف سے ارشاد ہو رہا ہے:

﴿كَلَّا لَا وَزَرَ ⑪ اِلٰی رَبِّكَ یَوْمَئِذِ نِ الْمُسْتَقَرُّ ⑫ یُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ یَوْمَئِذٍ ۢ بِمَا قَدَّمَ وَاَخَّرَ ⑬﴾

''ہرگز نہیں! (اُس روز) کوئی جائے پناہ نہیں ہوگی۔ اُس روز تو تیرے ربّ ہی کے سامنے جا کر ٹھہرنا ہوگا۔ (اس روز) انسان کو جتلا دیا جائے گا جو کچھ اس نے آگے کیا (یا آگے بھیجا) اور جو کچھ پیچھے کیا (یا پیچھے چھوڑا)!''

یہ ایک نقشہ تو ''اَلسَّاعَۃُ'' کا ہے جو کھینچا گیا ہے۔ دوسرا نقشہ ہے ''یَوْمُ الْقِیَامَۃِ'' کا — جس روز لوگ اپنے ربّ کے حضور میں کھڑے ہوں گے' نتیجہ کا اعلان ہونے والا ہوگا۔ جیسے کہ آپ نے اسکولوں میں دیکھا ہوگا کہ جس روز سالانہ امتحان کا نتیجہ نکلتا ہے تو طالب علم جب کھڑے ہوتے ہیں تو نتیجہ گویا ان کے چہروں پر پہلے ہی سے لکھا ہوا ہوتا ہے۔ جو کامیاب ہونے والے ہوتے ہیں' جن کو معلوم ہے کہ ہم امتحان کے پرچے اچھے کر کے آئے ہیں' ان کے چہرے تروتازہ ہوتے ہیں' انہیں کوئی تشویش نہیں ہوتی۔ اور جنہیں معلوم ہوتا ہے کہ ہم فیل ہونے والے ہیں' وہ نتیجہ کے متعلق خود جانتے ہیں کہ وہ کیا ہوگا! اسی کیفیت کو اس سورۂ مبارکہ کی آیات ۱۴' ۱۵ میں یوں فرمایا گیا:

﴿بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِیْرَۃٌ ۝۱۴ وَّلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَہٗ ۝۱۵﴾

''بلکہ انسان اپنے لیے خود ہی دلیل ہے (ہر انسان کو خوب معلوم ہے کہ وہ کتنے پانی میں ہے اور وہ کہاں کھڑا ہے!) خواہ وہ کتنے ہی بہانے تراشے اور معذرتیں پیش کرے (اور اپنی چرب زبانی سے اعتراض کرنے والوں کی زبانیں بند کر دے)۔''

لیکن وہ اپنی تمام باطنی کیفیات اور اپنے اصل محرکاتِ عمل کو اچھی طرح جانتا ہے۔ لہٰذا جب لوگ بارگاہِ ربّ العزت میں کھڑے ہوں گے تو ان کے چہروں پر ان کا انجام' ان کے امتحان کا نتیجہ لکھا ہوا ہوگا۔ اسی بات کو اگلی آیات (۲۲ تا ۲۵) میں فرمایا گیا:

﴿وُجُوْہٌ یَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَۃٌ ۝۲۲ اِلٰی رَبِّهَا نَاظِرَۃٌ ۝۲۳﴾

''اُس روز بہت سے چہرے ہوں گے تروتازہ (اور شاداں وفرحاں) اپنے پروردگار کی رحمت کے امیدوار (یا اپنے پروردگار کی جانب دیکھتے ہوئے)''۔

اس کے برعکس کچھ لوگوں کا حال یہ ہوگا کہ:

﴿وَوُجُوْہٌ یَّوْمَئِذٍۭ بَاسِرَۃٌ ۝۲۴ تَظُنُّ اَنْ یُّفْعَلَ بِهَا فَاقِرَۃٌ ۝۲۵﴾

''اور کچھ چہرے ہوں گے اُس دن سوکھے ہوئے (اداس اور افسردہ و پریشان)۔ اس خیال سے (لرز رہے ہوں گے) کہ اب اُن کے ساتھ کمر توڑ دینے والا سلوک ہونے والا ہے۔''

تیسرا نقشہ جو کھینچا گیا' وہ ہے قیامتِ صغریٰ یعنی عالمِ نزع کا نقشہ' جب اس دنیا سے روانگی کا

وقت ہوتا ہے اور انسان کو یقین ہو جاتا ہے کہ اب اپنے اہل وعیال اور مال ومنال سے جدائی کی گھڑی آن پہنچی ہے۔ نبی اکرم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

((مَنْ مَاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِيَامَتُهُ))

''جو مر گیا تو اس کی قیامت تو واقع ہو گئی۔''

یعنی دنیا کی مہلتِ عمل ختم ہو گئی' جیسا کہ امتحان گاہ میں کہا جاتا ہے کہ وقت ختم ہو گیا' لکھنا بند کر دیا جائے اور قلم رکھ دیے جائیں۔ تو یہ موت درحقیقت مہلتِ عمل کے خاتمے کا نام ہے اور وقوعِ جزا وسزا کا مقدمہ اور پیش خیمہ ہے۔ اُس وقت کا نقشہ کھینچا گیا:

﴿كَلَّآ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ ﴿٢٦﴾ وَقِيْلَ مَنْ سكتة رَاقٍ ﴿٢٧﴾﴾

''ہرگز نہیں! جب جان ہنسلیوں میں آن پھنسے گی' اور کہا جائے گا (یعنی تیمار دار کہیں گے) ہے کوئی جھاڑ پھونک کرنے والا؟''

یعنی اب تو ساری تدبیریں ناکام ہو چکیں اور معالج جواب دے چکے۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ اس موقع پر بسا اوقات بڑے سے بڑا اعقلیت پرست بھی اس تگ ودو میں لگ جاتا ہے کہ کوئی ٹونا ٹوٹکا ہی کام کر جائے اور کسی تیر تکے ہی سے کام چل جائے۔

﴿وَظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ ﴿٢٨﴾ وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ ﴿٢٩﴾﴾

''اور اسے یقین ہو جائے گا کہ اب جدائی کا وقت آن پہنچا ہے' اور پنڈلی پنڈلی سے لپٹی ہو گی۔''

اگلی آیت میں جو حالت بیان فرمائی گئی ہے وہ دنیا سے آخرت کی جانب انتقال (نقل مکانی) کے مختلف مراحل کی نہایت جامع اور فصیح و بلیغ تعبیر ہے' یعنی:

﴿اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ نِ الْمَسَاقُ ﴿٣٠﴾﴾

''(اُس روز کہا جائے گا) آج تو تجھے اپنے ربّ کی طرف ہی جانا ہے (چار و ناچار' کشاں کشاں)''۔

الغرض یہ تین نقشے ہیں جن کو پیش کرنے سے مطلوب و مقصود یہ ہے کہ جو لوگ آخرت اور قیامت کے منکر ہیں' جو کبوتر کی مانند اپنی آنکھیں بند کیے ہوئے ہیں' جو اپنی فطرت کی گواہی پر غور نہیں کر رہے' اپنے ضمیر کی پکار کو نہیں سن رہے' اس کی خلش پر دھیان نہیں دے رہے' نفسِ ملامت گر کی پروا نہیں کر رہے' جو عقل وخرد اور فہم وادراک نیز شعور سے کام نہیں لے رہے' ان کے باطن کی بصیرت شاید اِن واقعات وحالات کی تذکیر سے جاگ جائے جن کا وقوع پذیر ہونا یقینی' قطعی اور حتمی ہے' جیسا کہ

سورۃ الذّٰریٰت میں فرمایا گیا:

﴿اِنَّمَا تُوۡعَدُوۡنَ لَصَادِقٌ ۙ﴿۵﴾ وَّ اِنَّ الدِّیۡنَ لَوَاقِعٌ ؕ﴿۶﴾﴾

''بلا شبہ تم سے جو وعدہ کیا جا رہا ہے وہ سچا ہے (حق ہے) اور یقیناً جزا و سزا واقع ہو کر رہے گی''۔

گویا جو لوگ ان حقائق کو اپنے شعور و ادراک سے دُور رکھے ہوئے ہیں اور ان کی طرف سے اپنی نگاہیں بند کیے ہوئے ہیں' اور جو خوابِ غفلت میں مدہوش ہیں' ان نیند کے متوالوں کو اس سورۂ مبارکہ میں مؤثر ترین اسالیب سے جگایا جا رہا ہے۔ اور جو اس کے باوجود نہ جاگیں' بلکہ کبوتر کی طرح آنکھیں بند کیے رہیں ان کے لیے سورۂ مبارکہ کی آیات ۳۴' ۳۵ میں فرمایا:

﴿ اَوۡلٰی لَکَ فَاَوۡلٰی ﴿ۙ۳۴﴾ ثُمَّ اَوۡلٰی لَکَ فَاَوۡلٰی ﴿ؕ۳۵﴾﴾

''(اے غفلت شعار!) تیرے لیے افسوس اور ہلاکت ہے۔ پھر تیرے لیے افسوس اور بربادی ہے!''

اللہ تعالیٰ ہمیں اس انجامِ بد سے بچائے اور ہمارے دلوں میں آخرت کا یقین بھی پیدا فرما دے اور ''زَلْزَلَۃَ السَّاعَۃُ'' اور ''أھوالُ القیامۃ'' کی سختیاں آسان فرما کر جنت الفردوس میں داخل فرمائے' آمین!

عُجلت خیر میں بھی پسندیدہ نہیں

وقوعِ قیامت اور اثباتِ قیامت کے ضمن میں منکرین کے اعتراضات' اشکالات اور شبہات کے جواب کا مطالعہ مکمل کرنے کے بعد اب ہمیں ان چار آیات (۱۶ تا ۱۹) کا مطالعہ کرنا ہے جن میں خطاب براہِ راست نبی اکرم ﷺ سے ہے اور جن میں اوّلاً آپ ؐ کو تحصیلِ قرآن کے ضمن میں فرطِ شوق و اشتیاق کی بنا پر عجلت پسندی سے نہایت شفقت و محبت کے ساتھ روکا گیا ہے' اور اس کے ساتھ ہی آپ ؐ کو یہ اطمینان دلایا گیا ہے کہ متنِ قرآن کے ضمن میں جمع و ترتیب اور مطالبِ قرآن کے ضمن میں تفتیش و تدقیق کے لیے آپ ؐ کو زحمت اور مشقت کی ضرورت نہیں ہے' ان جملہ امور کی کامل ذمہ داری اللہ تعالیٰ پر ہے۔ تو آیئے کہ پہلے ان آیاتِ مبارکہ کا ایک سلیس و رواں ترجمہ سامنے رکھ لیں اور پھر ان میں سے مقدّم الذکر مضمون پر کسی قدر تفصیل کے ساتھ غور کریں۔

﴿ لَا تُحَرِّکۡ بِہٖ لِسَانَکَ لِتَعۡجَلَ بِہٖ ﴿ؕ۱۶﴾ اِنَّ عَلَیۡنَا جَمۡعَہٗ وَ قُرۡاٰنَہٗ ﴿ۚ۱۷﴾ فَاِذَا قَرَاۡنٰہُ فَاتَّبِعۡ قُرۡاٰنَہٗ ﴿ۚ۱۸﴾ ثُمَّ اِنَّ عَلَیۡنَا بَیَانَہٗ ﴿ؕ۱۹﴾﴾

''(اے نبیؐ!) آپ اس (قرآن) کے ساتھ اپنی زبان کو (تیزی سے) حرکت مت دیا کیجیے کہ اسے جلدی سے حاصل کریں۔ یقیناً ہمارے ذمہ ہے اس کا جمع کرنا اور اس کا پڑھوانا۔ تو پھر جب ہم اسے (فرشتے کی زبانی) پڑھ چکیں تو اس پڑھنے کی آپ (بھی) پیروی کیجیے۔ پھر ہمارے ہی ذمہ ہے اس کی وضاحت بھی!''

یہ بات اس سے پہلے عرض کی جا چکی ہے کہ قرآن مجید کا اسلوب خطبہ کا ہے اور خطبہ میں تحویلِ خطاب ہوتا رہتا ہے کہ ابھی خطیب کسی ایک جانب مخاطب تھا' پھر اس کا خطاب دوسری جانب ہو گیا۔ مزید برآں کبھی وہ حاضر کو غائب فرض کر کے گفتگو کرتا ہے اور کبھی غائب کو حاضر فرض کر کے گفتگو شروع کر دیتا ہے۔ سورۃ القیامۃ میں اس کی ایک نمایاں مثال زیر مطالعہ آیات کی صورت میں موجود ہے۔ اس لیے کہ یہ سورۂ مبارکہ از اوّل تا آخر مختلف اسالیب سے منکرین قیامت کے ساتھ بحث و گفتگو اور ردّ و قدح پر مشتمل ہے' لیکن درمیان میں خطاب کا رُخ نبی اکرم ﷺ کی جانب مڑ گیا۔ اس ضمن میں سب سے پہلے تو ہمیں یہ سمجھنا ہے کہ اِس سورۂ مبارکہ کے اصل مضمون کے ساتھ اِس گفتگو کا ربط و تعلق کیا ہے! اس لیے کہ چاہے کسی سلسلۂ کلام میں کوئی بات ضمنی طور پر آئی ہو لیکن ظاہر ہے کہ کلام کے عمود کے ساتھ اس کا کوئی نہ کوئی ربط ضرور ہوتا ہے' خواہ وہ کتنا ہی ''خفی'' ہو۔ چنانچہ اس سورۂ مبارکہ میں لوگوں کی گمراہی کا ایک اہم اور بنیادی سبب ''حُبِّ عاجلہ'' کو قرار دیا گیا ہے:

﴿كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ ﴿٢٠﴾ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ ﴿٢١﴾﴾

''ہرگز نہیں' بلکہ (تمہاری گمراہی کا اصل سبب یہ ہے کہ) تم عاجلہ کی محبت میں گرفتار ہو جاتے ہو۔ اور آخرت کو نظر انداز کر دیتے ہو۔''

یعنی انسان کی گمراہی کا اصل سبب یہ ہے کہ وہ ''عاجلہ'' یعنی دنیا سے دل لگا بیٹھتا ہے' اس لیے کہ اس کی لذتیں بھی فی الفور محسوس ہوتی ہیں اور انسان ان سے شاد کام ہوتا ہے اور اس کی کلفتیں اور اذیتیں بھی انسان کو فوری طور پر متاثر کرتی ہیں۔ گویا دنیا کا نفع بھی نقد ہے اور نقصان بھی۔ چنانچہ جب یہ ''عاجلہ'' انسان کا اصل مطلوب و مقصود بن جاتی ہے تو اس کائنات اور اس کی تخلیق کے وسیع ترین حقائق اور بلند ترین مقاصد انسان کی نگاہوں سے خود بخود اوجھل ہو جاتے ہیں اور انسان کا شعور ان سے محجوب ہو جاتا ہے۔ نتیجتاً وہ آخرت کو مختلف غلط تأویلات سے نظر انداز کر دیتا ہے' بلکہ اس پر اعتراضات' اشکالات اور شبہات وارد کرتا ہے' حتیٰ کہ اسے محالِ مطلق گردانتا ہے اور اس کا انکار کر دیتا ہے۔

یہاں ایک نہایت لطیف لفظی مناسبت سے بات کا رُخ رسول اکرم ﷺ کی طرف موڑ دیا جاتا

ہے اور ارشاد ہوتا ہے:﴿لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ﴿۱۶﴾﴾ ''(اے نبیؐ!) آپ قرآن کے ساتھ اپنی زبان کو تیزی سے حرکت نہ دیں کہ اس کو جلدی سے حاصل کر لیں (یا یاد کر لیں)''۔ یہاں عجلت کے ذکر سے اس عظیم حقیقت کی جانب اشارہ فرما دیا گیا ہے کہ ''عجلت پسندی'' وہ چیز ہے جو خیر کے لیے بھی پسندیدہ نہیں ہے۔ بلکہ ''سہج پکے سو میٹھا ہو'' کے مصداق خیر اور نیکی کے کاموں میں بھی مناسب تدریج اور میانہ روی پیش نظر رہنی چاہیے' تب ہی ان میں تمکن و استحکام بھی پیدا ہوتا ہے اور نتائج بھی صحیح اور متوازن طور پر برآمد ہوتے ہیں۔ الغرض یہ تو ایک بڑے لطیف معنوی ربط کی بات تھی جس کے حوالے سے نبی اکرم ﷺ کی طرف خطاب کا رُخ مڑ گیا۔

البتہ یہاں عجلت پسندی کے متعلق یہ بات بھی نوٹ کر لی جائے تو مناسب ہو گا کہ قرآن حکیم اس کو انسان کی طبعی کمزوریوں میں شمار کرتا ہے۔ چنانچہ سورۃ الانبیاء میں ارشاد ہوتا ہے:﴿خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ ؕ﴾ (آیت ۳۷) ''انسان جلد باز پیدا کیا گیا ہے''۔ یعنی انسان کی خلقت اور سرشت میں جلد بازی کا عنصر شامل ہے۔ یہ بالکل وہی اسلوب ہے جو سورۃ النساء میں وارد ہوا کہ:﴿وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا ﴿۲۸﴾﴾ ''اور انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے''۔ پس معلوم ہوا کہ انسان کی خلقت اور سرشت میں بعض پہلو ضعف کے ہیں' جن میں سے ایک عجلت پسندی بھی ہے۔ چنانچہ سورۂ بنی اسرائیل میں ارشاد ہوا:﴿وَكَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا ﴿۱۱﴾﴾ ''اور انسان بہت جلد باز واقع ہوا ہے''۔ اب ظاہر ہے کہ اگر اس عجلت پسندی کا رُخ شر اور نفس پرستی کی طرف ہو جائے تب تو اس کی تباہ کاری اور ہولناکی اظہر من الشمس ہے ہی' لیکن اگر عجلت پسندی کا رُخ خیر کی جانب ہو تب بھی یہ ایک غیر مطلوب اور ناپسندیدہ شے ہے۔ اس کی سب سے زیادہ نمایاں مثال سورۂ طٰہٰ میں آئی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب کوہِ طور پر اللہ تعالیٰ نے طلب فرمایا تو آنجناب علیہ السلام وقت مقررہ سے پہلے پہنچ گئے۔ اللہ تعالیٰ نے سوال کیا:﴿وَمَا اَعْجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ يٰمُوْسٰى ﴿۸۳﴾﴾ ''اور کیوں جلدی کی تو نے اپنی قوم سے اے موسیٰ؟''یعنی تم وقت مقررہ سے قبل اپنی قوم کو چھوڑ کر کیوں آ گئے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جواباً عرض کیا:﴿هُمْ اُولَآءِ عَلٰٓى اَثَرِيْ وَعَجِلْتُ اِلَيْكَ رَبِّ لِتَرْضٰى ﴿۸۴﴾﴾ ''(پروردگار!) وہ بھی میرے پیچھے پیچھے چلے آ رہے ہیں اور اے میرے ربّ! میں تو تیری طرف جلدی کر کے اس لیے آیا ہوں کہ تو راضی ہو جائے''۔ گویا وہ جو ایک مشہور مصرع ہے ع ''تو میرا شوق دیکھ' مرا انتظار دیکھ!'' اس میں تھوڑا سا تصرف کر لیجیے کہ ع ''تو میرا شوق دیکھ' مرا اشتیاق دیکھ!'' یعنی میں تو اے ربّ! تیری ملاقات کے

شوق میں جلدی کر کے پہلے آ گیا ہوں۔لیکن اب اللہ تعالیٰ کا جواب ملاحظہ فرمائیے:﴿قَالَ فَاِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْۢ بَعْدِكَ وَاَضَلَّهُمُ السَّامِرِیُّ ﴿٨٥﴾﴾ ''(اللہ نے) فرمایا: تو اے موسیٰ! تمہاری عجلت کا نتیجہ یہ نکل چکا ہے کہ) ہم نے تمہارے پیچھے تمہاری قوم کو فتنہ میں مبتلا کر دیا ہے اور سامری نے انہیں گمراہ کر دیا ہے''۔معلوم ہوا کہ اگرچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عجلت اللہ تعالیٰ سے ملاقات اور مخاطبۂ الٰہی سے شادکام ہونے کے اشتیاق پر مبنی تھی' جو سراسر خیر اور ہر اعتبار سے قابل تعریف جذبہ ہے' لیکن عالمِ واقعہ میں اس کا بھی ناپسندیدہ نتیجہ ظاہر ہوا۔

اسی سورۂ طٰہٰ میں نبی اکرم ﷺ سے خطاب کر کے فرمایا گیا:﴿وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰٓى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ ۡ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا ﴿١١٤﴾﴾ ''اور (اے نبیؐ!) آپ جلدی نہ کریں قرآن کے حاصل کر لینے میں جب تک پورا نہ ہو چکے آپ کی طرف اس کا اترنا' اور آپ دعا کریں: اے میرے ربّ! میرے علم میں اضافہ فرما!'' یعنی اے نبی ﷺ! آپ کا ذوق وشوق ہمارے علم میں ہے۔آپ کا یہ اشتیاق اپنی جگہ! لیکن ہم نے نزولِ قرآن کے لیے ایک ترتیب اور ایک تدریج مقرر کر رکھی ہے۔ ہماری حکمتِ بالغہ میں اس کا جو بھی وقت معین ہے' اس کا نزول اسی کے مطابق ہوگا۔رہی علم کی وہ پیاس جو آپ کو اپنے قلبِ مبارک میں شدت کے ساتھ محسوس ہوتی ہے' تو اس کے لیے آپ دعا کرتے رہا کیجیے کہ ''اے میرے ربّ! میرے علم میں اضافہ فرما''۔

سورۂ مریم میں یہی مضمون اس انداز میں وارد ہوا ہے کہ آنحضور ﷺ کے شوق واشتیاق اور وحی کے انتظار کے متعلق حضرت جبرائیل علیہ السلام سے کہلوایا گیا:﴿وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ ۚ لَهٗ مَا بَيْنَ اَيْدِيْنَا وَمَا خَلْفَنَا وَمَا بَيْنَ ذٰلِكَ ۚ وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا ﴿٦٤﴾﴾ ''اور ہم آپ کے ربّ کے حکم کے بغیر نازل نہیں ہو سکتے۔ جو کچھ ہمارے سامنے ہے اس کا اختیار بھی اسی کو ہے اور جو کچھ ہمارے پیچھے ہے اس کا اختیار بھی اسی کے ہاتھ میں ہے' اور جو کچھ ان دونوں کے مابین ہے اس کا اختیار بھی (کلیتًا) اسی کے پاس ہے۔ اور آپؐ کا ربّ بھولنے والا نہیں ہے!''——ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آنحضور ﷺ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام سے شکوہ کیا ہوگا کہ آپ دیر دیر سے اور وقفہ دے کر آتے ہیں' جبکہ ہمیں وحی کا شدت سے انتظار رہتا ہے۔اس شکوہ کا جواب ہے جو حضرت جبرائیل علیہ السلام کی زبان سے اللہ تعالیٰ نے دلوایا کہ ہم اللہ کے حکم سے وحی لے کر آتے ہیں۔اُس کا علم کامل ہے' کائنات کی کوئی چیز اُس سے پوشیدہ نہیں ہے۔ یہ تأخیر وتعویق اس کے کسی نسیان کے باعث نہیں ہے' بلکہ اس کی

حکمتِ بالغہ کے مطابق ہے۔

پھر اسی سورۂ مریم میں نبی اکرم ﷺ کو خطاب کر کے فرمایا: ﴿فَلَا تَعۡجَلۡ عَلَیۡہِمۡ ؕ اِنَّمَا نَعُدُّ لَہُمۡ عَدًّا ﴿۸۴﴾﴾ ''پس (اے نبیؐ!) آپ ان (کافروں) پر (عذاب کے نزول کے لیے) جلدی نہ کیجیے۔ بالتحقیق ہم ان کے لیے (دن) گن رہے ہیں''۔ یعنی یہ کفار و مشرکین ہماری گرفت میں ہیں' کہیں بھاگ کر نہیں جاسکیں گے۔ ان میں سے ہر ایک کو کیفرِ کردار تک پہنچا دیا جائے گا۔ لیکن اس کے لیے بھی ایک مہلت ہمارے علمِ کامل اور حکمتِ بالغہ میں معین ہے — اور جیسے سورۃ الطارق میں ارشاد فرمایا گیا: ﴿فَمَہِّلِ الۡکٰفِرِیۡنَ اَمۡہِلۡہُمۡ رُوَیۡدًا ﴿۱۷﴾﴾ ''پس (اے نبیؐ!) ان کافروں کو ڈھیل دیجیے! ان کو ذرا سی دیر اِن کے حال پر چھوڑ دیجیے''۔ ان کے لیے جو ڈھیل اور مہلت ہم نے مقرر کر رکھی ہے ذرا اسے ختم ہو لینے دیجیے! ہمارے علمِ کامل میں ہر چیز کا وقت معین ہے۔ اجلِ مسمّٰی کو کوئی ٹال نہیں سکے گا۔ اور جب وہ وقتِ معین آ جائے گا تو اِن کا حساب پاک کر دیا جائے گا۔

الغرض یہاں پہلی بات یہ ارشاد فرمائی گئی کہ اے نبیؐ! آپ قرآن کو یاد کرنے کے لیے جلدی نہ کیا کیجیے اور اس کے لیے اپنی زبان کو تیزی سے حرکت نہ دیا کیجیے —— اور اس مضمون کو عجلت کی لفظی مناسبت کی بنا پر سورۃ القیامۃ میں نگینے کے مانند جڑ دیا گیا کہ عجلت پسندی تو وہ شے ہے جو نیکی اور خیر کے کاموں کے ساتھ بھی مناسبت نہیں رکھتی' کجا یہ کہ انسان پر ''حُبِّ عاجلہ'' کا ایسا غلبہ ہو جائے کہ اس کی ساری جدوجہد' سعی و محنت اور تگ و دَو کا مقصود و مطلوب ہی صرف ''عاجلہ'' یعنی دنیا کی دولت و ثروت اور جاہ و حشمت کا حصول بن کر رہ جائے۔ تو اس کے جو خراب نتائج نکلیں گے ان کا تم خود بخوبی اندازہ کر سکتے ہو۔ اس پورے مفہوم کو دریا کو کوزے میں بند کرنے کے انداز میں نہایت فصاحت و بلاغت کے ساتھ ان دو آیات میں سمو دیا گیا۔ یعنی تمہاری تمام تر گمراہی اور ضلالت' کفر و تکذیب' اور اعراض و انکار کا اصل سبب یہ ہے کہ تم عاجلہ (اس دُنیا) کی محبت میں گرفتار ہو اور آخرت کو نظر انداز کر دیتے ہو۔

یہاں ضمناً ایک وضاحت ضروری ہے' اور وہ یہ کہ قرآن مجید میں ''سَارِعُوۡا'' اور ''سَابِقُوۡا'' کے الفاظ بھی متعدد مقامات پر وارد ہوئے ہیں' جیسے سورۂ آل عمران میں فرمایا: ﴿وَسَارِعُوۡۤا اِلٰی مَغۡفِرَۃٍ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ﴾ (آیت ۱۳۳) ''اور دوڑ لگاؤ اپنے ربّ کی مغفرت کی طرف!'' اسی طرح سورۃ الحدید کی آیت ۲۱ میں فرمایا گیا: ﴿سَابِقُوۡۤا اِلٰی مَغۡفِرَۃٍ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ﴾ ''ایک دوسرے سے آگے نکلو اپنے ربّ کی مغفرت کی طرف!'' ''سَارِعُوۡا'' اور ''سَابِقُوۡا'' فعل امر کے صیغے ہیں۔ سورۃ المؤمنون کی آیت

۶۱ میں مؤمنین صادقین کے اوصاف کے ضمن میں یہ دونوں الفاظ خبریہ انداز میں فعل مضارع اور اسم فاعل کی صورت میں وارد ہوئے ہیں: ﴿اُولٰٓـئِكَ يُسٰرِعُوْنَ فِى الْخَيْرٰتِ وَهُمْ لَهَا سٰبِقُوْنَ ۝﴾ ''یہی لوگ ہیں جو بھلائیوں کے لیے تیز گام ہیں اور اس راہ میں سب سے آگے نکل جانے والے ہیں''۔ سَرِعَ 'یَسْرَعُ سے بابِ مفاعلہ کا مصدر ہے ''مُسَارَعَةٌ'' اور سَبَقَ یَسْبِقُ سے بابِ مفاعلہ ہی کا مصدر ہے ''مُسَابَقَةٌ''— اور یہ دونوں قریب المفہوم اور تقریباً ہم معنی الفاظ ہیں۔ ان دونوں کا مفہوم ہے ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش میں دوڑ لگانا۔ البتہ مسارعت و مسابقت اپنے اساسی مفہوم کے اعتبار سے عجلت پسندی سے قدرے مختلف شے ہے۔ واضح رہے کہ مسارعت اور مسابقت کا جذبہ بھی طبع انسانی میں ودیعت شدہ موجود ہے۔ چنانچہ ہر انسان دوسرے لوگوں سے آگے نکلنا اور بڑھنا چاہتا ہے۔ قرآن مجید مسارعت و مسابقت کے اس جذبہ کے رُخ کو خیر کی طرف موڑ دینا چاہتا ہے۔ وہ انسان کو تعلیم دیتا اور تلقین کرتا ہے کہ ''دنیا'' یعنی دُنیوی دولت و ثروت اور جاہ و حشمت کے حصول میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی سعی و کوشش کرنے کے بجائے تم بھلائیوں میں' نیکیوں میں' خیر میں' خدمت خلق میں' عبادات کی بجا آوری میں' دین کے احکام اور اس کے اوامر و نواہی کی تعمیل میں' دین کی دعوت و تبلیغ اور نشر و اشاعت کی سعی و جہد میں اور اقامت دین اور غلبۂ دین کے لیے انفاقِ مال اور بذلِ نفس میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کرو۔ یہ اللہ کی مغفرت اور جنت کے شاہ درے ہیں۔

البتہ ہر کام کے لیے مناسب تدریج بھی ضروری ہے اور اس کی جملہ شرائط کو پورا کرنے میں جو مناسب وقت لگنا چاہیے اس کے ضمن میں صبر کا مظاہرہ بھی ضروری ہے۔ جیسے اگر نماز کو بہت جلدی جلدی پڑھا جا رہا ہو تو رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کے مطابق ایسی نماز ادا نہیں ہوتی۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایک بدوی مسلمان نے مسجد نبویؐ میں آ کر جلدی جلدی نماز پڑھ لی تو آپ ﷺ نے اس سے فرمایا: ((فَصَلِّ فَاِنَّكَ لَمْ تُصَلِّ))(۱) ''دوبارہ نماز پڑھ' اس لیے کہ تیری نماز ادا نہیں ہوئی''۔ لہٰذا نماز کے ہر رکن کا حق پورے سکون اور ٹھہراؤ کے ساتھ ادا کرنا ضروری اور لازمی ہے۔ اسی طرح اگرچہ قرآن حکیم میں نمازِ جمعہ کے بارے میں فرمایا گیا: ﴿اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا

(۱) صحیح البخاری' کتاب الاذان' باب وجوب القراءة للامام والماموم فی الصلوات کلها...... وصحیح مسلم' کتاب الصلاۃ' باب وجوب قراءة الفاتحة فی کل رکعة وانه اذا لم یحسن۔

اِلٰی ذِکۡرِ اللّٰہِ﴾ (آیت ۹) جس کا لفظی ترجمہ یہ ہے کہ ''جب نمازِ جمعہ کے لیے بلایا جائے (اذان ہو جائے) تو اللہ کی یاد کے لیے دوڑو''۔ لیکن تمام مفسرین کا اس بات پر اجماع ہے کہ یہاں سعی (فَاسۡعَوۡا) سے دوڑنا مراد نہیں ہے۔ اس لیے کہ نماز کے لیے دوڑ کر آنے سے رسول اکرم ﷺ نے منع فرمایا ہے' یہ وقار اور سکینت کے منافی ہے۔ لہٰذا یہاں سعی سے مراد لپکنا ہو گا۔ یعنی اپنے تمام کاموں سے ذہنی و عملی تعلق توڑ کر جمعہ کی نماز کے لیے لپکو اور ہمہ تن اسی کی طرف متوجہ ہو جاؤ۔

اللہ کی جانب سے متنِ قرآن کی حفاظت اور معانیٔ قرآن کی وضاحت کی ضمانت

آیت ۱۶ میں نبی اکرم ﷺ کو مخاطب کر کے جو بات فرمائی گئی' یعنی آنحضور ﷺ کو اپنی زبانِ مبارک کو قرآن حکیم کے ساتھ تیزی سے حرکت دینے سے کمالِ شفقت و محبت کے ساتھ روکا گیا' تو آپ ﷺ کے اس طرزِ عمل کا ایک سبب تو وہ تھا جو جلی انداز میں بیان کر دیا گیا' یعنی آپ ﷺ کی قرآن حکیم کے ساتھ غایت درجہ کی محبت اور اس کا حد درجہ شوق' جس کے نتیجے میں آپ ﷺ نازل شدہ آیاتِ قرآنی کو جلد از جلد یاد کر لینا چاہتے تھے تاکہ مزید وحی نازل ہو —— لیکن آیت ۱۷ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کے وحیٔ قرآنی کو یاد کرنے کے لیے تیزی سے زبانِ مبارک کو حرکت دینے اور اس طرح شدید مشقت برداشت کرنے کا ایک دوسرا سبب بھی تھا' اور وہ یہ کہ آپ ﷺ چاہتے تھے کہ آپ ﷺ وحی کے الفاظ کو اچھی طرح یاد کر لیں' مبادا اس کا کوئی حصہ آپ ﷺ کی دداشت میں محفوظ نہ رہے اور اس طرح قرآن مجید کا کوئی لفظ یا کوئی آیت ضائع ہو جائے۔ چنانچہ آپ ﷺ کی اس تشویش کو رفع کرنے کے لیے ارشاد فرمایا گیا: ﴿اِنَّ عَلَیۡنَا جَمۡعَهٗ وَقُرۡاٰنَهٗ ﴿۱۷﴾﴾ ''یقیناً ہمارے ذمے ہے اس (قرآن) کو جمع کر دینا بھی اور اس کا پڑھنا (یا پڑھوانا) بھی!''

وجوبِ حفاظتِ قرآن

یہ آیۂ مبارکہ جمع و ترتیبِ قرآن اور حفاظتِ متنِ قرآن کے ضمن میں قرآن حکیم کی اہم ترین آیت کی حیثیت رکھتی ہے' اس لیے کہ اگرچہ سورۃ الحجر کی آیت ۹ میں بھی حفاظتِ قرآن کے ضمن میں اللہ تعالیٰ کا پختہ وعدہ وارد ہوا ہے کہ: ﴿اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوۡنَ ﴿۹﴾﴾ ''یقیناً ہم نے ہی اس نصیحت (اور یاددہانی) کو نازل فرمایا ہے اور خود ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں'' لیکن

یہ حقیقت بادنیٰ تأمل واضح ہو جاتی ہے کہ اس موضوع پر قرآن حکیم کا ذروۂ سنام سورۃ القیامۃ کی آیت ۱۷ ہی ہے‘ اس لیے کہ ایک تو اس میں حفاظت کی مزید وضاحت دو الفاظ کے ذریعے کی گئی‘ یعنی ’’جَمْعَهٗ‘‘ اور ’’قُرْاٰنَهٗ‘‘ اور دوسرے اس (عَلَيْنَا) میں جو حرفِ جار ’’عَلٰی‘‘ وارد ہوا ہے اس کا لازمی نتیجہ ’’وجوب‘‘ ہے‘ یعنی جمع و ترتیب قرآن اور حفاظتِ متنِ قرآن کو اللہ نے اپنے اوپر واجب کر لیا ہے۔ اور اگرچہ اہل سنت ایک کلامی اختلاف کے باعث اللہ تعالیٰ پر کسی چیز کا ’’وجوب‘‘ تسلیم نہیں کرتے‘ لہٰذا اس مقام پر اس سے مراد ’’وجوب‘‘ نہیں بلکہ ’’وعدہ‘‘ لیتے ہیں‘ لیکن ظاہر ہے کہ اس کا حاصل بھی وہی ہے‘ اس لیے کہ اللہ کا وعدہ کبھی غلط نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں دو بار یہ ارشاد فرمایا کہ: ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ۝﴾ (آل عمران: ۹‘ الرعد: ۳۱) ’’یقیناً اللہ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا!‘‘ اور دو ہی بار یہ فرمایا کہ: ﴿فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗ﴾ (البقرۃ: ۸۰) ’’پس اللہ ہرگز خلاف نہیں کرے گا اپنے وعدے کے!‘‘ اور: ﴿وَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ ؕ﴾ (الحج: ۴۷) گویا اللہ تعالیٰ اور قرآن حکیم پر ایمان رکھنے والے کسی شخص کو قرآن مجید کے متن کی سالمیت اور محفوظیت کے معاملے میں ہرگز کبھی کسی قسم کا شک و شبہ لاحق نہیں ہو سکتا۔

جمع قرآن کے دو مراحل

اس آیۂ مبارکہ میں جمع قرآن کے ضمن میں اللہ تعالیٰ کی جس ذمہ داری کا ذکر ہے اس کا اوّلین مصداق تو جمیع مفسرین و محققین کے نزدیک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو نبی اکرم ﷺ کے سینۂ مبارک میں جمع فرما دیا تھا۔ یہ تو ایک ایسی حقیقت ہے جس کے ضمن میں کسی کو کوئی اختلاف یا اشتباہ ہو ہی نہیں سکتا۔ البتہ جمع قرآن کے دوسرے مرحلے کے ضمن میں لاعلمی کے باعث بہت سے لوگوں کے ذہنوں میں مختلف النوع شبہات پائے جاتے ہیں۔

جمع قرآن کا یہ مرحلۂ ثانی قرآن مجید کو ایک کتابی شکل میں جمع کرنے کا تھا جو بالاجماع نبی اکرم ﷺ کی وفات کے بعد طے پایا‘ اس لیے کہ اس پر اتفاق ہے کہ ’’مَابَيْنَ الدَّفَّتَيْنِ‘‘ (جلد کے دو گتوں کے درمیان) قرآن کا ایک کتاب کی صورت میں جمع ہو جانا آنحضور ﷺ کی حیاتِ دُنیوی کے دوران نہیں ہوا تھا۔ اُس وقت تک قرآن جس طرح نبی اکرم ﷺ کے سینۂ مبارک میں جمع تھا اسی طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک بڑی تعداد کے بھی صرف سینوں میں محفوظ تھا۔

اس مرحلۂ ثانی کے بارے میں ایک بالکل غلط اور بے بنیاد بات تو وہ ہے جو خلیفۂ ثالث ذوالنورین حضرت عثمان بن عفان ؓ کے نام کے ساتھ قافیہ کی مناسبت سے ''جَامِعُ آیَاتِ الْقُرْآنِ'' کے الفاظ چسپاں کر دینے کے باعث بہت بڑے حلقے میں پھیل گئی ہے' جس سے ذہنوں میں خواہ مخواہ یہ وسوسہ پیدا ہو جاتا ہے کہ شاید قرآن کتابی صورت میں نبی اکرم ﷺ کے وصال کے کم از کم پندرہ بیس سال بعد جمع ہوا' اور یہ وسوسہ منطقی طور پر بہت سے شکوک وشبہات کو جنم دینے کا باعث بن جاتا ہے' جبکہ واقعہ اس کے بالکل برعکس یہ ہے کہ مصحف کی صورت میں قرآن مجید کے جمع ہو جانے کا مرحلہ تو دورِ خلافت صدیق اکبر ؓ ہی میں' گویا نبی اکرم ﷺ کی وفات کے بعد زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ سال کے اندر اندر' طے پا گیا تھا۔ حضرت عثمان ؓ نے تو فی الواقع اُمت کو قرآن کے ایک رسم الخط پر جمع کیا تھا۔ گویا اگر قافیہ کی رعایت ہی ملحوظ رہے تب بھی اُن کی شان میں ''جَامِعُ الْاُمَّةِ عَلَی الْقُرْآنِ'' کے الفاظ زیادہ موزوں بھی ہیں اور مطابقِ واقعہ بھی!

سورتوں اور آیات کی ترتیب

جمع قرآن کے ضمن میں دوسرا بڑا وسوسہ اور مغالطہ آیات اور سورتوں کی باہمی ترتیب سے متعلق ہے' جس کے ازالے کے لیے اوّلاً تو لفظ ''جَمْعَهٗ'' ہی میں واضح اشارہ موجود ہے' اس لیے کہ یہ ایک بدیہی امر ہے کہ قرآن کا جمع ہونا بغیر ترتیب کے ممکن نہیں ہے۔ ثانیاً اس کی مزید وضاحت وصراحت دوسرے لفظ یعنی ''قُرْاٰنَهٗ'' کے ذریعے کر دی گئی' جس کا ترجمہ ''اس کا پڑھنا'' بھی کیا جا سکتا ہے اور ''اس کا پڑھوانا'' بھی۔ لیکن اگر اس اصول کو پیشِ نظر رکھا جائے کہ ''قرآن کا ایک حصہ دوسرے حصے کی تفسیر وتوضیح کرتا ہے'' تو سورۃ الاعلیٰ کی آیت ﴿سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى ۝﴾ ''ہم عنقریب آپ کو پڑھوا دیں گے تو آپ بھولیں گے نہیں'' کے مطابق یہاں بھی زیادہ موزوں ترجمہ ''پڑھوانا'' ہی ہو گا۔ چنانچہ اگلی آیت مبارکہ: ﴿فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ۝﴾ ''تو جب ہم اسے پڑھوائیں تو آپ اسی پڑھوانے کی پیروی کریں'' مزید دلالت کر رہی ہے کہ یہاں زیادہ زور اور تاکید ترتیب قرآنی کے بارے میں ہے' اس لیے کہ اوّلاً پڑھوانا لامحالہ کسی ترتیب ہی کے ساتھ ممکن ہے اور ثانیاً نبی اکرم ﷺ کو اسی ترتیب کی پابندی اور پیروی کا حکم دیا گیا ہے۔

''قَرَاْنٰهُ'' میں جو ضمیر فاعلی جمع متکلم کے صیغہ میں موجود ہے اس کے بارے میں اگرچہ دو احتمالات موجود ہیں' یعنی ایک یہ کہ اس کا مرجع اللہ تعالیٰ کی ذات ہو اور دوسرے یہ کہ حضرت

جبرائیل علیہ السلام ہوں، لیکن از روئے آیاتِ قرآنی: ﴿مَنۡ يُّطِعِ الرَّسُوۡلَ فَقَدۡ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ﴾ (النساء: ۸۰) ''جو رسول کی اطاعت کرتا ہے اس نے اصلاً اللہ ہی کی اطاعت کی'' اور: ﴿اِنَّ الَّذِيۡنَ يُبَايِعُوۡنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوۡنَ اللّٰهَ ؕ﴾ (الفتح: ۱۰) ''یقیناً جو لوگ (اے نبی ﷺ!) آپ سے بیعت کر رہے ہیں وہ درحقیقت اللہ سے بیعت کر رہے ہیں''۔ ان دونوں احتمالات سے معنی اور مراد میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ گویا فی الحقیقت تو اس پڑھوانے کا فاعل حقیقی اللہ سبحانہ وتعالیٰ خود تھا، لیکن مجازاً یا بالفعل یہ پڑھوانا حضرت جبرائیلؑ کا فعل تھا۔ چنانچہ احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ آنحضور ﷺ ہر رمضان مبارک میں حضرت جبرائیل علیہ السلام کے ساتھ قرآن کا دور فرمایا کرتے تھے اور اپنی حیاتِ دُنیوی کے آخری رمضان المبارک میں آپ ﷺ نے پورے قرآن کا دو مرتبہ دَور مکمل کیا۔ اور ظاہر ہے کہ نہ آپ ﷺ کا یہ دَورۂ قرآن کسی ترتیب کے بغیر ممکن تھا، نہ ہی آپ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے جو حضرات پورے قرآن کے حافظ تھے وہ بغیر کسی ترتیب کے حفظ کر سکتے تھے۔

غرضیکہ عقلاً اور نقلاً ہر اعتبار سے یہ بات مسلّم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کو ایک خاص ترتیب سے نبی اکرم ﷺ کے سینۂ مبارک میں جمع کیا اور اسی ترتیب کے ساتھ آنحضور ﷺ نے اُمت کو قرآن سکھایا اور یاد کرایا، اور امانتِ خداوندی کو کامل دیانت کے ساتھ اُمت کے حوالے کر دیا، جیسے کہ آپؐ نے خطبہ حجۃ الوداع میں ارشاد فرمایا:

((قَدۡ تَرَکۡتُ فِیۡکُمۡ مَا لَنۡ تَضِلُّوۡا بَعۡدَهٗ اِنِ اعۡتَصَمۡتُمۡ بِهٖ : كِتَابُ اللّٰهِ)) (۱)

''میں چھوڑ کر جا رہا ہوں تمہارے مابین وہ چیز جسے اگر تم مضبوطی سے تھامے رہے تو اس کے بعد کبھی گمراہ نہ ہو گے، یعنی اللہ کی کتاب۔''

غلط فہمی کا سبب

اس ضمن میں مغالطہ کا سبب یہ ظاہر و باہر اور متفق علیہ حقیقت ہے کہ قرآن کی ترتیب نزولی مصحف کی ترتیب سے بالکل مختلف تھی۔ لیکن اگر ترتیبِ نزولی اور ترتیبِ مصحف کے فرق کی حکمت کو سمجھ لیا جائے تو شیطان کو کسی وسوسہ اندازی کا موقع نہیں مل سکتا۔

ہمارا ایمان ہے کہ قرآن اللہ کا وہ کلامِ قدیم ہے جو ازل سے ''لوحِ محفوظ'' (البروج: ۲۲) یا ''اُمّ الکتاب'' (الزخرف: ۴) یا ''کتابِ مکنون'' (الواقعہ: ۷۸) میں درج ہے، اور یہ وہ ابدی

(۱) صحیح مسلم، کتاب الحج، باب حجۃ النبی ﷺ۔

ہدایت نامہ ہے جو تا قیامِ قیامت تمام انسانوں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے کفایت کرے گا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ علامہ اقبال کے اس شعر کے مطابق کہ ؎

''نوعِ انساں را پیامِ آخریں
حامل اُو رحمۃٌ للعالمیں!''

اس کا نزول نبی اکرم ﷺ پر ایک خاص زمانے میں اور مخصوص حالات کے تناظر میں ہوا۔ اور یہ قرآن کا عظیم اعجاز ہے کہ اس کی آیاتِ بینات ترتیب کے ذرا سے فرق کے ساتھ نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ دُنیوی کے دوران بدلتے ہوئے حالات و واقعات پر اتنے معجزانہ طور پر چسپاں ہوتی چلی گئیں جیسا کہ وہ خاص اُن ہی حالات کے لیے نازل ہوئی ہوں' اور اس طرح آنحضور ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کو اپنی دعوت و تحریک کے جاں گسل حالات و واقعات اور مسائل و مشکلات کے ضمن میں بروقت ہدایت و رہنمائی ملتی چلی گئی' جس سے آپ ﷺ کے قلب مبارک کو بھی جماؤ اور ٹھہراؤ اور استقامت حاصل ہوتی چلی گئی اور آپ ﷺ کے صحابہؓ کے دلوں کو بھی سہارا ملتا رہا اور ان کی ڈھارس بندھی رہی۔ چنانچہ یہی بات ہے جو سورۃ الفرقان کی آیت ۳۲ میں بیان ہوئی ہے کہ:

﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۚ كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا ﴿٣٢﴾﴾

''اور کافروں نے کہا کہ ان (محمد ﷺ) پر قرآن ایک ہی مرتبہ پورا کیوں نہ نازل کر دیا گیا؟ (اس کا جواب یہ ہے کہ) ہم نے یہ اس لیے کیا کہ اس کے ذریعے (اے نبیؐ!) آپ کے دل کو جماؤ عطا فرما دیں' اور ہم نے اسے پڑھوایا تھوڑا تھوڑا کر کے!''

گویا ترتیبِ نزولی کی اصل حکمت یہ تھی کہ رسول اللہ ﷺ کی دعوت جن جن مراحل سے گزر رہی ہے اور آپؐ کی جدوجہد کو جن جن موانع سے سابقہ پیش آ رہا ہے ان کی مناسبت سے آیاتِ قرآنیہ نازل ہوتی چلی جائیں تاکہ آپؐ کو بروقت رہنمائی ملے' اور ہر مرحلے پر جو اعتراضات آپؐ پر کیے جائیں' یا جو سوالات و اشکالات آپؐ کے سامنے پیش کیے جائیں ان سب کا حل اور جواب ساتھ کے ساتھ ملتا چلا جائے' جبکہ ترتیبِ مصحف وقتی حالات کے تابع نہیں ہے' بلکہ لوحِ محفوظ' یا کتابِ مکنون' یا اُمّ الکتاب کے عین مطابق ہے اور اس کا اصل ہدف ابدی ہدایت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آیات اور سورتوں کی اس ازلی اور ابدی ترتیب میں غور و فکر کرنے والوں کو عظیم حکمتوں اور علوم و معارف کے نہ ختم ہونے والے خزانوں کا

سراغ ملتا ہے اور اس سے علم و حکمت قرآنی کے نئے نئے گوشے روشن ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہی وہ ترتیب ہے جس کے مطابق اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم کو نبی اکرم ﷺ کے سینۂ مبارکہ میں جمع فرمایا اور اسی کی پیروی اور پابندی کا آپؐ کے متبعین کو حکم دیا' اور یہی ترتیب اب ہمیشہ کے لیے دین میں حجت ہے!!

البتہ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ قرآن مجید کو ایک کتاب کی شکل میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے دَورِ خلافت میں اُس وقت مرتب اور جمع کیا جب جنگِ یمامہ میں بہت سے حفاظ صحابہ رضی اللہ عنہم شہید ہو گئے اور اندیشہ پیدا ہوا کہ کہیں اس طرح نوعِ انسانی قرآن سے محروم نہ ہو جائے۔ چنانچہ آن جنابؓ نے نبی اکرم ﷺ کے زمانہ مبارک کے جملہ کاتبینِ وحی کو جمع کر کے اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو اُن کا ناظم اور سربراہ بنا کر اس کمیٹی کے سپرد یہ کام کیا کہ قرآن مجید کو ایک کتاب کی شکل میں مرتب کر لیں۔ چنانچہ پورا قرآن کریم جو حفاظِ کرام کے سینوں میں محفوظ تھا اور جس کے بعض اجزاء اور مختلف سورتیں بعض صحابہؓ کے پاس تحریری شکل میں بھی موجود تھیں' ان سب کی مدد سے قرآن مجید کو ''بَیْنَ الدُّفَّتَیْنِ'' یعنی جلد کے دو گتوں کے درمیان کتابی شکل میں جمع کر لیا گیا۔ البتہ اس کے پڑھنے میں اہل عرب کے مختلف لہجے تھے جیسے اردو زبان کے بھی مختلف لہجے ہیں' چنانچہ لکھنوی لہجہ اور ہے اور دہلی کا لہجہ اور' اسی طرح حیدر آبادی لہجہ جدا ہے اور بہاری لہجہ جدا' اور ابتداءً لوگوں کی سہولت کے لیے انہیں قرآن مجید کو اپنے اپنے لہجوں میں پڑھنے کی اجازت تھی' لہٰذا مختلف لہجوں کا اثر قرآن کریم کی کتابت و قراءت میں بھی آ رہا تھا۔ چنانچہ اُمت پر یہ احسانِ عظیم حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کا ہے کہ آپؓ نے اپنے دورِ خلافت میں اُمت کو قرآن کے ایک رسم الخط پر جمع کیا۔ گویا آنجنابؓ قرآن کریم کو جمع کرنے والے نہیں ہیں' بلکہ اُمت کو قرآن کی ایک کتابت پر جمع کرنے والے ہیں۔

الغرض سورۃ القیامۃ کی یہ دو آیات ﴿اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ﴿١٧﴾ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ﴿١٨﴾﴾ ''(اے نبیؐ!) یقیناً ہمارے ذمہ ہے اس کا جمع کرنا بھی اور اس کا پڑھوانا بھی' تو جب ہم اسے پڑھوائیں تو آپؐ اس کو اسی ترتیب سے پڑھیے۔'' حفاظتِ متنِ قرآن اور جمع و ترتیبِ قرآن کے ضمن میں قرآن کا ذروۂ سنام ہیں۔

اس کے بعد آیت ۱۹ میں فرمایا: ﴿ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَهٗ ﴿١٩﴾﴾ ''پھر ہمارے ہی ذمے ہے اس کی تبیین (یعنی توضیح و تشریح)''۔ یہ بات بھی نہایت اہم ہے' اور جس طرح جمع قرآن کے دو مرحلے تھے اسی طرح اس کے بھی دو حصے ہیں' جن کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ چنانچہ ایک حصہ تو یہ ہے کہ جب

قرآن مجید میں نازل شدہ احکام کے بارے میں لوگوں کے ذہنوں میں کچھ سوالات پیدا ہوتے تھے تو بعد میں توضیحی آیات نازل ہو جاتی تھیں۔ ایسی آیات بعض اوقات تو اُسی کے حکم کے ساتھ متصلاً درج کر دی گئی ہیں‘ بعض اوقات انہیں کسی قدر فصل کے ساتھ درج کیا گیا ہے‘ اور بعض اوقات سورۃ کے آخر میں شامل کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ رمضان کے روزوں کے بارے میں تفصیلی احکام پر مشتمل آیت سورۃ البقرۃ کے اسی تیئیسویں رکوع کے آخر میں شامل کر دی گئی جس میں ابتدائی حکم درج ہے‘ جبکہ دوسری اور تیسری صورتوں کی نمایاں مثالیں سورۃ النساء میں موجود ہیں۔ ایسی توضیحی آیات کے ساتھ آپ اکثر دیکھیں گے کہ یہ الفاظ آتے ہیں: ﴿كَذٰلِكَ يُـبَـيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ﴾ ’’اسی طرح اللہ اپنی آیات کی تبیین (اور وضاحت) فرما دیتا ہے‘‘۔

الغرض ایک تو تبیین قرآن یعنی قرآن مجید کی مزید تشریح وتوضیح کی صورت یہ ہے کہ وہ خود قرآن ہی کے ذریعے ہوگئی۔ اس کے علاوہ اس کا ایک دوسرا نظام بھی ہے اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی اکرم ﷺ کا یہ فرضِ منصبی قرار دیا گیا کہ آپ ﷺ قرآن مجید کی تشریح وتوضیح اور تبیین فرمائیں۔ چنانچہ سورۃ النحل کی آیت ۴۴ میں فرمایا: ﴿وَاَنۡـزَلۡـنَـاۤ اِلَيۡكَ الـذِّكۡـرَ لِتُبَيِّـنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيۡهِمۡ﴾ ’’اور (اے نبی ﷺ!) ہم نے آپ پر الذکر (یعنی قرآن) نازل فرمایا ہے تاکہ آپ لوگوں کے لیے وضاحت کریں اُس چیز کی جو اُن کی طرف نازل کی گئی ہے‘‘۔ گویا قرآن مجید کی توضیح وتبیین کی ایک صورت وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی ہدایت خصوصی یا وحیٔ خفی پر مبنی سنتِ رسولؐ کے ذریعے سامنے آئی۔ اس سلسلے میں کچھ کج فہم اور گم کردہ راہ لوگوں کا یہ اِشکال بالکل بے بنیاد ہے کہ اگر قرآن پر سنت رسولؐ کا اضافہ کیا جائے تو یہ قرآن کی توہین ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن مکمل نہیں ہے اور وہ اپنی وضاحت کے لیے سنت کا محتاج ہے۔ معاذ اللہ‘ کوئی صاحبِ ایمان قرآن کے متعلق ہرگز یہ تصور اور خیال نہیں رکھتا کہ قرآن سنت کا محتاج ہے‘ البتہ تمام مسلمانوں کا اجماعی ومتفق علیہ موقف یہ ہے کہ ہم قرآن مجید کو سمجھنے اور اس کی رہنمائی پر عمل پیرا ہونے کے لیے سنت رسولؐ کے محتاج ہیں۔ گویا یہ احتیاج ہماری ہے کہ ہم فہم قرآن اور عمل بالقرآن کے لیے نبی اکرم ﷺ کے اقوال اور افعال مبارکہ کو اپنے سامنے رکھیں اور دیکھیں کہ نبی اکرم ﷺ نے قرآن مجید پر کس طرح عمل کر کے دکھایا ہے اور تعلیماتِ قرآن کو انفرادی اور اجتماعی زندگی کے دائروں میں کس طرح بالفعل نافذ کیا اور اس طرح اس کا عملی نمونہ پیش فرمایا۔ اس لیے کہ اسی کے حوالے سے ہم قرآن مجید کو صحیح طور پر سمجھ بھی سکیں گے اور اس پر

عمل بھی کر سکیں گے‘ اور سنت کی یہ تبیین بھی حکماً ہدایتِ قرآن ہی کا حصہ ہوگی‘ اس لیے بھی کہ اس تبیین قرآن کا حکم اللہ ہی نے آپؐ کو دیا ہے ——اور اس لیے بھی کہ قرآن حکیم کے مطابق اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کے متعدد کاموں کو صراحتاً اپنی طرف منسوب فرمایا ہے‘ جس کی ایک نمایاں مثال سورۃ الانفال میں وارد ہوئی ہے کہ غزوۂ بدر میں نبی اکرم ﷺ نے کنکریوں کی مٹھی بھر کر کفار کی طرف پھینکی تو اس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: ﴿وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰـكِنَّ اللّٰـهَ رَمٰى ۚ﴾ (آیت ۱۷) ’’اور (اے نبیؐ!) جب آپؐ نے کنکریاں پھینکی تھیں تو آپؐ نے نہیں پھینکی تھیں‘ بلکہ اللہ نے پھینکی تھیں‘‘۔ علامہ اقبال نے اسی بات کو یوں تعبیر کیا ہے: ؎

گفتۂ اُو گفتۂ اللہ بود
گرچہ از حلقومِ عبداللہ بود

الغرض‘ معانی و مطالب قرآن کی وضاحت کا ذمہ بھی از روئے آیۂ مبارکہ اللہ نے خود لیا تھا‘ جو کچھ تو خود قرآن حکیم کی توضیحی آیات کے ذریعے پورا ہوا اور اکثر و بیشتر سنتِ رسول ﷺ کے ذریعے پورا ہوا۔

بارك الله لى ولكم فى القرآن العظيم ونفعنى واياكم بالآيات والذكر الحكيم oo

۞۞۞

حِصّہ سوئم

مبَاحثِ عَمل صَالِح

درس 10 تا درس 14

درس 10

تعمیر سیرت کی اساسات

سورۃ المؤمنون اور سورۃ المعارج کی روشنی میں

درس ۱۰

تعمیر سیرت کی اساسات

سورۃ المؤمنون اور سورۃ المعارج کی روشنی میں

نحمدهٗ ونصلی علٰی رَسولهِ الکریم ...... امَّا بَعد:

فَاَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ ۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿قَدۡ اَفۡلَحَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ۙ﴿۱﴾ الَّذِیۡنَ هُمۡ فِیۡ صَلَاتِهِمۡ خٰشِعُوۡنَ ۙ﴿۲﴾ وَالَّذِیۡنَ هُمۡ عَنِ اللَّغۡوِ
مُعۡرِضُوۡنَ ﴿۳﴾ وَالَّذِیۡنَ هُمۡ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوۡنَ ﴿۴﴾ وَالَّذِیۡنَ هُمۡ لِفُرُوۡجِهِمۡ حٰفِظُوۡنَ ﴿۵﴾ اِلَّا
عَلٰۤی اَزۡوَاجِهِمۡ اَوۡ مَا مَلَكَتۡ اَیۡمَانُهُمۡ فَاِنَّهُمۡ غَیۡرُ مَلُوۡمِیۡنَ ﴿۶﴾ فَمَنِ ابۡتَغٰی وَرَآءَ ذٰلِكَ
فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡعٰدُوۡنَ ﴿۷﴾ وَالَّذِیۡنَ هُمۡ لِاَمٰنٰتِهِمۡ وَعَهۡدِهِمۡ رٰعُوۡنَ ﴿۸﴾ وَالَّذِیۡنَ هُمۡ عَلٰی
صَلَوٰتِهِمۡ یُحَافِظُوۡنَ ﴿۹﴾ اُولٰٓئِكَ هُمُ الۡوٰرِثُوۡنَ ﴿۱۰﴾ الَّذِیۡنَ یَرِثُوۡنَ الۡفِرۡدَوۡسَ ؕ هُمۡ فِیۡهَا
خٰلِدُوۡنَ ﴿۱۱﴾﴾ (المؤمنون) ...... صدق اللّٰہ العظیم

''کامیاب اور بامراد ہوئے اہل ایمان' جو اپنی نمازوں میں خشوع سے کام لیتے ہیں' اور جو بے کار اور بے مقصد باتوں سے احتراز کرتے ہیں' اور جو تزکیۂ نفس پر مسلسل کاربند رہتے ہیں' اور جو اپنی شرم گاہوں (یعنی اپنی شہوت کی) حفاظت کرتے ہیں' سوائے اپنی بیویوں یا باندیوں کے' لہٰذا (ان کے اس معاملے میں) ان پر کوئی ملامت نہیں ہے' بس جو کوئی اس سے تجاوز کرے گا تو وہی حد سے بڑھ جانے والے ہیں' اور وہ جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کی پابندی کرتے ہیں اور جو اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ یہی ہیں وہ لوگ جو وارث بنیں گے' جنہیں جنت الفردوس کی وراثت ملے گی' وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے''۔

یہ سورۃ المؤمنون کی ابتدائی گیارہ آیات ہیں' جن پر ہمارے اس منتخب نصاب کا دسواں سبق

مشتمل ہے۔ اسی سبق سے اس منتخب نصاب کے تیسرے حصے کا بھی آغاز ہوتا ہے' جو قرآن حکیم کے چند ایسے منتخب مقامات پر مشتمل ہے جن میں اعمالِ صالحہ کی کسی قدر تفصیل بیان ہوئی ہے۔ یعنی انسانی زندگی کے عملی اور اخلاقی پہلو اُجاگر کیے گئے ہیں۔ اگرچہ اس سے قبل اس سلسلۂ درس میں اب تک ہونے والے تمام دروس میں بلا استثناء ایمان کے ساتھ ساتھ انسانی زندگی کے عملی اور اخلاقی پہلوؤں کا بھی ذکر ہوا ہے' اور ایمان کے عملی تقاضے' ایمان کے عملی لوازم' ایمان کے عملی اور اخلاقی نتائج قریباً تمام اسباق میں ہمارے سامنے آتے رہے ہیں' لیکن اس حصے میں بنیادی طور پر ہماری توجہ اعمالِ صالحہ ہی کی بحث پر مرتکز رہے گی —— اور اس میں جو تدریج پیشِ نظر ہے اسے آپ پہلے ہی سے ذہن نشین فرما لیں۔ وہ یہ کہ سب سے پہلے ہم ایک فرد' ایک شخص اور ایک انسان کی سیرت و کردار میں جو اوصاف مطلوب ہیں' ان کے اعتبار سے قرآن مجید کے بعض مقامات کا مطالعہ کریں گے۔ گویا کہ ہم یہ جاننا چاہیں گے کہ قرآن کا انسانِ مطلوب کیسا ہوتا ہے! جس کی نقشہ کشی علامہ اقبال نے اپنے اشعار میں ''مردِ مؤمن'' کے حوالے سے کی ہے —— اس کی کیا خصوصیات ہوتی ہیں! اس کی سیرت و کردار میں کون سے پہلو نمایاں ہوتے ہیں!

پھر یہ بحث ہمارے اس سلسلۂ سبق میں دو سطحوں پر آئے گی۔ ایک تو یہ کہ تعمیر سیرت کے لیے اساسات کون سی ہیں۔ یعنی وہ بنیادیں کون سی ہیں جن پر ایک اعلیٰ سیرت و کردار کی عمارت تعمیر ہو سکتی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ ہر عمارت کی ایک بنیاد ہوتی ہے' اسی بنیاد پر وہ عمارت اٹھتی ہے اور اسی بنیاد کے مستحکم ہونے پر اس عمارت کے استحکام کا دار و مدار ہوتا ہے۔ لہٰذا تعمیر ذات یا تعمیر سیرت یا اگر علامہ اقبال کی اصطلاح مستعار لی جائے تو تعمیر خودی کے لیے قرآن مجید کیا لائحۂ عمل پیش کرتا ہے اور اس کی اساسات کیا ہیں! پھر ہم یہ دیکھیں گے کہ جب ان بنیادوں پر ایک انسانی شخصیت کی بتمام و کمال تعمیر ہو جاتی ہے تو اس کے امتیازی خدوخال کیا ہوتے ہیں! اس میں جو حسن اور جو دلکشی پیدا ہوتی ہے وہ کن اوصاف کی بنیاد پر پیدا ہوتی ہے۔ مردِ مؤمن کے بارے میں علامہ اقبال کا ایک شعر ہے: ؎

کہتے ہیں فرشتے کہ دل آویز ہے مؤمن!
حوروں کو شکایت ہے کم آمیز ہے مؤمن

تو مؤمن کی شخصیت کی جو دل آویزی ہے وہ کون کون سی خصوصیات اور اس کے کون کون سے اوصاف پر مبنی ہے!

پھر ہم یہ دیکھیں گے کہ جب ایک فرد سے آگے بڑھ کر ایک خاندان وجود میں آتا ہے تو خاندان اور عائلی زندگی کے سلسلہ میں قرآن مجید ہمیں کیا رہنمائی دیتا ہے اور اس کی عملی تشکیل کے لیے کیا اصول دیتا ہے! قرآن مجید کے نزدیک ایک اچھا خاندان کون سا ہے! اس کے خصائص واوصاف کیا ہیں!

اس سے ہم جب آگے بڑھیں گے تو دیکھیں گے کہ خاندانوں کے مجموعے سے ایک معاشرہ وجود میں آتا ہے۔ اس انسانی معاشرے میں کن اقدار واوصاف کو قرآن مجید چاہتا ہے کہ وہ نافذ اور رائج ہوں! قرآن مجید کو کن اقدار (values) کی ترویج ایک معاشرے میں اصلاً مطلوب ہے! اور از روئے قرآن وہ کون سی سماجی خرابیاں اور برائیاں (social evils) ہیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ وہ انسانی معاشرے سے دور رہیں اور اُن کا استیصال کیا جائے۔ پھر اس عملِ صالح کی بحث کی بلندترین سطح یہ ہوگی کہ ملت وریاست کی سطح پر' حکومت اور نظامِ حکومت کی سطح پر قرآن مجید ہماری کیا رہنمائی کرتا ہے!

اس ضمن میں یہ ہمارا پہلا سبق ہے' جس میں دراصل وہ اساسات بیان ہوئی ہیں اور وہ بنیادیں معین کی گئی ہیں جن پر ایک مردِ مؤمن کی شخصیت کی تعمیر ہوسکتی ہے ـــــ یا یوں کہہ لیجیے کہ انسانی سیرت وکردار کی پختگی کے لیے جو لوازم ہیں' ان کا تعین کیا گیا ہے۔ علامہ اقبال کا یہ شعر آپ کے ذہن میں ہو گا کہ: ؎

خام ہے جب تک تو ہے مٹی کا اِک انبار تو
پختہ ہو جائے تو ہے شمشیرِ بے زنہار تو

اس سبق میں ہمارے سامنے یہ بات واضح ہوکر آئے گی کہ انسانی سیرت وکردار کی پختگی اور استحکام کے لیے کون سی محنت ضروری ہے' اور وہ کون سی مشقت اور ریاضت ہے جس کی طرف قرآن مجید رہنمائی کرتا ہے!

بندۂ مؤمن کے مطلوبہ اوصاف

اب آپ نوٹ کیجیے کہ سورۃ المؤمنون کی ابتدائی گیارہ آیات میں چند اوصاف سلسلہ وار بیان ہوئے ہیں۔ ان میں اہم ترین وصف ہے صلٰوۃ' جس کا ترجمہ ہم عام طور پر ''نماز'' کرتے ہیں۔ اس ضمن میں خاص طور پر نوٹ کرنے والی بات یہ ہے کہ اوصاف کی اس فہرست میں آغاز بھی نماز سے ہوا ہے اور اختتام بھی۔ آغاز میں فرمایا گیا: ﴿قَدۡ اَفۡلَحَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ۙ﴿۱﴾ الَّذِیۡنَ ہُمۡ فِیۡ

صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ﴿٢﴾ ’’کامیاب ہوگئے وہ اہل ایمان جو اپنی نمازوں میں خشوع سے کام لیتے ہیں‘‘۔ پھر چند اوصاف بیان کرنے کے بعد آخری وصف بیان ہوا: ﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ﴿٩﴾ ’’اور (کامیاب ہوگئے) وہ لوگ جو اپنی نمازوں کی محافظت کرتے ہیں‘‘ انہیں ضائع نہیں ہونے دیتے۔ معلوم ہوا کہ اس فہرست میں اوّل بھی نماز ہے‘ آخر بھی نماز ہے۔ اس سے یہ خصوصی رہنمائی حاصل ہوئی کہ تعمیر سیرت کا جو قرآنی پروگرام اور جو لائحۂ عمل ہے‘ اس میں نماز کا نظام نہایت اہمیت کا حامل ہے۔

دوسرا وصف آتا ہے: ﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ﴿٣﴾ ’’اور جو بے کار اور بے مقصد باتوں سے احتراز کرتے ہیں۔‘‘ یعنی بے کار باتوں سے احتراز کرنا‘ بچنا‘ دامن بچائے رکھنا۔ یعنی انسان اپنے وقت کی قدر و قیمت کا احساس کرے اور اپنے ہر ہر لمحہ کو مفید‘ با مقصد اور نتیجہ خیز بنائے۔ انسان کا وقت یا تو اِس حیاتِ دُنیوی کی کسی حقیقی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے صرف ہو رہا ہو‘ یا اپنی حیاتِ معنوی کی تطہیر اور اس کے تزکیہ کے لیے صرف ہو رہا ہو‘ یا حیاتِ اُخروی کے لیے کچھ کمانے اور بنانے میں صرف ہو رہا ہو۔ ان کاموں کے سوا وقت کا صرف ضیاع بھی ہے اور زیاں بھی۔

تیسرا وصف آتا ہے: ﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ﴿٤﴾ ’’اور وہ لوگ جو زکوٰۃ پر عمل کرتے رہتے ہیں‘‘۔ یہاں نوٹ کرنے والی بات یہ ہے کہ قرآن مجید میں عموماً زکوٰۃ کے ساتھ لفظ ’’اِيْتَاء‘‘ آتا ہے۔ جیسے اٰتَى الزَّكٰوةَ ‘ يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ ‘ لیکن یہاں آپ نے دیکھا کہ بالکل مختلف فعل استعمال ہوا ہے: ﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ﴿٤﴾ یہاں فَاعِلُوْنَ یہ مفہوم ادا کر رہا ہے کہ مسلسل کوشاں رہتے ہیں‘ مسلسل کاربند رہتے ہیں۔ اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ تزکیۂ نفس کے لیے ان کی جدوجہد مسلسل جاری رہتی ہے۔

چوتھا وصف ہے اپنے جنسی جذبہ یعنی اپنی شہوت پر کنٹرول (sex discipline) کہ اس کی تسکین کے لیے قرآن مجید نے جو جائز راہ معین کر دی ہے‘ اس پر اکتفا کیا جائے۔ اس کے بارے میں یہ بھی صراحت کر دی گئی کہ ان جائز راہوں سے اگر کوئی اپنے اس جنسی جذبہ کی تسکین کرتا ہے تو اس میں ہرگز کوئی ملامت والی بات نہیں ہے۔ جنسی جذبہ (sexual Instinct) فی نفسہٖ شر نہیں ہے‘ برائی نہیں ہے‘ evil نہیں ہے۔ اس کا غلط استعمال درحقیقت برائی ہے۔ اگر اس میں انضباط (Discipline) ہو اور اِس میں بے راہ روی اور کجروی (pervertion) نہ ہو‘ یعنی اس میں نہ تو

بے قابو ہونے کی کیفیت پیدا ہو اور نہ جائز راہوں سے انحراف ہو تو فی نفسہٖ یہ کوئی ملامت والی بات نہیں۔ چنانچہ فرمایا گیا: ﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝﴾

غور طلب بات یہ ہے کہ یہاں جائز راستوں کی اجازت کے لیے ''غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ'' کا اسلوب کیوں اختیار کیا گیا! اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کے سوا دوسرے مذاہب میں تجرد کی زندگی بسر کرنا اور اپنے جنسی جذبہ کو' جو فطرت اور جبلت میں ایک نہایت قوی جذبہ ہے' کچلنا ایک اعلیٰ ترین روحانی قدر قرار دیا جاتا ہے۔ جبکہ اسلام دینِ فطرت ہے' چنانچہ وہ اس فطری وجبلی جذبہ کو بالکلیہ کچلنے اور دبانے کو قطعاً پسند نہیں کرتا۔ اس کا منشاء و مدعا یہ ہے کہ اس جذبہ کی تسکین کے لیے جائز اور حلال راہیں اختیار کی جائیں۔ نکاح کو اسی لیے نبی اکرم ﷺ نے اپنی سنتوں میں سے ایک سنت قرار دیا ہے۔ آپ میں سے اکثر حضرات نے یہ حدیث سنی ہوگی جو ہر خطبۂ نکاح میں پڑھی جاتی ہے کہ: ((اَلنِّكَاحُ مِنْ سُنَّتِيْ))(۱) ''نکاح میری سنت میں سے ہے''۔ اسی حدیث کا ایک حصہ یہ بھی ہے کہ جو عام طور پر نہیں پڑھا جاتا کہ: ((فَمَنْ لَّمْ يَعْمَلْ بِسُنَّتِيْ فَلَيْسَ مِنِّيْ)) ''پس جس نے میری سنت پر عمل نہ کیا وہ مجھ سے نہیں ہے''۔ البتہ اس کے ساتھ ایک دوسری طویل حدیث کا یہ آخری حصہ پڑھا جاتا ہے کہ: ((فَمَنْ رَّغِبَ عَنْ سُنَّتِيْ فَلَيْسَ مِنِّيْ))(۲) ''تو جس نے میری سنت سے اعراض کیا (جس کو میری سنت پسند نہیں) اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں''۔

اس مقام پر جہاں جنسی تسکین کے لیے جائز راہوں کی طرف رہنمائی کی گئی وہاں اس کے ساتھ ہی فرما دیا گیا: ﴿فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۝﴾ ''تو جو کوئی ڈھونڈے (اختیار کرے' پسند کرے) اس کے سوا کوئی اور راہ تو وہی لوگ ہیں حد سے بڑھنے والے (یعنی طاغی اور باغی)''۔

اگلی آیت میں دو اوصاف آئے۔ گویا پانچواں وصف امانتوں کی پاس داری اور چھٹا وصف ایفائے عہد۔ فرمایا: ﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۝﴾ ''اور وہ لوگ (فلاح پا گئے) جو

(۱) سنن ابن ماجه' كتاب النكاح' باب ما جاء فى فضل النكاح۔

(۲) صحيح البخارى' كتاب النكاح' باب الترغيب فى النكاح۔ وصحيح مسلم' كتاب النكاح' باب استحباب النكاح لمن قامت نفسه اليه ووجدمونه۔

اپنی امانتوں اور عہد و پیمان کی پاس داری کرتے ہیں‘‘۔ امانت داری اور ایفائے عہد کے معاملات میں چوکس رہتے ہیں۔

یہ چھ اوصاف گویا corner stones ہیں۔ یہ وہ اساسات اور بنیادیں ہیں جن پر انسانی شخصیت کی اُس رخ پر تعمیر کا عمل مبنی ہو سکتا ہے جس رُخ پر اللہ کو انسان کی شخصیت کی تعمیر پسند ہے۔ تعمیر ذات‘ تعمیر سیرت‘ تعمیر کردار کے بھی مختلف معیارات ہو سکتے ہیں۔ مختلف نظریات اور مختلف فلسفوں پر مبنی انسانی سیرت و کردار کے مختلف ہیولے لوگوں کے ذہنوں میں ہو سکتے ہیں‘ لیکن اللہ کے انسانِ مطلوب یا قرآن کے مردِ مؤمن کی جو سیرت و کردار اس کے خالق و مالک اور پروردگار کو مطلوب ہے اس کی تعمیر کے لیے یہ چھ ناگزیر‘ لابدی‘ اٹل (inevitable) اساسات ہیں —— ان چھ اوصاف کے بیان کے بعد پھر نماز کا ذکر فرمایا گیا‘ تاکہ دین میں نماز کی جو اہمیت ہے وہ مستحضر رہے اور ایک مردِ مؤمن جان لے کہ تعمیر سیرت کا اہم ترین عامل نماز کی حفاظت ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۝۹﴾

آخر میں ان لوگوں کو جو اپنے اندر یہ اوصاف مستقل طور پر پیدا کر لیں اور ان اساسات پر اپنی سیرت و کردار کی تعمیر کر لیں‘ بشارت دی گئی ہے کہ یہی لوگ جنت الفردوس کے وارث ہوں گے‘ جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے: ﴿اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ۝۱۰ الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ ۭ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝۱۱﴾

سورۃ المؤمنون اور سورۃ المعارج کی آیات کا تقابل

قرآن حکیم کا یہ اسلوب ہے کہ اس میں جو مضامین بتکرار و اعادہ یعنی بار بار آئیں گے گویا ان کی اہمیت مسلّم ہوتی چلی جائے گی۔ چنانچہ انتیسویں (۲۹) پارے میں سورۃ المعارج کی آیات ۱۹ تا ۳۵ میں بھی تعمیر سیرت کے یہی لوازم بیان ہوئے ہیں۔ ان دونوں مقامات کے تقابل سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں کس قدر مشابہت ہے۔ سورۃ المعارج میں فرمایا گیا: ﴿اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ۝۱۹﴾ ’’یقیناً انسان تھڑدلا (اور کم ہمت) پیدا ہوا ہے‘‘۔ ﴿اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا ۝۲۰﴾ ’’جب اسے تکلیف پہنچتی ہے تو جزع فزع کرتا ہے‘‘۔ فریاد کرتا ہے‘ نالہ و شیون کرتا ہے۔ ﴿وَاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا ۝۲۱﴾ ’’اور جب اس کو خیر ملتا ہے (مال و دولت ہاتھ آتی ہے‘ اللہ تعالیٰ نعمتیں دیتا ہے) تو (اُن) کو روک کر رکھتا ہے‘‘۔ سینت سینت کر رکھتا ہے‘ دوسروں تک انہیں پہنچنے نہیں دیتا۔ یہ دراصل

انسان کی سیرت کی اس خامی کی طرف اشارہ جس سے انسان کو رُستگاری اور آزادی دلانا اس پروگرام کا مقصد ہے۔

آگے فرمایا: ﴿اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ ﴿٢٢﴾﴾ ''سوائے اُن کے جو نماز پڑھنے والے (نماز کے خوگر اور عادی ہو گئے) ہوں''۔ یہاں کی اتنی اہمیت سامنے آئی کہ وہاں جو ﴿قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿١﴾﴾ کے الفاظ وارد ہوئے تھے ان کی بجائے یہاں لفظ ''مُصَلِّيْنَ'' آیا۔ گویا مؤمن اور نمازی مترادف اور ہم معنی الفاظ ہیں۔ آگے فرمایا: ﴿الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ ﴿٢٣﴾﴾ ''جو اپنی نمازوں پر مداومت کرنے والے ہیں'' ہمیشگی اختیار کرتے ہیں۔

آگے فرمایا: ﴿وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ﴿٢٤﴾ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ﴿٢٥﴾﴾ ''اور وہ لوگ جن کے اموال میں معین اور معلوم حق ہے مانگنے والوں کے لیے بھی اور ان لوگوں کے لیے بھی جو (کسی سبب سے) محروم ہو جائیں''۔ یہ گویا سورۃ المؤمنون کے الفاظ: ﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ﴿٤﴾﴾ کے مترادف الفاظ ہیں۔

آگے فرمایا: ﴿وَالَّذِيْنَ يُصَدِّقُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ﴿٢٦﴾﴾ ''اور وہ لوگ جو روزِ جزا (یوم قیامت) کی تصدیق کرتے ہیں''۔ ﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ ﴿٢٧﴾﴾ ''اور وہ لوگ جو اپنے ربّ کے عذاب سے لرزاں و ترساں رہتے ہیں (ڈرتے رہتے ہیں)'' ﴿اِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَاْمُوْنٍ ﴿٢٨﴾﴾ ''اور واقعتاً اُن کے ربّ کا عذاب ایسی ہی چیز ہے جس سے نچنت نہیں ہوا جا سکتا''۔ جس سے بے خوف ہونا ممکن نہیں ہے۔ ان تین آیات کے بارے میں مَیں عرض کروں گا کہ ان کا تعلق ''اِعراض عن اللّغو'' سے ہے۔ یہ ایمان بالآخرت ہے جس کے نتیجہ میں دنیا کی زندگی کا ایک ایک لمحہ قیمتی ہو جاتا ہے' اور اس کا اصل ہے ''اِعراض عن اللّغو'' یعنی بیکار باتوں سے دامن بچانا' پہلو تہی کرنا۔ اس کی قدرے وضاحت اِن شاء اللہ اگلے صفحات میں آئے گی۔

اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ بعینہٖ وہ الفاظ دوبارہ آ رہے ہیں جو سورۃ المؤمنون (آیات ۵ تا ۸) میں آئے تھے: ﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ﴿٢٩﴾ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ﴿٣٠﴾ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ﴿٣١﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ﴿٣٢﴾﴾ البتہ یہاں ایک چیز کا اضافہ کیا گیا' اور وہ یہ کہ امانت اور عہد کے ضمن میں شہادت پر قائم رہنا' گواہی پر قائم رہنا۔ چنانچہ فرمایا: ﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ بِشَهٰدٰتِهِمْ

قَآئِمُوۡنَ ﴿۳۳﴾ ''اور جو اپنی گواہیوں پر قائم رہتے ہیں''۔ آخر میں وہی نماز کا ذکر پھر آیا: ﴿وَالَّذِیۡنَ هُمۡ عَلٰی صَلَاتِهِمۡ یُحَافِظُوۡنَ ﴿۳۴﴾﴾ جیسے وہاں اوّل و آخر نماز' ویسے بھی یہاں اوّل و آخر نماز۔

آگے فرمایا: ﴿اُولٰٓئِكَ فِیۡ جَنّٰتٍ مُّكۡرَمُوۡنَ ﴿۳۵﴾﴾ ''یہ ہیں وہ لوگ جو جنتوں میں ہوں گے اور وہاں ان کا اکرام واعزاز کے ساتھ''۔ سورۃ المؤمنون میں فرمایا تھا: ﴿اُولٰٓئِكَ هُمُ الۡوٰرِثُوۡنَ ﴿۱۰﴾ الَّذِیۡنَ یَرِثُوۡنَ الۡفِرۡدَوۡسَ ؕ هُمۡ فِیۡهَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۱۱﴾﴾ یہاں اِن الفاظ میں بشارت دی گئی: ﴿اُولٰٓئِكَ فِیۡ جَنّٰتٍ مُّكۡرَمُوۡنَ ﴿۳۵﴾﴾

انسانی شخصیت میں کمزوری کے پہلو

سورۃ المؤمنون کی پہلی آیت ﴿قَدۡ اَفۡلَحَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۱﴾﴾ میں ایک اصطلاح وارد ہوئی ہے۔ ''فلح''۔ یہ لفظ قرآن مجید میں متعدد بار آیا ہے' مثلاً: ﴿اُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ ﴿۵﴾﴾ اور سورۃ المعارج کا جو حصہ سورۃ المؤمنون کی ابتدائی گیارہ آیات کے مشابہ ہے' اس کے آغاز میں الفاظ آئے کہ: ﴿اِنَّ الۡاِنۡسَانَ خُلِقَ هَلُوۡعًا ﴿۱۹﴾﴾ ''بے شک انسان تھڑ دلا (اور کم ہمت) پیدا کیا گیا ہے''۔ اس کی مزید وضاحت ہوئی: ﴿اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوۡعًا ﴿۲۰﴾﴾ ''جب اسے تکلیف پہنچتی ہے تو جزع فزع کرتا ہے'' نالہ وشیون سے کام لیتا ہے' فریاد کرتا ہے' چیختا چلاتا ہے۔ ﴿وَاِذَا مَسَّهُ الۡخَیۡرُ مَنُوۡعًا ﴿۲۱﴾﴾ ''اور جب اسے خیر (یا بھلائی یا دولت) ملتی ہے تو اسے سینت سینت کر رکھتا ہے''۔ سمیٹ سمیٹ کر اپنے ہی پاس رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اپنے دوسرے ابناءِ نوع کو اس میں حصہ دار بنانے کی ہمت نہیں رکھتا۔

چنانچہ ہمیں یہ سمجھنا ہے کہ انسان کی شخصیت میں ضعف اور کمزوری کے وہ کون کون سے پہلو ہیں جن کی نشاندہی قرآن مجید نے کی ہے اور جن کے ازالہ کے لیے انسان کو محنت ومشقت اور ریاضت کی ضرورت ہے۔ قرآن مجید کے مطالعہ سے ایک بڑی عجیب حقیقت سامنے آتی ہے کہ ایک طرف قرآن مجید انسان کی عظمت کو نمایاں (emphasise) کرتا ہے کہ یہ بہت اعلیٰ خلقت کا حامل ہے۔ دوسری طرف قرآن مجید انسانی خلقت کے بعض خلاء اور اس کی بعض کمزوریوں کی نشاندہی بھی کرتا ہے۔ ایک طرف بلندیاں ہیں اور ساتھ ہی پستیاں ہیں۔ جیسے سورۃ التّین میں فرمایا گیا: ﴿لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِیۡۤ اَحۡسَنِ تَقۡوِیۡمٍ ﴿۴﴾ ثُمَّ رَدَدۡنٰهُ اَسۡفَلَ سٰفِلِیۡنَ ﴿۵﴾﴾ ''ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا' پھر اسے اُلٹا پھیر کر ہم نے سب نیچوں سے نیچ کر دیا''۔ اس کی بہت خوبصورتی سے

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے ترجمانی کی ہے۔ وہ کہتے ہیں: ؎

آدمی زادہ طرفہ معجون است
از فرشتہ سرشتہ و ز حیوان

یہ انسان' آدمی زادہ' حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد عجیب مرکب وجود کا حامل ہے۔ یہ گویا چوں چوں کا مربہ ہے۔ اس میں ایک جانب بڑی بلندیاں ہیں' وہ بلندیاں جو اسے ملائکہ کا ہم پلہ ہی نہیں مسجود بناتی ہیں۔ دوسری طرف اس میں ایسی پستیاں ہیں کہ یہ خالص حیوانات کی سطح پر بھی گر جاتا ہے۔ پس اس میں ملکوتیت اور حیوانیت کے اوصاف بیک وقت موجود ہیں۔ اگر ہم خود کچھ دروں بینی کی عادت ڈالیں اور اپنے اندر بھی جھانکا کریں تو ہمیں خود محسوس ہوگا کہ یہ دو متضاد تقاضے ہمارے اندر موجود ہیں۔ خیر و شر کے عواطف و میلانات بیک وقت ہمیں اپنے باطن میں محسوس ہوتے ہیں۔ ایک طرف ہمارے اندر نیکی' بھلائی' علو ہمت اور کردار کی بلندی کی طرف رجحان بھی موجود ہے اور دوسری طرف پستی کی طرف میلان بھی خود ہمارے اندر موجود ہے۔ اسے ہم تعبیر کرتے ہیں کشمکش خیر و شر سے' جس کے داعیات اور عواطف و میلانات ہمارے اپنے اندر موجود ہیں۔ اسی کو علامہ اقبال نے ایک مقام پر ''معرکۂ روح و بدن'' سے تعبیر کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں ؎

دنیا کو ہے پھر معرکۂ روح و بدن پیش!
تہذیب نے پھر اپنے درندوں کو ابھارا
اللہ کو پامردیٔ مؤمن پہ بھروسہ!
ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا

فرائڈ ایک بہت بڑا ماہر نفسیات شمار ہوتا ہے۔ اگرچہ اس کے بہت سے نظریات گمراہ کن بھی ہیں' لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نے انسانی نفسیات کا مطالعہ اور مشاہدہ بہت گہرائی میں اتر کر کیا ہے۔ اس کے یہاں انسانی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کے ضمن میں جو اصطلاحات ملتی ہیں ان میں ایک طرف "IDD" اور "LIBIDO" ہے' یعنی حیوانی جبلتیں اور حیوانی تقاضے (animal instincts)' اور دوسری طرف "EGO" اور "SUPER EGO" یعنی ''انا'' اور ''انائے کبیر'' بھی موجود ہے۔ یہ وہ چیزیں ہیں جو انسان کو رفعت اور اخلاق کی بلند منزلوں کی طرف کھینچتی ہیں۔

قرآن مجید نے بھی ''نفس'' کو کہیں تو ایک وحدت کی حیثیت سے لیا ہے تو وہ پستی کا مظہر ہے اور

اس کے مقابلہ میں قلب وروح کو بلندی اور رفعت کا مظہر قرار دیا ہے۔ کہیں ایسا ہوا ہے کہ نفس ہی کو ایک جامع اصطلاح کے طور پر لے کر اس کی تین حالتوں اور کیفیات کی نشاندہی کی گئی ہے۔ ان میں سے پہلی ''نفسِ امّارہ'' ہے' یعنی اس میں برائی' بے حیائی' شہوت' خواہشات اور حیوانی جبلتوں ہی کی طرف سارا میلان اور رجحان ہے۔ چنانچہ تیرھویں پارے کی پہلی آیت میں حضرت یوسف علیہ السلام کے الفاظ نقل ہوئے ہیں: ﴿وَمَآ اُبَرِّئُ نَفۡسِیۡ ۚ اِنَّ النَّفۡسَ لَاَمَّارَۃٌۢ بِالسُّوۡٓءِ﴾ (یوسف:٥٣) ''یقیناً میں کچھ اپنے نفس کی براءت نہیں کر رہا ہوں' نفس تو بدی پر اکساتا ہی ہے''۔

لیکن قرآن مجید دوسری کیفیت ''نفسِ لوّامہ'' کو نہ صرف تسلیم کرتا ہے بلکہ اللہ نے اس کی قسم کھائی ہے اور اسے وقوعِ قیامت پر بطورِ شہادت پیش کیا ہے جس کا ہم سورۃ القیامہ میں مطالعہ کر چکے ہیں: ﴿وَلَاۤ اُقۡسِمُ بِالنَّفۡسِ اللَّوَّامَۃِ ؕ﴾ چنانچہ برائی پر ملامت کرنے والی چیز بھی انسان کے اپنے اندر موجود ہے۔

پھر ''نفس مطمئنہ'' ایک بلند ترین کیفیت ہے۔ جب آدمی زادہ حیوانیت سے آزادی اور رُستگاری حاصل کر کے انسانیت کے بلند مقام پر متمکن ہو جائے' قائم ہو جائے' جم جائے' تو یہ ہے نفس مطمئنہ' جس کا ذکر سورۃ الفجر کے آخر میں ہے: ﴿یٰۤاَیَّتُہَا النَّفۡسُ الۡمُطۡمَئِنَّۃُ ﴿٭ۖ﴾ ارۡجِعِیۡۤ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَۃً مَّرۡضِیَّۃً ﴿ۚ﴾﴾ ''اے نفس مطمئن! چل اپنے ربّ کی طرف اس حال میں کہ تو (اپنے انجامِ نیک سے) خوش (اور اپنے ربّ کے نزدیک) پسندیدہ ہے''۔ لہٰذا یہ ہیں وہ متضاد میلانات و رجحانات جو انسان کے اندر موجود ہیں۔

مزید توجہ کیجیے۔ قرآن کریم ہمیں یہ بتاتا ہے کہ انسان مسجودِ ملائک ہے۔ قرآن مجید میں سات مرتبہ اس کا ذکر ہے کہ ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو۔ مزید برآں سورۂ بنی اسرائیل میں ارشاد ہے کہ: ﴿وَلَقَدۡ کَرَّمۡنَا بَنِیۡۤ اٰدَمَ وَحَمَلۡنٰہُمۡ فِی الۡبَرِّ وَالۡبَحۡرِ وَرَزَقۡنٰہُمۡ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ وَفَضَّلۡنٰہُمۡ عَلٰی کَثِیۡرٍ مِّمَّنۡ خَلَقۡنَا تَفۡضِیۡلًا ﴿٪﴾﴾ ''اور ہم نے بنی آدم کو بڑی عزت بخشی ہے' اور ہم اسے بحر و بر میں اٹھائے پھرتے ہیں' اور اسے پاکیزہ رزق دیا ہے اور ہم نے جو کچھ بنایا ہے اس میں سے بہتوں پر اسے فضیلت عطا کی ہے''۔ یہ بھی اس کا اعزاز و اکرام ہے۔ قرآن یہ بھی کہتا ہے: ﴿لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِیۡۤ اَحۡسَنِ تَقۡوِیۡمٍ ۫﴾ ''ہم نے انسان کو بہترین خلقت پر پیدا کیا ہے''۔ اور سورۂ صٓ کی آیت ٧٥ میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں: ﴿لِمَا خَلَقۡتُ بِیَدَیَّ ؕ﴾ ''اس (انسان) کو تو میں نے

اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا ہے''۔[1] اور اگرچہ قرآن میں تو اس کا ذکر نہیں ہے' لیکن تورات میں یہ مضمون بھی آیا ہے کہ:

"And God created man in his own image"

اور بعینہٖ یہ مضمون حدیث نبویؐ میں بھی موجود ہے کہ:((خَلَقَ اللّٰهُ آدَمَ عَلٰی صُوْرَتِهٖ))[2] ''اللہ نے آدم کی تخلیق اپنی صورت پر فرمائی ہے''۔اس کو بلاتشبیہ خیال کیجیے!

اب ایک طرف تو انسان کی عظمتوں کا یہ عالم ہے اور دوسری طرف قرآن یہ بھی بتاتا ہے: ﴿خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا ﴿۲۸﴾﴾(النساء)''انسان کمزور پیدا ہوا ہے''۔﴿اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ﴿۱۹﴾﴾''انسان تھڑدلا (کم ہمت) پیدا ہوا ہے''۔﴿خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ ط﴾ (الانبیاء:۳۷) ''انسان جلد باز پیدا کیا گیا ہے۔(یعنی اس کی خلقت میں جلد بازی کا مادہ ہے' جلد بازی اس کی طبیعت اور سرشت میں ودیعت شدہ ہے۔کہیں فرمایا جاتا ہے:﴿زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ط﴾(آل عمران:۱۴) یعنی انسان کے لیے عورتوں سے دلچسپی اور ان کی طرف شہوت کا میلان' اولاد کی محبت اور مال واسبابِ دنیا کی مختلف صورتوں کی طرف بھی ایک کشش ہے جو اس میں طبعی طور پر ودیعت کر دی گئی ہے۔یہ ہے انسان کی حقیقت از روئے قرآن۔

قرآن کا تصورِ فلاح

اب غور طلب اصل مسئلہ یہ ہے کہ انسان کو اپنی ان خامیوں' کمزوریوں اور اپنی خلقت کے ضعف کے حامل ان پہلوؤں سے کشمکش اور کشاکش کر کے' محنت و مشقت اور ریاضت کر کے اپنی جو اصل

(۱) قرآن مجید میں بہت سے مقامات پر اللہ تعالیٰ کے لیے ایسے الفاظ بھی آئے ہیں جو جسم کے مختلف اعضاء کے لیے بولے جاتے ہیں۔جیسے ہاتھ' چہرہ' پنڈلی' مٹھی' وغیرہ—— ان الفاظ سے ہم یہ مراد لیں گے کہ کوئی حقیقت معنوی ہے جس کو اِن الفاظ سے تعبیر کیا جا رہا ہے۔اپنے جسموں پر قیاس کر کے اللہ تعالیٰ کے ہاتھ یا اپنی طرح کا اللہ تعالیٰ کا کوئی چہرہ یا اللہ تعالیٰ کی آنکھ ہم نہیں مان سکتے۔اللہ تعالیٰ جسم اور جسمانیت سے پاک ہے' اعلیٰ ہے' ارفع ہے اور منزہ ہے! ''سُبْحٰنَهٗ وَتَعَالٰی عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ''—— البتہ اجمالاً جب یہ الفاظ آئے ہیں تو ہمارا ایمان رہے گا کہ کوئی حقیقت معنوی ہے جس کو اِن الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

(۲) صحیح البخاری' کتاب الاستئذان' باب بدء الاسلام' وصحیح مسلم' کتاب البر والصلة والآداب' باب النھی عن ضرب الوجه۔

بلندی اور رفعت ہے اسے attain کرنا ہے' اس کا جو اصل مرتبہ اور مقام ہے اس کو حاصل کرنا ہے۔ جیسے سورۃ التین میں فرمایا: ﴿لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِیۡۤ اَحۡسَنِ تَقۡوِیۡمٍ ۫﴿۴﴾ ثُمَّ رَدَدۡنٰہُ اَسۡفَلَ سٰفِلِیۡنَ ۙ﴿۵﴾ اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ ''ہم نے انسان کو اعلیٰ ترین تخلیق پر پیدا فرمایا' پھر اسے نچلوں میں سب سے نیچے لوٹا دیا' سوائے ان کے جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے''۔ پس اس جدوجہد کا عنوان ''ایمان اور عملِ صالح'' ہے جس کے ذریعے سے انسان اپنی پستی سے اُبھر کر اپنے اس مقامِ بلند تک پہنچتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے بالقوۃ (potentially) تخلیق فرمایا ہے۔ اس محنت و مشقت اور اس ریاضت کا نام شریعت' طریقت اور سلوک ہے۔ پستی سے بلندیوں تک پہنچنے کے عمل کے لیے قرآن مجید جامع ترین لفظ استعمال کرتا ہے: ''فَلَحَ''۔ اب غور کیجیے کہ اس لفظ کا لغوی مفہوم کیا ہے! ہم عام طور پر اس کا ترجمہ کر دیتے ہیں کامیابی' بامراد ہونا۔ لیکن ''فَلَحَ'' ـــــ جو عربی زبان میں سہ حرفی مادہ (ف ل ح) ہے' اس کا بنیادی مفہوم ہے کسی چیز کو توڑنا' پھاڑنا' کسی چیز کو پھاڑ کر اُس میں سے کوئی اور چیز برآمد کرنا۔ چنانچہ جیسے ہمارے یہاں کہا جاتا ہے کہ ''لوہے کو لوہا کاٹتا ہے'' اس طرح عربی زبان کی ضرب المثل ہے: اِنَّ الْحَدِیْدَ بِالْحَدِیْدِ یُفْلَحُ ''لوہا لوہے ہی سے کاٹا جاتا ہے''۔ اسی طرح جدید عربی میں فَلّاح کسان کو کہتے ہیں' کیونکہ وہ اپنے ہل کی نوک سے دھرتی کے سینہ کو چیرتا ہے۔ ہل اس کا آلہ فلح ہے جس سے کسان' کاشت کار' فلاح زمین میں شگاف ڈالتا ہے۔ اب اس لفظ کو ذہن میں رکھیے اور غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ انسانی شخصیت کے اندر ایک معنوی حقیقت مضمر ہے' جو اس کی اصل شخصیت ہے' جو اس کی خودی ہے' جو اس کی انا ہے۔ کوئی شخص جب ''مَیں'' کہہ کر اپنی طرف اشارہ کرتا ہے تو کسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے! غور طلب بات ہے کہ یہ میرا ہاتھ ہے' یہ میرے پاؤں ہیں' یہ میری آنکھیں ہیں' یہ میرے کان ہیں' یہ میرا سر ہے' یہ میرا بدن ہے' تو میں کون ہوں جس کی یہ تمام چیزیں ہیں؟ یہ 'مَیں' 'انا' یا خودی انسان کی اصل حقیقت اور اس کی اصل معنوی شخصیت ہے۔ لیکن یہ 'مَیں' یا 'انا' یا خودی چند مادی اور شہوانی غلافوں میں لپٹی ہوئی ہے' جو انسان کے حیوانی وجود کے اندر ودیعت کیے گئے ہیں۔ وہ حیوانی وجود اسے پستیوں کی طرف کھینچتا ہے۔ سارے حیوانی داعیات (animal instincts) اس کے ساتھ لگے ہوئے ہیں جو اس کو بلندیوں کی طرف نہیں جانے دیتے' بلکہ پستیوں کی طرف کھینچتے ہیں۔ اس سے رُستگاری حاصل کرنا اور اپنے مادی اور شہوانی غلافوں کو پھاڑ کر اس میں سے اپنی اصل معنوی شخصیت کو برآمد کرنا اور اس کو

نشوونما دینا' یہ عمل فلح ہے۔ جیسے آم کی گٹھلی پھٹتی ہے تو اس میں سے آم کا پودا برآمد ہوتا ہے اور جیسے ایک بیج شق ہوتا ہے تو اس میں سے پتیاں نکلتی ہیں۔ عربی زبان میں فلح کے بہت ہی قریب کا لفظ ''فَلَقَ'' ہے۔ فَلَقَ (ف ل ق) کے معنی بھی پھاڑنا کے ہیں' جو قرآن میں صبح کے لیے آتا ہے۔ سورۃ الانعام کی آیت ۹۶ میں اللہ تعالیٰ کو ﴿فَالِقُ الْاِصْبَاحِ ۚ﴾ قرار دیا گیا ہے کہ وہ رات کی تاریکی کا پردہ چاک کرتا اور دن کی روشنی برآمد کرتا ہے۔ اور فرمایا: ﴿اِنَّ اللّٰہَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰی ؕ﴾ (الانعام: ۹۵) ''بالتحقیق اللہ دانوں (بیجوں) اور گٹھلیوں کا پھاڑنے والا ہے''۔ وہ ان کو پھاڑتا ہے اور ان میں سے پودے برآمد کرتا ہے۔ تو فلاحِ انسانی کیا ہے؟ یہ کہ انسان کا اپنے مادی اور شہوانی میلانات ورجحانات' اپنے حیوانی تقاضوں اور جبلتوں کے خول کو پھاڑ کر اپنی معنوی شخصیت' اپنی خودی اور اپنی انا کو برآمد کرنا' اس کو پروان چڑھانا اور اس کی تعمیر کرنا۔ یہ ہے انسان کی فلاح از روئے قرآن حکیم۔

حکمت چونکہ انسان کی ایک مشترک متاع ہے اس لیے میں یہاں اپنشد کے ایک جملہ کا انگریزی ترجمہ پیش کر رہا ہوں:

> *"Man in his ignorance identifies himself with the material sheats which encompass his real self."*
>
> ''انسان اپنی نادانی اور جہالت میں اپنے آپ کو ان مادی غلافوں سے تعبیر کر بیٹھتا ہے جن کے اندر اس کی اصل حقیقت مضمر اور پنہاں ہے اور بایں وجوہ اس کی اصل حقیقت اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہے''۔

قرآن حکیم میں سورۃ الحشر میں فرمایا گیا: ﴿وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ ؕ﴾ (آیت: ۱۹) ''اور اُن لوگوں کے مانند نہ بن جانا جنہوں نے اللہ کو بھلا دیا تو اللہ نے انہیں خود اپنے آپ سے (اپنی حقیقت اور اپنی عظمت سے) غافل کر دیا''۔

یہ ہے انسان کی انفرادی شخصیت اور سیرت و کردار کی تعمیر کا قرآنی پروگرام اور لائحہ عمل جس کا اصل مقصد فلاحِ انسانی ہے۔ یعنی انسانی شخصیتوں کے خام مال سے ایک تعمیر شدہ اور مستحکم سیرت و کردار وجود میں آئے' جس کا حوالہ علامہ اقبال کے اس شعر میں ہے: ؎

خام ہے جب تک تو ہے مٹی کا اِک انبار تو
پختہ ہو جائے تو ہے شمشیر بے زنہار تو

اور اس سے بھی زیادہ پیارے انداز میں اس بات کو علامہ اقبال نے فارسی میں بایں طور پر ادا کیا ہے: ؎

بانشۂ درویشی در ساز و دمادم زن
چوں پختہ شوی خود را بر سلطنت جم زن!

آپ کو معلوم ہے کہ اگر ریت کا ایک گولہ بنا کر اسے آپ کسی شیشہ پر دے ماریں تو شیشہ نہیں ٹوٹے گا‘ اس کا کچھ نہیں بگڑے گا‘ بلکہ وہ ریت خود ہی بکھر جائے گی۔ لیکن اسی ریت کو آپ پکا لیں‘ پختہ کر لیں اور وہ اینٹ کی شکل اختیار کر لے تو اب اس کی ضرب کاری اور نتیجہ خیز ہو گی۔ اکبر الٰہ آبادی مرحوم نے‘ جن کو علامہ اقبال اپنا مرشد معنوی کہا کرتے تھے‘ اسی بات کو بڑے سادہ لیکن پُر اثر انداز میں یوں ادا کیا ہے:؎

تو خاک میں مل اور آگ میں جل‘ جب خشت بنے تب کام چلے
اِن خام دلوں کے عنصر پر بنیاد نہ رکھ‘ تعمیر نہ کر!

تعمیر سیرت میں صلوٰۃ کی اہمیت

اسلام اور قرآن حکیم انسان کے سامنے جو اعلیٰ نصب العین پیش کرتے ہیں‘ اس کے حصول کے لیے جو جدوجہد درکار ہے اس کے لیے پہلے پختہ انسانی شخصیتیں ایک ناگزیر ضرورت کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اور ان پختہ شخصیتوں کو بروئے کار لانے کے لیے جو پروگرام اور لائحۂ عمل قرآن مجید تجویز کرتا ہے اس کا اوّل و آخر صلوٰۃ ہے۔ ہم نے قرآن حکیم کے ان دو مقامات پر دیکھا کہ آغاز میں بھی نماز کا ذکر ہے اور اختتام پر بھی نماز ہی کا ذکر ہے۔ میں اس بات کو نبی اکرم ﷺ کی تین احادیث سے واضح کروں گا کہ اسلام کا نقطۂ آغاز نماز ہے۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

((بَیْنَ الرَّجُلِ وَبَیْنَ الشِّرْكِ وَالْكُفْرِ تَرْكُ الصَّلَاةِ)) (۱)

”شرک و کفر اور بندے کے درمیان نماز ترک کرنے کا معاملہ حائل ہے“۔

یعنی اسلام اور کفر کے مابین امتیاز نماز ہی سے قائم ہوتا ہے۔ پھر دیکھیے کسی عمارت کی درمیانی اور اہم شے اُس کا عمود ہوتی ہے جس پر چھت کھڑی ہوتی ہے‘ جسے ہم ستون کے نام سے جانتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((اَلصَّلٰوۃُ عِمَادُ الدِّیْنَ)) ”نماز دین کا ستون ہے“۔ پھر یہ کہ دین کی بلند ترین حقیقت کے بارے میں کسی صحابی کا قول ہے: ((اَلصَّلٰوۃُ مِعْرَاجُ الْمُؤْمِنِیْنَ)) ”صلوٰۃ مؤمنین کے لیے معراج کا درجہ رکھتی ہے“۔ تو گویا کہ ابتدا بھی‘ اہم اور درمیانی عمود بھی‘ اور چوٹی بھی‘ ان تمام

(۱) صحیح مسلم‘ کتاب الایمان‘ باب بیان اطلاق اسم الکفر علی من ترک الصلاۃ۔

مرحلوں میں ہم دیکھ رہے ہیں کہ نماز دین کی اہم ترین شے ہے۔ میں اسے یوں تعبیر کروں گا کہ اگر ہم انسان کی سیرت سازی کو ایک شہر سے تشبیہہ دیں تو اس کے گرداگرد جو فصیل کھنچی ہوئی ہے وہ نماز ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس پہلو سے بھی اگر دیکھا جائے تو نماز کو اگر کوئی شخص اپنی زندگی میں قائم کرلے تو اس کی زندگی گویا کہ ایک حصار میں آ جاتی ہے' ایک کھونٹے سے بندھ جاتی ہے۔ پھر اس کے سارے پروگرام اس نماز کے حوالے سے طے ہوں گے' اس کی appointments اگر ہوں گی تو نماز کے اوقات کو مدّنظر رکھ کر ہوں گی' اس کے شب و روز کے معمولات میں فیصلہ کن چیز نماز ہوگی۔ لہٰذا پوری انسانی زندگی کو شکنجہ میں کس لینے والی شے نماز ہے۔

''صلوٰۃ'' کا مفہوم

آیئے پہلے ہم یہ سمجھیں کہ ''صلوٰۃ'' جو قرآن مجید کا اصل لفظ ہے اور ''نماز'' جو فارسی کا لفظ ہے' ان دونوں کے مفاہیم میں بڑا بنیادی فرق ہے۔ اب یہ ہماری مجبوری ہے کہ چونکہ ہمارے یہاں اسلام جب پہنچا ہے تو فارسی زبان کے حوالے سے پہنچا ہے' لہٰذا اکثر اصطلاحاتِ قرآنیہ کا ترجمہ جو اردو میں مستعمل ہے وہ فارسی الاصل ہے۔ فارسی زبان میں ان الفاظ کا ایک اپنا مفہوم پہلے سے تھا۔ وہ مفہوم کہیں غیر شعوری طور پر ان اصطلاحات کے اصل مفہوم میں شامل نہیں ہو جانا چاہیے جو قرآن کریم اور ہمارے دین سے مراد ہے۔ عربی زبان میں ''ص ل ی'' کا مادہ (root) جس سے یہ لفظ صلوٰۃ بنا ہے' اپنے اندر دو بنیادی مفہوم رکھتا ہے۔ ایک ہے: ''اِقدام الی الشیء'' کہ کسی کی طرف بڑھنا' کسی چیز کی طرف متوجہ ہونا۔ گویا کہ صلوٰۃ اللہ تعالیٰ کی طرف بڑھنے اور متوجہ ہونے کا نام ہے۔ صلوٰۃ اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہونے کا نام ہے۔ اسی وجہ سے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ یہ چونکہ مکالمہ ومخاطبۂ الٰہی سے مشرف کرنے والی چیز ہے لہٰذا یہ حقیقی ایمان کے لیے بمنزلہ ''معراج'' ہے: ((اَلصَّلٰوۃُ مِعْرَاجُ الْمُؤْمِنِیْنَ))

یہی لفظ ''صلوٰۃ'' دعا کے مفہوم میں بھی آتا ہے۔ جب کوئی شخص کسی سے دعا کرتا ہے تو وہ اس کی طرف ہمہ تن متوجہ ہوتا ہے۔ یہی لفظ عنایت وشفقت کے مفہوم میں بھی آتا ہے' جیسے سورۃ الاحزاب میں وارد ہوا ہے: ﴿اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ ط﴾ (آیت:۵۶) ''بے شک اللہ صلوٰۃ بھیجتا ہے اپنے نبی (ﷺ) پر اور اس کے فرشتے بھی''۔ اسی سورت میں ایک اور جگہ آیا ہے: ﴿ھُوَ الَّذِیْ یُصَلِّیْ عَلَیْکُمْ وَمَلٰٓئِکَتُہٗ﴾ (آیت ۴۳) ''(اے اہل ایمان! اپنے نصیب پر فخر کرو کہ) وہ (اللہ) تم پر صلوٰۃ بھیجتا ہے اور اُس کے فرشتے بھی''۔ اس سے مراد کیا ہے؟ اللہ کی طرف منسوب ہو تو

اس کا مفہوم ہو گا اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے عنایت' شفقت' رحمت' توجہ۔فرشتوں کی طرف منسوب ہو کر اس کا مفہوم ہو جائے گا اُن کی طرف سے نبی اکرم ﷺ اور مؤمنین صادقین کے لیے اللہ کی شفقت' عنایت' رحمت اور توجہ کے لیے اس کے حضور میں دعا۔تو یہ سب باتیں اس لفظ صلوٰۃ کے پہلے بنیادی مفہوم میں شامل ہیں۔

آپ میں سے اکثر حضرات کو معلوم ہو گا کہ صلوٰۃ کے آغاز کے لیے حدیث میں سورۃ الانعام کی آیت ۷۹ کے یہ الفاظِ مبارکہ بھی آتے ہیں:﴿اِنِّیۡ وَجَّهۡتُ وَجۡهِیَ لِلَّذِیۡ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ حَنِیۡفًا وَّمَاۤ اَنَا مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ ﴿۷۹﴾﴾ ''میں نے اپنی توجہ کو مرتکز کر لیا ہے اُس ذات کی طرف (اُس ہستی کی طرف) جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا (اور میں ہر شے سے اپنی توجہ کو ہٹا کر اور) یکسو ہو کر (اللہ تعالیٰ کی جناب میں متوجہ ہو رہا ہوں) اور میں مشرکین میں سے نہیں ہوں''۔یہ صلوٰۃ کا نقطۂ آغاز ہے۔

صلوٰۃ کا یہ جو مفہوم ہے اس کے اعتبار سے یہ بات ذہن میں رکھیے کہ صلوٰۃ یا نماز کا مقصد ذکر الٰہی بنتا ہے۔صلوٰۃ میں آپ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں' اللہ عزوجل آپ کو یاد آتا ہے۔اسی لیے سورۂ طٰہٰ میں فرمایا:﴿اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکۡرِیۡ ﴿۱۴﴾﴾ ''نماز کو قائم کرو' صلوٰۃ کو قائم رکھو میری یاد کے لیے''۔

اسی لفظ کا دوسرا بنیادی مفہوم ہے:''آگ سے حرارت حاصل کرنا' تاپنا''۔حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے اہل خانہ سے فرمایا تھا:﴿اِنِّیۡۤ اٰنَسۡتُ نَارًا ؕ سَاٰتِیۡکُمۡ مِّنۡهَا بِخَبَرٍ اَوۡ اٰتِیۡکُمۡ بِشِهَابٍ قَبَسٍ لَّعَلَّکُمۡ تَصۡطَلُوۡنَ ﴿۷﴾﴾ (النمل) ''میں نے آگ دیکھی ہے' میں اس سے عنقریب کوئی خبر لاؤں گا یا کوئی انگارا لاؤں گا تاکہ تم (سردی سے بچنے کے لیے) تاپ سکو''۔اس مفہوم کو بھی مدنظر رکھیے۔اس کے حوالے سے حقیقتِ صلوٰۃ کا یہ پہلو سامنے آنا چاہیے کہ انسان کی روح میں اگر ضعف واضمحلال پیدا ہو گیا ہو' اس پر افسردگی طاری ہو گئی ہو' تو اس میں حرارتِ تازہ پیدا کرنے کا ذریعہ صلوٰۃ ہے۔جذباتِ ایمانی کے متعلق اگر محسوس ہو کہ ان پر کچھ ٹھنڈ طاری ہے یا اَوس پڑ گئی ہے تو ان جذبات کے اندراز سرنو ایک حرارتِ ایمانی کا پیدا کرنا صلوٰۃ کا مقصد ہے۔ان دونوں بنیادی مفاہیم اور ان کے ذیلی مفاہیم کو ذہن میں رکھیے تو صلوٰۃ کا جو اصل مطلوب ومقصود ہے' اس کی جو اصل حکمت اور اصل غرض وغایت ہے' وہ سامنے آئے گی۔یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبال نے بڑی خوبصورتی سے توجہ دلائی ہے کہ اگر یہ باطنی

کیفیات موجود نہ ہوں تو پھر نماز محض ایک رسم بن کر رہ جاتی ہے' اس میں رکوع وسجود تو ہوتا ہے لیکن توجہ اللہ کی طرف ہوتی ہی نہیں۔ وہ ایک جسمانی مشقت تو ہو جاتی ہے لیکن اس کا جو اصل حاصل ہے اس تک انسان کی رسائی نہیں ہوتی۔ علامہ کہتے ہیں: ؎

شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب! میرا سجود بھی حجاب!

اور: ؎

عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اوّلیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بت کدۂ تصورات

توجہ اور انابت الی اللہ کے بغیر فرض عبادات محض رسومات بن کر رہ جاتی ہیں۔ ان کی ادائیگی کی حیثیت رسم پرستی کی رہ جاتی ہے اور جو اصل حقائق و مقاصد ہیں وہ نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ جیسے علامہ نے کہا ہے: ؎

رہ گئی رسمِ اذاں روحِ بلالی نہ رہی
فلسفہ رہ گیا تلقینِ غزالی نہ رہی

البتہ یہ بات ذہن میں رکھیے کہ اس کیفیت میں بھی یہ نماز فائدے سے بالکل خالی نہیں ہے۔ ایک شخص نے اگر وقت صرف کیا ہے' وہ اپنے کاروبار اور مشغولیات سے نکلا ہے' اس نے وضو کیا ہے' پھر وہ نیت باندھ کر اللہ کے سامنے کھڑا ہو گیا ہے' تو اس نے جو جسمانی مشقت جھیلی ہے آخر اس کا اجر و ثواب تو اسے ملنا چاہیے۔ یہی وقت وہ کاروبار میں لگاتا' یا زندگی کی کسی اور مصروفیت و مشغولیت میں صرف کرتا تو اس سے وہ کوئی منفعت حاصل کرتا۔ لہٰذا یہ ممکن نہیں ہے کہ اس کا کوئی اجر و ثواب نہ ہو۔ اجر و ثواب تو ملے گا۔ فرض کی ادائیگی فی نفسہٖ بہت بڑی بات ہے کہ اس نے اللہ کے ایک حکم پر عمل کیا ہے' امتثال امر بجا لایا ہے' لیکن نماز کے جو اصل مقاصد ہیں وہ اُس وقت تک حاصل نہیں ہوں گے جب تک کہ وہ توجہ' انابت' خشوع و خضوع اور وہ حضوریٔ قلب کی کیفیت نہ ہو جو مطلوب ہے۔ علامہ اقبال اس کے متعلق جذبات سے مغلوب ہو کر کہتے ہیں: ؎

تیرا امام بے حضور' تیری نماز بے سرور
ایسی نماز سے گزر' ایسے امام سے گزر

صلوٰۃ کا ظاہری نظام

اس صلوٰۃ کا ایک ظاہری نظام ہے۔ اس کی معین ہیئات ہیں' حرکات وسکنات ہیں۔ اس میں تکبیر تحریمہ ہے' ہاتھوں کا اٹھانا ہے' اس میں قیام اور رکوع ہے' پھر قومہ ہے' پھر سجدہ ہے' پھر جلسہ ہے' پھر دوسرا سجدہ ہے۔ اس طرح ایک رکعت کی تکمیل ہوتی ہے۔ اس کے مقررہ اوقات ہیں' از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا ﴿۱۰۳﴾﴾ (النساء) پھر اس میں تعدادِ رکعات کی تعیین ہے۔ مزید برآں نماز باجماعت کا نظام ہے۔ یہ پورا صلوٰۃ کا نظامِ ظاہری ہے۔ اس کے بارے میں اوّلاً تو یہ اصل الاصول ذہن نشین کر لیجیے کہ یہ سارے کا سارا منقول ہے' ماثور ہے' مسنون ہے محمدٌ رسول اللہ ﷺ سے۔ اس کی اصل بنیاد میرا' آپ کا یا کسی اور کا اجتہاد نہیں ہے۔ شخصی اجتہاد پر معاملہ لے آئیں گے تو سب کی نماز علیحدہ علیحدہ ہو جائے گی' یکسانی اور یک رنگی نہیں رہے گی۔ لہٰذا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((صَلُّوْا كَمَا رَاَيْتُمُوْنِيْ اُصَلِّيْ)) (۱) ''صلوٰۃ ایسے ادا کرو (نماز ایسے پڑھو) جیسے مجھے دیکھتے ہو کہ میں پڑھتا ہوں''۔

اس صلوٰۃ کے ظاہری نظام کے بارے میں یہ بات بھی جان لیجیے کہ اس میں ہمیں عجیب حکمت یہ نظر آتی ہے کہ اس کے ذریعے سے اسلامی معاشرے میں اجتماعی سطح پر تطہیر وتنظیم کا ایک نہایت اعلیٰ نظام قائم کیا گیا ہے۔ اجتماعی طور پر نماز ادا ہو رہی ہے' ہر روز ایک ہی وقت میں دن میں پانچ مرتبہ مسلمان مساجد میں جمع ہو رہے ہیں۔ اجتماعی ماحول اس کے لیے جزوِ لازم بن گیا ہے۔ پھر اس میں تنظیم کا معاملہ مستقل طور پر ہو رہا ہے۔ محلّہ دار تنظیم بھی ہے۔ جمعہ کے دن اس سے بھی بڑی تنظیم ہے۔ عیدین کے موقع پر بڑے بڑے شہروں میں تنظیم ہے۔ حج کے موقع پر پورے کرۂ ارضی سے وہ لوگ جوق در جوق جمع ہو رہے ہیں جو توحید کے ماننے والے ہیں اور جو محمدٌ رسول اللہ ﷺ کے کلمہ گو ہیں۔ اس طرح مسلمانانِ عالم کا عالمی اجتماع اور عالمی تنظیم کا مظاہرہ ہو رہا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ اس نظامِ صلوٰۃ میں اجتماعی تطہیر وتنظیم بھی پیشِ نظر ہے۔

نظامِ صلوٰۃ میں محافظت ومداومت کی اہمیت

نظامِ صلوٰۃ کے متعلق یہ بات جان لیجیے کہ اس میں اہم ترین چیز محافظت اور مداومت ہے۔ اس نظام کو مستقل قائم ودائم رکھنا ہے۔ یہ نہیں کہ جب چاہا نماز ادا کر لی اور جب چاہا گول کر دی۔ یا جب جی

(۱) صحیح البخاری' کتاب الاذان' باب الاذان للمسافر اذا کانوا جماعة والاقامة وكذلك۔

چاہا نماز تو پڑھ لی لیکن اوقات کی پابندی نہیں کی گئی‘ یا بلا کسی عذر اور مجبوری کے گھر میں ہی ادا کر لی‘ مسجد میں حاضر نہیں ہوئے؟ تو یہ طرزِ عمل اقامتِ صلوٰۃ کے تقاضوں کے منافی ہے‘ اس طرح اس کی اجتماعی مصلحتیں اور حکمتیں بالکل ضائع ہو جائیں گی۔ چنانچہ اس کے لیے ’’محافظت‘‘ اور ’’مداومت‘‘ لازمی ہے۔ میں نے یہ دونوں الفاظ اسی سبق سے لیے ہیں۔ سورۃ المؤمنون اور سورۃ المعارج میں صلوٰۃ کے لیے جو آخری بات آئی ہے وہ محافظت ہے۔ سورۃ المؤمنون میں فرمایا: ﴿وَالَّذِیۡنَ هُمۡ عَلٰی صَلَوٰتِهِمۡ یُحَافِظُوۡنَ ۝۹﴾ اور سورۃ المعارج میں فرمایا: ﴿وَالَّذِیۡنَ هُمۡ عَلٰی صَلَاتِهِمۡ یُحَافِظُوۡنَ ۝۳۴﴾ یعنی وہ لوگ جو اپنی نمازوں کی محافظت کرتے ہیں‘ اس کا پورا اہتمام کرتے ہیں‘ اس کے تمام قواعد و ضوابط اور اس کے تمام آداب کی پابندی ملحوظ رکھتے ہیں۔ نیز سورۃ المعارج میں فرمایا: ﴿الَّذِیۡنَ هُمۡ عَلٰی صَلَاتِهِمۡ دَآئِمُوۡنَ ۝۲۳﴾ ’’وہ لوگ جو اپنی نمازوں میں مداومت (یعنی ہمیشگی اور پابندی) کرتے ہیں‘‘۔ لہٰذا صلوٰۃ کے نظامِ ظاہری کے ساتھ اقامت‘ محافظت اور مداومت‘ ان تین الفاظ کو اپنے ذہن میں محفوظ کر لیجیے۔

صلوٰۃ کی روحِ باطنی

آگے چلیے۔ صلوٰۃ کی ایک روحِ باطنی ہے۔ اس کے لیے لفظ ’’خشوع‘‘ آیا ہے: ﴿قَدۡ اَفۡلَحَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ۝۱ الَّذِیۡنَ هُمۡ فِیۡ صَلَاتِهِمۡ خٰشِعُوۡنَ ۝۲﴾ ’’فلاح سے ہمکنار ہوئے وہ اہلِ ایمان جو اپنی نمازوں میں خشوع اختیار کرتے ہیں‘‘۔ یہاں خشوع سے اصلاً مراد ہے انسان کی معنوی شخصیت کا اپنے ربّ کے حضور میں جھک جانا۔ ظاہری طور پر تو جسم جھک ہی رہا ہے۔ آپ کھڑے ہوتے ہیں تو اس انداز سے جس میں جھکاؤ ہوتا ہے‘ سینہ تان کر کھڑے نہیں ہوتے۔ پھر رکوع کرتے ہیں تو مزید جھکاؤ ہو گیا ہے۔ پھر جب سجدے میں گئے تو جھکاؤ کی انتہا ہو گئی۔ لیکن اگر صرف ظاہری طور پر جسم جھک رہا ہو‘ اور جو معنوی شخصیت ہے اور اندر کا انسان ہے اگر اس کی گردن اکڑی ہوئی ہو‘ وہ اللہ کے سامنے معنوی طور پر سرنگوں اور Surrender نہ ہو رہا ہو‘ انسان کا نفسِ امّارہ سرکشی اور تمرّد پر تلا ہوا ہو‘ وہ اللہ کے سامنے نہ جھک رہا ہو تو ظاہری نماز تو ادا ہو گئی‘ لیکن جو حقیقی نماز ہے وہ ادا نہیں ہو گی۔ اسی لیے اس سبق میں خشوع کی طرف بھی توجہ دلا دی گئی۔

خشوع و خضوع اور حضورِ قلب وہ باطنی کیفیات ہیں جو مطلوب ہیں‘ اور اقامت‘ محافظت اور

مداومت یہ وہ چیزیں ہیں جو نظامِ صلوٰۃ کے ظاہر کے ساتھ منسلک ہیں۔ اس ظاہر کے ساتھ اسلامی معاشرے کی اجتماعی مصلحتیں وابستہ ہیں اور اس باطنی کیفیات کے ساتھ ایک بندۂ مؤمن کی اپنی ذاتی سیرت وکردار کی تعمیر اور اس کے ترفع کا مسئلہ متعلق و وابستہ ہے۔ ان دونوں کے امتزاج سے نماز سے وہ اصل اور حقیقی برکات ظاہر ہوتی ہیں جن کا ذکر سورۃ العنکبوت کی آیت ۴۵ کے درمیان میں فرمایا گیا ہے: ﴿اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنۡهٰی عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَالۡمُنۡكَرِ ؕ وَلَذِكۡرُ اللّٰهِ اَكۡبَرُ ؕ﴾ ''بے شک نماز روکتی ہے بے حیائی اور بری بات سے' اور یقیناً اللہ کی یاد ہی سب سے بڑی (اعلیٰ اور ارفع) بات ہے''۔ لیکن اگر اس کے برعکس معاملہ ہوگا تو صلوٰۃ کی ادائیگی کے باوجود معاشرہ ان برکات سے محروم رہے گا۔

صلوٰۃ کی پابندی: ایمان کا تقاضا

ایک بات اور جان لیجیے کہ نمازوں میں ایک تو فرض نمازیں ہیں اور بقیہ نوافل وسنن ہیں۔ فرض نمازیں تو لازم ہیں' ان کو ہر صورت میں ادا کرنا ہے۔ البتہ ان کی ادائیگی کے لیے خود شریعت ہی نے چند رعایتیں دے رکھی ہیں۔ مثلاً کوئی عذر ہے تو آپ مسجد میں نہ جائیں' نماز گھر میں ادا کر لیں۔ فرض کیجیے آپ بیمار ہیں تو گھر میں پڑھ لیں' اس سے بھی زیادہ معذور ہیں تو لیٹ کر پڑھ لیں' جس میں قیام' رکوع' قومہ' سجدہ' جلسہ اور قاعدہ کے لیے اشارات کفایت کریں گے۔ ایسی رعایتیں خود شریعت نے فراہم کر دی ہیں۔ لیکن جہاں تک فرض نماز کا قصداً ضائع کر دینا ہے تو اس کے بارے میں جان لیجیے کہ یہ گویا حقیقی وقلبی ایمان کا ضائع کر دینا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے سورۃ المعارج میں دیکھا کہ وہاں اُس مقام پر لفظ ''اَلۡمُصَلِّیۡنَ'' لایا گیا ہے جس مقام پر سورۃ المؤمنون میں ''اَلۡمُؤۡمِنُوۡنَ'' کا لفظ آیا ہے: ﴿قَدۡ اَفۡلَحَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ۙ﴿۱﴾ الَّذِیۡنَ هُمۡ فِیۡ صَلَاتِهِمۡ خٰشِعُوۡنَ ۙ﴿۲﴾﴾ اور سورۃ المعارج میں فرمایا: ﴿اِلَّا الۡمُصَلِّیۡنَ ﴿ۙ۲۲﴾ الَّذِیۡنَ هُمۡ عَلٰی صَلَاتِهِمۡ دَآئِمُوۡنَ ﴿۪ۙ۲۳﴾﴾ بہر حال اس گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ تعمیر سیرتِ انسانی کے قرآنی پروگرام کا مرکز و محور' اس کا نقطۂ آغاز اور اس کی آخری منزل' یہ سب صلوٰۃ پر مبنی ہیں۔

انسان کی سیرت وکردار کی تعمیر کے ضمن میں جو اساسی پروگرام قرآن حکیم ہمیں دیتا ہے' اس کے جزوِ اوّل کے بارے میں' جو اس لائحۂ عمل کا اہم ترین جزو ہے' ہم نے سورۃ المؤمنون اور سورۃ المعارج کی آیات میں یہ دیکھا کہ دونوں جگہ کامل مطابقت ہے' کہ دونوں مقامات پر اوّلاً بھی صلوٰۃ کا ذکر آیا اور اختتام بھی صلوٰۃ پر ہوا۔ پھر یہ کہ دونوں مقامات پر صلوٰۃ کی محافظت پر بہت زیادہ زور دیا گیا۔ سورۃ

المؤمنون میں خشوع وخضوع کی طرف توجہ دلائی گئی اور سورۃ المعارج میں مداومت کی طرف متوجہ کیا گیا۔ ان تمام چیزوں کو جمع کر لیا جائے تو اس سے اقامتِ صلوٰۃ کی اصطلاح وجود میں آتی ہے۔ چنانچہ ہم بعد کی سورتوں میں قرآن حکیم میں اسی اصطلاح کو دیکھتے ہیں' مثلاً: ''اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ'' اور ''وَالَّذِیۡنَ یُقِیۡمُوۡنَ الصَّلٰوۃَ''۔

اس پروگرام کے دوسرے اور تیسرے اجزاء (اعراض عن اللّغو اور زکوٰۃ) کے ضمن میں ہمیں دو باتیں نظر آتی ہیں جن کا دونوں سورتوں میں تذکرہ ہو رہا ہے۔ ان میں ایک تو ترتیب عکسی ہے' یعنی سورۃ المؤمنون میں پہلے اعراض عن اللّغو کا ذکر ہے اور بعد میں زکوٰۃ اور تزکیہ کا' جبکہ سورۃ المعارج میں پہلے زکوٰۃ اور تزکیہ کا ذکر ہے اور پھر ایمان بالآخرۃ اور ایمان بالقیامہ کا' جس کا اعراض عن اللّغو سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ پھر ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ان دونوں اوصاف کے بیان میں دونوں مقامات پر تعبیر کے لیے جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں وہ قدرے مختلف ہیں اور ان سے ہمیں ان دونوں کی اصل حقیقت اور اصل روح کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

لغو کاموں سے پرہیز

ہم اِس وقت سورۃ المؤمنون کی ابتدائی آیات کی ترتیب کے مطابق گفتگو کریں گے۔ اس میں **مُفۡلِحِین** کا جو دوسرا وصف آیا ہے وہ ''اِعراض عَنِ اللَّغو'' ہے۔ لغو کا مفہوم معصیت یا گناہ نہیں ہے' بلکہ وہ کام مراد ہے جو خواہ فی نفسہٖ مباح ہو' اس کی شریعت میں ممانعت نہ ہو' لیکن انسان کو اس کا کوئی فائدہ نہ پہنچتا ہو۔ قرآن مجید انسان کے وقت کی قدر و قیمت کے معاملہ پر بہت زور دیتا ہے اور اس کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے کہ یہی انسان کا اصل سرمایہ اور رأس المال ہے۔ اس ''وقت'' ہی سے انسان کو بنانا ہے جو کچھ بھی بنانا ہے اور اس ''وقت'' ہی میں بننا ہے جو کچھ بھی بننا ہے۔ لہٰذا اس وقت کی قدر و قیمت کا احساس ہونا چاہیے۔ یہ وقت یا تو کسی حقیقی دُنیوی ضرورت کو پورا کرنے میں صرف ہو' یا اس کے ذریعے سے آخرت کے لیے کوئی کمائی کی جائے۔ ہر وہ کام جس سے نہ تو کوئی دُنیوی ضرورت حاصل ہو رہی ہو اور نہ اس کے ذریعے انسان آخرت کے لیے کوئی کمائی کر رہا ہو تو ایسا کام ''لغو'' شمار ہوگا' خواہ وہ ممنوعات کی فہرست میں شامل نہ ہو' وہ حرام و ناجائز نہ ہو' وہ معصیت اور گناہ نہ ہو۔ اس حقیقت کو نبی اکرم ﷺ نے بایں الفاظ بیان فرمایا:

((مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهُ مَا لَا يَعْنِيهِ))

یعنی انسان کے دین اور اسلام کے حسن وخوبی میں یہ چیز بھی شامل ہے کہ وہ ہر اُس چیز کو ترک کر دے جو لایعنی ہو' جس کا اسے کوئی فائدہ نہ پہنچ رہا ہو۔ تو ہر لایعنی اور غیر مفید کام کو چھوڑ دینا ''اعراض عن اللّغو'' ہے۔

اب آپ غور کیجیے کہ اصل میں اس کا گہرا تعلق ہمارے تصورِ حیات سے ہے۔ اگر کوئی شخص دنیا کی زندگی کے متعلق یہ سمجھتا ہے کہ بس یہی کُل زندگی ہے' کوئی بعثِ بعد الموت اور آخرت نہیں' کوئی جزا وسزا نہیں' پھر تو ظاہر بات ہے کہ اپنی معاشی ضروریات سے جو وقت بھی بچ رہا ہوگا وہ اس کا کوئی مصرف تلاش کرے گا کہ کوئی hobby اور مشغلہ ہو' کوئی amusement اور تفریح ہو' وقت گزاری (to pass time) کے لیے کوئی شغل ہو۔ لیکن اُس شخص کا معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے جسے اس بات کا یقین ہے کہ دراصل اس دنیا کی زندگی تو ایک دیباچہ اور مقدمہ ہے' اصل کتابِ زندگی تو موت کے بعد کھلے گی: ﴿وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۷ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴾ (العنکبوت) ''اصل گھر تو آخرت کا گھر ہے (زندگی تو آخرت کی زندگی ہے)' کاش انہیں معلوم ہوتا!'' نبی اکرم ﷺ کی بڑی پیاری حدیث ہے جس میں آپ ﷺ نے وہ نتیجہ بیان فرما دیا جو اس حقیقت کے انکشاف سے برآمد ہوتا ہے۔ فرمایا الصادق والمصدوق ﷺ نے: ((اَلدُّنْيَا مَزْرَعَةُ الْآخِرَةِ)) ''دنیا آخرت کی کھیتی ہے''۔ یہاں بوؤ گے تو وہاں کاٹو گے۔ ظاہر بات ہے کہ دنیا کے بارے میں یہ حقیقت منکشف ہونے کے بعد اب اس دنیا کی زندگی کا ایک ایک لمحہ قیمتی ہو گیا۔ ہمیں اس میں بونا ہے تاکہ اسے ہم آخرت میں کاٹ سکیں۔ لہٰذا جس کے دل میں یہ ایمان بالآخرۃ ہوگا وہ اپنے وقت کی جس طرح قدر و قیمت کا احساس کرے گا ایسا اُس شخص کا معاملہ نہیں ہو سکتا جو آخرت پر یقین نہیں رکھتا۔

سورۃ العصر جہاں سے ہمارے اس سلسلۂ درس کا آغاز ہوا' اس میں ہم نے جو پہلے لفظ پڑھا وہ ہے: ﴿وَالْعَصْرِ ﴾ ''زمانہ کی قسم ہے''۔ یہ زمانہ تیزی سے گزرا جا رہا ہے۔ یہی تمہارا راُس المال ہے۔ اس کے بارے میں ایک مفسر نے بڑی عبرت انگیز مثال پیش کی ہے کہ برف کا ایک تاجر چلاّ تا ہے کہ لوگو! رحم کرو! اگر میرا یہ برف فروخت نہ ہوا تو میرا جو راُس المال ہے وہ پگھل جائے گا۔ میں یہ بات ہنری ورڈز ورتھ کی ایک نظم ''Psalm of life'' کے حوالے سے بیان کیا کرتا ہوں جس میں شاعر نے اس حقیقت کی بڑی خوبصورتی سے عکاسی کی ہے:

Art is long and time is fleeting
And our hearts though stout and brave
Still, like muffled drums are beating
Funeral marches to the grave

اس وقت کی قدر کرو' یہ بڑی تیزی سے گزر رہا ہے۔ اور جس طرح کسی اہم فوجی شخصیت کا جنازہ ڈھول کی ہر ضرب کے ساتھ قبر سے نزدیک تر ہوتا جاتا ہے اسی طرح ہمارے دل کی ہر دھڑکن گویا ہمیں ہماری قبر سے قریب تر کر رہی ہے۔

یہ احساس اگر سامنے ہو تو معلوم ہوگا کہ وقت کی کیا قدر و قیمت ہے! لہٰذا یہاں تعمیر سیرت کے ذیل میں جو دوسرا وصف بیان ہوا وہ ہے ''اِعراض عن اللّغو'' اور اس پر سورۃ المعارج کے ان الفاظ سے روشنی پڑی: ﴿وَالَّذِيْنَ يُصَدِّقُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ﴿٢٦﴾﴾ ''وہ لوگ جو روزِ جزا کی تصدیق کرتے ہیں''۔ قیامت کے دن کو مانتے ہیں: ﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ ﴿٢٧﴾﴾ ''اور وہ لوگ جو اپنے ربّ کے عذاب (کے خیال) سے لرزاں و ترساں رہتے ہیں''۔ اور واقعہ یہ ہے کہ: ﴿اِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَاْمُوْنٍ ﴿٢٨﴾﴾ ''بے شک ان کے ربّ کا عذاب چیز ہی ایسی ہے جس سے بے خوف (اور نچنت) ہوا ہی نہیں جا سکتا''۔

زکوٰۃ پر کاربند رہنا

تیسرا وصف سورۃ المؤمنون میں یہ بیان ہوا: ﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ﴿٤﴾﴾ ''اور وہ لوگ جو زکوٰۃ پر کاربند رہتے ہیں''۔ میں نے پہلے بھی توجہ دلائی تھی کہ جب قرآن مجید میں زکوٰۃ کا ایک اصطلاح کے طور پر ذکر ہوتا ہے تو اس کے ساتھ فعل اِیْتَا آتا ہے' مثلاً اِيْتَاءِ الزَّكٰوةِ' يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ' اٰتَى الزَّكٰوةَ' اٰتُوا الزَّكٰوةَ. لیکن یہاں اسلوب مختلف ہے۔ یہاں فرمایا گیا: ﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ﴿٤﴾﴾۔ اس میں ایک تو دراصل زکوٰۃ کی بنیادی حقیقت کی طرف توجہ دلائی گئی اور دوسرے یہ کہ ''فَاعِلُوْنَ'' فرما کر اس بات کو واضح کیا گیا کہ وہ لوگ یہ عمل مسلسل کرتے رہتے ہیں۔

یہاں اس بات کو جان لیجیے کہ زکوٰۃ کا اصل مفہوم اور اس کی بنیادی حقیقت کیا ہے! جیسے ''ف ل ح'' کے مادے سے ہم نے فلح کا مفہوم سمجھا تھا ایسے ہی ''ز ک ی'' کے حوالے سے ہمیں اس کا اصل مفہوم سمجھنا ہوگا۔ اسے آپ ایک مالی کے عمل پر قیاس کر کے بخوبی سمجھ سکیں گے جس نے ایک باغیچہ لگایا ہے' جس میں کچھ پودے اُس نے خود لگائے ہیں جو پھل دار ہیں' یا پھول دار ہیں۔ لیکن اسی باغیچے میں

خود رَو گھاس اور کچھ جھاڑ جھنکاڑ بھی اپنے آپ اُگ آتا ہے اور یہ خود رَو گھاس یا جھاڑ جھنکاڑ اِن پودوں کی نشوونما میں رکاوٹ بنتا ہے۔ زمین میں جتنی قوتِ نمو ہے اسے اگر یہ خود رَو گھاس اور جھاڑ جھنکاڑ نہ کھینچ رہے ہوں تو یہ ساری قوتِ نمو اُن پودوں کو ملے گی جو اس مالی نے خود لگائے ہیں' ورنہ یہ گھاس اور جھاڑ جھنکاڑ بھی اس میں سے اپنا حصہ وصول کریں گے۔ اسی طرح ہوسکتا ہے کہ یہ خود رَو چیزیں ان پودوں کے لیے ہوا کی آکسیجن اور سورج کی تمازت حاصل کرنے سے رکاوٹ بن رہی ہوں۔ لہٰذا مالی اپنے کھرپے کے ذریعے سے' جو ہر وقت اس کے ہاتھ میں ہوتا ہے' اس باغیچہ کے اندر سے تمام خود رَو گھاس اور جھاڑ جھنکاڑ کو علیحدہ کر دے گا۔ مالی کا یہ عمل ''تزکیہ'' ہے۔ چنانچہ اس کا اصل مفہوم یہ ہوا کہ کسی شے کی نشوونما میں جو رکاوٹ ہو اس کو دور کر دینا تزکیہ ہے۔

اب اس بات کو جان لیجیے کہ ہر انسان' ہر فردِ نوعِ بشر اللہ تعالیٰ کی کیاری کا ایک پودا ہے جو اُس نے لگایا ہے۔ چنانچہ اللہ چاہتا ہے کہ یہ پروان چڑھے' پھلے پھولے' اس میں جو استعدادات اللہ نے ودیعت کی ہیں وہ پورے طور پر بروئے کار آئیں اور نشوونما پائیں۔ اس طرح انسان اپنے اس اصل مقام کو حاصل کرلے جس کے لیے اللہ نے اسے بالقوۃ (potentially) تخلیق فرمایا ہے۔ لیکن کچھ چیزیں اس کی اس نشوونما میں رکاوٹ بنتی ہیں۔ ''ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں'' کے مصداق ان تمام چیزوں کو جمع کریں گے تو وہ ہے دنیا کی محبت۔ چنانچہ آپ قرآن مجید میں بار بار دیکھیں گے کہ جہاں انسان کی گمراہی اور بے راہ روی کے اصل سبب کی تشخیص ہوتی ہے وہاں عموماً یہ بات آئے گی: ﴿بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ۝﴾ (الاعلیٰ) ''بلکہ تم دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو' حالانکہ آخرت بہتر بھی ہے اور باقی رہنے والی بھی''۔ کہیں فرمایا جاتا ہے: ﴿كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ ۝ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ ۝﴾ ''ہرگز نہیں' اصل بات یہ ہے کہ تم عاجلہ (دنیا کی زندگی) سے محبت کرتے ہو' اور آخرت کو چھوڑ دیتے ہو''۔ ہم سورۃ القیامۃ کے درس میں ان آیات کا مطالعہ کر چکے ہیں کہ تمہاری گمراہی کا اصل سبب یہ ہے کہ تمہارے دل حبِّ عاجلہ میں گرفتار ہوگئے ہیں اور تم آخرت کو نظر انداز کرتے ہو۔ اور عاجلہ سے مراد یہ دنیا ہے۔

اب ذرا ایک قدم اور آگے آئیے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اس حبِّ دُنیا کا سب سے بڑا نشان' اس کی سب سے بڑی علامت (symbol) حبِّ مال ہے۔ سورۃ الفجر میں فرمایا: ﴿وَتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ۝﴾ ''اور تم مال سے محبت کرتے ہو جی بھر کر''۔ تم پر اسے جمع کرنے کی دُھن سوار

رہتی ہے۔اور سورۃ الھمزۃ میں فرمایا:﴿اَلَّذِیْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ ۝۲ یَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗۤ اَخْلَدَهٗ ۝۳﴾ ''(تباہی ہے اُس شخص کے لیے) جس نے مال جمع کیا اور اسے گن گن کر رکھا۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال اسے دوام بخشے گا''۔ پس یہ مال کی محبت ہی انسان کے اخلاقی ارتقاء اور اس کی اعلیٰ اقدار کی نشوونما میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ جس رُخ پر اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ انسان کی شخصیت ترقی اور نشوونما پائے' اس کا ارتقاء ہو' اس کی تعمیر ہو' اس کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ یہی مال کی محبت ہے۔ لہٰذا اس مال کی محبت کو دل سے کھرچنے کے لیے نسخہ انفاقِ مال ہے' یعنی مال کا اللہ کی خوشنودی اور رضا کے حصول کے لیے خرچ کرنا۔ وہ خیرات وصدقات کی صورت میں محتاجوں' مسکینوں' یتیموں' بیواؤں کی مدد میں صرف ہو رہا ہو۔ وہ قرابت داروں کا حق ادا کرنے میں صرف ہو رہا ہو۔ وہ اللہ تعالیٰ کے دین کی خدمت میں صرف ہو رہا ہو۔ وہ پیغامِ الٰہی کی نشر واشاعت کے لیے صرف ہو رہا ہو۔ وہ دین کی سربلندی اور غلبہ کے لیے اور اس کے جو تقاضے ہیں ان کو پورا کرنے کے لیے صرف ہو رہا ہو۔ یہ ہے اصل میں ''عملِ تزکیہ''۔ یہ کرتے رہو گے تو دل سے مال کی محبت ختم ہو گی' جو اصلاً علامت ہے حبِّ دنیا کی۔ اور حبِّ دنیا کا یہ بریک (brake) اگر کھل گیا' اس کی گرفت ختم ہو گئی تو اب تمہاری گاڑی پوری رفتار کے ساتھ اس شاہراہ پر چلے گی جس پر چل کر تم تعمیر ذات' تعمیر خودی' تعمیر شخصیت اور تعمیر سیرت وکردار کے باب میں ترقی کر سکو گے۔

اب اس ارتقاء وترقی کے لیے قرآن مجید نے ایک دوگونہ پروگرام بتایا ہے۔ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ صلوٰۃ میں وہ نماز بھی شامل ہے جو فرض ہے' جس کو آپ نے ہر حالت میں ادا کرنا ہے' جس کے لیے روزانہ پانچ فرض نمازوں کا نظام موجود ہے' اور اس کے ساتھ ہی نفل نمازیں بھی صلوٰۃ کے زمرے میں شامل ہیں۔ اسی طرح اس زکوٰۃ کے عمل کے بھی دو اجزاء کر دیے گئے۔ ایک ''زکوٰۃ'' تو لازم اور فرض ہو گئی اور اس کے لیے ایک خاص حد معین کر دی گئی ہے جسے ''نصاب'' کہا جاتا ہے۔ یعنی مالی حیثیت سے اس سے زائد جو بھی ہے اس پر شرحِ نصاب کے مطابق لازماً رقم لے لی جائے گی۔ اس کی ادائیگی فرض ہے۔ اس کو اصطلاحاً زکوٰۃ کہا جاتا ہے۔

لیکن عملِ تزکیہ تو دائم ہے۔ اس میں صرف زکوٰۃ مفروضہ ہی نہیں' بلکہ اس سے آگے بڑھ کر مزید انفاقِ مال کی ترغیب ہے۔ جیسے ہم آیۂ بر میں پڑھ چکے ہیں:﴿وَاٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّهٖ ذَوِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ ۙ وَالسَّآئِلِیْنَ وَفِی الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَی الزَّکٰوةَ ۚ﴾

(البقرۃ:۱۷۷) یہاں فرض زکوٰۃ کا علیحدہ سے ذکر ہے اور اس سے پہلے ذکر کیا گیا کہ ''اس نے مال محبوب ہونے کے باوجود اسے قرابت داروں' یتیموں' مساکین' سوال کرنے والوں اور گردنوں کے چھڑانے میں خرچ کیا''۔ لہٰذا مطلوب یہ ہے کہ زکوٰۃ کے علاوہ بھی اور دو' بڑھ چڑھ کر دو۔ اس کی جب آخری حد پوچھی گئی کہ حضورﷺ! کہاں تک دیں؟ تو قرآن مجید میں اس کی وضاحت فرمائی گئی: ﴿یَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ ۬ؕ قُلِ الْعَفْوَ ؕ﴾ (البقرۃ:۲۱۹) ''یہ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کتنا خرچ کریں! تو (اے نبیؐ!) ان سے کہیے جو بھی تمہاری ضرورت سے زائد ہے (اسے دے ڈالو)''۔ پھر مزید تشویق وترغیب کے لیے فرمایا: ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ؕ﴾ (آل عمران:۹۲) ''تم نیکی (کے بلند ترین مقام) تک نہیں پہنچ سکو گے جب تک کہ (اللہ کی راہ میں) اس چیز میں سے صرف نہ کرو جو تمہیں محبوب ہے''۔ اب یہ ہے وہ عملِ تزکیہ جس کی ترغیب وتاکید قرآن مجید میں بار بار آتی ہے۔ آخری پارے کی سورۃ الشّمس میں نفس انسانی کے بارے میں فرمایا گیا: ﴿وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝۷ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝۸ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝۹ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۝۱۰﴾ ''گواہ ہے یہ نفسِ انسانی اور جو اللہ نے اسے بنایا اور سنوارا (اور اس میں طرح طرح کی صلاحیتیں اور بہت سی استعدادات ودیعت فرمائیں)۔ پھر اس میں بدی اور نیکی کا شعور بھی الہامی طور پر پیدا فرما دیا۔ تو جس کسی نے اس کا تزکیہ کر لیا وہ کامیاب ہوا اور جس نے اسے خاک آلود کر دیا وہ ناکام ونامراد ہوا''۔ یہی بات ہم سورۃ الاعلیٰ میں دیکھتے ہیں: ﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰی ۝۱۴ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰی ۝۱۵﴾ ''کامیاب ہو گیا وہ شخص جس نے تزکیہ حاصل کر لیا اور اس نے اپنے ربّ کے نام کا ذکر کیا اور نماز ادا کی''۔ سورۃ الاعلیٰ کی یہ دو آیتیں سورۃ المؤمنون کی ان آیات سے بہت مشابہ ہیں: ﴿قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝۱ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۝۲ وَالَّذِیْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۝۳ وَالَّذِیْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ۝۴﴾

تو یہ تھے تعمیر سیرت کے قرآنی پروگرام کے دوسرے اور تیسرے اجزاء' یعنی ایک ''اِعراض عَنِ اللّغو'' جس کا براہِ راست تعلق ایمان بالآخرۃ اور ایمان بالقیامۃ سے ہے' اور دوسرے تزکیہ پر مسلسل عمل پیرا رہنا۔ اسی کے لیے سورۃ المعارج میں یہ الفاظ آئے: ﴿وَالَّذِیْنَ فِیْۤ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ۝۲۴ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۝۲۵﴾ ''اور وہ لوگ کہ جن کے اموال میں حق ہے' جو جانا پہچانا ہے' سائل کے لیے بھی اور محروم کے لیے بھی''۔

جنسی جذبہ پر قابو رکھنا

اب ہم سورۃ المؤمنون کی آیات ۵ تا ۷ پر اپنی توجہ مرکوز کرتے ہیں۔ یہ تینوں آیات بعینہٖ انہی الفاظ میں سورۃ المعارج (آیات ۲۹ تا ۳۱) میں بھی وارد ہوئی ہیں۔

﴿وَالَّذِیۡنَ ھُمۡ لِفُرُوۡجِھِمۡ حٰفِظُوۡنَ ﴿۵﴾ اِلَّا عَلٰۤی اَزۡوَاجِھِمۡ اَوۡ مَا مَلَکَتۡ اَیۡمَانُھُمۡ فَاِنَّھُمۡ غَیۡرُ مَلُوۡمِیۡنَ ﴿۶﴾ فَمَنِ ابۡتَغٰی وَرَآءَ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الۡعٰدُوۡنَ ﴿۷﴾﴾

''اور وہ لوگ جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں۔سوائے اپنی بیویوں اور باندیوں کے، پس (ان کے معاملہ میں) ان پر کوئی ملامت نہیں۔ پھر جو کوئی اس سے تجاوز کرے گا تو وہی ہیں حد سے بڑھنے والے''۔

تعمیر سیرت کے جس قرآنی پروگرام کا ہم سورۃ المؤمنون کی ابتدائی گیارہ آیات اور سورۃ المعارج کی آیات ۱۹ تا ۳۵ کے حوالہ سے مطالعہ کر رہے ہیں اس میں چوتھا وصف یا اس کا چوتھا جزو جنسی جذبہ پر قابو رکھنا ہے۔ یہ بات اپنی جگہ اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ انسان میں جو مختلف قسم کے حیوانی میلانات اور داعیات ہیں ان میں سے ایک اہم میلان جنسی جذبہ بھی ہے۔ انسان کا پیٹ کھانے کو مانگتا ہے' اس سے اس کی اپنی زندگی کا تسلسل وابستہ ہے۔اسی طرح تمام حیوانات میں اپنے نسلی تسلسل کو برقرار رکھنے کے لیے فاطر فطرت نے جنسی جذبہ ودیعت کیا ہے۔اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ دورِ جدید کے ایک بہت بڑے ماہر نفسیات فرائڈ نے جنسی جذبہ کو انسان کے محرکاتِ عمل میں سب سے زیادہ قوی جذبہ قرار دیا ہے۔ ہم اگرچہ اس کو تسلیم نہیں کرتے' ہمارے نزدیک یہ اس کا مغالطہ ہے' اس کی نگاہ میں ایک چیز بہت زیادہ اہمیت اختیار کر گئی ہے۔اور انسانی فکر کا یہ خاصہ ہے کہ بسا اوقات کوئی ایک چیز انسان کے ذہن پر اس طرح مسلط ہو جاتی ہے کہ باقی تمام چیزیں اسے اس کے تابع نظر آنے لگتی ہیں۔ یہی معاملہ فرائڈ کے ساتھ بھی ہوا ہے۔لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنی جگہ پر جنسی داعیہ ایک بہت بڑا محرک اور نہایت قوی جذبہ ہے۔

اس ضمن میں اگر ہم تاریخ انسانی کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں انسانوں میں افراط و تفریط کی دو انتہائیں نظر آتی ہیں۔ایک طرف انسان نے اس جذبہ کو فی نفسہٖ شر قرار دیا کہ یہ ہے ہی سرتاسر برائی' یہ برائیوں کی ماں ہے۔اسی لیے ہمیں ایک بہت بڑے طبقہ میں یہ خیال ملے گا کہ جنسی جذبہ فی نفسہٖ شر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کئی مذاہب میں روحانی ترقی کا راستہ تجرد کی زندگی کے ذریعے سے اختیار کیا گیا کہ ساری عمر

شادی بیاہ نہ کیا جائے' گھر گرہستی کا کھکھیڑ نہ پالا جائے' اس لیے کہ یہ راستہ ہے ہی برائی کا' اس میں کوئی خیر ہے ہی نہیں۔ یہ رہبانیت کا نظریہ ہے جو دنیا میں مختلف علاقوں میں مختلف ناموں سے رائج رہا ہے۔

اس ضمن میں دوسری انتہا یہ ہوئی کہ اپنے اس جنسی جذبہ کی آزاد اور بے قید طریق سے تسکین کرنا' اس میں حلال وحرام کی کوئی تمیز نہ کرنا اور صحیح وغلط کے فرق وامتیاز کو ملحوظ نہ رکھنا جیسے خیالات کو روا رکھا گیا۔ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر نوعِ انسانی جن بہت بڑی بڑی گمراہیوں میں مبتلا ہوئی ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ یہ جذبہ pervert ہو کر' یعنی کج رو ہو کر فطرت کی جو ایک معین راہ ہے اس کی بجائے دوسرے راستے اختیار کرتا ہے۔ تو تاریخ انسانی میں یہ دو انتہائیں ہمیشہ موجود رہی ہیں۔

ان آیات میں قرآن مجید کا جو متوازن بیان ہمارے سامنے آتا ہے اس کے متعلق یہ بات اہم ہے کہ تین تین آیات دونوں مقامات پر (سورۃ المؤمنون اور سورۃ المعارج میں) اس شان سے وارد ہوئی ہیں کہ ایک شوشے تک کا فرق نہیں ہے' اور جیسا کہ ہم آخر میں دیکھیں گے کہ یہاں سات اوصاف زیرِ بحث آئے ہیں جن میں سے تین پہلے ہیں' تین بعد میں ہیں' مرکزی بحث یہی ہے۔ پھر اس مسئلہ پر دونوں مقامات پر تین تین آیات وقف کی گئی ہیں۔ تو اس سے اس مسئلہ کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

ان آیات میں ہمارے سامنے جو متوازن بات آتی ہے وہ یہ ہے کہ اگر قانونِ شریعت کے دائرہ میں رہ کر حلال پر اکتفا کرتے ہوئے ایک انسان اپنے فطری جذبہ کی تسکین حاصل کرتا ہے تو فرمایا گیا: ﴿فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ﴾ کہ اس میں کوئی ملامت کی بات نہیں ہے' اس میں فی نفسہٖ کوئی برائی نہیں ہے۔ بلکہ رسول اللہ ﷺ نے تو صاف طور پر فرمایا: ((لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْاِسْلَامِ)) ''اسلام میں رہبانیت بالکل نہیں ہے''۔ اس کے برعکس آپ ﷺ نے فرمایا: ((اَلنِّكَاحُ مِنْ سُنَّتِيْ)) نکاح کرنا (شادی بیاہ کرنا' گھر گرہستی کی زندگی اختیار کرنا) میرا طریقہ ہے''۔ یہ میری سنتوں میں سے ایک سنت ہے۔ لہٰذا تعمیر سیرت اور اخلاقی ترفع حاصل کرنے کے لیے ترکِ دنیا والی روش اسلام کی روش نہیں ہے' وہ محمدٌ رسول اللہ ﷺ کی سنت نہیں ہے۔ وہ آپ ﷺ کا طریقہ نہیں ہے۔

لیکن دوسری طرف اس کے لیے حد بندیاں کر دی گئیں۔ دوسرے ناجائز راستے بند کر کے نکاح کا جائز راستہ کھول دیا گیا کہ اس راستہ سے انسان اپنے جذبہ کی تسکین حاصل کرے۔ اس کے لیے حدیث میں یہاں تک فرمایا گیا کہ ایک بندۂ مؤمن کے لیے یہ عمل بھی عبادت کا ایک جزو بن جاتا ہے' جبکہ یہ فعل اس قاعدہ' اس ضابطہ اور قانون کے تابع رہ کر ہو رہا ہو جو اللہ نے اس کے لیے معین فرما دیا ہے۔

اسلام میں مِلک یمین کی حیثیت

ان آیات میں ضمنی طور پر ایک مسئلہ ایسا بھی سامنے آیا ہے جس کے بارے میں بہت سے سوالات ذہنوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ جنسی جذبہ کی تسکین کے لیے جو قانونی راہ ہے اس کو بیان کرتے ہوئے قرآن مجید دونوں مقامات پر ﴿اِلَّا عَلٰٓی اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُهُمْ﴾ کے الفاظ استعمال کر رہا ہے۔ یعنی بیویوں کا ذکر بھی ہے اور باندیوں یا لونڈیوں کا بھی۔ یہ معاملہ بہت پیچیدہ بھی ہے اور بڑا تفصیل طلب بھی۔ میں چاہتا ہوں کہ اس ضمن میں چند باتیں اچھی طرح ذہن نشین کر لی جائیں تو اِن شاء اللہ تمام اشکالات رفع ہو جائیں گے۔

پہلی بات یہ ہے کہ لونڈیوں یا غلاموں کا ادارہ (institution) اسلام کے اپنے نظام کا کوئی جزوِ لازم نہیں ہے۔ لونڈی یا غلام رکھنا فرائض میں سے ہے نہ واجبات میں سے۔

دوسری بات یہ کہ جس وقت قرآن مجید نازل ہوا اور محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی بعثتِ مبارکہ ہوئی تو معاشرے میں یہ ادارہ بالفعل موجود تھا' اور جیسے بہت سی دوسری چیزیں ایسی تھیں جو اصلاح طلب تھیں ویسے ہی یہ ادارہ بھی اصلاح طلب ادارہ کی حیثیت سے موجود تھا۔ جس طرح اسلام نے دوسری چیزوں میں اپنے اصلاحی پروگرام کو تدریجی طور پر آگے بڑھایا ایسے ہی اس معاملہ میں بھی اسلام نے بہت سی اصلاحات نافذ کیں اور نبی اکرم ﷺ نے ان کا اجراء فرمایا۔ سب سے پہلی اصلاح یہ ہوئی کہ یہ بات بار بار فرمائی گئی کہ یہ لونڈی غلام تمہارے ہی بھائی بند ہیں۔ یہ صرف ایک relationship ہے جو دنیا میں تمہارے اور اِن کے مابین قائم ہو گئی ہے' جیسے ایک آجر (employer) ہے اور ایک مستاجر (employee) ہے لیکن بحیثیت انسان دونوں برابر ہیں۔ پس اگر یہ اونچ نیچ کہیں چلی آ رہی ہے کہ کوئی آقا ہے اور کوئی غلام ہے تو بحیثیت انسان وہ مساوی ہیں۔ لہٰذا آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ جو کچھ تم خود کھاتے ہو اپنے غلاموں کو وہی کچھ کھلاؤ' اور جو کچھ تم خود پہنتے ہو وہی ان کو پہناؤ۔ ان کے ساتھ محبت' شفقت اور حسنِ سلوک رکھو۔ ایک طرف تو یہ اخلاقی تعلیم ہے جس کے ذریعہ سے ان کی تألیف قلبی کی گئی۔ یعنی وہ انسان جو گرے ہوئے تھے' دبے ہوئے تھے' پسے ہوئے تھے' نبی اکرم ﷺ نے ان کو اس حالت سے اٹھا کر آزاد انسانوں کے برابر لانے کی کوشش فرمائی۔ اس کی دشمن بھی گواہی دیتے ہیں۔ ایچ جی ویلز' جو رسول اللہ ﷺ سے بہت دشمنی رکھتا ہے' وہ بھی گواہی دیتا ہے کہ محمد (ﷺ) نے یہ پروگرام واقعتاً روبعمل لا کر دکھایا۔

تیسری بات یہ کہ اسلام نے ان کی آزادی کا ایک راستہ کھول دیا۔ چنانچہ قرآن مجید میں مکاتبت کا حکم آیا۔ یعنی اگر کوئی غلام اپنے آقا سے یہ معاہدہ کر لے کہ میں اتنی رقم (اپنی آزادی کی قیمت کے طور پر) تمہیں ادا کر دوں گا تو اس آقا کو از روئے شریعت پابند کیا گیا ہے کہ وہ اس غلام کے ساتھ معاہدہ کر لے۔ اب وہ غلام محنت کرے، کمائی کرے اور طے شدہ رقم اپنے آقا کو دے دے تو وہ آزاد ہو جائے گا۔ اس معاملے میں کوئی آقا انکار نہیں کر سکتا کہ میں تمہارے ساتھ یہ معاہدہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ ان کی آزادی کے لیے پہلی شکل یہ اختیار کی گئی۔ چنانچہ فرمایا گیا: ﴿وَالَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتٰبَ مِمَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوْهُمْ......﴾ (النور:۳۳) ''اور تمہارے مملوکوں میں سے جو مکاتبت کی درخواست کریں تو اُن سے مکاتبت کر لو......'' ﴿فَكَاتِبُوْهُمْ﴾ فعل امر ہے اور امر وجوب کے لیے بھی آتا ہے۔ پھر تمام مسلمانوں حتیٰ کہ ان کے آقاؤں کو بھی تلقین کی گئی کہ تم اس معاملے میں ان کے ساتھ تعاون کرو اور صدقہ و خیرات سے ان کی مدد کرو۔ چنانچہ اسی آیت میں جس میں مکاتبت کے لیے حکم آیا ہے، آگے چل کر فرمایا: ﴿وَاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اٰتٰىكُمْ ؕ﴾ ''اور دو اُن کو اللہ کے مال میں سے جو اُس نے تم کو دیا ہے''۔ یہاں یہ نکتہ بھی نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ انسان کے پاس جو مال ہے اس کی ملکیتِ حقیقی کی نسبت اللہ تعالیٰ اپنی طرف فرما رہا ہے۔ یہ دوسری شکل ہے جو قرآن مجید نے اختیار کی۔ اس طرح ان کی تالیفِ قلبی، ان کے رتبہ کی بلندی اور اُن کی آزادی کی راہ نکلی۔

پھر آپ کو یاد ہو گا کہ مطالعۂ قرآن حکیم کے اس منتخب نصاب کے دوسرے سبق میں ہم نے حقیقی نیکی کو سمجھنے کے لیے سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۷۷ کا مطالعہ کیا تھا، جسے میں ''آیت البر'' سے تعبیر کیا کرتا ہوں۔ وہاں گردن چھڑانے یعنی غلاموں کی آزادی کے عمل کو اعلیٰ ترین نیکی کے کاموں میں شمار کیا گیا ہے۔ پھر سورۃ التوبہ کی آیت ۶۰ میں صدقاتِ واجبہ یعنی زکوٰۃ کے مستحقین کی جو آٹھ مدّات مقرر فرمائی گئی ہیں ان میں بھی گردن چھڑانے یعنی غلاموں کی آزادی کے لیے زکوٰۃ سے رقم ادا کرنے کی مدّ بھی شامل ہے۔ مزید یہ کہ سورۃ البلد میں بڑے پیارے انداز میں غلاموں کو آزاد کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ فرمایا: ﴿فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ۝﴾ ''انسان گھاٹی کو عبور نہیں کر پایا اور تمہیں کیا معلوم کہ وہ گھاٹی کون سی ہے!'' اس گھاٹی کی جب تفصیل بیان کی گئی تو سب سے پہلے ذکر ہوا: ﴿فَكُّ رَقَبَةٍ ۝﴾ ''کسی گردن کو آزاد کرا دینا''۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دفترِ فضائل کا ایک درخشاں باب یہ بھی ہے کہ آپؓ نے غلاموں اور کنیزوں کے طبقے میں سے اسلام قبول

کرنے والے چھ مسلمانوں کو' جن میں حضرت بلال ؓ بھی شامل ہیں' ایک خطیر رقم دے کر خریدا اور اُن کو آزاد کیا۔ حضرت عثمان ذوالنورین ؓ خود فرماتے ہیں کہ میں جس روز سے ایمان لایا ہوں (اور اندازہ کیجیے کہ آپؓ سابقون الاوّلون میں سے ہیں' ایمان لانے والوں میں آپؓ کا چھٹا نمبر ہے) اس روز کے بعد سے کوئی جمعہ مجھ پر ایسا نہیں گزرا کہ میں نے ایک غلام آزاد نہ کیا ہو' اور اگر اتفاقاً کسی جمعہ کو میرے لیے یہ ممکن نہ ہوا تو اگلے جمعہ کو میں نے دو غلام آزاد کیے یا کرائے۔ پھر شریعت کے احکام کی بعض فروگزاشتوں کے کفارہ کے طور پر ایک غلام یا لونڈی کو آزاد کرنا یا کرانا قرار دیا گیا۔ تو یہ ہیں وہ تدابیر جو اسلام نے اس مسئلہ کی اصلاح کے لیے اختیار کیں۔

اس تیسری بات کے ضمن میں یہ بات بہت اہم ہے کہ اسلام نے اس بات کو سب سے بڑے گناہوں یعنی کبائر میں سے قرار دیا ہے کہ کسی آزاد انسان کو پکڑ کر غلام بنالیا جائے۔ اسلام میں صرف اُن لوگوں کو غلام اور لونڈی بنایا گیا ہے جو خالص قتال فی سبیل اللہ کے نتیجہ میں محاذ جنگ پر گرفتار ہوتے تھے۔ ان کو کبھی فدیہ لے کر' کبھی بطورِ احسان اور کبھی مسلمان قیدیوں کے تبادلہ میں رہا کر دیا جاتا تھا۔ اگر اُن میں سے کوئی صورت مصالح دینی کے لحاظ سے مناسب نہ ہوتو ان کو مسلمان معاشرہ میں تقسیم کر دیا جاتا تھا اور اسلام نے ان کے لیے حسن سلوک کی اعلیٰ اخلاقی تعلیمات دی ہیں۔

اِس وقت دنیا میں جو سب سے زیادہ متمدن اور مہذب ترین مملکت کہلاتی ہے' یعنی امریکہ' اس میں جو کالے ہیں وہ بھلا کون ہیں؟ انہیں افریقہ سے اس طرح پکڑ کر جس طرح شکاری گھات لگا کر شکار کو زندہ پکڑتے ہیں' جہازوں میں بھیڑ بکریوں کی طرح لاد کر بطورِ غلام امریکہ لے جایا گیا۔ وہاں ان کی خرید وفروخت ہوتی تھی' حالانکہ وہ اپنے ملک کے آزاد باشندے تھے۔ اگرچہ یہ ماننا پڑے گا کہ بعد میں امریکی سوسائٹی نے کسی حد تک اپنے آباء واَجداد کے اس جرم کی تلافی کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس ضمن میں ابراہام لنکن کی عظمت تسلیم کی جانی چاہیے۔ لیکن امریکی ذہناً اب بھی کالوں کو اپنے برابر سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ نوٹ کرنے والی بات یہ ہے کہ تاریخ میں یہ کچھ بھی ہوا ہے' اور اُن لوگوں نے کیا ہے جو صدیوں سے بڑے متمدن اور مہذب ہونے کے مدعی چلے آ رہے ہیں' جبکہ اسلام نے اس کو ایک بہت بڑا گناہ قرار دیا ہے کہ آپ کسی آزاد کو پکڑ کر غلام بنالیں۔

اب میں چوتھی بات یہ عرض کروں گا کہ اپنی جگہ یہ حقیقت ہے کہ غلامی کی قطعی وحتمی منسوخی (final abolition) کی کوئی آیت قرآن مجید میں موجود نہیں ہے۔ جیسے کہ ہم شراب کے بارے میں دیکھتے

ہیں کہ ابتدا میں حکم آیا کہ نشہ کی حالت میں نماز نہ پڑھو۔ تدریجاً اصلاح کا قدم اٹھایا گیا' اور بالآخر وہ وقت آ گیا کہ فرمایا گیا: ﴿فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ﴾ ''پس کیا تم (اس سے) باز آتے ہو کہ نہیں؟'' اور: ﴿فَاجْتَنِبُوْهُ﴾ ''تو اب اس سے باز آ جاؤ''۔ اسی طرح کی سب سے پہلے سورۃ الروم میں اخلاقی سطح پر مذمت کی گئی۔ پھر سورۂ آل عمران میں سود در سود سے منع کیا گیا۔ پھر حرمت کی آخری آیت ۹۰ ھ میں رسول اللہ ﷺ کے انتقال سے کچھ عرصہ قبل نازل ہوگئی' جو سورۃ البقرۃ میں ہے اور جس میں ہر نوع کا سود حرامِ مطلق قرار دیا گیا۔ لیکن غلاموں اور لونڈیوں کے بارے میں اس نوعیت کا کوئی حکم قرآن مجید میں نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے یہاں یہ ادارہ کچھ عرصہ تک چلتا رہا ہے۔

اب آپ یہ ہدایات پیشِ نظر رکھیے کہ جو خود کھاؤ وہی انہیں کھلاؤ' جو خود پہنو وہی ان کو پہناؤ اور اُن کے ساتھ حسن سلوک کرو۔ پھر یہ کہ ان کی گردنوں کو چھڑانے کے لیے اخلاقی تعلیمات بھی موجود ہوں' جیسے ﴿فَكُّ رَقَبَةٍ﴾ (البلد) اور صدقاتِ واجبہ اور صدقاتِ نافلہ میں گردنیں چھڑانے کی مستقل مدّ رکھ دی گئی ہو تو ان اسلامی تدابیر کا نتیجہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ عالمِ اسلام میں وہ دَور بھی آیا کہ مشرق و مغرب میں عظیم ترین مملکتیں ان کی تھیں جن کو ممالیک اور غلام کہتے ہیں۔ ہندوستان میں جو خاندانِ غلاماں حکمران تھا اور مصر میں جو ممالیک کی حکومت تھی تو یہ اُس اصلاحی عمل (reform) کا نتیجہ ہے جس کا آغاز رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ غلاموں کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ غلامی سے اٹھا کر شہنشاہی تک پہنچا دیا۔ دنیا نے دیکھ لیا کہ غلام تختِ ہند پر متمکن ہے۔ وہ چاہے قطب الدین ایبک ہو یا شمس الدین التمش جیسا درویش صفت اور ولی اللہ بادشاہ ہو۔ اسی طرح آپ کو دَورِ خلفائے راشدینؓ دَورِ بنواُمیہ اور دَورِ بنوعباس میں علومِ دین کی مسندوں پر بہت سے ایسے اکابر جلوہ افروز نظر آئیں گے جو آزاد کردہ غلاموں کے طبقہ سے تعلق رکھتے تھے' اور جن کی جوتیاں سیدھی کرنا اور اٹھانا بنواُمیہ اور بنوعباس کے باجبروت بادشاہوں کے شہزادگان اپنے لیے بہت بڑی سعادت خیال کرتے تھے۔

لیکن بہرحال اگر حکمتِ خداوندی نے اس کی آخری تنسیخ نہیں کی ـــــ اور کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ قرآن مجید میں کوئی آیت ایسی ہے جو اس ادارہ کو حتمی و قطعی طور پر منسوخ قرار دیتی ہو ـــــ تو ہمیں بحیثیت مسلمان اللہ تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ پر قطعی طور پر ایمان و اعتماد رکھنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ بھولنے والا نہیں ہے کہ کہیں معاذ اللہ' ثم معاذ اللہ نسیان سے یہ بات رہ گئی ہو۔ ارشادِ الٰہی ہے: ﴿وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا﴾ (مریم) ''اور تمہارا ربّ بھولنے والا نہیں ہے''۔ یہ معاذ اللہ کسی بھول چوک سے نہیں

ہوا۔ہمیں بہر حال اپنے علم سے اللہ کے علم کو مقدم رکھنا ہے۔ کہاں ہماری عقل اور ہماری منطق! کہاں ہمارے فلسفے! جو انتہائی کوتاہ اور محدود ہیں اور کہاں اللہ تعالیٰ کی حکمتیں!! تو وہ جو اللہ تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ اور حکمتِ کاملہ ہے یقیناً یہ اسی کا ظہور ہے کہ قرآن مجید میں اس کی آخری درجہ میں تنسیخ نہیں آئی ——!!

تعمیرِ سیرت کے لیے آخری تین اوصاف

زیر نظر درس میں انسان کی انفرادی سیرت و کردار کی تعمیر کے لیے اللہ تعالیٰ نے سات نکات پر مشتمل جو لائحہ عمل عطا کیا ہے' اب ہم اس کے آخری تین اوصاف کا مطالعہ کریں گے۔اس لائحۂ عمل کا اوّلین اور اہم ترین نکتہ اقامة الصلوٰة ہے' دوسرا فعل الزکوٰۃ تیسرا اعراض عن اللغو اور چوتھا ضبط نفس' یعنی جنسی جذبے پر قابو یافتہ ہونا۔ اس لائحۂ عمل کے آخری تین اوصاف یہ ہیں: (۱) امانت کی پاس داری (۲) ایفائے عہد (۳) اپنی شہادتوں پر قائم رہنا۔

اب اگر آپ ایک خاص اعتبار سے غور کریں گے تو اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ پہلے تین اوصاف کا تعلق ایک شخص کی اپنی ذات کے ساتھ ہے' کوئی دوسرا شخص ان سے متعلق نہیں ہوتا۔ نماز کو قائم رکھنا' بے کار اور بے مقصد باتوں سے اعراض' اللہ کی راہ میں خرچ کرنا' یہ تو خالص ذاتی نوعیت کے اوصاف ہیں۔ چوتھا وصف وہ تھا کہ جس پر انسانی تمدن کی صحت کا دارو مدار ہے۔ اس لیے کہ انسانی تہذیب و تمدن میں خاندان کے ادارے کو جڑ اور بنیاد کی حیثیت حاصل ہے۔ عائلی زندگی اور خاندان کے ادارے کی صحت اور استحکام کا دارو مدار اس پر ہے کہ انسان اپنے جنسی جذبہ پر قابو اور ضبط رکھتا ہو' اسے کسی غلط رُخ پر نہ پڑنے دے۔

اب جو آخری تین اوصاف ہیں جن پر ہمیں اجمالاً گفتگو کرنی ہے' ان کا تعلق انسان کی اجتماعی زندگی کی اس سطح سے ہے جسے ہم ملی اور سیاسی زندگی کہتے ہیں۔یعنی حکومت کا نظام' نظامِ مملکت' قومی و ملی معاملات۔ اس ضمن میں آپ دیکھیں گے کہ تین اوصاف نہایت ضروری ہیں۔ ان میں سب سے پہلا وصف امانت داری اور دوسرا ایفائے عہد ہے۔

امانت داری اور پاس عہد کا ذکر سورۃ المعارج میں بھی ہے اور سورۃ المؤمنون میں بھی۔ اور دونوں جگہ پر ایک شوشے کے فرق کے بغیر بعینہٖ یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں: ﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۝﴾ (المؤمنون:۸'المعارج:۳۲) امانت داری اور ایفائے عہد کے مابین جو ربط و تعلق ہے اور ان کی جو اہمیت ہے وہ ہمیں نبی اکرم ﷺ کی ایک حدیثِ مبارکہ سے بخوبی معلوم ہو جاتی

ہے۔اس حدیث کے راوی حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ ہیں جو مسلسل دس برس تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خادمِ خاص رہے ہیں' اور اس کو روایت کیا ہے امام بیہقی رحمہ اللہ نے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: قَلَّمَا خَطَبَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم اِلاَّ قَالَ ''شاذ ہی کبھی ایسا ہوا ہو گا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی خطبہ ارشاد فرمایا ہو اور اس میں آپؐ نے یہ الفاظ نہ فرمائے ہوں'' ((لاَ اِیْمَانَ لِمَنْ لاَ اَمَانَةَ لَهٗ وَلاَ دِیْنَ لِمَنْ لاَ عَھْدَ لَهٗ)) ''جس میں امانت داری کا وصف نہیں ہے اس کا کوئی ایمان نہیں ہے' اور جس میں ایفائے عہد کا وصف نہیں ہے اس کا کوئی دین نہیں ہے''۔اس لیے کہ ایمان کا امانت داری سے گہرا رشتہ ہے۔ دونوں کا مادہ ایک ہی لفظ ہے۔''امن'' سے ہی لفظ امانت بنا اور اسی سے ایمان بنا۔ چنانچہ یہ لازم وملزوم ہیں' ان کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ایمان ہے تو امانت کا وصف بھی ہو گا' اگر امانت کا وصف نہیں ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فتویٰ مبارک کی رُو سے حقیقی وقلبی ایمان بھی نہیں ہے۔ اسی طرح دین تو اصل میں نام ہے بندے اور ربّ کے مابین ایک عہد و معاہدہ کا۔ ہم نماز کی ہر رکعت میں جب سورۃ الفاتحہ کی یہ مرکزی آیت پڑھتے ہیں: ﴿اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ ۝﴾ ''(اے ربّ!) ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور کریں گے اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں اور چاہیں گے۔'' تو یہ اللہ کے ساتھ ایک قول و قرار' ایک معاہدہ اور ایک میثاق ہے۔ اب غور طلب بات یہ ہے کہ جو شخص انسانوں کے ساتھ کیے گئے عہد نہیں نباہ سکتا' جو انسانوں کے ساتھ کیے ہوئے وعدے پورے نہیں کر سکتا تو ظاہر بات ہے کہ وہ اللہ کے ساتھ پوری زندگی کے لیے کیا ہوا اتنا بڑا معاہدہ کیسے نباہے گا۔ اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((لاَ دِیْنَ لِمَنْ لاَ عَھْدَ لَهٗ)) ایسا شخص حقیقی دین سے تہی دست ہے۔

امانت داری اور ایفائے عہد کا ذکر سورۃ المؤمنون اور سورۃ المعارج دونوں میں آیا ہے۔ لیکن سورۃ المعارج میں ایک تیسری چیز کا اضافہ کیا گیا ہے: ﴿وَالَّذِیْنَ هُمْ بِشَهٰدٰتِهِمْ قَآئِمُوْنَ ۝۳۳﴾ ''اور وہ لوگ جو اپنی شہادتوں پر قائم رہنے والے ہیں''۔ غور طلب بات ہے کہ اس کا ذکر سورۃ المؤمنون میں کیوں نہیں آیا! یہ وہ واحد مثال ہے کہ جب ہم نے دونوں مقامات کا تقابلی مطالعہ کیا تو اس کا ذکر ہمیں سورۃ المؤمنون کی ابتدائی گیارہ آیات میں نہیں ملا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ درحقیقت شہادت بھی ایک امانت ہے۔ اگر کسی وقوعہ کے وقت آپ موجود تھے' آپ کی موجودگی میں کسی نے کسی پر دست درازی کی ہے' کسی نے کسی پر ظلم کیا ہے' کسی نے کسی کو قتل کیا ہے' کوئی دوسرا حادثہ ہوا ہے' تو آپ کی وہاں موجودگی کی بنا پر جو شہادت آپ کے پاس ہے وہ معاشرہ' قوم و ملت اور

ملک کی ایک امانت ہے۔ اگر آپ اسے چھپاتے ہیں تو آپ اس امانت میں خیانت کر رہے ہیں۔ لہٰذا جو چیز کسی فعل میں آپ سے آپ مضمر ہوتی ہے قرآن حکیم کہیں اس کا ذکر نہیں کرتا اور کہیں اس مضمر شے کو بھی عیاں کر دیتا ہے۔ چنانچہ شہادت بھی درحقیقت ایک امانت ہے۔

نبی اکرم ﷺ نے امانت کے تصور کو اتنی وسعت دی ہے کہ آپؐ نے فرمایا: ((اَلْمَجَالِسُ بِالْاَمَانَةِ)) ''مجالس بھی امانتوں پر قائم ہیں''۔ کسی محفل میں کوئی بات ہو رہی تھی' آپ بھی اس میں موجود تھے' آپ نے وہاں کوئی بات سنی اور کہیں اور جا کر بیان کر دی جب کہ اس کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی' تو یہ خیانت ہے۔ آپ نے کسی محفل کی بات کو اگر کہیں اور جا کر نقل کر دیا تو غیر شعوری یا شعوری طور پر بات میں کمی بیشی بھی ہو سکتی ہے اور بات کرنے والے کے منشاء کے خلاف بھی بیان ہو سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آپ بات کہنے والے کے صحیح مفہوم کو سمجھ نہ پائے ہوں۔ تو نہ معلوم اس سے کتنے فتنے اٹھنے کا احتمال پیدا ہو سکتا ہے! اور عین ممکن ہے کہ یہی بے احتیاطی بعض لوگوں کو بعض کے خلاف بدظنی اور بدگمانی میں مبتلا کرنے کا سبب بن جائے اور دلوں میں کدورت اور رنجش ڈیرے ڈال لے۔ تو کسی مجلس اور کسی محفل میں آپ شریک ہیں تو وہاں کی باتیں آپ کے پاس ایک امانت کے طور پر ہیں جن کی آپ کو حفاظت کرنی ہے۔ اسی طرح نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ((اَلْمُسْتَشَارُ مُؤْتَمَنٌ)) ''جس کسی سے کوئی مشورہ طلب کیا جاتا ہے گویا اس کے پاس بھی ایک امانت رکھوائی گئی ہے''۔ مشورہ طلب کرنے والے نے آپ پر اپنا اعتماد ظاہر کیا ہے۔ اب اگر آپ دیانتاً جو رائے رکھتے ہیں وہ کچھ اور ہے' لیکن آپ کسی مصلحت سے اپنی اس دیانت دارانہ رائے کو چھپا کر کوئی اور رائے ظاہر کرتے ہیں تو آپ نے اس کی امانت میں خیانت کی۔ یہ معاملہ بھی' جیسا کہ عرض کیا گیا' شہادت کا ہے۔

سورۃ البقرۃ میں ایک بڑی اہم آیت ہے جس کے درمیان میں فرمایا گیا ہے: ﴿وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهُ مِنَ اللّٰهِ ؕ﴾ (آیت ۱۴۰) ''اُس شخص سے بڑھ کر ظالم اور کون ہو گا کہ جس کے پاس اللہ کی طرف سے کوئی شہادت ہو اور وہ اسے چھپائے!'' اس فرمانِ الٰہی اور امانت وشہادت کے حوالے سے اُمت مسلمہ کا جو فرضِ منصبی ہے ہمیں اسے سمجھنا چاہیے۔ ہمارے پاس اللہ کا کلام ہے' اللہ کی ہدایت ہے' اللہ کا قانون ہے اور اللہ کی شریعت ہے۔ پھر ہمارے پاس اللہ کے رسول جناب محمد ﷺ کی سنت ہے' آپ ﷺ کی احادیث ہیں۔ آپؐ کا اُسوۂ حسنہ کامل صورت میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ یہ تمام امانتیں ہیں جن کو ادا کرنے کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہمارے کاندھوں

پر رکھی گئی ہے‘ لہٰذا ان امانتوں کو ادا کرنا پوری اُمت مسلمہ کا فریضہ ہے۔ اس لیے کہ یہ پوری نوعِ انسانی کے لیے ہیں‘ صرف ہمارے لیے نہیں ہیں۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کا سب سے بڑا وصف رسولِ امین یعنی امانت دار رسولؐ ہے‘ جن کے پاس پیغامِ ربانی آیا اور انہوں نے اسے بلاکم و کاست لوگوں تک پہنچا دیا‘ چنانچہ امانت کا حق ادا کر دیا۔ آپ کو معلوم ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام اس پیغام کے پہلے امین ہیں‘ اُن کا لقب بھی رسولِ امین ہے۔ دوسرے امین جناب محمدؐ رسول اللہ ﷺ ہیں۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے یہ امانت پہنچائی نبی اکرم ﷺ کو‘ اور آپ ﷺ نے یہ امانت پہنچا دی اُمت کو۔ اور اسی کو ہم یوں تعبیر کریں گے کہ نبی اکرم ﷺ نے اُمت کے سامنے حق کی گواہی دے دی‘ توحید کی گواہی دے دی‘ اپنی رسالت کی گواہی دے دی‘ قرآن کی حقانیت کی گواہی دے دی‘ دین و شریعت کے اوامر و نواہی اور ہر ہر فعل و عمل کی گواہی دی‘ قولاً بھی اور عملاً بھی۔ اب اس امانت اور شہادت کو ادا کرنے کی ذمہ داری کا بوجھ اُمت مسلمہ کے کاندھوں پر عائد ہوتا ہے‘ جس کا ہر وہ شخص ایک فرد اور رکن ہے جو اپنے آپ کو مسلمان کہتا اور کہلواتا ہے۔

ہمارا فرضِ منصبی یہ قرار دیا گیا ہے کہ ہم اس حق کی‘ اس دین کی‘ اس توحید کی اور جناب محمد ﷺ کی رسالت کی شہادت دیں‘ کہ جن کے توسط سے ہمیں یہ ”الہدیٰ“ اور یہ ”الحق“ ملا ہے۔ اس موقع پر علامہ اقبال کا یہ مصرع بے اختیار میری زبان پر آ جاتا ہے کہ: ع ”دے تو بھی محمدؐ کی صداقت کی گواہی“۔ یہ گواہی ہمیں قولاً بھی دینی ہے اور عملاً اور فعلاً بھی۔ یہ گواہی ہم نے اپنی گفتگو‘ دعوت و تبلیغ اور اپنی قوتِ بیانیہ سے دینی ہے۔ یہ گواہی ہم نے اپنے قلم سے‘ مدلل مضامین و مقالات کی صورت میں دینی ہے‘ اور یہ گواہی ہمیں اپنے کردار اور اپنی سیرت سے دینی ہے۔ اگر ہم یہ نہیں کرتے تو ہم کتمانِ شہادت کے بہت بڑے مجرم ثابت ہو رہے ہیں۔ از روئے قرآن: ﴿وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ ؕ﴾ (البقرۃ: ١٤٠)

یہ بات خاص طور پر یاد رکھنے کی ہے کہ اس آیت سے چند آیات بعد سورۃ البقرۃ میں اُمت مسلمہ کا فرضِ منصبی بایں الفاظِ مبارکہ بیان ہوا ہے: ﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ﴾ (آیت ۱۴۳) یعنی ہم نے تمہیں ایک اُمتِ وسط (درمیانی اُمت) بنایا ہی اس لیے ہے کہ تم ہو جاؤ گواہ پوری نوعِ انسانی پر اور رسول (محمد ﷺ) گواہ ہو جائیں تم پر“۔

میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ اہم مضامین قرآن مجید میں کم از کم دو جگہ ضرور آتے ہیں۔ سورۃ المؤمنون کی گیارہ اور سورۃ المعارج کی سترہ آیات کے باہمی تقابل سے ہم پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہوگئی ہے اور اِن مضامین کی اہمیت بھی سامنے آ گئی ہے۔ اسی کی ایک مثال اور جان لیجیے۔ سورۃ المؤمنون سے متصلاً قبل سورۃ الحج ہے۔ سورۃ المؤمنون کی پہلی آیت ہے: ﴿قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝۱﴾ اور سورۃ الحج کی جو آخری آیت ہے اس میں اسی شہادت علی الناس کا ذکر ہے۔ مسلمانوں سے خطاب فرما کر کہا جا رہا ہے: ﴿وَجَاهِدُوْا فِی اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ﴾ یعنی اللہ کی راہ میں محنتیں کرو، مشقتیں کرو، ایثار کرو، قربانیاں دو، جان و مال کھپاؤ، مجاہدہ کرو، جیسا کہ اس کی راہ میں جہاد کا حق ہے۔ اس نے تمہیں چن لیا ہے، تمہیں امورِ نبوت کا وارث بنا دیا ہے، کتابِ الٰہی کا وارث بنا دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی عظیم ترین امانت تمہارے سپرد کی ہے، اب اس کا حق ادا کرو۔ اور اسی آیت میں ایک Subordinate Clause کے بعد الفاظ آئے: ﴿لِیَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِیْدًا عَلَیْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَی النَّاسِ ۚ﴾ (آیت ۷۸) ''تاکہ رسول (ﷺ) گواہ بن جائیں تم پر اور تم گواہ بن جاؤ پوری نوعِ انسانی پر''۔ تو یہ ہے پوری اُمت مسلمہ کی اجتماعی (collective) ذمہ داری جو شہادت کے اس لفظ کے حوالے سے ہمیں جان لینی چاہیے۔

ان آیات کے ذریعے تین اوصاف پاسِ امانت، پاسِ عہد اور شہادت کی ادائیگی کے بعد سورۃ المؤمنون اور سورۃ المعارج دونوں میں اوّلین اور اہم ترین وصف یعنی اقامتِ صلوٰۃ اور اس کی حفاظت کے وصف کا اعادہ فرمایا گیا: ﴿وَالَّذِیْنَ هُمْ عَلٰی صَلَوٰتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ ۝۹﴾ (المؤمنون) اور ﴿وَالَّذِیْنَ هُمْ عَلٰی صَلَاتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ ۝۳۴﴾ (المعارج) کے الفاظ میں ـــــ پھر سورۃ المؤمنون میں فرمایا گیا: ﴿اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ۝۱۰ الَّذِیْنَ یَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ ؕ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ۝۱۱﴾ اور سورۃ المعارج میں ارشاد ہوا: ﴿اُولٰٓئِكَ فِیْ جَنّٰتٍ مُّكْرَمُوْنَ ۝۳۵﴾ کہ یہ ہیں وہ لوگ جو جنت الفردوس کے وارث بنیں گے۔ یہ ہیں وہ لوگ جن کا اعزاز و اکرام ہوگا جنتوں میں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان اوصاف کو اپنی شخصیتوں میں پیدا کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہمیں بھی جنت میں داخل ہونے والوں میں شامل کر دے۔ آمین یا ربّ العالمین!

وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین

❁❁❁

درس 11

اللہ کے محبوب بندوں کی شخصیت کے خدوخال

سُورَةُ الْفُرْقَان کے آخری رکوع کی روشنی میں

درس ۱۱

اللہ کے محبوب بندوں کی شخصیت کے خدوخال

سورۂ فرقان کے آخری رکوع کی روشنی میں

نحمدہٗ ونصلی علی رسولہ الکریم

اعوذ باللّٰہ من الشیطن الرجیم۔ بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

﴿تَبٰرَكَ الَّذِیْ جَعَلَ فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِیْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِیْرًا ﴿۶۱﴾ وَهُوَ الَّذِیْ
جَعَلَ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ یَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا ﴿۶۲﴾ وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ
یَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ﴿۶۳﴾ وَالَّذِیْنَ یَبِیْتُوْنَ
لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِیَامًا ﴿۶۴﴾ وَالَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ ۖ اِنَّ عَذَابَهَا
كَانَ غَرَامًا ﴿۶۵﴾ اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ﴿۶۶﴾ وَالَّذِیْنَ اِذَاۤ اَنْفَقُوْا لَمْ یُسْرِفُوْا وَلَمْ یَقْتُرُوْا
وَكَانَ بَیْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ﴿۶۷﴾ وَالَّذِیْنَ لَا یَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا یَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِیْ
حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا یَزْنُوْنَ ۚ وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِكَ یَلْقَ اَثَامًا ﴿۶۸﴾ یُّضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ یَوْمَ
الْقِیٰمَةِ وَیَخْلُدْ فِیْهٖ مُهَانًا ﴿۶۹﴾ اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ یُبَدِّلُ اللّٰهُ
سَیِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ﴿۷۰﴾ وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّهٗ یَتُوْبُ اِلَى
اللّٰهِ مَتَابًا ﴿۷۱﴾ وَالَّذِیْنَ لَا یَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ﴿۷۲﴾ وَالَّذِیْنَ اِذَا
ذُكِّرُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ یَخِرُّوْا عَلَیْهَا صُمًّا وَّعُمْیَانًا ﴿۷۳﴾ وَالَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ
اَزْوَاجِنَا وَذُرِّیّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْیُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِیْنَ اِمَامًا ﴿۷۴﴾ اُولٰٓئِكَ یُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا
وَیُلَقَّوْنَ فِیْهَا تَحِیَّةً وَّسَلٰمًا ﴿۷۵﴾ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ؕ حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ﴿۷۶﴾ قُلْ مَا یَعْبَؤُا بِكُمْ
رَبِّیْ لَوْ لَا دُعَآؤُكُمْ ۚ فَقَدْ كَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ یَكُوْنُ لِزَامًا ﴿۷۷﴾﴾ (الفرقان)

”بہت ہی بابرکت ہے وہ ہستی جس نے آسمان میں برج بنائے اور اس میں ایک چراغ اور روشن چاند بنایا۔ اور وہی ہے کہ جس نے رات اور دن کو ایک دوسرے کے تعاقب میں لگا دیا (اس میں نشانیاں ہیں) ہر اُس شخص کے لیے جو یاددہانی اخذ کرنا چاہے یا شکر کی روش اختیار کرنا چاہے۔

اور رحمٰن کے (محبوب) بندے تو وہ ہیں جو زمین پر چلتے ہیں تواضع اور نرمی کے ساتھ اور جب اُن سے جاہل لوگ الجھتے ہیں تو وہ سلام کہہ کر علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ اور وہ جو راتیں بسر کرتے ہیں اپنے ربّ کے حضور میں سجدہ کرتے ہوئے اور دست بستہ کھڑے رہ کر۔ اور وہ جو یہ کہتے ہیں اے ربّ ہمارے! پھیر دے ہم سے جہنم کے عذاب کو' یقیناً اس کا عذاب چمٹ جانے والی چیز ہے۔ یقیناً وہ بہت بُری جگہ ہے مستقل جائے قرار ہونے کے اعتبار سے بھی اور عارضی قیام گاہ کے اعتبار سے بھی۔ اور وہ جو جب خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی سے کام لیتے ہیں نہ بخل سے' بلکہ اُن کی روش اس کے بین بین ہوتی ہے۔ اور وہ جو نہیں پکارتے اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو' اور نہ قتل کرتے ہیں کسی جان کو جسے اللہ نے محترم ٹھہرایا ہے مگر حق کے ساتھ' اور نہ زنا کرتے ہیں —— اور جو کوئی بھی یہ کرے گا وہ اس کی پاداش بھگت کر رہے گا۔ دوگنا کر دیا جائے گا اس کے لیے عذاب کو قیامت کے دن اور وہ اس میں رہے گا ہمیشہ ہمیشہ ذلیل وخوار ہو کر۔ سوائے اس کے جو توبہ کرے اور ایمان لائے اور اچھے عمل کرے' تو ایسے لوگوں کی برائیوں کو اللہ تعالیٰ بھلائیوں سے بدل دے گا۔ اور اللہ تو ہے ہی بخشنے والا' رحم فرمانے والا۔ اور جو توبہ کرتا ہے اور نیک عمل کرتا ہے تو حقیقتاً وہی ہے جو ایسی توبہ کرتا ہے جیسے کہ توبہ کرنے کا حق ہے —— اور وہ جو جھوٹ پر اپنی موجودگی تک گوارا نہیں کرتے اور اگر کسی لغو کام کے پاس سے اُن کا اتفاقاً گزر ہو جائے تو بھی دامن کو بچاتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔ اور وہ جنہیں جب اُن کے ربّ کی آیات کے ذریعے نصیحت کی جاتی ہے تو وہ اس پر اندھے اور بہرے ہو کر نہیں ٹوٹ پڑتے۔ اور وہ جو یہ کہتے ہیں کہ اے ربّ ہمارے! ہمیں اپنی بیویوں اور اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما اور ہمیں اپنے نیک بندوں کے آگے چلنے والا بنا۔ یہ ہیں وہ لوگ جنہیں بدلے میں بالا خانے ملیں گے بعوض اُس صبر کے جو انہوں نے کیا' اور وہاں ان کا استقبال ہوگا نیک دعاؤں اور سلام کے ساتھ۔ وہ اس میں رہیں گے ہمیشہ ہمیش' اور وہ بہت ہی عمدہ جگہ ہے مستقل جائے قرار ہونے کی حیثیت سے بھی اور عارضی قیام گاہ ہونے کے اعتبار سے بھی۔ (اے نبیؐ!) کہہ دیجیے: میرے ربّ کو تمہاری کوئی پروا نہیں ہے اگر نہ ہوتا تمہیں پکارنا۔ پس تم نے جھٹلا دیا ہے تو اب یہ جھوٹ جلد تم پر لاگو ہو کر رہے گا۔''

مطالعہ قرآن حکیم کے جس منتخب نصاب کا سلسلہ وار مطالعہ ان صفحات میں ہو رہا ہے' اس کا درس نمبر ۱۱ سورۃ الفرقان کی آیات ۶۱ تا ۷۷ پر مشتمل ہے۔ اس منتخب نصاب کے پہلے حصے میں چار جامع اسباق تھے۔ دوسرے حصے میں کچھ ایسے مقامات تھے جن کے ذریعے ایمان کے ضمن میں چند مباحث ہمارے سامنے آئے تھے۔ تیسرے حصے میں اعمالِ صالحہ کی بحث ہے جو چل رہی ہے۔ اس کے پہلے

سبق میں ان اوصاف کا بیان تھا جو از روئے قرآن حکیم انسان کی سیرت کی تعمیر' یا بقول علامہ اقبال مرحوم تعمیرِ خودی کے لیے بنیادی لوازم اور اساسات ہیں۔ زیر درس آیات کے مطالعہ اور ان کی ترجمانی سے آپ نے محسوس کر لیا ہوگا کہ گزشتہ سبق کی طرح یہاں بھی چند اوصاف کا ذکر ہو رہا ہے۔

جس طرح سورۃ المؤمنون کے پہلے رکوع میں چھ مرتبہ اسمِ موصولہ ''اَلَّذِیْنَ'' تکرار کے ساتھ آیا تھا اور سورۃ المعارج کی اُن آیات میں کہ جو سورۃ المؤمنون کی آیات کی ہم مضمون تھیں' آٹھ مرتبہ ''اَلَّذِیْنَ'' کی تکرار ہوئی' اسی طرح آج کے درس میں بھی ''اَلَّذِیْنَ'' ایک مرتبہ آیا ہے اور ''وَالَّذِیْنَ'' سات مرتبہ دہرایا گیا ہے کہ عباد الرحمٰن یعنی ہمارے محبوب بندوں میں یہ اور یہ اوصاف ہوتے ہیں' اُن کی یہ اور یہ کیفیت ہوتی ہے' ان کی راتیں اس حال میں اور اس کیفیت میں بسر ہوتی ہیں' وہ جب خرچ کرتے ہیں تو اُن کی روش یہ ہوتی ہے' وغیرہم۔

غور طلب بات یہ ہے کہ گزشتہ سبق اور اس سبق کے مابین منطقی ربط کیا ہے! آپ نے محسوس کر لیا ہوگا کہ اس مقام پر اُن اوصاف کا بیان ہو رہا ہے جنہیں ہم چوٹی کے اوصاف کہہ سکتے ہیں۔ یعنی ایک پوری طرح تربیت یافتہ خودی یا ایک پوری طرح تعمیر شدہ شخصیت کے یہ خدوخال ہونے چاہئیں۔ ایک بندۂ مؤمن کے جو نمایاں اوصاف اللہ کو پسند ہیں' ان کا اس سبق میں نہایت جامع بیان آیا ہے۔ اسے ایک مثال سے واضح کیا جائے تو وہ یہ ہوگی کہ جیسے ہم ایک عمارت بناتے ہیں تو اس کا ایک ڈھانچہ (structure) ہوتا ہے' جس میں سیمنٹ' لوہا' سریا اور لکڑی وغیرہ استعمال ہوتی ہے' اور عمارت کی اصل مضبوطی اور اس کا اصل استحکام اس کے سٹرکچر کی مضبوطی پر ہوتا ہے۔ پھر اس عمارت کی finishing اور اس کی آراستگی ہے۔ یعنی عمدہ پلاسٹر ہو' رنگ و روغن اعلیٰ ہو اور اس عمارت کے خدوخال کی خوبصورتی مختلف پہلوؤں سے ظاہر ہو رہی ہو۔ ظاہر بات ہے کہ جب آپ کسی عمارت کو دیکھتے ہیں تو اس کا سٹرکچر نگاہوں کے سامنے نہیں آتا۔ وہ تو ایک مخفی اور نظروں سے اوجھل شے ہے۔ جو چیز سامنے آئے گی وہ اس کے نمایاں خدوخال ہیں۔ اگر عمارت دل آویز ہے' خوبصورت ہے' پلاسٹر اچھا ہے' رنگ و روغن عمدہ ہے تو وہ دیدہ زیب ہوگی اور آپ کی نگاہوں کو اپنی طرف کھینچے گی۔ بالکل یہی ربط و تعلق ہمارے سابقہ سبق اور اس سبق میں ہے۔ یوں سمجھئے کہ سیرت و شخصیت کی تعمیر کا اساسی پروگرام تو وہ ہے جس پر ہم دو مقامات کے حوالے سے غور کر چکے ہیں' لیکن ایک مکمل تعمیر شدہ انسانی شخصیت میں' جس کی تعبیر علامہ اقبال مرحوم نے یوں کی ہے کہ : ع

''کہتے ہیں فرشتے کہ دل آویز ہے مؤمن!''

یہ دل آویزی جن اوصاف سے پیدا ہوتی ہے انہیں اللہ تعالیٰ نے اس مقام پر نہایت جامعیت کے ساتھ بیان فرما دیا ہے۔

آیاتِ آفاقی میں غور وفکر کی دعوت

سب سے پہلے ہم اس سبق کی پہلی دو آیات کا مطالعہ کرتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ایمان کے ضمن میں جو بحثیں اس سے قبل اس سلسلۂ دروس میں ہو چکی ہیں' ان کا نہایت جامع خلاصہ ان دو آیات میں آ گیا ہے۔ فرمایا:

﴿تَبٰرَكَ الَّذِیْ جَعَلَ فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّ جَعَلَ فِیْهَا سِرٰجًا وَّ قَمَرًا مُّنِیْرًا ﴿۶۱﴾﴾

''بڑی ہی بابرکت ہے وہ ذات جس نے آسمانوں میں برج بنائے اور اس (آسمان) میں ایک چراغ روشن کیا (یعنی سورج) اور روشن چاند بنایا''۔

﴿وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً﴾

''اور وہی ہے جس نے رات اور دن کو ایک دوسرے کے تعاقب میں لگا دیا''۔

گویا وہ ایک دوسرے کا پیچھا کر رہے ہیں۔ رات دن کا پیچھا کرتی ہوئی چلی آتی ہے اور دن جیسے رات کا تعاقب کرتے ہوئے نمودار ہوتا ہے۔ یہ قانونِ طبعی کی ایک بیّن حقیقت ہے۔ اسے سورۂ آل عمران کے آخری رکوع میں آیاتِ الٰہیہ سے تعبیر کیا گیا تھا۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۰﴾﴾ اور اس موقع پر ہم نے سورۃ البقرۃ کے اکیسویں رکوع کی پہلی آیت (البقرۃ:۱۶۴) بھی تفصیل سے پڑھی تھی کہ اس کائنات کی ہر شے ایک نشانی ہے جس کو دیکھ کر لامحالہ ایک سلیم الفطرت اور سلیم العقل انسان کا ذہن اُس کے خالق' اس کے مالک' اس کے صانع اور اس کے مصور کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ اور اس کائنات کے مشاہدات سے اُس ذات کی صفاتِ کمال کا اندازہ ہوتا ہے کہ جو اِس کائنات کا بنانے والا ہے' وہ جو ''عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ'' ہے' اس کی قدرت میں کہیں کوئی کمی نہیں' اس کے علم میں کہیں کوئی کمی نہیں' اس کی حکمت میں کہیں کوئی کمی نہیں' وہ ''بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ'' ہے' اور وہ ہستی ''اَلْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ'' ہے۔

یہ درحقیقت وہی مضمون ہے جسے یہاں بھی تمہید کے طور پر بیان کیا گیا ہے کہ جو لوگ اِن آیاتِ آفاقیہ پر غور وتدبر کرتے ہیں' جسے علامہ اقبال نے اس طرح تعبیر کیا کہ ؎

کھول آنکھ ' زمیں دیکھ' فلک دیکھ' فضا دیکھ!
مشرق سے اُبھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ!

وہ لوگ جو اِس وسیع وعریض کائنات میں پھیلی ہوئی آیات سے اُس کے خالق کی معرفت حاصل کرتے ہیں' انہی میں یہ اوصاف پیدا ہوں گے کہ جن کا ذکر آگے آرہا ہے۔ چنانچہ دوسری آیت کے آخر میں فرمایا:

﴿لِّمَنۡ اَرَادَ اَنۡ یَّذَّکَّرَ اَوۡ اَرَادَ شُکُوۡرًا ﴿۶۲﴾﴾

''(یہ نشانیاں ہیں) اُس کے لیے جو چاہے تو یاد دہانی حاصل کرے یا چاہے تو (اللہ کا) شکر گزار بنے''۔

اِن الفاظِ مبارکہ سے آپ کے ذہن میں سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع کا مضمون آ گیا ہوگا کہ کائنات کے مشاہدہ سے جہاں تذکر حاصل ہوتا ہے' یاد دہانی نصیب ہوتی ہے' ذہن اللہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے وہاں ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا احساس پیدا ہوتا ہے' اس کے احسانات کا ادراک حاصل ہوتا ہے کہ اُس نے انسان کی روزی کی فراہمی کے لیے کیا عظیم الشان نظام بنایا ہے! اُس نے انسان کی ہر ہر ضرورت کی بہم رسانی کے لیے کیا اعلیٰ انتظام وانصرام فرمایا ہے! وہ انسان کے جسم وجان کے تمام تقاضوں کو کس کس طریقہ سے پورا فرما رہا ہے۔ اس شعور وادراک سے ایک دوسرا جذبہ جو انسان کے دل میں اُبھرتا ہے وہ جذبۂ شکر ہے۔ سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع کی پہلی آیت ذہن میں تازہ کیجیے:

﴿وَلَقَدۡ اٰتَیۡنَا لُقۡمٰنَ الۡحِکۡمَۃَ اَنِ اشۡکُرۡ لِلّٰہِ ؕ﴾

''ہم نے لقمان کو حکمت اور دانائی عطا فرمائی کہ کر شکر اللہ کا!''

تو معلوم ہوا کہ اس کائنات کے مشاہدہ سے اور آیاتِ سماوی' آیاتِ ارضی' آیاتِ آفاقی اور آیاتِ انفسی سے ایک سلیم الفطرت اور سلیم العقل انسان کو دو چیزیں اخذ کرنی چاہئیں —— ایک وہ جسے قرآن کریم تذکّر سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی اس کائنات کی وسعتوں میں انسان کی نگاہیں اُلجھ کر نہ رہ جائیں' بلکہ ان کو دیکھ کر اُن پر غور وتدبر سے اس کا خالق' اس کا مالک' اس کا صانع' اس کا مصور اور اس کا مدبر یاد آجائے اور ذہن وشعور اور عقل وادراک اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرف متوجہ ہو جائے۔ جیسے علامہ اقبال نے کہا ہے: ؎

گاہ مری نگاہِ تیز چیر گئی دلِ وجود
گاہ اُلجھ کے رہ گئی میرے توہمات میں!

تو دل کی آنکھ سے اس کائنات کے ذریعے اللہ تک پہنچا جائے تو اس کا نام تذکر ہے ــــــ اور دوسرے یہ کہ انسان کو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا ادراک ہو‘اس کے احسانات کا شعور ہو‘ جس کے لازمی نتیجہ کے طور پر اس کے دل میں تشکر کے جذبات وجود میں آئیں۔ ان دونوں کے لیے یہاں فرمایا گیا: ﴿لِّمَنۡ اَرَادَ اَنۡ یَّذَّکَّرَ اَوۡ اَرَادَ شُکُوۡرًا ﴿۶۲﴾﴾

عبادالرحمٰن کے چند اوصاف

اس رکوع کی پہلی دو آیات کا مضمون سمجھ لینے کے بعد اب ہم اگلی پانچ آیات (الفرقان: ۶۳ تا ۶۷) کا مطالعہ کرتے ہیں۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ اپنے ان بندوں کے اوصاف بیان فرما رہا ہے جو اُسے بہت ہی پسند اور محبوب ہیں۔ چنانچہ گفتگو کی جو ابتدا ہوئی ہے وہ ﴿عِبَادُ الرَّحۡمٰنِ﴾ کے الفاظ سے ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ’’اَلرَّحۡمٰن‘‘ نہایت پیارا نام ہے۔ اس لیے بھی کہ یہ رحمت سے مشتق ہے‘ اور ظاہر بات ہے کہ بندوں کو جس چیز کی زیادہ احتیاج ہے وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہی ہے۔ اور اس لیے بھی کہ اگرچہ رحمت سے اللہ تعالیٰ کا ایک نام اور بھی بنتا ہے اور وہ ہے ’’اَلرَّحِیۡمُ‘‘ لیکن ’’الرحیم‘‘ میں اللہ تعالیٰ کی رحمت کی شان ایک مستقل اور دائم حقیقت کی حیثیت سے سامنے آتی ہے‘ جبکہ ’’اَلرَّحۡمٰن‘‘ میں اللہ تعالیٰ کی رحمت کی جو شان سامنے آتی ہے وہ ایک ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کے مانند ہے‘ جس میں جوش و خروش ہو‘ جس میں ہیجان ہو۔ یہ لفظ ہیجان بھی فَعۡلَان کے وزن پر عربی ہی کا لفظ ہے۔ اسی وزن پر عربی زبان میں متعدد الفاظ آتے ہیں۔ مثلاً عَطۡشَان یعنی انتہائی پیاسا‘ جس کی پیاس سے جان نکلی جا رہی ہو‘ جَوۡعَان یعنی نہایت بھوکا‘ جو بھوک سے مر رہا ہو۔ تو اللہ تعالیٰ کا یہ نامِ نامی‘ اسم گرامی ’’اَلرَّحۡمٰن‘‘ بہت ہی پیارا ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی رحمت ایک ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کی طرح سامنے آتی ہے۔

پھر ’’عِبَادُ الرَّحۡمٰنِ‘‘ کے فرمانے میں بھی ایک محبت اور شفقت و عنایت کا انداز ہے‘ یعنی اللہ کے محبوب بندے‘ اللہ کے پسندیدہ بندے یہ ہیں جن میں یہ اوصاف پائے جاتے ہوں جن کا ذکر آگے آ رہا ہے۔

(۱) تواضع و انکساری

ان اوصاف میں سے پہلا وصف آیا: ﴿الَّذِیۡنَ یَمۡشُوۡنَ عَلَی الۡاَرۡضِ ہَوۡنًا﴾ ” وہ لوگ جو

زمین پر چلتے ہیں آہستگی سے (نرمی سے)''۔ان کی چال سے تواضع نمایاں ہوتی ہے۔ یہ بات جان لیجیے کہ جیسے انگریزی میں کہتے ہیں کہ: "Face is the index of the mind." آپ کسی انسان کے چہرے کو دیکھ کر اس کے باطنی احساسات وجذبات کا اندازہ کر سکتے ہیں' اسی طرح انسان کی چال سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں غرور ہے' یہ کسی فخر میں مبتلا ہے' یہ گھمنڈی ہے۔ اکڑ کر چلے گا تو اس کی چال بتائے گی کہ اس کی ذہنی کیفیت کیا ہے! یا پھر اس کی چال سے یہ ظاہر ہوگا کہ اس میں عجز و تواضع' فروتنی' انکساری اور خاکساری ہے۔ تو یہ ہے پہلا وصف —— اور بندے کو یہ حقیقت پہچان لینی چاہیے کہ میں بندہ ہوں' آقا نہیں ہوں' آقا تو صرف ایک ہے اور وہ اللہ ہے' باقی بڑے سے بڑا انسان بھی بندہ ہے' اور عبدیت ہی درحقیقت ہمارا طرۂ امتیاز ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں جہاں بھی اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ سے خصوصی عنایت کے ساتھ خطاب فرمایا ہے' یا آپ ﷺ کا ذکر خصوصی محبت و شفقت اور التفات کے ساتھ فرمایا ہے وہاں حضور ﷺ کی عبدیت کو نمایاں کیا جاتا ہے۔ جیسے: ﴿سُبْحٰنَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا﴾ اور: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِهِ الْكِتٰبَ﴾ اور جیسے: ﴿تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ لِیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا ۝۱﴾. دیکھئے کس قدر لطیف ربط ہمارے سامنے آتا ہے! یہ اس سورۂ مبارکہ کی پہلی آیت ہے جس کے آخری رکوع کا ہم مطالعہ کر رہے ہیں۔ اس سورۂ مبارکہ کے آخری رکوع کا آغاز بھی ''تَبٰرَكَ الَّذِیْ'' کے الفاظ سے ہوتا ہے۔ آغاز میں فرمایا گیا: ''بڑی بابرکت' بلند مرتبت ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے (ﷺ) پر الفرقان (یعنی قرآن مجید) نازل فرمایا''۔

تو یہ عبدیت درحقیقت معراجِ انسانیت ہے۔ لہٰذا یہاں ''عِبَادُ الرَّحْمٰنِ'' فرمانے میں بڑی شفقت' محبت' عنایت اور التفات کے پہلو مضمر ہیں۔ مراد ہیں وہ لوگ جو واقعی اللہ کے بندے ہیں' ان کی چال ڈھال سے نمایاں ہوتا ہے کہ یہ اپنے آپ کو بندہ ہی سمجھتے ہیں' آقا نہیں سمجھتے۔ یہ اپنے آپ کو مملوک سمجھتے ہیں اور اپنے مالک' اپنے آقا کو پہچانتے ہیں۔ چنانچہ ان کی چال گواہی دیتی ہے کہ فخر و غرور کے بجائے ان میں عجز و فروتنی کے احساسات وجذبات جاگزیں ہیں۔

ہمارے اس منتخب نصاب کا جو تیسرا درس سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع پر مشتمل ہے' اس کے آخر میں بھی اسی وصف پر زور دیا گیا ہے: ﴿وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ۝۱۸﴾ حضرت لقمان اپنے بچے کو نصیحت فرماتے ہوئے

کہتے ہیں کہ ''اے میرے بچے! اپنے گال لوگوں کے لیے پھلا کر نہ رکھ اور زمین پر اکڑ کر مت چل‘ بے شک اللہ کو بالکل پسند نہیں ہیں شیخی خورے اور اترانے اور غرور و فخر سے کام لینے والے''۔ تو یہاں نقطۂ آغاز وہ وصف ہے جہاں سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع کے مضامین کی قریباً انتہا ہوئی تھی۔

(۲) ہٹ دھرمی کے جواب میں طرزِ عمل

اسی آیت میں دوسرا وصف بیان ہوا ہے: ﴿وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ۝۶۳﴾ ''اور جب جاہل اُن سے مخاطب ہوتے ہیں (اور اُن سے اُلجھنا چاہتے ہیں) تو وہ سلام کہہ دیتے ہیں (اور اس طرح اُن سے علیحدہ ہو جاتے ہیں)''۔ یہ بھی درحقیقت انسان کی شخصیت کی پختگی کی ایک بہت بڑی علامت ہے۔ بعض لوگ اپنے جذبات سے مغلوب ہو کر لوگوں سے بے کار سی بحث و تمحیص میں الجھ جاتے ہیں‘ حالانکہ اس طرح کے بحث و مباحثہ کا حاصل کچھ نہیں ہوتا۔ ایک پختہ (mature) انسان کا لازمی وصف یہ ہوگا کہ وہ اندازہ کرے کہ اس کا مخاطب اس وقت بات سمجھنے کے موڈ میں ہے یا محض بحث و نزاع پر تلا ہوا ہے۔ اور اگر وہ یہ محسوس کرے کہ یہ شخص اِس وقت افہام و تفہیم کے موڈ میں نہیں ہے‘ یہ میری بات کو سنجیدگی سے نہیں سن رہا‘ بلکہ ضد اور عناد میں مبتلا ہو چکا ہے‘ اس وقت اس پر ہٹ دھرمی مسلط ہو چکی ہے‘ یہ خواہ مخواہ مجھ سے الجھ رہا ہے‘ بات کو سمجھنا اس کے پیش نظر سرے سے ہے ہی نہیں‘ تو بڑی خوبصورتی سے سلام کہہ کر اس سے علیحدہ ہو جائے۔ بعض جوشیلے قسم کے مبلغین ایسے موقع پر تلخی پر اتر آتے ہیں‘ تلخ کلامی اختیار کر لیتے ہیں‘ یا علیحدہ بھی ہوتے ہیں تو اس طور سے گویا لٹھ مار کر علیحدہ ہو رہے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ پھر دوبارہ گفتگو کا موقع باقی نہیں رہتا۔ اگر آپ خوبصورتی کے ساتھ علیحدگی اختیار کریں تو موقع رہے گا کہ آپ آئندہ کسی مناسب وقت پر جب یہ محسوس کریں کہ یہ شخص سمجھنے سمجھانے کے موڈ میں ہے تو اس کے سامنے دوبارہ اپنی بات رکھنے کی پوزیشن میں ہو سکتے ہیں۔ یہ دونوں چیزیں بڑی ہی پختہ شخصیت کے نمایاں اوصاف میں سے ہیں‘ جن سے یہاں گفتگو کا آغاز ہو رہا ہے۔

(۳) قیام اللیل کا اہتمام

اس کے بعد فرمایا: ﴿وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا ۝۶۴﴾ ''اور جو راتیں بسر کرتے ہیں اپنے ربّ کے حضور میں سجدہ کرتے ہوئے اور دست بستہ کھڑے رہ کر''۔ اب یہاں ایک فوری

تقابل (simultaneous contrast) آپ کے سامنے رہے۔ ہمارے سابقہ درس میں نماز کا ذکر بار بار آیا تھا: ﴿قَدۡ اَفۡلَحَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ۙ﴿۱﴾ الَّذِیۡنَ هُمۡ فِیۡ صَلَاتِهِمۡ خٰشِعُوۡنَ ۙ﴿۲﴾﴾ اور پھر ان اوصاف کا اختتام ان الفاظِ مبارکہ پر ہوا: ﴿وَالَّذِیۡنَ هُمۡ عَلٰی صَلَوٰتِهِمۡ یُحَافِظُوۡنَ ۘ﴿۹﴾﴾ یعنی ابتدا بھی صلوٰۃ کے ذکر سے اور اختتام بھی صلوٰۃ کے ذکر پر۔ پہلے صلوٰۃ میں خشوع کا ذکر ہے جو اِس کی باطنی روح ہے اور آخر میں صلوٰۃ کی محافظت اور مداومت کا ذکر ہے۔ لیکن یہاں رات کی نماز یعنی تہجد کا ذکر ہے۔ اس لیے کہ ایک مسلمان میں جو بنیادی اوصاف درکار ہیں' جن سے تعمیر سیرت کا وہ پروگرام وجود میں آتا ہے جو قرآن مجید دیتا ہے' اس کی ابتدا و انتہا اقامت الصلوٰۃ یعنی نمازِ پنجگانہ کا اہتمام ہے جو فرض ہے۔ اس کی پابندی کرنا' اس کے تمام آداب اور جملہ شرائط کے ساتھ اس کی ادائیگی کا اہتمام کرنا ضروری ہے۔ لیکن یہاں بات بالکل دوسری ہے۔ یہاں تو اس سطح کی گفتگو ہو رہی ہے جہاں ایک انسان اللہ تعالیٰ کی محبوبیت کا مقام اور درجہ حاصل کر لے۔ یہاں جس نماز کا ذکر ہے وہ رات کی تنہائی کی نماز ہے۔ ارشاد ہو رہا ہے: ﴿وَالَّذِیۡنَ یَبِیۡتُوۡنَ لِرَبِّهِمۡ سُجَّدًا وَّقِیَامًا ﴿۶۴﴾﴾ یعنی اُن کی راتوں کا نقشہ اُن لوگوں کی راتوں کی کیفیت سے بالکل مختلف ہے جو غفلت میں پڑے ہوئے ہیں' جو پوری رات پاؤں پھیلا کر سوتے ہیں۔ ان کو اس غفلت کا احساس تک نہیں ہوتا' کیونکہ ان کے دل میں کوئی لگن نہیں ہے' ان کے دل میں اللہ کی محبت کا جذبہ نہیں ہے ---- لیکن جن لوگوں کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کی محبت گھر کر چکی ہو اُن کو ان کا وہ جذبۂ محبت رات کے وقت سونے نہیں دیتا۔ وہ رات کو بار بار اٹھتے ہیں' اپنے ربّ کے حضور دست بستہ کھڑے ہوتے ہیں یا اپنے ربّ کے سامنے سجدہ ریز رہتے ہیں۔ نبی اکرم ﷺ کی رات کی نماز کی کیفیات کے متعلق ہمیں روایات میں یہ نقشہ ملتا ہے کہ آپؐ راتوں کو بار بار اٹھتے تھے' چونک چونک کر اٹھتے تھے اور آپؐ اپنے ربّ کے سامنے نماز میں دست بستہ کھڑے ہوتے تھے' سجدہ ریز ہوتے تھے۔ بندۂ مؤمن کی شخصیت کے تکمیلی اوصاف میں یہ رات کی نماز یعنی تہجد یا قیام اللیل عظیم ترین اہمیت کی حامل ہے ---- اور اساسی و بنیادی اوصاف میں سب سے زیادہ اہم وصف اقامت الصلوٰۃ' یعنی پنج وقتہ فرض نماز کی پابندی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جو لوگ رات کے وقت کی اس نماز کی پابندی کر رہے ہوں' کیسے ممکن ہے کہ وہ فرض نمازوں کے نظام میں کسی درجہ میں بھی کوتاہی یا غفلت سے کام لیں ----!!

(۴) عذابِ جہنم سے بچاؤ کی دُعا

اس کے بعد فرمایا کہ اپنے ربّ کے سامنے اس قیام اللیل کے نتیجہ میں جو دعا ان کے دل سے نکل کر زبان پر آتی ہے وہ یہ ہے کہ: ﴿رَبَّنَا اصۡرِفۡ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ ۖ﴾ ''اے ربّ ہمارے! جہنم کی سزا کو ہم سے دُور کر دے (ہمیں اس سے بچا)''۔ اس میں درحقیقت اس طرف اشارہ کیا جا رہا ہے کہ جہاں مخلوق کے سامنے ان کی روش تواضع اور فروتنی کی ہوتی ہے' وہاں وہ اپنے ربّ کے سامنے بھی نہایت عاجزی کا انداز اختیار کرتے ہیں۔ انہیں اپنی نیکی پر کوئی فخر یا غرور نہیں ہوتا۔ وہ کسی زعم یا گھمنڈ میں مبتلا نہیں ہوتے' بلکہ اُن کو ہمیشہ یہ فکر دامن گیر رہتی ہے کہ نمعلوم ہمارے اعمال اللہ تعالیٰ کے یہاں قبول ہو رہے ہیں یا نہیں! لہٰذا اُن پر ایک لرزہ طاری رہتا ہے۔ یہ مضمون اس سے پہلے سورۃ النور کے پانچویں رکوع کی آیات میں آ چکا ہے کہ وہ لوگ اپنے ربّ کے عذاب سے خائف رہتے ہیں' لرزاں و ترساں رہتے ہیں —— چنانچہ ہم کبار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے حالات میں یہ پڑھتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ایک عجیب کیفیت کے عالم میں یہ فرمایا کرتے تھے کہ کاش میں گھاس کا ایک تنکا ہوتا جو جلا دیا جاتا ہے اور اس سے کوئی حساب کتاب نہیں ہوگا! کاش میں درختوں پر چہچہانے والی ایک چڑیا ہوتا جو چہچہاتی ہے' پھر ختم ہو جاتی ہے' لیکن اس سے کوئی محاسبہ نہیں ہوگا! حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں آتا ہے کہ ویسے تو آپؓ کا جسم بہت گٹھا ہوا اور بڑا مضبوط تھا' لیکن جب آپؓ نماز میں کھڑے ہوتے تھے تو جسم خشیتِ الٰہی سے نرم پڑ جاتا تھا۔ ایک مرتبہ آپؓ کے جسم میں ایک تیر پیوست ہو گیا جو نکالے نکل نہیں رہا تھا۔ آپؓ نے فرمایا کہ مجھے نماز کی نیت باندھ لینے دو' اس حالت میں تیر نکال لینا۔ یہ ہے وہ کیفیت: ﴿وَالَّذِيۡنَ يَقُوۡلُوۡنَ رَبَّنَا اصۡرِفۡ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ ۖ﴾۔ اس کے ساتھ ہی فرمایا: ﴿اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا ﴿۶۵﴾﴾ ''یقیناً اس کا عذاب تو چمٹ جانے والی چیز ہے''۔ یہ عذاب تو جان کو لاگو ہو جانے والا ہے' اس سے انسان کو چھٹکارا نہیں ملے گا۔

آگے جہنم کے بارے میں الفاظ آئے ہیں: ﴿اِنَّهَا سَآءَتۡ مُسۡتَقَرًّا وَّمُقَامًا ﴿۶۶﴾﴾ ''یقیناً وہ مستقر بھی بہت بُرا ہے اور مقام بھی''۔ عربی زبان میں ''مستقر'' جائے قرار کو کہتے ہیں جہاں انسان کا مستقل ٹھکانا ہو۔ اردو میں بھی مستقر اِسی معنی میں مستعمل ہے —— اور ''مقام'' کے معنی ہیں قیام کی جگہ۔ جہاں بھی تھوڑی دیر کے لیے انسان رکتا ہے وہ اُس کا مقام ہے۔ تو اِن الفاظ کے ذریعے یہ تأثر دیا جا رہا ہے کہ جہنم اتنی بُری جگہ ہے کہ اگر کسی کی مستقل جائے قرار بن جائے تو اس کی بربادی' رسوائی

اور ہلاکت کا ذکر ہی کیا ہے! یہ تو اتنی بری جگہ ہے کہ اس میں اگر تھوڑی دیر کے لیے بھی قیام ہو تو یہ اپنی تمام ہولناکیاں اور سختیاں پورے طور پر ظاہر کر دے گی۔ عام طور پر ہمارا یہ تصور ہے کہ کسی اچھی سے اچھی جگہ پر بھی اگر مستقل رہنا پڑے تو اس میں دلچسپی اور رعنائی نہ رہے گی' انسان اُکتا جائے گا' اور بری سے بری جگہ پر بھی انسان اگر تھوڑی دیر کے لیے چلا جائے تو یہ تبدیلی اس کے لیے تفریح کا ذریعہ بن جائے گی۔ لیکن یہاں الفاظ ہیں: ﴿اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ۝﴾—— اور اس رکوع کے آخر میں جنت کے بارے میں آیا ہے: ﴿حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ۝﴾. یہ بھی ایک فوری تقابل کے لیے ہے کہ جنت اتنی اچھی جگہ ہے کہ انسان اس میں ہمیشہ کے لیے رہے گا تب بھی اس جنت کی رعنائیوں' دل آویزیوں' لطافتوں اور دلچسپیوں میں اسے کوئی کمی محسوس نہیں ہوگی' انسان اکتائے گا نہیں' اور جہنم اتنی بری جگہ ہے کہ ایک لمحہ کے لیے بھی اگر کسی کو اس میں داخل کر دیا جائے تو وہ اپنی ساری شدتیں' اپنی ساری غلظتیں' اپنی ساری کلفتیں آنِ واحد میں ظاہر کر دے گی۔

(۵) اخراجات میں میانہ روی

اس کے بعد فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ۝﴾

''اور وہ لوگ کہ جب خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں نہ بخل' بلکہ ان کا خرچ دونوں انتہاؤں کے درمیان اعتدال پر قائم رہتا ہے''۔

میانہ روی اختیار کرنا بھی شخصیت کی پختگی اور بالغ نظری کی علامت ہے۔ یعنی ایسا نہ ہو کہ اگر ایک وقت ہاتھ کشادہ ہے تو انسان اللّوں تللّوں میں پیسہ اڑا دے اور اگر کسی وقت تنگی ہوگئی ہو تو انسان بالکل بجھ کر رہ جائے—— اور نہ ایسا ہو کہ جہاں خرچ لازمی اور ضروری ہو وہاں وہ ہاتھ روک لے' یہ بخیلی ہے۔ ان تین رویوں کے بجائے ایک بین بین اور معتدل روش اختیار کرنا ایک اعلیٰ و ارفع وصف ہے۔ لہٰذا فرمایا کہ وہ لوگ جو جب خرچ کرتے ہیں تو نہ اسراف سے کام لیتے ہیں اور نہ بخل سے' بلکہ ان کا طرزِ عمل اس کے بین بین ہوتا ہے۔ یہ بات بھی سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع کے آخر میں آئی تھی: ﴿وَاقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ﴾ ''اپنی چال میں میانہ روی اختیار کر''—— یہاں چال ڈھال میں بھی اعتدال مراد ہے اور خرچ میں بھی—— تو وہی وصف ہے جو یہاں ایک دوسرے اسلوب سے بیان ہوا۔

(٦) کبیرہ گناہوں سے اجتناب

اگلی دو آیات میں فرمایا:

﴿ وَالَّذِیْنَ لَا یَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰہِ اِلٰـھًا اٰخَرَ وَلَا یَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰہُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا یَزْنُوْنَ ۚ وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِکَ یَلْقَ اَثَامًا ﴿٦٨﴾ یُّضٰعَفْ لَہُ الْعَذَابُ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ وَیَخْلُدْ فِیْہٖ مُھَانًا ﴿٦٩﴾﴾

''اور وہ لوگ جو نہیں پکارتے اللہ کے سوا کسی اور معبود کو' اور نہ وہ قتل کرتے ہیں کسی جان کو جسے اللہ نے محترم ٹھہرایا ہے مگر حق کے ساتھ' اور نہ ہی وہ زنا کرتے ہیں' اور جو کوئی یہ کام کرے گا وہ اس کی پاداش پائے گا۔ دوگنا کیا جائے گا اس کے لیے عذاب کو قیامت کے دن' اور وہ رہے گا اس میں ہمیشہ ہمیش نہایت ذلیل وخوار ہو کر''۔

اُن مثبت اوصاف اور مثبت اقدار کے ذکر کے بعد جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہیں' جن سے ایک بندۂ مؤمن کی شخصیت میں دل آویزی اور جاذبیت پیدا ہوتی ہے اور جو ایک مؤمن کی شخصیت کی پختگی اور "maturity" کی علامات ہیں' اب ان دو آیات میں اندازِ بیان منفی ہے۔ یعنی عباد الرحمٰن میں یہ چیزیں بالکل نہیں ہوتیں' وہ اِن چیزوں کے قریب بھی نہیں پھٹکتے۔

اس سلسلے میں قرآن مجید کی حکمت کا ایک اہم باب ہمارے سامنے آ رہا ہے کہ وہ کون کون سے کام ہیں جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ مغضوب اور مبغوض ہیں' جن سے وہ سخت ناراض ہوتا ہے اور جن سے اس کا غیظ وغضب شدید ترین طور پر بھڑکتا ہے۔ یا بالفاظِ دیگر یوں سمجھئے کہ ہمارے یہاں جو یہ تصور ہے کہ ایک گناہ کبیرہ ہوتے ہیں اور ایک گناہ صغیرہ ہوتے ہیں —— تو ہم سمجھیں کہ کبیرہ گناہوں میں چوٹی کے گناہ کون سے ہیں! ان دو آیات میں سے پہلی آیت چوٹی کے تین گناہوں کو معین کر رہی ہے۔ یعنی اس ایک آیت میں کبائر میں سے درجہ بدرجہ تین سب سے بڑے گناہوں کا ذکر ہے۔

__اکبر الکبائر__: سب سے کبیرہ گناہ' عظیم ترین گناہ' جس کے بارے میں سورۃ النساء میں دو مرتبہ یہ الفاظ وارد ہوئے: ﴿اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَاءُ﴾ (آیت ۴۸ و ۱۱۶) ''بے شک اللہ اِس کو تو ہرگز معاف نہیں فرمائے گا کہ اُس کے ساتھ شرک کیا جائے' البتہ اس سے کمتر (گناہ) جس کے لیے چاہے گا معاف فرما دے گا'' —— گویا قرآن مجید کی رُو سے ہمارے دین میں سب سے بڑا جرم' سب سے بڑا اور قطعی ناقابلِ معافی گناہ شرک ہے۔

سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع کے درس کے ضمن میں ''اقسامِ شرک'' کے موضوع پر کچھ مختصر گفتگو ہوئی تھی کہ ایک شرک ہے شرک فی الذات۔ یعنی اللہ کی ذات کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا۔ اور ایک شرک وہ ہے جو اللہ کی صفات کے ضمن میں ہے' یعنی شرک فی الصفات ——— اور تیسرا شرک ہے شرک فی العبادت۔ اور نبی اکرم ﷺ نے عبادت کے لبِّ لباب کی حیثیت دعا کو دی ہے۔ ارشادِ نبویؐ ہے: ((اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ)) (۱) ''دعا عبادت کا اصل جوہر ہے''۔ اور: ((اَلدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ)) (۲) ''دعا ہی اصل عبادت ہے''۔ لہٰذا یہاں نوٹ کیجیے کہ الفاظ آئے ہیں: ﴿وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ﴾ ''اور وہ لوگ جو اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو نہیں پکارتے''۔ یہ پکارنا کس مقصد کے لیے ہوتا ہے؟ ظاہر ہے کہ استمداد' استدعا' استغاثہ اور استعانت کے لیے۔ یعنی پکارنا کسی کو اپنی کسی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ——— پکارنا کسی کو اپنی کسی مصیبت کو دُور کرنے کے لیے ——— پکارنا کسی کو اپنی حاجت روائی کے لیے ——— پکارنا کسی کو اپنی مشکل کشائی اور دستگیری کے لیے ——— پکارنا کسی کو اپنی مدد و اعانت کے لیے۔ غور کیجیے یہاں یہ نہیں فرمایا کہ ''اللہ کو چھوڑ کر کسی اور معبود کو نہیں پکارتے'' بلکہ واضح کر دیا گیا کہ: ''اللہ کے ساتھ کسی اور کو پکارنا'' یہ شرک ہے۔ بس یوں سمجھئے کہ ہمارے دین میں شرک تو اکبر الکبائر ہے۔ کبیرہ گناہوں میں سے سب سے بڑا کبیرہ گناہ شرک ہے۔ چنانچہ آغاز میں سب سے پہلے اُسی کا ذکر ہوا۔ اس لیے کہ درحقیقت شرک سے انسان کا نقطۂ نظر غلط ہو جاتا ہے۔ گویا پہلی اینٹ ہی ٹیڑھی لگ گئی تو اس کے بعد اس کا جو نتیجہ نکلے گا وہ ظاہر ہے کہ ؎

خشت اوّل چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

پھر تو کجی ہی کجی ہوگی۔ انسان کی اپنی ذاتی سیرت میں بھی کجی ہوگی۔ ایسے لوگوں پر مشتمل جو معاشرہ وجود میں آئے گا وہ بھی کج ہوگا۔ لہٰذا یہاں سب سے پہلے شرک کا ذکر ہوا۔

قتل ناحق: دوسرے بڑے گناہ کا ذکر بایں الفاظ ہوا: ﴿وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ﴾ ''اور جو نہیں قتل کرتے کسی جان کو جسے اللہ نے محترم ٹھہرایا ہے' مگر حق کے ساتھ''۔ اس کا تعلق انسانی جان کے احترام سے ہے۔ یہ بات جان لیجیے کہ شرک کے بعد سب سے بڑا گناہ قتلِ عمد

(۱) سنن الترمذی' کتاب الدعوات عن رسول اللہ ﷺ' باب المنہ۔

(۲) سنن الترمذی' کتاب تفسیر القرآن عن رسول اللہ ﷺ' باب ومن سورۃ البقرۃ۔

ہے‘ اس لیے کہ اس سے تمدن کی جڑ کٹ جاتی ہے۔ یہ جو ہم کہتے ہیں کہ انسان ایک متمدن حیوان ہے‘ انگریزی میں کہا جاتا ہے کہ "Man is a gregarious animal" تمدن کی بنیاد مل جل کر رہنا ہے۔ تہذیب‘ تمدن اور حضارت مل جل کر رہنے سے ہی وجود میں آتی ہے‘ اور اس کی جڑ اور بنیاد یہ ہے کہ انسان ایک دوسرے کی جانوں کا احترام کریں۔ اگر احترامِ جان ہی ختم ہو گیا تو گویا تمدن کی اساس ہی منہدم ہو گئی۔ لہٰذا تہذیب و تمدن کی بقا کے لیے لازم ہے کہ معاشرے کے اندر احترامِ جان کا پورا پورا اہتمام والتزام رہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانی جان کو بہت محترم ٹھہرایا ہے۔ البتہ بعض ایسی صورتیں ضرور ہیں کہ جہاں کوئی شخص قانون کی زد میں آ کر قتل کا مستوجب قرار پائے گا اور اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔

شریعت میں ﴿اِلَّا بِالْحَقِّ﴾ کی مصداق چار صورتیں ہیں۔ پہلی یہ کہ قتلِ عمد کی صورت میں اگر مقتول کے وارث دیت یا خون بہا لینے کے لیے بھی آمادہ نہ ہوں اور معاف کرنے کے لیے بھی تیار نہ ہوں تو جان کے بدلے جان لی جائے گی۔ ازروئے الفاظِ قرآنی: ﴿اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ﴾ (المائدۃ:۴۵) ’’کہ جان کے بدلے جان ہے۔‘‘ دوسری یہ کہ کوئی شخص شادی شدہ ہونے کے باوجود زنا کرے تو شریعت میں اس کے لیے رجم کی سزا ہے کہ اس کو سنگسار کیا جائے تا آنکہ وہ ہلاک ہو جائے۔ تیسری یہ کہ اسلام میں ارتداد کی سزا قتل ہے۔ چوتھی یہ کہ وہ کافر جو حربی ہو‘ جس کے ساتھ باقاعدہ اور اعلانیہ جنگ ہو رہی ہو۔ کسی اسلامی ریاست کا پُرامن ذمی یا معاہد غیر مسلم اس کا مصداق نہیں بن سکتا۔ اس کی جان تو اتنی ہی محترم ہے جتنی کسی مسلمان کی جان ہے۔ اُسے وہی تحفظات حاصل ہیں جو کسی مسلمان کو حاصل ہوتے ہیں۔ البتہ جہاں کفار و مشرکین کے ساتھ جنگ ہو رہی ہو وہاں کافر کی جان مؤمن کے لیے حلال ہو گی۔ ان چار صورتوں کے سوا کسی بھی حالت میں انسانی جان کا لینا قتل ناحق ہو گا —— اور اس آیت مبارکہ کی رُو سے قتلِ ناحق کے متعلق یہ جان لیجیے کہ دینِ اسلام کے نظام میں شرک کے بعد یہ سب سے بڑا جرم ہے۔

جنسی بے راہ روی: تیسری بات فرمائی کہ: ﴿وَلَا یَزْنُوْنَ﴾ ’’اور وہ زنا نہیں کرتے‘‘ —— ہم اس سے پہلے سورۃ المؤمنون اور سورۃ المعارج کی بعض آیات کے درس میں دیکھ چکے ہیں کہ اپنے شہوانی جذبات پر قابو پانے (sex discipline) کی کتنی اہمیت بیان ہوئی ہے۔ دونوں مقامات پر فرمایا: ﴿وَالَّذِیْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝۵ اِلَّا عَلٰۤی اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَیْرُ مَلُوْمِیْنَ ۝۶ فَمَنِ ابْتَغٰی وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۝۷﴾ یہاں وہی بات ہے لیکن

اسلوب منفی ہے۔ وہاں مثبت پہلو سے بیان کیا گیا کہ وہ لوگ اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں' اپنی شہوت پر قابو یافتہ ہیں' حلال راستہ کے علاوہ اپنی شہوت کی تسکین کے لیے کوئی حرام راستہ اختیار نہیں کرتے۔ یہاں وہی بات منفی اسلوب سے بیان فرمائی کہ ''وہ زنا نہیں کرتے''۔ البتہ یہاں جس سیاق (context) میں یہ بات آئی ہے اس سے ہمارے سامنے یہ عظیم حقیقت آتی ہے کہ قتلِ ناحق کے بعد سب سے بڑا جرم زنا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس معاشرے میں یہ فعلِ بد رواج پا جائے اس میں سے اعتمادِ باہمی اور محبت والفت بالکل ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس لیے کہ باہمی محبت کا سرچشمہ ایک شوہر اور اُس کی بیوی کے مابین اعتماد کا احساس ہے۔ اگر یہ اعتماد موجود ہے تو محبت بھی ہوگی' مودّت بھی ہوگی اور یہ خاندان اس دنیا میں جنت کے باغیچوں میں سے ایک باغیچہ کی کیفیت کا مظہر بن جائے گا۔ لیکن اگر کسی معاشرہ میں بدچلنی کا رواج ہو جائے' شوہر کو بیوی پر اعتماد نہ رہے اور بیوی کا شوہر پر سے اعتماد اٹھ جائے اور بے اعتمادی باہمی اعتماد کی جگہ لے لے تو اُس معاشرے میں اعلیٰ اوصاف کبھی ترقی نہیں کریں گے۔ جو نئی نسل اس گھر میں پرورش پائے گی اس میں حسنات اور اعلیٰ اخلاق کبھی بھی نشوونما نہیں پاسکیں گے' بلکہ ایسے ماحول میں پرورش پانے والی نسل میں ایک منفی کردار پیدا ہو جائے گا۔ تو گویا زنا وہ چیز ہے جو تمدن میں حسن وخوبی کے پھول کھلانے کے بجائے اسے ایک متعفن سنڈاس بنا کر رکھ دے گی۔ لہٰذا تیسری چیز فرمائی: ﴿وَلَا یَزۡنُوۡنَ﴾ ''اور وہ زنا نہیں کرتے''۔

گناہ کا خمیازہ' اور رستگاری کی واحد صورت: توبہ

اِن تین سب سے بڑے گناہوں کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا: ﴿وَمَنۡ یَّفۡعَلۡ ذٰلِکَ یَلۡقَ اَثَامًا ﴿۶۸﴾﴾ ''اور جو کوئی بھی یہ کرے گا وہ اس کی پاداش بھگت کر رہے گا''۔ یعنی جو کوئی بھی ان میں سے کسی فعل کا ارتکاب کرے گا ـــــ یعنی شرک کرے گا' اللہ کے ساتھ کسی اور کو بھی حاجت روائی اور مشکل کشائی کے لیے پکارے گا' کسی اور کی بھی عبادت کرے گا' یا وہ انسانی جان ناحق لے گا' انسانی خون ناحق بہائے گا' یا وہ زنا کرے گا ـــــ تو وہ جان لے کہ اس کی پاداش اس کو بھگتنی پڑے گی۔ وہ یہ نہ سمجھے کہ بچ نکلے گا' کوئی گرفت نہیں ہے' کوئی سزا نہیں ہے۔ اگر اس دنیا میں اسے سزا نہیں ملی تو آخرت میں اسے اس کا بھرپور خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔

اگلی آیت میں فرمایا: ﴿یُّضٰعَفۡ لَہُ الۡعَذَابُ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ﴾ ''قیامت کے دن اس کے لیے

عذاب دو گنا کر دیا جائے گا''——اس کا ایک مفہوم تو یہ لیا گیا ہے کہ یہ عذاب بڑھتا چلا جائے گا' اس میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔ بجائے اس کے کہ سزا اور عذاب میں تخفیف یا کمی واقع ہو' اس کی تندی اور سختی میں زیادتی ہوتی چلی جائے گی۔ لیکن اس کا ایک دوسرا مفہوم بھی ہے' جو اپنے اندر ایک لطیف نکتہ لیے ہوئے ہے۔ بعض حضرات کا یہ گمان ہے کہ عذابِ اُخروی اور یوم القیامۃ سے قبل عالم برزخ کے عذاب یا بالفاظِ دیگر عذابِ قبر کی جو خبریں احادیث نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں ہیں' قرآن مجید میں ان کا ذکر نہیں ہے۔ تو ایسے سب حضرات کے لیے جو قرآن میں ذکر نہ ہونے کی وجہ سے عذابِ قبر کو تسلیم کرنے میں متامل ہیں' یہ مقام بہت ہی لائقِ توجہ ہے۔ فرمایا: ﴿یُضٰعَفۡ لَہُ الۡعَذَابُ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ﴾ ''دو گنا کر دیا جائے گا اس کے لیے عذاب قیامت کے دن''۔ اس سے یہ بات آپ سے آپ نکل رہی ہے کہ قیامت کے دن سے پہلے بھی عذاب موجود ہے' جس کو دو گنا کرنے یا جس میں اضافہ کرنے کا یہاں ذکر کیا جا رہا ہے۔ یہی وہ عذاب ہے جسے ہم عذابِ قبر سے تعبیر کرتے ہیں اور جس کی خبر ہمیں نبی اکرم ﷺ نے احادیث میں دی ہے' اور یہ احادیث محدثین کے مقرر کردہ سخت سے سخت معیار کے مطابق مستند اور صحیح تسلیم کی گئی ہیں۔

اگر کسی کو یہ اشکال ہو کہ ابھی قیامت کی عدالت تو لگی ہی نہیں' ابھی حساب کتاب اور وزنِ اعمال تو ہوا ہی نہیں تو اس سے پہلے سزا کیسی؟ تو ان کے اطمینان کے لیے عرض ہے کہ انسان جو کچھ کرتا ہے اسے خوب جانتا ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿بَلِ الۡاِنۡسَانُ عَلٰی نَفۡسِہٖ بَصِیۡرَۃٌ ﴿۱۴﴾﴾ یہ آیت ہم سورۃ القیامۃ میں پڑھ چکے ہیں۔ وہ طالب علم جس نے امتحان میں کچھ نہیں کیا' وہ جانتا ہے کہ اس نے پرچے کیسے کیے ہیں۔ چنانچہ امتحان کا نتیجہ نکلنے سے پہلے ہی اس کی جان سوکھتی رہتی ہے۔ اس کو معلوم ہوتا ہے کہ میری کارکردگی کیا ہے جس کا نتیجے کے طور پر اعلان ہونے والا ہے۔ نتیجے کے اعلان کے دن سے پہلے ہی وہ گویا ایک نوع کے کرب اور کوفت کی کیفیت میں مبتلا ہوتا ہے۔ تو یہی ہے اصل حقیقت کہ اس دنیا سے عالمِ برزخ کی طرف منتقل ہونے کے فوراً بعد اس چیز کا ایک عکس انسان کی روح پر پڑنا شروع ہو جاتا ہے جو کچھ اس نے اس دنیا میں کیا ہے۔ یہی ہے وہ بات جس کو نبی اکرم ﷺ نے یوں تعبیر فرمایا کہ ''قبر جنت کے باغیچوں میں سے ایک باغیچہ یا دوزخ کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے''۔ اِدھر آنکھ بند ہوئی' اُدھر عالم برزخ میں آنکھ کھل گئی' اور اس میں انسان پر ان کیفیات کا ایک عکس پڑنا شروع ہو جاتا ہے جن سے اُسے بالآخر اپنے اعمال کی پاداش میں قیامت کے دن دوچار ہونا

ہے۔ اس آیت مبارکہ کے ایک حصہ میں کس قدر خوبصورتی سے اس طرف ایک لطیف اشارہ آ گیا: ﴿یُضٰعَفُ لَهُ الْعَذَابُ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ﴾ قیامت کے دن تو عذاب دوگنا ہو جائے گا' عذاب بڑھ چڑھ کر آئے گا اور پھر انسان اس میں ہمیشہ ہمیش رہے گا۔ ﴿وَیَخْلُدْ فِیْهٖ مُهَانًا ﴿۶۹﴾﴾ خلود اور دوام اس کا مقدر ہوگا اور وہ اس میں رہے گا نہایت ذلیل وخوار ہو کر' رسوا ہو کر۔ اور یہ ذلت بھی دائمی ہوگی' اس سے رستگاری ممکن نہیں ہوگی۔ البتہ ایک استثناء ہے جو اگلی آیت میں بیان ہو رہا ہے:

﴿اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ یُبَدِّلُ اللّٰهُ سَیِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ؕ وَکَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ﴿۷۰﴾ وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّهٗ یَتُوْبُ اِلَی اللّٰهِ مَتَابًا ﴿۷۱﴾﴾

''سوائے اس کے جو تائب ہوا اور ایمان لایا اور اس نے اچھے عمل کیے' تو یہ وہ لوگ ہیں کہ جن کی برائیوں کو اللہ بھلائیوں اور نیکیوں سے بدل دے گا' اور اللہ تو ہے ہی مغفرت فرمانے والا' رحم فرمانے والا۔ اور جو توبہ کرتا ہے اور اچھے عمل کرتا ہے تو وہی ہے جو توبہ کرتا ہے اللہ کی جناب میں جیسا کہ توبہ کرنے کا حق ہے''۔

توبہ کی حقیقت واہمیت

ان دو آیات کا مضمون ان سے پہلی دو آیات سے مربوط ہے' جن میں تین بڑے بڑے گناہوں کا ذکر کیا گیا' یعنی شرک' قتل ناحق اور زنا —— اور فرمایا گیا کہ جو کوئی ان جرائم کا مرتکب ہوگا اسے سزا مل کر رہے گی' اور سزا بھی وہ جس میں اضافہ ہوتا رہے گا' اور پھر اس کے لیے خلود یعنی ہمیشہ ہمیش کے لیے سزا ہے۔ تو یہ نقشہ بعض اعتبارات سے خاصا مایوسی پیدا کرنے والا ہے کہ اگر کسی شخص سے ان میں سے کسی جرم کا ارتکاب ہوا ہو تو گویا یہ صورت حال اس کے لیے بڑی مایوس کن ہوگی۔ مایوسی کے اس اندھیرے میں اگلی دو آیات اُمید کی ایک کرن بن کر نمودار ہوتی ہیں۔

فرمایا: ﴿اِلَّا مَنْ تَابَ﴾ ہاں' جو توبہ کر لے وہ بچ جائے گا۔ معلوم ہوا کہ گناہ کے اثرات اشیاء کے مادی اور طبعی اثرات کی طرح نہیں ہیں کہ ان کا ظہور لازماً ہو۔ جیسے اگر آپ نے آگ میں انگلی ڈالی تو وہ لازماً جل کر رہے گی۔ اس کے بعد اگر آپ توبہ کریں تو اس توبہ سے آگ کا انگلی پر جو اثر ہوا ہے وہ زائل نہیں ہوگا' وہ جلی رہے گی۔ اس لیے کہ یہ ایک طبعی اثر (physical effect) ہے۔ لیکن اخلاقی جرائم کا معاملہ ایسا نہیں ہے۔ اگر کوئی گناہ ہوا ہو' کوئی خطا ہوئی ہو تو لازم نہیں ہے کہ اس کا اثر ضرور ظاہر ہو۔ بلکہ اس سے بچاؤ کا ایک راستہ ہے' اور وہ درحقیقت توبہ کا راستہ ہے۔ توبہ کی عظمت اور

توبہ کی حقیقت کے بیان میں قرآن کا یہ مقام نہایت اہم ہے۔ بلکہ اس اعتبار سے اس کو قرآن مجید کی چوٹی قرار دینا غلط نہ ہوگا۔

پہلے اصولی طور پر یہ سمجھ لیجیے کہ توبہ کی اہمیت کیا ہے! انفرادی اعتبار سے بھی یہ بات بڑی آسانی سے سمجھ میں آ جائے گی کہ اگر انسان اس مغالطہ میں مبتلا ہو کہ مجھ سے جو خطا ہو چکی ہے اس کی سزا تو مجھے لازماً بھگتنی پڑے گی' تو انسان پر مایوسی مسلط ہو جائے گی اور اصلاح کے لیے جو ہمت اور ارادہ درکار ہے' وہ اس میں باقی نہیں رہے گا۔ چنانچہ کتب احادیث میں ایک بہت ہی دلچسپ واقعہ ملتا ہے جو جناب نبی اکرم ﷺ نے صحابہؓ کو سنایا۔ اس حدیث کے راوی حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ ہیں اور یہ متفق علیہ روایت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم سے پہلے جو اُمتیں گزری ہیں ان میں سے کسی اُمت کے ایک فرد کا یہ واقعہ ہے کہ وہ بڑا سفاک قاتل تھا' اس نے ننانوے انسانوں کو قتل کیا تھا' لیکن پھر اس کی طبیعت میں کچھ تبدیلی پیدا ہوئی تو وہ ایک بہت بڑے عالم کے پاس گیا اور اس سے کہا کہ میں ننانوے انسانوں کو قتل کر چکا ہوں' کیا اب بھی میری مغفرت کا کوئی راستہ کھلا ہے؟ اُس عالم نے کہا کہ نہیں' تمہاری مغفرت کی اب کوئی سبیل نہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اس شخص نے اُس عالم کو بھی قتل کر دیا کہ میں ننانوے قتل تو پہلے ہی کر چکا ہوں' سو کیوں نہ پورے کرلوں! پھر اس نے ایک اور بڑے عالم کی طرف رجوع کیا۔ اس نے بتایا کہ نہیں' اللہ کی مغفرت و رحمت کا دروازہ کبھی بند نہیں ہوتا' اگر تم اب بھی صدقِ دل سے توبہ کرو تو اللہ تمہارے گناہ بخش دے گا۔ پھر اس عالم نے اس کی رہنمائی بھی کی کہ فلاں جگہ چلے جاؤ' وہاں تمہیں بہتر ماحول ملے گا۔ تم اب تک جس ماحول میں رہے ہو اگر تم اسی میں رہے تو شاید تم اپنی اصلاح نہ کرسکو۔ وہ شخص اپنی اصلاح کے ارادے سے اس مقام کی طرف چل پڑا جس کی رہنمائی اس عالم نے کی تھی۔ ابھی راستے ہی میں تھا کہ اس کی موت کا وقت آ گیا۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ اس کے بارے میں فرشتوں کے مابین یہ اختلاف رونما ہوا کہ اس کی روح کو عذاب والے فرشتے قبض کر کے لے جائیں یا رحمت والے فرشتے! اللہ کی طرف سے فرشتوں کو حکم ہوا کہ راستہ ماپ لو۔ وہ راستہ جس طرف وہ اصلاحِ احوال کی غرض سے قیام کے ارادے سے چلا تھا اگر اس راستہ سے کم رہ گیا ہے جو وہ طے کر چکا ہے تو اس کی روح کو رحمت کے فرشتے لے کر جائیں' بصورتِ دیگر اس کی روح کو عذاب والے فرشتے لے کر جائیں۔ راستہ ماپا گیا تو جس مقام کے ارادے سے وہ شخص چلا تھا وہ راستہ کم پایا گیا' لہٰذا رحمت والے فرشتے اس کی روح کو لے کر برزخ کی

طرف روانہ ہوئے۔ ایک حدیث میں وارد ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین کو حکم دیا تو وہ راستہ جو ابھی طے کرنا باقی تھا‘ وہ سمٹ گیا‘ جبکہ وہ راستہ جو وہ طے کر چکا تھا‘ وہ پھیل گیا۔

تو یہ ہے توبہ کا معاملہ انفرادی اصلاح کے ضمن میں کہ انسان جب بھی جاگ جائے‘ جب بھی ہوش میں آ جائے‘ اگر سچے دل سے توبہ کر لے تو اللہ تعالیٰ نے مغفرت کی امید دلائی ہے۔ ایک حدیث میں الفاظ آئے ہیں کہ خواہ اس کے گناہوں کا ڈھیر کوہِ اُحد جتنا بلند ہو تب بھی سچی توبہ کے عوض اللہ تعالیٰ ان کو معاف فرما دے گا۔ اور مغفرت کے ضمن میں قرآن مجید کی سب سے زیادہ امید افزا آیت سورۃ الزمر کی یہ آیت ہے:

﴿قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ ﴿۵۳﴾﴾

''(اے نبیؐ!) فرما دیجیے کہ اے میرے وہ بندو جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے‘ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ! اللہ تمام گناہ بخشنے کا اختیار رکھتا ہے۔ اور وہ ہے ہی بخشنے والا‘ رحم فرمانے والا''۔

دنیا کے دوسرے مذاہب نے اپنے فلسفۂ اخلاق میں توبہ کے بارے میں بہت ٹھوکریں کھائی ہیں جس کے باعث ان کا نقطۂ نظر بہت کج ہو گیا ہے۔ مثلاً ایک عقیدہ یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے جو خطا ہو گئی تھی‘ جب کہ انہیں آزمائشی طور پر جنت میں رکھا گیا تھا اور ایک خاص درخت کا پھل کھانے سے منع کر دیا گیا تھا مگر شیطان کے ورغلانے سے انہوں نے اس درخت کے پھل کو کھا لیا تھا‘ تو یہ گناہ گویا اب نسلِ آدم میں منتقل ہو رہا ہے۔ نوعِ انسانی کا جو بچہ پیدا ہو رہا ہے وہ پیدائشی طور پر گناہ گار ہوتا ہے‘ وہ اپنے جدامجد کے گناہ کی گٹھڑی لے کر اس دنیا میں آنکھیں کھولتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جہاں یہ غلط عقیدہ ہوگا وہاں اس پر مزید غلطیاں ہوں گی۔ چنانچہ پھر ''کفارہ'' کا عقیدہ ایجاد کیا گیا۔ یہ بنائے فاسد علی الفاسد ہے۔ اس کے برعکس قرآن مجید یہ بتاتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے غلطی ضرور ہوئی تھی‘ لیکن انہوں نے توبہ کی:

﴿رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ٚ وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ﴿۲۳﴾﴾

(الاعراف)

''اے ربّ ہمارے! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے‘ اب اگر تو ہم کو معاف نہیں فرمائے گا اور ہم پر رحم نہیں فرمائے گا تو لازماً ہم خسارہ اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے''۔

اور سورۃ البقرۃ میں فرمایا:

﴿فَتَلَقّٰی اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ؕ﴾ (آیت ۳۷)

''پس آدم نے کچھ کلمات اپنے ربّ سے حاصل کیے (اور جب ان کلمات کے ذریعے اللہ سے توبہ کی) تو اللہ نے ان کی توبہ قبول فرمالی''۔

مزید یہ کہ توبہ کے بارے میں نبی اکرم ﷺ کا یہ ارشاد بھی کتب احادیث میں موجود ہے:

((اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لاَ ذَنْبَ لَهٗ)) [1]

''جو کوئی گناہ سے توبہ کر چکا اس کے لیے کوئی گناہ ہے ہی نہیں''۔

گویا وہ ایسے ہے جیسے اس نے کبھی گناہ کیا ہی نہیں تھا۔ لہٰذا اب اس کا کوئی سوال نہیں ہے کہ نسل آدم علیہ السلام کا ہر بچہ پیدائشی طور پر گناہ گار رہو——معاذ اللہ! قرآن مجید کا فیصلہ تو یہ ہے:

﴿فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ؕ﴾ (الرّوم: ۳۰)

''اللہ کی وہ فطرت جس پر اس نے انسان کو پیدا کیا ہے''۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَا مِنْ مَوْلُوْدٍ اِلاَّ يُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ، فَاَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهٖ اَوْ يُنَصِّرَانِهٖ اَوْ يُمَجِّسَانِهٖ)) [2]

یعنی نسلِ آدم کا ہر بچہ فطرتِ اسلام پر پیدا ہوتا ہے' وہ تو اس کے والدین ہیں جو اُسے یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔ پس قرآن مجید کے فلسفہ میں اور بعض دوسرے مذاہب کے فلسفہ میں یہ بڑا عظیم فرق وتفاوت ہے۔

توبہ کی شرائط

اب ہمیں اس بات کو سمجھنا ہے کہ توبہ کی شرائط کیا ہیں! صرف زبان سے کہہ دینے سے توبہ نہیں ہو جائے گی۔ توبہ کی چند شرائط اور کچھ لوازم ہیں۔ اگر وہ شرائط پوری نہ ہوں تو چاہے آدمی توبہ کی تسبیح پڑھتا رہے اور صرف زبانی طور پر استغفار کا کتنا ہی ورد کرتا رہے اسے توبہ نہیں کہا جائے گا۔ چنانچہ امام نووی رحمہ اللہ نے جو بہت بڑے محدث گزرے ہیں ''ریاض الصالحین'' میں توبہ کے باب میں علمائے

(۱) سنن ابن ماجه ' کتاب الزهد' باب ذکر التوبة۔

(۲) صحیح البخاری' کتاب الجنائز' باب اذا اسلم الصبی فمات هل یصلی علیه وهل یعرض علی الصبی۔ وصحیح مسلم' کتاب القدر' باب معنی کل مولود یولد علی الفطرة وحکم موت اطفال الکفار وانفال المسلمین۔

اُمت کا اس بات پر اجماع نقل کیا ہے کہ اگر توبہ کسی ایسے گناہ کے ضمن میں ہو جو حقوق اللہ سے متعلق ہے تو اس کے صحیح ہونے کی تین شرائط ہیں۔ لیکن اگر کوئی گناہ حقوق العباد کے ضمن کا ہے تو ایک اضافی شرط مزید شامل ہو جائے گی۔ پہلی تین شرائط حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں میں مشترک ہیں۔

پہلی شرط یہ ہے کہ انسان کے دل میں سچی اور حقیقی ندامت ہو کہ میں اب تک جو کچھ کرتا رہا ہوں غلط کرتا رہا ہوں۔ اس پر واقعی پشیمانی ہو۔ اس حقیقت کو علامہ اقبال نے اپنے نوعمری کے دور کے اس شعر میں نہایت خوبصورتی سے بیان کیا ہے، جسے داغ دہلوی نے بہت پسند کیا تھا اور اس پر داد دی تھی کہ ؎

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چُن لیے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

تو اللہ کو بندے کی یہ پشیمانی اور ندامت بہت محبوب ہے۔

دوسری شرط یہ ہے کہ عزمِ مصمم ہو کہ اب یہ کام دوبارہ نہیں کروں گا۔ تیسری شرط یہ ہے کہ فی الواقع اس گناہ کو ترک کر دے اور عمل صالح کی روش اختیار کرے۔ یہ تین شرائط حقوق اللہ کے ضمن کے گناہوں سے متعلق ہیں—— اضافی چوتھی شرط حقوق العباد کے معاملے میں ہے۔ وہ یہ کہ اگر کسی انسان کا حق مارا ہے تو اس کی تلافی کرے، کسی کا مال ہڑپ کیا ہے تو وہ مال واپس کرے یا اس سے معافی طلب کرے، کسی کی غیبت کی ہے تو اس کے پاس جا کر معافی چاہے، کسی پر ظلم کیا ہے تو اس کے لیے مظلوم سے عفو اور درگزر حاصل کرے۔ اس لیے کہ یہ جو حقوق العباد ہیں انہیں اللہ تعالیٰ معاف نہیں فرمائے گا۔ اگر اس دنیا میں ان بندوں سے جن کی حق تلفی کی گئی ہے، معافی حاصل نہیں کی جائے گی تو آخرت میں نیکیوں اور گناہوں کا لین دین ہوگا۔ یعنی ظلم اور زیادتی کرنے والے شخص کی نیکیاں اس شخص کو دے دی جائیں گی جس کے حق پر اس دنیا میں دست درازی کی گئی تھی یا جس پر ظلم کیا گیا تھا۔ اگر زیادتی کرنے والے کی نیکیوں کا سرمایہ ختم ہو جائے گا تو پھر مظلوم کے گناہ ظالم کے وزنِ اعمال کے پلڑے میں ڈال دیے جائیں گے۔

چنانچہ اس آیت پر غور کیجیے، فرمایا: ﴿اِلَّا مَنۡ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا﴾ . یہاں صرف ایک لفظ ''تَابَ'' نہیں آیا، بلکہ اس کے ساتھ ایمان اور عمل صالح کا ذکر بھی ہے۔ توبہ کے معنی ہیں لوٹنا، پلٹنا، رجوع کرنا—— تو فرمایا: ﴿مَنۡ تَابَ وَاٰمَنَ﴾ ''جو توبہ کرے اور ایمان لائے''۔ اس کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اگر وہ پہلے کافر تھا، اب ایمان لا رہا ہے تو وہ بھی کفر سے پلٹنے اور ایمان

لانے کے اعتبار سے ان الفاظِ مبارکہ کے ذیل میں آ جائے گا۔ دوسرا یہ کہ اگر وہ مسلمان تھا اور مسلمان ہوتے ہوئے بھی گناہ کر رہا تھا تو درحقیقت اس گناہ کی وجہ سے جو قلبی یقین والا ایمان ہے وہ زائل ہو گیا تھا۔ اب جب وہ توبہ کر رہا ہے تو گویا تجدید ایمان کر رہا ہے اور اس کے دل میں از سرِ نو ایمان داخل ہو رہا ہے۔ جیسا کہ ایک حدیث میں نبی ﷺ نے فرمایا کہ ''جب کوئی شخص گناہ کرتا ہے تو ایمان اس کے دل سے نکل کر پرندے کے مانند اس کے سر پر منڈلاتا ہے۔ اب اگر وہ توبہ کرتا ہے تو ایمان اس کے دل میں لوٹ آتا ہے''۔ لہٰذا جب دل میں تصدیقِ قلبی والا اور یقین والا ایمان ہو تو اس کے اثرات لازماً عمل پر مترتب ہوں گے اور وہ درست ہو جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ توبہ کے فوراً بعد ایمان اور عملِ صالح کا ذکر کیا گیا۔

پھر اس توبہ‘ تجدیدِ ایمان اور اعمالِ صالحہ کے مرتبہ اور مقام کا ذکر بایں الفاظِ مبارکہ فرمایا: ﴿فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ؕ﴾ ''پس ایسے لوگوں کے نامۂ اعمال میں سے اللہ ان کی برائیوں کو محو فرما کر ان کی جگہ نیکیوں کا اندراج فرما دے گا''۔ یہ ہے اللہ کی نگاہ میں توبہ کی عظمت۔ اس آیت کا اختتام ان الفاظِ مبارکہ پر ہوتا ہے: ﴿وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝﴾ ''اور اللہ تو ہے ہی بخشنے والا‘ رحم فرمانے والا''۔ اس کی ذاتِ والا صفات میں مغفرت و رحمت کی شانیں بدرجۂ اتم موجود ہیں لہٰذا ایک مؤمن کو کبھی مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ گناہ کی معافی کے لیے اس کی رحمت و مغفرت کے دروازے لوگوں کے لیے ہر وقت کھلے ہوئے ہیں‘ بشرطیکہ وہ اس کی جناب میں پورے لوازم و شرائط کے ساتھ توبہ کریں۔

اگلی آیت میں اس بات کو پھر دہرایا گیا۔ عملِ صالح توبہ کی شرطِ لازم ہے۔ انسان توبہ توبہ کہتا رہے اور اس کا عمل وہی رہے جو پہلے تھا تو یہ توبہ نہیں ہے‘ یہ تو اپنے آپ کو دھوکہ دینا ہے۔ بلکہ فرمایا: ﴿وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّهٗ يَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا ۝﴾ ''اور جو شخص توبہ کرے اور عمل درست کر لے تو وہ ہے کہ جو اللہ کی جناب میں توبہ کرتا ہے جیسا کہ توبہ کرنے کا حق ہے''۔

عبادُ الرحمٰن کے مزید اوصاف

عبادالرحمٰن کے اوصاف کے ضمن میں اگلی آیات میں فرمایا گیا:

﴿وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ۝ وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا

بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا ۝ وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا ۝ اُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا وَيُلَقَّوْنَ فِيْهَا تَحِيَّةً وَّسَلٰمًا ۝ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَّ مُقَامًا ۝﴾

''اور وہ لوگ جو جھوٹ میں شرکت گوارا نہیں کرتے اور اگر اتفاقاً کسی لغو کام پر ان کا گزر ہو جائے تو وہ وہاں سے اپنا دامن بچاتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔ اور وہ جنہیں جب اپنے ربّ کی آیات کے ذریعے سے تذکیر اور نصیحت کی جاتی ہے تو وہ اس پر اندھے اور بہرے ہو کر گر نہیں پڑتے۔ اور وہ جو کہتے ہیں: اے ہمارے ربّ! ہمیں عطا فرما ہماری بیویوں اور اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک' اور ہمیں متقی لوگوں کا امام بنا۔ یہ ہیں وہ لوگ کہ جنہیں بدلے میں دیے جائیں گے بالا خانے بسبب ان کے صبر کے' اور اُن کا استقبال ہو گا جنت میں دعا اور سلام کے ساتھ۔ رہیں گے وہ اس میں ہمیشہ ہمیش۔ بہت ہی اچھی ہے وہ جگہ مستقل جائے قرار ہونے کے اعتبار سے بھی' اور تھوڑی دیر قیام کے لیے بھی''۔

سورۃ الفرقان کی مندرجہ بالا آیات میں پھر وہی مضمون آیا ہے جو اس سے پہلے اس رکوع کی تیسری آیت سے لے کر آٹھویں آیت تک آیا تھا۔ یعنی اللہ کے محبوب بندوں کے اوصاف۔ گویا وہ اوصاف جو اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہیں۔ اس رکوع کی تیسری سے آٹھویں آیت تک چھ اوصاف کا ذکر ہو چکا ہے' جن میں سے پہلا وصف تواضع ہے' یعنی وہ لوگ جو زمین پر فروتنی کے ساتھ چلتے ہیں' ان کی چال سے عجز و انکسار اور تواضع کا اظہار ہوتا ہے۔ دوسری صفت خواہ مخواہ کی بحث و تمحیص سے دامن بچانا ہے۔ اللہ کے ان محبوب بندوں سے جب مشتعل مزاج لوگ خواہ مخواہ حجت بازی پر اتر آتے ہیں تو وہ سلام کہہ کر ان سے جدا ہو جاتے ہیں۔ تیسرے یہ کہ شب کی عبادت میں اللہ کے محبوب بندے اپنی راتیں اللہ کے حضور سجدے اور قیام میں گزارتے ہیں: ﴿وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا ۝﴾. چوتھی صفت جہنم سے پناہ مانگتے رہنا بیان ہوئی' کہ اے ربّ ہمارے! ہمیں عذابِ جہنم سے بچالے۔ ان کی پانچویں صفت میانہ روی ہے' بالخصوص خرچ کے معاملہ میں: ﴿وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ۝﴾. چھٹی صفت کبیرہ گناہوں سے بچتے رہنا ہے' جس کا ذکر سورۃ الشوریٰ اور سورۃ النجم میں بایں الفاظ مبارکہ آیا ہے: ﴿وَالَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ﴾ ''اور وہ لوگ جو بڑے بڑے گناہوں اور فحش کاموں سے بالفعل مجتنب رہتے ہیں''۔ اور ہم کئی مرتبہ دیکھ چکے ہیں کہ از روئے قرآن مجید کبیرہ گناہوں میں سب سے بڑے اور چوٹی کے گناہ

تین ہیں: شرک، قتل ناحق اور زنا۔

ان چھ اوصاف کے ذکر کے بعد ایک ضمنی بحث توبہ کی حقیقت، توبہ کی اہمیت اور توبہ کی شرائط کے بارے میں آ گئی تھی۔ اب مضمون پھر اسی سلسلۂ گفتگو کی طرف لوٹ رہا ہے، یعنی عباد الرحمٰن کے اوصاف کیا کیا ہوتے ہیں۔

(۱) جھوٹ سے بیزاری

یہاں پہلا وصف بیان ہوا: ﴿وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ﴾. ''زُوْر'' جھوٹ کو کہتے ہیں اور شَهِدَ يَشْهَدُ کا معنی موجود ہونا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ وہ لوگ جھوٹ پر اپنی موجودگی بھی گوارا نہیں کرتے۔ کہیں جھوٹ کا معاملہ ہو رہا ہو، کہیں جھوٹ کی بنیاد پر لین دین ہو رہا ہو، کہیں کوئی سازش ہو رہی ہو، کہیں کچھ جھوٹ گھڑے جا رہے ہوں تو ایسی جگہوں پر انہیں اپنی موجودگی تک گوارا نہیں۔ ظاہر بات ہے کہ جھوٹی گواہی اس میں از خود آ جائے گی۔ جو لوگ جھوٹ میں ادنیٰ درجہ کی شرکت اور شمولیت گوارا نہیں کرتے وہ جھوٹی گواہی کیونکر دیں گے؟

(۲) لغویات سے کنارہ کشی

دوسرا وصف ہے: ﴿وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ۝٧٢﴾ یعنی وہ لوگ کہ جن کا کسی لغو اور بے کار کام کی طرف قصداً اور ارادہ کر کے جانا تو سرے سے خارج از بحث ہے ہی، اگر کسی لغو کام پر ان کا اتفاقاً گزر ہو جائے، مثلاً راہ چلتے ہوئے جب دیکھیں کہ کوئی مداری تماشا دکھا رہا ہے تب بھی یہ لوگ اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتے، بلکہ اپنے دامن کو بچاتے ہوئے وہاں سے گزر جاتے ہیں۔ یہ مضمون اس سے پہلے سورۃ المؤمنون کی ابتدائی آیات میں آ چکا ہے: ﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۝٣﴾ لیکن یہاں جو فرق ہے اسے نوٹ کر لیجیے کہ ایک ہے لغو کام کا ارادہ کرنا۔ لیکن یہاں نقشہ یہ کھینچا گیا ہے کہ اس کا تو سوال ہی نہیں کہ اللہ کے یہ محبوب بندے کوئی لغو اور بے کار کام کریں۔ اگر اتفاقاً بھی کسی لغو کام پر ان کا گزر ہو جائے تو وہ باعزت طور پر اپنا دامن بچاتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔ اصل میں مؤمن کو اپنے وقت کی قدر ہوتی ہے۔ یہ محدود سا وقت اور محدود سی فرصت جو اِس دنیا میں حاصل ہے، یہ بڑی قیمتی ہے۔ اس لیے کہ اس کے نتائج اُس دنیا میں نکلیں گے جو لامحدود ہے۔ لہٰذا نتیجہ کے اعتبار سے اُس زندگی کا ہر لمحہ اَمر ہے۔ اس کا ثمرہ اُس زندگی میں ملے گا جو کبھی ختم ہونے والی نہیں ہے۔ لہٰذا ان کے پاس کوئی فالتو وقت نہیں ہوتا کہ اسے بے کار کاموں میں صرف کریں۔

(۳) آیاتِ الٰہی پر تفکر و تدبر

تیسرا وصف یہ بیان ہوا کہ جب انہیں ان کے ربّ کی آیات کے ذریعہ سے نصیحت کی جاتی ہے تو وہ اندھے بہرے ہو کر نہیں گر پڑتے: ﴿لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا ۝﴾ اس میں کفار کی طرف ایک تعریض ہے کہ انہیں جب آیاتِ الٰہی سنائی جاتی ہیں تو ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ جیسے وہ ان کی مخالفت پر اُدھار کھائے بیٹھے ہیں۔ وہ غور ہی نہیں کرتے' سنتے ہی نہیں' تدبر ہی نہیں کرتے۔ پہلے ہی سے طے کیے بیٹھے ہوتے ہیں کہ اعتراضات وارد کریں۔ یہ معاملہ مذکورہ بالا اوصاف کے حامل عباد الرحمٰن کا نہیں ہوتا ہے۔ اس قدر (value) کو اگر ہم مثبت طور پر معین کریں تو وہ یہ ہوگی کہ آیاتِ قرآنیہ پر' آیاتِ ربانیہ پر تدبر و تفکر ہو' ان پر غور کیا جائے' انہیں گوشِ حقیقت نیوش سے سنا جائے' انسان ان آیاتِ الٰہیہ کی گہرائیوں میں غوطہ زنی کرے۔

(۴) اہل و عیال کے لیے دُعا

چوتھا وصف انسانی فطرت سے وابستہ ہے۔ جو شخص خود نیک ہوگا اور سیدھے راستے پر زندگی بسر کر رہا ہوگا' لازماً اس کی تمنا ہوگی کہ اس کے اہل و عیال بھی اسی راستہ پر چلیں اور وہ بھی تقویٰ اور احسان کی روش اختیار کریں۔ لہٰذا وہ اپنے ربّ سے دعا کرتے رہتے ہیں کہ: ﴿رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ﴾ ''اے ہمارے ربّ! ہمیں اپنی بیویوں سے اور اپنی اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما''۔ ایک مؤمن کی آنکھوں کی ٹھنڈک اسی میں ہے کہ اس کی اولاد بھی ایمان و اسلام اور تقویٰ و احسان کے راستہ پر گامزن ہو' اس کے گھر میں بر و تقویٰ کا ماحول ہو۔ چنانچہ اس معاملے میں ہمارے قریب کے زمانہ میں شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی مثال بڑی عظیم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں چار بیٹے عطا فرمائے' شاہ عبدالقادر' شاہ عبدالعزیز' شاہ عبدالغنی اور شاہ رفیع الدین رحمہم اللہ۔ یہ چاروں نہایت نیک اور نہایت پارسا تھے۔ ان میں سے دو بیٹے تو وہ ہیں (یعنی شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہما) جنہوں نے قرآن مجید کے اُردو میں اولین ترجمے کیے اور آج تک مستند ترین ترجمے وہی ہیں۔ تیسرے بیٹے نے دہلی میں درس گاہ قائم کی جو مدرسہ شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے مشہور ہے جس سے برعظیم پاک و ہند میں بہت علم پھیلا۔ جبکہ چوتھے بیٹے شاہ عبدالغنی رحمۃ اللہ علیہ کا نوجوانی ہی میں انتقال ہو گیا تھا' لہٰذا کسی علمی میدان میں ان کی صلاحیتیں زیادہ نمایاں نہیں ہو سکیں۔ تاہم اس کی تلافی اللہ تعالیٰ نے اس طرح فرما دی کہ آگے ان کے بیٹے شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ تھے اور

ان کا نام اپنے اس نامور عالم ومجاہد اور شہید بیٹے کی وجہ سے روشن ہوا۔ تو آپ غور کیجیے کہ شاہ ولی اللہ ؒ کو اپنی اولاد کو ان کیفیات میں دیکھ کر کس قدر آنکھوں کی ٹھنڈک میسر آتی ہوگی!

(۵) ''متقیوں کی پیشوائی'' کی دُعا

اس کے بعد فرمایا: ﴿وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا ﴾ اور وہ یہ دعا بھی کرتے ہیں کہ ''ہمیں متقیوں کا امام بنا دے''۔ ان الفاظ سے یہ مضمون بھی متبادر ہوسکتا ہے کہ یہ دعا کی جارہی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں نیک لوگوں کا امام اور پیشوا بنائے' نیک لوگوں کے آگے چلنے والا بنائے۔ اگرچہ اس کی خواہش رکھنا بھی کوئی بری بات نہیں ہے' لیکن جس سیاق وسباق میں یہ الفاظ آ رہے ہیں اس کے اعتبار سے ان کا مفہوم کچھ مختلف ہے۔ درحقیقت ان الفاظ کے ذریعے پہلی بات ہی کی مزید تاکید ہو رہی ہے۔ اس لیے کہ ہر شخص فطری طور پر اپنے اہل وعیال کا امام ہے۔ قیامت کے روز جب لوگ اٹھیں گے تو ان کے پیچھے ان کی نسلیں چلی آ رہی ہوں گی' ان کی اولاد واَخلاف ان کے پیچھے چلے آ رہے ہوں گے۔ تو گویا وہی بات ذرا اسلوب بدل کر کہی گئی ہے کہ اے ربّ ہم جن کے امام ہیں ان کو متقی بنا دے۔ ایسا نہ ہو کہ ہمارے پیچھے آنے والے' ہماری آئندہ نسلیں فساق وفجار پر مشتمل ہوں۔

نبی اکرم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے: ((كُلُّكُمْ رَاعٍ وَّكُلُّكُمْ مُسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ))[1] ''تم میں سے ہر ایک کی حیثیت ایک چرواہے کی ہے اور تم میں سے ہر ایک اپنے ریوڑ کے بارے میں جواب دہ ہے''۔ جیسے بھیڑ بکریاں چرانے والا ایک چرواہا ہوتا ہے اور چند بھیڑ بکریاں اس کی ذمہ داری میں ہوتی ہیں' شام کو اگر کوئی بھیڑ یا بکری لوٹ کر نہ آئی تو اس سے پوچھا جائے گا' وہ ان کے بارے میں مسئول ہے' اسی طرح تم میں سے ہر شخص کی حیثیت ایک چرواہے کی ہے' اللہ نے اپنی مخلوق میں سے کچھ افراد تمہارے حوالے کر دیے ہیں' وہ تمہاری بیویاں ہیں' تمہاری اولاد ہیں' وہ تمہارے زیر کفالت ہیں' وہ تمہارے زیر تربیت ہیں' یہ تمہارا وہ گلہ ہے جس کے بارے میں اللہ تم سے پوچھے گا کہ تم نے ان کی صحیح رُخ پر تعلیم وتربیت کا کتنا اہتمام کیا؟ انہیں اللہ کے نیک اور متقی بندے بنانے کے لیے کتنی محنت کی؟ یہ ہے مفہوم اس ارشادِ نبویؐ کا ((كُلُّكُمْ رَاعٍ وَّكُلُّكُمْ مُسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ))۔ چنانچہ ہر بندۂ مؤمن کی یہ دعا ہونی چاہیے کہ اے اللہ! جو گلہ تو نے مجھے عطا فرمایا ہے' جس کی ذمہ داری تو نے مجھے سونپی ہے' اس کو توفیق دے کہ وہ نیکی اور تقویٰ کی روش اختیار کرے' اور ہم

(۱) صحیح البخاری' کتاب الجمعة' باب الجمعة فی القری والمدن۔

کو ایسے متقیوں کا امام بنا۔ ﴿وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا﴾

صبر واستقامت کا بدلہ: جنت

آگے فرمایا: ﴿اُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا﴾ ''یہ وہ لوگ ہیں جنہیں جزا کے طور پر جنت میں بالا خانے ملیں گے بسبب ان کے صبر کے''۔ اس آیت میں گویا عباد الرحمٰن کا چھٹا اور نہایت اہم وصف آ گیا۔ ''بِمَا صَبَرُوْا'' یعنی یہ درحقیقت بدلہ ہے اس صبر کا جو انہوں نے اللہ کی راہ میں کیا۔ یہ وہ بات ہے جو ہم سورۃ العصر کے ذیل میں بھی پڑھ چکے ہیں اور سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع میں بھی کہ ﴿وَاصْبِرْ عَلٰی مَآ اَصَابَكَ﴾۔ ظاہر بات ہے کہ یہ تمام اوصاف انہی لوگوں میں پیدا ہو سکتے ہیں جن میں صبر کا مادہ ہو‘ تبھی وہ دُنیوی لذات وترغیبات سے کنارہ کشی کر سکیں گے‘ ہوائے نفس سے اجتناب کر سکیں گے اور شیطان کے اغوا سے بچ سکیں گے۔ یہ سب کام اسی وقت ممکن ہوں گے جب ان میں صبر کا مادہ ہوگا۔ پھر دنیا میں نیکی‘ راست بازی اور صداقت شعاری کا راستہ اختیار کرنے والوں کو آزمائشوں سے سابقہ پیش آ کر رہے گا۔ ان آزمائشوں پر صبر کر کے ہی وہ برّ وتقویٰ کی راہ پر مستقیم رہ سکیں گے۔ جیسے سورۃ حٰمٓ السّجدۃ میں فرمایا گیا: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا......﴾ (آیت ۳۰) ''یقیناً جن لوگوں نے کہا ہمارا پروردگار اللہ ہے اور پھر وہ اس پر ثابت قدم رہے......'' تو یہ استقامت اور یہ صبر ہی درحقیقت وہ جوہر ہے کہ جس کی بنیاد پر انسان دنیا میں وہ روش اختیار کر سکتا ہے جس کے نتیجے میں اس میں وہ اوصاف پیدا ہو سکتے ہیں جن کا یہاں ذکر ہوا۔ اس آیت کا اختتام ان الفاظ پر ہوتا ہے کہ: ﴿وَيُلَقَّوْنَ فِيْهَا تَحِيَّةً وَّسَلٰمًا﴾ ''ان لوگوں کا جنت میں استقبال ہوگا دعاؤں کے ساتھ اور سلام کے ساتھ''۔ ظاہر بات ہے کہ یہ استقبال کرنے والے جنت کے فرشتے ہوں گے۔

آگے فرمایا: ﴿خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ﴾ ''اس میں وہ ہمیشہ ہمیش رہیں گے''۔ جنت وہ جگہ ہے کہ ایک بار داخلے کے بعد وہاں سے نکلنے کا کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ ﴿حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا﴾ ''وہ بہت ہی عمدہ جگہ ہے مستقل رہنے کے لیے بھی اور تھوڑی سی دیر کے قیام کے لیے بھی''۔ اس رکوع میں پہلے جہنم کا ذکر آیا تھا‘ اب یہاں جنت کا ذکر تقابل (contrast) کے طور پر آیا ہے۔ کیونکہ دنیا میں ہمارا تصور یہ ہے کہ کتنی ہی عمدہ جگہ پر بھی اگر مستقل رہنا پڑے تو اس میں انسان کے لیے کوئی دلچسپی اور

رعنائی نہیں رہتی اور اگر بری سے بری جگہ پر بھی تھوڑی سی مدت کے لیے جانا ہو' جیسے صحرائے اعظم میں انسان تھوڑے عرصہ کے لیے چلا جائے تو تبدیلی (change) کی وجہ سے ایک تفریح ہو جاتی ہے' ایک مہم جوئی کا احساس ہوتا ہے۔ تو جہنم کے بارے میں فرمایا کہ وہ ایسی بری جگہ ہے کہ مستقل جائے قرار کی حیثیت سے تو انتہائی خوفناک ہے ہی' اگر کوئی ایک لمحہ کے لیے بھی اس میں داخل ہو جائے تو اس دوزخ کی تمام شدتیں' غلظتیں اور ساری کلفتیں آنِ واحد میں عیاں ہو جاتی ہیں۔ اس کے برعکس جنت وہ جگہ ہے کہ وہاں تھوڑی دیر ہی نہیں بلکہ مستقل قیام ہوگا' لیکن اس کے حسن میں' اس کی رعنائیوں میں' اس کی دلچسپیوں میں کبھی کوئی کمی نہیں آئے گی اور انسان اس سے کبھی بھی نہیں اکتائے گا۔

نبوت ورسالت کی غرض وغایت

آخر میں ارشاد فرمایا:

﴿قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْ لَا دُعَآؤُكُمْ ۚ فَقَدْ كَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ يَكُوْنُ لِزَامًا ﴿٧٧﴾﴾

(الفرقان)

''(اے نبی ﷺ!) فرما دیجیے کہ میرے ربّ کو تمہاری کوئی پروا نہیں ہے اگر نہ ہوتا تمہارا پکارنا' سو تم جھٹلا چکے ہو' اب اس کی سزا جلد ہی تمہیں چمٹ کر رہے گی''۔

اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ سورۃ الفرقان کی اس آخری آیت میں اور اس سورۂ مبارکہ کی پہلی آیت میں بڑا گہرا ربط وتعلق ہے:

﴿تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرَا ﴿١﴾﴾

''بڑی بابرکت ہے وہ ہستی جس نے نازل فرمایا الفرقان اپنے بندے (ﷺ) پر تاکہ وہ تمام جہان والوں کے لیے خبردار کرنے والے بن جائیں''۔

ایمانیات کے ذیل میں یہ بات ہمارے سامنے آ چکی ہے کہ ایمان کے تین بڑے بڑے اجزاء ہیں: (۱) ایمان باللہ یا توحید (۲) ایمان بالآخرۃ یا معاد' اور (۳) ایمان بالرسالت۔ سورۃ الفرقان کے آخری رکوع کی پہلی دو آیات ایمان باللہ سے بحث کرتی ہیں۔ ارشاد ہوا:

﴿تَبٰرَكَ الَّذِيْ جَعَلَ فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِيْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِيْرًا ﴿٦١﴾ وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا ﴿٦٢﴾﴾

میں نے عرض کیا تھا کہ ان سب کا نتیجہ ایمان باللہ ہے۔ سورۃ الفرقان کی پہلی اور آخری آیت کا تعلق

ایمان بالرسالت سے ہے کہ اللہ تعالیٰ رسولوں کو کیوں بھیجتا رہا! نبوت ورسالت کی غرض وغایت کیا ہے! سورۃ النساء کی آیت ۱۶۵ میں یہ مضمون بڑی وضاحت سے اور بڑے واضح الفاظ میں آیا ہے۔ فرمایا:

﴿رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿١٦٥﴾﴾

''ہم اپنے رسولوں کو بشارت دینے والا اور خبردار کرنے والا بنا کر بھیجتے رہے ہیں تا کہ رسولوں کی آمد کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے یہاں کوئی عذر باقی نہ رہ جائے۔ اور اللہ تو ہے ہی غالب' حکمت والا''۔

معلوم ہوا کہ رسولوں کو بھیجنے کا ایک اہم مقصد ''اتمامِ حجت'' اور ''قطعِ عذر'' تھا' تا کہ لوگ یہ نہ کہہ سکیں کہ اے اللہ! ہمیں پتا نہیں تھا کہ تو کیا چاہتا ہے! ہمیں معلوم نہیں تھا کہ تجھے کون کون سے اوصاف پسند ہیں! ہم جانتے نہیں تھے کہ تو کن چیزوں سے ناراض ہوتا ہے! اگرچہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس دنیا میں سماعت وبصارت' عقل وشعور اور نیکی وبدی کی تمیز جیسی بہت سی چیزوں سے مسلح کر کے بھیجا ہے اور یہ بنیادی اور ابتدائی حجت ہے جو ہر انسان پر قائم ہے' لیکن اتمامِ حجت تب ہوتا ہے جب رسول تشریف لاتے ہیں۔ چنانچہ رسولوں نے حق کو قولاً اور عملاً پیش کر دیا۔ سچ بولنے کی ترغیب دی تو ساری عمر سچ بول کر دکھایا۔ دیانت اور امانت کی تلقین کی تو اپنی زندگیوں میں دیانت وامانت کا نمونہ پیش فرما دیا۔ عدل وقسط کی تاکید کی تو دوست ودشمن کی تمیز وامتیاز کے بغیر عدل وانصاف کر کے دکھایا۔ عفو وصفح کی نصیحت کی تو اپنی جان کے دشمنوں اور خود اپنے اوپر اور اپنے ساتھیوں پر بے پناہ مظالم ڈھانے والوں کو معاف کر کے دکھایا۔ جو دعوت دی اس کا عملی نمونہ بھی لوگوں کے سامنے رکھ دیا۔ تو گویا لوگوں پر قولاً اور عملاً آخری درجہ میں حجت قائم ہو گئی۔ یہی وہ حقیقت ہے جو سورۃ النساء کی مذکورہ بالا آیت میں بیان فرمائی گئی ہے۔

یہی مضمون سورۃ الفرقان کی پہلی آیت میں آیا ہے کہ انبیاء ورُسل کی اس مقدس جماعت میں رسول اللہ ﷺ کی ایک امتیازی شان ہے۔ پہلے بھی رسول بشیر ونذیر بن کر آتے تھے لیکن وہ اپنی اپنی قوموں کی طرف آتے تھے۔ قرآن مجید میں یہ مضمون تکرار کے ساتھ آیا ہے: ﴿وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ؕ...... وَاِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ؕ...... وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ؕ﴾ (الاعراف: ۶۵ و ۷۳ و ۸۵) ''اور قومِ عاد کی طرف ہم نے ان کے بھائی ہودؑ کو بھیجا...... اور قومِ ثمود کی طرف ہم نے ان کے بھائی صالحؑ کو بھیجا...... اور مدین (میں رہنے والی قوم) کی طرف ہم نے ان کے بھائی شعیبؑ کو

بھیجا''۔ چنانچہ مطالعہ قرآن حکیم کی روشنی میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ نبی اکرمﷺ کی بعثت سے قبل نبوت و رسالت کا معاملہ علاقائی یا قومی ہوتا تھا' لیکن جناب محمدٌ رسول اللہﷺ کی ذاتِ مبارکہ پر جو نبوت کا اختتام واتمام ہوا اور رسالت کی تکمیل ہوئی' اس کا ایک مظہر یہ ہے کہ آپؐ سارے جہان والوں کے لیے خبردار کرنے والے بن کر تشریف لائے اور قرآن مجید' فرقانِ حمید اسی مقصد کے لیے نازل فرمایا گیا:

﴿تَبٰرَكَ الَّذِیۡ نَزَّلَ الۡفُرۡقَانَ عَلٰی عَبۡدِهٖ لِیَكُوۡنَ لِلۡعٰلَمِیۡنَ نَذِیۡرَا ۙ﴾

یہی بات سورۃ الانبیاء میں بایں الفاظِ مبارکہ فرمائی گئی: ﴿وَمَاۤ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِیۡنَ ﴾ اور سورۂ سبا میں آنحضورﷺ کی آفاقی وعالمی شان کو اور بھی واضح الفاظ میں بیان فرمایا گیا:

﴿وَمَاۤ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِیۡرًا وَّنَذِیۡرًا﴾ (آیت ۲۸)

''اور (اے نبیؐ!) ہم نے نہیں بھیجا آپ کو مگر تمام لوگوں کے لیے بشیر اور نذیر بنا کر!''

لیکن یہ بات جان لیجیے کہ رسول ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے برہان' دلیل اور بیّنہ بن کر تشریف لاتے ہیں' لہٰذا جہاں رسولوں کی بعثت رحمت ہے وہاں جو انکار کرنے والے ہیں ان کے لیے دنیا اور آخرت میں یہی چیز موجب عذاب اور موجب سزا بھی ہے۔ رسولوں کی آمد سے پہلے ان کے پاس کوئی عذر تو تھا کہ اے اللہ ہمیں معلوم نہیں تھا' ہم جانتے نہیں تھے کہ تیری رضا کیا ہے۔ لیکن رسولوں کے آنے کے بعد یہ عذر ختم ہوگیا۔ اب محاسبہ شدید ہوگا اور پکڑ سخت ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید میں بار بار اُن قوموں کا ذکر ہوا ہے جن کی طرف رسولوں کو مبعوث فرمایا گیا' اور جب انہوں نے ان رسولوں کا انکار کیا' ان کی تکذیب کی' ان کو قتل کرنے کے درپے ہوگئے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کو اور ان چند لوگوں کو جو اُن رسولوں پر ایمان لائے تھے' بچالیا اور اُن قوموں کو ہلاک کردیا۔

سورۃ الفرقان کی اس آخری آیت میں اہل عرب کو یہی تنبیہہ فرمائی جارہی ہے کہ یہ نہ سمجھو کہ ہمارے رسول اگر تمہیں دعوت دے رہے ہیں' تبلیغ کر رہے ہیں' تمہارے پیچھے پیچھے پھر رہے ہیں' ایک ایک گھر پر جا کر پیغامِ ربانی پہنچا رہے ہیں' ایک ایک انسان کے دل پر دستک دے رہے ہیں تو میرے ربّ کو تمہاری کوئی پروا ہے۔ اللہ کو ہرگز تمہاری کوئی پروا نہیں ہے۔ اگر تمہیں پکارنا اور خبردار کرنا مقصود نہ ہوتا تو ہمارے رسول یہ مشقت نہ جھیلتے۔ اس لیے کہ اللہ کی سنت یہی ہے کہ کسی قوم پر عذاب بھیجنے سے پہلے اُسے متنبہ اور خبردار کر دیا جائے' جیسا کہ سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا:

﴿وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِیۡنَ حَتّٰی نَبۡعَثَ رَسُوۡلًا ﴾

''ہم عذاب نہیں بھیجتے رہے ہیں جب تک رسولوں کو مبعوث نہ فرما دیں''۔

یعنی رسولوں کی آمد کے ذریعے جب تک اتمامِ حجت نہ ہو جائے اس سے پہلے قومیں ہلاک نہیں کی جاتیں۔ لہٰذا یہاں نبی اکرم ﷺ سے کہلوایا جا رہا ہے کہ میں نے تم تک تمہارے ربّ کا پیغام پہنچا دیا' تمہارے سامنے تمہارے ربّ کی دعوت پیش کر دی' مجھ تک جو ہدایتِ ربّانی آئی تھی اسے قولاً اور عملاً تمہارے سامنے پیش کر دیا' یہ تمہارے ہی نفع کے لیے کیا گیا ہے' ورنہ میرے ربّ کو تمہاری کوئی پروا نہیں ہے۔ یہ تبلیغ و دعوت اس لیے ہے کہ تم کو خبردار کر دیا جائے۔ اگر تمہیں پکارنا نہ ہوتا تو رشد و ہدایت اور دعوت و تبلیغ کی ذمہ داری بھی مجھ پر نہ ہوتی۔ لیکن ﴿فَقَدْ كَذَّبْتُمْ﴾ ''پس تم جھٹلا چکے (تم تکذیب کر چکے)''۔ عربی زبان میں فعل ماضی پر جب ''قَـدْ'' کا اضافہ ہو جاتا ہے تو اس میں کسی کام کے ہو جانے میں قطعیت و حتمیت کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے۔ انگریزی میں Present Perfect Tense کا جو مفہوم ہوتا ہے' یعنی کام ہو چکا ہے' بات ہو چکی ہے' یہی مفہوم عربی میں فعل ماضی پر ''قَدْ'' کا اضافہ کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿فَقَدْ كَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ يَكُوْنُ لِزَامًا ﴿٧٧﴾﴾ ''سو لوگو! تم جھٹلا چکے ہو' پس اب عنقریب اس کی سزا تمہیں چمٹ کر رہے گی''۔ لازم و ملزوم کے الفاظ ہم عام بول چال میں استعمال کرتے ہیں۔ ''لِـزَامًا'' کے معنی ہوں گے جیسے کوئی چیز چمٹ کر رہ جائے' چپک کر رہ جائے۔ تو فرمایا: ''سو تم نے (دعوتِ ربانی کو) جھٹلا دیا' پس عنقریب اس کا وبال تم پر لاگو ہو کر رہے گا''۔ تمہیں اس تکذیب کی سزا مل کر رہے گی۔

یہ آیتِ مبارکہ نہ صرف اُن لوگوں کے لیے بہت اہم ہے جو قرآن مجید کے اوّلین مخاطب تھے اور جن کے سامنے جناب محمد رسول اللہ ﷺ بنفسِ نفیس خلقِ خدا کو دعوت پہنچا رہے تھے' بلکہ ہمارے لیے بھی بہت اہم ہے۔ اس لیے کہ جناب محمد رسول اللہ ﷺ پر نبوت کا جو اختتام و اتمام ہوا ہے' رسالت کی جو تکمیل ہوئی ہے' اس کا ایک مظہر وہ ہے جو میں پیش کر چکا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت پوری نوعِ انسانی کے لیے ہے۔ اور اسی کا دوسرا مظہر یہ ہے کہ آپ ﷺ ہی کا دورِ رسالت تا قیامِ قیامت جاری ہے۔ یہ دور جس میں ہم سانس لے رہے ہیں' یہ بھی دورِ رسالتِ محمدی ہے (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام)۔ ہر انسان جو آج دنیا میں پیدا ہو رہا ہے اور قیامت تک پیدا ہوگا وہ نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ کی اُمتِ دعوت میں شامل ہے۔ ہاں اُمتِ اجابت میں وہی شامل ہوگا جو نبی اکرم ﷺ کی دعوت پر لبیک کہے' حضور ﷺ کی تصدیق کرے' حضور ﷺ پر ایمان لائے۔ لیکن اُمتِ دعوت سے

مراد وہ تمام لوگ ہیں جن کی طرف کسی رسول کو بھیجا گیا ہو۔ جیسے حضرت ہود علیہ السلام کی اُمتِ دعوت قومِ عاد تھی‘ حضرت صالح علیہ السلام کی اُمتِ دعوت قومِ ثمود تھی‘ اسی طرح جناب محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی اُمتِ دعوت پوری نوعِ انسانی ہے۔ اور پیغامِ ربانی کو جس طرح نبی اکرم ﷺ نے بنفسِ نفیس ان لوگوں کو پہنچایا جو آپ ﷺ کے مخاطبین اوّلین تھے‘ اسی طرح یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم روئے ارضی پر بسنے والے ہر شخص تک اسے پہنچائیں۔ رسول اللہ ﷺ نے تکلیفیں جھیل کر اور مصیبتیں اٹھا کر یہ فریضۂ دعوت انجام دیا۔ آپؐ کا تمسخر واستہزاء بھی ہوا‘ آپؐ پر پتھراؤ بھی ہوا‘ آپؐ کے راستہ میں کانٹے بھی بچھائے گئے‘ آپؐ کی گردن مبارک میں چادر ڈال کر اس طرح بل دیا گیا کہ چشم ہائے مبارک اُبل پڑنے کو ہوئیں۔ آپؐ پر کوڑا کرکٹ ڈالا گیا۔ آپؐ کے شانۂ مبارک پر‘ جبکہ آپؐ سربسجود تھے‘ اونٹ کی نجاست بھری اوجھڑی رکھی گئی۔ طائف کی گلیوں میں آپؐ پر پتھروں کی اس طور پر بارش ہوئی کہ جسد اطہر لہولہان ہو گیا اور جسمِ اَقدس سے خون بہہ بہہ کر نعلین شریفین میں جم گیا۔ یہ ساری تکلیفیں آپ ﷺ نے جھیلیں‘ لیکن دین کا پیغام پہنچا کر حجت قائم کر دی۔

اب یہ کام اُمتِ مسلمہ کے ذمہ ہے‘ میرے اور آپ کے ذمہ ہے‘ حضور ﷺ کے ہر اُمتی کے ذمہ ہے کہ اللہ کا پیغام ایک ایک فردِ نوعِ بشر تک پہنچائیں۔ یہ ہر مسلمان کی دینی ذمہ داری ہے۔ اگر پہنچا دیں تو ہم بریٔ الذمہ ہو جائیں گے۔ جن تک بات پہنچا دی جائے اگر وہ دعوت کو ردّ کریں اور اس کو قبول کرنے سے انکار کریں تو پھر وہ خود ذمہ دار ہوں گے‘ سارا بوجھ اُن پر آئے گا۔ لیکن اگر معاملہ وہ ہو جو فی الواقع ہمارا ہے کہ ہم دوسروں تک کیا پہنچائیں آج خود ہم اس بات کے محتاج ہو گئے ہیں کہ قرآن ہمیں پہنچایا جائے‘ تو مجرم ہم ٹھہریں گے۔ سو معلوم ہوا کہ ہمارے شانوں پر دوہری ذمہ داری آ گئی۔ جن تک پیغام پہنچانا تھا اگر اُن تک پیغام نہیں پہنچ رہا‘ انذار نہیں ہو رہا‘ دعوتِ ربانی کا حق ادا نہیں ہو رہا‘ تو ان لوگوں کی غلط روی اور گمراہی کا وبال بھی ہم پر آئے گا۔ اور خود ہمارا اپنا حال یہ ہے کہ اگرچہ ہم قرآن کے ماننے والے ہیں اور جناب محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے نام لیوا ہیں‘ لیکن اِلَّا ماشاءاللہ‘ ہم عملاً تو تکذیب کر رہے ہیں۔ ایک تکذیب قولی ہوتی ہے کہ کسی نبی کے بارے میں یہ کہا جائے کہ وہ نبوت کا غلط دعویٰ کر رہا ہے‘ جھوٹ گھڑ رہا ہے۔ جیسے ابوجہل اور ابولہب نے رسول اللہ ﷺ کی تکذیب کی۔ جبکہ ایک تکذیب عملی ہوتی ہے کہ بظاہر زبان سے حضور ﷺ کو نبی اور رسول مان لیا جائے‘ لیکن آپؐ کے احکام کو تسلیم نہ کیا جائے۔ تکذیب عملی کی ایک مثال قرآن مجید میں سورۃ

الجمعہ میں آئی ہے:

﴿مَثَلُ الَّذِیْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ یَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ یَحْمِلُ اَسْفَارًا ؕ بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ﴾

''مثال اُن کی جو حامل تورات بنائے گئے تھے' پھر انہوں نے اس کی ذمہ داری کو ادا نہ کیا' اس گدھے کی مانند ہے جس پر کتابوں کا بوجھ لدا ہوا ہو' اور بہت بُری ہے مثال اس قوم کی جس نے آیاتِ الٰہیہ کی تکذیب کی۔ اور اللہ ایسے ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا''۔

اب آپ اس آیت مبارکہ کے ان الفاظ پر غور فرمایئے: ﴿بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰهِ ؕ﴾. ہم سب جانتے ہیں کہ یہود نے زبان سے کبھی تورات کی تکذیب نہیں کی۔ تو غور طلب بات یہ ہے کہ یہ تکذیب کون سی ہے! یہ تکذیب درحقیقت تکذیبِ عملی ہے کہ تورات کے کتاب اللہ ہونے کا زبانی اقرار تو موجود ہے لیکن اُس پر عمل نہیں ہو رہا۔ اور ظاہر بات ہے کہ تورات پر ایمان کا دعویٰ کرنے والے اگر اُس کے احکام پر کاربند نہیں ہیں' اگر تورات کے نواہی سے اجتناب نہیں کیا جا رہا' جو ذمہ داریاں تورات نے عائد کی ہیں اگر انہیں ادا کرنے سے پہلو تہی کی جا رہی ہے' اُن سے اغماض برتا جا رہا ہے' تو چاہے زبان سے یہود اقرار کرتے ہوں کہ وہ تورات کو اللہ کی کتاب مانتے ہیں لیکن حقیقتاً اور عملاً یہ رویہ تورات کی تکذیب کے مترادف ہے۔ آج اگر ہم اپنے گریبانوں میں جھانکیں تو نظر آئے گا کہ بعینہٖ یہی معاملہ ہمارا رہا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے ہمیں پہلے ہی سے متنبہ فرما دیا تھا۔ بڑی پیاری حدیث ہے جس کا آغاز ''یَا اَهْلَ الْقُرْآن'' کے الفاظ سے ہو رہا ہے۔ یعنی ''اے قرآن والو!'' جیسے قرآن مجید میں یہود و نصاریٰ سے ''یَا اَهْلَ الْكِتٰبِ'' کے الفاظ سے خطاب ہوتا ہے' محبوبِ ربّ العالمین ﷺ ہم مسلمانوں سے خطاب فرما رہے ہیں ''یَا اَهْلَ الْقُرْآنِ'' کے الفاظ سے۔ ارشاد ہوتا ہے: ((یَا اَهْلَ الْقُرْآنِ لَا تَتَوَسَّدُوا الْقُرْآنَ))(۱) ''اے قرآن والو! قرآن حکیم کو اپنا تکیہ نہ بنا لینا''۔ اُسے ایک ذہنی سہارا نہ بنا لینا۔ قرآن کو پس پشت نہ ڈال دینا۔ تکیہ پیٹھ کے پیچھے ہوتا ہے' ایسا نہ ہو کہ تم قرآن کو پیٹھ کے پیچھے پھینک دو۔ بلکہ تمہارا طرزِ عمل کیا ہونا چاہیے: ((وَاتْلُوْهُ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ مِنْ آنَاءِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ)) ''اُسے پڑھو جیسا کہ اس کے پڑھنے کا حق ہے' رات کے اوقات میں بھی اور دن کے اوقات میں بھی''۔ ((وَاَفْشُوْهُ)) ''اور اُسے پھیلاؤ''۔ اُسے عام کرو' اس کی تبلیغ کرو' اس کے نور سے چہار دانگِ عالم کو منور کرو۔ ((وَتَغَنَّوْهُ)) ''اور اُسے خوش الحانی سے پڑھو'' کہ اس سے تمہاری روح

(۱) رواہ البیهقی فی شعب الایمان۔

کو غذا میسر آئے۔((وَتَدَبَّرُوْا فِیْہِ))''اور اُس میں تدبر کرو(غور وفکر کرو)''۔وہی بات جو ہم نے اس رکوع میں پڑھی کہ ﴿وَالَّذِیْنَ اِذَا ذُکِّرُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّہِمْ لَمْ یَخِرُّوْا عَلَیْہَا صُمًّا وَّعُمْیَانًا ﴿۷۳﴾﴾ چنانچہ قرآن پر تدبر ہو' غور وفکر ہو۔آخر میں ارشاد فرمایا:((لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ))''تاکہ تم فلاح پاؤ''۔

پس اگر ہم قرآن مجید کے ساتھ یہ طرزِ عمل اختیار نہیں کرتے جس کا حکم نبی اکرم ﷺ کی اس حدیث میں آیا ہے تو چاہے زبان سے ہم مانتے ہوں کہ یہ اللہ کا کلام ہے' لیکن حقیقتاً ہم تکذیب کا ارتکاب کر رہے ہوتے ہیں' اور یہی عملی تکذیب ہے۔اس معنی میں اس آیت مبارکہ کے مخاطبین میں ہم بھی شامل ہیں:﴿قُلْ مَا یَعْبَؤُا بِکُمْ رَبِّیْ لَوْ لَا دُعَآؤُکُمْ﴾ کہ اے نبیؐ!ان لوگوں کے کان کھول دیجیے' انہیں یہ بات سنا دیجیے کہ میرے ربّ کو تمہاری کوئی پروا نہیں ہے' بلکہ اُس نے اگر مجھے مبعوث فرمایا ہے' مجھ پر یہ قرآن نازل فرمایا ہے تو صرف اس لیے کہ تم پر اتمامِ حجت کرنا مقصود ہے۔لہٰذا میں نے تو تبلیغ کا حق ادا کر کے تم پر حجت قائم کر دی ہے۔لیکن ﴿فَقَدْ کَذَّبْتُمْ﴾ تم جھٹلا چکے ہو' تم نے کفر کی روش اختیار کی ہے' خواہ یہ جھٹلانا قولاً ہو یا عملاً ہو۔﴿فَسَوْفَ یَکُوْنُ لِزَامًا ﴿۷۷﴾﴾ پس جان رکھو کہ جلد ہی اس کی سزا تم سے چمٹ کر رہے گی۔اس کی پاداش تم کو بھگتنی پڑے گی۔اللہ تعالیٰ اس انجامِ بد سے ہمیں بچائے!

بَارَکَ اللّٰہُ لِیْ وَلَکُمْ فِی الْقُرْاٰنِ الْعَظِیْمِ وَنَفَعَنِیْ وَاِیَّاکُمْ بِالْاٰیَاتِ وَالذِّکْرِ الْحَکِیْمِ

❁❁❁

درس 12

عائلی زندگی کے اہم اصول

سُورَۃ التحریم کی روشنی میں

درس ۱۲

عائلی زندگی کے بنیادی اصول

سورۃ التحریم کی روشنی میں

نحمدہٗ ونصلی علٰی رَسولہِ الکریم ...... امَّا بَعد:

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿یٰۤاَیُّھَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰہُ لَکَ ۚ تَبْتَغِیْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِکَ ؕ وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ① قَدْ فَرَضَ اللّٰہُ لَکُمْ تَحِلَّۃَ اَیْمَانِکُمْ ۚ وَاللّٰہُ مَوْلٰىکُمْ ۚ وَھُوَ الْعَلِیْمُ الْحَکِیْمُ ②﴾ ...... صدق اللّٰہ العظیم

''اے نبی (ﷺ)! آپ کیوں حرام کرتے ہیں وہ چیز جو اللہ نے آپ کے لیے حلال ٹھہرائی ہے' اپنی بیویوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے' اور اللہ بخشنے والا رحم فرمانے والا ہے۔ اللہ نے تمہاری قسموں کو کھولنے کے لیے طریقہ معین کر دیا ہے' اور اللہ ہی تمہارا پشت پناہ اور مددگار ہے' اور وہ سب کچھ جاننے والا اور کمالِ حکمت والا ہے۔''

سورۃ التحریم اٹھائیسویں پارے کی آخری سورۃ ہے ——— اور مطالعۂ قرآنِ حکیم کے جس منتخب نصاب کا درس اِن مجالس میں سلسلہ وار ہو رہا ہے اس کا بحیثیت مجموعی یہ بارہواں درس ہے اور تیسرے حصے یعنی ''مباحث عمل صالح'' کا تیسرا درس ہے۔ اس منتخب نصاب کے جن دروس کا ہم مطالعہ کر چکے ہیں اِن کے درمیان جو معنوی ربط و تعلق اور منطقی ترتیب ہے اس کو اپنے ذہن میں تازہ کر لیجیے!

اس منتخب نصاب کا پہلا حصہ چار جامع اسباق پر مشتمل ہے' جس میں انسان کی کامیابی اور فوز و فلاح کے چاروں لوازم یعنی ایمان' عمل صالح' تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کا بیان ہے۔ دوسرے حصے میں چند ایسے مقامات شامل ہیں جو خاص طور پر ایمان کے مباحث سے متعلق ہیں۔ تیسرے حصے میں اعمالِ صالحہ کی بحث ہے جو جاری ہے۔

ظاہر بات ہے کہ انسانی اعمال میں سب سے پہلے انفرادی سیرت وکردار کا معاملہ زیر بحث آنا چاہیے۔ چنانچہ اس حصے کے پہلے دو اسباق میں انفرادی سیرت وکردار ہی سے متعلق چند اہم پہلو سامنے آئے ہیں۔ اوّلین درس، جو سورۃ المؤمنون کی ابتدائی گیارہ آیات اور سورۃ المعارج کی درمیانی سترہ ہم مضمون آیات پر مشتمل ہے، میں قرآن نے تعمیر سیرت کے لیے جو بنیادیں فراہم کی ہیں اور تعمیر خودی کا جو پروگرام دیا ہے، اس کا بیان ہے، اور سورۃ الفرقان کے آخری رکوع پر مشتمل دوسرے سبق میں یہ بات ہمارے سامنے آئی کہ ایک مکمل طور پر تعمیر شدہ بندۂ مؤمن کی شخصیت کے کیا خدوخال ہونے چاہئیں! یعنی قرآن مجید کا انسانِ مطلوب کیا ہے، جسے علامہ اقبال مردِ مؤمن سے تعبیر کرتے ہیں۔

اب ہم انفرادیت سے اجتماعیت کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اجتماعیت کی پہلی منزل خاندان اور عائلی نظام ہے۔ اس سے آگے معاشرہ اور پھر اس سے آگے ریاست ہے۔ یہ سارے اس اجتماعیت کے مدارج ہیں جس کا نقطۂ آغاز خاندان ہے۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ خاندان کی بنیاد رشتۂ ازدواج سے پڑتی ہے، یعنی ایک مَرد اور ایک عورت کے درمیان شوہر اور بیوی کا تعلق ایک خاندان کا سنگ بنیاد بنتا ہے۔

چونکہ اجتماعیت کا اوّلین قدم یہی ہے، لہٰذا قرآن مجید میں عائلی نظام سے متعلق مباحث نہایت شرح وبسط اور تفصیل کے ساتھ آئے ہیں اور شوہر و بیوی کے رشتے کے متعلق معاملات اور نکاح وطلاق کے احکام ومسائل کے بارے میں تفصیلی ہدایات بیان ہوئی ہیں۔ سورۃ البقرۃ میں کئی رکوع اسی بحث پر مشتمل ہیں۔ پھر سورۃ النساء، سورۃ المائدۃ، سورۃ الاحزاب، سورۃ المجادلۃ، سورۃ الطلاق اور سورۃ التحریم میں اس موضوع پر گفتگو آئی ہے۔ فارسی کے اس مشہور شعر کے مصداق کہ ؎

خشتِ اوّل چوں نہد معمار کج
تا ثریا می رود دیوار کج

چونکہ خاندان انسانی معاشرے اور انسانی تہذیب وتمدن کا بنیادی پتھر ہے اور اسی پر ریاست، ملّت اور اجتماعیت کے تمام تصورات کی تعمیر ہوتی ہے، لہٰذا اگر خاندان کے ادارے کی تعمیر میں کوئی کجی یا ٹیڑھ رہ جائے تو ظاہر بات ہے کہ پھر وہ کجی آخر تک جائے گی۔ جڑ اور بنیاد میں ضعف رہ جائے تو یہ ضعف معاشرے کی تمام سطحوں پر ظہور کرے گا۔ لہٰذا قرآن مجید خاندان کے اس ادارے کو نہایت مستحکم کرنا چاہتا ہے اور اسے نہایت صحیح بنیادوں پر استوار کرنا چاہتا ہے تاکہ اس میں نہ کوئی عدم توازن رہے، نہ ہی

کوئی اونچ نیچ ہو‘ نہ ظلم وتعدی ہو اور نہ ہی یہ ضعف واضمحلال کا شکار ہو۔

قرآن کریم کے اٹھائیسویں پارے کے آخر میں اس موضوع پر سورۃ الطلاق اور سورۃ التحریم کی صورت میں دو نہایت حسین وجمیل سورتوں کا جوڑا ہمارے سامنے آتا ہے۔ ظاہر بات ہے جتنی سورتوں یعنی سورۃ البقرۃ‘ سورۃ النساء وغیرہ جن میں عائلی زندگی کے معاملات پر بحث کی گئی ہے‘ ان پر اس محدود وقت میں گفتگو نہیں ہو سکتی۔ البتہ سورۃ التحریم (جس کا مطالعہ آج کی اس نشست سے شروع ہو رہا ہے) کی ہر آیت کا ہم قدرے تفصیل سے مطالعہ کریں گے۔ لیکن اس سے قبل میں ایک اہم بات کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں جس سے ان شاء اللہ آپ کو فہم قرآن کے لیے رہنمائی ملے گی اور قرآن مجید کی آیات اور سورتوں میں جو باہمی ربط اور نظم ہے‘ اس کے بارے میں آپ کو ایک بصیرتِ باطنی حاصل ہو گی۔ قرآن مجید میں اکثر وبیشتر سورتیں جوڑوں کی شکل میں ہیں۔ اب جوڑے ہونے کی نسبت کا تقاضا ہے کہ موضوع زیر بحث کے دو پہلو ہونے چاہئیں۔ ایک یہ کہ مشابہت بھی ہو اور دوسرے یہ کہ اُن میں ایک تقسیم بھی ہو۔ یعنی تصویر کا ایک رُخ یا ایک پہلو اگر ایک سورت میں آیا ہے تو اس کا دوسرا رُخ اور دوسرا پہلو دوسری سورت میں آئے۔ جیسے قرآن مجید کی آخری دو سورتیں ’’معوّذتین‘‘ ہیں۔ ان دونوں کا مضمون ایک ہی ہے۔ تعوّذ کا ایک پہلو سورۃ الفلق میں آ گیا ہے‘ یعنی اُن وبالوں اور بلاؤں سے پناہ کے لیے اللہ سے دعا کرنا جو انسان پر خارج سے حملہ آور ہوتی ہیں — اور تعوّذ کا دوسرا رُخ سورۃ الناس میں آ گیا ہے‘ یعنی اُن وسوسوں اور بہکاووں سے پناہ کے لیے اللہ سے دعا کرنا جو شیطان اور اس کی صلبی ومعنوی اولاد انسان کے دل ودماغ اور باطن میں پیدا کرتی ہے۔ اسی طرح عائلی زندگی کے بھی دو پہلو ہیں‘ جنہیں تصویر کے دو رُخ یا معاملات کے دو اجزاء کہہ لیجیے‘ جو سورۃ الطلاق اور سورۃ التحریم میں سامنے آتے ہیں۔

اس کو اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ ان سورتوں کا بنیادی اور مرکزی مضمون کیا ہے! خاندان کے جذبات کا لحاظ رکھنا اور ایک دوسرے کے احساسات کا پاس کرنا ایک بنیادی قدر ہے۔ جس گھر میں شوہر اور بیوی کے مابین یہ کیفیت نہیں ہے تو یوں سمجھئے کہ زبردستی اور مارے باندھے کا ایک رشتہ ہے جو قائم ہے۔ اس رشتہ میں چاشنی اور باہم محبت واُلفت درکار ہے۔ اگر وہ موجود نہیں ہے تو ایسا گھر اِس دنیا میں جہنم کا نمونہ بن جاتا ہے۔ الغرض عائلی زندگی میں دو رویے ہیں جن میں انسان انتہا تک چلا جاتا ہے۔ ایک رویہ یہ ہے کہ شوہر اور بیوی کے درمیان عدم موافقت ہے‘ دونوں کے مزاجوں میں کوئی ایسا بُعد ہے کہ باہم موافقت نہیں ہو پا رہی تو اس کی انتہا طلاق ہے۔ یہ مضمون سورۃ الطلاق میں آیا

ہے۔ سورۃ التحریم اور سورۃ الطلاق میں مشابہت دیکھئے کہ دونوں کے آغاز میں براہِ راست نبی اکرمﷺ سے خطاب کیا گیا ہے۔ البتہ سورۃ الطلاق کے شروع میں طلاق کا ذکر ہے‘ مگر چونکہ نبی اکرمﷺ کی حیاتِ طیبہ میں طلاق کا کوئی واقعہ ہوا ہی نہیں لہٰذا شروع میں تو خطاب آنحضورﷺ سے ہے لیکن فوراً بعد ہی ﴿اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ﴾ سے آخر آیت تک جمع کا صیغہ آیا ہے۔ یعنی دراصل یہ بات رسول اللہﷺ کو مخاطب کر کے آپؐ کی وساطت سے مسلمانوں سے کہی جا رہی ہے کہ اے مسلمانو! اگر تمہارے یہاں کوئی اس قسم کی صورتِ حال پیش آ جائے کہ طلاق ناگزیر ہو جائے تو یہ روش اختیار کرو‘ یہ اس کے قواعد وضوابط اور شرائط وآداب ہیں۔

یہ بات تمدنی اعتبار سے بڑی اہم ہے کہ بعض معاشروں اور بعض مذاہب نے طلاق کو عائلی زندگی سے خارج کر دیا ہے‘ جبکہ اسلام کا نظام بڑا متوازن اور معتدل ہے۔ اسلام کے عائلی نظام میں ایک طرف تو طلاق کو حلال چیزوں میں سے سب سے زیادہ ناپسندیدہ اور مبغوض چیز کہا گیا ہے اور ساتھ ہی بیوی کی ناپسندیدہ عادتوں سے صرفِ نظر کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ ایک حدیث شریف میں‘ جو حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے‘ نبی اکرمﷺ نے بطورِ انتباہ فرمایا:

((لَا یَفْرُكْ مُؤْمِنٌ مُؤْمِنَةً اِنْ کَرِہَ مِنْھَا خُلُقًا رَضِیَ مِنْھَا آخَرَ)) (۱)

یعنی کسی مؤمن کو اپنی بیوی سے اس کی کسی ناپسندیدہ عادت کی وجہ سے نفرت نہیں کرنی چاہیے۔ اس لیے کہ اگر اس کی کوئی ایک عادت اسے ناپسند ہے تو اس کی کوئی دوسری عادت اسے اچھی بھی تو لگتی ہے۔

اس ارشادِ رسولﷺ کی روشنی میں یہ کوشش کرنی چاہیے کہ جانبین ایک دوسرے کی خوبیوں اور بھلائیوں پر نگاہ رکھیں تاکہ حتی الامکان کوشش ہو سکے کہ ان کے درمیان موافقت پیدا ہو جائے۔ لیکن اگر کوشش کے باوجود کسی وجہ سے موافقت پیدا نہیں ہو رہی تو پھر اسلام ان دونوں کو زبردستی باندھ کر رکھنا نہیں چاہتا۔ اس زبردستی کے بندھن سے معاشرے میں خیر پیدا نہیں ہوتا‘ شر پیدا ہوتا ہے‘ لہٰذا طلاق کا راستہ کھول دیا گیا ہے۔ البتہ اس کے جو قواعد وضوابط اور آداب وشرائط ہیں انہیں بھی قرآن میں وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ اِن آداب وشرائط کو ہمارے معاشرے میں عام طور پر ملحوظ نہیں رکھا جاتا اور کوئی شوہر غصہ میں آ کر ایک ہی وقت میں آخری قدم اٹھا بیٹھتا ہے اور ایک دفعہ ہی تین طلاقیں دے دیتا ہے اور بعد میں پچھتاتا ہے۔

---

(۱) صحیح مسلم‘ کتاب الرضاع‘ باب الوصیة بالنساء۔

دوسری طرف عائلی زندگی میں ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ ایک دوسرے کی دلجوئی اور خوشنودی حاصل کرنے کا معاملہ حدِ اعتدال سے بڑھ جائے اور شوہر اپنی بیوی کی رضا جوئی میں اِس حد تک چلا جائے کہ شریعت کے احکام ٹوٹنے لگیں۔ مثلاً کوئی شخص اپنی بیوی کو خوش اور راضی کرنے کے لیے یا اس کی کوئی فرمائش پوری کرنے کے لیے اللہ کی حرام کی ہوئی کسی چیز کو حلال ٹھہرا لے۔ ظاہر بات ہے کہ اس کا تو سرے سے کوئی امکان نبی اکرم ﷺ کے لیے نہیں تھا' معاذ اللہ ثم معاذ اللہ۔ البتہ آنحضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں ایک واقعہ ایسا پیش آ گیا جس میں آپ ﷺ نے اپنی بعض ازواجِ مطہرات ؓ کی دلجوئی ملحوظ رکھی۔ اگرچہ یہ اپنی جگہ پسندیدہ اور مطلوب ہے' آپ ﷺ نے اس کی ترغیب دی ہے' رسالت مآب ﷺ کا ارشاد ہے کہ: ((خَیْرُکُمْ خَیْرُکُمْ لِاَھْلِہٖ' وَاَنَا خَیْرُکُمْ لِاَھْلِیْ)) (۱) ''تم میں سے بہترین وہ لوگ ہیں جو اپنے گھر والوں کے حق میں بہترین طرزِ عمل اختیار کرنے والے ہیں' اور جان لو کہ میں تم میں سے اپنے گھر والوں کے لیے بہترین روش اختیار کرنے والا ہوں''۔ اگرچہ یہ ایک پسندیدہ طرزِ عمل ہے مگر ایک خاص واقعہ میں رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے فہمائش کی گئی۔ اس لیے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے معاملہ میں یہ ہو چکا تھا کہ انہوں نے اپنے ذاتی ذوق کی بنا پر اونٹ کے گوشت کا استعمال ترک کر دیا تھا لیکن یہود نے یہ سمجھ لیا کہ اونٹ کا گوشت حرام ہے۔ گویا ایک نبی کے ذاتی ذوق کے معاملہ کو شریعت کا جزو بنا لیا گیا اور اونٹ کے گوشت کی حرمت بنی اسرائیل کی شریعت میں مستقل ہوگئی۔

میں نے جس خاص واقعہ کا حوالہ دیا ہے وہ احادیث میں تفصیل سے بیان ہوا ہے۔ سورۃ التحریم میں اس واقعہ کی طرف محض اشارہ ہے۔ احادیثِ صحیحہ سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کا یہ معمول تھا کہ آپ ﷺ عصر کی نماز کے بعد تھوڑی تھوڑی دیر کے لیے سب ازواجِ مطہرات ؓ کے یہاں تشریف لے جاتے۔ ازواجِ مطہرات ؓ کو آپ ﷺ کے ساتھ جو محبت اور جو تعلقِ خاطر تھا اس کے پیشِ نظر ہر زوجہ محترمہ ؓ کی یہی تمنا اور کوشش ہوتی تھی کہ وہ آنحضور ﷺ کی توجہات کا مرکز بنے اور زیادہ سے زیادہ وقت اسے رسول اللہ ﷺ کی بابرکت صحبت میں رہنے کا موقع نصیب ہو۔ لیکن آپ ﷺ اس معاملے میں کامل عدل سے کام لیتے تھے اور ہر زوجہ محترمہ ؓ کے یہاں مساوی وقت دیتے تھے۔ ایک روز رسول اللہ ﷺ کو حضرت زینب بنت جحش ؓ کے یہاں معمول سے زیادہ دیر لگی۔ ہوا یہ کہ ان ؓ کے

(۱) سنن الترمذی' کتاب المناقب عن رسول اللہ ﷺ' باب فضل ازواج النبی۔

یہاں کہیں سے ہدیتاً شہد آیا ہوا تھا' اور حضور ﷺ کو چونکہ شہد بہت مرغوب تھا اس لیے اُمّ المؤمنین حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے آپ ﷺ کو شہد پیش کیا جس کے نوش فرمانے کے باعث آپؐ انؓ کے یہاں زیادہ دیر تک ٹھہرے۔ پھر کئی روز تک یہی معمول ہوا۔ حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے مل کر تدبیر کی کہ آپؐ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے یہاں شہد پینا چھوڑ دیں تاکہ آپؐ انؓ کے یہاں معمول سے زیادہ وقت نہ دے سکیں۔ وہ شہد مغافیر کے پھولوں کا تھا جس میں کچھ بساند اور ہینک ہوتی ہے۔ چنانچہ حضور ﷺ شہد کے استعمال کے بعد جب انؓ کے حجرے میں تشریف لے جاتے تو وہ حضور ﷺ سے کہتیں کہ آپؐ کے مُنہ سے مغافیر کی بساند آتی ہے۔ ان دونوں نے چند دیگر ازواج مطہراتؓ کو بھی اس میں شریک کرلیا۔ آپؐ چونکہ نہایت نفاست پسند تھے اور جب آپ ﷺ کی متعدد ازواجِ مطہراتؓ نے یہ بات کہی تو آپؐ نے عہد کرلیا اور قسم کھالی کہ آئندہ آپ ﷺ یہ شہد استعمال نہیں فرمائیں گے۔

ہمارے دین میں نبی اکرم ﷺ کو یہ مقام حاصل ہے کہ اگر آپؐ سے کوئی معمولی بات بھی ظہور میں آجائے تو وہ قانون کی حیثیت اختیار کر جاتی ہے۔ اب آپؐ نے چونکہ اپنی ازواجِ مطہراتؓ کی خوشنودی کے لیے اللہ تعالیٰ کی حلال کردہ ایک شے اپنے اوپر حرام کی تھی اس لیے یہ خطرہ پیدا ہوسکتا تھا کہ اُمت اس شے کو ہمیشہ کے لیے حرام یا کم از کم حد درجہ مکروہ سمجھنے لگے' یا اُمت کے لوگ یہ خیال کرنے لگیں کہ اللہ کی حلال کی ہوئی چیز اپنے اوپر حرام کر لینے کی دین میں اجازت ہے' اس لیے اللہ تعالیٰ نے یہ سورۂ مبارکہ نازل فرما کر آنحضور ﷺ کو اس کام پر ٹوک دیا۔

اس ٹوکنے سے متعلق یہ بات بھی واضح ہوئی کہ حلال وحرام اور جائز و ناجائز کی حدود مقرر کرنے کے مطلق اور قطعی اختیارات اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں۔ نبی بھی اگر کسی شے کو حلال یا حرام قرار دیتا ہے تو صرف اس صورت میں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا اشارہ ہو' خواہ وہ اشارہ وحیٔ جلی کی صورت میں ہوا ہو یا وحیٔ خفی کے طور پر کیا گیا ہو۔

اس سورۂ مبارکہ پر تدبر کرنے سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ جب ایک ذرا سی بات پر رسول اللہ ﷺ کو نہ صرف ٹوک دیا گیا اور اس کی اصلاح کی گئی بلکہ اس کا ایک سورۃ میں ذکر کر کے اس کو ابدالآباد تک کے لیے قرآن مجید میں محفوظ کر دیا گیا' تو اس سے قطعی طور پر یہ بات بھی ثابت ہو جاتی ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے جن اعمال' افعال' احکام اور ہدایات پر قرآن مجید میں کوئی گرفت یا اصلاح موجود نہیں ہے وہ سراسر حق ہیں اور اللہ تعالیٰ کی منشاء و مرضی کے مطابق ہیں اور ان کا اتباع ہم پر لازم

ہے۔اس بات سے سنت کی حجیت وفرضیت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے۔

ان تمہیدی باتوں کے بعد اب ہم اس سورۂ مبارکہ کا مطالعہ شروع کرتے ہیں۔فرمایا: ﴿يَـٰٓأَيُّهَا النَّبِىُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ أَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ۖ﴾ ''اے نبی (ﷺ)! آپ اُس چیز کو کیوں حرام ٹھہراتے ہیں جسے اللہ نے آپؐ کے لیے حلال کیا ہے؟'' انداز استفہامیہ ہے لیکن مقصود آنحضورﷺ کو ٹوکنا اور متنبہ کرنا ہے۔ ﴿تَبْتَغِى مَرْضَاتَ أَزْوَٰجِكَ ۚ﴾ ''کیا آپؐ اپنی بیویوں کی خوشنودی چاہتے ہیں؟'' آیت کے اس حصہ سے معلوم ہوا کہ حضورﷺ کا یہ فعل اپنی ذاتی پسند یا ناپسند کی بنا پر نہیں تھا' بلکہ بیویوں کی خوشنودی کی وجہ سے تھا' جنہوں نے یہ صرف اس لیے چاہا تھا کہ آپؐ شہد پینے کی خاطر حضرت زینبؓ کے ہاں زیادہ دیر قیام نہ فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس سبب کو یہاں بیان فرما کر ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کو متنبہ فرما دیا کہ وہ نبی کی ازواج ہونے کی نازک ذمہ داریوں کا لحاظ رکھیں۔آگے فرمایا: ﴿وَاللّٰهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ①﴾ ''اور اللہ معاف کرنے والا' رحم کرنے والا ہے'' آیت کے اس حصہ میں نبی اکرمﷺ کو تسلی دی جا رہی ہے کہ آپؐ نے اپنی بیویوں کی خوشنودی کی خاطر ایک حلال چیز کو حرام قرار دینے کا جو کام کیا ہے وہ کوئی گناہ نہ تھا لیکن آپؐ کے منصب کی اہم ترین ذمہ داریوں کے اعتبار سے مناسب نہ تھا' لہٰذا اللہ نے صرف ٹوک کر اصلاح کی طرف متوجہ کرنے پر اکتفا فرمایا۔

اس مقام پر ٹھہر کر ذرا اس بات پر غور فرمایئے کہ جب نبی اکرمﷺ کو اپنی ازواج کی خوشنودی کی خاطر ایک حلال چیز کو اپنے لیے حرام قرار دینے پر اس شدّومدّ کے ساتھ ٹوک دیا گیا ہے تو اُن لوگوں کا آخرت میں کتنا سخت اور شدید مؤاخذہ ہوگا جو اپنی بیویوں کو خوش رکھنے کے لیے حرام کو حلال کر لیتے ہیں اور پھر اس کا مسلسل اور مستقل ارتکاب کرتے رہتے ہیں۔

دوسری آیت میں فرمایا: ﴿قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ أَيْمَـٰنِكُمْ ۚ﴾ ''اللہ ایسی قسموں کو کھولنے کا ایک راستہ تمہارے لیے مقرر کر چکا ہے''۔اس میں سورۃ المائدۃ کی آیت ۸۹ کی طرف اشارہ ہے جس میں واضح کیا گیا ہے کہ اگر کسی شخص نے کوئی قسم کھالی ہے اور اب اس کو کھولنا ہے تو اس کے لیے کفارہ مقرر ہے' اور وہ یہ کہ دس مساکین کو کھانا کھلائے۔وہ کھانا ایسا ہو جو انسان اپنے اہل و عیال کو کھلاتا ہے ——یا دس مساکین کو لباس مہیا کرے ——یا کسی ایک غلام یا لونڈی کو آزاد کرائے۔ اور اگر کسی کو اِن میں سے کسی کی بھی استطاعت نہ ہو تو اس کا بدل یہ مقرر کیا گیا کہ ایسا شخص تین دن کے

روزے رکھے۔ یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ قسم کو کھولنے اور عہد کی پابندی سے نکلنے کا اللہ تعالیٰ طریقہ معین فرما چکا ہے۔ اس لیے جب بھی کوئی ایسی صورت پیش آ جائے تو کفارہ ادا کر کے قسم کھول دو۔ آگے فرمایا: ﴿وَاللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۚ﴾ ''اور (یہ بات جان لیجیے کہ) آپ کا اور سب مسلمانوں کا مددگار (حامی اور پشت پناہ) صرف اللہ ہی ہے''۔ لہٰذا اسی کی رضا اور خوشنودی کو ہمیشہ مقدم رکھنا چاہیے۔ ﴿وَهُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ۝۲﴾ ''اور وہی ہے سب کچھ جاننے والا' کمالِ حکمت والا''۔ یعنی وہ جو بھی حکم دیتا ہے اپنے علمِ کامل کی بنیاد پر دیتا ہے اور اس کی حکمتِ بالغہ اس حکم میں شامل ہوتی ہے۔

سورۃ التحریم کی ابتدائی دو آیات میں ہمارے سامنے خاندانی و عائلی زندگی کے بارے میں ایک بڑی بنیادی بات آ گئی کہ بیویوں کی رضاجوئی اور ان کی خوشنودی حاصل کرنا' ان کے ساتھ نرمی' محبت' مودّت' الفت اور اُن کے جذبات کا پاس اور لحاظ رکھنا' یہ تمام چیزیں اصلاً مطلوب اور پسندیدہ ہیں' لیکن ایک خاص حد تک۔ ایسا نہ ہو کہ کہیں یہ جذبہ حدِ اعتدال سے تجاوز کر جائے اور شریعت کے احکام ٹوٹنے شروع ہو جائیں۔ لہٰذا ایک بندۂ مؤمن کو ہمیشہ اور ہر وقت اعتدال کی روش اختیار کرنی چاہیے اور اس معاملہ میں ہوشیار اور چوکنا رہنا چاہیے۔ آیات ۳ تا ۵ میں فرمایا:

﴿وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِيُّ اِلٰى بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِيْثًا ۚ فَلَمَّا نَبَّاَتْ بِهٖ وَاَظْهَرَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ عَرَّفَ بَعْضَهٗ وَاَعْرَضَ عَنْۢ بَعْضٍ ۚ فَلَمَّا نَبَّاَهَا بِهٖ قَالَتْ مَنْ اَنْۢبَاَكَ هٰذَا ۭ قَالَ نَبَّاَنِيَ الْعَلِيْمُ الْخَبِيْرُ ۝۳ اِنْ تَتُوْبَآ اِلَى اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا ۚ وَاِنْ تَظٰهَرَا عَلَيْهِ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰىهُ وَجِبْرِيْلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِيْرٌ ۝۴ عَسٰى رَبُّهٗٓ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ يُّبْدِلَهٗٓ اَزْوَاجًا خَيْرًا مِّنْكُنَّ مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ تٰٓئِبٰتٍ عٰبِدٰتٍ سٰٓئِحٰتٍ ثَيِّبٰتٍ وَّاَبْكَارًا ۝۵﴾

''اور جب نبی (ﷺ) نے ایک بات اپنی بیوی سے راز میں کہی تھی' پھر جب اُس بیوی نے وہ راز (کسی اور پر) ظاہر کر دیا' اور اللہ نے نبی (ﷺ) کو اُس (افشائے راز) کی اطلاع دے دی تو نبی (ﷺ) نے اس پر کسی حد تک (اس بیوی کو) خبردار کیا اور کسی حد تک اس سے درگزر کیا۔ پھر جب نبی (ﷺ) نے اسے (افشائے راز کی) یہ بات بتائی تو اس نے پوچھا: آپ کو اس کی خبر کس نے دی؟ نبی (ﷺ) نے کہا ''مجھے اُس نے خبر دی جو سب کچھ جانتا اور خوب باخبر ہے''۔ اگر تم دونوں اللہ کی طرف رجوع کرو تو (یہی تمہارے لیے زیبا ہے) تمہارے دل تو (خدا کی طرف) مائل ہی ہیں' اور اگر تم نبیؐ کے خلاف ایکا کرو گی تو اس کا حامی اللہ ہے اور جبریل اور تمام

نیکوکار مسلمان' اور مزید برآں فرشتے بھی اس کے مددگار ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ وہ تمہیں طلاق دے دے تو اُس کا پروردگار تمہارے بدلے میں تم سے بہتر بیویاں اس کو عطا کر دے' اطاعت شعار' مؤمنہ' فرمانبردار' توبہ کرنے والیاں' عبادت گزار' ریاضت کرنے والیاں' شوہر آشنا اور کنواریاں''۔

ان آیات میں نبی اکرم ﷺ کی عائلی زندگی کے ایک خاص واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ واقعہ کی تفصیلات میں جانے کی چنداں ضرورت نہیں' کیونکہ یہ آیات اپنے مفہوم و مدعا کو خود واضح کر رہی ہیں۔ نبی اکرم ﷺ نے کوئی راز کی بات اپنی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن میں سے کسی ایک سے کہی اور ساتھ ہی یہ تاکید بھی فرما دی کہ یہ بات کسی اور کو نہ بتائی جائے۔ ان زوجہ محترمہؓ سے یہ غلطی ہوئی کہ انہوں نے کسی دوسری زوجہؓ کے سامنے اس کا ذکر کر دیا۔ نبی اکرم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے اس افشائے راز کی خبر دے دی۔ اس پر حضور ﷺ نے نہایت ملائمت' شفقت اور نرمی سے اُن زوجہ محترمہؓ کو اشارتاً جتلا دیا کہ یہ بات آپؐ کے علم میں آ گئی ہے۔ ﴿عَرَّفَ بَعْضَهٗ وَاَعْرَضَ عَنْ بَعْضٍ ۚ﴾ کے الفاظ میں آپؐ کے حسن معاشرت کی اعلیٰ مثال کا ذکر ہے کہ آپ نے پوری بات جتلانا اور پورے کا پورا الزام دینا پسند نہ فرمایا۔ آپؐ نے شکوہ و شکایت میں بھی التفات و ملائمت کے پہلو کو پیش نظر رکھا' تا کہ ان زوجہ محترمہؓ کو انتباہ ہو جائے۔ اس پر اُن زوجۂ محترمہؓ نے پلٹ کر سوال کیا کہ ''آپؐ کو یہ کس نے بتایا؟'' ہوسکتا ہے کہ انہیں یہ گمان ہوا ہو کہ میں نے جن کو یہ بات بتائی تھی شاید انہوں نے حضور ﷺ کو بتا دی۔ اس لیے اپنے شک اور سوئے ظن کو رفع کرنے کے لیے انہوں نے حضور ﷺ سے وضاحت چاہی کہ آپؐ کو کس نے بتایا! —— اس کے جواب میں حضور ﷺ کے جو الفاظ آئے ہیں ان میں تھوڑا سا اظہارِ ناراضگی کا پہلو بھی ہے' کیونکہ یہ معاملہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا کہ یہ مجھے کس نے بتایا' اصل بات تو یہ ہے کہ ایک راز کی بات تھی' اسے راز ہی رہنا چاہیے تھا۔ لہٰذا حضور ﷺ نے جواب میں فرمایا: ''مجھے تو اُس خدا نے بتایا ہے جو العلیم بھی ہے اور الخبیر بھی''۔ اس واقعے کے اجمالی ذکر کے بعد اب اللہ تعالیٰ کی جانب سے خطاب ہو رہا ہے۔

یہاں اس بات کو بھی جان لیجیے کہ عائلی زندگی میں مرد کا اپنی بیوی کے حق میں نرم ہونا' شفیق ہونا' شوہر اور بیوی کے درمیان محبت و الفت' رحمت و شفقت اور مودّت کا پایا جانا مطلوب ہے۔ لیکن اس میں اگر شوہر کی طرف سے نرمی زیادہ ہو جائے اور خاندان کے ادارہ کو مستحکم رکھنے کا بنیادی اصول یعنی ﴿اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ﴾ کا اہتمام و التزام پوری طرح باقی نہ رہے تو خاندانی زندگی کے

بنیادی ڈھانچے کو ضعف پہنچے گا۔ پھر جب معاملہ خاص طور پر نبی اکرم ﷺ کا ہو تو اُس کی اہمیت دوچند ہو جاتی ہے، کیونکہ آپ ﷺ کا ہر عمل اُمت کے لیے نمونہ ہے —— سورۃ الحجرات میں بہت زور دے کر فرمایا گیا ہے کہ ﴿وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ فِیۡکُمۡ رَسُوۡلَ اللّٰہِ﴾ ''خوب جان لو کہ تمہارے درمیان اللہ کا رسولؐ موجود ہے''۔ اس میں ایک بڑا لطیف نکتہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے ساتھ ہمارے تعلق کا تو ایک ہی پہلو ہے، کہ آپؐ اللہ کے نبی اور رسول ہیں اور ہم اُمتی ہیں، آپؐ ہمارے آقا ہیں، ہم آپؐ کے غلام ہیں، اور تو کوئی رشتہ اور نسبت نہیں ہے! لیکن صحابہ کرام اور صحابیات رضی اللہ عنہم کا معاملہ بہت مختلف تھا۔ صحابہؓ میں سے کوئی آنحضور ﷺ کا چچا بھی ہے، اب چچا ہونے کے اعتبار سے وہ بڑا ہے، حضورؐ بھتیجے ہیں، بھتیجے کا رشتہ بہر حال چھوٹا ہے۔ اب اگر کہیں حضرت حمزہ اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما اپنی اس حیثیت کو سامنے رکھتے ہوئے حضور ﷺ کے ساتھ کوئی ایسا طرزِ عمل اختیار کر لیتے جو بڑا اپنے چھوٹے کے ساتھ اختیار کرتا ہے تو حضور ﷺ کی حیثیتِ رسالت مجروح ہو سکتی تھی۔ لہٰذا آگاہ کر دیا گیا، متنبہ کر دیا گیا: ﴿وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ فِیۡکُمۡ رَسُوۡلَ اللّٰہِ﴾ اچھی طرح جان رکھو کہ تمہارے مابین صرف محمدؐ نہیں ہیں، بلکہ محمد رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ گرامی ہے، لہٰذا آپ ﷺ کی اس حیثیت کو ہمیشہ پیش نظر رکھو۔

اسی بات کا اطلاق ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن پر بھی ہوگا کہ بیوی ہونے کی حیثیت سے ان کی طرف سے ناز کا بھی اظہار ہو جائے گا۔ لہٰذا اُن کو بھی متنبہ کر دیا گیا کہ ٹھیک ہے اے عائشہؓ! کہ محمد ﷺ تمہارے شوہر ہیں، اے حفصہؓ! ٹھیک ہے کہ محمد ﷺ تمہارے شوہر ہیں، لیکن ہر دم یہ بات پیش نظر رہے کہ یہ اللہ کے رسول بھی ہیں اور یہ بہت نازک مقام ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے احترام اور ادب کو کسی درجہ میں بھی ضعف پہنچنے کا امکان ہو تو اس کے بارے میں ہمیشہ سخت ترین تنبیہہ نظر آئے گی۔ جیسے سورۃ الحجرات میں ہے کہ: ﴿اَنۡ تَحۡبَطَ اَعۡمَالُکُمۡ وَاَنۡتُمۡ لَا تَشۡعُرُوۡنَ ﴿۲﴾﴾ ''مبادا تمہارے اعمال اکارت ہو جائیں اور تم کو خبر تک نہ ہو''۔ اگر معاملے کی یہ خاص صورت پیشِ نظر نہ ہو تو پھر ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن سے کچھ سوئے ظن کی کیفیت پیدا ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ حقائق جو میں نے بیان کیے ہیں، اگر مدّنظر رہیں تو پھر کوئی ایسی صورت پیدا نہیں ہوگی۔

زیر بحث معاملہ دو ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہما کے درمیان پیش آیا۔ ایک نے نبی ﷺ کا بتایا ہوا راز دوسری پر ظاہر کر دیا۔ اب دونوں کے لیے اللہ کا حکم ہے کہ: ﴿اِنۡ تَتُوۡبَاۤ اِلَی اللّٰہِ فَقَدۡ صَغَتۡ قُلُوۡبُکُمَا ۚ﴾ ''اگر تم دونوں اللہ کی جناب میں توبہ کرو (اظہارِ ندامت کرو اور اللہ سے استغفار کرو) تو

(یہی تمہارے حق میں بہتر ہے' کیونکہ) تمہارے دل تو مائل ہو ہی چکے ہیں''۔ یعنی دلوں میں تو یہ کیفیت ہے ہی' پشیمانی اور ندامت کے جذبات تو ہیں ہی ــــــ لیکن بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کسی کو کوئی مان ہوتا ہے۔ وہی بات جسے میں نے ناز سے تعبیر کیا ہے۔ اس ناز کی وجہ سے ندامت اور پشیمانی کے الفاظ زبان پر نہیں آ رہے' طبیعت ہچکچا رہی ہے۔ تو گویا ترغیب کا یہ نہایت بلیغ انداز ہے کہ فرمایا گیا: ''تمہارے دل تو مائل ہو ہی گئے ہیں''۔ جیسے ہم کسی سے کہتے ہیں کہ ذرا ہمت کرو' اصل میدان تو تم سر کر ہی چکے ہو' کٹھن منزل تو تم نے طے کر لی ہے' اب تھوڑی سی کسر رہ گئی ہے' ہمت نہ ہارو' حوصلہ سے کام لے کر اس مرحلہ سے بھی گزر جاؤ۔

اس مقام پر بعض مفسرین کو سخت مغالطہ ہوا ہے۔ انہوں نے ''صَغَتْ'' کا مفہوم کسی شے سے انحراف سمجھا ہے' حالانکہ یہ لفظ کسی شے کی طرف جھکنے اور مائل ہونے کا مفہوم رکھتا ہے۔ شاہ عبدالقادر دہلویؒ نے بھی یہاں ''صَغَتْ'' کا ترجمہ ''جھک جانا'' کیا ہے۔ آیت کا اسلوب بھی یہی بتا رہا ہے کہ ''اگر تم اللہ کی جناب میں توبہ کرو تو تمہارے دل تو مائل ہو ہی چکے ہیں (جھک ہی چکے ہیں)''۔ ذرا سی یہ ہچکچاہٹ جو شوہر اور بیوی کے نفسیاتی تعلق کی وجہ سے حائل ہے' اس جھجک کو دور کرو اور اپنی خطا کا اعتراف کرو۔ اللہ سے بھی اس کے لیے استغفار کرو اور نبی ﷺ سے بھی معذرت کرو کہ ہم سے خطا ہوئی ہے۔

اس ضمن میں یہ بات بھی جان لینی چاہیے کہ قرآن مجید کے الفاظ میں اگر بظاہر درشتی کا پہلو ہو' سختی کا اسلوب ہو تو دیکھنا یہ ہوگا کہ خطاب کن سے ہے! بسا اوقات شفقت اور محبت ہی کے اظہار کے لیے بظاہر سختی کا انداز اختیار کیا جاتا ہے۔ ایک شفیق والد اپنے بچے کی تربیت کے لیے بعض اوقات سختی اور درشتی کا انداز اختیار کرتا ہے' لیکن کیا یہ گمان ہو سکتا ہے کہ باپ کا دل اپنے بچے کی محبت سے خالی ہے؟ البتہ یہاں ایک بات یہ جان لیجیے کہ ع ''جن کے رتبے ہیں سوا' ان کی سوا مشکل ہے'' کے مصداق جن کے مقامات بلند ہوتے ہیں ان کی چھوٹی سی بات پر بھی جب گرفت ہوتی ہے تو بظاہر انداز بڑا سخت ہوتا ہے۔ عربی کا ایک مقولہ ہے کہ ''حَسَنَاتُ الْاَبْرَارِ سَيِّئَاتُ الْمُقَرَّبِيْنَ'' یعنی عام لوگوں کے لیے جو کام بڑی نیکی کا سمجھا جائے گا ہو سکتا ہے کہ وہی کام اللہ تعالیٰ کے مقربین اولیاء اور محبوب بندوں کے لیے تقصیر قرار پائے اور ان کے مرتبہ کے اعتبار سے قابل گرفت شمار ہو جائے۔ لہٰذا یہ معاملہ مراتب اور درجات کے اعتبار سے ہوتا ہے۔ یہی اسلوب ہم قرآن مجید کے بعض مقامات پر دیکھتے

ہیں کہ آنحضور ﷺ کے ساتھ خطاب میں بھی بظاہر کچھ سختی کا اظہار ہو رہا ہے۔ جیسے:

﴿عَبَسَ وَتَوَلّٰی ① اَنْ جَآءَہُ الْاَعْمٰی ② وَمَا یُدْرِیْكَ لَعَلَّهٗ یَزَّكّٰی ③ اَوْ یَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰی④ اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰی⑤ فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰی⑥﴾

''ترش رو ہوا اور بے رُخی برتی۔ اس بات پر کہ وہ اندھا اس کے پاس آ گیا۔ تمہیں کیا خبر' شاید وہ سدھر جائے! یا نصیحت پر دھیان دے اور نصیحت کرنا اس کے لیے نافع ہو! جو شخص بے پروائی برتتا ہے' اس کی طرف تو تم توجہ کرتے ہو۔''

بظاہر اِس اسلوب میں کچھ سختی ہے' لیکن درحقیقت اس انداز میں محبت' شفقت اور عنایت پنہاں ہے۔ نبی اکرم ﷺ کے مقام اور مرتبہ کے اعتبار سے گرفت کا انداز نظر آتا ہے' جبکہ بڑی معمولی بات ہے اور عام لوگوں کے لیے غلطی بھی نہیں ہے' لیکن رسول اور نبی ہونے کے اعتبار سے اس پر بھی روک ٹوک ہو رہی ہے اور بظاہر انداز سخت نظر آ رہا ہے۔ اسی اصول کا ہم یہاں بھی اطلاق کریں گے کہ ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن سے فرمایا جا رہا ہے کہ تم اپنا مقام اور مرتبہ پہچانو' تم اُمّہات المؤمنین ہو' پوری اُمت کی خواتین کے لیے قیامت تک تمہارا طرزِ عمل نمونے کا طرزِ عمل ہوگا۔ لہٰذا تمہارا طرزِ عمل بڑا اعلیٰ' معیاری اور آئیڈیل ہونا چاہیے۔ اس میں ذرا سی کمی کسی پہلو سے بھی ہو تو ممکن ہے کہ وہ پہلو اُمت کی خواتین کے لیے بڑی بڑی لغزشوں کا سبب بن جائے۔ اس لیے یہاں الفاظ میں بظاہر کچھ سختی ہے' لیکن اس سے ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کے بارے میں کوئی معمولی سا سوئے ظن بھی دل میں ہرگز پیدا نہیں ہونا چاہیے۔

آیت مبارکہ کی طرف پھر رجوع کیجیے' فرمایا: ﴿اِنْ تَتُوْبَآ اِلَی اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا ۚ﴾ ''اگر تم اللہ کی جناب میں توبہ کرو تو تمہارے دل تو اس کی طرف مائل ہو ہی چکے ہیں''۔ ﴿وَاِنْ تَظٰهَرَا عَلَیْهِ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰىهُ وَجِبْرِیْلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِیْنَ ۚ﴾ ''اور اگر تم ہمارے نبی کے خلاف ایکا کرو گی تو جان رکھو کہ اللہ خود اپنے رسول کا رفیق ہے' پشت پناہ ہے اور ساتھ ہی جبریل ہیں (جو ملائکہ کے سردار ہیں) اور تمام مؤمنین صالحین (یعنی آپؐ کے اصحابؓ آپؐ کے پشت پناہ ہیں)''۔ ﴿وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِیْرٌ ④﴾ ''اور اس کے بعد تمام ملائکہ بھی ہمارے نبیؐ کے ساتھی اور مددگار ہیں'' —— یہاں اہل ایمان کا ذکر تو صالحیت کی صفت کے ساتھ کیا گیا ہے' لیکن ملائکہ کے لیے فرمایا کہ کُل کے کُل ملائکہ' کیونکہ وہ تو سب کے سب ہی صالح ہیں' ان کے بارے میں تو کوئی دوسری رائے

ہو ہی نہیں سکتی۔ ان کا معاملہ تو یہ ہے کہ: ﴿يَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۝﴾ ’’وہی کچھ کرتے ہیں جس کا انہیں حکم دیا جاتا ہے‘‘۔

آگے پھر وہی تہدید کا انداز چل رہا ہے جس میں ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کی سیرت و کردار کی ایک جھلک بھی سامنے آتی ہے کہ تمہارے اندر جو یہ اوصاف ہیں کہ تم اطاعت شعار ہو‘ ایماندار ہو‘ فرمانبردار ہو‘ توبہ کرنے والیاں ہو‘ زہد و قناعت اختیار کرنے والیاں ہو‘ ان پر تمہیں نازاں نہیں ہونا چاہیے۔ تم یہ نہ سمجھو کہ اللہ تم جیسی یا تم سے بہتر خواتین اپنے نبیؐ کے لیے ازواج کے طور پر فراہم نہیں کر سکتا۔ اگر کہیں تمہیں بالفرض اپنے اسلام و ایمان پر‘ اپنے تقویٰ و احسان پر اور اپنی نیکیوں اور عبادت گزاریوں پر زعم ہو گیا ہے (اگر اس کا کچھ بھی امکان ہے) تو جان لو کہ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم تم سب کو چھوڑنے کا فیصلہ کر لیں تو اللہ ان کو تم جیسی بلکہ تم سے بھی بہتر بیویاں عطا کر سکتا ہے۔ یہ مفہوم ہے آیت کے ان الفاظِ مبارکہ کا کہ ﴿عَسٰى رَبُّهٗٓ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ يُّبْدِلَهٗٓ اَزْوَاجًا خَيْرًا مِّنْكُنَّ مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ تٰٓئِبٰتٍ عٰبِدٰتٍ سٰٓئِحٰتٍ ثَيِّبٰتٍ وَّاَبْكَارًا ۝﴾ ’’ثَـیِّبَات‘‘ ان خواتین کو کہا جاتا ہے جن کی ایک دفعہ شادی ہو چکی ہو‘ یعنی بیوہ یا مطلقہ ہوں اور ’’اَبکار‘‘ سے کنواری خواتین مراد ہیں۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حبالۂ عقد میں اکثر خواتین شوہر آشنا تھیں لہٰذا ان کا ذکر بھی یہاں کر دیا گیا‘ کیونکہ ایک خاتون جسے متاہل زندگی کا تجربہ پہلے ہو چکا ہو بعض پہلوؤں سے اس کی رفاقت شوہر کے لیے آسانی کا موجب بن جاتی ہے۔ رہا اَبکار یعنی کنواریوں کا معاملہ تو ہر شخص کے لیے کسی خاتون کا بیوی کی حیثیت سے یہ نہایت پسندیدہ وصف ہے ہی۔

ان تین آیات میں ایک خاص واقعہ کے حوالہ سے ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن سے خطاب کیا گیا ہے‘ جس سے یہ رہنمائی حاصل ہوتی ہے کہ ازدواجی زندگی میں اگرچہ باہمی محبت و الفت‘ شفقت و مودّت‘ ایک دوسرے کے جذبات و احساسات کا لحاظ‘ حسن معاشرت اور نرمی کا سلوک مطلوب ہے‘ لیکن ایسا نہ ہو کہ اس کے نتیجہ میں بیویوں میں شوخی کا انداز حدِ اعتدال سے تجاوز کر جائے اور ﴿اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ﴾ کا اصول مجروح ہو جائے جو ہماری خاندانی زندگی کی بنیاد ہے۔ کیونکہ اگر خاندان کا ادارہ کمزور ہو جائے تو اس کے اثرات سارے معاشرے پر مرتب ہوتے ہیں‘ اس لیے اس اصول کو ایک واقعے کے حوالے سے ذہن نشین کروایا گیا ہے۔

عائلی زندگی کو صحیح بنیادوں پر استوار رکھنے اور ’’گھر‘‘ کو امن و سکون کا گہوارہ بنانے کے لیے ان

آیات میں مسلمان عورتوں کو ایک اہم سبق یہ دیا گیا ہے کہ وہ اپنے شوہر کے رازوں کی امانت دار اور محافظ بنیں۔ قرآن میں ان کی صفت ''حٰفِظٰتٌ لِّلۡغَیۡبِ '' یعنی ''رازوں کی حفاظت کرنے والیاں'' بتائی گئی ہے۔ بیوی فطری طور پر بھی گھر کے رازوں کی امین ہوتی ہے' لیکن اگر وہ خود ہی اس امانت کی حفاظت نہ کر سکے تو عائلی زندگی جن الجھنوں کا شکار ہو سکتی ہے اور ہوتی ہے اس کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں۔

تربیتِ اولاد اور والدین کی ذمہ داریاں

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا قُوۡۤا اَنۡفُسَكُمۡ وَاَهۡلِیۡكُمۡ نَارًا وَّقُوۡدُهَا النَّاسُ وَالۡحِجَارَةُ عَلَیۡهَا مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا یَعۡصُوۡنَ اللّٰهَ مَاۤ اَمَرَهُمۡ وَیَفۡعَلُوۡنَ مَا یُؤۡمَرُوۡنَ ۝ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ كَفَرُوۡا لَا تَعۡتَذِرُوا الۡیَوۡمَ ؕ اِنَّمَا تُجۡزَوۡنَ مَا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ۝﴾

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو اُس آگ سے جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے' جس پر نہایت تندخو اور سخت گیر فرشتے مقرر ہوں گے جو کبھی اللہ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے اور جو حکم بھی انہیں دیا جاتا ہے اسے بجالاتے ہیں۔ (اُس وقت کہا جائے گا کہ) اے کافرو! آج معذرتیں پیش نہ کرو' تمہیں تو ویسا ہی بدلہ دیا جا رہا ہے جو عمل تم کیا کرتے تھے''۔

سورۃ التحریم کی چھٹی آیت میں ایک مسلمان خاندان کے سربراہ کی ذمہ داری مثبت انداز میں امر کے صیغے میں بیان کی جا رہی ہے۔ مطالعہ قرآن حکیم کے منتخب نصاب میں یہ مضمون دو مواقع پر پہلے بھی بیان ہو چکا ہے۔ سورۃ التغابن میں اہل ایمان کو خبردار کیا گیا: ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنَّ مِنۡ اَزۡوَاجِكُمۡ وَاَوۡلَادِكُمۡ عَدُوًّا لَّكُمۡ فَاحۡذَرُوۡهُمۡ ۚ﴾ ''اے اہل ایمان! تمہاری بیویوں اور تمہاری اولادوں میں سے بعض تمہارے دشمن ہیں' پس ان سے ہوشیار رہو'' ـــــ اگرچہ ہماری اجتماعی زندگی کا جو نقشہ ہے اس کی بنیاد میں مال و اولاد کی طبعی محبت ہی کارفرما ہے۔ یہ محبت اپنی جگہ صحیح اور درست ہے' لیکن بسا اوقات یہ طبعی و فطری محبت حدّ اعتدال سے تجاوز کر کے اس درجہ بڑھ جاتی ہے کہ انسان اپنے اہل و عیال کی محبت کی وجہ سے اللہ کے حلال کو حرام اور حرام کو حلال کر بیٹھتا ہے۔ بیویوں کی فرمائشیں پوری کرنے' اولاد کو اچھے سے اچھا کھلانے پلانے اور ان کو اعلیٰ تعلیم دلانے کے لیے انسان حرام میں مُنہ مارنے لگتا ہے۔ گویا یہ محبت نتیجہ کے اعتبار سے اس کے لیے محبت نہیں بلکہ عداوت بن جاتی ہے اور اس کی عاقبت کی تباہی و بربادی کا سبب بن جاتی ہے ـــــ اس آیت میں اسی حقیقت کی نشاندہی کی گئی ہے۔

سورۃ الفرقان کے آخری رکوع میں اسی فطری محبت کا ذکر ایک مثبت انداز سے ہوا ہے۔ ایک بندۂ مؤمن کے دل میں یہ فطری تمنا ہوتی ہے کہ اس کے اہل وعیال بھی ایمان' اسلام' تقویٰ اور احسان کی روش اختیار کریں۔ یہ تمنا اور آرزو اس قرآنی دعا کی صورت میں ہمارے سامنے آتی ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا ﴿۷۴﴾﴾ (الفرقان)

''جو دعائیں مانگا کرتے ہیں کہ اے ہمارے ربّ! ہمیں اپنی بیویوں اور اپنی اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک دے اور ہم کو پرہیز گاروں کا امام بنا''۔

یہی مضمون سورۃ التحریم کی زیرِ نظر آیت میں اپنی منطقی انتہا کو پہنچ رہا ہے۔ یعنی ایک مسلمان کی ذمہ داری صرف اتنی نہیں ہے کہ وہ اپنے اہل وعیال کے نان نفقہ کا اہتمام کرے' انہیں کھلائے پلائے' ان کے رہن سہن کی ضرورتیں پوری کرے۔ یہ تو جبلی طور پر ہر انسان کرتا ہے۔ ایک خاندان کے سربراہ کے مؤمن ومسلم ہونے کا نتیجہ یہ نکلنا چاہیے کہ اللہ نے اپنی مخلوق میں سے جن کو بطورِ امانت اس کے حوالے کیا ہے وہ ان کے صحیح حقوق کی ادائیگی کی فکر کرے —— اس امانت کا حق اس طرح ادا ہوگا کہ ان کی بہتر سے بہتر دینی تربیت کی کوشش کرے تاکہ وہ صحیح رُخ پر پروان چڑھیں۔ لیکن اگر اسے اس ذمہ داری کا احساس نہیں ہے تو معلوم ہوا کہ ایک مسلمان خاندان کا سربراہ اپنی ذمہ داری کو بحیثیت ایک مسلمان ادا نہیں کر رہا۔

اس طرف متوجہ کرنے کے لیے قرآن مجید کا انداز بڑا فطری ہے۔ تنبیہہ کا آغاز ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْۤا اَنْفُسَكُمْ﴾ ''اے اہل ایمان! بچاؤ اپنے آپ کو'' کے الفاظ سے کیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں قیامت کا نقشہ یوں کھینچا گیا ہے کہ اُس روز ہر ایک کو اپنی فکر پڑی ہوگی۔ اُس وقت ہر شخص بھول جائے گا کہ کون میرا بیٹا ہے' کون میری بیوی ہے اور کون میرا باپ ہے! سورۂ عبس میں آتا ہے: ﴿فَاِذَا جَآءَتِ الصَّآخَّةُ ﴿۳۳﴾ يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ ﴿۳۴﴾ وَاُمِّهٖ وَاَبِيْهِ ﴿۳۵﴾ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيْهِ ﴿۳۶﴾﴾ ''آخر کار جب وہ کان بہرے کر دینے والی آواز ہوگی —— اُس روز آدمی اپنے بھائی اور اپنی ماں اور اپنے باپ اور اپنی بیوی اور اپنی اولاد سے بھاگے گا''۔ اور سورۃ المعارج میں فرمایا گیا کہ:

﴿وَلَا يَسْئَلُ حَمِيْمٌ حَمِيْمًا ﴿۱۰﴾ يُّبَصَّرُوْنَهُمْ ۭ يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِيْ مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍۭ بِبَنِيْهِ ﴿۱۱﴾ وَصَاحِبَتِهٖ وَاَخِيْهِ ﴿۱۲﴾ وَفَصِيْلَتِهِ الَّتِيْ تُـــْٔوِيْهِ ﴿۱۳﴾ وَمَنْ فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا ثُمَّ

يُنۡجِيۡهِ ﴿۱۴﴾

''اور کوئی جگری دوست اپنے جگری دوست کو نہ پوچھے گا' حالانکہ وہ ایک دوسرے کو دکھائے جائیں گے۔ مجرم چاہے گا کہ اُس دن کے عذاب سے بچنے کے لیے اپنی اولاد کو' اپنی بیوی کو' اپنے بھائی کو اور اپنے قریب ترین خاندان کو جو اُسے پناہ دینے والا تھا اور روئے زمین کے سب لوگوں کو فدیہ میں دے دے اور یہ تدبیر اُسے نجات دلا دے۔''

اسی لیے یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ ''بچاؤ اپنے آپ کو''۔ اور اس کے بعد اپنے قریب ترین افراد یعنی اہل خانہ' جن سے انسان کو بہت محبت ہوتی ہے' کو اس آگ سے بچانے کی ہدایت کی جا رہی ہے جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے۔

اس سورۂ مبارکہ کے خاص اسلوب سے اس آیت کا جو ربط و تعلق ہے اسے اس مقام پر نوٹ کر لیجیے۔ ہر سورۂ مبارکہ کا ایک عمود یعنی ایک مرکزی مضمون ہوتا ہے جس کے ساتھ سورت کی ہر آیت منسلک اور مربوط ہوتی ہے۔ یہاں بھی دیکھئے کہ اولاد کی تربیت میں بسا اوقات لاڈ پیار حائل ہو جاتا ہے جو اولاد کے بگاڑ کا سبب بن جاتا ہے —— آپ بچے کی صبح کی میٹھی نیند میں خلل ڈالنا نہیں چاہتے' اس لیے اسے فجر کی نماز وقت پر ادا کرنے کا عادی نہیں بنا رہے۔ آپ کا دل چاہتا ہے کہ وہ سوتا رہے۔ اب اگر آپ کی اس بے جا شفقت و محبت کے نتیجے میں وہ بچہ بعد میں نماز کا پابند نہ ہو سکا تو آپ خود سوچئے کہ آپ نے اس کے حق میں کتنے کانٹے بو دیے ہیں۔ اس کی تربیت اس طرح کس تباہی کے رُخ پر ہو رہی ہے اور اس کی زندگی عاقبت کے اعتبار سے کس خسارے کی راہ پر گامزن ہو رہی ہے۔ اسی طرح اگر اپنی بیویوں کے ساتھ لاڈ پیار اس حد کو پہنچ گیا ہے کہ اللہ کے احکام میں خلل پیدا ہو رہا ہے' حدود اللہ ٹوٹ رہی ہیں' اللہ کا تقویٰ نگاہوں سے اوجھل ہو رہا ہے اور اس سے دل غافل ہو رہے ہیں تو اچھی طرح جان لیجیے کہ آپ کی طرف سے آپ کی یہ محبت نہ آپ کے حق میں نافع ہے اور نہ ان کے حق میں' بلکہ یہ دونوں کے لیے عداوت ہے۔

اس حقیقت کو واضح کرنے کے لیے نبی اکرم ﷺ نے ایک نہایت جامع قاعدہ کلیہ ارشاد فرمایا ہے: ((كُلُّكُمْ رَاعٍ وَّكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَّعِيَّتِهٖ)) (۱) ''تم میں سے ہر شخص کی حیثیت ایک چرواہے کی ہے اور تم میں سے ہر ایک اپنے ریوڑ کے بارے میں جواب دہ ہے''۔ جس طرح ایک

(۱) صحیح البخاری' کتاب النکاح' باب المرأة راعية فی بیت زوجها **ومتعدد دیگر مقامات**۔ وصحیح مسلم' کتاب الامارة' باب فضيلة الامام العادل......

چرواہا اور گلہ بان ان مویشیوں کی حفاظت کا ذمہ دار اور مسئول ہوتا ہے جو اس کے چارج میں دیے گئے ہیں اور اس میں سے اگر کوئی جانور گم ہو جائے یا حادثہ کا شکار ہو جائے تو اُس چرواہے کا محاسبہ ہوتا ہے کہ اس جانور کی گمشدگی میں اس کی غفلت کا کتنا دخل ہے‘ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں ہر انسان کے حوالے اپنی مخلوق میں سے کچھ افراد کر دیے ہیں۔ اگر کوئی کسی دفتر میں افسر ہے تو جو اُس کے ماتحت ہیں‘ وہ گویا ایک گلہ ہے جس کا وہ نگہبان ہے۔ اس کو اپنی حیثیت کے تناسب سے اپنے ماتحتوں کے دین و ایمان اور ان کی سیرت و کردار کے بارے میں فکرمند رہنا چاہیے کہ یہ چیزیں صحیح رُخ پر رہیں‘ کیونکہ وہ ذمہ دار اور مسئول ہے—— اور خاندان کے سربراہ پر تو یہ اصول صد فیصد راست آتا ہے کہ وہ اپنے بیوی بچوں کے لیے ذمہ دار اور مسئول ہے۔

صحیح روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ اپنے گھرانے کے قریب ترین افراد کو لے کر بیٹھتے تھے اور خصوصاً خواتین کا نام لے کر انہیں نصیحت فرماتے تھے۔ مثلاً اپنی لختِ جگر‘ نورِ نظر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے خطاب کر کے ارشاد فرمایا:

> ’’اے فاطمہ! محمد (ﷺ) کی لختِ جگر! اپنے آپ کو آگ سے بچانے کی فکر کرو‘ اس لیے کہ اللہ کے ہاں تمہارے باب میں مجھے کوئی اختیار حاصل نہیں ہے‘‘۔

حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا:

> ’’اے صفیہ! اللہ کے رسول کی پھوپھی! اپنے آپ کو آگ سے بچانے کی فکر کرو‘ اس لیے کہ اللہ کے ہاں تمہارے بارے میں مجھے کوئی اختیار حاصل نہیں ہے‘‘۔

تو یہ ہے اللہ کے رسول ﷺ کا متوجہ کرنے‘ خبردار کرنے اور ترغیب و ترہیب کا انداز۔ ہر مسلمان گھرانے کے سربراہ کا یہ وہ مثبت رول ہے جسے اپنے اہل و عیال کے ضمن میں ادا کرنے کے لیے اسے فکرمند رہنا چاہیے۔

اب دیکھئے کہ یہ بڑا لطیف اور بلیغ انداز اختیار فرمایا گیا ہے کہ اپنے آپ کو اور اپنے اہل خانہ کو اس آگ سے بچانے کی فکر کرو جس کی شدت کا یہ عالم ہے کہ اس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے۔ پتھروں کا ذکر قرآن مجید میں کئی مقامات پر آیا ہے۔ انسان جب جہنم میں جھونکے جائیں گے تو گویا وہ اس کا ایندھن ہوں گے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ پتھروں کے ذکر میں کیا حکمت ہے! غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا ذکر اس اعتبار سے بھی ہو سکتا ہے کہ اس آگ کی شدت و حرارت کو ظاہر کرنا مقصود ہے کہ ایک آگ تو وہ ہے جو لکڑیوں سے جلائی جاتی ہے اور ایک آگ وہ ہے جو پتھروں سے

جلے گی۔ پتھر کے کوئلوں سے کسی زمانہ میں جو آگ جلا کرتی تھی اس کی حرارت کا ذرا تصور کیجیے اور اس سے بھی آگے بڑھ کر سوچئے کہ اصل پتھر جس آگ کا ایندھن بن رہے ہوں' اس کی تُندی وتیزی اور شدت کا کیا عالم ہوگا!——اس کا ایک مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ چونکہ بُت عموماً پتھروں سے تراشے جاتے ہیں اور انہیں معبود سمجھا جاتا ہے' ان پر چڑھاوے چڑھائے جاتے ہیں' ان کے آگے ماتھا ٹیکا جاتا ہے' ان سے حاجت روائی کے لیے دعائیں کی جاتی ہیں' اس لیے مشرکوں کے ساتھ پتھروں کے یہ بُت بھی جہنم میں جھونک دیے جائیں گے تاکہ ان کی حسرت میں مزید اضافہ ہو کہ جنہیں ہم معبود سمجھے بیٹھے تھے وہ بھی ہمارے ساتھ اس آگ میں جل رہے ہیں۔

آگے فرمایا: ''اس جہنم پر وہ فرشتے مامور ہیں جو بڑے سخت دل اور تندخو ہیں''۔ غور کیجیے! بہت ہی لطیف انذار ہے کہ آج تم بڑی محبت' شفقت اور لاڈ پیار کی وجہ سے اپنی اولاد کو بگاڑ رہے ہو' لیکن نتیجہ کے طور پر وہ اُن تُندخو اور سخت گیر فرشتوں کے حوالے ہوں گے جو جہنم کے کارندے اور داروغے ہیں اور ان کے دلوں میں کوئی نرمی اور محبت نہیں ہے۔ تمہاری یہ چہیتی اولاد کتنی ہی فریاد کرے اُن فرشتوں کے دل پسیجیں گے نہیں۔ ان کے دل میں رحم اور رأفت کا جذبہ رکھا ہی نہیں گیا۔ وہ بڑے سخت دل اور تُندخو ہیں اور اُن کا حال یہ ہے کہ ''وہ اللہ کی طرف سے ملنے والے کسی حکم کی نافرمانی نہیں کرتے' اور وہی کچھ کرتے ہیں جس کا انہیں حکم ملتا ہے''۔

ان آیات سے فرشتوں پر ایمان کے بارے میں بھی رہنمائی ملتی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ فرشتوں پر ایمان ہمارے ایمانیات کا لازمی حصہ ہے۔ دنیا میں دیویوں اور دیوتاؤں کے تصورات درحقیقت ''فرشتوں پر ایمان'' ہی کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ اس تصور میں بنیادی غلطی یہ ہوئی کہ فرشتوں کو بااختیار سمجھ لیا گیا۔ قرآن مجید واضح کرتا ہے کہ اگرچہ ملائکہ ایک نوری مخلوق ہیں اور ان کا رتبہ بہت بلند ہے لیکن وہ بااختیار مخلوق نہیں۔ اسی بات کو یہاں ان الفاظ مبارکہ سے واضح کیا گیا کہ: ﴿لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۝﴾ جب یہ حقیقت سامنے آگئی تو اب ان کو پکارنا بے کار' ان سے دعا کرنا لاحاصل اور ان کو پوجنا بے فائدہ——لہٰذا اللہ کو پکارو' اللہ سے دعا کرو' اللہ سے مدد مانگو۔ اللہ تعالیٰ جس ذریعے سے چاہے آپ کی ضرورت پوری کردے۔ وہ کسی انسان کے دل میں ڈال دے' کسی فرشتہ کو مامور کردے' یہ اس کا اختیارِ مطلق ہے۔ فرشتے اس اعتبار سے ایک مجبور اور ناچار مخلوق ہیں کہ وہ اپنے ارادہ واختیار سے کچھ کر ہی نہیں سکتے۔ اس کی بڑی خوبصورت وضاحت

سورۂ مریم میں آئی ہے۔ متعلقہ آیت کے بین السطور سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے حضرت جبریل علیہ السلام سے شکوہ کیا کہ اے جبریل! آپ وقفہ وقفہ سے آتے ہیں، ہمیں انتظار رہتا ہے۔ اس شکوہ کا حضرت جبریلؑ سے اللہ تعالیٰ نے جواب دلوایا کہ ﴿وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمۡرِ رَبِّكَ ۚ لَـهٗ مَا بَيۡنَ اَيۡدِيۡنَا وَمَا خَلۡفَنَا وَمَا بَيۡنَ ذٰلِكَ ۚ وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا ﴿٦٤﴾﴾ ''اور (اے نبیؐ!) ہم آپ کے ربّ کے حکم کے بغیر نہیں اترا کرتے۔ جو کچھ ہمارے آگے ہے اور جو کچھ پیچھے ہے اور جو کچھ اس کے درمیان ہے ہر چیز کا مالک وہی ہے، اور آپ کا ربّ بھولنے والا نہیں ہے''۔ یعنی نزولِ وحی میں وقفہ کسی بھول کے باعث نہیں ہوتا بلکہ اللہ کی حکمتِ بالغہ کی وجہ سے ہوتا ہے۔

اگلی آیت میں نقشہ کھینچا گیا کہ جب لاڈ پیار سے بگڑے تمہارے یہ لاڈلے اور پیارے جہنم میں جھونکے جائیں گے تو اُس وقت وہ معذرتیں کریں گے، دہائیاں دیں گے اور چیخ و پکار کریں گے تو ان کو جواب دیا جائے گا: ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا لَا تَعۡتَذِرُوا الۡيَوۡمَ ؕ﴾ ''اے ناشکرو! آج بہانے مت بناؤ (معذرتیں نہ تراشو)''۔ اب اس کا کچھ حاصل نہیں۔ ﴿اِنَّمَا تُجۡزَوۡنَ مَا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ﴿٧﴾﴾ ''تمہیں بدلے میں وہی کچھ دیا جا رہا ہے جو تم کرتے تھے''۔ یہ تمہارے اپنے اعمال ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ دنیا میں ان میں لذت اور سرور تھا۔ وہاں تمہاری بداعمالیاں ''sugar coated pills'' کی حیثیت رکھتی تھیں، جس کے باعث ان کی تلخی تم پر نمایاں نہیں ہوتی تھی اور جس انجام سے تمہیں دوچار ہونا تھا وہ تم پر واضح نہیں ہوتا تھا۔ تم نے اپنے افعال پر اپنی خواہشاتِ نفس کی coating کر رکھی تھی، اب وہ اتر گئی ہے، لہٰذا اس کی حقیقی و واقعی تلخی کا مزا ہے جو تم یہاں چکھ رہے ہو۔ یہ تمہارے وہی اعمال ہیں جو آج تمہارے سامنے آ گئے ہیں۔ یہ تمہارے اپنے ہاتھوں کی کمائی اور تمہارے اپنے کرتوت ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس انجامِ بد سے ہم سب کو بچائے۔ آمین!

تَوۡبَةً نَّصُوۡحًا کا ہمارے دین میں مقام

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا تُوۡبُوۡۤا اِلَى اللّٰهِ تَوۡبَةً نَّصُوۡحًا ؕ عَسٰى رَبُّكُمۡ اَنۡ يُّكَفِّرَ عَنۡكُمۡ سَيِّاٰتِكُمۡ وَيُدۡخِلَكُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ ۙ يَوۡمَ لَا يُخۡزِى اللّٰهُ النَّبِىَّ وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَهٗ ۚ نُوۡرُهُمۡ يَسۡعٰى بَيۡنَ اَيۡدِيۡهِمۡ وَبِاَيۡمَانِهِمۡ يَقُوۡلُوۡنَ رَبَّنَاۤ اَتۡمِمۡ لَنَا نُوۡرَنَا وَاغۡفِرۡ لَنَا ۚ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ﴿٨﴾ يٰۤاَيُّهَا النَّبِىُّ جَاهِدِ الۡكُفَّارَ

وَالۡمُنٰفِقِیۡنَ وَاغۡلُظۡ عَلَیۡہِمۡ ؕ وَمَاۡوٰىہُمۡ جَہَنَّمُ ؕ وَبِئۡسَ الۡمَصِیۡرُ ﴿۹﴾

''اے ایمان والو! توبہ کرو اللہ کی جناب میں خالص توبہ۔ اُمید ہے کہ تمہارا پروردگار تم سے تمہاری برائیوں کو دور فرما دے گا اور تمہیں ان باغات میں داخل کرے گا جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہوں گی۔ اُس دن اللہ ہرگز رُسوا نہ کرے گا' نہ اپنے نبی کو اور نہ ان کے ساتھی اہل ایمان کو۔ ان کا نور دوڑتا ہوا ہوگا ان کے سامنے بھی اور ان کے داہنی جانب بھی ـــــ اور وہ یہ کہہ رہے ہوں گے کہ اے ہمارے پروردگار! ہمارے لیے ہمارے اس نور کو پورا فرما دے اور ہماری خطاؤں سے درگزر فرما' یقیناً تجھے ہر شے پر قدرت اور ہر کام پر اختیار حاصل ہے۔ اے نبی (ﷺ)! کفار اور منافقین سے جہاد کیجئے اور ان پر سختی کیجئے' اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بہت ہی برا ٹھکانا ہے''۔

ان میں سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ تمام اہل ایمان کو توبہ کا حکم دے رہے ہیں' یا یوں کہہ لیجیے کہ توبہ کی ترغیب دے رہے ہیں' لیکن توبہ وہ ہو جو خالص توبہ ہو' جو خلوصِ دل سے کی گئی ہو' جو صحیح معنی میں توبہ ہو۔ ہمارے اس سلسلۂ دروس میں سورۃ الفرقان کے آخری رکوع کے ضمن میں توبہ کے موضوع پر بڑی مفصل گفتگو ہو چکی ہے اور توبہ کا فلسفہ' توبہ کی عظمت' ہمارے دین کی حکمت میں اس کا مقام اور توبہ کے صحیح ہونے کے لیے شرائط جیسے تمام امور زیر بحث آ چکے ہیں۔

موقع کی مناسبت سے میں یہاں ایک حدیث کا اضافہ کرنا چاہتا ہوں۔ یہ حدیث حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ اس کی ایک تو متفق علیہ روایت ہے' یعنی صحیح بخاری اور صحیح مسلم دونوں میں موجود ہے جبکہ ایک ذرا تفصیلی روایت صرف مسلم شریف میں ہے۔ اس میں نبی اکرم ﷺ نے اس بات کو واضح فرمانے کے لیے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے کسی بندے کی توبہ سے کتنی خوشی ہوتی ہے' ایک تشبیہہ بیان کی ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ ایک ایسے شخص کا تصور کرو جو کسی لق و دق صحرا میں تنہا سفر کر رہا ہے' اس کے پاس ایک اونٹنی ہے' اسی پر اس کا زادِ راہ یعنی راشن اور پانی وغیرہ ہے۔ وہ تھوڑی دیر ستانے کے لیے کسی درخت کے سایہ تلے بیٹھتا ہے' اونٹنی بھی پاس ہی کھڑی ہے۔ وہاں پر اس کی آنکھ لگ جاتی ہے۔ اسی اثناء میں اس کی اونٹنی غائب ہو جاتی ہے۔ جب اس کی آنکھ کھلتی ہے تو وہ دیوانہ وار اونٹنی کی تلاش میں کبھی اِدھر دوڑتا ہے' کبھی اُدھر بھاگتا ہے۔ اس کے اضطراب اور بیتابی کا آپ خود تصور کر سکتے ہیں' اس لیے کہ وہ اونٹنی ہی درحقیقت اس کے لیے وسیلۂ حیات اور ذریعۂ زندگی ہے۔ وہی اس کی سواری ہے' اسی پر اس کا کھانا اور پانی ہے۔ وہ ہر چہار طرف بھاگ دوڑ کرنے کے بعد مایوس ہو کر بیٹھ

جاتا ہے۔ وہ موت کے انتظار میں آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ اچانک وہ آنکھیں کھولتا ہے تو کیا دیکھتا ہے کہ اونٹنی اس کے پاس کھڑی ہے۔ اس پر وہ اپنی خوشی کی شدت کے باعث ایسا بوکھلا اٹھتا ہے کہ کہنا تو یہ چاہتا ہے کہ ''اے اللہ! تو میرا ربّ ہے' میں تیرا بندہ ہوں'' لیکن فرطِ جذبات سے اس کی زبان لڑکھڑاتی ہے اور اس سے الفاظ نکلتے ہیں ''اے پروردگار! میں تیرا ربّ ہوں' تو میرا بندہ ہے''۔ تصور کیجیے کہ اونٹنی دوبارہ پالینے پر اس شخص کی فرطِ مسرت کا کیا عالم ہے! نبی اکرمﷺ یہ تشبیہہ بیان کر کے ارشاد فرماتے ہیں کہ: ''اللہ کو اس سے بھی زیادہ خوشی اپنے کسی گنہگار بندے کی توبہ سے ہوتی ہے''۔

احادیث میں توبہ کی جو عظمت بیان ہوئی ہے اور جس قدر شدّومدّ کے ساتھ اس کی ترغیب دی گئی ہے اسے سامنے رکھئے اور پھر اس آیت کا مطالعہ کیجئے کہ تمام مسلمانوں سے' خواہ وہ کسی زمان و مکان سے تعلق رکھتے ہوں' خطاب فرمایا جارہا ہے: ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْۤا اِلَی اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا﴾ ''اے ایمان والو! توبہ کرو اللہ کی جناب میں خالص توبہ''۔

توبہ کے ضمن میں دو مزید احادیث بھی پیش نظر رہنی چاہئیں' جن میں نبی اکرمﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ میں خود روزانہ ستر ستر اور سو سو بار اللہ کی جناب میں توبہ اور استغفار کرتا ہوں۔ ایک روایت صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' اس کے الفاظ ہیں: ((وَاللّٰهِ اِنِّیْ لَاَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ وَاَتُوْبُ اِلَیْهِ فِی الْیَوْمِ اَکْثَرَ مِنْ سَبْعِیْنَ مَرَّةً)) (۱) ''اللہ کی قسم! میں روزانہ ستر مرتبہ سے زیادہ اللہ کی جناب میں استغفار بھی کرتا ہوں' توبہ بھی کرتا ہوں''۔ دوسری روایت صحیح مسلم میں ہے جس کی رو سے نبی اکرمﷺ فرماتے ہیں: ((یَا اَیُّهَا النَّاسُ' تُوْبُوْا اِلَی اللّٰهِ' فَاِنِّیْ اَتُوْبُ فِی الْیَوْمِ اِلَیْهِ مِائَةَ مَرَّةٍ)) (۲) ''اے لوگو! اللہ تعالیٰ کی جناب میں توبہ کرو' اس لیے کہ میں خود اُس کے حضور روزانہ سو مرتبہ توبہ کرتا ہوں''—— سوال پیدا ہوتا ہے کہ نبی اکرمﷺ کی توبہ کے کیا معنی ہیں؟ حضورﷺ سے کسی گناہ کے ارتکاب کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ انبیاء علیہم السلام معصوم ہوتے ہیں۔ لہٰذا اچھی طرح جان لیجیے کہ نبی اکرمﷺ کی توبہ اور آپؐ کے استغفار کا معنی و مفہوم کیا ہے! دراصل توبہ کے معنی ہیں رجوع کرنا' پلٹنا' لوٹنا۔ اس کے کم از کم چار درجے اگر ذہن میں رکھے جائیں تو بات واضح ہو جائے گی۔ ایک شخص وہ ہے جو کفر سے توبہ کرتا ہے اور اسلام میں آتا ہے۔ ایمان لانا بھی ایک نوع

(۱) صحیح البخاری' کتاب الدعوات' باب استغفار النبیﷺ فی الیوم واللیلۃ۔

(۲) صحیح مسلم' کتاب الذکر والدعاء والتوبۃ والاستغفار' باب استحباب الاستغفار والاستکثار منہ۔

کی توبہ ہے۔ جیسے ہم سورۃ الفرقان کے آخری رکوع میں پڑھ آئے ہیں: ﴿اِلَّا مَنۡ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا﴾ دوسری توبہ کسی مسلمان شخص کی ہے جو معصیت سے توبہ کرتا ہے' گناہ کو چھوڑ رہا ہے' گناہ سے رجوع کر رہا ہے اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری اور اطاعت کی طرف۔ تیسری توبہ ہوگی اَبرار یعنی نیکوکاروں کی۔ کسی وقت ایک صالح اور نیک شخص کی قلبی کیفیت ایسی ہو سکتی ہے کہ معرفت الٰہی کے معاملے میں اس کے دل پر کچھ دیر کے لیے غفلت کا پردہ سا پڑ جائے۔ وہ محض غفلت ہے' اس سے کسی معصیت کا ارتکاب نہیں ہوا۔ اسے محض یہ احساس ہوا کہ میرے قلب پر کچھ دیر کے لیے غفلت کا حجاب طاری رہا ہے۔ اب وہ غفلت سے استحضار اللہ فی القلب کی جانب رجوع کر رہا ہے' دل میں اللہ کی یاد کو مستحضر کرنے کے لیے اللہ کے ذکر کی طرف متوجہ ہو رہا ہے' یہ بھی توبہ ہے —— پھر ایک توبہ مقربین بارگاہِ الٰہی کی ہے۔ یعنی اُن کے قلب کا جو مضبوط تعلق اور رابطہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ استوار رہتا ہے' اس کی شدت میں اگر کبھی کوئی کمی محسوس ہوتی ہے تو اس حساسیت کے باعث وہ اس سے بھی توبہ کرتے ہیں اور اپنے تعلق مع اللہ کی اسی سابقہ شدت کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ یہ ہے وہ کیفیت جس کو مقربین یعنی انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی توبہ میں شمار کیا جا سکتا ہے کہ جب ان نفوسِ قدسیہ کو یہ محسوس ہو کہ کسی مصروفیت کے باعث ان کے تعلق مع اللہ کی شدت میں ذرا سی بھی کمی ہوگئی ہے تو وہ اس سے بھی توبہ کرتے اور رجوع فرماتے ہیں۔

اس تناظر میں آپ سمجھئے کہ کوئی صاحب ایمان ایسا نہیں ہے جو اس حکم یا اس ترغیب کا مخاطب نہ ہو کہ ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا تُوۡبُوۡۤا اِلَى اللّٰهِ تَوۡبَةً نَّصُوۡحًا ؕ﴾ ''اے ایمان والو! اللہ کی جناب میں توبہ کرو خالص توبہ!'' خالص توبہ کون سی ہوگی؟ اس کے متعلق عرض کیا جا چکا ہے کہ کم از کم تین شرطیں پوری ہوں تو وہ خالص توبہ ہوگی۔ اگر حقوق اللہ کے ضمن میں کوتاہی ہوئی ہے تو (۱) شدید پشیمانی ہو (۲) مصمم ارادہ ہو کہ میں آئندہ اس کا ارتکاب نہیں کروں گا' اور (۳) انسان اس گناہ کے کام کو فی الواقع چھوڑ دے۔ اور اگر حقوق العباد کا معاملہ ہے تو مزید ایک شرط یہ ہوگی کہ یا تو اس شخص سے جس کی حق تلفی کی ہے' معافی حاصل کرے یا اپنے کسی عمل سے اس کے نقصان کی تلافی کرے۔

اس خالص توبہ کا مقام اور مرتبہ کیا ہے! اسے اسی آیت میں آگے بیان فرمایا: ﴿عَسٰی رَبُّکُمۡ اَنۡ یُّکَفِّرَ عَنۡکُمۡ سَیِّاٰتِکُمۡ﴾ عربی زبان میں ''عَسٰی'' اور ''لَعَلَّ'' کے الفاظ عام طور پر تو ''شاید'' کے معنی میں آتے ہیں' لیکن قرآن مجید میں جب یہ الفاظ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہو کر وارد ہوتے

ہیں تو شاہانہ اندازِ کلام کی رو سے اس کے معنی ہوتے ہیں ''تاکہ'' اور ''اُمید ہے کہ'' یعنی اس میں بشارت کا پہلو ہوتا ہے۔ لہٰذا ترجمہ یہ ہوگا کہ ''اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ تم سے تمہاری برائیوں کو دُور فرما دے گا'' ﴿وَيُدْخِلَكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ﴾ ''اور تمہیں اُن باغات میں داخل فرمائے گا جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہوں گی''۔

آ گے فرمایا کہ اُس دن یعنی قیامت کے روز سب کے لیے رسوائی ہوگی' صرف انبیاء کرام علیہم السلام' ان کے پیروکار اور سب سے بڑھ کر النبی الخاتم جناب حضرت محمد ﷺ اور ان کے ساتھی اہل ایمان اس رسوائی سے بچے ہوئے ہوں گے: ﴿يَوْمَ لَا يُخْزِي اللّٰهُ النَّبِيَّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۚ﴾ آ گے فرمایا: ﴿نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ﴾ ''ان کا نور ان کے سامنے اور ان کی داہنی طرف دوڑتا ہوگا''—— یہ بات جان لیجیے کہ انسان کے ایمان کا محل و مقام اس کا قلب ہے۔ ایمان حقیقت میں ایک روشنی ہے' ایک نور ہے۔ یہ بات ہم سورۃ النور کی آیتِ نور کے حوالے سے پہلے اچھی طرح سمجھ بھی چکے ہیں۔ اس قلب میں جو نورِ ایمان ہے' وہ میدانِ حشر میں ظاہر ہو جائے گا اور اس کی روشنی انسان کے سامنے پڑے گی—— اسی طرح انسان کے نیک اعمال میں بھی ایک نورانیت ہے۔ البتہ اس دنیا میں اس کا ظہور نہیں ہوتا' میدانِ حشر میں اس کا ظہور ہوگا۔ نیک کاموں کا کمانے والا عام طور پر انسان کا داہنا ہاتھ ہوتا ہے' لہٰذا میدانِ حشر میں انسان کے نیک اعمال کا نور اس کے داہنی جانب نمایاں ہوگا۔ ﴿نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ﴾ ''دوڑتا ہوگا ان کا نور ان کے آگے اور ان کی داہنی طرف''۔ ﴿يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا ۚ﴾ ''اور وہ کہہ رہے ہوں گے کہ اے ہمارے ربّ! (اگر ہمارے نور میں کچھ کمی رہ گئی ہے تو) ہمارے لیے ہمارے نور کو پورا کر دے اور ہم کو معاف کر دے''۔

نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ میدانِ حشر میں یہ نور ہر شخص کو اُس کے مقام و مرتبہ کے اعتبار سے ملے گا۔ ایمان کے بھی مدارج و مراتب ہیں۔ ایک ایمان حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ہے اور ایک ہما شما کا ایمان ہے۔ ان کے مابین ظاہر ہے زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اگر ہمیں ایمان کی ذرا سی رمق بھی میسر ہو تو وہ بھی ہمارے لیے بہت بڑی کامیابی ہے۔ کہاں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا نورِ ایمان اور کہاں ہمارا ایمان——! حضور ﷺ نے فرمایا کہ اُس روز میدانِ حشر میں لوگوں کو جو نور ملے گا تو کسی کا نور اتنا ہوگا کہ جیسے وہ مدینہ میں ہو اور اس کی روشنی صنعاء (یمن کے دارالحکومت)

تک پہنچ جائے اور کسی کا نور بس اس قدر ہو گا کہ اس کے قدموں کے سامنے روشنی ہو جائے۔ جن کو اُس روز اتنا نور مل جائے وہ بھی بڑے نصیب والے اور کامیاب و کامران لوگ شمار ہوں گے‘ کیونکہ وہ اس کٹھن اور سخت مرحلہ سے گزر جائیں گے جس سے آگے ان کی منزلِ مراد یعنی جنت ہے۔ کم نور والوں کے نور کی حیثیت گویا اس ٹارچ کی روشنی کی سی ہوگی جس کو لے کر انسان کسی پگڈنڈی پر چل تو لیتا ہے۔ پس اس کٹھن مرحلہ کے لیے فرمایا کہ وہ لوگ دعا کر رہے ہوں گے کہ اے ہمارے ربّ! ہمارے نور میں ہماری کوتاہیوں کے باعث کمی رہ گئی ہے‘ پس تو ہمارے اس نور کا اتمام فرما دے اور ہماری کوتاہیوں سے درگزر فرما‘ ہمیں بخش دے۔ یہ ہمارے گناہ ہیں جن کی وجہ سے ہماری نورانیت میں کمی رہ گئی ہے‘ تُو اپنے خاص خزانۂ فضل سے اپنے خصوصی اختیار سے اس کمی اور تقصیر کی تلافی فرما دے‘ اس لیے کہ ﴿اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ۝۸﴾ ’’یقیناً تجھے ہر شے کا اختیار حاصل ہے‘‘۔

اس کے بعد اگلی آیت میں نبی اکرم ﷺ سے خطاب ہے اور بظاہر یہ آیت اس سورت کے مضامین سے غیر متعلق سی معلوم ہوتی ہے۔ ابھی تک ساری باتیں آنحضور ﷺ کے گھر والوں سے متعلق‘ اہل ایمان سے متعلق اور مسلمانوں کے عائلی نظام سے متعلق تھیں‘ لیکن یہاں یہ بات فرمائی گئی کہ: ﴿یٰۤاَیُّہَا النَّبِیُّ جَاہِدِ الۡکُفَّارَ وَ الۡمُنٰفِقِیۡنَ وَ اغۡلُظۡ عَلَیۡہِمۡ ؕ﴾ ’’اے نبی (ﷺ)! آپؐ کفار اور منافقین سے جہاد کیجیے اور اُن پر سختی کیجیے‘‘۔ وہ آپؐ کی نرمی‘ آپؐ کی مروّت‘ آپؐ کی شفقت اور آپؐ کی رحمتِ عمومی سے فائدہ اٹھانے نہ پائیں۔ وہ تو غلظت اور سختی کے مستوجب ہو چکے ہیں۔ ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بہت ہی برا ٹھکانا ہے۔

یہ آیت بعینہٖ انہی الفاظ کے ساتھ سورۃ التوبہ (آیت ۷۳) میں بھی وارد ہوئی ہے۔ سورۃ التحریم کے مضامین سے اس آیت کا بڑا لطیف ربط ہے۔ دراصل اس سورۂ مبارکہ کا مرکزی مضمون (Axis) یہ ہے کہ نرمی‘ شفقت‘ دلجوئی‘ کسی کے جذبات کا لحاظ اور پاس کرنا یہ فی نفسہٖ تو بہت اچھی باتیں ہیں‘ بہت مطلوب اور پسندیدہ ہیں‘ لیکن اگر اِن میں حدِّ اعتدال سے تجاوز ہو جائے تو یہ چیز مختلف پہلوؤں سے خرابیاں پیدا ہونے کا سبب بن سکتی ہے۔ اولاد کے ساتھ بے جا لاڈ پیار اور بے جا نرمی کا معاملہ ہو تو اس کے بے راہ اور آوارہ ہو جانے کا خطرہ ہے۔ وہاں بھی نرمی مطلوب تو ہے لیکن ایک حد تک۔ اسی طرح جب انسان اپنے نفس کے معاملہ میں نرمی کرتا ہے تو خرابی کا اندیشہ لاحق ہو جاتا ہے۔ یہ بات ذہن میں رکھئے کہ چونکہ ہمارا دین‘ دینِ فطرت ہے‘ لہٰذا اس میں ہمارے اوپر اپنے

نفس کے حقوق بھی معین کیے گئے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ((وَاِنَّ لِنَفْسِكَ [عَلَيْكَ] حَقًّا))[1] ''اور بے شک تمہارے نفس کا بھی تم پر حق ہے''۔ اس پر بے جا سختی پسندیدہ نہیں ہے۔ ہمارے دین میں رہبانیت جائز نہیں ہے۔ ارشادِ نبویؐ ہے: ((لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْاِسْلَامِ))[2] ہمارے دین میں نفس کشی کی اجازت نہیں ہے' بلکہ ضبطِ نفس کی ہدایت ہے کہ اپنے نفس کو کنٹرول میں رکھو۔ لیکن نفس کو بالکل کچل ڈالنا پسندیدہ نہیں ہے۔ اس کے تقاضوں کو صحت منداور جائز وحلال ذرائع سے پورا کرنے کی اجازت ہے۔ اس نفس کے جو تقاضے ہیں وہ تمدن کے مختلف پہلوؤں کے اعتبار سے ضروری ہیں' لہٰذا اس پر بھی نرمی کرو۔ لیکن اگر یہ نرمی حدِّ اعتدال سے تجاوز کر جائے گی تو معصیت کی طرف لے جائے گی' لہٰذا اس کی باگیں تھام کر اور کھینچ کر رکھو — اسی طرح کا معاملہ کفار اور منافقین کا ہے۔ ان کے بارے میں کوئی نرمی تمہارے دل میں نہ ہو۔ اہل ایمان کی جو شان قرآن مجید میں ایک سے زائد مقام پر آئی ہے وہ ﴿اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ﴾ کی شان ہے۔ یعنی وہ کفار کے حق میں نہایت سخت ہوتے ہیں اور آپس میں ایک دوسرے کے لیے نہایت رحیم وشفیق ہوتے ہیں۔ کفار کے لیے سختی کی ضرورت اس لیے ہے کہ وہ کہیں مسلمانوں کے جسد ملی میں انگلی نہ دھنسا سکیں' وہ مسلمانوں کو نرم چارا نہ سمجھ بیٹھیں۔ اس تناظر میں نبی اکرم ﷺ کا معاملہ دیکھئے کہ آپؐ سراپا رحمت وشفقت ہیں۔ آپ ﷺ کی یہ شان خود اللہ تعالیٰ بیان فرماتا ہے کہ آپؐ رؤف ورحیم ہیں' آپؐ رحمۃ للعالمین ہیں۔ آپؐ میں نرمی' رقتِ قلب اور خلقِ خدا کے حق میں رأفت ورحمت کا معاملہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ لہٰذا بسا اوقات اس سے کفار ومشرکین اور منافقین ناجائز فائدہ اٹھا جاتے تھے۔ چنانچہ آپ ﷺ سے فرمایا گیا:

﴿يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ؕ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿٩﴾﴾

معلوم ہوا کہ اس سورۂ مبارکہ کا جو مرکزی خیال ہے اس کے ساتھ یہ آیت بھی مربوط ہے' اگرچہ بظاہر یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس سورت کے سیاق وسباق سے اس کا کوئی خاص تعلق نہیں ہے۔

---

(١) صحيح البخاری' كتاب الجمعة' باب ما يكره من ترك قيام الليل لمن كان يقومه۔ وسنن الترمذی' كتاب الزهد عن رسول الله ﷺ' باب منه۔

(٢) فتح البارى لابن حجر ١٣/٩۔

عورت کا رُوحانی واَخلاقی تشخص

﴿ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّامْرَاَتَ لُوْطٍ ؕ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ
عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ فَخَانَتٰهُمَا فَلَمْ يُغْنِيَا عَنْهُمَا مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا وَّقِيْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ
الدّٰخِلِيْنَ ⑩ وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا امْرَاَتَ فِرْعَوْنَ ۷ اِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِيْ
عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ وَنَجِّنِيْ مِنْ فِرْعَوْنَ وَعَمَلِهٖ وَنَجِّنِيْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ⑪ وَمَرْيَمَ
ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا وَصَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا
وَكُتُبِهٖ وَكَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِيْنَ⑫﴾

''اللہ تعالیٰ نے مثال بیان فرمائی ہے کافروں کے لیے نوح اور لوط (علیہما السلام) کی بیویوں کی۔ وہ دونوں ہمارے دو نہایت نیک بندوں کے عقد میں تھیں، تو انہوں نے ان سے خیانت کی روش اختیار کی، تو وہ دونوں ان (اپنی بیویوں) کو اللہ کے عذاب سے نہ بچا سکے، اور یہ کہہ دیا گیا (ان بیویوں سے) کہ تم دونوں داخل ہو جاؤ آگ میں دوسرے داخل ہونے والوں کے ساتھ۔ اور اللہ تعالیٰ نے مثال بیان فرمائی ہے اہل ایمان کے لیے فرعون کی بیوی کی۔ جبکہ اس نے کہا اے میرے ربّ! میرے لیے اپنے پاس ایک گھر جنت میں بنا اور مجھے فرعون اور اس کے عمل سے نجات دے اور مجھے نجات بخش ظالموں کی قوم سے۔ اور عمران کی بیٹی مریم کی مثال بیان فرمائی ہے جس نے اپنی عصمت کی پوری حفاظت کی تو ہم نے اس میں اپنی روح میں سے پھونکا اور اس نے تصدیق کی اپنے ربّ کی تمام باتوں کی اور اس کی کتابوں کی اور وہ ہمارے بہت ہی فرمانبردار بندوں میں سے تھی''۔

یہ بات عرض کی جا چکی ہے کہ سورۃ التحریم میں مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کی پہلی منزل یعنی مرد اور عورت کے مابین رشتۂ ازدواج کہ جس سے خاندان کے ادارہ کی بنیاد پڑتی ہے، کے ضمن میں نہایت اہم اور بنیادی ہدایات ہمارے سامنے آتی ہیں۔ عائلی زندگی کے بارے میں ایک نہایت اہم مسئلہ یہ ہے کہ عورت کا مقام کیا ہے! آپ کو معلوم ہے کہ اس ضمن میں اس دنیا میں بہت افراط و تفریط رہی ہے۔ عورت کو یا تو بالکل بھیڑ بکری کی طرح ایک ملکیت قرار دیا گیا، ہمارے ہاں بول چال کے عام محاورے میں اسے جوتی کی نوک سے تعبیر کیا گیا، یا پھر اسے بازار میں لا بٹھایا گیا اور کبھی اسے قلوپطرہ کا روپ دھار کر قوموں کی قسمتوں سے کھیلنے کے لیے آزاد چھوڑ دیا گیا۔ یہ افراط و

تفریط ہے جس میں نوع انسانی بالعموم مبتلا رہی ہے۔ اسلام نے عورت کو ایک مکمل قانونی اور اخلاقی تشخص عطا کیا' پھر اس کے دائرۂ عمل اور میدانِ کار کا تعین کیا۔ اسلام کی رو سے عورت کا ایک علیحدہ قانونی وجود ہے۔ چنانچہ اس کے قانونی حقوق ہیں۔ عورت کی اپنی ذاتی ملکیت ہو سکتی ہے اور وہ اپنی اس ملکیت میں تصرف کا کامل اختیار رکھتی ہے۔ لہٰذا عام انسانی حقوق کے اعتبار سے مرد اور عورت کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔

اس ضمن میں نہایت قابل غور پہلو یہ ہے کہ اسلام نے عورت کو قانونی تشخص دینے کے ساتھ ساتھ اخلاقی تشخص بھی عطا کیا ہے۔ عورت اگر کوئی نیک کام کرتی ہے تو اس کا اجر وثواب اُس کے لیے ہے۔ وہ اس معاملے میں مَردوں کے تابع نہیں ہے۔ چنانچہ شوہر اپنی بیوی کے نان ونفقہ کا کفیل اور ذمہ دار تو ہے' لیکن اس کے دین واخلاق کا کفیل اور ذمہ دار نہیں ہے۔ اگر عورت میں نیکی اور بھلائی ہو گی تو وہ اس کے لیے ہے' عورت کوئی خیر کمائے گی تو اُس کا صلہ اور اجر وثواب اسی کو ملے گا۔ اسی طرح اگر مَرد کوئی نیکی کماتا ہے تو اُس کا اجر وثواب اسی کے لیے ہے۔ اس ضمن میں قرآن مجید نے یہ اصل الاصول بیان کیا ہے کہ ﴿لَیۡسَ لِلۡاِنۡسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی ﴿۳۹﴾﴾ (النجم) ''کسی انسان کے لیے نہیں ہے مگر وہی کچھ جس کے لیے اس نے محنت کی ہے''۔ جس کے لیے اس نے مشقت اور بھاگ دوڑ کی ہے۔

پھر یہ کہ انسان ہونے کے ناطے سے مَرد اور عورت میں کوئی فرق نہیں ہے۔ چنانچہ سورۂ آل عمران کی آیت ۱۹۵ میں فرمایا گیا: ﴿اَنِّیۡ لَاۤ اُضِیۡعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنۡکُمۡ مِّنۡ ذَکَرٍ اَوۡ اُنۡثٰی ۚ بَعۡضُکُمۡ مِّنۡۢ بَعۡضٍ ۚ﴾ ''میں تم میں سے کسی بھی عمل کرنے والے کے کسی بھی عمل کو ضائع کرنے والا نہیں ہوں' خواہ وہ (عمل کرنے والا) مَرد ہو یا عورت ہو' تم ایک دوسرے ہی سے ہو''۔ یعنی مرد و عورت کا فرق وتفاوت خواہ جسمانی ہو' خواہ نفسیاتی ساخت کے اعتبار سے ہو' یہ فرق تو ہم نے تمدنی ضروریات کے تحت رکھا ہے' باقی انسان ہونے کے اعتبار سے تم ایک دوسرے ہی سے ہو۔

یہی اصول قرآن مجید میں سورۃ النساء کی آیت ۳۲ میں نہایت واضح شکل میں سامنے آتا ہے:
﴿لِلرِّجَالِ نَصِیۡبٌ مِّمَّا اکۡتَسَبُوۡا ؕ وَ لِلنِّسَآءِ نَصِیۡبٌ مِّمَّا اکۡتَسَبۡنَ ؕ﴾ ''مَردوں کے لیے حصہ ہے اس میں سے جو کمائی انہوں نے کی اور عورتوں کے لیے حصہ ہے اس میں سے جو کمائی انہوں نے کی''۔ یعنی جو بھلائیاں' نیکیاں' خیرات اور حسنات مَردوں نے اپنی محنت اور مشقت سے کمائی ہیں' ان کا اجر وثواب ان کے لیے ہے اور جو بھلائیاں اور نیکیاں عورتوں نے کمائی ہیں' ان کا اجر وثواب ان

کے لیے ہے۔ اسی طرح جو برائی اور بدی مَرد کمائے گا اس کا وبال اس پر ہوگا اور جو بدی اور برائی عورت کمائے گی اس کی پاداش اس کو بھگتنی ہوگی۔

اس اصول کو سورۃ التحریم کی آخری تین آیات میں تین مثالوں سے واضح کیا گیا ہے کہ خواتین کہیں اس مغالطہ میں نہ رہیں کہ اُن کے شوہر اُن کے دین و اخلاق کے بھی کفیل ہیں اور وہ دین و اخلاق کے معاملہ میں مَردوں کے تابع ہیں۔ چنانچہ پہلی مثال دو ایسی عورتوں کی پیش کی گئی جن کے شوہر اللہ تعالیٰ کے جلیل القدر رسول تھے‘ ایک حضرت نوح اور دوسرے حضرت لوط علیہما السلام۔ ان دونوں کی بیویوں کا ذکر کیا گیا کہ دین کے اعتبار سے ان کا معاملہ درست نہ تھا۔ انہوں نے اپنے شوہروں کے ساتھ بے وفائی کی تھی۔ لیکن اس سے یہ ہرگز نہ سمجھ لیا جائے کہ اُن سے لازمی طور پر کوئی اخلاقی لغزش سرزد ہوئی ہو۔ اپنے شوہروں کے رازوں کا افشا بھی ایک خیانت اور بے وفائی کا عمل ہے۔ اس لیے کہ سورۃ النساء کی آیت ۳۴ میں جہاں یہ اصل الاصول بیان کیا گیا کہ ﴿اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ﴾ یعنی مرد عورتوں پر نگران اور حاکم ہیں‘ وہاں ایک مثالی (ideal) بیوی کے یہ اوصاف بھی بیان فرمائے گئے ہیں کہ ﴿فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَیْبِ﴾ ’’پس نیک بیویاں وہ ہیں جو فرمانبرداری کی روش اختیار کریں (اپنے شوہروں کا کہنا مانیں اور ان کے) رازوں کی پوری حفاظت کریں‘‘۔ ظاہر بات ہے کہ بیوی سے زیادہ مرد کا راز دار اور کون ہوگا! مَرد میں اگر کوئی خامی ہے‘ اگر کسی پہلو سے اس میں کوئی پوشیدہ جسمانی عیب ہے تو اسے اس کی بیوی سے بڑھ کر جاننے والا اور کوئی نہیں۔ گویا مَرد کی پوری شخصیت عورت کے پاس بطور امانت ہے۔ راز کو بھی امانت کہا گیا ہے۔ لہٰذا اگر شوہر نے کوئی راز کی بات بیوی کو بتائی ہو اور بیوی اس راز کو افشا کر دے تو یہ بھی خیانت ہے۔ چنانچہ ’’فَخَانَتٰھُمَا‘‘ کے لفظ سے یہ لازمی نتیجہ نکالنا درست نہیں ہے کہ ان دونوں جلیل القدر رسولوں کی بیویاں بدچلن اور بدکار تھیں (معاذ اللہ)۔ قرآن مجید کے اصول کو اگر پیشِ نظر رکھیں تو یہ بات صحیح معلوم نہیں ہوتی کہ کسی رسول کے حبالۂ عقد میں کوئی بدچلن اور بدکار عورت ہو۔ لہٰذا ان خواتین کا یہ طرزِ عمل کہ وہ در پردہ اپنی کافر قوموں کے ساتھ تھیں اور ان کی ہمدردیاں کفار کے ساتھ تھیں‘ اسے یہاں خیانت سے تعبیر کیا گیا ہے۔

لیکن یہاں جو اصل بات واضح کرنا مقصود ہے وہ یہ ہے کہ اگرچہ یہ دونوں عورتیں ہمارے رسولوں کے حبالۂ عقد میں تھیں لیکن چونکہ ان دونوں کے اپنے اعمال درست نہ تھے لہٰذا ان کا انجام

کافروں کے ساتھ ہوگا اور رسول کی زوجیت میں ہونا انہیں کوئی فائدہ نہ پہنچا سکے گا۔ چنانچہ فرمایا گیا:
﴿وَقِيۡلَ ادۡخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِيۡنَ ۝۱۰﴾ ''اور ان سے کہہ دیا گیا دوزخ میں داخل ہو جاؤ دوسرے داخل ہونے والوں کے ساتھ''۔ یہاں 'قِيۡلَ' فعل ماضی مجہول ہے۔ قرآن مجید میں جہاں بھی قیامت کے حالات کا ذکر ہوتا ہے وہاں عام طور پر فعل ماضی استعمال ہوتا ہے۔ اس لیے کہ فعل ماضی میں قطعیت وحتمیت ہوتی ہے کہ کوئی کام ہو چکا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جتنی یقینی بات وہ ہوتی ہے جو وقوع پذیر ہو چکی ہو اتنی ہی یقینی بات قیامت و آخرت کی ہے۔ لہٰذا آخرت کے احوال بیان کرتے ہوئے قرآن مجید عام طور پر ماضی کا صیغہ استعمال کرتا ہے۔ یہاں جو اسلوب اختیار کیا گیا ہے' ہوسکتا ہے کہ اس میں عالمِ برزخ میں یہ بات کہی جانے کی طرف اشارہ ہو' واللہ اعلم بالصواب' لیکن یہاں جس حقیقت کی طرف نشاندہی مقصود ہے وہ نبی اکرم ﷺ کی اس حدیث کے حوالے سے بھی ہمارے سامنے آ چکی ہے کہ آپ ﷺ نے اپنی لختِ جگر' نورِ نظر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے ارشاد فرمایا تھا کہ اے فاطمہ! محمد (ﷺ) کی بیٹی! اپنے آپ کو دوزخ سے بچاؤ' اس لیے کہ مجھے تمہارے بارے میں اللہ کے یہاں کوئی اختیار حاصل نہیں ہوگا —— یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ حضرت نوح اور حضرت لوط (علیہما السلام) جیسے جلیل القدر پیغمبر آخرت میں اپنی بیویوں کے کام نہ آ سکیں گے۔ یہ مثال بیان ہوئی ان دو عورتوں کی جو دو بہترین شوہروں کے حبالۂ عقد میں تھیں' لیکن چونکہ وہ خود اہل ایمان میں سے نہ تھیں لہٰذا اُن کے شوہروں کی نیکی اور بزرگی انہیں کوئی فائدہ نہ دے سکے گی۔

اب اس کے برعکس ایک مثال ایک بدترین شخص کے نکاح میں ایک نہایت نیک اور صالحہ خاتون کی آ رہی ہے۔ فرعون جیسے سرکش و متمرد' اللہ کے باغی اور خدائی کے مدعی شخص کے عقد میں حضرت آسیہ رضی اللہ عنہا تھیں۔ اغلباً یہ وہی خاتون ہیں جنہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دریا میں بہتے ہوئے صندوق سے نکالا تھا اور فرعون کو آمادہ کر لیا تھا کہ ان کی پرورش وہ خود کریں گی۔ وہ یقیناً بنی اسرائیل کی کوئی مؤمنہ وصالحہ خاتون تھیں جو فرعون کی بیوی تھیں۔ قرآن مجید کے الفاظ یہ بتا رہے ہیں کہ ان کی نیکی کا یہ عالم تھا کہ فرعون کا محل اور وہاں کی آسائشیں اور سہولتیں نیز وہاں کا آرام گویا ان کو کاٹ کھانے کو دوڑ رہا تھا۔ شوہر کی ضلالت' اس کی گمراہی و بے راہ روی اور اس کی بداعمالیوں کی وجہ سے وہ عیش و آرام جو شاہی محل کا جزو لاینفک ہوتا ہے' ان پر دوبھر تھا۔ چنانچہ ان کی دعا قرآن نے بایں الفاظ نقل کی ہے:
﴿رَبِّ ابۡنِ لِىۡ عِنۡدَكَ بَيۡتًا فِى الۡجَـنَّةِ وَنَجِّنِىۡ مِنۡ فِرۡعَوۡنَ وَعَمَلِهٖ وَنَجِّنِىۡ مِنَ الۡقَوۡمِ الظّٰلِمِيۡنَ

﴿۱۱﴾ یعنی پروردگار! مجھے جلد سے جلد فرعون سے‘ اس کے عمل سے اور ظالم و مشرک قوم سے نجات دے کر اپنے پاس بلا اور اپنے جوارِ رحمت یعنی جنت میں میرے لیے گھر بنا۔ اس دوسری مثال سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کسی عورت کا شوہر خواہ کتنا ہی بدکردار یا کافر و مشرک ہو‘ اگر وہ عورت خود مؤمنہ اور صالحہ ہے تو اس کا اجر اللہ کے ہاں محفوظ ہے۔ شوہر کی برائی اسے کچھ نقصان نہ پہنچائے گی۔

اب اس ضمن میں تیسری مثال ایک ایسی خاتون کی آ رہی ہے کہ جنہیں ماحول بھی بہترین ملا اور پھر جن کے اپنے اندر بھی نیکی‘ بھلائی اور حسنات کے بہترین رجحانات اور میلانات بتمام وکمال موجود تھے۔ گویا وہ نُورٌ عَلٰی نورٍ کی مثال ہیں — پہلی مثال بہترین شوہروں کے گھروں میں بدترین بیویوں کی تھی۔ دوسری مثال اس کے برعکس ایک بدترین شوہر کے عقد میں ایک بہترین خاتون کی تھی اور اب تیسری مثال حضرت مریم سلامٌ علیہا کی آ رہی ہے‘ جو خود بھی نیک‘ صالحہ اور عبادت گزار تھیں‘ پھر اُن کی والدہ بھی اس قدر نیک تھیں کہ انہوں نے ان کی پیدائش سے پہلے ہی اپنی ہونے والی اولاد کو اللہ کی نذر کر دیا تھا‘ جس کا ذکر سورۂ آل عمران کی آیت ۳۵ میں بایں الفاظ آیا ہے: ﴿رَبِّ اِنِّیْ نَذَرْتُ لَکَ مَا فِیْ بَطْنِیْ مُحَرَّرًا﴾ ”اے میرے ربّ! میں نے تیرے لیے نذر کیا جو کچھ میرے پیٹ میں ہے‘ دنیا کے تمام بکھیڑوں سے اسے چھٹکارا دلاتے ہوئے“۔ یعنی میں اس کو صرف تیرے دین کی خدمت کے لیے وقف کرنے کا عہد کرتی ہوں۔ تو یہ خاتون ہیں جن کی آغوش میں حضرت مریم نے پرورش پائی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت زکریا علیہ السلام کو اُن کا مربی اور کفیل بنایا جو اللہ کے جلیل القدر نبی اور ہیکل سلیمانی (بیت المقدس) کے مجاور اور نگران بھی تھے اور رشتے میں حضرت مریم کے خالو تھے۔ تو گویا یہ نُورٌ علٰی نورٍ کا معاملہ ہے۔ ایک طرف حضرت مریم سلامٌ علیہا کی سیرت اور ان کا کردار ہے جس کی اللہ تعالیٰ مدح فرما رہے ہیں کہ انہوں نے اپنی عصمت وعفت کی کامل طور پر حفاظت کی۔ پھر امر واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو بہت بڑی آزمائش سے دوچار فرمایا۔ ایک نوجوان خاتون جو نا کتخدا ہو‘ جس کی شادی نہ ہوئی ہو اور وہ حاملہ ہو جائے‘ آپ خود سوچئے کہ معاشرہ میں کیسی رسوائی کا سامان ہے جو اُن کے لیے فراہم ہو گیا! اللہ تعالیٰ نے انہیں کس شدید آزمائش میں مبتلا کیا! لیکن اس اللہ کی بندی نے اپنے ربّ کے ہر حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کیا ﴿وَصَدَّقَتْ بِکَلِمٰتِ رَبِّہَا وَکُتُبِہٖ﴾ یہ ان کی زندگی کا نقشہ ہے کہ انہوں نے اللہ کے تمام احکام کی تعمیل کی۔ پھر انہوں نے تمام آسمانی کتابوں کی بھی تصدیق کی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علومِ دینیہ سے انہیں خصوصی

دلچسپی تھی۔ آیت کے آخر میں اُن کی مدح ان الفاظ مبارکہ سے فرمائی گئی: ﴿وَكَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِيْنَ ⑫﴾ ''اور وہ اللہ کے فرماں برداروں میں سے (ایک بندی) تھی''۔

غور کیجئے کہ یہاں تین مثالوں کے ذریعے تین ممکنہ صورتوں کو بیان کر دیا گیا' لیکن ایک امکان ابھی باقی ہے۔ گویا اس عمارت کا ایک کونہ ابھی خالی ہے۔ بہترین شوہروں کے ہاں بدترین عورتوں کی مثال حضرت نوح اور حضرت لوط علیہا السلام کی بیویاں ہیں' بدترین شوہر کے ہاں بہترین خاتون کی مثال حضرت آسیہ ہیں' جبکہ بہترین ماحول میں بہترین خاتون کی مثال حضرت مریم ہیں۔ اب ایک مثال رہ جاتی ہے کہ شوہر بھی بدترین ہو اور بیوی بھی۔ گویا ﴿ظُلُمٰتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ﴾ کا نقشہ ہو' جسے ہم اپنے محاورہ میں کہتے ہیں کہ کریلا اور پھر نیم چڑھا۔ اس کی مثال ہمیں قرآن مجید میں ایک دوسرے مقام پر ملتی ہے اور وہ ہے سورۃ اللّھب۔ اس سورۂ مبارکہ میں ابولہب اور اس کی بیوی دونوں کا ذکر ہے:

﴿تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ ① مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ ② سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ ③ وَّامْرَاَتُهٗ ؕ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ④ فِيْ جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ ⑤﴾

اس سورۂ مبارکہ میں نبی اکرم ﷺ کے چچا ابولہب اور آپ ﷺ کی چچی (ابولہب کی بیوی) اُمِ جمیل کی آنحضور ﷺ سے عداوت کا بیان ہے اور یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ ان دونوں میں سے کس کو نبی اکرم ﷺ سے زیادہ عداوت' بغض اور دشمنی تھی' کیونکہ دونوں ہی ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر آنحضور ﷺ کی دشمنی' عداوت اور ایذا رسانی میں پیش پیش تھے۔ تو سورۃ اللّھب میں بدترین شوہر اور بدترین بیوی کی مثال موجود ہے۔ اس طرح یہ کونہ اور گوشہ بھی پُر ہو جاتا ہے کہ شوہر بھی بدترین ہو اور بیوی بھی بدترین ہو تو اس کی صورت کیا ہوگی۔ چنانچہ ان کے بارے میں اسی دنیا میں جہنم کا فیصلہ سنا دیا گیا۔

اب ان چاروں مثالوں کو سامنے رکھ کر جو نتیجہ نکلا وہ یہ ہے کہ عورت کا اپنا ایک ذاتی تشخص ہے۔ اس معاملہ میں عورت لازماً اپنے شوہر کے تابع نہیں ہے۔ وہ دینی و اخلاقی طور پر ایک آزادانہ تشخص کی مالک ہے۔ اس کے اندر اگر بھلائی' نیکی اور خیر ہے تو وہ اسی کے لیے ہے' لیکن برائی' بدی اور سرکشی ہے تو اس کا وبال بھی اسی پر آئے گا۔ چونکہ اسلام کے عائلی نظام میں مالی اعتبار سے شوہر بیوی کا کفیل ہوتا ہے لہٰذا ہمارے ہاں بعض خواتین کو غیر شعوری طور پر یہ مغالطہ لاحق ہو گیا ہے کہ شاید نیک کام کرنا' بھلائیاں کمانا اور دین کی خدمت کرنا' یہ صرف مَردوں کے کرنے کا کام ہے' اور مَرد اگر یہ کام کر لیں تو

عورتوں کے لیے کفایت کرے گا۔ اس مغالطہ کی ان آیاتِ مبارکہ کی روشنی میں مکمل اصلاح ہونی چاہیے۔ اس کے لیے میں پھر وہی الفاظ دہرا رہا ہوں جو سورۃ النساء کی آیت ۳۲ میں آئے کہ: ﴿لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ؕ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ؕ﴾ ''جو کچھ مردوں نے کمایا ہے اس کے مطابق ان کا حصہ ہے اور جو کچھ عورتوں نے کمایا ہے اس کے مطابق ان کا حصہ ہے!''

وآخر دعوانا ان الحمد للّٰه ربّ العالمین

❁❁❁

درس 13

اسلام کا معاشرتی اور سماجی نظام

سُورَۃُ الإِسْرَاءِ کی آیات ۲۳ تا ۴۰ کی روشنی میں

درس ۱۳

اسلام کا معاشرتی اور سماجی نظام

سورۂ بنی اسرائیل کی آیات ۲۳ تا ۴۰ کی روشنی میں

اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

﴿وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ؕ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ
اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ﴿۲۳﴾ وَاخْفِضْ لَهُمَا
جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ﴿۲۴﴾ رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِيْ
نُفُوْسِكُمْ ؕ اِنْ تَكُوْنُوْا صٰلِحِيْنَ فَاِنَّهٗ كَانَ لِلْاَوَّابِيْنَ غَفُوْرًا ﴿۲۵﴾ وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ
وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ﴿۲۶﴾ اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ ؕ
وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا ﴿۲۷﴾ وَاِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ ابْتِغَآءَ رَحْمَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ تَرْجُوْهَا
فَقُلْ لَّهُمْ قَوْلًا مَّيْسُوْرًا ﴿۲۸﴾ وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ
الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا ﴿۲۹﴾ اِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ
بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًاۢ بَصِيْرًا ﴿۳۰﴾ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ؕ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ؕ اِنَّ
قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا ﴿۳۱﴾ وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا ﴿۳۲﴾ وَلَا
تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا فَلَا
يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا ﴿۳۳﴾ وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ
حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۪ وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْـُٔوْلًا ﴿۳۴﴾ وَاَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ
وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ؕ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ﴿۳۵﴾ وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ
عِلْمٌ ؕ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔوْلًا ﴿۳۶﴾ وَلَا تَمْشِ فِي
الْاَرْضِ مَرَحًا ۚ اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا ﴿۳۷﴾ كُلُّ ذٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهٗ
عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوْهًا ﴿۳۸﴾ ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ؕ وَلَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ
اِلٰهًا اٰخَرَ فَتُلْقٰى فِيْ جَهَنَّمَ مَلُوْمًا مَّدْحُوْرًا ﴿۳۹﴾ اَفَاَصْفٰىكُمْ رَبُّكُمْ بِالْبَنِيْنَ وَاتَّخَذَ مِنَ

الْمَلٰٓئِکَۃِ اِنَاثًا ؕ اِنَّکُمْ لَتَقُوْلُوْنَ قَوْلًا عَظِیْمًا ﴿۴۰﴾

مطالعۂ قرآنِ حکیم کے جس منتخب نصاب کا درس ان مجالس میں ہو رہا ہے اس کا تیرہواں سبق سورۂ بنی اسرائیل کی آیات ۲۳ تا ۴۰ پر مشتمل ہے۔ یہ آیاتِ مبارکہ اس سورۃ کے تیسرے اور چوتھے رکوع پر مشتمل ہیں۔ اس سبق کا عنوان یا موضوع ہے ''اسلام کا معاشرتی اور سماجی نظام''۔

سابقہ مباحث سے ربط و تعلق

اس درس پر گفتگو کے آغاز سے قبل اگر ہم ان مضامین کا مختصر طور پر اعادہ کر لیں جو اس سے پہلے دروس میں بیان ہو چکے ہیں تو مباحث کی کڑیاں جوڑنے میں آسانی ہو گی۔ مطالعۂ قرآن حکیم کے اس منتخب نصاب کا پہلا حصہ چار جامع اسباق پر مشتمل تھا' جن میں اُخروی نجات کے چار ناگزیر لوازم یعنی ایمان' عمل صالح' تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کا بیان تھا۔ دوسرے حصے میں پانچ سبق تھے جن کا مرکزی موضوع ''ایمان'' تھا۔ تیسرے حصے میں ''عملِ صالح'' کی تشریح و توضیح چل رہی ہے۔ یعنی اس حصہ میں قرآنی تعلیمات کے عملی پہلو کا بیان ہو رہا ہے۔ اس ضمن میں سب سے پہلے ہم نے یہ دیکھنے کی کوشش کی کہ انفرادی طور پر ایک بندۂ مؤمن کی سیرت و کردار میں اللہ تعالیٰ کو کون سے اوصاف محبوب ہیں۔ اس کے لیے ہم نے سورۃ المؤمنون کی ابتدائی آیات اور سورۃ المعارج کی ہم مضمون آیات کے حوالے سے یہ سمجھا کہ انفرادی سیرت کی تعمیر کے ضمن میں قرآن مجید کیا اصول بیان کرتا ہے اور اس کی کیا اساسات معین کرتا ہے۔ پھر سورۃ الفرقان کے آخری رکوع میں ہم نے پوری طرح تعمیر شدہ شخصیت یعنی علامہ اقبال کے ''مردِ مؤمن'' اور قرآن مجید کی اصطلاح میں ''عبادالرحمٰن'' کی سیرت و کردار کے خدوخال کا مطالعہ کیا۔ اس کے بعد انفرادیت سے اجتماعیت کی طرف پہلے قدم یعنی خاندانی زندگی اور عائلی زندگی کے ضمن میں ہم نے پوری سورۃ التحریم کا مطالعہ کیا۔

اب ہم ایک قدم اور آگے بڑھا رہے ہیں۔ خاندانوں سے معاشرہ وجود میں آتا ہے جسے ہم سماج سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔ اب ہمیں دیکھنا ہے کہ اس معاشرے کے ضمن میں قرآن مجید ہماری کیا رہنمائی کرتا ہے! بالفاظِ دیگر یوں سمجھئے کہ قرآن مجید کی رُو سے وہ سماجی و معاشرتی اقدار (social values) کون سی ہیں جنہیں اسلام پسند کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ ان کی ترویج و تنفیذ ہو' انہیں معاشرے میں رائج کیا جائے۔ اور اس کے برعکس وہ سماجی برائیاں (social evils) کون سی ہیں جنہیں اسلام ناپسند کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ ان کو معاشرے سے بیخ و بُن سے اکھاڑ پھینکا جائے' ان کا

استیصال ہو' ان کو معاشرے میں پنپنے نہ دیا جائے۔ یہ مضامین ہیں جو اِن اٹھارہ آیات میں ہمارے سامنے آ رہے ہیں۔

تورات کے ''احکامِ عشرہ'' کا خلاصہ

یہ بات بھی پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ سورۂ بنی اسرائیل قرآن مجید کے قریباً وسط میں وارد ہوئی ہے۔ پندرہویں پارے کا آغاز اسی سورۂ مبارکہ سے ہوتا ہے۔ اس سورۂ مبارکہ کی ابتدا اور اختتام پر بنی اسرائیل کی تاریخ کے اہم واقعات کا خلاصہ ہے اور درمیان میں یعنی تیسرے اور چوتھے رکوع میں تورات کی تعلیمات کا خلاصہ بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ حبر الاُمت حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ان آیات میں تورات کے احکامِ عشرہ (Ten Commandments) کا خلاصہ اور نچوڑ بیان کر دیا گیا ہے۔

اسلامی حکومت کے لیے رسول اللہ ﷺ کا منشور

زمانۂ نزول کے اعتبار سے سورۂ بنی اسرائیل مکی دَور کے آخری زمانے میں نازل ہونے والی سورتوں میں سے ہے۔ چنانچہ اس کی پہلی آیت میں واقعۂ معراج کا ذکر ہے: ﴿سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ لَیۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اِلَی الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا الَّذِیۡ بٰرَکۡنَا حَوۡلَہٗ﴾ یعنی ''پاک ہے وہ جو لے گیا اپنے بندے کو راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک' جس کے ماحول کو ہم نے برکت دی ہے''۔ درمیان میں بھی ایک مقام پر معراج کے واقعہ کا تذکرہ ہے۔ معراج ۱۳ نبویؐ میں ہوا۔ لہٰذا یہی اس سورۂ مبارکہ کا زمانۂ نزول ہے' گویا کہ ہجرت سے متصلاً قبل۔

مکہ میں مسلمان کمزور تھے' وہاں کفر کا پوری طرح غلبہ تھا' لیکن ہجرت کے فوراً بعد اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے مدینہ منورہ میں ایک آزاد اسلامی معاشرہ وجود میں آنے والا تھا' یا یوں کہیے کہ ایک اسلامی حکومت قائم ہونے والی تھی' جہاں مسلمان اپنی آزادی اور اختیار سے جن چیزوں کو چاہیں رائج کریں' ان کی تنفیذ کریں' انہیں promote کریں اور جن جن چیزوں کو چاہیں ان کو روکیں' ان کو مٹائیں اور ان کا استیصال کریں۔ اس اعتبار سے جدید اصطلاح میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان آیاتِ مبارکہ میں جناب محمدؐ رسول اللہ ﷺ کا منشور (manifesto) بیان ہو رہا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ رسول اللہ ﷺ کو غلبہ عطا فرمائے تو اسلامی ریاست میں آپؐ کی ترجیحات کیا ہوں گی۔ جیسا کہ سورۃ الحج میں وارد ہوا: ﴿اَلَّذِیۡنَ اِنۡ مَّکَّنّٰہُمۡ فِی الۡاَرۡضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَ اَمَرُوۡا بِالۡمَعۡرُوۡفِ

وَ نَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ﴾ (آیت ۴۱) ''وہ لوگ جنہیں اگر ہم زمین میں تمکن (غلبہ) عطا فرمائیں تو وہ نماز قائم کریں گے' زکوٰۃ ادا کریں گے (یعنی نظامِ صلوٰۃ اور زکوٰۃ قائم کریں گے)' نیکیوں کا حکم دیں گے اور بدیوں سے روکیں گے''۔ گویا یہ اسی آیت کی شرح ہے جو سورۂ بنی اسرائیل کی زیر مطالعہ آیات میں ہمارے سامنے آ رہی ہے کہ وہ اوامر کون سے ہیں جن کی وہاں ترویج و تنفیذ ہوگی اور وہ نواہی کون سے ہیں جن کا اس معاشرے میں استیصال کیا جائے گا۔ اس اعتبار سے اس سبق کی بڑی اہمیت ہے کہ ہم اس کے متعلق کہہ سکتے ہیں کہ یہ اسلامی حکومت کے قیام کے لیے نبی اکرم ﷺ کا منشور ہے۔

آیاتِ مبارکہ کا مطالعہ

اب ہم ان آیاتِ مبارکہ کے متن کے ساتھ ساتھ ان کا ترجمہ کرتے ہیں' تاکہ پہلے بیک نظر ہمارے سامنے وہ مضامین آ جائیں جو اِن آیاتِ مبارکہ میں آ رہے ہیں۔ پھر ان میں سے ایک ایک پر کسی قدر تفصیل کے ساتھ گفتگو ہوگی۔

﴿وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ؕ﴾

''اور تیرے ربّ نے فیصلہ کر دیا ہے کہ مت بندگی کرو کسی کی سوائے اس کے' اور والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو۔''

﴿اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ﴿۲۳﴾﴾

''اگر پہنچ جائیں تمہارے پاس بڑھاپے کی عمر کو ان میں سے کوئی ایک یا دونوں' تو انہیں اُف تک نہ کہو اور نہ انہیں جھڑکو اور ان سے نرمی اور ادب کے ساتھ بات کرو۔''

﴿وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ﴿۲۴﴾﴾

''اور ان کے سامنے (اپنے) شانے نیازمندی اور ادب کے ساتھ جھکا کر رکھو اور کہو (یہ دعا کیا کرو) کہ اے میرے ربّ ان دونوں پر رحم فرما جیسا کہ انہوں نے مجھے پالا پوسا جبکہ میں چھوٹا سا تھا۔''

﴿رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِيْ نُفُوْسِكُمْ ؕ اِنْ تَكُوْنُوْا صٰلِحِيْنَ فَاِنَّهٗ كَانَ لِلْاَوَّابِيْنَ غَفُوْرًا ﴿۲۵﴾﴾

''تمہارا ربّ خوب جانتا ہے جو کچھ کہ تمہارے جی میں ہے۔ اگر تم (واقعتاً) نیک ہوئے تو یقیناً اللہ تعالیٰ رجوع کرنے والوں کے حق میں بہت مغفرت کرنے والا (بخشنے والا) ہے۔''

﴿ وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ﴿۲۶﴾﴾

''اور رشتہ دار کو اس کا حق ادا کرو' اور محتاج اور مسافر کو بھی (اپنے مال میں سے دو) اور (اپنی

دولت کو) بے جا (نام ونمود اور نمائش کے لیے) نہ اڑاؤ۔‘‘

﴿اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ ۭ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا ﴿٢٧﴾﴾

’’یقیناً (اپنی دولت) بے جا (نمود ونمائش کے لیے) اڑانے والے شیطانوں کے بھائی ہیں' اور شیطان اپنے پروردگار کا بڑا ہی ناشکرا (اور نافرمان) ہے۔‘‘

﴿وَاِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ ابْتِغَاۗءَ رَحْمَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ تَرْجُوْهَا فَقُلْ لَّهُمْ قَوْلًا مَّيْسُوْرًا ﴿٢٨﴾﴾

’’اور اگر تمہیں ان سے اعراض کرنا ہی پڑے' اس لیے کہ تم اللہ کی رحمت کے امیدوار ہو' تو ان سے بات نرمی سے کرو۔‘‘

﴿وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا ﴿٢٩﴾﴾

’’اور اپنے ہاتھ کو نہ تو اپنی گردن کے ساتھ باندھ رکھو اور نہ اس کو بالکل ہی کھلا چھوڑ دو کہ پھر تمہیں بیٹھ رہنا پڑے ملامت زدہ ہو کر (اور) عاجز بن کر۔‘‘

﴿اِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيَقْدِرُ ۭ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًۢا بَصِيْرًا ﴿٣٠﴾﴾

’’یقیناً تیرا ربّ رزق کو کشادہ بھی کرتا ہے اور تنگ بھی کرتا ہے جس کے لیے چاہتا ہے۔ وہ یقیناً اپنے بندوں (کے حالات) سے باخبر ہے (اور انہیں) دیکھ رہا ہے۔‘‘

﴿وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ۭ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا ﴿٣١﴾﴾

’’اور اپنی اولاد کو مفلسی کے خوف سے قتل نہ کرو' ہم ان کو بھی رزق دیتے ہیں اور خود تمہیں بھی' یقیناً ان کو قتل کرنا بہت بڑی خطا ہے۔‘‘

﴿وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ۭ وَسَاۗءَ سَبِيْلًا ﴿٣٢﴾﴾

’’اور زنا کے قریب بھی نہ پھٹکو ——— یقیناً وہ بڑی بے حیائی ہے' اور بہت ہی گھناؤنا راستہ ہے۔‘‘

﴿وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ۭ وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ ۭ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا ﴿٣٣﴾﴾

’’اور نہ قتل کرو کسی جان کو جسے اللہ نے محترم ٹھہرایا ہے' مگر حق کے ساتھ۔ اور جو کوئی مظلومانہ قتل کیا جائے تو ہم نے اس کے ولی کو (قصاص کا) اختیار عطا فرمایا ہے' پس چاہیے کہ وہ قتل میں حد سے نہ بڑھے' یقیناً اس کی مدد کی جائے گی۔‘‘

﴿وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِىَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۠ وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ

الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا ﴿٣٤﴾

''اور یتیم کے مال کے قریب بھی نہ پھٹکو مگر بہترین طور پر تا آنکہ وہ پہنچے اپنی جوانی کو (بالغ ہو جائے) اور عہد کو پورا کرو' یقیناً عہد کے بارے میں باز پرس ہوگی۔''

﴿وَاَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ط ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ﴿٣٥﴾﴾

''اور جب ماپ کر دو تو پیمانہ پورا بھر و اور (جب تولو تو) سیدھی ڈنڈی کے ساتھ تولو' یہی بہتر (عمدہ طرزِ عمل) ہے اور انجام کار کے اعتبار سے بھی بہتر ہے۔''

﴿وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ط اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا ﴿٣٦﴾﴾

''اور اُس چیز کی پیروی مت کرو جس کے لیے تمہارے پاس کوئی علم نہیں ہے' یقیناً کان اور آنکھ اور دل (یعنی سماعت' بصارت اور قلب و ذہن کی جو استعدادات تمہیں عطا کی گئی ہیں)' ان تمام کے بارے میں باز پرس ہوگی۔''

﴿وَلَا تَمْشِ فِى الْاَرْضِ مَرَحًا ج اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا ﴿٣٧﴾﴾

''اور زمین میں اکڑ کر مت چلو' یقیناً تم ہرگز نہ تو زمین کو پھاڑ سکتے ہو نہ ہی ہرگز اونچائی اور بلندی میں پہاڑوں کو پہنچ سکتے ہو۔''

﴿كُلُّ ذٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهٗ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوْهًا ﴿٣٨﴾﴾

''ان تمام باتوں میں جو برائی کے پہلو ہیں وہ تمہارے ربّ کو ناپسند ہیں۔''

﴿ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ط وَلَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰـهًا اٰخَرَ فَتُلْقٰى فِىْ جَهَنَّمَ مَلُوْمًا مَّدْحُوْرًا ﴿٣٩﴾﴾

''(اے نبی ﷺ!) یہ ہیں وہ باتیں جو آپ ﷺ کی جانب آپ ﷺ کے ربّ نے وحی کی ہیں از قسم حکمت و دانائی۔ اور اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود مت ٹھہرا بیٹھنا کہ پھر جھونک دیے جاؤ جہنم میں ملامت زدہ ہو کر (اور) دھکے دیے جا کر''۔

﴿اَفَاَصْفٰكُمْ رَبُّكُمْ بِالْبَنِيْنَ وَاتَّخَذَ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ اِنَاثًا ط اِنَّكُمْ لَتَقُوْلُوْنَ قَوْلًا عَظِيْمًا ﴿٤٠﴾﴾

''کیا تمہارے ربّ نے تمہیں تو چن لیا ہے بیٹوں کے لیے اور خود ملائکہ کی صورت میں بیٹیاں اختیار کر لی ہیں؟ یقیناً تم ایک بہت بڑی بات کہہ رہے ہو۔''

قرآن میں مضامین کی تکرار اور اس کی حکمت

ان آیات کے ترجمے سے جو مضامین ہمارے سامنے آئے‘ ان میں سے اکثر مضامین اس سے قبل اس منتخب نصاب کے مختلف اسباق میں آ چکے ہیں۔ مثلاً شرک کی مذمت و ممانعت اور والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کا ذکر سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع میں بیان ہو چکا ہے۔ اقرباء‘ یتامیٰ اور مساکین کے ساتھ نیک سلوک اور ان کی احتیاجوں کے رفع کرنے میں اپنا مال خرچ کرنے کے مضامین آیۂ بر میں بھی آئے (جو ہمارا درس نمبر دو تھا) اور پھر سورۃ المعارج میں بھی یہ آیات وارد ہوئیں: ﴿وَالَّذِيْنَ فِىْۤ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ۝۲۴ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۝۲۵﴾ ”اور وہ لوگ جن کے مالوں میں ایک مقرر حق ہے مانگنے والے کے لیے بھی اور محروم کے لیے بھی“۔ اسی طرح قتل ناحق کی مذمت و ممانعت سورۃ الفرقان کے آخری رکوع میں آ چکی ہے۔ زنا کی شناعت کا ذکر بھی اسی سبق میں آ چکا ہے۔ ایفائے عہد کی تاکید آیۂ بر میں بھی آئی اور اس کا ذکر سورۃ المؤمنون اور سورۃ المعارج کی ہم مضمون آیات میں بھی آیا ہے۔ تکبر اور غرور کی مذمت اور تواضع‘ فروتنی اور حلم کی تلقین سورۂ لقمان کے سبق میں بھی آ چکی ہے اور یہی مضمون سورۃ الفرقان میں مثبت پیرائے میں بایں الفاظ آ چکا ہے: ﴿وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا﴾ (آیت ۶۳) ”اور اللہ کے محبوب بندے وہ ہیں جو زمین پر دبے پاؤں (آہستگی اور فروتنی کے ساتھ) چلتے ہیں“۔

قرآن حکیم میں مضامین کی تکرار کے ضمن میں چند باتیں قابل توجہ ہیں۔ قرآن مجید میں اگر مضامین کی تکرار ہوتی ہے تو اس سے اوّلاً تو ان مضامین کی اہمیت کی طرف اشارہ مقصود ہوتا ہے۔ ثانیاً تکرارِ محض کہیں نہیں ہوتی‘ تکرارِ محض کلام کا عیب شمار ہوتا ہے اور قرآن مجید اس عیب سے پاک ہے۔ اگر کہیں کوئی مضمون دوہرا کر آتا ہے تو اسلوب بدلا ہوا ہوتا ہے۔ وہی بات کہ ع ”اِک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں!“ اس اندازِ بیان اور اسلوب کے فرق سے اس کلام کی دل نشینی‘ دل آویزی‘ اثر انگیزی اور اثر پذیری میں اضافہ ہوتا ہے۔ ثالثاً بعض مقامات پر ایسا ہوتا ہے کہ موضوع تو مشترک ہوتا ہے لیکن کہیں وہ انفرادی سیرت و کردار کے ضمن میں آ رہا ہوتا ہے اور کہیں وہی بات معاشرتی اور سماجی اقدار کی حیثیت سے سامنے لائی جا رہی ہوتی ہے۔ رابعاً جہاں بھی کوئی مضمون دوسری بار آتا ہے تو اگر اسے نظرِ غائر سے دیکھا جائے تو وہاں کوئی نہ کوئی نیا پہلو مل جاتا ہے۔ چنانچہ اگر قرآن مجید میں کہیں تکرار محسوس ہو تو آپ ان چاروں میں سے کسی نہ کسی ایک بات کو وہاں موجود پائیں گے۔

ان سب باتوں کو جمع کر کے سورۃ الزمر کی ایک آیت کی طرف اشارہ کر رہا ہوں جس میں قرآن مجید اپنا تعارف ان الفاظِ مبارکہ میں کراتا ہے: ﴿كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ ۖ﴾ (آیت ۲۳) یعنی یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کے مضامین باہم مماثل ہیں اور دوہرا دوہرا کر آتے ہیں۔ بقول اقبال: ؏

''شاید کہ اُتر جائے تیرے دل میں مری بات!''

اگر ایک انداز سے بات سمجھ میں نہیں آئی تو شاید دوسرے انداز سے سمجھ میں آ جائے۔

زیر درس آیات کے متن اور ترجمہ سے ان آیاتِ مبارکہ کے مضامین کا ایک اجمالی نقشہ ہمارے سامنے آ گیا ہے۔ اب ہم ان میں سے اہم نکات کے بارے میں کسی قدر تفصیل سے گفتگو کریں گے۔

شرک کی مذمت اور ممانعت

سب سے پہلا نکتہ یہ ہے کہ ان آیات کے آغاز میں بھی شرک کی مذمت اور ممانعت ہے اور ان کا اختتام بھی اسی مضمون پر ہو رہا ہے۔ گویا وہ تمام اوصاف یا تمام اقدار جو ان آیات میں بیان ہو رہی ہیں ان کے لیے توحید باری تعالیٰ ایک حصار کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس طرح ہم نے سورۃ المؤمنون کی آیات میں دیکھا تھا کہ انفرادی سیرت کی تعمیر کے ضمن میں آغاز بھی نماز سے ہوا تھا: ﴿قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۝﴾ اور پھر اختتام بھی نماز کے ذکر پر ہوا تھا: ﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۝﴾ اور یہی اسلوب سورۃ المعارج کی ہم مضمون آیات میں ملاحظہ کیا تھا' بعینہٖ یہ بات ہمیں یہاں توحید کے بارے میں نظر آ رہی ہے۔ اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ چونکہ اسلام دین توحید ہے اور توحید کی ضد شرک ہے' لہٰذا اسلام جو بھی معاشرہ تشکیل دینا چاہتا ہے اس میں توحید کو مرکز کی حیثیت حاصل ہے اور شرک کا مکمل استیصال ہے۔ یعنی جہاں شرک کا شائبہ بھی نظر آئے اسے محو کرنا اس کے بنیادی مقاصد میں شامل ہے۔ اس لیے کہ کوئی بھی معاشرہ اگر اپنے بنیادی نظریہ اور اپنے اساسی فکر کے خلاف کسی چیز کو در آنے کا موقع دے گا تو ظاہر بات ہے کہ اس سے اس معاشرے کی جڑیں کھوکھلی ہو جائیں گی۔ چنانچہ یہاں ابتداء میں فرمایا: ﴿وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ﴾ بڑا فیصلہ کن انداز ہے کہ ''اور تیرے ربّ نے طے فرما دیا ہے کہ مت بندگی کرو کسی کی سوائے اس کے''۔ اختتام پر بھی توحید ہی کا مضمون ہے' البتہ انداز مختلف ہے: ﴿وَلَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰـهًا اٰخَرَ﴾ ''اور اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود نہ ٹھہرا بیٹھنا''۔ بات ایک ہے لیکن اسلوب جدا۔

یہ دونوں باتیں تو فی الحقیقت شرک فی العبادت کی نفی کر رہی ہیں' مگر دنیا میں شرک کی ایک اور قسم

بھی موجود رہی ہے‘ جسے شرک فی الذات کہتے ہیں‘ یعنی کسی کو خدا کا بیٹا یا بیٹی قرار دے دینا۔ جیسا کہ یہودیوں کے ایک گروہ نے حضرت عزیر علیہ السلام کو اور عیسائیوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کو خدا کا بیٹا قرار دیا۔ اسی طرح اہل عرب فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں قرار دیتے تھے۔ چنانچہ ان کے جتنے بُت تھے ان کے نام مؤنث تھے‘ جیسے ’’لات‘‘ الٰہ کا مؤنث ہے‘ ’’العزیٰ‘‘ العزیز کا مؤنث ہے اور ’’المنات‘‘ المنان کا مؤنث ہے۔ انہوں نے فرشتوں کو اپنا معبود مانا اور ان کے بارے میں یہ سمجھا کہ یہ خدا کی بیٹیاں ہیں۔ چنانچہ اس ضمن میں بڑے ہی لطیف پیرائے میں تنقید کی جا رہی ہے کہ ہوش مندو! تم نے اللہ کو الاٹ بھی کیں تو بیٹیاں!! ﴿اَفَاَصۡفٰىكُمۡ رَبُّكُمۡ بِالۡبَنِيۡنَ﴾ ’’کیا تمہارے ربّ نے تم کو تو چن لیا ہے بیٹوں کے لیے؟‘‘ ﴿وَاتَّخَذَ مِنَ الۡمَلٰٓـئِكَةِ اِنَاثًا ؕ﴾ ’’اور اپنے لیے فرشتوں کی صورت میں بیٹیاں اختیار کر لیں!‘‘ ﴿اِنَّكُمۡ لَتَقُوۡلُوۡنَ قَوۡلًا عَظِيۡمًا ﴿۴۰﴾﴾ ’’جان لو کہ یہ بات جو تم اپنی زبان سے نکال رہے ہو‘ یہ بہت بڑی بات ہے‘‘۔ یہ اللہ کی جناب میں بہت بڑی جسارت ہے‘ بہت بڑی گستاخی ہے۔

حقوقِ والدین کی خصوصی اہمیت

دوسرا نکتہ ہے: ﴿وَبِالۡوَالِدَيۡنِ اِحۡسَانًا ؕ﴾ ’’اور ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرو‘‘۔ یہ مضمون اس سے پہلے سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع میں بھی آ چکا ہے: ﴿وَوَصَّيۡنَا الۡاِنۡسَانَ بِوَالِدَيۡهِ ۚ﴾ (آیت ۱۴) ’’اور ہم نے انسان کو وصیت کی اپنے والدین (سے حسن سلوک) کے بارے میں‘‘۔ نیز قرآن مجید میں متعدد مقامات اور بھی ہیں جہاں اللہ تعالیٰ کے حقوق کے فوراً بعد والدین کے حقوق کا ذکر ہے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ اس مضمون کی خصوصی اہمیت کیا ہے؟ اگر آپ ذرا غور کریں گے تو یہ بات صاف نظر آئے گی کہ جسے ہم معاشرہ یا سماج کہتے ہیں وہ خاندانوں کا اجتماع ہے‘ بہت سے خاندان مل کر معاشرے کی صورت اختیار کرتے ہیں۔ گویا معاشرے کی اکائی خاندان ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اگر خاندان مستحکم ہو گا‘ اس کا نظام مضبوط ہو گا تو پورا معاشرہ بھی مستحکم ہو گا‘ اور اگر خاندان کمزور پڑ جائے تو پورے معاشرے میں بھی اضمحلال اور فساد رونما ہو گا۔ اس لیے کہ اگر اینٹیں کچی ہوں گی تو فصیل بھی کچی ہو گی اور اگر اینٹیں پکی ہوں اور ہر اینٹ اپنی جگہ مضبوطی سے جمی ہوئی ہو تو فصیل بھی مضبوط ہو گی۔ ایک مشہور مفکر نے ایک بڑی عجیب بات کہی ہے کہ مختلف تہذیبوں اور تمدنوں کے مطالعے سے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ کوئی تہذیب اور کوئی تمدن اُس وقت تک زوال سے دوچار نہیں ہوتا جب تک اس میں خاندان کا ادارہ کمزور نہ پڑ جائے۔ یہ گویا تہذیب و تمدن کے اضمحلال اور زوال کا نقطۂ آغاز ہے۔

اب اگر ہم غور کریں تو خاندان کے ادارے کے تین اہم گوشے ہیں۔ایک گوشہ شوہر اور بیوی کے باہمی ربط و تعلق کا ہے' دوسرا گوشہ والدین اور اولاد کے باہمی ربط و تعلق کا ہے اور تیسرا گوشہ بہنوں اور بھائیوں کے درمیان رشتۂ اخوت سے متعلق ہے۔ خاندان کے ادارے کے ان اَبعادِ ثلاثہ (Three Dimensions) کے مابین صحیح توازن قائم رہے گا تو خاندان کا نظام مستحکم ہوگا۔ جہاں تک شوہر اور بیوی کے باہمی تعلق کا معاملہ ہے۔اس موضوع پر ہم سورۃ التحریم میں قرآن مجید کی بنیادی راہنمائی قدرے تفصیل کے ساتھ دیکھ چکے ہیں۔

اب یہاں یہ سمجھئے کہ اگر کسی معاشرے میں والدین سے بے رُخی عام ہوجائے تو یہ خاندانی نظام کو مضمحل کرنے کا ایک بہت بڑا سبب ہوگا۔اگر والدین کو یہ اعتماد نہ ہو کہ بڑھاپے میں ہماری اولاد ہمارا سہارا بنے گی تو ان میں بھی خودغرضی پیدا ہوسکتی ہے۔ پھر وہ بھی اپنے آپ کو اولاد میں کلیتًا کھپا دینے (invest کرنے) کے لیے آمادہ نہیں ہوں گے اور اپنے مستقبل کے لیے کچھ بچا بچا کر رکھیں گے۔لیکن اگر کسی معاشرے میں یہ قدر (value) موجود ہے کہ بوڑھے والدین کی اولاد اُن کا سہارا بنتی ہے' ان کی ذمہ داریوں کو پوری طرح نباہتی اور ادا کرتی ہے تو والدین بھی اپنی جوانی کے دور کی ساری توانائیاں اپنی اولاد پر کھپاتے اور invest کرتے ہیں۔ ہمارے یہاں آج بھی الحمدللہ یہ رنگ بڑی حد تک موجود ہے۔لیکن اس کے بالکل برعکس صورتِ حال دیکھنا چاہیں تو آپ یورپ اور امریکہ جا کر وہاں کے معاشروں کا مشاہدہ کیجیے۔ وہاں موجودہ دور میں بڑھاپا سب سے بڑی لعنت سمجھی جاتی ہے۔اگرچہ وہاں حکومت کی سطح پر بوڑھوں کے لیے ادارے قائم ہیں' ان کی دیکھ بھال ہورہی ہے' لیکن وہ جو محبت کی پیاس ہوتی ہے اس پیاس کی تسکین کا ان اداروں میں کوئی سامان نہیں ہے۔ وہ اپنی اولاد کو دیکھنے تک کے لیے تڑپتے رہتے ہیں۔ان ممالک میں کرسمس کی اہمیت اب یہ رہ گئی ہے کہ بوڑھے والدین ان اداروں میں اپنے دل میں یہ تمنا اور توقع لیے منتظر رہتے ہیں کہ شاید اس کرسمس پر ہمارے بچے ہم سے ملنے آئیں اور اس موقع پر ہم اپنی اولاد کی شکل دیکھ سکیں۔

اس کے برعکس نظام ہے جو اسلام نے دنیا کو دیا ہے۔اس میں والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کو اتنی اہمیت دی گئی ہے کہ قرآن مجید میں اکثر مقامات پر اللہ کے حقوق کے متصلاً بعد والدین کے حقوق کا ذکر ہوتا ہے۔جیسا کہ عرض کیا گیا' قرآن حکیم میں تکرارِ محض کہیں نہیں ہوتی۔سورۂ لقمان میں والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کی ترغیب دیتے ہوئے والدہ کا ذکر بطورِ خاص کیا گیا تھا:﴿حَمَلَتۡهُ اُمُّهٗ وَهۡنًا

عَلٰی وَهۡنٍ وَّفِصٰلُهٗ فِیۡ عَامَیۡنِ﴾ (آیت۱۴)''اس کو اٹھایا اس کی ماں نے تکلیف پر تکلیف جھیل کر' اور اس کا دودھ چھڑانا ہے دو سالوں میں''۔ اور یہاں ضعیفی کی وہ عمر خاص طور پر پیش نظر ہے جس کو قرآن مجید میں ارزل العمر قرار دیا گیا ہے' یعنی عمر کا وہ حصہ جو بڑا ہی کمزوری اور بے چارگی والا حصہ ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے خود بھی عمر کے اس حصے سے اللہ کی پناہ طلب کی ہے۔ عمر کے اس حصے میں ایک تو بوڑھے والدین کے احساسات زیادہ نازک ہو جاتے ہیں۔ دوسرے اکثر و بیشتر ان کے فہم میں بھی کمی آ جاتی ہے۔ جیسے سورۃ یٰسٓ میں فرمایا: ﴿وَمَنۡ نُّعَمِّرۡهُ نُنَكِّسۡهُ فِی الۡخَلۡقِ﴾ (آیت ۶۸) ''جس شخص کو ہم لمبی عمر دیتے ہیں (اس کی) ساخت کو ہم الٹ ہی دیتے ہیں''۔ ان کی ذہنی توانائیاں پہلی سی نہیں رہتیں اور ان کے فہم و فکر میں اضمحلال واقع ہو جاتا ہے۔ بہت سے لوگوں کا مشاہدہ ہو گا کہ بڑھاپے میں انسان میں بچپن کی سی خواہشات عود کر آتی ہیں اور وہ کچھ اسی طرح کی فرمائشیں کرنے لگتا ہے۔ ان حالات میں واقعہ یہ ہے کہ اولاد کے لیے بڑی سخت آزمائش ہوتی ہے۔ وہ ان کی سب فرمائشیں پوری بھی نہیں کر سکتے' کہیں نہ کہیں روک لگانی پڑے گی' ان کی بات ردّ کرنا پڑے گی۔ اس کے پیش نظر یہاں حکم دیا جا رہا ہے کہ ان سے جب بھی بات کرو تو نرمی اور ادب کو بہر حال ملحوظ رکھو۔ سینہ تان کر بات نہ کرو' انہیں جھڑکو مت' ملامت نہ کرو۔ اور اگر ان کی کسی بات کو پورا نہیں کر سکتے ہو تو نرمی کے ساتھ معذرت کرو۔ ساتھ ہی یہ بھی کہ ان کے سامنے اپنے شانے جھکا کر رکھو۔ انہیں یہ احساس نہ ہو کہ آج یہ مجھ سے سینہ تان کر بات کر رہا ہے درآنحالیکہ یہ کبھی اس حال میں تھا کہ اس کا وجود بھی ہمارا مرہونِ منت تھا' اس کی پرورش ہمارے ذمہ تھی اور ہم اپنا پیٹ کاٹ کر اس کی ضروریات کو مقدم رکھتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی فرما دیا کہ اللہ سے بھی دعا کرتے رہا کرو کہ پروردگار! مجھ سے اگر کوئی کوتاہی ہو ہی جائے تو تُو بخشنے والا ہے۔ اور والدین کے تمام حقوق میں خود ادا کر بھی نہیں سکتا' ان کے احسانات کا جو بارِ گراں میرے کاندھوں پر ہے ان کا حساب میں نہیں چکا سکتا' لہٰذا تجھ ہی سے استدعا کر رہا ہوں: ﴿رَّبِّ ارۡحَمۡهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِیۡ صَغِیۡرًا ﴿۲۴﴾﴾ ''پروردگار! تُو اِن پر رحم فرما جیسے انہوں نے مجھے پالا پوسا جبکہ میں چھوٹا تھا''۔

ساتھ ہی یہ تسلی بھی دے دی کہ اگر استثنائی حالات میں کبھی تمہیں ان کی بات کو ردّ کرنا پڑے تو ایک سعادت مند بیٹے پر اس کا جو احساس طاری ہو گا اور جو کوفت اسے ہو گی اس کے ازالے کے لیے فرمایا کہ گھبراؤ نہیں' تمہارا ربّ صرف ظاہر کو نہیں جانتا بلکہ وہ تو اسے بھی جانتا ہے جو تمہارے جی میں

ہے: ﴿رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِيْ نُفُوْسِكُمْ ؕ﴾ ''تمہارا ربّ خوب جانتا ہے جو کچھ تمہارے جی میں ہے۔'' تم نے اگر کسی وقت اپنے والدین کی فرمائش کو ردّ کیا ہے تو تمہاری کیا مجبوری ہے' تمہارے کیا حالات ہیں' تمہارا ربّ خوب جانتا ہے۔ اگر تم اپنی قلبی کیفیت کے اعتبار سے درست ہو اور نیک نیت ہو تو اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں کی مغفرت فرمانے والا ہے: ﴿اِنْ تَكُوْنُوْا صٰلِحِيْنَ فَاِنَّهٗ كَانَ لِلْاَوَّابِيْنَ غَفُوْرًا ﴿۲۵﴾﴾ ''اگر تم (واقعتاً) نیک ہوئے تو یقیناً اللہ تعالیٰ رجوع کرنے والوں کے حق میں بہت مغفرت کرنے والا ہے۔''

رشتہ دار' مسکین اور مسافر کا حق

اب تیسرے نکتے کی طرف آیئے۔ ویسے یہ مضمون بھی اس سے پہلے آ چکا ہے' لیکن یہاں ایک نئی شان سے آ رہا ہے' فرمایا: ﴿وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ﴾ ''اور رشتہ دار کو اس کا حق ادا کرو اور رشتہ دار اور مسافر کو بھی (اپنے مال میں سے دو)۔'' دیکھئے' یہ بڑی فطری ترتیب ہے۔ خاندان کے ادارے کو مستحکم کرنے کے بعد اب انسان کے حسنِ سلوک کا دائرہ بڑھنا چاہیے' اور ظاہر بات ہے کہ ''اَلْاَقْرَبُ فَالْاَقْرَبُ'' کے اصول کے مطابق جو سب سے قریب ہے وہ سب سے پہلے حسنِ سلوک کا مستحق ہے۔ یعنی جو فطری طور پر مقدم ہے اسی کو مقدم رکھنا ہوگا۔ پس جو قرابت دار اور رشتہ دار ہیں ان کا حق حسنِ سلوک میں فائق اور مقدم رہے گا۔ پھر اس دائرے میں معاشرے کے محروم افراد کو شامل کرنا ہوگا' جن میں مساکین' مجبور' یتیم اور مسافر سبھی شامل ہیں۔ اس طرح تمہارے حسنِ سلوک کا دائرہ بڑھتا چلا جانا چاہیے۔

''تبذیر'' کی ممانعت اور اس کی شناعت

لیکن اگر کوئی شخص اپنی دولت کو نام و نمود' نمائش اور اللّوں تللّوں میں اڑا رہا ہے تو وہ اس خیر' اس نیکی اور اس بھلائی سے محروم رہے گا۔ لہٰذا اس کے ساتھ ہی تبذیر کی ممانعت کی گئی جو ادائے حقوق کی ضد ہے۔ گویا ایک ہی آیت مبارکہ میں معاشرتی و سماجی اعتبار سے اخراجات کی دو انتہاؤں کو جمع کر دیا گیا اور یہ رہنمائی دے دی گئی کہ انسان کو چاہیے کہ ابنائے نوع پر اپنی دولت مندی کا رعب گانٹھنے کے لیے نام و نمود اور نمائش کے فضول کاموں پر خرچ کرنے کے بجائے اسے ان کی ضروریات اور احتیاجات کو رفع کرنے کا ذریعہ بنائے۔ چنانچہ آیت کے اختتام پر فرمایا: ﴿وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ﴿۲۶﴾﴾ ''اور (اپنی دولت کو) بے جا (نام و نمود اور نمائش کے لیے) نہ اڑاؤ۔'' یعنی اپنی دولت کو اللوں تللوں میں مت اڑاؤ۔

یہاں نوٹ کیجیے کہ اس سلسلے میں سورۃ الفرقان میں لفظ ''اسراف'' آیا تھا' لیکن یہاں اسراف کے بجائے ''تبذیر'' آیا ہے۔ اگرچہ اسراف اور تبذیر دونوں قابل تحذیر اور قابل مذمت ہیں' لیکن ان کے مابین فرق ہے! اسراف انسان کا اپنی کسی جائز ضرورت کو پورا کرنے میں ضرورت سے زائد خرچ کرنا ہے' مثلاً خوراک ہماری ضرورت ہے' لیکن ضرورت سے آگے بڑھ کر انواع واقسام کے کھانوں کو دستر خوان کی زینت کا معمول بنا لینا اسراف کے ذیل میں آئے گا۔ کپڑے پہننا اور تن ڈھانپنا ہماری ضرورت ہے' لیکن بیس بیس اور تیس تیس جوڑوں سے الماریاں بھری ہوئی ہوں تو یہ اسراف ہے۔ اسراف کی ضد ہے بخل' یعنی اللہ تعالیٰ نے کشادگی دے رکھی ہے' آسودگی اور خوشحالی ہے' لیکن انسان دولت کو سینت سینت کر رکھ رہا ہے' دوسروں پر تو کیا خرچ کرے گا' خود اپنی جائز ضرورتوں میں بھی بخل سے کام لیتا ہے۔ یہ انسان کے ذاتی اور نجی اخراجات کی دو انتہائیں ہیں۔ چنانچہ انسان کے ذاتی سیرت وکردار کے اوصاف کے ضمن میں سورۃ الفرقان میں اس بات کو مثبت انداز میں بیان کر دیا گیا:

﴿وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا﴾

''اور وہ لوگ (یعنی عباد الرحمٰن) جب خرچ کرتے ہیں تو نہ اسراف کرتے ہیں (کہ ضرورت سے زیادہ خرچ کریں) اور نہ بخل سے کام لیتے ہیں (کہ حقیقی ضرورت کے معاملے میں بھی خرچ کرتے ہوئے دل میں گھٹن محسوس کریں)' بلکہ ان کا معاملہ (اور رویہ) اعتدال کا رہتا ہے''۔ اب ذرا غور کیجیے کہ تبذیر کیا ہے؟ تبذیر اس خرچ کو کہا جاتا ہے جس کی سرے سے کوئی حقیقی ضرورت ہوتی ہی نہیں۔ صرف نمود ونمائش کے لیے' لوگوں پر اپنی دولت کا رُعب گانٹھنے کے لیے اور اپنی دولت مندی کی دھونس جمانے کے لیے دولت خرچ کی جاتی ہے' جیسے ہمارے اہلِ ثروت کے یہاں شادی کی تقاریب کے موقع پر ہوتا ہے۔

یہاں تبذیر کی نہایت شدید مذمت بیان کی گئی ہے۔ فرمایا گیا کہ یہ مبذّرین (فضول خرچی کرنے والے) دراصل شیطانوں کے بھائی ہیں۔ غور کیجیے ایسا کیوں کہا گیا؟ شیطان انسانوں پر جو سب سے بڑا حربہ آزماتا ہے' خصوصاً معاشرتی' سماجی اور تمدنی سطح پر' وہ انسانوں کے دلوں سے باہم محبت و اخوت کے رشتوں اور جذبات کو ختم کر کے اس میں نفرت وعداوت کے بیج بو دینا ہے۔ چنانچہ شراب اور جوئے کے بارے میں سورۃ المائدۃ میں فرمایا گیا: ﴿اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاۗءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ﴾ (آیت ۹۱) ''یقیناً شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ شراب اور

جوئے کے ذریعے سے تمہارے مابین دشمنی (اور بغض وعداوت) ڈال دے''۔غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ تبذیر سے بھی یہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔ایک بہت بڑے سرمایہ دار کی بیٹی کی شادی ہو رہی ہے' اس کا عالی شان بنگلہ جگمگ جگمگ کر رہا ہے' اس کے چپے چپے پر اور درختوں کے ایک ایک پتے کے ساتھ روشنی کے قمقمے لگا دیے گئے ہیں' پوری کوٹھی بقعۂ نور بنی ہوئی ہے۔اسی کوٹھی میں اس کا کوئی شوفر بھی ہے' کوئی خانساماں بھی ہے' اس کے بنگلے میں مختلف کاموں کے لیے بہت سے دوسرے ملازمین بھی ہوں گے۔ہوسکتا ہے کہ ان ملازمین میں سے کسی کی جوان بچی اس لیے بیٹھی ہوئی ہو اور اُس کے ہاتھ پیلے نہ ہو سکتے ہوں کہ بچی کی شادی کے ضمن میں جو کم سے کم ضروری اخراجات ہوں' ان کے لیے بھی اس کے پاس پیسہ نہ ہو۔اب آپ خود فیصلہ کر لیجیے کہ دولت کے اس طرح اظہار کو دیکھ کر کیا آپس میں محبت اور یگانگت کا احساس پیدا ہوگا؟ اس سے تو نفرت وعداوت کے بیج ہی دلوں میں بوئے جائیں گے۔''haves'' اور ''have nots'' کا شعور اور طبقاتی فرق وتفاوت کے احساسات و جذبات کے ادراک کو دلوں میں پختہ کرنے میں سب سے زیادہ مؤثر بات یہی ہے کہ دولت منداپنی دولت کا اس طریقے سے اظہار کریں' اس کی نمائش کریں۔اس طرح دلوں کے اندر نفرت وعداوت کا لاوا پکتا رہتا ہے۔لہٰذا فرمایا:

﴿اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ ۭ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا ۝۲۷﴾

''یقیناً مبذرین (نام ونمود اور نمائش کے لیے اپنی دولت اڑانے والے) شیطانوں کے بھائی ہیں' اور شیطان تو ہے ہی اپنے ربّ کا بے حد ناشکرا''۔

اگلی آیت میں ایک اور بات کی تلقین فرمائی کہ اگر تمہیں کبھی اپنے قرابت داروں' ضرورت مندوں یا سائلین سے کسی وقت معذرت کرنا ہی پڑے' اس لیے کہ تم خود بھی (فراغت اور کشادگی کے لیے) اللہ کی رحمت کے امیدوار ہو' تو بات نرمی کے ساتھ کرو' ان کو جھڑکو نہیں' جیسا کہ سورۃ الضحیٰ میں خود رسول اللہ ﷺ سے فرمایا گیا: ﴿وَاَمَّا السَّاۗىِٕلَ فَلَا تَنْهَرْ ۝۱۰﴾ ''اور سائل کو نہ جھڑکو''۔یہاں ایک معاشرتی اخلاقی قدر (value) کے طور پر ہدایت دی جارہی ہے: ﴿وَاِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ ابْتِغَاۗءَ رَحْمَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ تَرْجُوْهَا فَقُلْ لَّهُمْ قَوْلًا مَّيْسُوْرًا ۝۲۸﴾ ''اور اگر تمہیں ان سے اعراض کرنا ہی پڑے' اس لیے کہ تم اللہ کی رحمت کے امیدوار ہو' تو ان سے بات نرمی سے کرو''

پھر یہ بھی فرمایا گیا کہ اس خیر اور بھلائی کے کام میں بھی اعتدال وتوازن کی ضرورت ہے: ﴿وَلَا

تَجۡعَلۡ یَدَكَ مَغۡلُوۡلَةً اِلٰی عُنُقِكَ﴾ ''اور اپنے ہاتھ کو نہ تو اپنی گردن کے ساتھ باندھ رکھو''۔ نہ تو ایسا ہو کہ ہاتھ گردن سے بندھا ہوا ہو۔ یہ بخل کے لیے ایک تعبیر ہے۔ ﴿وَلَا تَبۡسُطۡهَا كُلَّ الۡبَسۡطِ﴾ ''اور نہ ایسا ہو کہ اسے بالکل کھلا چھوڑ دیا جائے'' اس میں بھی اعتدال کی ضرورت ہے۔ آدمی جذبات میں آ کر کسی وقت اپنا سب کچھ اللہ کی راہ میں لٹا دیتا ہے۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ بعد میں پچھتائے۔ ﴿فَتَقۡعُدَ مَلُوۡمًا مَّحۡسُوۡرًا ۝۲۹﴾ ''پھر تمہیں بیٹھ رہنا پڑے ملامت زدہ ہو کر (اور) عاجز بن کر''۔ اس کی اپنی اولاد فقیروں اور بھکاریوں کی صورت اختیار کر لے۔ اس لیے اس میں بھی توازن اور اعتدال درکار ہے۔

اس مضمون کا اختتام اس آیت مبارکہ پر ہوتا ہے:

﴿اِنَّ رَبَّكَ یَبۡسُطُ الرِّزۡقَ لِمَنۡ یَّشَآءُ وَیَقۡدِرُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِیۡرًۢا بَصِیۡرًا ۝۳۰﴾

''بے شک تیرا ربّ ہی کھول دیتا ہے روزی جس کے لیے چاہے اور تنگ بھی وہی کرتا ہے۔ بلاشبہ وہ اپنے بندوں کی خبر رکھنے والا (اور) ان کو دیکھنے والا ہے''۔

اس آیت کے ذریعے سے دراصل یہ اصول بیان کر دیا گیا کہ کسی کی کشادگی و تونگری اور کسی کی تنگی اور مفلسی کے ذمہ دار تم نہیں ہو اور نہ یہ واقعتاً تمہارے بس کی بات ہے۔ اس کا فیصلہ اللہ تعالیٰ اپنے علم کامل اور حکمتِ بالغہ کی بنا پر کرتا ہے اور فراخی و تنگی میں بھی بندے کا امتحان مقصود ہوتا ہے۔

قتلِ اولاد کی ممانعت

اگلی آیت میں قتل اولاد کی ممانعت ان الفاظ میں وارد ہوئی ہے:

﴿وَلَا تَقۡتُلُوۡۤا اَوۡلَادَكُمۡ خَشۡیَةَ اِمۡلَاقٍ ؕ نَحۡنُ نَرۡزُقُهُمۡ وَاِیَّاكُمۡ ؕ اِنَّ قَتۡلَهُمۡ كَانَ خِطۡاً كَبِیۡرًا ۝۳۱﴾

''اور اپنی اولاد کو مفلسی اور تنگ دستی کے خوف سے مت قتل کرو۔ ہم ان کو بھی رزق دیں گے اور تم کو بھی (دے رہے ہیں اور دیں گے)۔ یقیناً ان کا قتل بہت بڑا گناہ ہے''۔

ایامِ جاہلیت یعنی بعثت نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے قبل عرب میں یہ قبیح رواج تھا کہ پیدائش کے فوراً بعد اپنی اولاد کو مار ڈالتے تھے کہ ان کا خرچ کہاں سے لائیں گے! گویا معاشی محرکات اُن کو قتلِ اولاد جیسے ظالمانہ فعل پر آمادہ کرتے تھے۔ یہاں افلاس کے خوف سے قتل اولاد سے روکا گیا ہے اور واضح کیا گیا ہے کہ رزق کے ٹھیکے دار تم نہیں ہو بلکہ اس کی پوری ذمہ داری اللہ پر ہے۔ وہی تمہیں رزق دیتا ہے اور وہی تمہاری آئندہ نسلوں کو بھی کھلائے گا۔ اولاد کا قتل ایک بہت بڑا گناہ ہے

اور یہ فعل کبیرہ گناہوں میں شامل ہے۔ یہاں یہ بات بھی نوٹ کر لیجیے کہ ہمارے اکثر علماء کرام نے معاشی محرکات کے تحت منع حمل کی تدابیر کو بھی تبعاً اسی ''نہی'' کے حکم میں شامل قرار دیا ہے اور کسی حقیقی و ناگزیر طبی ضرورت کے علاوہ صرف معاشی محرکات کے پیش نظر اسقاطِ حمل کو تو واضح طور پر قتل اولاد کے گناہِ کبیرہ میں شمار کیا ہے۔

زنا کا مکمل سدّ باب

﴿وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰۤى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا ۝۳۲﴾

''اور زنا کے قریب بھی نہ پھٹکو' یقیناً وہ بڑی بے حیائی ہے اور بہت ہی گھناؤنا راستہ ہے''۔

اس آیۂ مبارکہ میں زنا کی جس شدت کے ساتھ ممانعت وارد ہو رہی ہے' وہ لفظ ''لَا تَقْرَبُوْا'' سے ظاہر ہے۔ اس سے پہلے سورۃ الفرقان میں بھی اس برائی کا ذکر آیا تھا' لیکن وہاں اسلوبِ مختلف تھا۔ وہاں عباد الرحمٰن کے اوصاف میں سے ایک اعلیٰ وصف یہ بیان کیا گیا کہ: ﴿وَلَا يَزْنُوْنَ ؕ﴾ ''اور وہ زنا نہیں کرتے'' جبکہ یہاں انتہائی تاکیدی انداز سے نہی کے اسلوب میں حکم فرمایا جا رہا ہے کہ: ﴿وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰۤى﴾ ''اور زنا کے قریب تک نہ پھٹکو''۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام کے معاشرتی اور سماجی نظام میں اس سماجی برائی (social evil) کو ختم کرنے کے لیے ہر ممکن تدبیر اختیار کی گئی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ بہت دُور دُور تک قدغنیں لگائی گئی ہیں تاکہ کوئی اس فحش کام کے قریب تک نہ پھٹک سکے۔ اس لیے کہ ہمارے معاشرے اور ہمارے سماج میں عصمت و عفت اور پاک دامنی (chastity) کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ چنانچہ ایک اسلامی معاشرے میں ہر ممکن تدبیر اور احتیاط اختیار کی جائے گی کہ اس بدکاری کے جو بھی محرکات' اسباب اور داعیات ہو سکتے ہیں' ان سب کے لیے بندشیں اور قدغنیں ہوں۔

اس ضمن میں سب سے پہلی بات تو یہ نوٹ کیجیے کہ نبی اکرم ﷺ کی تعلیمات میں بھی یہ وضاحت آئی ہے اور انجیل میں بھی یہ مضمون موجود ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے بھی اس لفظ ''زنا'' کی وسعت کو ظاہر کیا ہے کہ یہ مجرد وہ فعل نہیں ہے جو اس لفظ سے عام طور پر مراد لیا جاتا ہے۔ چنانچہ حدیث نبویؐ میں الفاظ آتے ہیں: ((زِنَا الْعَيْنَيْنِ النَّظَرُ)) ''آنکھوں کی بدکاری نظر بازی ہے''۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ہاتھوں کی بھی بدکاری ہے' پاؤں کی بھی بدکاری ہے' زبان کی بھی بدکاری ہے' کانوں کی بھی بدکاری ہے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ انسان کے یہ تمام اعضاء و جوارح بدکاری

میں اپنا اپنا حصہ ادا کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں ان تمام راستوں کو بند کیا گیا ہے جن کے باعث انسان کے اس جذبہ میں اشتعال و ہیجان پیدا ہو۔

یہ حقیقت پسندانہ ہدف معین کرنے کے بعد کہ ہمیں اپنے معاشرے میں عصمت و عفت اور آبرو کی حفاظت کا اہتمام کرنا ہے اور بدکاری کا سدِّ باب کرنا ہے' اب ہم جائزہ لیتے ہیں کہ اسلام میں اس کے لیے کیا تدابیر اختیار کی گئی ہیں۔ آگے بڑھنے سے پہلے یہ ذہن نشین کر لیجیے کہ قرآن مجید میں جو لفظ ''زنا'' آیا ہے اور جس نے ہمارے دین میں ایک اصطلاح کی شکل اختیار کر لی ہے' اس ایک لفظ میں انگریزی زبان میں مستعمل تین الفاظ ''fornication''' ''adultery'' اور ''rape'' کا مفہوم موجود ہے۔

سب سے پہلے مثبت تدابیر کو لیجیے۔ ان میں اہم ترین مثبت تدبیر نکاح کو آسان بنانا ہے۔ اس لیے کہ اگر نکاح مشکل ہو' ہزاروں لاکھوں روپے کے انتظام کے بغیر نکاح نہ ہو سکے تو ظاہر بات ہے کہ شہوت کے جبلی تقاضے کی تسکین کے لیے بدکاری کی طرف رجحان ہوگا۔ جب تک جائز راستے کو کھولا نہ جائے اور اسے آسان نہ بنایا جائے اس وقت تک ناجائز راستوں کو بند کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ جس طرح پانی کے بہاؤ کے راستے میں رکاوٹ ہو تو وہ سیدھا راستہ چھوڑ کر اِدھر اُدھر سے اپنا راستہ بنا لیتا ہے' اسی طرح جنسی جذبے کی آسودگی کے جائز راستوں کو مشکل بنا دیا جائے گا تو وہ ناجائز راستے تلاش کرے گا۔ لہٰذا اسلامی معاشرے میں زنا کے فعلِ قبیح کو روکنے والا اہم قدم تسہیلِ نکاح یعنی نکاح کو آسان بنانا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام میں نکاح کے لیے رسومات کا کوئی طومار نہیں اور نہ ہی یہ نام و نمود اور دولت کی نمائش اور دھوم دھڑکّے کے اظہار کا کوئی ذریعہ ہے۔ شادی بیاہ کے موقع پر ہمارے یہاں بدقسمتی سے جو کچھ ہوتا ہے وہ درحقیقت ایک ملغوبہ ہے کہ ہم نے کچھ چیزیں تو اسلام کی اختیار کیں اور کچھ ہندوانہ معاشرت کی اپنا لیں۔ ہماری آبادی کی اکثریت ان ہندوؤں کی نسل سے تعلق رکھتی ہے جو ہندوستان میں آباد تھے اور انہوں نے اسلام قبول کیا تھا۔ یہ نومسلم اپنی سابقہ رسومات' روایات اور رواجات بھی اپنے ساتھ لے آئے۔ چنانچہ ہماری سماجی رسومات ایک کھچڑی ہے۔ ان میں ہندوانہ رسومات بھی شامل ہیں اور کچھ اسلامی افعال و اعمال کو بھی ہم نے ان میں داخل کر لیا ہے۔ ورنہ یہ دھوم دھڑکّا' یہ جہیز دینے کی رسم اور یہ بارات کا تصور' جیسے ایک لشکر کہیں کچھ فتح کرنے کے لیے جا رہا ہو' اور پھر بہت سی دوسری لغو اور فضول رسومات' یہ سب کچھ ہندوانہ پس منظر کی

حامل چیزیں ہیں۔ اسلام کا معاملہ نہایت سادہ طریق پر ایجاب و قبول ہے۔ اسلام نے شادی کا جشن (celebration) لڑکے کے ذمہ رکھا ہے کہ وہ دعوتِ ولیمہ کرے اور اپنی وسعت کے مطابق اپنے اعزہ واقارب اور احباب کو اپنی خوشیوں میں شامل کرے۔ پس پہلی چیز تو یہ ہے کہ نکاح کے راستے کو آسان بنایا جائے تاکہ کسی بھی نوجوان کا دھیان غلط رُخ کی طرف نہ جائے۔

دوسرا مثبت طریقہ یہ اختیار کیا گیا ہے کہ جنسی جذبہ کو ہیجان اور اشتعال دینے والی تمام چیزوں کو سختی سے روک دیا گیا ہے۔ مثلاً شراب کے بارے میں کون نہیں جانتا کہ یہ انسان کے جنسی داعیہ کو اکساتی ہے! بعض دوسری منشیات کا اثر بھی اسی طرح کا ہوتا ہے۔ اسلام ان کو حرام قرار دیتا ہے تاکہ انسان بے خود ہو کر آپے سے باہر نہ ہو جائے۔ اس کی خودی کی گرفت اس کے پورے وجود پر رہے' اس کا شعور معطل نہ ہو اور وہ جنسی ہیجان سے شکست نہ کھا جائے' بلکہ ہر طرح سے بیدار رہے۔ اسی طرح رقص اور موسیقی کا بھی اسلامی معاشرے میں سدّ باب کیا گیا ہے' کیونکہ یہ بھی جنسی جذبے میں ہیجان پیدا کرتی ہیں۔ اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ جب تک ان چیزوں کا سدّ باب نہیں ہو گا جن کے متعلق اسلام چاہتا ہے کہ وہ معاشرے سے بیخ و بن کی طرح اکھڑ جائیں' اس وقت تک زنا کی روک تھام ممکن نہیں ہو گی۔

پھر اسلام اپنے معاشرے میں مردوں اور عورتوں کے آزادانہ اختلاط کو پسند نہیں کرتا' بلکہ مردوں اور عورتوں کے علیحدہ علیحدہ دائرہ کار متعین کرتا ہے۔ عورت کا اصل دائرہ کار اس کا گھر ہے۔ جیسے سورۃ الاحزاب میں فرمایا: ﴿وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاھِلِیَّۃِ الْاُوْلٰی﴾ (آیت ۳۳) ''اور اپنے گھروں میں قرار پکڑو اور سابقہ دورِ جاہلیت کی سی سج دھج نہ دکھاتی پھرو''۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ عورت ضرورت کے تحت بھی گھر سے نہیں نکل سکتی۔ اسے ضرورت کے تحت نکلنے کی اجازت ہے اور اس کے لیے بھی اس سورۂ مبارکہ میں حکم موجود ہے کہ: ﴿یُدْنِیْنَ عَلَیْھِنَّ مِنْ جَلَابِیْبِھِنَّ ط﴾ (آیت ۵۹) ''(اے نبیؐ! اپنی بیویوں اور بیٹیوں اور اہل ایمان کی عورتوں سے کہہ دو کہ) وہ اپنے اوپر اپنی چادروں کے پلو لٹکا لیا کریں''۔ یعنی وہ اپنے پورے وجود کو ایک چادر میں لپیٹ کر چہرے پر ایک پلو اس طرح لٹکا لیا کریں کہ راستہ آسانی سے دیکھ سکیں اور حجاب کا تقاضا بھی پورا ہو سکے۔ یہاں میں نے ''ضرورت کے تحت'' کی جس اجازت کا ذکر کیا ہے وہ خود نبی اکرم ﷺ نے دی ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری میں روایت موجود ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((قَدْ اَذِنَ اللّٰہُ لَکُنَّ اَنْ تَخْرُجْنَ لِحَوَائِجِکُنَّ)) ''اللہ تعالیٰ نے تم (عورتوں) کو اجازت دی ہے کہ تم اپنی ضروریات کے لیے گھر سے

نکل سکتی ہو''۔ مذکورہ بالا آیاتِ مبارکہ میں بناؤ سنگھار اور سج دھج کے ساتھ گھر سے نکلنے کی ممانعت وارد ہوئی ہے اور اس فعل کو جاہلیت کا فعل قرار دیا گیا ہے۔

اسی سورۃ الاحزاب کی آیت ۵۳ میں اہل ایمان سے کہا جا رہا ہے کہ ﴿وَاِذَا سَاَلۡتُمُوۡهُنَّ مَتَاعًا فَسۡـَٔلُوۡهُنَّ مِنۡ وَّرَآءِ حِجَابٍ ؕ﴾ ''اور جب تمہیں اُن (یعنی (نبی اکرم ﷺ کی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن) سے کوئی چیز مانگنی ہو تو پردے کی اوٹ سے مانگو''۔ آیت کے اس حصے میں دو باتیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں' ایک یہ کہ اس میں لفظ ''حجاب'' آیا ہے جس کے معنی ہر پڑھا لکھا شخص جانتا ہے کہ ''پردہ'' کے ہیں۔ دوسری یہ کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا جا رہا ہے جن کے لیے کہ ازواجِ مطہرات بمنزلہ روحانی ماں ہیں' جو اُمہات المؤمنین ہیں' کہ ان سے بھی اگر کوئی چیز مانگنی ہو تو پردے کی اوٹ سے مانگیں۔ یہ اسلوب اس بات پر صریح دلالت کر رہا ہے کہ اسلام اپنے معاشرتی نظام میں مردوں اور عورتوں کے مابین اختلاط کو روکنے کے لیے کیسی کیسی احتیاطیں ملحوظ رکھ رہا ہے۔ اس ضمن میں یہ حکم بھی دیا گیا ہے کہ کہیں تنہائی میں نامحرم مرد اور عورت اکٹھے نہ رہیں۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جہاں کہیں نامحرم مرد اور عورت اکیلے ہوں گے وہاں تیسرا شیطان موجود ہوگا۔

اب آگے بڑھئے' لباس کے سلسلے میں ہماری تہذیب وتمدن کی جو روایات بنی ہیں وہ یوں ہی نہیں بن گئیں۔ اسلام نے ستر کا تصور دیا ہے اور اس کے لیے مستقل احکام دیے ہیں۔ ستر سے مراد جسم کے وہ حصے ہیں جو ڈھکے رہنے چاہئیں۔ ستر پوشی کا شعور اللہ تعالیٰ نے انسان کی جبلت وفطرت میں رکھا ہے۔ چنانچہ وحشی سے وحشی قبائل کو بھی آپ جا کر دیکھیں تو ان کا پورا جسم اگرچہ ننگ دھڑنگ ہو لیکن وہ پتوں سے اپنے جسم کے کچھ حصوں کو چھپاتے ہیں۔ اس لیے کہ یہ تقاضائے فطرت ہے۔ اسلام کی رو سے مرد کا ستر ناف سے لے کر گھٹنے کے نچلے حصہ تک ہے' اس پر کسی کی نگاہ نہیں پڑنی چاہیے' یہ ہر حال میں ڈھکا رہنا چاہیے۔ چنانچہ کسی بیٹے کے سامنے باپ کے جسم کا بھی یہ حصہ نہیں کھلنا چاہیے۔ اسی طرح کسی بھائی کے سامنے اس کے بھائی کا بھی یہ حصہ نہیں کھل سکتا' یہ ستر ہے۔ اب عورت کے بارے میں دیکھئے۔ عورت کے بارے میں فرمایا گیا کہ: ((اَلْمَرْءَةُ عَوْرَةٌ)) ''عورت سراپا ستر ہے''۔ یعنی عورت کا پورا جسم ستر ہے۔ واضح رہے کہ لفظ ''عورت'' کا معنی ''ہی چھپانے کے قابل شے'' ہے۔ اسی طرح ہمارے یہاں عورتوں کے لیے لفظ ''مستورات'' استعمال ہوتا ہے۔ مستور ستر سے بنا ہے' اس کے معنی چھپی ہوئی شے کے ہیں۔ اس سے مستثنیٰ عورت کے جسم کے صرف تین حصے ہیں: چہرے کی ٹکیہ' ہاتھ اور

ٹخنے سے نیچے پاؤں۔ یہ تین حصے ستر نہیں ہیں' باقی پورا جسم ستر ہے۔ عورت کا سر بلکہ بال بھی ستر میں داخل ہیں۔ اب سمجھئے کہ ستر کے کیا معنی ہیں! یہ کہ عورت کے جسم کے ان تین حصوں کے سوا کسی اور حصے پر اس کے بھائی یا باپ کی نگاہ بھی نہیں پڑنی چاہیے۔ یہ حصے ہر حال میں مستور رہیں گے۔ ستر سے آگے کا معاملہ شوہر اور بیوی کے لیے ہے۔ البتہ کسی اشد اور ناگزیر صورتِ حال میں مرد یا عورت کے ستر کا کوئی حصہ طبیب' ڈاکٹر یا جراح کے سامنے کھولا جا سکتا ہے۔ باقی باپ' بیٹا' بھائی' بہن ان سب کے لیے ستر کی پابندی ضروری ہے۔

اسی ستر کے ضمن میں نبی اکرم ﷺ نے مزید فرمایا کہ عورت کا ایسا لباس جس سے بدن چھلکتا ہو یا اس کی رعنائیاں نمایاں ہوتی ہوں' ستر نہیں ہے۔ بلکہ ایسا لباس پہننے والی عورتوں کو آپ ﷺ نے ''کَاسِیَاتٍ عَارِیَاتٍ'' قرار دیا ہے' یعنی لباس پہننے کے باوجود یہ عورتیں عریاں ہیں۔ صحیح بخاری میں اُمّ المؤمنین حضرت سلمہ ؓ سے مروی ایک طویل روایت کے آخری الفاظ ہیں: ((رُبَّ کَاسِیَةٍ فِی الدُّنْیَا عَارِیَةٌ فِی الْآخِرَةِ)) ''دنیا میں کپڑے پہننے والی بہت سی عورتیں آخرت میں عریاں ہوں گی''۔ حدیث کے ان الفاظ سے ایسے باریک اور ایسے چست کپڑے پہننا مراد ہے جن سے جسم جھلکے یا عورت کی رعنائی کی چیزیں نمایاں ہوں۔ ایسی عورتوں کو کپڑے پہننے کے باوجود نبی اکرم ﷺ نے ننگی قرار دیا ہے۔

ایک مزید چیز جو ہماری تہذیب کا جزو ہے اور جو ہماری معاشرت میں قرآن مجید کے حکم کے مطابق داخل ہوئی ہے' وہ عورتوں کا دوپٹہ یا اوڑھنی ہے۔ ہماری معاشرت' ہماری تہذیب اور ہمارے تمدن کی اساسات کتاب اللہ میں موجود ہیں' اس کا تفصیلی ڈھانچہ جناب محمدٌ رسول اللہ ﷺ نے بنایا ہے' پھر وہ ہماری معاشرتی زندگی میں پیوست ہو گیا ہے۔ چنانچہ ہمارے یہاں دوپٹہ کا جو تصور اور استعمال ہے اس کا حکم بھی قرآن مجید میں موجود ہے۔ سورۃ النور میں فرمایا: ﴿وَلْیَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰی جُیُوْبِهِنَّ ۖ﴾ (آیت ۳۱) ''اور عورتیں اپنے سینوں پر اپنی چادروں کے آنچل ڈال لیا کریں''۔ یعنی بکل مار لیا کریں۔ چاہے کسی خاتون نے کرتا پہنا ہوا ہے اور وہ موٹا بھی ہے' ڈھیلا بھی ہے' اس سے جسم تو ڈھک گیا' لیکن ابھی مزید کی ضرورت ہے' اور وہ دوپٹہ یا اوڑھنی ہے جسے اوڑھ کر عورت کا سر' سینہ' کمر سب اچھی طرح ڈھک جائیں۔ اگرچہ اِس دَور میں مغربی تہذیب کے اثرات کی وجہ سے ہمارا تمدن اس اعتبار سے ایک مغلوبہ بن رہا ہے کہ کچھ اسلامی اقدار بھی موجود ہیں' کچھ مغربی اقدار بھی آ گئی ہیں اور اس میں کچھ ہندوانہ رسوم و رواج بھی شامل ہیں' ان سب کے امتزاج سے

ہمارے معاشرے میں فی الوقت ایک عجیب کھچڑی پکی ہوئی ہے۔ چنانچہ ہماری نوجوان لڑکیاں جس قسم کا دوپٹہ استعمال کرتی ہیں وہ اس حکم کے منشاء کو پورا نہیں کرتا' بلکہ اس کے بالکل خلاف ہے۔ یہ بات سمجھ لیجیے کہ یہ بات گھر میں بھی پسندیدہ نہیں ہے کہ نوجوان لڑکی کا سینہ بغیر دوپٹے کے ہو۔ کون نہیں جانتا کہ عورت کے جسم میں سب سے زیادہ جاذبِ نظر اس کا سینہ ہوتا ہے۔ لہٰذا حکم دیا جا رہا ہے کہ:
﴿وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ﴾ .

پھر اسی سورۃ النور کی آیت ۳۰ میں تمام اہل ایمان مردوں اور آیت ۳۱ کی ابتدا میں تمام مسلمان خواتین کو غضِ بصر کا حکم دیا جا رہا ہے۔ مَردوں کے لیے فرمایا: ﴿قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ﴾ (آیت ۳۰) ''(اے نبیؐ!) مؤمن مردوں سے کہہ دیجیے کہ اپنی نظریں نیچی رکھیں''۔ اسی طرح عورتوں کے لیے فرمایا: ﴿وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ﴾ (آیت ۳۱) ''اور (اے نبی!) مؤمن عورتوں سے کہہ دیجیے کہ وہ اپنی نظریں نیچی رکھیں''۔ ان آیات میں غضِ بصر سے مراد نگاہ بھر کر دیکھنے کی ممانعت ہے۔ یعنی مرد اپنی بیوی کے علاوہ کسی محرم خاتون کو بھی اور عورت اپنے شوہر کے علاوہ کسی محرم مرد کو بھی نگاہ بھر کر نہ دیکھے۔ جب محرموں کے نگاہ بھر کر دیکھنے کی ممانعت کی جا رہی ہے تو غیر محرموں کے لیے خود بخود اِس پابندی کا وزن بہت بڑھ جائے گا۔ چنانچہ اس قسم کی دیدہ بازی کو حدیث شریف میں آنکھ کے زنا سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ ایک طویل روایت میں ہے: ((اَلْعَيْنَانِ تَزْنِيَانِ وَزِنَاهُمَا النَّظَرُ)) ''آنکھیں زنا کرتی ہیں اور اُن کا زنا نظر بازی ہے''۔ ایک اور مشہور حدیث کا مفہوم ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے سرخیلِ اتقیاء حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ''اے علی! کسی نامحرم پر اچانک اور بلا ارادہ پہلی نگاہ کا پڑ جانا معاف ہے' لیکن ارادتاً دوسری نگاہ ڈالنا قابل مؤاخذہ ہے''۔

مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمارا فرض ہے کہ ہم دیکھیں کہ قرآن مجید ہمیں کیا احکام دے رہا ہے اور نبی اکرم ﷺ کی تعلیمات کیا ہیں۔ ان سب کے جو اثرات ہمارے تمدن پر مترتب ہوئے ہیں وہ بہت واضح ہیں۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ مسلمان عورت کا ساتر لباس کیسے وجود میں آیا؟ مسلمانوں کے گھروں کی تعمیر کا کیا مزاج بنا؟ آج کل کے کوٹھی نما طرزِ تعمیر کے وجود کو پچاس ساٹھ سال سے زیادہ عرصہ نہیں گزرا' ورنہ مسلمان چاہے امیر ہوتا تھا یا غریب' گھر خواہ بڑا ہوتا تھا خواہ چھوٹا' اس میں زنانہ اور مردانہ حصے علیحدہ علیحدہ ہوتے تھے۔ پہلے مردانہ حصہ آتا' پھر ڈیوڑھی ہوتی اور اس ڈیوڑھی سے آگے زنانہ حصہ ہوتا اور زنانہ حصے کے صحن کے چاروں طرف تعمیر ہوتی تھی۔ مسلمانوں نے اسلام کی تعلیمات کے زیر اثر اپنے تمدن میں

اس طرزِ تعمیر کو ترقی اور نشو ونما دی ہے۔ الغرض اسلام نے محرکاتِ زنا کے سدّ باب کے لیے بہت دُور رس اقدامات کیے ہیں۔ ان میں سے چند ایک کے بیان پر اکتفا کیا جا رہا ہے۔ ان پابندیوں اور قدغنوں کا مقصود یہی ہے کہ بدکاری کے قریب بھی نہ پھٹکا جائے۔ فرمایا جا رہا ہے: ﴿وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا ۝۳۲﴾ اس لیے کہ واقعہ یہ ہے کہ یہ بے حیائی کا کام تو ہے ہی‘ یہ ایک بہت برا راستہ بھی ہے‘ جس پر کوئی معاشرہ پڑ جائے تو وہ تباہ و برباد ہو جائے گا۔

اب غور کیجیے! اِس دَور میں ایک طرف تو فرائڈ کا نظریہ ہے‘ اور نفسیات کا کون سا طالب علم یہ نہیں جانتا کہ اس نے جنس کو کس قدر مؤثر عامل مانا ہے! اس کے فلسفہ کی رو سے اس کے انسانی زندگی کے تمام تفصیلی ڈھانچہ میں جنسی جذبہ کہیں نہ کہیں کارفرما ہے اور اس کے اثرات کم و بیش موجود ہیں۔ حد یہ ہے کہ اس کے فلسفہ کے مطابق اگر ایک باپ اپنی چھوٹی بچی کو پیار کرتا ہے اور ایک ماں اپنے چھوٹے بچے کو گود میں لے کر اس کو چومتی ہے تو وہ اس کا محرک بھی جنس کو قرار دیتا ہے۔ جبکہ دوسری طرف ہم اپنے آپ کو یہ کہہ کر دھوکہ دیتے ہیں کہ اسلام میں ستر وحجاب کی یہ پابندیاں اور قدغنیں شاید ثقافت‘ تہذیب اور تمدن کے اعتبار سے پس ماندہ لوگوں کے لیے ہوں گی۔ یہ ہمارا ایک علمی وفکری تضاد ہے۔ فرائڈ نے اپنے نظریہ کی بنیاد اپنے تجربات ومشاہدات پر رکھی ہے اور یہ یقیناً گمراہی ہے اور اس میں نہایت مبالغہ ہے۔ لیکن اگر اس کا دسواں حصہ بھی صحیح ہو تو جو نظام اسلام نے دیا ہے اس کے بغیر اس قسم کی برائیوں کی روک تھام ممکن نہیں ہے۔

یہ مثبت اقدامات کرنے کے بعد اب اسلام منفی قدم اٹھاتا ہے اور وہ ہے حدود وتعزیرات۔ ان پابندیوں اور قدغنوں کے باوجود اگر کوئی شخص گندگی میں مُنہ مارتا ہے‘ بدکاری میں ملوث ہوتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کی فطرت مسخ ہو چکی ہے‘ اس کے اندر گندگی گھر کر چکی ہے۔ لہٰذا ایسے شخص کے لیے سزا بہت سخت ہے۔ یعنی کوئی غیر شادی شدہ مرد یا عورت اس قبیح فعل میں ملوث ہو جائے تو اس کی سزا اسلام نے سو کوڑے رکھی ہے‘ جبکہ شادی شدہ مرد وعورت میں سے کوئی اس کا ارتکاب کرے تو اس کی سزا رجم یعنی سنگساری ہے۔ غیر شادی شدہ کے لیے عقل ومنطق کی رو سے کسی قدر رعایت کا معاملہ سمجھ میں آتا ہے‘ کیونکہ اس کے لیے اپنی جبلت کے منہ زور تقاضے کو پورا کرنے کا کوئی جائز راستہ موجود نہیں ہے‘ لہٰذا ایسا فرد غلط رخ پر پڑ گیا ہے تو کچھ نرمی کا مستحق ہے۔ چنانچہ ایسے افراد کے لیے سو کوڑوں کی سزا مقرر کی گئی۔ لیکن شادی شدہ مرد وعورت کے لیے رجم کی سزا ہے‘ جس کو دینی اصطلاح

میں ''حد'' کہا جاتا ہے' یعنی ایسے افراد کو برسرِ عام سنگسار کر دیا جائے۔

اس میں شبہ نہیں کہ رجم کی سزا بہت سخت سزا ہے' لیکن اس کی بے شمار حکمتیں ہیں۔ سب سے نمایاں حکمت تو یہ ہے کہ اس سزا سے پورا معاشرہ عبرت پکڑے اور اس قبیح فعل کے ارتکاب سے مجتنب رہے۔ دوسری حکمت یہ نظر آتی ہے کہ شادی شدہ جوڑے میں باہمی محبت و اعتماد کا رشتہ مضبوط رہے۔ تیسری حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ حسب و نسب میں خلل واقع نہ ہو۔ البتہ یہاں یہ بات ذہن نشین رکھنی ضروری ہے کہ زنا کی اتنی ہولناک سزا رکھنے کے ساتھ یہ شرط عائد کر دی گئی ہے کہ اس فعل قبیح کی شہادت دینے والے چار عینی گواہ موجود ہوں۔ ظاہر ہے کہ اس فعل کو اس طور پر انجام دینا کہ چار چشم دید گواہ بھی موجود ہوں' اس فعل کی شناعت و قباحت میں کئی گنا اضافہ کا باعث ہوتا ہے۔ یہ گویا معاشرے کے لیے سرطان کے پھوڑے کی مانند ہے' جس سے معاشرے کو محفوظ رکھنے کے لیے لازمی ہے کہ اس کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا جائے۔ یہ بات بھی نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ اسلام کی تاریخ میں رجم کی سزا اقراری مجرموں کو دی گئی ہے۔ یعنی ان افراد کو جن کے ضمیر نے اتنی ملامت کی کہ انہوں نے عذابِ اُخروی سے نجات پانے کے لیے اپنے اس گناہ کا اعتراف کر کے اس دنیا کی سزا قبول کر لی تاکہ وہ اس سزا کے بعد یہیں پاک ہو جائیں اور آخرت کی عقوبت سے بچ سکیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کے جملہ محرکات سے محفوظ و مامون رکھے۔ آمین!

قتلِ ناحق کی ممانعت

اگلا حکم ارشاد ہوا: ﴿وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ﴾ ''اور نہ قتل کرو اس جان کو جسے اللہ نے محترم ٹھہرایا ہے مگر حق کے ساتھ''۔ یہ الفاظ بڑے قابل غور ہیں۔ انسانی جان بہت محترم ہے۔ انسان کی جان کا ناحق لے لینا' خونِ ناحق بہانا' یہ بہت بڑا جرم ہے' بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ترتیب میں تو شرک کے بعد یہی آتا ہے' اس کے بعد زنا کا معاملہ آئے گا۔ اس لیے کہ تمدن کی اصل اساس اور جڑ تو یہی ہے۔ انسان کو جو متمدن حیوان اور gregarious animal کہا جاتا ہے تو اس کے تمدن کی جڑ یہی احترامِ جان ہے۔ اگر کسی معاشرے میں ایک دوسرے کی جان کا احترام ہی نہ رہے تو ظاہر بات ہے کہ گویا تمدن کی جڑوں پر کلہاڑا رکھ دیا گیا ہے۔ یہ وہ بات ہے جو سورۃ المائدۃ میں ہابیل اور قابیل کے واقعے کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمائی کہ: ﴿مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِی الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَا اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ﴾ (آیت ۳۲) ''جس کسی

نے ایک انسان کی جان بھی جان کے بدلے یا زمین میں فساد پھیلانے کے سوا (کسی اور وجہ سے) لی تو اس نے گویا پوری نوعِ انسانی کو قتل کر دیا' اور جس نے ایک انسان کو زندگی دی (اس کی جان بچائی) اس نے گویا پوری نوعِ انسانی کی جان بچائی''۔ اس لیے کہ حقیقتاً قتل ناحق انسانی تمدن کی جڑوں کو کاٹتا ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا کہ: ﴿وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰہُ﴾ ''جس جان کو اللہ نے محترم ٹھہرایا ہے اس کو قتل نہ کرو''۔

اس کے ساتھ ہی فرمایا: ﴿اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ﴾ یہاں استثناء بیان کر دیا گیا کہ ''مگر حق کے ساتھ۔'' اب یہ بہت اہم معاملہ ہے۔ ''بِالْحَقِّ'' سے مراد ہے ''قانون کے تحت'' جہاں کہیں حق واقع ہو جائے۔ اس حق کے واقع ہونے کی شریعت اسلامی نے چند صورتیں معین کر دی ہیں۔ قتل عمد کی سزا میں ایک صورت یہ ہے کہ قاتل کو قتل کیا جائے۔ اس سزا کی ایک دوسری متبادل صورت بھی ہے جو بعد میں عرض کی جائے گی۔ بہرحال قتلِ عمد کی سزا کے طور پر کسی قاتل کو قتل کر دینا ''اِلَّا بِالْحَقِّ'' کی پہلی صورت ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ (جیسا کہ پچھلی آیت کی وضاحت میں بیان کیا گیا) اگر کوئی شادی شدہ مرد یا عورت زنا کا ارتکاب کرے تو قانونِ اسلامی میں اس کی سزا بھی موت ہے' بلکہ بڑی بھیانک اور عبرت ناک موت' جس کو ہم رجم یعنی سنگسار کرنے سے تعبیر کرتے ہیں۔ تیسری صورت یہ ہے کہ اسلامی ریاست میں اگر کوئی مسلمان مرتد ہوتا ہے تو اس کی سزا بھی اسلامی قانون میں قتل ہے۔ اور چوتھی شکل ہے حربی کافر کا قتل' یعنی جس کے ساتھ اعلانِ جنگ ہو چکا ہو۔ کافر اگر ذِمی ہے تو وہ اسلامی ریاست کا شہری ہے' اسلامی ریاست نے اس کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے' اس کی جان بھی اتنی ہی محترم ہے جتنی کسی بھی مسلمان شہری کی۔ تو یہ چار صورتیں ہیں کسی انسان کی جان لینے کی جن کو شریعت اسلامی نے جائز اور صحیح قرار دیا ہے۔ انسانی جان کا احترام لازم ہے' انسانی تمدن کی یہی جڑ' بنیاد اور اساس ہے۔

اس کے بعد فرمایا: ﴿وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِیِّہٖ سُلْطٰنًا فَلَا یُسْرِفْ فِّی الْقَتْلِ﴾ (اور جو کوئی مظلومانہ قتل کیا جائے تو ہم نے اس کے ولی کو (قصاص کا) اختیار عطا فرمایا ہے' بس چاہیے کہ وہ قتل ہی میں حد سے نہ بڑھے''۔ جو شخص ناحق قتل ہوا ہے' یعنی بِالْحَقِّ قتل نہیں ہوا بلکہ قتل ناحق کا شکار ہوا ہے' اس کے ورثاء کو ہم نے ایک اختیار (سلطان) دیا ہے۔ سلطان کے معنی سند اور اختیار کے ہیں۔ بادشاہوں کی طرف سے اگر کوئی فرمان آتا ہے تو وہ بھی سلطان ہے۔ تو یہ سلطان اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس مقتول کے ورثاء کو حاصل ہوتا ہے جس کو ناحق قتل کیا گیا ہو۔ اس کے ولی اور

اس کے وارث کو قاتل کے سلسلے میں ایک اختیار حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ قاتل کی جان لے سکتا ہے۔ گویا کہ اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس ضمن میں مالک اور مختار بنا دیا جاتا ہے۔ شریعت اسلامی نے اسے یہ قانونی حق دیا ہے۔ قانون کی مشینری اور حکومت کا نظام صرف یہ کریں گے کہ قاتل کو پکڑیں گے۔ اس پر جرم کے اثبات اور ثبوت کے سلسلے میں ساری کارروائی حکومت کے ذمے ہے، لیکن آخری فیصلے کے معاملے میں مقتول کے ورثاء کو اختیار دیا گیا ہے کہ چاہے تو خون کے بدلے خون لیں، جان کے بدلے جان لیں، اور چاہیں تو جان بخشی کر دیں۔ اور اس کی بھی دو صورتیں ہیں، چاہیں تو احسان کریں اور بغیر کسی معاوضے کے معاف کر دیں اور چاہیں تو خون بہا قبول کر لیں۔ یہ بڑا حکیمانہ قانون ہے، اگرچہ ظاہر ہے کہ کسی قبائلی معاشرے میں اس کا جتنا scope تھا ہمارے جدید معاشرے میں اس کا سکوپ اتنا نہیں ہے۔ اس لیے کہ قبائلی نظام میں مقتول کے ورثاء کا تعین ہوتا ہے، یہ سارا معاملہ بالکل کھلا ہوتا ہے، لیکن یہاں اب ہماری شہری سوسائٹی میں تمدن کے اس مرحلہ میں کچھ معاملات اتنے واضح نہیں ہیں جتنے کہ اُس دَور میں ہوتے تھے۔ بہرحال اسلامی قانون میں یہ ایک امکان اور متبادل موجود ہے اور واقعتاً جان بخشی کی بڑی برکات ہیں۔ اس لیے کہ اس سے جو انتقامی قتل کا سلسلہ چلا کرتا ہے اس کے رکنے کے بڑے امکانات پیدا ہو جاتے ہیں۔ ایک تو واقعہ یہ ہے کہ مقتول کے ورثاء کے زخم پر گویا کہ مرہم رکھا جاتا ہے۔ انہیں اس وقت ایک عجیب تسکین ہوتی ہے جب انہیں یہ احساس ہو جائے کہ اب قاتل کی جان ہمارے ہاتھ میں ہے، ہم چاہیں تو بخشیں اور چاہیں تو اس کا خون بہا دیں۔ یہ اختیار حاصل ہو جانا زخمی دلوں کے لیے اپنے اندر مرہم کی تاثیر لیے ہوئے ہے۔ اور پھر یہ کہ اگر کسی مقتول کے ورثاء کی طرف سے اتنا بڑا معاملہ ہو جائے کہ قاتل کی جان اس کے قابو میں آنے کے بعد انہوں نے اس کو بخش دیا ہو تو یہ چیز معاشرے کے اندر بڑے صحت مند اور مثبت نتائج پیدا کرنے والی ہے۔ بجائے اس کے کہ دشمنی پر دشمنی اور قتل در قتل کا سلسلہ چلتا جائے، یہ چیزیں اس معاملے کے اندر بہت بہتر صورتِ حال سامنے لاتی ہیں۔ بہرحال یہ ہے قتل نفس کی شناعت اور اہمیت کہ یہ تین سب سے بڑے گناہوں میں سے ہے۔

اس قتل ناحق کے سلسلے میں مقتول کے ورثاء کو بھی ایک ہدایت دی گئی کہ: ﴿فَلَا یُسۡرِفۡ فِّی الۡقَتۡلِ ؕ﴾ کہ وہ قتل کے معاملے میں حد سے آگے نہ بڑھیں۔ اسراف فی القتل کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ اُس سوسائٹی میں مختلف قبائل مدعی تھے کہ ہماری عزت زیادہ ہے،

ہمارے ایک شخص کی جان کسی دوسرے قبیلے کے دو افراد کی جان کے برابر ہے' ہمارا اگر ایک قتل ہوا ہے تو اس قبیلے کے دو افراد قتل کیے جائیں گے۔ یہ اسراف فی القتل کی ایک صورت ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ قاتل کو مقتول کے ورثاء کے حوالے کر دیا جائے تو اب وہ خود اسے اذیتیں دے دے کر اور اس کے اعضاء کو ایک ایک کر کے کاٹ کر قتل کریں اور اسے پوری طرح اپنے انتقامی جذبے کا تختۂ مشق بنائیں۔ یا یہ کہ خون بہا لے لیا جائے لیکن پھر بھی دلی کدورت ختم نہ ہو' انتقامی جذبات پھر بھی موجود رہیں۔ یا یہ کہ قتل کے بدلے قتل بھی ہو گیا ہے پھر بھی جذبات ٹھنڈے نہیں ہو رہے اور مزید قتل کے لیے دل کے اندر عزائم اور ارادے پروان چڑھ رہے ہیں۔ یہ ساری صورتیں اسراف فی القتل کی ہیں۔ چنانچہ ﴿فَلَا یُسۡرِفۡ فِّی الۡقَتۡلِ ؕ﴾ کے زیر عنوان ان سب کا سدِّ باب کر دیا گیا۔ آگے فرمایا: ﴿اِنَّہٗ کَانَ مَنۡصُوۡرًا ﴿۳۳﴾﴾ ''یقیناً اس کی مدد کی جائے گی''۔ اسلامی معاشرہ مقتول کے ورثاء کو مدد دے گا کہ وہ اپنا قصاص اور انتقام حاصل کریں لیکن بہر حال ان کے لیے بھی کچھ حدود ہیں جن کا انہیں پابند ہونا ہے۔

مالِ یتیم کے بارے میں احتیاط کا حکم

اس کے بعد جو اخلاقی ہدایت کا سلسلہ شروع ہوا تو سب سے پہلی چیز آئی: ﴿وَلَا تَقۡرَبُوۡا مَالَ الۡیَتِیۡمِ﴾ ''اور یتیم کے مال کے قریب بھی نہ پھٹکو''۔ یہاں بھی وہی انداز ہے جو زنا کے بارے میں آیا کہ ﴿وَلَا تَقۡرَبُوا الزِّنٰۤی﴾ تو فرمایا: ﴿وَلَا تَقۡرَبُوۡا مَالَ الۡیَتِیۡمِ اِلَّا بِالَّتِیۡ ہِیَ اَحۡسَنُ﴾ ''اور یتیم کے مال کے قریب بھی نہ پھٹکو' سوائے اس (طور اور طریقے) کے جو بہت ہی اعلیٰ (اور بہت ہی عمدہ) ہو''۔ اس میں درحقیقت ہدایت دی جا رہی ہے اُس معاشرے کو جس میں یہ رواج تھا کہ ایک طرف تو وراثت کو سمیٹنے کی کوشش کی جاتی تھی اور متوفّی کا بڑا لڑکا یا بڑے لڑکے پوری کی پوری وراثت پر قابض ہو جاتے تھے۔ تعدّدِ ازدواج تو وہاں موجود تھا۔ اب ہوتا یہ تھا کہ ایک شخص نے ابھی چند سال ہوئے شادی کی ہے' اس کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں' اس کی پہلی شادی سے جوان اولاد موجود ہے' اب اس کا جو بھی ترکہ ہے اس پر وہ جوان بیٹے قابض ہو گئے ہیں اور اس کی نابالغ اولاد بالکل محروم ہو گئی ہے' بلکہ محتاج ہو کر معاشرے میں بھیک مانگنے پر مجبور ہو رہی ہے۔ یا یہ کہ کسی یتیم کا کوئی ولی اور سرپرست ہے اور مختلف بہانوں اور طریقوں سے یتیم کا مال ہڑپ کر رہا ہے۔ ایک دوسرے کے مال کو ساتھ ملا کر بظاہر تجارت میں یتیم کا مال شامل کر لیا گیا ہے' لیکن مختلف حیلوں بہانوں سے کوشش ہو رہی ہے کہ کسی طرح اس کے مال کو ہڑپ کر لیا جائے۔ تو یہاں اس پس منظر میں ایک بڑی ہی اہم ہدایت دی جا رہی

ہے کہ مالِ یتیم کو اپنے لیے مطلق حرام جانو' یوں سمجھو کہ یہ آگ ہے۔ جیسا کہ ایک جگہ قرآن مجید میں آیا بھی ہے کہ ﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ یَاۡکُلُوۡنَ اَمۡوَالَ الۡیَتٰمٰی ظُلۡمًا اِنَّمَا یَاۡکُلُوۡنَ فِیۡ بُطُوۡنِهِمۡ نَارًا ؕ﴾ (النساء:۱۰) ''یقیناً جو لوگ یتیموں کا مال ہڑپ کرتے ہیں ظلم کے ساتھ وہ اپنے پیٹوں میں آگ بھر رہے ہیں''۔ انہیں جاننا چاہیے کہ اس وقت تو یہ مال بڑا محبوب اور مرغوب نظر آ رہا ہے' لیکن آخرت میں یہ آگ کے انگارے بنیں گے۔ تو یہاں فرمایا کہ یتیم کے مال کے قریب نہ پھٹکو مگر بہت ہی اعلیٰ طریقے پر' احتیاط کے ساتھ' اس کی خیر خواہی کرتے ہوئے' اس کے مال کا اپنے آپ کو محافظ جانتے ہوئے۔ ﴿حَتّٰی یَبۡلُغَ اَشُدَّهٗ ۪﴾ ''یہاں تک کہ وہ اپنی جوانی کو پہنچ جائے''۔ اسے اپنے نفع اور نقصان کی خود سمجھ حاصل ہو جائے' اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی استعداد پیدا ہو جائے۔ تو اس صورت میں ظاہر بات ہے کہ وہ تمام مال اس کے حوالے کر دیا جائے گا۔

یہ مالِ یتیم کے سلسلے میں ابتدائی ہدایتیں ہیں۔ اور یہ بات قابل ذکر ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا قرآن کو سننے اور اسے پڑھنے کا انداز یہ تھا کہ جو احکام اس میں وارد ہوتے تھے وہ اُن پر آخری امکانی حد تک عمل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ چنانچہ بہت سے ایسے صحابہؓ 'جن کے زیر تربیت' زیر کفالت یا زیر سرپرستی کچھ یتیم تھے اور ان کا بھی کچھ مال تھا' انہوں نے اس سلسلے میں انتہائی احتیاط شروع کر دی۔ مثلاً کوئی یتیم ہے اور اس کا باغ ہے' کوئی یتیم ہے اور اس کا بھی کوئی بھیڑوں یا بکریوں کا گلہ ہے۔ اب ظاہر بات ہے کہ جو یتیم کا ولی اور سرپرست ہے وہی اس کی دیکھ بھال کر رہا ہے۔ تو یہاں تک کیا گیا کہ یتیم کی ہنڈیا اس کے مال میں سے علیحدہ پکے گی' تاکہ اس کا مال اور ہمارا مال کہیں مشترک ہانڈی میں جمع ہو کر گڈمڈ نہ ہو جائے اور مبادا اس کے مال میں سے کوئی بوٹی یا اس کے شوربے میں سے کوئی ایک دو چمچے ہمارے پیٹ میں چلے جائیں۔ اس معاملے میں جب انتہائی شدت اختیار کی گئی تب سورۃ البقرۃ میں حکم نازل ہوا کہ اللہ تعالیٰ یہ نہیں چاہتا' اللہ صرف یہ چاہتا ہے کہ احتیاط رکھو' محتاط ہو جاؤ' یتیم کا مال ہڑپ نہ کرو' اپنے آپ کو اس کا امین سمجھو۔ یہاں تک کہ پھر سورۃ النساء میں تفصیلی احکام آئے کہ جب وہ جوان ہو جائے تو اس کا مال اس کے حوالے کرو اور اس پر گواہ بناؤ کہ کیا مال تھا اور کس کس طریقے سے اس کے حوالے کر دیا گیا ہے۔ یہ بڑے تفصیلی احکام ہیں۔ یہاں پر اس کو بھی اسلام کے نظامِ معاشرت میں بڑی اہمیت کے ساتھ بیان کر دیا گیا۔

ایفائے عہد کی تاکید

اس کے بعد فرمایا: ﴿وَاَوۡفُوۡا بِالۡعَهۡدِ﴾ ''اور وعدے کو پورا کرو''۔ جب عہد کر لیا ہے تو اسے نبھاؤ' وعدہ ہوا ہے تو پورا کرو۔ اور یہاں اس میں تاکید کے لیے فرمایا گیا: ﴿اِنَّ الۡعَهۡدَ كَانَ مَسۡـُٔوۡلًا ۝۳۴﴾ ''یقیناً عہد کے بارے میں (خدا کے ہاں) باز پرس ہوگی''۔ یہ نہ سمجھو کہ یہ تو ہمارے آپس کے معاملات تھے' اللہ کو اس سے کیا تعلق۔ اللہ تو حساب لے اپنے روزوں کا اور اپنی نمازوں کا' اپنے احکام کا جو اس نے ہمیں دیے ہیں۔ اگر ہمارا کوئی معاملہ ہوا ہے اور اس میں اگر ہمارے باہمی معاملات میں اونچ نیچ ہوگئی ہے تو اس کا کوئی تعلق اللہ کے ساتھ نہیں ہے۔ یہ غلط فہمی ہے' بلکہ ﴿اِنَّ الۡعَهۡدَ كَانَ مَسۡـُٔوۡلًا ۝۳۴﴾ عہد کے بارے میں لوگوں کو جواب دہی کرنی ہوگی کہ کیا وعدہ کیا تھا اور اس کا ایفاء کیا یا نہیں کیا؟ اس کو پورا کیا یا نہیں کیا؟ یہ مضمون ہمارے اس منتخب نصاب میں بتکرار واعادہ آیا ہے۔ آیۂ برّ' جو اس منتخب نصاب کے حصہ اوّل ''جامع اسباق'' میں سے دوسرا ہی سبق تھا' میں بھی فرمایا گیا تھا کہ: ﴿وَالۡمُوۡفُوۡنَ بِعَهۡدِهِمۡ اِذَا عٰهَدُوۡا﴾ (البقرۃ:۱۷۷) ''اور اپنے عہد کے پورا کرنے والے جبکہ باہم کوئی معاہدہ کر لیں''۔ پھر سورۃ المؤمنون اور سورۃ المعارج کی آیات میں فرمایا: ﴿وَالَّذِيۡنَ هُمۡ لِاَمٰنٰتِهِمۡ وَعَهۡدِهِمۡ رٰعُوۡنَ ۝﴾ (المؤمنون:۸' المعارج:۳۲) ''اور وہ لوگ کہ جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کی رعایت کرنے والے ہیں'' یعنی حفاظت کرنے والے ہیں۔

عہد کے بارے میں نبی اکرم ﷺ نے تو یہ فتویٰ صادر فرمایا ہے: ((لَا دِيۡنَ لِمَنۡ لَّا عَهۡدَ لَهٗ)) ''جس میں عہد کا پاس نہیں (ایفائے عہد کا مادہ نہیں) اس کا کوئی دین نہیں''۔ اس لیے کہ تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ دین بھی ایک معاہدہ ہے بندے اور ربّ کے درمیان۔ ﴿اِيَّاكَ نَعۡبُدُ وَاِيَّاكَ نَسۡتَعِيۡنُ ۝﴾ کے متعلق سورۃ الفاتحہ کے ضمن میں عرض کیا جا چکا ہے کہ یہ ایک بہت بڑا قول وقرار ہے' ایک بہت بڑا معاہدہ ہے' جو پوری زندگی پر پھیلا ہوا ہے۔ اس معاہدے کو کیسے نبھاؤ گے اگر چھوٹے چھوٹے وعدے پورے نہیں کر سکتے؟ اگر ایک پیسے میں خیانت کا ارتکاب کر رہے ہو تو ایک کروڑ میں تمہاری امانت پر کیسے اعتماد کیا جائے گا؟ نبی اکرم ﷺ آغازِ وحی سے پہلے کاروبار کرتے تھے' لیکن اس تجارت کے میدان میں آپ ﷺ نے اپنی شخصیت اور سیرت و کردار کا لوہا منوایا۔ آپؐ کہیں معاشرے سے کٹے ہوئے کسی راہب کی خانقاہ اور درگاہ میں زیر تربیت نہیں رہے' بلکہ آپؐ نے زندگی کی منجدھار میں' معاشرے اور سماج کے عین بیچوں بیچ اپنی زندگی بھرپور طریقے سے بسر کی ہے۔ آپؐ

نے نوجوانی کے عالم میں بھیڑیں اور بکریاں بھی چرائیں۔اسی پر علامہ اقبال نے کہا ہے ع ''شبانی سے کلیمی دو قدم ہے!'' یہ وہ کام ہے جو تمام انبیاء کرام علیہم السلام نے کیا' محمدٌ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی کیا' اس لیے کہ فطرت سے قریب تر ہونے میں اس کو بڑا دخل ہے۔اس کے بعد آپؐ نے عمدہ ترین سطح پر تجارت کی۔ایک واقعہ آتا ہے کہ ایک شخص سے کوئی کاروباری گفتگو ہو رہی تھی' ابھی معاہدہ اپنی تکمیلی شکل کو نہیں پہنچا تھا کہ اچانک اسے کوئی کام یاد آ گیا۔اس نے کہا آپؐ یہاں میرا انتظار کیجیے' میں ابھی آیا۔نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہاں تم ہو آؤ میں تمہارا انتظار یہیں کروں گا۔وہ شخص چلا گیا اور بعد میں بھول گیا۔حدیث میں الفاظ آتے ہیں: ''بَعْدَ ثَلَاثٍ '' کہ تین کے بعد اسے یاد آیا۔اب اندازہ یہی ہے جو اکثر شارحینِ حدیث نے کہا کہ ''بَعْدَ ثَلَاثَةِ اَيَّامٍ '' یعنی تین دن کے بعد یاد آیا۔اس کے بعد وہ دوڑتا ہوا' ہانپتا ہوا آیا تو اس نے دیکھا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم وہیں موجود ہیں۔آپؐ نے فرمایا: ''تو نے مجھے مشقت میں ڈال دیا۔جب اس نے معذرت کی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بہرحال میں اپنے عہد کا پابند تھا' میں تمہیں زبان دے چکا تھا کہ میں یہاں انتظار کروں گا' لہٰذا میں یہاں موجود رہا۔

اسی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((عِدَةُ الْمُؤْمِنِ كَاَخْذِ الْكَفِّ)) یعنی ''مؤمن کا وعدہ تو ایسے ہے جیسے ہاتھ پکڑ لیا گیا ہو''۔اب وہ اس طرح اپنے آپ کو بندھا ہوا محسوس کرتا ہے جیسے کسی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا ہو' اسے جکڑ لیا ہو۔یہ ہے وہ نفسیاتی احساس اور کیفیت جس کی شدت کو انسان اپنے باطن میں محسوس کرے کہ میں زبان دے چکا ہوں' بات ہو چکی ہے' قول وقرار ہو گیا ہے۔غور کیجیے کہ کسی معاشرے میں اور خاص طور پر کاروبار' لین دین' بیع وشراء اور تجارت میں' اور اس کی پھر جتنی بھی زیادہ ترقی یافتہ اور پیچیدہ صورتیں ہیں' ان سب میں اصل چیز یہی ایفائے عہد ہے۔بلکہ اس سے معاشرے کے نہ معلوم کتنے پہلوؤں میں اصلاحِ احوال اور streamlining کی کیفیت ہو جائے گی' بالکل overhauling کا انداز ہو جائے گا۔اگر کسی معاشرے میں ایفائے عہد کا رواج ہو جائے اور لوگ واقعتاً اپنے وعدوں کی پابندی کریں اور اس میں جانبین کو یہ اعتماد ہو کہ جو بات ہو رہی ہے وہ یونہی پوری ہو گی تو اندازہ کیجیے کہ اس معاشرے میں کتنا سکون واطمینان ہو گا اور کتنا کچھ خرچ جو خواہ مخواہ احتیاطی تدابیر کرنے پر ہوتا ہے' وہ نہ ہو گا۔مثلاً کہیں چار مزدور کام کر رہے ہیں تو ان پر ایک سپروائزر کھڑا کیا جاتا ہے اور ان سپروائزروں پر ایک مزید سپروائزر کی ضرورت ہوتی ہے۔یہ سارے غیر ترقیاتی اخراجات ختم ہو سکتے ہیں اگر یہ اطمینان ہو کہ مزدور اپنے اس عہد میں بندھا ہوا کام

کرے گا کہ میں نے جو آٹھ گھنٹے کام کرنا طے کیا ہے یہ مجھ پر واجب اور لازم ہے اور اپنی پوری قوتوں کو اس پر انڈیل دینا میرا فرض ہے' اس لیے کہ اس کے بغیر جو اجرت میں لوں گا وہ میرے لیے جائز اور حلال نہ ہو سکے گی' تو اندازہ کیجیے کہ واقعتاً سارے انسانی معاملات کے لیے ایفائے عہد ایک بڑی ہی بنیادی اہمیت کی حامل چیز ہے۔

ناپ تول کو پورا کرنے کی تاکید

ان اوامر ونواہی یعنی do's & dont's کے سلسلے میں اگلا حکم ہے: ﴿وَاَوۡفُوا الۡکَیۡلَ اِذَا کِلۡتُمۡ وَزِنُوۡا بِالۡقِسۡطَاسِ الۡمُسۡتَقِیۡمِ ؕ﴾ ''اور جب تم ناپو تو پیمانہ پورا کرو اور جب تولو تو سیدھی ڈنڈی کے ساتھ تولو''۔ ﴿ذٰلِکَ خَیۡرٌ وَّ اَحۡسَنُ تَاۡوِیۡلًا ﴿۳۵﴾﴾ ''یہی بہتر طرزِ عمل ہے اور انجام کار کے اعتبار سے بھی عمدہ ہے''۔ یہ گویا کسی معاشرے میں لینے اور دینے کے باٹ برابر رکھنے کی تاکید ہے۔ اگرچہ اس کا اطلاق وسیع تر پیمانے پر بھی ہوسکتا ہے کہ انسان لینے اور دینے کے پیمانے برابر رکھے اور جن معیارات پر وہ دوسروں کو پرکھتا ہے انہی پر وہ اپنے آپ کو بھی پرکھے' جس ترازو سے وہ دوسروں کو تولتا ہے اسی سے اپنے آپ کو تولے' جس پیمانے سے اپنے آپ کو ناپ رہا ہے اسی سے دوسروں کو ناپے' لیکن یہاں تعین کے طور پر ہمارے انسانی معاشرے میں کاروباری لین دین اور exchange کا جو سلسلہ چلتا ہے اس کے ضمن میں یہ بنیادی ہدایت دی جارہی ہے کہ جب ناپ کر دو تو پیمانہ پورا کرو اور جب تول کر دو تو سیدھی ڈنڈی کے ساتھ تولو۔

قرآن مجید کی بالکل ابتدائی سورتوں میں بھی اس سماجی برائی یعنی ذراسی ڈنڈی مار لینے اور ناپ تول کے اندر کچھ کمی کر دینے پر بڑی خوبصورتی کے ساتھ گرفت کی گئی ہے۔ سورۃ المُطَفِّفین کا آغاز ہی ان آیات سے ہوتا ہے: ﴿وَیۡلٌ لِّلۡمُطَفِّفِیۡنَ ﴿۱﴾ الَّذِیۡنَ اِذَا اکۡتَالُوۡا عَلَی النَّاسِ یَسۡتَوۡفُوۡنَ ﴿۲﴾ وَ اِذَا کَالُوۡہُمۡ اَوۡ وَّزَنُوۡہُمۡ یُخۡسِرُوۡنَ ﴿۳﴾﴾ ''ہلاکت (بربادی' تباہی) ہے اُن مُطفِّفین (ڈنڈی مارنے والوں) کے لیے کہ جب لوگوں سے ناپ کر لیتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں اور جب اُن کو ناپ کر یا تول کر دیتے ہیں تو کمی کر دیتے ہیں''۔ عربی زبان میں ''طفّ'' کہتے ہیں کسی بہت حقیر سی شے کو۔ یہاں پر بڑا بلیغ پیرایۂ بیان ہے کہ ڈنڈی تھوڑی سی مار لو گے' سیر میں آدھی چھٹانک' چھٹانک' تولہ' دو تولہ کی کمی کر لو گے۔ یہ نہایت حقیر اور چھوٹی بات ہے جس کے لیے تم نے اپنی دیانت اور امانت کا سودا کیا۔ اس کے بعد فرمایا کہ اس کا براہِ راست تعلق ایمان بالآخرۃ سے ہے۔ گویا تل کی اوٹ میں پہاڑ ہے۔ تجزیہ

تو کرو‘ یہ ہاتھ کی ذراسی جنبش بتا رہی ہے‘ تمہارا ڈنڈی مارنے کا یہ تھوڑا سا عمل اس بات کی پوری غمازی کر رہا ہے کہ تمہیں آخرت کا یقین نہیں‘ جزاء و سزا کا یقین نہیں‘ خدا کے حاضر و ناظر ہونے کا یقین نہیں‘ خدا کے ’’بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ‘‘ ہونے کا یقین نہیں‘ یا خدا کی ہستی کا ہی یقین نہیں۔ بہر حال ایمان کا معاملہ عمل کے ساتھ جس قدر گہرا ربط لیے ہوئے ہے اس کی طرف یہاں اشارہ کر دیا گیا: ﴿اَلَا یَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ ۝۴ لِیَوْمٍ عَظِیْمٍ ۝۵ یَّوْمَ یَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝۶﴾ ’’کیا انہیں یہ گمان نہیں ہے کہ انہیں اٹھایا جائے گا اُس بڑے دن جس دن لوگ اپنے ربّ العالمین کے حضور کھڑے ہوں گے؟‘‘

یہ ہے وہ بات جس کو یہاں دہرایا گیا کہ اپنے پیمانے پورے کیا کرو‘ تولتے ہوئے ڈنڈی سیدھی رکھا کرو۔ فرمایا: ﴿ذٰلِكَ خَیْرٌ﴾ ’’یہ خیر ہے‘‘۔ اس میں بھی ایک اعتماد کی فضا پیدا ہوتی ہے۔ ایسا نہیں کہ ہر شخص دوسرے کو چور سمجھے اور اس طرح ڈرتے ہوئے اور چوکس و چوکنا رہ کر اس سے معاملہ کرے۔ اس سے معاشرے کے اندر ایک عجیب کیفیت پیدا ہوتی ہے کہ ہر شخص دوسرے کو چور‘ خائن اور بددیانت سمجھ رہا ہے۔ اسے یہ اندیشہ ہے کہ ابھی کہیں ڈنڈی مار لی جائے گی‘ ابھی کہیں ناپ تول میں کمی کر دی جائے گی‘ ابھی کہیں میری جیب کاٹ لی جائے گی‘ مجھ پر کوئی ڈاکہ ڈال دیا جائے گا۔ چنانچہ ناپ تول پورا رکھنے سے ایک طرف تو معاشرے میں اعتماد اور حسنِ ظن کی فضا ہوتی ہے۔ اور فرمایا: ﴿وَّاَحْسَنُ تَاْوِیْلًا ۝۳۵﴾ ’’اور انجام کار کے اعتبار سے بھی یہ طرزِ عمل بہت خوب ہے‘‘۔ تم سمجھتے ہو کہ ناپ تول میں کمی کر کے تم نے کچھ بچایا ہے اور چند سکّوں کی صورت میں زیادہ نفع کمایا ہے‘ حالانکہ ایسا نہیں‘ بلکہ تم مجرم ضمیر لیے ہوئے گھر کو لوٹے ہو۔ حقیقت میں خیر یہ نہیں‘ بلکہ خیر تو یہ ہے کہ پورے مطمئن قلب کے ساتھ اپنے گھروں کو لوٹو۔ اللہ تعالیٰ رازق ہے‘ تمہارا رزق اس کے ذمے ہے‘ وہ رزق تمہیں بہر طور بہم پہنچائے گا۔

توہمات کی روک تھام

آگے ایک بڑی اہم بات آ رہی ہے‘ اور واقعہ یہ ہے کہ کسی مسلمان معاشرے میں یہ ہدایت بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ: ﴿وَلَا تَقْفُ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ﴾ ’’اور اس چیز کے پیچھے نہ پڑو جس کے لیے تمہارے پاس کوئی علم نہیں ہے‘‘۔ حکم دیا جا رہا ہے اتباعِ علم کا‘ یعنی پیروی کرو علم کی۔ اب ظاہر بات ہے کہ علم یا تو بالحواس ہے۔ ہم نے آنکھوں اور کانوں سے جو کچھ دیکھا اور سنا اس کی بنیاد پر ہم نے کوئی رائے قائم کی‘ یہ علم ہے۔ علم کا دوسرا دائرہ علم بالعقل ہے۔ انسان سمع و بصر سے حاصل شدہ

معلومات کا اپنے ذہن میں تجزیہ کرتا ہے‘ اس سے استنتاج کرتا ہے‘ نتائج اخذ کرتا ہے‘ ان کو جوڑ کر ان سے کچھ حاصل کرتا ہے‘ یہ انسان کے ذہن کے تفقہ اور تعقّل کا عمل ہے۔ یہ علم بالعقل ہے۔ مزید برآں اسلام ایک اور ذریعۂ علم کو بھی تسلیم کرتا ہے اور اسے علم کے ان دونوں سرچشموں (علم بالحواس اور علم بالعقل) سے بالاتر‘ زیادہ قابلِ اعتماد‘ زیادہ یقینی اور زیادہ وثوق و اعتماد کے قابل قرار دیتا ہے‘ اور وہ ہے علم بالوحی۔ بہرحال ذرائع علم یہی تین ہیں اور انہی سے حاصل شدہ معلومات ’’علم‘‘ کا درجہ رکھتی ہیں۔ ان ذرائع سے حاصل ہونے والی معلومات کے علاوہ جو کچھ بھی ہے وہ ظن اور قیاس ہے‘ وہ اٹکل پچو ہے‘ وہ تخمینے ہیں‘ وہ occult sciences کا ایک دائرہ ہے۔ کہیں ہاتھ کی لکیریں لیے بیٹھے ہو‘ کہیں ستاروں کی چال کے زائچے بنا رہے ہو۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ انسان کو ان تمام چیزوں سے‘ ان تمام توہمات سے‘ ان تمام تخمینات سے بالکل آزاد کر کے اس کے موقف کی بنیاد اور اس کے عمل کی اساس علم پر قائم کرے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ انسان کے تمدن اور اس کے علمی اور سائنٹیفک ارتقاء کے لیے ایک بڑی ہی اہم ہدایت تھی۔ اور یہ بات تسلیم کی گئی ہے‘ مستشرقین نے بھی مانا ہے‘ مغربی مفکرین بھی تسلیم کرتے ہیں کہ حقیقتاً دنیا میں توہمات کو ختم کرنے والا اور انسان کے عمل کو علم کی بنیاد پر استوار کرنے والا قرآن مجید ہے۔ زلزلے کے بارے میں ایک قدیم تصور یہ تھا کہ کوئی گائے ہے جس کے سینگوں پر یہ زمین رکھی ہوئی ہے‘ جب وہ وزن ایک سینگ سے دوسرے سینگ پر منتقل کرتی ہے تو زلزلہ آ جاتا ہے۔ اس کی کیا دلیل ہے؟ کیا سند ہے؟ کس بنیاد پر یہ بات کہی جا رہی ہے؟ جب اس کی سند نہیں تو رد کر دو یا پھر سند لاؤ۔ جیسا کہ امام احمد بن حنبلؒ نے فرمایا تھا: ’’اِیْتُوْنِیْ بِشَیْءٍ مِنْ کِتَابِ اللّٰہِ وَسُنَّۃِ رَسُوْلِہٖ حَتّٰی اَقُوْلَ‘‘۔ اگر کوئی چیز ماوراءِ عقل ہے یا ماوراءِ حس ہے تو اس کے لیے کوئی سند اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کے فرمودات سے لاؤ‘ ہم مان لیں گے۔ لیکن اگر نہ وہ سمع و بصر کی گرفت میں آنے والی شے ہو‘ نہ ہمارے حواس اس کی تصدیق کر سکتے ہوں‘ نہ وہ ہماری عقل کی میزان میں کسی طور سے پوری اترتی ہو اور نہ وحی کے علم میں اس کے لیے کوئی اساس اور بنیاد موجود ہو‘ چاہے وہ وحی متلو ہو یا وحی غیر متلو‘ یعنی چاہے وہ قرآن ہو یا فرمودۂ نبی ﷺ ہو‘ ان سب سے باہر کسی بات کو تسلیم کرنے کے لیے ہم تیار نہیں۔ یہ نقطۂ نظر اور انداز ہے جس سے سائنس کے سفر کا آغاز ہوا ہے۔ اور یہ مانا گیا ہے کہ منطق استقرائی (inductive logic) کے موجد مسلمان ہیں اور اس کی طرف متوجہ کرنے والا قرآن ہے: ؎

کھول آنکھ' زمیں دیکھ' فلک دیکھ' فضا دیکھ!
مشرق سے اُبھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ!!

قرآن اپنے قاری کو متوجہ کرتا ہے کہ یہ آیاتِ الٰہیہ ہیں' ان کو دیکھو اور ان کی مدد سے نتائج اخذ کرو' استقراء سے کام لو' جو سائنس کی بنیاد ہے۔

اسلام سے قبل علم کی بنیاد ارسطو کی استخراجی منطق (deductive logic) پر تھی' اسی پر سارا دار و مدار تھا' اسی سے گتھیوں پر گتھیاں بن بھی رہی تھیں اور سلجھ بھی رہی تھیں' بلکہ واقعہ یہ ہے کہ سلجھتی کم' اُلجھتی زیادہ تھیں۔ لیکن اسلام نے آ کر انسان کو اس منطق کی تنگ نائے سے نکالا اور اسے استخراج (deduction) کی بجائے استقراء (induction) کی طرف متوجہ کیا۔ دیکھئے' کس قدر عمدہ پیرایہ بیان ہے: ﴿اِنَّ السَّمۡعَ وَالۡبَصَرَ وَالۡفُؤَادَ کُلُّ اُولٰٓئِکَ کَانَ عَنۡہُ مَسۡـُٔوۡلًا ﴿۳۶﴾﴾ ''یقیناً کان اور آنکھ اور دل' ان سب کی اس سے باز پرس ہوگی''۔ تمہیں یہ استعدادات اللہ نے کیوں عطا کی ہیں؟ سماعت دی ہے تاکہ سنو' بصارت دی ہے تاکہ دیکھو' اور تمہارے اندر تفکر و تعقل کی قوتیں رکھی ہیں تاکہ غور و فکر اور سوچ بچار کرو۔ تمہیں استنباط' استدلال اور استنتاج کی صلاحیتیں عطا کی گئی ہیں۔ ان سب کے بارے میں تم سے باز پرس ہوگی کہ انہیں معطل کر کے رکھ چھوڑا تھا اور توہمات پر اپنے موقف کی بنیاد رکھی تھی یا ان قوتوں اور استعدادات کو استعمال کیا تھا؟ یہ اللہ کی امانتیں ہیں' اللہ کی نعمتیں ہیں' ان کا استعمال کرو۔ ان کے بارے میں تم سے باز پرس ہوگی' محاسبہ ہوگا' پوچھ گچھ ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ساری نجومیوں کے انداز میں پیشین گوئیاں' یہ دست شناسی اور اسی نوع کے سارے معاملات' منجموں کے حساب کتاب اور زائچوں کی تیاری' ان کی اسلامی تمدن اور اسلامی تہذیب میں کوئی جگہ نہیں۔ نبی اکرم ﷺ نے یہاں تک ارشاد فرمایا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی منجم یا کسی پیشین گوئی کرنے والے کی پیشین گوئی کی تصدیق کرتا ہے تو اس نے اس کی تکذیب کی جو میں لایا ہوں۔ یعنی میری لائی ہوئی تعلیم کچھ اور ہے' اس کی بنیاد علم پر ہے' وہ علم بالحواس بھی ہے' علم بالعقل بھی ہے اور علم بالوحی بھی ہے' چنانچہ فرمایا: ﴿وَلَا تَقۡفُ مَا لَیۡسَ لَکَ بِہٖ عِلۡمٌ ؕ اِنَّ السَّمۡعَ وَالۡبَصَرَ وَالۡفُؤَادَ کُلُّ اُولٰٓئِکَ کَانَ عَنۡہُ مَسۡـُٔوۡلًا ﴿۳۶﴾﴾ یعنی اس چیز کے پیچھے نہ پڑو جس کے لیے تمہارے پاس کوئی علم نہیں' جسے تم verify نہیں کر سکتے۔ ہاں ایسی چیزوں کا ایک دائرہ عالم غیب کے امور پر مشتمل ہے جو تمہارے حواس اور تمہاری عقل سے ماوراء ہیں' ان کی verification کے تم پابند نہیں ہو۔

لیکن ان کے ضمن میں جو قابل اعتماد ذریعہ ہے وہ وحی ہے۔ اس سے باہر جس چیز کے لیے کوئی علمی بنیاد نہ ہو اُس پر اپنا موقف قائم نہ کرو!

تمکنت اور تکبر کی ممانعت

اس سلسلے میں آخری بات یہ فرمائی گئی: ﴿وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا﴾ ''اور زمین میں اکڑ کر مت چلو''۔ سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع کے آخر میں بھی آیا تھا: ﴿وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا﴾ (آیت ۱۸) ''اور لوگوں کے لیے گال مت پھلا (اُن سے منہ پھیر کر بات مت کر) اور نہ زمین میں اکڑ کر چل''۔ دراصل رذائلِ نفس میں سے سب سے آخر میں انسان کا پیچھا چھوڑنے والی چیز تکبر ہے اور آخری چیز جو انسان کو محاسنِ اخلاق میں سے میسر آتی ہے وہ تواضع ہے' جو انسانی شخصیت کی پختگی کی سب سے نمایاں علامت ہے۔ لہٰذا سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع کے آخر میں بھی اس کا ذکر تھا اور یہاں بھی۔ اتنی کچھ اخلاقی' معاشرتی اور معاشی معاملات میں ہدایات دینے کے بعد اَب فرمایا: ﴿وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا﴾ ''اور زمین میں اکڑ کر نہ چلو''۔ سورۂ لقمٰن میں تو اس کے لیے الفاظ آئے تھے: ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ۝۱۸﴾ ''اللہ کی خود پسند اور فخر جتانے والے کو یقیناً پسند نہیں فرماتا''۔ کیسا دل میں اتر جانے والا انداز ہے کہ تمہارے ربّ کو یہ پسند نہیں' وہ اکڑنے والوں' شیخی خوروں' چال میں تمکنت پیدا کرنے والوں سے محبت نہیں کرتا' انہیں پسند نہیں کرتا۔ یہاں ایک دوسرے رُخ سے بات کی گئی ہے کہ چاہے کتنا اکڑ لو' کتنا پاؤں مار کر چلو' کتنے ہی دندناتے ہوئے چلنے کی کوشش کرو' تم ہماری زمین کو پھاڑ نہیں سکتے۔ ہماری مخلوقات بڑی عظیم ہیں' ہماری یہ کائنات اور اس کی وسعتیں تمہارے تصور اور تخیل سے بھی ماوراء ہیں۔ تم کتنی گردنیں اکڑا لو' کتنے ہی اونچے طرے لگا لو بہرحال تم پہاڑوں کی بلندی کو نہیں پہنچ سکتے۔ ﴿اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا ۝۳۷﴾ ''تم ہرگز نہ زمین کو پھاڑ سکو گے اور ہرگز نہ بلندی میں پہاڑوں کو پہنچ پاؤ گے''۔

بندۂ مؤمن کے لیے آخری دلیل

پھر فرمایا: ﴿كُلُّ ذٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهٗ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوْهًا ۝۳۸﴾ ''ان میں سے ہر ایک کا برا پہلو تیرے رب کے نزدیک ناپسندیدہ ہے''۔ وہی ترغیب (persuation) کا انداز ہے۔ اگر کوئی شخص خدا کو مانتا ہو تو اس کی ترغیب کے لیے آخری بات یہی ہوگی کہ یہ چیز خدا کو پسند نہیں ہے۔ اگر اپنے

ربّ پر یقین اور ایمان ہے' اگر اس سے محبت ہے اور اگر اس کی رضا جوئی تمہاری زندگی کا نصب العین بن چکی ہے یہ تو جان لو کہ یہ چیزیں تمہارے ربّ کو ناپسند ہیں۔ یہاں اوامر بھی زیر بحث آئے اور نواہی بھی' حکم بھی دیے گئے اور روکا بھی گیا کہ یہ کرو اور یہ نہ کرو' اللہ کے سوا کسی اور کی پرستش نہ کرو' والدین کے ساتھ حسن سلوک سے کام لو' قرابت داروں کو اُن کا حق ادا کرو اور اگر کہیں مجبوراً ان سے اعراض کرنا ہی پڑ جائے تو ان سے نرمی کی بات کرو' اپنے ہاتھ کو نہ گردن سے باندھ لو نہ بالکل کھلا چھوڑ دو' میانہ روی اختیار کرو' ناحق قتل نہ کرو' زنا کے قریب نہ پھٹکو۔ تو چونکہ یہاں اوامر بھی آئے اور نواہی بھی آئے' do's بھی ہیں اور dont's بھی ہیں کہ یہ کرو یہ نہ کرو' اس لیے فرمایا: ﴿كُلُّ ذٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهٗ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوْهًا ﴿٣٨﴾﴾ کہ یہ جو کچھ بیان ہوا ہے اس میں جو مکروہات ہیں وہ تیرے ربّ کو بہت ہی ناپسند ہیں' تیرا ربّ ان کو بالکل پسند نہیں کرتا۔ جیسا کہ عرض کیا گیا کہ بندۂ مؤمن کے لیے یہ آخری دلیل ہے۔ اب اس کے بعد اس سے قوی تر کوئی اور دلیل ممکن نہیں۔

حکمت و دانائی کی حقیقت

آگے فرمایا: ﴿ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ؕ﴾ ''(اے محمدؐ!) یہ وہ حکمت کی باتیں ہیں جو تیرے ربّ نے تجھ پر وحی کی ہیں''۔ بڑے پیارے الفاظ ہیں کہ اے محمد ﷺ! یہ حکمت ہے' یہ دانائی ہے' یہ wisdom ہے جو آپؐ کے ربّ نے آپؐ پر وحی کی ہے۔ لفظ ''حکمت'' کو سمجھنے کے ضمن میں یہ مقام بڑا اہم ہے۔ بعض حضرات نے قرآن مجید کی اُن آیات کی' جن میں نبی اکرم ﷺ کے فرائض چہارگانہ کا بیان الفاظ ذکر ہے: ﴿يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾ 'تفسیر اس طور سے کی ہے کہ کتاب سے مراد قرآن اور حکمت سے مراد سنّت رسولؐ یا احادیثِ رسولؐ لی ہیں۔ اس خیال کی قرآن مجید کے اس مقام کے حوالے سے تصحیح ضروری ہے۔ قرآن مجید میں احکام بھی ہیں اور قوانین کا بیان بھی ہے' شریعت اور فقہ بھی ہے اور قرآن مجید ہی میں حکمت و دانائی (wisdom) بھی ہے۔ یہ خود قرآن مجید ہی کے دو رُخ (aspects) ہیں' ایک طرف قانون ہے اور ایک طرف اس قانون کی پشت پر کارفرما دانائی ہے۔ ایک طرف حکم ہے تو دوسری طرف اس حکم کی بنیاد جس حکمت پر قائم ہے' اس کا بیان ہے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع کا اس درس کے دوران بار بار حوالہ آیا

ہے۔ یہ مشابہت اس لفظ حکمت میں بھی موجود ہے۔ وہاں آغاز ہوا تھا: ﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ ۭ وَمَنْ يَّشْكُرْ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ﴾ (آیت ۱۲) ''اور ہم نے لقمان کو حکمت عطا کی تھی کہ شکر کرو اللہ کا اور جو کوئی شکر کرے تو شکر کرتا ہے اپنی ہی (فائدے کے) لیے''۔ وہاں نقطۂ آغاز حکمت تھا' جبکہ یہاں اس پوری بحث کا اختتام حکمت کے ذکر پر ہو رہا ہے۔ بایں الفاظ: ﴿ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ۭ﴾ یعنی یہ ہیں وہ باتیں' وہ ہدایات' وہ اوامر و نواہی اور ان کی تعلیم جو کہ تیرے ربّ نے وحی کی ہیں اے محمد ﷺ آپ پر از قسمِ حکمت۔

حرفِ آخر: توحید فی الالوہیت

اس سب کا لبِّ لباب اور حاصل کیا ہے؟ — یہ آخری بات "last but not the least" کے درجے میں فرما دی گئی: ﴿وَلَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰـهًا اٰخَرَ﴾ اللہ کے ساتھ کوئی اور الٰہ نہ بنا لینا''۔ یہ وہی بات ہے جو ہمارے کلمۂ طیبہ کا جزوِ اوّل ہے: ''لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ ''۔ پس اللہ کے سوا کسی کو معبود نہ ٹھہرا لینا' اللہ کے سوا کسی اور کو الوہیت کا حامل نہ مان بیٹھنا۔ اللہ ہی الٰہ واحد ہے' وہی مطاعِ مطلق ہے' وہی محبوبِ حقیقی ہے۔

''اِلٰہ'' کے لفظ کی تفصیل ہمارے اس منتخب نصاب میں پہلے کہیں نہیں آئی۔ یہ عجیب لفظ ہے۔ اس کے حروفِ اصلی میں' جو اس کا مادہ ہیں' اور پھر اس کے بنیادی لغوی مفاہیم کے اندر جامعیت کا عجیب رنگ ہے۔ ''الـہ'' کا مادہ عربی زبان میں کئی معنوں میں آتا ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے: ''اَلَـہَ الـفـصـيـلُ اِلٰی اُمِّہٖ ''۔ یعنی اونٹنی کا وہ بچہ جو ماں سے دور کہیں باندھ دیا گیا ہو' جب اسے موقع ملتا ہے تو وہ اپنی ماں کی طرف لپکتا ہے۔ اس مفہوم سے یہ لفظ ''الٰہ'' اخذ کیا گیا ہے۔ اسی طرح اس مادے کا ایک مفہوم تحیرّ ہے۔ یعنی جس کی اصل حقیقت اور کنہ تک کوئی نہ پہنچ پائے۔ ایک رائے یہ بھی ہے کہ یہ ''ولـه'' سے ہے جس کا مفہوم والہانہ محبت ہے۔ گویا الٰہ وہ ہستی ہے جس کی طرف کوئی لپکتا ہے اپنی حاجت روائی کے لیے' اپنی مشکل کشائی کے لیے' اپنے مصائب کو دور کرنے کی درخواست لے کر' اپنی ضروریات کی بہم رسانی کی توقع کے ساتھ —— اور تمہارا مشکل کشا' تمہارا حاجت روا' تمہارا روزی رساں اور تمہاری تکالیف کا دور فرمانے والا سوائے اللہ کے کوئی نہیں۔ یہ ہے بنیادی تصورِ الٰہ۔ اس کے بعد یہی لفظ آئے گا اس ذات کے لیے جو محبت کے قابل ہو' جس سے والہانہ عشق ہو' اور وہ ذات بھی اللہ ہی کی ذات ہے۔ وہ محبوبِ حقیقی اور مطلوبِ اصلی ہے۔ اور پھر

فلسفیانہ انداز میں بات کی جائے تو وہ ہستی کہ جس کی کنہ کو سمجھنا انسان کے لیے ناممکن ہو' جس کی ذات وراء الوراء' ثم وراء الوراء' ثم وراء الوراء ہو' جہاں انسان کے لیے سوائے تحیر کے اور کوئی چارہ باقی نہیں رہتا' تو وہ بھی اللہ ہی کی ذات ہو سکتی ہے۔ چنانچہ یوں سمجھئے کہ یہ جامہ ہر اعتبار سے راست آتا ہے صرف باری تعالیٰ کی ذات پر۔

مختلف مزاج' مختلف شعور کی سطحوں پر فائز' مختلف افتادِ طبع کے لوگ اپنی ذہنی سطح کے مطابق الٰہ کا تصور رکھتے ہیں۔ عوام الناس کے نزدیک الٰہ کا تصور یہی ہے کہ وہ روزی رساں ہے' تکالیف کا دور کرنے والا ہے' دعائیں سننے والا ہے' تمنائیں بر لانے والا ہے۔ ان کی ذہنی سطح پر معبود کا مفہوم یہی ہو گا: ''لَا اِلٰــــہَ اِلَّا اللّٰہُ ''یعنی روزی رساں اس کے سوا کوئی نہیں' مشکل کشا اس کے سوا کوئی نہیں۔ حاجت روا اس کے سوا کوئی نہیں' تکلیفیں دور کرنے والا اس کے سوا کوئی نہیں اور اس کے سوا کوئی نہیں جو لوگوں کی دعائیں سنتا ہو' ان کو قبول کرتا ہو اور ان کی مصیبتوں کو دور فرماتا ہو۔ لیکن فلسفیانہ ذہن اور ہے۔ فلسفیانہ افتاد اور مزاج کا حامل شخص الٰہ کو وہ ہستی مانتا ہے کہ ع ''اے بروں از وہم و قیل و قالِ من'' کے مصداق جہاں انسان کا فکر تھک ہار کر رہ جائے' جس کی ہستی کا تصور ممکن نہ ہو' جس کی صفات کا تصور ممکن نہ ہو' وہ قادر ہے تو کتنا قادر ہے' وہ سمیع ہے تو کتنا سمیع ہے' وہ علیم ہے تو کتنا علیم ہے۔ وہ ذات کہ جہاں پر سوائے تحیر کے انسان کے پاس اور کوئی چارۂ کار نہیں' وہ ہستی الٰہ ہے۔ اور وہ شخص کہ جو عبادت کی اصل روح سے آشنا ہو چکا ہو' وہ شخص کہ جس کا دل بیدار ہو' اس کی روح زندہ ہو' اس کے لیے الٰہ محبوبِ حقیقی ہے' مطلوبِ اصلی ہے' یعنی: ''لَا مَعْبُوْدَ اِلَّا اللّٰہُ' لَا مَقْصُوْدَ اِلَّا اللّٰہُ' لَا مَطْلُوْبَ اِلَّا اللّٰہُ' لَا مَحْبُوْبَ اِلَّا اللّٰہُ''۔

اگرچہ اس کلمۂ طیبہ کے پہلے جزو کی اس سے بلند تر سطح بھی ہے' لیکن اس کا ذکر یہاں شاید اختصار کے ساتھ مناسب نہ رہے گا' تاہم صرف اشارہ کر دیا جاتا ہے۔ اس پر اگرچہ کچھ بحث حقیقتِ شرک کے ضمن میں ہو چکی ہے کہ ایک مقام وہ بھی ہے جہاں اللہ کے سوا کسی الٰہ کی نفی کا معاملہ اس صورت میں سامنے آتا ہے کہ ''لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا اللّٰہُ ''یعنی وجودِ حقیقی صرف اللہ کا ہے۔ حقیقتاً موجود صرف وہ ہے۔ ؎

کُلُّ مَا فِی الْکَوْنِ وَھْمٌ اَوْ خَیَالٌ
اَوْ عُکُوْسٌ فِی الْمَرَایَا اَوْ ظِلَالٌ

باقی جو کچھ نظر آ رہا ہے یا تو وہ سائے ہیں' یا عکس ہیں یا وہ ایک قوتِ واہمہ کی کارفرمائی ہے' جبکہ وجودِ حقیقی صرف اللہ کا ہے۔

انسان کا فکری ارتقاء ہو' انسان کی روحانی ترقی ہو' ان سب کی معراج یہ ہے کہ انسان اس ''لَا اِلٰـــہَ اِلَّا اللّٰہُ'' کی حقیقت کو پالے۔ لہٰذا یہ ساری بحث وتمحیص اور یہ سارے اوامر ونواہی آخر میں آ کر جس نقطے پر مرتکز ہوتے ہیں وہ نقطہ پھر وہی ہے جہاں سے آغاز ہوا تھا۔ آغاز شرک فی العبادت کی نفی سے ہوا تھا: ﴿وَقَضٰی رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ﴾ اور اختتام ہوتا ہے شرک فی الالوہیت کی نفی سے: ﴿وَلَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰـهًا اٰخَرَ فَتُلْقٰى فِيْ جَهَنَّمَ مَلُوْمًا مَّدْحُوْرًا ﴿۳۹﴾﴾

''اور اللہ کے ساتھ کسی اور کو معبود نہ بنا لینا' ورنہ تم جہنم میں ڈال دیے جاؤ گے ملامت زدہ (اور) دھتکارے ہوئے (ہر بھلائی سے محروم ہو کر)''۔ یعنی شرک کا تو ایک ہی نتیجہ نکلے گا۔ اگر تم اس جرم کے مرتکب ہوئے تو پھر تمہاری حیثیت اُس خس وخاشاک اور اس کوڑے کرکٹ کی ہوگی جس کو دیا سلائی دکھا دی جائے' جس کو آگ لگا دی جائے۔ چنانچہ تم مَـــلُـــوْم اور مَـــدْحُـــوْر ہو کر' یعنی ملامت زدہ (condemned) اور دھتکارے ہوئے جہنم میں جھونک دیے جاؤ گے۔ اس لیے کہ تم شرفِ انسانیت سے تہی ہو گئے ہو۔ اگر تم نے شرک کا ارتکاب کیا تو تم اس منصب اور اس مقام ومرتبے سے اپنے آپ کو محروم کر چکے ہو۔ اگر تم نے توحید کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا تو اب تمہارا مصرف اور مقام اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ تمہیں جلایا جائے اور ابد الآباد تک نارِ جہنم میں جھونک دیا جائے۔

﴿اَفَاَصْفٰىكُمْ رَبُّكُمْ بِالْبَنِيْنَ وَاتَّخَذَ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ اِنَاثًا ۭ﴾ ''کیا تمہارے ربّ نے تمہیں تو چن لیا ہے بیٹوں کے لیے اور خود فرشتوں کی صورت میں بیٹیاں اختیار کر لی ہیں''۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا' شرک کی ایک شکل' جو اُس معاشرے میں موجود تھی' یہ تھی کہ بنی اسماعیل' مشرکین عرب فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں قرار دیتے تھے۔ اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کچھ تو مزاح کے انداز میں بھی تنقید کی گئی اور کچھ زجر' جھڑکی اور ڈانٹ کے انداز میں اظہارِ ناراضگی بھی فرمایا گیا کہ کیا تمہارے ربّ نے تمہیں تو چن لیا ہے بیٹوں کے لیے؟ اگر بیٹی ہو جائے تو تم شرمائے رہتے ہو' منہ چھپائے پھرتے ہو اور تم اس فکر میں ہوتے ہو کہ اسے کہیں گڑھے میں دفن کر آؤ اور جلد سے جلد اس عار اور بدنامی سے کسی نہ کسی طرح رُستگاری اور چھٹکارا حاصل کر لو۔ اور خدا کے لیے تم نے بیٹیاں ٹھہرائی ہیں؟ تمہاری یہ تقسیم بڑی بھونڈی تقسیم ہے۔ جیسا کہ سورۃ النجم میں آیا ہے: ﴿اَلَـــكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى ﴿۲۱﴾ تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ

ضِيۡزٰى ﴿۲۲﴾ ”کیا تمہارے لیے بیٹے ہیں اور اس کے لیے بیٹیاں؟ یہ تقسیم تو بڑی ہی نا منصفانہ ہے“۔ یہ تو بڑی ہی عجیب تقسیم ہے جو تم نے کی ہے۔ لیکن اب مزاح کا معاملہ ختم ہوا' اور اس کے بعد فرمایا: ﴿اِنَّكُمۡ لَتَقُوۡلُوۡنَ قَوۡلًا عَظِيۡمًا ﴿۴۰﴾﴾ ”یقیناً یہ بہت بڑی بات ہے جو تم کہہ رہے ہو“۔ یہی انداز اگلی سورت یعنی سورۃ الکہف میں نصاریٰ کے ذکر میں آتا ہے: ﴿وَّيُنۡذِرَ الَّذِيۡنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ﴿۴﴾ مَا لَهُمۡ بِهٖ مِنۡ عِلۡمٍ وَّلَا لِاٰبَآئِهِمۡ‌ؕ كَبُرَتۡ كَلِمَةً تَخۡرُجُ مِنۡ اَفۡوَاهِهِمۡ‌ؕ اِنۡ يَّقُوۡلُوۡنَ اِلَّا كَذِبًا ﴿۵﴾﴾ ”......اور ان کو ڈرائے جو کہتے ہیں اللہ نے کسی کو بیٹا بنایا ہے۔ اس بات کا نہ انہیں کوئی علم ہے اور نہ ان کے باپ دادا کو۔ بہت بڑی بات ہے جو ان کے منہ سے نکلتی ہے۔ وہ محض جھوٹ بولتے ہیں“۔ یعنی بہت بڑی بات ہے جو اُن کے مُنہ سے نکل رہی ہے۔ وہ جھوٹ بول رہے ہیں۔ ان کے اس قول کے اندر کوئی صداقت نہیں ہے۔ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ یہ سرتاسر جھوٹ' تہمت اور بہتان ہے۔ اس پر یہ آیاتِ مبارکہ ختم ہو رہی ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ ان اٹھارہ آیات میں ایک صالح تمدن' نیک اور صحت مند معاشرہ یا یوں کہہ لیجیے کہ اسلامی معاشرہ' اسلامی سوسائٹی اور اسلامی رہن سہن کا بڑا جامع نقشہ سامنے آ گیا ہے۔ تاہم اجتماعیت کی وہ سطح جبکہ ملی وملکی اور سیاسی مسائل سامنے آئیں' ذرا بلند تر سطح ہے' ان سے بحث اِن شاءَ اللہ اگلے درس میں ہو گی۔ اس سطح پر سورۃ الحجرات اجتماعیت کے ضمن میں قرآن مجید کی ہدایت کا ایک بڑا جامع مرقع ہے اور اسی پر ہمارا آئندہ درس مشتمل ہو گا۔ یہاں اس سے کم تر یعنی سماج' معاشرے' سوسائٹی کی سطح پر اسلام کیا چاہتا ہے اور کیا نہیں چاہتا' کن چیزوں کو پروان چڑھانا چاہتا ہے اور کن چیزوں کا استیصال اسے منظور ہے' اس کا ایک بڑا جامع نقشہ سامنے آ گیا ہے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ ربّ العالمین OO

❁❁❁

درس 14

مسلمانوں کی سیاسی وملّی زندگی کے رہنما اصول اوراس کے استحکام کے لئے اہم ہدایات

سورۃ الحجرات کی روشنی میں

درس ۱٤

مسلمانوں کی سیاسی وملی زندگی کے رہنما اُصول اوراس کے استحکام کیلئے اہم ہدایات

سورۂ حجرات کی روشنی میں

انسان کی عملی زندگی کے ذیل میں اس منتخب نصاب میں چھٹا اور آخری مقام سورۃ الحجرات مکمل ہے۔ یہ عظیم سورۃ اجتماعیاتِ انسانی کے ذیل میں عام سماجی و معاشرتی معاملات سے بلند تر سطح پر نہ صرف قومی و ملی امور سے بحث کرتی ہے اور یہ بتاتی ہے کہ ملتِ اسلامیہ کی تاسیس اور تشکیل کن بنیادوں پر ہوتی ہے اور اس میں اتحاد و اتفاق اور یک جہتی و ہم رنگی کیسے برقرار رکھی جاسکتی ہے بلکہ سیاست و ریاست کے متعلق امور سے بھی بحث کرتی ہے کہ اسلامی ریاست کس بنیاد پر قائم ہوتی ہے' اس کا دستورِ اساسی کیا ہے' اس کی شہریت کیسے حاصل ہوتی ہے اور اس کا دنیا کے دوسرے معاشروں یا اس کی دوسری ریاستوں سے تعلق کن بنیادوں پر استوار ہوگا۔

اس سورۃ کو بغرض تفہیم تین حصوں میں منقسم سمجھنا چاہیے۔

پہلا حصہ مسلمانوں کی حیاتِ اجتماعی کے 'اصل الاصول' یعنی اسلامی ریاست کے دستورِ اساسی اور ملت اسلامیہ کی شیرازہ بندی(۱) کے اصل قوام یعنی ''مرکزِ ملت'' سے بحث کرتا ہے۔

چنانچہ پہلی ہی آیت نے غیر مبہم طور پر واضح کر دیا کہ مسلمان معاشرہ اور اسلامی ریاست ''مادر پدر آزاد'' نہیں بلکہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکام کے ''پابند'' ہیں' اور مسلمانوں کی آزادی کے معنی صرف یہ ہیں کہ خدا اور رسول کی اطاعت کے لیے دوسری ہر طرح کی غلامی سے آزاد ہو جائیں۔ گویا کہ ایک فرد کی طرح اجتماعیت بھی صرف وہی 'مسلمان' قرار دی جاسکتی ہے جو نبی اکرم ﷺ کی بیان

---

(۱) کتابِ ملتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا

کردہ تشبیہ کے مطابق اسی طرح اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کے ساتھ بندھی ہوئی ہو جیسے ایک گھوڑا اپنے کھونٹے سے بندھا ہوا ہوتا ہے۔ اسی طرح یہ آیت مسلمانوں کی ہیئت اجتماعی کے اصل الاصول یعنی ایک اسلامی ریاست کے دستورِ اساسی میں حاکمیت سے متعلق اوّلین دفعہ کو متعین کر دیتی ہے کہ یہاں حاکمیت نہ کسی فرد کی ہے نہ طبقے کی' نہ قوم کی ہے نہ جمہور کی بلکہ صرف خدا کی ہے ﴿اِنِ الْحُکْمُ اِلاَّ لِلّٰہِ﴾ اور اسلامی ریاست کا کام (function) صرف یہ ہے کہ رسولؐ کی تشریح وتوضیح کے مطابق خدا کی مرضی ومنشا کو پورا کرے۔

آیت کے اخیر میں اس اطاعت کی اصل رُوح کی جانب بھی اشارہ کر دیا گیا ہے یعنی تقوی اللہ۔ اس کے بعد مسلمانوں کی ہیئت اجتماعی کی 'اصلِ ثانی' کو واضح کیا گیا جس کے گرد مسلمانوں کی حیاتِ ملی کی اصل شیرازہ بندی ہوتی ہے یعنی رسول اللہ ﷺ کا ادب' آپؐ کی تعظیم وتوقیر' آپؐ سے محبت اور عشق اور آپؐ کے مقام ومرتبہ سے آگاہی ﴿وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ فِیْکُمْ رَسُوْلَ اللّٰہِ﴾ اور ہر اُس قول وفعل یا رویے اور برتاؤ سے کامل اجتناب جس سے ادنیٰ ترین درجے میں بھی گستاخی یا تحقیر وتوہین کا پہلو نکلتا ہو (ع ''ادب گاہیست زیرِ آسماں از عرش نازک تر!'')

مسلمانوں کی ہیئت اجتماعی کی ان دو بنیادوں میں سے پہلی چونکہ عقیدۂ **توحید فی الالوھیۃ** کا لازمی نتیجہ ہے اور اس اعتبار سے گویا قرآن حکیم کے ہر صفحے پر بطرزِ جلی اس کا ذکر موجود ہے لہٰذا اس مقام پر اس کا ذکر صرف ایک آیت میں کر دیا گیا اس کا بالمقابل اصلِ ثانی پر انتہائی زور دیا گیا۔ اور بعض متعین واقعات پر گرفت اور سرزنش کے ضمن میں واضح کر دیا گیا کہ ؎

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست!
اگر بہ اُو نہ رسیدی تمام بولہبی است!!

اس لیے کہ حقیقت یہ ہے کہ آنحضور ﷺ کی ذاتِ گرامی میں ملتِ اسلامیہ کے پاس وہ ''مرکزی شخصیت'' موجود ہے جس سے تمدنِ انسانی کی وہ فطری ضرورت بہ تمام وکمال اور بغیر تصنع و تکلف پوری ہو جاتی ہے جس کے لیے دوسری قوموں کو باقاعدہ تکلف واہتمام کے ساتھ شخصیتوں کے بت تراشنے اور ہیرو (Heroes) گھڑنے کا کھکھیڑ مول لینا پڑتا ہے۔ مزید برآں دُنیا کی دوسری اقوام تو ع ''می تراشد فکرِ ما ہر دم خداوندے دگر'' کے مصداق مجبور ہیں کہ ہر دور میں ایک نئی شخصیت کا بت تراشیں' لیکن ملت اسلامیہ کے پاس ایک دائم وقائم مرکز' موجود ہے جو اس کے ثقافتی تسلسل

(Cultural Continuity) کا ضامن ہے (اس اعتبار سے دیکھا جائے تو ﴿وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ﴾ میں خطاب صرف صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ہی سے نہیں بلکہ تا قیامِ قیامت پوری اُمت مسلمہ سے ہے) اس دوام اور تسلسل کے ساتھ ساتھ' اُمت مسلمہ کی وسعت اور پھیلاؤ پر بھی نگاہ رہے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ یہ آنحضورﷺ کی ''مرکزیت'' ہی کا ثمرہ ہے کہ مشرقِ اقصیٰ سے لے کر مغربِ بعید تک پھیلی ہوئی قوم میں نسل ولسان کے شدید اختلاف اور تاریخی و جغرافیائی عوامل کے انتہائی بُعد کے علی الرغم ایک گہری ثقافتی یک رنگی (Cultural Homogeneity) موجود ہے۔ اور اسی کی فرع کے طور پر اس حقیقت پر بھی ہمیشہ متنبہ رہنا چاہیے کہ مختلف مسلم ممالک میں علیحدہ علیحدہ قیادتوں اور ''علاقائی شخصیتوں'' کو بس ایک حد تک ہی ابھارنا چاہیے' اس سے تجاوز کی صورت میں اس سے ''وحدتِ ملت'' کی جڑیں کمزور ہونے کا اندیشہ ہے۔ گویا بقول علامہ اقبال ؎

یہ زائرینِ حریمِ مغرب ہزار رہبر بنیں ہمارے
ہمیں بھلا ان سے واسطہ کیا جو تجھ سے ناآشنا رہے ہیں

روئے زمین کی تمام مسلمان اقوام کو معیارِ قیادت ایک ہی رکھنا چاہیے اور وہ ہے ذاتِ محمدؐ فداہ ابی واُمیﷺ۔

مسلمانوں کی ہیئت اجتماعی کی متذکرہ بالا دو بنیادوں میں سے ایک زیادہ تر عقلی و منطقی ہے اور دوسری نسبتاً جذباتی۔ پہلی پر دستور و قانون کا دارومدار ہے اور دوسری پر تہذیب و ثقافت کی تعمیر ہوتی ہے اور ان دونوں کا باہمی رشتہ ایک دائرے اور اس کے مرکز کا ہے۔ مسلمان اجتماعیت کے اس دائرے میں ''محصور'' ہے جو خدا اور اس کے رسول کے احکام نے کھینچ دیا ہے اور اس کے مرکز کی حیثیت آنحضورﷺ کی دلآویز اور دلنواز شخصیت کو حاصل ہے جن کے اتباع کے جذبے سے اس ہیئت اجتماعی کو ثقافتی یک رنگی نصیب ہوتی ہے اور جن کی محبت کے رشتے سے اس کے افراد ایک مرکز سے بھی وابستہ رہتے ہیں اور باہم دِگر بھی جڑے رہتے ہیں۔

(اب اس معذرت کے ساتھ آگے چلتا ہوں کہ ''مقامِ رسالت'' کے ذکر میں طولِ کلام فی الواقع ع ''لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم!'' کے مصداق ہے)

دوسرا حصہ ان احکامات پر مشتمل ہے جن پر عمل پیرا ہونے سے ملت اسلامیہ کے افراد اور گروہوں اور جماعتوں کے مابین رشتۂ محبت و الفت کے کمزور ہونے کے امکانات کم ہو جاتے ہیں

اور اختلاف وانتشار اور فتنہ وفساد کو بڑھنے سے روکا جا سکتا ہے۔ ان احکامات کو بھی مزید دو عنوانات میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک وہ اہم تر احکام جو وسیع پیمانے پر گروہوں کے مابین تصادم سے بحث کرتے ہیں اور دوسرے وہ بظاہر چھوٹے لیکن حقیقتاً نہایت بنیادی احکام جو خالص انفرادی سطح پر نفرت اور عداوت کا سدّ باب کرتے ہیں۔

مقدم الذکر احکام دو ہیں: (۱) افواہوں کی روک تھام اور کسی حتمی فیصلے اور عملی اقدام سے قبل اچھی طرح تحقیق وتفتیش اور چھان بین کا اہتمام [1] اور (۲) نزاع کے واقع ہو جانے کی صورت میں صحیح طرزِ عمل یعنی:

(ا) یہ کہ فریقین کے مابین صلح کرانے کو اجتماعی ذمہ داری اور معاشرتی فرض سمجھا جائے۔ گویا کہ لاتعلقی (Indifference) کی روش کسی طور صحیح نہیں۔

(ب) اس کے بعد بھی اگر ایک فریق زیادتی پر ہی مصر رہے تو اب اس کا مقابلہ صرف فریق ثانی ہی کو نہیں پوری ہیئت اجتماعیہ کو کرنا چاہیے اور:

(ج) جب وہ گردن جھکا دے تو از سر نو عدل وقسط پر مبنی صلح کرا دی جائے۔ (اس مقام پر عدل اور قسط کا مکرر مؤکد ذکر خاص طور پر اس لیے ہے کہ جب پوری ہیئت اجتماعیہ اس فریق سے ٹکرائے گی تو فطری طور پر اس کا امکان موجود ہے کہ دوبارہ صلح میں اس فریق پر غصے اور جھنجھلاہٹ کی بنا پر زیادتی ہو جائے!)

مؤخر الذکر احکام چھ نواہی پر مشتمل ہیں یعنی ان میں چھ معاشرتی برائیوں سے منع فرمایا گیا ہے جن کے باعث بالعموم دو افراد یا گروہوں کے مابین رشتۂ محبت والفت کمزور پڑ جاتا ہے اور اس کی جگہ نفرت وعداوت کے بیج بوئے جاتے ہیں اور ایسی کدورت پیدا ہو جاتی ہے جو پھر کسی طرح نہیں نکلتی۔ اس لیے کہ عام ضرب المثل کے مطابق تلواروں کے گھاؤ بھر جاتے ہیں لیکن زبان کے زخم کبھی مندمل نہیں ہوتے! وہ چھ چیزیں یہ ہیں:

---

(۱) اس سلسلے میں آنحضور ﷺ کے یہ الفاظ مبارک مستحضر رہنے چاہئیں کہ ((كَفٰى بِالْمَرْءِ كَذِبًا اَنْ يُحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ)) (صحیح مسلم، کتاب المقدمه، باب النهی عن الحديث بكل ما سمع) ”ایک شخص کے جھوٹے ہونے کے لیے یہ بات بالکل کافی ہے کہ وہ جو کچھ سنے اُسے آگے بیان کر دے (یعنی آگے بیان کرنے سے قبل اس کی صحت کی تحقیق وتصدیق نہ کرے)۔“

۱) تمسخر (اس کے سدباب کے لیے اس نہایت گہری حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا کہ ایک انسان دوسرے انسان کے صرف ظاہر کو دیکھتا ہے اور اسی کی وجہ سے تمسخر کا مرتکب ہو بیٹھتا ہے حالانکہ اصل چیز انسان کا باطن ہے اور خدا کی نگاہ میں انسانوں کی قدر و قیمت اُن کے باطن کی بنیاد پر ہے)۔

۲) عیب جوئی اور تہمت (اس کے ذیل میں اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی کہ جب مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں تو کسی دوسرے مسلمان کو عیب لگانا گویا خود اپنے آپ کو عیب لگانا ہے)۔

۳) تنابز بالالقاب یعنی لوگوں یا گروہوں کے توہین آمیز نام رکھ لینا (اس کے ضمن میں اشارہ فرمایا کہ اسلام لانے کے بعد برائی کا نام بھی نہایت برا ہے)۔

۴) سوئے ظن (اس لیے کہ بہت سے ظن گناہ کے درجے میں ہیں)

۵) تجسس اور

۶) آخری اور اہم ترین' غیبت جس کی شناعت کے اظہار کے لیے حد درجہ بلیغ تشبیہ اختیار کی یعنی یہ کہ کسی مسلمان کی غیبت ایسی ہے جیسے کسی مردہ بھائی کا گوشت کھانا۔ (اس لیے کہ جس طرح ایک مردہ اپنے جسم کا دفاع نہیں کر سکتا اسی طرح ایک غیر موجود شخص بھی اپنی عزت کے تحفظ پر قادر نہیں ہوتا)

الغرض ان آٹھ اوامر و نواہی سے مسلمانوں کی ہیئت اجتماعیہ کا استحکام مطلوب ہے۔ اس لیے کہ جس طرح بڑی سے بڑی فصیل بھی بہرحال اینٹوں ہی سے بنی ہوتی ہے اور اس کے استحکام کا دار و مدار جہاں اینٹوں کی پختگی اور مضبوطی پر ہوتا ہے وہاں اینٹوں کو جوڑنے والے گارے یا چونے یا کسی دیگر مسالے (Cement Substance) کی پائیداری پر بھی ہوتا ہے۔ اسی طرح ملت اسلامیہ کے استحکام کے لیے بھی جس قدر مسلمانوں میں سے ہر ہر فرد کا سیرت و کردار کے اعتبار سے پختہ ہونا ضروری ہے' اسی قدر اُن کے مابین رشتۂ محبت و الفت کی استواری بھی لازمی ہے۔ یہ البتہ واضح رہے کہ ملت اسلامیہ کا استحکام عام قومی تصورات کے تحت دنیوی غلبہ و اقتدار کے لیے نہیں بلکہ اس لیے مطلوب ہے کہ وہ ع ''ہم تو جیتے ہیں کہ دنیا میں تیرا نام رہے!'' کے مصداق خدا کی زمین پر خدا کی مرضی پوری کرنے کا ذریعہ اور آلہ (Instrument) ہے!

تیسرا حصہ دو انتہائی اہم مباحث پر مشتمل ہے!

۱) پہلی بحث انسان کی عزت و شرف کے معیار سے متعلق ہے جس کے ذیل میں واضح کر دیا گیا

ہے کہ انسان کی عزت و ذلت یا شرافت و رزالت کا معیار نہ کنبہ ہے نہ قبیلہ' نہ خاندان ہے نہ قوم' نہ رنگ ہے نہ نسل' نہ ملک ہے نہ وطن' نہ دولت ہے نہ ثروت' نہ شکل ہے نہ صورت' نہ حیثیت ہے نہ وجاہت' نہ پیشہ ہے نہ حرفہ اور نہ مقام ہے نہ مرتبہ بلکہ صرف ''تقویٰ'' ہے اس لیے کہ پوری نوعِ انسانی ایک ہی خدا کی مخلوق بھی ہے اور ایک ہی انسانی جوڑے (آدم وحوا) کی اولاد بھی۔

یہ بحث فی نفسہٖ بھی نہایت اہم ہے اس لیے کہ واقعہ یہ ہے کہ دنیا میں بدامنی اور انتشار اور انسانوں کے مابین تصادم اور ٹکراؤ کا بہت بڑا سبب نسل اور نسب کا غرور ہی ہے اور یہ قومی گروہی مفاخرت ہی ہے جو مابین الانسانی منافرت کا اصل سبب بنتی ہے (اس سلسلے میں یہ حقیقت پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ آنحضور ﷺ کے بدترین دشمن [1] بھی معترف ہیں کہ آپ نے واقعتاً نسل انسانی کی عزت و شرف کی متذکرہ بالا تمام غلط بنیادوں کو منہدم کر دیا اور انسانی مساوات اور اخوت کی بنیادوں پر ایک معاشرہ عملاً قائم فرما دیا!) لیکن خاص طور پر اس مقام پر اس بحث کے دو رخ لائق توجہ ہیں: ایک یہ کہ اوپر جن سماجی برائیوں سے منع فرمایا گیا تھا مثلاً تمسخر و استہزاء اور عیب جوئی و بدگوئی ان کی جڑ میں جو گمراہی کار فرما ہے وہ اصل میں یہی نسل ونسب کی بنیاد پر تفاخر و تباہی کا جذبہ ہے اور دوسرے یہ کہ اسلام ان میں سے کسی چیز کی بنیاد پر انسانوں کے مابین تفریق وتقسیم کا قائل نہیں بلکہ وہ ایک خالص نظریاتی معاشرہ اور ریاست قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس کے یہاں انسانوں کے مابین صرف ایک تقسیم معتبر ہے اور وہ ہے ایمان کی تقسیم اور اہلِ ایمان کے حلقے میں بھی اس کے نزدیک صرف ایک معیارِ عزت و شرف معتبر ہے اور وہ ہے تقویٰ کا معیار!

۲) دوسری اہم بحث اسلام اور ایمان کے مابین فرق و امتیاز کی وضاحت سے متعلق ہے!

واضح رہے کہ قرآن حکیم میں ایمان و اسلام اور مؤمن ومسلم کی اصطلاحات اکثر و بیشتر ہم معنی اور مترادف الفاظ کی حیثیت سے استعمال ہوئی ہیں۔ اس لیے کہ واقعہ یہی ہے کہ یہ ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں۔ اور ایمان انسان کی جس داخلی کیفیت کا نام ہے اسلام اس کا خارجی ظہور ہے' لہٰذا جو انسان قلب میں ایمان ویقین کی دولت رکھتا ہو اور عمل میں اسلام اور اطاعت کی روش اختیار کر لے

(۱) چنانچہ ایچ جی ویلز (H.G.WELLS) نے اپنی ''مختصر تاریخ عالم'' میں آنحضور ﷺ کے خطبۂ حجۃ الوداع کے ذیل میں واضح طور پر اقرار کیا ہے کہ انسانی مساوات اور اخوت کے نہایت اونچے وعظ تو اگرچہ مسیح ناصری (علیٰ نبینا علیہ الصلوٰۃ والسلام) کے یہاں بھی موجود ہیں۔ لیکن ان بنیادوں پر تاریخ میں پہلی بار ایک معاشرے کا واقعی قیام صرف محمد عربی (ﷺ وفداہ ابی وامی) کا کارنامہ ہے۔

اسے ﴿اَیًّا مَّا تَدۡعُوۡا فَلَہُ الۡاَسۡمَآءُ الۡحُسۡنٰی﴾ ایک انگریزی مقولے(۱) کے مصداق چاہے مؤمن کہہ لیا جائے چاہے مسلم بات ایک ہی ہے' بخلاف اس مقام کے کہ یہاں ایمان و اسلام کو ایک دوسرے کے مقابل لایا گیا ہے اور ایمان کی نفی کامل کے علی الرغم اسلام کا اثبات کیا گیا ہے۔

اس مقام پر اس بحث کے لانے کا اصل مقصد یہ ہے کہ یہ اہم اور بنیادی حقیقت واضح ہو جائے کہ اسلامی معاشرے میں شمولیت اور اسلامی ریاست کی شہریت کی بنیاد ایمان پر نہیں ہے بلکہ اسلام پر ہے' اس لیے کہ ایمان ایک باطنی حقیقت ہے جو کسی قانونی بحث و تفتیش اور ناپ تول کا موضوع نہیں بن سکتی۔ لہٰذا مجبوری ہے کہ دنیا میں بین الانسانی معاملات کو صرف خارجی رویے کی بنیاد پر استوار کیا جائے جس میں ایمان کا زیادہ سے زیادہ صرف ''اِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ'' والا پہلو شامل ہو سکتا ہے۔

ایک یہ کہ انسان کی ایک ایسی حالت بھی ممکن ہے کہ اس کے دل میں نہ تو مثبت و ایجابی طور پر ایمان ہی متحقق ہو نہ منفی و سلبی طور پر نفاق' بلکہ ایک خلا کی سی کیفیت ہو لیکن اس کے عمل میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت موجود ہو۔ اس حال میں اگرچہ اس قاعدہ کلیہ کی رو سے بغیر ایمان انسان کا کوئی عمل بارگاہِ خداوندی میں مقبول نہیں ہو سکتا' یہ چیز بھی مبنی بر عدل ہی ہوتی کہ ایسی اطاعت قبول نہ کی جاتی لیکن یہ اللہ تعالیٰ کا خصوصی فضل و کرم ہے (جس کی جانب اشارہ دو اسمائے حسنیٰ غفورٌ اور رحیمٌ سے کر دیا گیا) کہ اس اطاعت کو بھی سندِ قبول عطا فرما دی گئی۔ (واضح رہے کہ آنحضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے آخری دور میں جب ﴿وَرَاَیۡتَ النَّاسَ یَدۡخُلُوۡنَ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰہِ اَفۡوَاجًا ۝۲﴾ (النصر) کی صورت ہوئی تو اس وقت بھی بہت سے لوگوں کے ایمان و اسلام کی نوعیت یہی تھی اور بعد میں تو ہر دور میں اُمت مسلمہ کے سوادِ اعظم کا حال یہ رہا ہی ہے!)

دوسرے یہ کہ حقیقی ایمان کی بھی ایک جامع و مانع تعریف بیان ہو گئی' اور واضح کر دیا گیا کہ فی الحقیقت ایمان نام ہے اللہ اور اس کے رسول ﷺ(۲) پر ایسے پختہ یقین کا جس میں شکوک و شبہات کے کانٹے چبھے نہ رہ گئے ہوں اور جس کا اوّلین اور نمایاں ترین عملی مظہر جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ یعنی یہ کہ انسانِ ہدایت آسمانی کی نشر و اشاعت اور حق کی شہادت' اور اللہ کے دین کی تبلیغ و تعلیم اور اس کے غلبہ و اظہار کے لیے جان و مال سے کوشش کرے اور اس جدوجہد میں تن من دھن سب قربان کر دے۔

(۱) (CALL THE ROSE BY ANY NAME IT WILL SMELL AS SWEET)

(۲) واضح رہے کہ دوسرے ایمانیات کے ذیل میں آپ سے آپ مندرج ہو گئے۔

آیت کے آخر میں مزید کھول دیا گیا کہ صرف ایسے ہی لوگ اپنے دعویٰ ایمان میں سچے ہیں۔

سورۃ الحجرات کی اس آیۂ کریمہ ﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا وَجَاھَدُوْا بِاَمْوَالِھِمْ وَاَنْفُسِھِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ؕ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الصّٰدِقُوْنَ ﴿۱۵﴾﴾ پر گویا کہ ہمارے منتخب نصاب کا جزوِ ثانی ختم اور جزوِ ثالث شروع ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ سورۃ العصر میں بیان شدہ چار لوازمِ نجات کو اس آیت میں دو اصطلاحات میں جمع کر دیا گیا ہے' ایک ایمانِ حقیقی جو جامع ہے ایمانِ قولی اور عملِ صالح دونوں کا اور دوسرے جہاد فی سبیل اللہ جو جامع ہے تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کا' چنانچہ یہیں سے تواصی بالحق کی تفصیلی بحث کا آغاز ہوتا ہے۔

اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیِ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَاتَّقُوا اللّٰہَ ؕ اِنَّ اللّٰہَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ﴿۱﴾﴾

''اے ایمان والو! مت آگے بڑھو اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) سے اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو۔ یقیناً اللہ سب کچھ سننے والا' سب کچھ جاننے والا ہے۔''

مطالعہ قرآن حکیم کے جس منتخب نصاب کا سلسلہ وار درس ان مجالس میں ہو رہا ہے' اس کا درس نمبر چودہ سورۃ الحجرات پر مشتمل تھا۔ ترتیبِ مصحف کے اعتبار سے یہ سورۂ مبارکہ' جو اٹھارہ آیات اور دو رکوعوں پر مشتمل ہے' ۲۶ ویں پارے میں سورۃ الفتح کے فوراً بعد وارد ہوئی ہے۔ اگر اس کے مضامین پر غور کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ سورۃ الفتح کی آخری دو آیات میں جو مضامین آئے ہیں' یہ پوری سورۂ مبارکہ ان کی مزید تشریح اور توضیح پر مشتمل ہے۔

ہمارے منتخب نصاب میں ربطِ مضمون کے اعتبار سے اس کا جو مقام ہے' اسے بھی ذہن میں تازہ کر لینا' ان شاء اللہ' مفید ہو گا۔ اس منتخب نصاب کا تیسرا حصہ اعمالِ صالحہ کے مباحث پر مشتمل ہے۔ اعمالِ انسانی کے ضمن میں پہلے دو دروس میں انفرادی سیرت و کردار سے متعلق قرآن مجید کی رہنمائی ہمارے سامنے آئی تھی۔ اس کے بعد ایک درس میں انفرادیت سے اجتماعیت کی طرف جو پہلا قدم ہے' یعنی گھریلو زندگی' خاندان کا ادارہ' عائلی نظام' اس سے متعلق ہم نے پوری سورۃ التحریم پڑھی تھی۔ اجتماعی زندگی میں اس سے بلند تر سطح پر ہماری معاشرتی یا سماجی زندگی کا دائرہ ہے۔ اس کے متعلق ہم نے گزشتہ دو درس میں سورۂ بنی اسرائیل کے تیسرے اور چوتھے رکوع کا مطالعہ کیا تھا۔ اب جو اجتماعیت کی بلند

ترین سطح ہے‘ یعنی قومی وملی اور سیاسی وریاستی زندگی‘ اس سے متعلق نہایت اہم مضامین اس سورۂ مبارکہ میں وارد ہورہے ہیں۔

قرآن حکیم کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ قرآن حکیم اس طرح کی کتاب نہیں ہے جیسی عام طور پر انسانی تصنیف ہوتی ہے۔ انسانی تصنیف میں ابواب ہوتے ہیں۔ پھر ہر باب کا ایک عنوان ہوتا ہے جو اس باب کے مضامین کی نشاندہی کرتا ہے۔ پھر وہ باب ذیلی عنوانات یا فصول میں منقسم ہوتا ہے اور ہر فصل میں بحث کا ایک حصہ مکمل ہو جاتا ہے‘ جبکہ قرآن مجید درحقیقت اس نوع کی کتاب نہیں ہے‘ بلکہ اسے ہم خطباتِ الٰہیہ کے مجموعے سے تعبیر کر سکتے ہیں اور یہ تعبیر غلط نہیں ہوگی۔ نبی کریم ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے دوران مختلف مواقع اور مراحل پر یہ خطباتِ الٰہیہ نازل ہوتے رہے اور حضور ﷺ کی انقلابی دعوتِ توحید کو جن حالات‘ موانعات‘ اعتراضات اور مخالفتوں سے سابقہ پیش آتا تھا‘ ان کی مناسبت سے حضور ﷺ کو ہدایات دی جاتی رہی ہیں اور متعلقہ بحثیں نازل ہوتی رہیں۔ ان ہی کے ضمن میں وہ دائمی وابدی رہنما اصول بھی دے دیے گئے جن پر اللہ تعالیٰ اس دنیا میں انسان کی اجتماعی زندگی کو استوار دیکھنا چاہتے ہیں‘ لیکن ان کے لیے قرآن حکیم میں غور وفکر اور تدبر لازم ہے۔ ان کو معلوم اور اخذ کرنے کے لیے آیات کے بین السطور جھانکنا پڑتا ہے اور سورتوں کے مضامین کا تجزیہ کر کے یہ چیز معین کرنی پڑتی ہے کہ یہاں کون سے دائمی اور ابدی رہنما اصول ہمیں مل رہے ہیں۔

اس پہلو سے اگر غور کریں تو اگرچہ سورۃ الحجرات کے شانِ نزول کے ضمن میں بھی ہمیں روایات ملتی ہیں‘ لیکن تفسیر قرآن کا ایک مستقل اصول ہے کہ ''**الاعتبارُ لعموم اللفظ لا لخصوص السبب**''، یعنی قرآن مجید کے فہم کے ضمن میں اصل اعتبار الفاظ کے عموم کا ہوگا‘ نہ کہ اس کے سبب کا جو کسی خاص واقعہ کے اعتبار سے شانِ نزول بنا ہے۔ اگر اس عموم کو پیشِ نظر رکھیں گے تو واقعہ یہ ہے کہ عقل انسانی دنگ رہ جاتی ہے کہ ریاست کی سطح پر اس سورۂ مبارکہ میں کتنی اعلیٰ ترین اور جامع ترین رہنمائی دے دی گئی ہے۔ حالانکہ تصورِ ریاست (Concept of State) انسانی تاریخ کے اعتبار سے ایک جدید تصور ہے‘ لیکن قرآن مجید نے ریاست کی سطح پر ان دائمی وبنیادی اصولوں کی رہنمائی نوعِ انسانی کو عطا فرما دی تھی کہ جنہیں اسلامی ریاست میں رُوبعمل لایا جائے گا۔ ان سب کے لیے بنیادی واساسی رہنمائی ہمیں اس سورۂ مبارکہ میں مل جاتی ہے۔

اس سورت کو ہم بغرض تفہیم تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ البتہ یہ بات جان لیجیے کہ یہ تقسیم قطعی تعیین کے ساتھ نہیں ہوگی بلکہ مضامین کی overlapping ہوگی۔ لیکن بحیثیت مجموعی یہ بات سامنے آئے گی کہ اس کے تین حصے ہیں جو تقریباً چھ چھ آیات پر مشتمل ہیں۔ پہلے حصہ میں اسلامی ہیئت اجتماعیہ کے جو بنیادی اصول ہیں اور جن ستونوں پر یہ عمارت کھڑی ہے' ان کو معین کیا گیا ہے۔ دوسرے حصہ میں مسلمانوں کی قومی و ملی زندگی کو انتشار سے بچانے اور اُمت کی شیرازہ بندی کو قائم و برقرار رکھنے کے ضمن میں آٹھ احکام دیے گئے ہیں' جن میں ہم دیکھیں گے کہ دو بہت اہم اور بنیادی احکام ہیں اور چھ ان دونوں کے مقابلہ میں نسبتاً چھوٹے احکام ہیں۔ آخری حصہ میں پھر ایک تو یہ مسئلہ سامنے آتا ہے کہ مسلمانوں کی ہیئت اجتماعیہ کا پوری نوعِ انسانی کے ساتھ ربط و تعلق کیا ہے اور ان تعلقات کی بنیادیں کیا ہیں؟ پھر سب سے اہم مسئلہ یہ زیر بحث آتا ہے کہ مسلمانوں کی معاشرتی زندگی میں کسی شخص کو شامل کرنے کے لیے معیار کیا ہے؟ یا زیادہ واضح الفاظ میں یوں سمجھئے کہ اسلامی ریاست میں شہریت کی بنیاد اور اساس کیا ہے؟ پھر اس کے ضمن میں ایک اہم مضمون آئے گا جس پر یہ سورۂ مبارکہ ختم ہوگی کہ اسلام اور ایمان میں کیا فرق ہے؟ میں نے بطور تمہید ایک اجمالی اور مختصر سا جائزہ آپ حضرات کے سامنے رکھ دیا ہے کہ یہ ہیں وہ اہم مضامین جو اس سورۂ مبارکہ کے مطالعہ کے نتیجہ میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔

اسلامی ریاست کے دستورِ اساسی کا اصل الاصول

اس تمہید کے بعد اب آیئے کہ ہم اس سورۂ مبارکہ کی پہلی آیت پر اپنی توجہات کو مرتکز کریں۔ فرمایا: ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ۝۱﴾ ''اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) سے آگے مت بڑھو اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو' اور جان رکھو کہ اللہ (ہر چیز کا) سننے والا' جاننے والا ہے'' —— اس کے معنی کیا ہیں! یہ کہ جیسے ایک مسلمان فرد' اپنی انفرادی حیثیت میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کا پابند ہوتا ہے' اور اس کے لیے مادر پدر آزادی کا کہیں وجود نہیں ہے' ویسے ہی ایک مسلمان معاشرہ اور ایک اسلامی ریاست بھی مادر پدر آزاد نہیں ہے بلکہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کی پابند ہے۔ اسلام میں آزادی کا تصور یہ ہے کہ اللہ کی بندگی کے لیے ہر نوع کی دوسری غلامی سے نجات حاصل کر لی جائے۔ علامہ اقبال نے اسے یوں ادا کیا ہے۔

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

اسی بات کو نبی اکرم ﷺ نے اس طور سے تعبیر فرمایا:

((مَثَلُ الْمُؤْمِنِ وَمَثَلُ الْاِیْمَانِ کَمَثَلِ الْفَرَسِ فِی آخِیَّتِهٖ))(۱)

''مؤمن اور ایمان کی مثال اس گھوڑے کی سی ہے جو ایک کھونٹے سے بندھا ہوا ہے''۔

بڑی پیاری تمثیل ہے۔ ایک گھوڑا تو وہ ہے جس پر کوئی پابندی نہیں ہے' کوئی بندش نہیں ہے' وہ جدھر چاہے منہ مارے' جدھر چاہے زقند لگائے' آزادی کے ساتھ جس طرف چاہے اور جہاں تک چاہے دوڑ لگائے۔ اس کے برعکس ایک گھوڑا وہ ہے جو ایک کھونٹے سے بندھا ہوا ہے۔ اب آپ فرض کیجیے کہ دس گز کی ایک رسّی ہے جس سے وہ گھوڑا اپنے کھونٹے سے بندھا ہوا ہے۔ لہٰذا دس گز نصف قطر کے دائرہ کے اندر وہ گھوم پھر سکتا ہے۔ اس گھوڑے کو اتنی آزادی ہے کہ وہ اس دائرے کے اندر جس طرف چاہے پانچ سات گز کے فاصلہ پر جا کر بیٹھ جائے' مزید آگے جانا چاہے تو چند قدم اور اٹھا لے' لیکن دس گز سے آگے ہرگز نہیں جا سکتا' اس لیے کہ وہ بندھا ہوا ہے —— بقول اقبال ؎

صنوبر باغ میں آزاد بھی ہے پا بگل بھی ہے
انہی پابندیوں میں حاصل آزادی کو تو کر لے

تو یہ نہایت بلیغ تمثیل اور تشبیہ ہے جو نبی اکرم ﷺ نے دی کہ ایک بندۂ مؤمن کی زندگی ایک پابند زندگی ہے۔ وہ اللہ اور رسول ﷺ کے احکام اور اوامر و نواہی کا پابند ہے۔ اب ظاہر بات ہے کہ جب مسلمان فرد اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کا پابند ہے تو مسلمانوں کی ہیئت اجتماعیہ ان سے کیسے آزاد ہو جائے گی؟ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کی ہر سطح پر ان احکام کی پابندی ضروری ہے۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ عائلی زندگی اجتماعیت کی پہلی سطح ہے' معاشرتی زندگی اس سے بلند تر سطح ہے اور سیاسی زندگی یعنی ریاستی سطح پر ہمارے معاملات' یہ اجتماعیت کا بلند ترین تصور ہے۔ پس ہماری زندگی کی ہر سطح اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کی پابند ہے۔ اگر مسلمانوں کی ہیئت اجتماعیہ موجود ہے اور ان کی ایک آزاد خود مختار ریاست قائم ہے تو اس کے معاملات میں' اس کے دستور و آئین میں اور اس کے قوانین میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام سے تجاوز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ہے حقیقی مفہوم اس سورۂ

(۱) مسند احمد' کتاب باقی مسند المکثرین' باب مسند ابی سعید الخدری' ح ۱۱۱۰۰

مبارکہ کی پہلی آیت کے اس حصہ کا: ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾ ''اے اہل ایمان! مت آگے بڑھو اللہ اور اس کے رسولﷺ سے''۔ یہاں جو لفظ ''تُقَدِّمُوْا'' آیا ہے اس کا لفظی ترجمہ ہوگا ''مت آگے بڑھاؤ''۔ اس سے آگے لفظ ''اَنْفُسَکُمْ'' کہ ''اپنے آپ کو آگے نہ بڑھاؤ'' یا لفظ ''رَاْیَکُمْ'' کہ ''اپنی رائے کو آگے مت بڑھاؤ'' محذوف ماننا پڑے گا۔ ﴿بَیْنَ یَدَیِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾ ''اللہ اور اس کے رسول سے'' — آیت کا یہ حصہ دونوں محذوف الفاظ کے ساتھ جڑا رہے گا۔ مفہوم یہ ہوگا کہ یہ ایک دائرہ ہے۔ تمہاری زندگی خواہ انفرادی معاملات سے متعلق ہو' خواہ اجتماعی زندگی کے مسائل سے تعلق رکھتی ہو' اس دائرے کے اندر اندر محدود رہنی چاہیے۔

اگر غور کیا جائے تو یہ اسلامی ریاست کی سطح پر اس کی حیاتِ اجتماعی اور دستورِ اساسی کا اصل الاصول ہے' یا یوں کہیے کہ اس کی پہلی دفعہ اس آیت سے معین ہوتی ہے۔ اس لیے کہ ریاست کے ضمن میں سب سے پہلی بحث یہ آئے گی کہ حاکمیت (Sovereignty) کس کی ہے؟ اور اسلامی ریاست میں حاکمیتِ مطلقہ صرف اللہ کی ہے — بقول علامہ اقبال مرحوم ؎

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آزری

لہٰذا مسلم معاشرتی نظریہ (Muslim Social Though) یا مسلم سیاسی خیال (Muslim Political Thought) میں اساسی و بنیادی اور اہم ترین بات یہ ہے کہ حاکمیتِ مطلقہ صرف اللہ کے لیے ہے۔ قرآن مجید میں اس بات کو متعدد مقامات پر مختلف اسالیب سے بیان کیا گیا ہے۔ سب سے زیادہ معروف الفاظ سورۂ یوسف کے ہیں: ﴿اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰهِ﴾ یعنی ''حکم دینے کا اختیارِ مطلق اللہ کے سوا اور کسی کو نہیں ہے''۔ اسی بات کو سورۃ الکہف میں منفی انداز میں یوں فرمایا: ﴿وَلَا یُشْرِكُ فِیْ حُکْمِهٖۤ اَحَدًا ﴿۲۶﴾﴾ ''اور وہ اپنے حکم (کے اختیار) میں کسی کو شریک کرنے کے لیے تیار نہیں ہے'' البتہ یہ ضرور ہے کہ اللہ کی حاکمیت کے اصول کا انسانی معاشرہ میں عملی طور پر جو نفاذ ہوگا وہ رسول اللہﷺ کی اطاعت کے واسطہ سے ہوگا۔ اس لیے کہ اللہ تو غیب کے پردوں میں ہے' اس کا حکم سب لوگوں کو براہِ راست نہیں پہنچتا بلکہ اس نے اپنے احکام لوگوں تک پہنچانے کے لیے اپنی حکمتِ بالغہ سے نبوت و رسالت کا سلسلہ جاری فرمایا جس کی آخری کڑی ہیں خاتم النبیین سید المرسلین جناب محمد رسول اللہﷺ — لہٰذا حاکمیت الٰہیہ کی جو عملی تشکیل ہوگی وہ سورۃ النساء کی اس آیت کے حوالے سے ہوگی

کہ ﴿اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِى الْاَمْرِ مِنْكُمْ﴾ (آیت ۵۹) ''اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول (ﷺ) کی اور تم میں سے جو صاحب امر ہیں ان کی''۔ اس آیۂ مبارکہ میں ''اَطِيْعُوْا'' جو صیغۂ امر ہے' دو مرتبہ آیا ہے' اللہ کے ساتھ بھی اور رسول ﷺ کے ساتھ بھی۔ ﴿اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ﴾ ''اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول (ﷺ) کی''—— لیکن آگے جب اس اطاعت کی زنجیر کی تیسری کڑی آئی تو فعل امر ''اَطِيْعُوْا'' کو لوٹایا نہیں گیا بلکہ فرمایا گیا: ﴿وَاُولِى الْاَمْرِ مِنْكُمْ﴾ ''اور ان کی جو تم میں سے صاحب امر ہوں''—— اس اسلوب سے معلوم ہوا کہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت بالذات اور مطلق ہے' جبکہ ''وَاُولِى الْاَمْرِ مِنْكُمْ'' کی اطاعت مشروط ہوگی کہ وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کے دائرہ کے اندر اندر حکم دے سکتے ہیں' اس کے باہر نہیں۔ اس کے لیے نبی اکرم ﷺ نے دائمی طور پر یہ اصل الاصول معین فرمادیا ہے کہ: ((لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِىْ مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ)) [1] یعنی کسی ایسے معاملہ میں مخلوق میں سے کسی کے حکم کی اطاعت نہیں کی جائے گی جس سے خالق کی معصیت یعنی اللہ کی نافرمانی لازم آرہی ہو۔

پس قرآن مجید میں مختلف مقامات پر مختلف اسالیب سے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کے جو احکام دیے گئے ہیں' ان سب کو جمع کیا جائے تو اس کا جو حاصل نکلتا ہے اسے بڑی جامعیت اور بڑی خوبصورتی کے ساتھ سورۃ الحجرات کی پہلی آیت میں بایں الفاظ مبارکہ بیان فرما دیا گیا ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَىِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾ ''اے اہل ایمان! مت آگے بڑھو اللہ سے اور اس کے رسول (ﷺ) سے''۔

یہاں یہ بھی عرض کردوں کہ یہ بڑے دستوری' آئینی اور قانونی الفاظ ہیں اس اصول الاصول کی تعیین کے لیے انفرادی و اجتماعی زندگی کے تمام امور و مسائل اور معاملات اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کے دائرے کے اندر اندر رہیں گے' اس سے تجاوز نہیں ہوگا۔ البتہ اس دائرے کے اندر رہتے ہوئے حسبِ حالات اور حسبِ موقع اپنی مرضی استعمال کرنے کا حق حاصل ہے۔ میں یہ بات اس لیے عرض کررہا ہوں کہ اہل لغت و نحو کے تمام کے تمام اس اصول کو تسلیم کرتے ہیں کہ ''امر'' کے مقابلہ میں ''نہی'' میں زیادہ زور (emphasis) ہوتا ہے۔ یعنی ایک یہ کہ حکم دیا جائے کہ ''اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو'' اور دوسرے یہ کہ بات یوں کہی جائے کہ ''اللہ اور اس کے رسول

(۱) المعجم الكبير للطبراني، عن عمران بن حصين، رقم الحديث 14819، اسناده حسن

(صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) سے آگے مت بڑھو'' تو یہ جو دوسرا انداز ہے اس میں تاکید کا رنگ زیادہ غالب ہے۔

پھر یہ کہ اگر غور کریں تو نظر آئے گا کہ خالص دستوری اعتبار سے یہ الفاظ نہایت جامع (comprehensive) ہیں۔ یہ الفاظ اس طریقہ سے اس بات کا احاطہ کر لیتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسول صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کے جو واضح احکام ہیں ان سے تجاوز نہیں کیا جا سکے گا' ان کے اندر اندر آزادی حاصل ہے' جیسے گھوڑے کی مثال کے ضمن میں عرض کیا گیا تھا کہ کھونٹے سے بندھے ہوئے گھوڑے کو بس اتنی آزادی ہے کہ وہ اپنی رسّی کی مقدار کے مطابق ایک معین دائرے کے اندر اندر گھوم پھر سکتا ہے اور جس سمت چاہے اور رسّی کی حدود میں رہتے ہوئے جتنے فاصلے پر چاہے جا کر بیٹھ سکتا ہے۔ لہٰذا سورۃ الحجرات کے ان الفاظ کے ذریعے سے ایک دائرہ کھینچ دیا گیا کہ اللہ اور اس کے رسول صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کے احکام کی حیثیت ''حدود اللہ'' کی ہے۔ ان سے تجاوز نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ اس دائرے کے اندر اندر تمہیں اختیار حاصل ہے کہ اپنے ریاستی' مملکتی اور انتظامی امور اپنی صوابدید سے طے کر سکتے ہو' اپنے قوانین بنا سکتے ہو۔

اسلامی ریاست میں شوریٰ کی اہمیت

لیکن اس کے لیے ایک اصل الاصول سورۃ الشوریٰ میں بیان کر دیا گیا ہے جسے اختیارات کے دائرے میں بہرحال ملحوظ رکھنا ہوگا۔ وہ اصل الاصول یہ ہے کہ ﴿وَاَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰى بَيۡنَهُمۡ﴾ (آیت ۳۸) ''اور (اہل ایمان) اپنے معاملات باہمی مشورے سے چلاتے ہیں''۔ یعنی اللہ اور اس کے رسول صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کے احکام کے دائرے کے اندر اندر بھی کسی فردِ واحد' کسی خاندان' کسی طبقہ یا کسی گروہ کو یہ اختیار حاصل نہیں ہے کہ وہ قوتِ نافذہ پر قابض ہو کر اس طرح بیٹھ جائے کہ گویا وہ اصل حکمران ہیں اور بقیہ لوگ صرف ان کی رعیت ہیں کہ جس طرح چاہیں ان پر اپنی مرضی ٹھونس دیں۔ اسلام اس نوع کے Authoritarianism اور Totalitarianism کی یعنی کسی فرد' طبقے یا گروہ یا خاندان میں اختیارات کے ارتکاز کی ہرگز اجازت نہیں دیتا۔ اسلامی ریاست کے معاملات کو چلانے کے لیے شورائیت کا نظام از روئے قرآن مجید لازم ہے۔ سورۃ الشوریٰ کی اس آیت میں یہ اصل الاصول اور اسلامی نظامِ حیات کی یہ خصوصیت بیان کی گئی ہے کہ اس میں وہ تمام اجتماعی امور جن کے متعلق قرآن و سنت مین کوئی صریح حکم یا ہدایت نہ ہو' مشورے سے انجام پاتے ہیں۔

البتہ یہاں شوریٰ کی کوئی خاص شکل معین نہیں کی گئی ہے اور اس کے بارے میں ہمیں قرآن میں

کسی دوسرے مقام پر بھی کوئی تفصیلی نقشہ نہیں ملتا کہ نظامِ حکومت کیا ہو! صدارتی ہو یا پارلیمانی ہو! وحدانی ہو یا کہ وفاقی ہو! اور اگر عام انتخابات ہوں تو اس کے لیے ووٹ کا حق کسے ہے' کسے نہیں ہے؟ یہ تمام معاملات انتظامی امور ہیں۔ تمدن کے ارتقاء کے اعتبار سے جس سطح پر جو معاشرہ ہوگا' اس کی مناسبت سے ﴿لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾ کے اصول کے پیشِ نظر تمام معاملات اس دائرے کے اندر اندر رہیں جو کتاب وسنت نے کھینچ دیا ہے اور یہ معاملات باہمی مشورے سے انجام پائیں۔ نظامِ شورائیت کی کوئی معین شکل نہ دینے کی یہ حکمت سمجھ میں آتی ہے کہ اسلام کے دائمی وابدی اوامر ونواہی اور احکام ساری دنیا کے لیے' ہر دور اور ہر زمانہ کے لیے اور ہمیشہ کے لیے ہیں' لہٰذا شوریٰ کا ایک خاص طریقہ ہر دَور' ہر سوسائٹی اور ہر تمدن کے لیے یکساں موزوں نہیں ہوسکتا۔ البتہ شوریٰ کا جو قاعدہ آیت کے اس حصہ میں بیان کیا گیا ہے کہ ﴿اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ﴾ ''(اہل ایمان) اپنے کام باہم مشاورت سے چلاتے ہیں'' یہ قاعدہ تین باتوں کا متقاضی ہے۔ ایک یہ کہ معاملہ جن لوگوں کے اجتماعی کام سے متعلق ہو' ان سب کو مشورے میں شریک ہونا چاہیے' خواہ وہ براہِ راست شریک ہوں' یا اپنے منتخب کردہ نمائندوں کے توسط سے ہوں۔ دوسرے یہ کہ مشورہ آزادانہ' بے لاگ اور مخلصانہ ہونا چاہیے۔ دباؤ یا لالچ کے تحت مشورہ لینا مشورہ نہ لینے کے برابر ہے۔ تیسرے یہ کہ جو مشورہ اہل شوریٰ کے اتفاق رائے سے دیا جائے یا جسے ان کی اکثریت کی تائید حاصل ہو' اسے تسلیم کیا جائے اور اس کے مطابق حکومت اور اجتماعیت کے تمام معاملات چلائے جائیں۔

اب آپ غور کیجیے کہ یہ مملکت خداداد پاکستان ہم نے قائداعظم محمد علی جناح کے الفاظ میں اس لیے حاصل کی تھی کہ ہم ایک آزاد وخود مختار خطہ اس مقصد کے لیے حاصل کرنا چاہتے ہیں کہ اسلام کے جو ابدی اصول ہیں ہم اس مملکت کو ان پر عمل پیرا ہونے کے لیے ایک تجربہ گاہ بنائیں' اسے ایک نمونہ کا اسلامی معاشرہ اور نمونہ کی ایک اسلامی ریاست بنا کر پوری دنیا کے سامنے پیش کریں۔

الحمد للہ ہمارے یہاں ''قراردادِ مقاصد'' میں یہ بات طے ہوگئی ہے کہ ''حاکمیتِ مطلقہ اللہ کی ہے''۔ ہم نے پہلی بار اس اصول سے دنیا کو روشناس کرایا اور یہ بات پیشِ نظر رکھیے کہ تاریخ انسانی میں پہلی مرتبہ کسی آزاد وخود مختار اور ذمہ دار اسمبلی نے (وہ ہماری دستور ساز اسمبلی تھی) اس طریقہ سے ایک اجتماعی فیصلہ کا اعلان واظہار کیا کہ ریاست میں حاکمیتِ مطلقہ اللہ کی ہے۔ اس کے متعلق ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ریاست کی سطح پر یہ گویا کلمۂ شہادت تھا: اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ

جس کا اعلان و اظہار قراردادِ مقاصد کے ذریعے سے پوری دنیا کے سامنے ہوا۔ اور میں آج خراجِ تحسین پیش کرنا چاہتا ہوں اُس شخص یا اُن اشخاص کو جنہوں نے اس دفعہ کے الفاظ معین کیے ہیں جو ہمیشہ سے دستورِ پاکستان کے رہنما اصولوں میں شامل رہی ہے۔

"No legislation will be done repugnant to the Quran and the Sunnah."

''کوئی قانون سازی نہیں کی جائے گی جو قرآن اور سنت سے متخالف اور متصادم ہو''۔

میں نہیں جانتا کہ ان کے پیشِ نظر سورۃ الحجرات کی یہ آیۂ مبارکہ تھی یا نہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس دفعہ کے الفاظ کامل ترین نمائندگی کرتے ہیں اس آیۂ مبارکہ کے الفاظ کی ﴿لَا تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیِ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ﴾ ''مت آگے بڑھو اللہ اور اس کے رسول سے''۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان، قرآن مجید ہے۔ اگر آپ اس سے آگے نہیں بڑھتے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ اللہ سے آگے نہیں بڑھے۔ اور رسول اللہ ﷺ کی سنت آپؐ کے افعال واقوال پر مشتمل ہے۔ اگر ہم اس سے آگے نہ بڑھنے کا اقرار کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کے احکام کے دائرہ کے اندر رہنے کا عزم کیا ہے ـــــ میرے نزدیک یہ دفعہ اسلامی دستور کی بنیادی شرط کو بتمام وکمال اور باحسن وجوہ پورا کرتی ہے، بشرطیکہ یہ دفعہ محض رہنما اصول (Directive Principles) میں نہ ہو بلکہ نافذ العمل دفعات (Operative Clauses) میں شامل ہو۔ بدقسمتی سے ہماری کوتاہی یہ رہی ہے کہ اس کو تاحال نافذ العمل دفعہ بنانے کے بجائے صرف رہنما اصولوں میں رکھا گیا ہے۔ البتہ موجودہ دور میں وفاقی شرعی عدالت کے قیام کی صورت میں یوں سمجھئے کہ اس دفعہ پر عمل کا کسی نہ کسی درجے میں آغاز ہوا ہے [1] اور دورِ جدید میں اسلامی ریاست کے تقاضوں میں سے ایک بنیادی تقاضے کو، ناقص شکل ہی میں سہی، پورا کرنے کا کام شروع ہو گیا ہے۔ اللہ کرے کہ وہ دن جلد از جلد پاکستان پر طلوع ہو کہ اسلامی ریاست کے جو بھی تقاضے ہیں ان پر بھرپور انداز اور عزم بالجزم سے اقدامات شروع ہوں۔

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ۝۱ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْۤا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ۝۲ اِنَّ

(۱) واضح رہے کہ محترم ڈاکٹر صاحب کا یہ خطاب پاکستان ٹیلی ویژن پر ۸۲۔۱۹۸۱ء کے دوران نشر ہوا تھا۔ (مرتب)

الَّـذِيْـنَ يَـغُضُّـوْنَ اَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى ط
لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۳﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ يُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ
﴿۴﴾ وَلَوْ اَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّٰى تَخْرُجَ اِلَيْهِمْ لَـكَانَ خَيْرًا لَّـهُمْ ط وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۵﴾ يٰٓـاَ
يُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًاۢ بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰى
مَـا فَعَلْتُمْ نٰدِمِيْنَ ﴿۶﴾ وَاعْلَـمُوْٓا اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ ط لَوْ يُطِيْعُكُمْ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنَ الْاَمْرِ
لَعَنِتُّمْ وَلٰكِنَّ اللّٰـهَ حَبَّبَ اِلَـيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ
وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ ط اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ ﴿۷﴾ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَنِعْمَةً ط وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ
حَكِيْمٌ ﴿۸﴾

''اے ایمان والو! مت بلند کرو اپنی آوازوں کو نبیؐ کی آواز پر اور مت گفتگو کرو انؐ سے بلند آوازی کے ساتھ جیسے تم باہم ایک دوسرے سے گفتگو کر لیتے ہو' مبادا تمہارے تمام اعمال رائیگاں ہو جائیں اور تمہیں اس کا شعور تک نہ ہو۔ یقیناً وہ لوگ جو اپنی آوازوں کو اللہ کے رسول (ﷺ) کے سامنے پست رکھتے ہیں' وہی ہیں کہ جن کے دلوں کو اللہ نے تقویٰ کے لیے جانچ لیا ہے۔ ان کے لیے بخشش بھی ہے اور بہت بڑا اجر بھی۔ بلاشبہ وہ لوگ جو اے نبی (ﷺ) آپؐ کو پکارتے ہیں حجروں کے باہر سے' ان میں اکثر ناسمجھ ہیں۔ اور اگر وہ صبر کرتے یہاں تک کہ آپؐ خود ان کے پاس تشریف لاتے تو یہ ان کے لیے کہیں بہتر تھا۔ اور اللہ بخشنے والا' رحم فرمانے والا ہے۔ اے ایمان والو! اگر تمہارے پاس کوئی فاسق کوئی اہم خبر لے کر آئے تو چھان بین کر لیا کرو' مبادا تم نادانی میں کسی قوم کے خلاف اقدام کر بیٹھو اور پھر تمہیں اپنے کیے پر پچھتانا پڑے اور جان رکھو کہ تمہارے مابین اللہ کے رسول (ﷺ) موجود ہیں۔ اگر وہ تمہارا کہنا اکثر معاملات میں ماننے لگیں تو تم خود مشکل میں پڑ جاؤ گے' لیکن اللہ نے تو ایمان کو تمہارے نزدیک بہت محبوب بنا دیا ہے اور اسے تمہارے دلوں میں کھبا دیا ہے' اور تمہارے نزدیک بہت ناپسندیدہ بنا دیا ہے کفر کو بھی اور نافرمانی کو بھی اور معصیت کو بھی۔ یہی ہیں وہ لوگ جو اصل میں کامیاب ہونے والے ہیں۔ یہ فضل ہے اللہ کی طرف سے اور مظہر ہے اس کی نعمت کا۔ اور اللہ سب کچھ جاننے والا' کمال حکمت والا ہے''۔

مسلمانوں کی حیاتِ ملّی کی دوسری اہم بنیاد
نبی اکرم ﷺ کا ادب واحترام

سورۃ الحجرات کی آیات ۲ تا ۸ میں مسلمانوں کی ہیئت اجتماعیہ یا ان کی حیاتِ ملّی کی شیرازہ بندی کی جو دوسری اہم بنیاد ہے' اس کا ذکر ہے۔ پہلی بنیاد جس کا ذکر اس سورۂ مبارکہ کی پہلی آیت میں ہے' دستوری اور آئینی نوعیت کی تھی کہ ایک اسلامی ریاست یا ایک اسلامی ہیئت اجتماعیہ یا ایک اسلامی معاشرہ پابند ہے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کا۔ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کا دائرہ وہ دائرہ ہے کہ مسلمان خواہ فرد ہو' خواہ معاشرہ ہو' خواہ پوری ملتِ اسلامیہ ہو' خواہ کوئی اسلامی ریاست ہو وہ اس دائرے کے اندر محدود رہے گی۔ اب اس دائرے کا ایک مرکز بھی ہے اور مرکزی شخصیت جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی۔ اور مسلمانوں کی حیاتِ ملی کی شیرازہ بندی میں جہاں اس پہلی اصل کو بہت بڑی اہمیت حاصل ہے جو دستوری و آئینی اصل ہے' وہاں دوسری بنیاد مرکزی نقطۂ کی حیثیت کی حامل ہے کہ حضور ﷺ سے دلی محبت ہو' حضور ﷺ سے عقیدت ہو' حضور ﷺ کا ادب و احترام ہر آن ملحوظ رکھا جائے۔ آپ ﷺ کی توقیر و تعظیم ہو۔ گویا فی الجملہ ہر مسلمان کے دل میں جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی محبت اور آپ ؐ کی تعظیم جاگزیں ہو۔

یہ درحقیقت وہ جذباتی بنیاد ہے جس سے ہمارے تمدن اور ہماری تہذیب کا نقشہ بنتا ہے ـــــ یہ بات ذہن میں رکھیے کہ انسان میں صرف عقل و ذہانت (Intellect) ہی نہیں بلکہ اس میں جذبات (sentiments) بھی ہیں۔ اور کسی بھی معاشرے میں جہاں اس کی عقلی اور فلسفیانہ اساسات کو اہمیت حاصل ہے' وہاں جذبات کے لیے بھی کوئی مرکز ضروری ہے' جس کے ساتھ اگر جذباتی وابستگی نہیں ہوگی تو دل پھٹے رہیں گے' آپس میں بُعد رہے گا اور ثقافت میں کوئی یک رنگی پیدا نہیں ہو سکے گی۔ چنانچہ کوئی تہذیبی و ثقافتی ہم آہنگی (Cultural Homogenity) وجود میں نہیں آ سکے گی۔ ایک مسلمان معاشرے میں یہ مطلوبہ کیفیت درحقیقت نبی اکرم ﷺ کے اتباع کے ذریعے سے ہی پیدا ہوتی ہے۔

یہاں یہ بات بھی ذہن میں رکھنی ضروری ہے کہ ایک ہے اطاعت اور ایک ہے اتباع۔ ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اطاعت نام ہے اس رویہ کا کہ جو حکم ملے اسے پورا کر دیا

جائے ـــــ اور یہ رویہ تو اصل میں اس دستوری اور آئینی بنیاد کا جزو ہے جس پر پہلے گفتگو ہو چکی ہے۔ اتباع کا دائرہ بہت وسیع ہے جو عمل بھی اُس شخصیت سے منسوب ہے جسے اللہ کا رسول مانا گیا ہے' جس پر ایمان لایا گیا ہے' جس کی اللہ کے نبی و رسول کی حیثیت سے تصدیق کی گئی ہے' اب اس شخصیت کی نشست و برخاست کا' اس کی گفتگو کا' اس کے رہن سہن کا' اس کی وضع قطع' اس کی تہذیب اور اس کی پوری نجی و مجلسی زندگی کا جو بھی انداز ہو' اس پورے نقشے کو اپنے سیرت و کردار میں جذب کرنا' اس رویہ اور اس کیفیت کا نام دراصل اتباع ہے ـــــ اور اس کا دائرہ بہت وسیع ہے۔

ثقافتی ہم آہنگی کا اہم ذریعہ: اتباعِ رسولؐ

پھر یہ کہ درحقیقت مسلمانوں کی تہذیب اور اس کے تمدن کے جو اصل خدوخال ہیں وہ درحقیقت اسی اتباعِ رسول ﷺ سے وجود میں آئے ہیں ـــــ یہ بات پیشِ نظر رہے کہ ہر معاشرے کو اس کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ جو علامہ اقبال نے ایک خاص پس منظر میں کہا ہے کہ ؏ ''خوگر پیکرِ محسوس تھی انسان کی نظر'' تو آپ اسے چاہے انسان کی کمزوریوں میں سے ایک کمزوری شمار کریں' لیکن یہ انسان کی عالمگیر (universal) کمزوری ہے کہ کوئی دل آویز اور دلنواز شخصیت ایسی ہو کہ اگر اس سے محبت اور قلبی لگاؤ ہے تو اس معاشرے کے افراد آپس میں ایک دوسرے سے قریب رہیں گے' ان کے دلوں کی دھڑکنوں میں ہم آہنگی ہو گی۔ انسان کی یہ ضرورت ہے کہ اس کے قلبی لگاؤ کے لیے ایسی شخصیت موجود ہو جو معاشرے کی شیرازہ بندی میں نقطۂ ماسکہ کا کردار ادا کرے۔ اسے آپ ہیرو کہیں' آپ اسے کسی دوسرے اعلیٰ لقب سے پکاریں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ تمام معاشروں کو یہ ہیرو باقاعدہ گھڑنے پڑتے ہیں' یہ شخصیتیں تراشنی پڑتی ہیں۔ اس لیے کہ یہ ان کی ضرورت ہے۔ جذباتی وابستگی کے لیے ایک ایسا مرکز لازم ہے۔

کتنی بڑی خوش قسمتی ہے کہ امت محمد (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کی کہ یہاں کوئی مصنوعی شخصیت تراشنے اور گھڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ دوسروں کو تو مصنوعی شخصیتیں گھڑنی پڑتی ہیں اور ان کا معاملہ یہ ہوتا ہے کہ ہر دور میں انہیں ایک نئی شخصیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس بات کی وضاحت کے لیے علامہ اقبال کا یہ مصرع بڑا پیارا ہے کہ ؏ ''می تراشد فکرِ ما ہر دم خداوندے دگر!'' لیکن ہمارے پاس نبی اکرم ﷺ کی محبوب' دلنواز' دلآویز' من موہنی' معراجِ انسانیت پر فائز شخصیت' جن کی سیرت و کردار پر کوئی دشمن بھی کہیں کوئی انگلی نہ رکھ سکا' انسانِ کامل' انسانی عظمت کا مظہر اتم شخصیت موجود ہے۔ آپ ﷺ کی شخصیت ہماری ملی شیرازہ بندی کے لیے مرکزی شخصیت ہے۔ آپؐ کے ساتھ دلی

محبت، آپؐ کا ادب، آپؐ کی تعظیم، آپؐ کا احترام، آپؐ سے عقیدت، اگر اسلامی معاشرہ میں ان تمام امور کا جذبہ موجود رہے گا تو معاشرہ بنیانِ مرصوص بنا رہے گا۔ آپ ﷺ وہ شخصیت ہیں کہ جن کے متعلق بالکل صحیح کہا گیا ہے ؎

ادب گاہیست زیرِ آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا!

آپؐ وہ شخصیت ہیں جن کے بارے میں علامہ اقبال نے بالکل درست کہا ہے کہ ؎

بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ اُو نہ رسیدی تمام بولہبی است

اب اگر ہم ان دونوں کو جمع کریں تو ایک ہے ہماری ہیئت اجتماعیہ یا حیاتِ ملی کے لیے دستوری، آئینی اور قانونی بنیاد ـــــ اور وہ ہے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کی اطاعت۔ یہ گویا ایک دائرہ ہے اور اس دائرے کے درمیان ہے ایک انتہائی دلنواز اور دلآویز شخصیت، بقول شاعر ع ''نگہ بلند سخن دل نواز جاں پرسوز'' کا مصداقِ کامل ـــــ اس کے لیے اگر ''مرکز ملت'' کی اصطلاح اختیار کی جائے تو مجھے اعتراض نہیں، لیکن اس شرط کے ساتھ کہ ہمارا یہ مرکز دائم وقائم ہے۔ یہ کسی بھی دور میں بدلنے والا نہیں ہے، بلکہ یہ تو ہمیشہ ہمیش کے لیے تا قیامِ قیامت جناب محمد رسول اللہ ﷺ ہی کی شخصیت ہے جو ''مرکز ملت'' کے مقام پر فائز رہے گی اور حضور ﷺ ہی کو معیارِ مطلق بنانا ہوگا۔ مختلف مسلمان معاشروں اور مختلف مسلمان ملکوں میں یقیناً جب رہنما اور مصلح سامنے آتے ہیں تو ہمیں ان سے محبت و عقیدت ہوتی ہے۔ اگر ترکوں کے دلوں میں مصطفیٰ کمال کی عظمت ہے تو ٹھیک ہے، وہ ان کے محسن تھے۔ اسی طرح پاکستانی مسلمانوں کے دلوں میں اگر قائداعظم محمد علی جناح مرحوم کی محبت ہے تو درست ہے، وہ ہمارے محسن ہیں۔ لیکن ہمیشہ کے لیے اور جو ابدی معیار قائم ودائم رہے گا وہ شخصیت جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی ہے۔ اگر ہم نے اس معیار کو مجروح کر دیا تو یہ جان لیجیے کہ پھر مسلمانوں کی حیاتِ ملی کی ایک اہم اساس منہدم ہو جاتی ہے۔ یہ ہمارا معیار ہے جو مستقل ہے، دائم وقائم ہے۔ یہ نہ صرف ہماری تہذیبی وثقافتی ہم آہنگی کی ضمانت دیتا ہے، بلکہ اس تہذیبی وثقافتی ہم رنگی، ہم آہنگی اور یکسانیت کے ساتھ تہذیب وثقافت کا ایک تسلسل وتواتر ہے جو چودہ سو سال سے جاری وساری ہے۔ وضع قطع اور لباس کے حدود وقیود اور نشست وبرخاست کے انداز، حضور ﷺ کے اُسوۂ حسنہ کے اتباع سے

مسلمانوں میں فروغ پذیر ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی مسلمان چاہے مشرق بعید کے رہنے والے ہوں یا مغربِ بعید کے، غرض دنیا کے کسی خطے میں بسنے والے مسلمان ہوں، ان سب کے درمیان ایک مناسبت، ہم رنگی اور یکسانیت نظر آتی ہے۔ یہ اسی لیے ہے کہ ان کے لیے مرکزی شخصیت ہمیشہ ہمیش کے لیے جناب محمدٌ رسول اللہ ﷺ کی ہے۔

مرتبہ ومقامِ محمدیؐ کا لحاظ اشد ضروری ہے

ان آیات کا مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے دوران کچھ واقعات ایسے ہوئے کہ جن میں لوگوں سے کچھ بے احتیاطی ہوئی، جس سے حضور ﷺ کا بلند، ارفع واعلیٰ مقام مجروح ہونے کا کچھ اندیشہ ہوا۔ کسی نے کبھی اپنی آواز کو حضور ﷺ کی آواز سے کچھ بلند کرلیا—— اس پر فرمایا گیا کہ مسلمانو! ہرگز ایسا نہ کرنا۔ یہ وہ عمل ہے کہ تمہیں محسوس بھی نہیں ہوگا لیکن یہ اتنی بڑی گستاخی شمار ہوگی کہ تمہارے پچھلے کیے کرائے سارے اعمال رائیگاں ہو جائیں گے، تمہاری ساری نیکیاں اکارت جائیں گی—— پھر مثبت انداز میں بھی فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کی تعلیم اور اس کی افزائش کے لیے انہی حضرات کے دلوں کو جانچ کر اور پرکھ کر منتخب فرما لیا ہے کہ جو اپنی آوازوں کو نبی ﷺ کی آواز کے سامنے پست رکھتے ہیں۔ اس معاملہ میں باہر سے آنے والے بدوؤں سے کچھ بے احتیاطی ہو جاتی تھی۔ جیسے کتب سیرت میں واقعہ ملتا ہے کہ بنی تمیم کے کچھ لوگ آئے اور جیسا کہ وہاں کے بدوؤں کا ایک مزاج تھا، انہوں نے مسجد نبوی میں آکر پکارنا شروع کر دیا ''یا محمّد اُخرج علینا'' یعنی ''اے محمد (ﷺ) باہر آیئے'' —— اس پر ان کو ٹوک دیا گیا، لیکن ساتھ ہی فرما دیا گیا کہ یہ لوگ ناسمجھ ہیں۔ ان کی نیت میں خلل نہیں ہے، یہ ان کے مزاج کا اکھڑ پن ہے جو ان کی طبیعتِ ثانیہ بن گیا ہے، اسی کا یہ ظہور ہے، لہٰذا ٹوکنے کے ساتھ ہی فرمایا گیا کہ: ﴿وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۵﴾ ''اللہ بخشنے والا ہے، رحم فرمانے والا ہے''، لیکن احتیاط کی ضرورت ہے۔

اس کے بعد آیت ۶ میں جو بات آئی ہے، اس پر ان شاء اللہ بعد میں گفتگو ہوگی۔ گزشتہ نشست میں مَیں نے اس سورۂ مبارکہ کے مضامین کو تین موضوعات میں تقسیم کیا تھا۔ چھٹی آیت کا تعلق ان معین موضوعات میں سے دوسرے موضوع سے ہے، لیکن آیات ۷ اور ۸ میں وہ اہم ترین بات آئی ہے جو آج کی گفتگو سے متعلق ہے۔ فرمایا: ﴿وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۭ﴾ ''اچھی طرح جان لو کہ تمہارے مابین'' (جو محمد ﷺ کی شخصیت ہے وہ) اللہ کے رسول ہیں''۔—— اگرچہ یہ صحیح ہے کہ یہ محمد بن

عبداللہ بن عبدالمطلب ہیں' لیکن تمہیں آپؐ کی جو شان ہر آن ملحوظ رکھنی چاہیے وہ یہ حقیقت ہے کہ حضورﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ اب فرض کیجیے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ یہ سمجھ کر کہ حضورﷺ میرے بھتیجے ہیں' آپؐ کے سات اس طرح کا معاملہ کریں جیسے ایک بڑا اپنے چھوٹے سے کرتا ہے تو یہاں حضورﷺ کی رسول کی حیثیت کے مجروح ہونے کا اندیشہ تھا۔ لہٰذا فرمایا گیا: ﴿وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ ؕ﴾ ''اور جان لو کہ تمہارے مابین اللہ کے رسول ہیں''۔ ان کے ساتھ وہ معاملہ کرو جو ایک اُمتی کو رسول کے ساتھ کرنا چاہیے اور وہ یہ ہے کہ حضورﷺ کا ادب واحترام اور آپﷺ کی تعظیم و توقیر کو ہر آن ملحوظ رکھو ــــــ اس ضمن میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کا یہ نقشہ خاص طور پر سامنے لایا گیا کہ اللہ نے تمہارے دلوں میں ایمان کو راسخ اور جاگزیں کر دیا ہے' اسے تمہارے دلوں میں کھبا دیا ہے' تمہارے دلوں کو ایمان سے مزین کر دیا ہے اور کفر وفسق سے اور معصیت سے تمہیں طبعاً نفرت ہو چکی ہے۔ اس اسلوب میں جہاں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مدح ہے' وہاں یہ ترغیب وتشویق کا بھی انداز ہے کہ اس معاملے میں ذرا احتیاط ملحوظ رکھنے کی ضرورت ہے کہ حضورﷺ کی رسول اللہﷺ ہونے کی حیثیت کسی حال میں بھی نظر انداز نہ ہونے پائے۔

مقامِ رسالت کے حوالے سے ہماری ذمہ داری؟

آخری بات یہ سامنے رکھیے کہ اس حکم پر ہم کیسے عمل کریں؟ اس کا تعلق ہم سے یہ ہے کہ حضورﷺ کی ثابت شدہ سنتیں اور حضورﷺ کی احادیث حضورﷺ کی قائم مقام ہیں۔ نبی اکرمﷺ کی آج بھی معناً ہمارے مابین موجود ہیں' اس لیے کہ حضورﷺ کی سنتیں آج بھی زندہ و پائندہ ہیں۔ حضورﷺ کا اُسوۂ حسنہ آج بھی نصف النہار کے خورشید کی طرح درخشاں وتاباں ہے۔ ہمارے سامنے جب بھی کوئی بات حضورﷺ کی آئے ہمیں اپنی عقل کو ایک طرف رکھ دینا چاہیے' اپنے فلسفے بھگارنے بند کر دینے چاہئیں' اپنی منطق کو پس پشت ڈال دینا چاہیے' اپنے ''اقوال'' پر تالا ڈال دینا چاہیے۔ تحقیق تو ہوسکتی ہے کہ حضورﷺ نے یہ بات فرمائی یا نہیں فرمائی' لیکن ادب کا تقاضا یہ ہے کہ حضورﷺ کی حدیث کے حوالے سے جب بات سامنے آئے تو زبان فوراً بند ہو جائے' سر فوراً جھکا دیے جائیں۔ بعد میں اگر تحقیق سے معلوم ہو کہ روایت صحیح نہیں تو ٹھیک ہے' اس پر اب عمل نہیں ہوگا۔ لیکن ادب کا تقاضا یہ ہے کہ حضورﷺ کی کوئی بات اگر سامنے آئے تو فوراً سرِ تسلیم خم کر دیا جائے۔ لیکن اگر اس کے برعکس پھر بھی ہم اپنے فلسفے چھانٹیں اور اپنی منطق بگھاریں تو یہ وہ طرزِ عمل ہو جائے گا کہ ﴿اَنْ تَحْبَطَ

اَعۡمَالُکُمۡ ﴾ ''مبادا تمہارے تمام اعمال اکارت ہو جائیں'' ﴿وَاَنۡتُمۡ لَا تَشۡعُرُوۡنَ ﴿۲﴾﴾ ''اور تمہیں اس کا ادراک و احساس تک نہ ہو''۔

اس کے بعد ہم آیت ۶ اور آیات ۹'۱۰ کا مطالعہ کرتے ہیں۔فرمایا:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنۡ جَآءَکُمۡ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوۡۤا اَنۡ تُصِیۡبُوۡا قَوۡمًۢا بِجَهَالَةٍ فَتُصۡبِحُوۡا عَلٰی مَا فَعَلۡتُمۡ نٰدِمِیۡنَ ﴿۶﴾﴾

﴿وَاِنۡ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اقۡتَتَلُوۡا فَاَصۡلِحُوۡا بَیۡنَهُمَا ۚ فَاِنۡۢ بَغَتۡ اِحۡدٰىهُمَا عَلَی الۡاُخۡرٰی فَقَاتِلُوا الَّتِیۡ تَبۡغِیۡ حَتّٰی تَفِیۡٓءَ اِلٰۤی اَمۡرِ اللّٰهِ ۚ فَاِنۡ فَآءَتۡ فَاَصۡلِحُوۡا بَیۡنَهُمَا بِالۡعَدۡلِ وَاَقۡسِطُوۡا ؕ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الۡمُقۡسِطِیۡنَ ﴿۹﴾ اِنَّمَا الۡمُؤۡمِنُوۡنَ اِخۡوَةٌ فَاَصۡلِحُوۡا بَیۡنَ اَخَوَیۡکُمۡ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّکُمۡ تُرۡحَمُوۡنَ ﴿۱۰﴾﴾

''اے ایمان والو! اگر تمہارے پاس کوئی فاسق کوئی اہم خبر لے کر آئے تو چھان بین کر لیا کرو۔ مبادا تم نادانی میں کسی قوم کے خلاف اقدام کر بیٹھو اور پھر تمہیں اپنے کیے پر پچھتانا پڑے''۔

اس کے بعد فرمایا:

''اور اگر اہل ایمان میں سے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے مابین صلح کرا دو' اور اگر ان میں سے ایک گروہ دوسرے پر زیادتی کرنے پر مصر رہے تو اس سے لڑو یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کے سامنے جھک جائے۔ پھر اگر وہ اللہ کے حکم کو تسلیم کر لے تو پھر صلح کرا دو ان دونوں کا مابین انصاف کے ساتھ' اور عدل سے کام لو' یقیناً اللہ انصاف کرنے والوں سے محبت رکھتا ہے۔ یقیناً تمام اہلِ ایمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ پس تم اپنے بھائیوں کے مابین صلح کرا دیا کرو' اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو (اس کی نافرمانی سے بچو) تاکہ تم پر رحم کیا جائے''۔

دو بڑے احکام:

اہم خبروں کی چھان پھٹک اور نزاع کی صورت میں صلح کرانے کا حکم

جیسا کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے کہ مسلمانوں کی حیاتِ ملی کی شیرازہ بندی کو مستحکم رکھنے کے لیے چند نہایت اہم احکام ہیں جو سورۃ الحجرات میں وارد ہوئے ہیں۔ مسلمانوں کی حیاتِ ملی یا ہیئت اجتماعیہ کی جو دو بنیادیں ہیں ان کی نشاندہی بھی ہو چکی ہے۔ ایک دستوری' آئینی و قانونی بنیاد جس پر

نظامِ حکومت قائم ہوتا ہے۔ دوسری وہ جذباتی بنیاد جس سے تمدن اور تہذیب وثقافت وجود میں آتی ہے ــــــ اب اس ہیئت اجتماعیہ کی شیرازہ بندی کو مضبوط رکھنے کے لیے دو احکام زیرِ مطالعہ آیات میں وارد ہوئے ہیں اور یہ دونوں احکام نہایت اہم ہیں۔

افواہوں کی روک تھام

پہلا حکم یہ ہے کہ محض افواہ پر کوئی اقدام نہ کیا جائے۔ اگر کہیں سے کوئی خبر آئے اور خبر بھی اہم قسم کی ہو (عربی میں ''نبـــا'' اہم خبر کو کہتے ہیں) تو اس کے ضمن میں سب سے پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ یہ خبر لانے والا کون ہے! اگر وہ کوئی انتہائی معتبر شخصیت ہو مثلاً حضرت ابوبکر صدیق، عمر فاروق، عثمان غنی، یا علی مجتبیٰ جیسے جلیل القدر صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے کوئی خبر دے رہا ہو تو کسی تحقیق، کسی تبیین اور کسی تفتیش کی ضرورت نہیں ہے، لیکن اگر اس خبر کو لانے والا کوئی ایسا شخص ہے کہ جو احکامِ الٰہیہ پر اس طور سے کاربند نہیں ہے جس طرح ایک مؤمن صادق کو ہونا چاہیے تو ایسے شخص کی لائی ہوئی خبر پر کوئی اقدام کرنا بہت خطرناک ہوسکتا ہے، لہٰذا اس کی تحقیق، تبیین اور تفتیش ضروری ہے۔ اور اسی سے یہ بات از خود سامنے آتی ہے کہ اگر وہ شخص ایسا ہے کہ جس کے بارے میں معلوم نہیں ہے کہ یہ شخص متقی ہے یا فاسق، تو سب سے پہلے اس شخص کے بارے میں تحقیق کرنی ہوگی کہ اس کا کردار کیسا ہے! اس کا اخلاق کیسا ہے! دین کے ساتھ اس کے رویے اور طرزِ عمل کا معاملہ کیسا ہے! ــــــ تو یہ دونوں چیزیں سامنے رکھیے کہ خبر لانے والے کے بارے میں بھی تحقیق وتفتیش ــــــ اور پھر جو ''خبر'' لائی گئی ہو اس کے بارے میں بھی پوری چھان بین کرنی ضروری ہے۔ ان دونوں مرحلوں سے گزر کر پھر کوئی فیصلہ کیا جائے اور اس فیصلے کے مطابق پھر کوئی اقدام ہو۔

واقعہ یہ ہے کہ اگر ان معاملات میں سہل انگاری سے کام لیا جائے اور ان احتیاطوں کو ملحوظ نہ رکھا جائے تو ہوسکتا ہے کہ نادانی، نادانستگی اور جہالت میں کسی غلط اطلاع کی بنیاد پر کوئی اہم اقدام ہو جائے اور بعد میں معلوم ہو کہ یہ اطلاع ہی سرے سے غلط تھی۔ یہ معاملہ عام طور پر خود ہمارے معاشرے میں نظر آتا ہے کہ ایک افواہ کہیں سے چلی اور پھر وہ بڑھتی چلی گئی، ایک کی زبان سے نکلی اور دوسرے کے کان تک پہنچی۔ اب دوسرے کی زبان سے نکلتی ہے تو اس میں اضافے ہوتے ہیں اور پھر یہ افواہ اضافوں کے ساتھ معاشرے میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل جاتی ہے اور لوگ اس پر یقین کر لیتے ہیں۔ لہٰذا یہ بات بڑی اہم ہے کہ تحقیق وتفتیش کے ذریعے صحیح معلومات حاصل کرنے کے

بعد کوئی اقدام ہو۔ اس سلسلے میں نبی اکرم ﷺ کا ایک فرمان بہت ہی پیارا ہے۔ آپؐ نے ہمارے سامنے ایک ایسا معیار رکھا ہے کہ واقعتاً اگر اس پر انسان کسی درجے میں بھی عمل پیرا ہو جائے تو اس طرح کے تمام اندیشوں کا سدّ باب ہو جائے گا۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((كَفٰى بِالْمَرْءِ كَذِبًا اَنْ يُّحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ)) (۱) ''کسی شخص کے جھوٹا ہونے کے لیے یہی بات کافی ہے کہ وہ جو کچھ سنے اسے آگے بیان کر دے''۔۔۔۔ اب دیکھئے کہ یہ بڑی عجیب اور بڑی پیاری بات ہے جو حضور ﷺ نے ارشاد فرمائی کہ ایک شخص نے کسی سے کچھ سنا' اس میں کوئی اضافہ بھی نہیں کیا' وہی بات جوں کی توں آگے بیان کر دی تو یہ طرزِ عمل ہی اس کے جھوٹا ہونے کے لیے کافی ہے۔ غور کیجیے کہ بات کیا ہے! اسے یہ چاہیے تھا کہ اس بات کو اپنی زبان سے نکالنے سے پہلے خود اس کی تحقیق کر لیتا۔ بالفرض وہ بات غلط ہے تو اس غلط بات کے پھیلانے میں وہ بھی ایک واسطہ بن گیا۔ اس کے ذریعے سے وہ جھوٹ کتنی دور تک پھیل سکتا ہے' اس کا اندازہ ہر شخص خود کر سکتا ہے۔

احادیثِ مبارکہ کے معاملے میں خصوصی احتیاط

اب اس ضمن میں ایک بات مزید نوٹ کر لیں۔ زیر مطالعہ آیت سے اگلی آیت (نمبر ۷) جس کا ہم مطالعہ کر چکے ہیں' اس میں خاص طور پر نبی اکرم ﷺ کے مقام کو بڑی وضاحت سے سامنے لایا گیا ہے کہ ﴿وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ ؕ﴾ ساتویں آیت کے اس جزو کا چھٹی آیت سے بھی ربط ہے۔ وہ اس پہلو سے کہ تمام اطلاعات اور تمام خبروں کی تحقیق و تفتیش ہونی چاہیے' لیکن جو بات خاص طور پر نبی اکرم ﷺ کی طرف منسوب ہو رہی ہو' چاہے وہ کتنی چھوٹی سے چھوٹی بات ہی کیوں نہ ہو' ہر مسلمان کے لیے وہ بات اس اعتبار سے بہت بڑی ہے کہ یہ حضور ﷺ کے فرمان کے طور پر پیش کی جا رہی ہے۔ اسی سے تو ہماری ساری شریعت اور ہمارے تمام قوانین کا ڈھانچہ بنے گا اور اسی پر ہمارے تمدن اور ہماری تہذیب و ثقافت کی تشکیل ہو گی' لہٰذا اس معاملہ میں سہل انگاری' صرف نظر یا تساہل عام معاملات کے مقابلے میں بہت زیادہ خطرناک نتائج پیدا کر سکتا ہے۔

یہ ہے وہ اہم بات جس کے تحت ہمارے محدثین کرام رحمہم اللہ نے احادیث کی تحقیق و تفتیش میں اپنی پوری پوری زندگیاں لگا دیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں اجر عظیم عطا فرمائے کہ انہوں نے حضور ﷺ کی احادیث بیان کرنے والے راویوں کے حالات کی بھی پوری چھان بین کی اور جرح و تعدیل کے

(۱) صحيح مسلم كتاب المقدمة، باب النهى عن الحديث بكل ما سمع

اصول معین کیے۔ اس طرح اسماء الرجال کا ایک بہت بڑا علم اور ایک بہت بڑا فن وجود میں آیا۔ ہزاروں راویانِ احادیث کی زندگیوں کے بارے میں تحقیق ہوئی' پھر ان کے حالات مدون کر کے ضبطِ تحریر میں لائے گئے' پھر ان کی درجہ بندی کی گئی۔ اگر کسی شخص نے نبی اکرم ﷺ کی طرف منسوب کر کے کوئی بات کہی تو اسے محض اس بنیاد پر قبول اور تسلیم نہیں کر لیا جائے گا کہ یہ بات ''قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم '' کے الفاظ سے بیان کی گئی ہے' بلکہ اس کی پوری تحقیق و تفتیش اور پوری چھان بین ہوگی' روایتاً بھی ہوگی اور درایتاً بھی۔ ان راویوں کے حالات پر بھی جرح ہوگی جو اس کو بیان کرنے والے ہیں۔ حدیث میں جتنے بھی واسطے اور links ہیں' ان کی ثقاہت اور ان کے تدین کی بھی تحقیق ہوگی۔ پھر حدیث کے متن پر درایتاً بھی غور کیا جائے گا۔ یہ سارے کا سارا نظام درحقیقت اسی حکم کے تحت ہے کہ ''اے اہل ایمان! اگر تمہارے پاس کوئی فاسق کوئی اہم خبر لے کر آئے تو تحقیق اور تفتیش کر لیا کرو''۔

باہمی نزاع کی صورت میں صلح کرانے کا حکم

اب آیئے اس دوسرے بڑے حکم کی طرف جو آیات ۹ اور ۱۰ میں ہمارے سامنے آیا—— اگر اس ساری احتیاط کے باوجود مسلمانوں کے دو گروہوں کے مابین کوئی نزاع برپا ہو جائے' کوئی جھگڑا ہو جائے' کسی نوع کا اختلاف ہو جائے اور یہ اس شدت کو پہنچ جائے کہ وہ باہم ایک دوسرے سے لڑ پڑیں تو ایک مسلم معاشرے کا کیا رویہ ہو! فرمایا: ﴿وَاِنۡ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اقۡتَتَلُوۡا......﴾ ''اور اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں......'' اس کے معنی یہ ہیں کہ مسلمان بھی آخر انسان ہیں۔ خطا اور نسیان کا ارتکاب ہر انسان سے ہو سکتا ہے' لہٰذا مسلمانوں کے مابین اگر کوئی جھگڑا کھڑا ہو جائے' وہ باہم لڑنے اور جھگڑنے لگ پڑیں تو یہ کوئی انہونی بات نہیں ہے' ایسا ہو سکتا ہے۔ پوری نیک نیتی کے ساتھ بھی اختلاف ہو سکتا ہے۔ پھر حالات ایسی صورت بھی اختیار کر سکتے ہیں کہ دونوں فریق اگرچہ نیک نیت ہوں' لیکن پھر بھی مسئلہ الجھتا چلا جائے۔ خاص طور پر اس صورت میں جبکہ کچھ خارجی عناصر بھی موجود ہوں اور کوئی سازشی عنصر اندر بھی موجود ہو کہ جو دونوں فریقوں کو بھڑکا رہا ہو' تو ہو سکتا ہے کہ خلوص اور نیک نیتی کے باوصف وہ جھگڑا باہمی قتال اور جنگ کی صورت اختیار کر جائے۔ اس صورتحال کا مطلب یہ نہیں ہوگا کہ ان میں سے کسی ایک فریق کو دائرۂ اسلام سے خارج قرار دے دیا جائے یا ان کے ایمان کی نفی کر دی جائے۔ واضح رہے کہ اس آیت کے آغاز میں دونوں لڑنے جھگڑنے والے گروہوں

کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ:﴿ وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا ﴾ ’’اور اگر اہل ایمان کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں‘‘۔ چنانچہ یہ بات نوٹ کرنے کی ہے کہ ان میں سے کسی کے بھی ایمان کی نفی نہیں کی گئی ہے۔

مصالحت کا قانون

آگے چلیے‘ اس سورۂ مبارکہ کی آیات زیر مطالعہ میں ایک پورا قانون بیان ہوا ہے‘ جس کی کئی دفعات ہیں۔ پہلی دفعہ یہ ہے کہ ﴿فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا ﴾ کہ یہ تمہارا فرض ہے کہ ان کے مابین صلح کرا دو۔ یعنی بے تعلقی کا رویہ صحیح نہیں ہے کہ ہمیں مداخلت کی کیا ضرورت ہے‘ یہ ان کا آپس کا معاملہ ہے جس سے وہ خود نمٹیں۔ یہ روش چھوٹی سطح پر بھی غلط ہے اور بڑی سطح پر انتہائی غلط ہے۔ اگر دو بھائیوں کے مابین اختلاف ہو گیا ہو اور بقیہ بھائی یا قریبی اعزہ یہ سوچیں کہ یہ اپنا اختلاف آپس ہی میں طے کریں‘ ہم اگر ایک کے حق میں بات کہیں گے تو خواہ مخواہ دوسرے کی خفگی اور ناراضگی مول لیں گے اور دوسرے کے حق میں بات کریں گے تو خواہ مخواہ دوسرے کی خفگی اور ناراضگی مول لیں گے اور دوسرے کے حق میں بات کریں گے تو پہلا خفا اور ناراض ہو جائے گا۔ تو یہ بے تعلقی کا رویہ بہت غلط ہے۔ اس کے لیے انگریزی محاورے ’’Nip the evil in the bud‘‘ کے مطابق عمل ہونا چاہیے۔ چنانچہ برائی نے جہاں بھی ظہور کیا ہے‘ وہ ایک رخنہ ہے جو مسلمانوں کی ہیئت اجتماعیہ میں رونما ہوا ہے‘ اس فصیل میں ایک دراڑ پڑ گئی ہے‘ اگر یہ دراڑ بڑھ گئی تو اس سے غنیم کو اندر آنے کا موقع ملے گا‘ دشمن اندر گھس آئے گا‘ لہٰذا پہلی فرصت میں اس دراڑ کو بند کرو اور اس رخنے کو ختم کرو۔ چنانچہ حکم دیا گیا ﴿فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا ﴾ یہ پہلی دفعہ ہے اور چونکہ ’’اَصْلِحُوْا‘‘ فعل امر ہے اور فقہ میں عام طور پر یہ اصول مانا جاتا ہے کہ ’’الامر للوجوب‘‘ پس معلوم ہوا کہ یہاں مسلمانوں پر واجب اور فرض کیا جا رہا ہے کہ وہ مصالحت کرائیں۔

اب اس کے بعد دوسری دفعہ ہے ﴿فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى ﴾ ’’پس اگر (مصالحت اور صلح کی کوشش کے باوجود) ایک گروہ دوسرے گروہ پر زیادتی کرتا جا رہا ہے‘‘—— اس زیادتی کی دو شکلیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ گروہ مسلمانوں کی جو مجموعی طاقت اور قوت ہے‘ اسے صلح سے انکار کر کے ضعف پہنچانے کا سبب بن رہا ہے اور بے جا طور پر اپنی زیادتی پر مصر ہے۔ دوسری یہ کہ ان کے مابین جو صلح اور مصالحت کرائی گئی تھی‘ اس کی شرائط پر وہ کاربند نہیں رہا‘ اس نے از سر نو کوئی زیادتی کی

ہے۔ان دونوں حالتوں کے بارے میں حکم مل رہا ہے:﴿فَقَاتِلُوا الَّتِیْ تَبْغِیْ﴾ ''اب تم اس گروہ سے لڑو جو زیادتی کر رہا ہے''—— یعنی اب یہ جھگڑا دو فریقوں کے مابین نہیں رہا بلکہ ملت کا بحیثیت مجموعی جو مقام و مرتبہ ہے' اس گروہ نے اسے چیلنج کیا ہے' وہ اسے غیر مؤثر بنانے اور نقصان پہنچانے کے درپے ہے۔لہٰذا اب اُمت کی مجموعی طاقت بروئے کار آئے اور وہ زیادتی کرنے والے گروہ سے لڑ کر اسے مجبور کرے کہ وہ اس زیادتی سے باز آ جائے۔ چنانچہ فرمایا:﴿حَتّٰی تَفِیْءَ اِلٰٓی اَمْرِ اللّٰهِ﴾ ''یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کے سامنے جھک جائے''۔ یہاں ''امراللہ'' میں ان شرائط کی طرف اشارہ ہے جو ملت کی ہیئت اجتماعیہ نے ان دونوں فریقوں کے مابین طے کرائی تھیں۔ وہی شرائط درحقیقت امر اللہ ہیں۔

تیسری دفعہ یہ بیان فرمائی:﴿فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا ؕ﴾''پھر اگر وہ فریق لوٹ آئے' زیادتی سے باز آ جائے تو پھر ان کے مابین از سرِ نو عدل کے ساتھ صلح کراؤ' اور انصاف سے کام لو''—— آیت کے اس حصے پر غور فرمایئے۔ یہ قرآن حکیم کا اعجاز ہے اور یہ وہ مقام ہے جہاں واقعتاً گھٹنے ٹیکنے پڑتے ہیں اور سر جھکانا پڑتا ہے کہ یہ انسان کا کلام نہیں ہوسکتا' یہ اللہ ہی کا کلام ہے—— یہاں بات دو اسلوبوں سے فرمائی گئی ہے:﴿بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا﴾ یعنی اب جو صلح کراؤ تو عدل کے ساتھ کراؤ اور دیکھو انصاف کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے۔ یہ تکرار کیوں ہوئی؟ یہ اس لیے کہ جب ملت نے بحیثیت مجموعی ایک فریق کو صلح پر مجبور کیا ہے تو ہوسکتا ہے کہ جذبات میں آ کر اس فریق پر کوئی ناروا زیادتی ہو جائے اور اسے زیادہ سے زیادہ دبانے کا رجحان پیدا ہو جائے' لہٰذا یہ خاص احتیاط کا مقام ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اب بطور سزا اس پر ایسی شرائط عائد کر دی جائیں جو نامناسب و ناروا ہوں اور جو زیادتی کے زمرے میں آتی ہوں۔ چنانچہ متنبہ کر دیا گیا ہے کہ زیادتی کرنے والا فریق بھی آخر مسلمان ہی ہے' اہل ایمان ہی میں سے ہے' لہٰذا اب کہیں اس پر زیادتی نہ ہو جائے اور عدل وقسط کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹ جائے۔آیت کے آخر میں فرمایا:﴿ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ ۝﴾ ''جان رکھو کہ بلا شک وشبہ اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔''

صلح ومصالحت کی اصل بنیاد

اس کے بعد اگلی آیت میں ایک حتمی وقطعی ضابطہ اور سنہری اصول بیان فرما دیا گیا کہ مسلمانوں کے مابین معاملات اور تنازعات طے کراتے ہوئے جو روح کارفرما رہنی چاہیے' جو اہم ترین بات پیش

نظر رکھنی چاہیے وہ کیا ہے! اس کی ان الفاظِ مبارکہ میں تعلیم دی گئی اور تلقین فرمائی گئی: ﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ﴾ ''یقیناً تمام مسلمان، تمام اہل ایمان آپس میں بھائی بھائی ہیں''۔ ﴿فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ﴾ ''لہٰذا اپنے بھائیوں کے مابین صلح، صفائی اور مصالحت کرا دیا کرو''——ان الفاظِ مبارکہ کے ذریعے سے فطرتِ انسانی کو اپیل کیا گیا ہے۔ یہ انسان کی فطرتِ سلیمہ کا تقاضا ہے کہ دو بھائیوں کے مابین جھگڑے کو دیکھ کر کوئی خوش نہیں ہوتا۔ دو بھائیوں کو لڑتا جھگڑتا دیکھ کر ہر سلیم الفطرت انسان یہ چاہے گا کہ ان کے مابین صلح اور مصالحت کرائے۔ تو اسی فطرت کو اپیل کیا جا رہا ہے کہ مسلمان تو سب کے سب آپس میں بھائی بھائی ہیں، ان سب کا ایک دوسرے سے رشتۂ اخوت ہے، لہٰذا اگر مسلمانوں کے مابین کہیں ایسا اختلاف ہو جایا کرے کہ جھگڑے اور لڑائی کی نوبت آ جائے تو اسی جذبے اور روح کے ساتھ جو بھائی بھائی ہونے کے ناطے تم میں ہونی لازمی ہے، ان کے مابین صلح کرانے کی کوشش کرو۔ آخر میں فرمایا: ﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۱۰﴾﴾ ''اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو، اس کی نافرمانی سے بچتے رہو، اسی طرزِ عمل کے نتیجے میں تم اُمید کر سکتے ہو کہ تم پر رحم کیا جائے گا، تم پر رحمت خداوندی کا سایہ ہوگا''۔

ہمیں ان احکام کو اپنی گھریلو سطح پر، برادری کی سطح پر اور محلّہ کی سطح پر پیشِ نظر رکھنا چاہیے اور اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرتے رہنا چاہیے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ جلد وہ دن بھی لائے کہ پوری اُمت مسلمہ ایک وحدت کی شکل اختیار کر لے، ان کے آپس کے جھگڑے، تنازعات، اختلافات ختم ہو جائیں اور یہ بات صورتِ واقعہ اختیار کر لے کہ ؎

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر

یا جیسے علامہ اقبال مرحوم نے اپنے لیکچرز میں کہا ہے کہ مسلمان قوموں کی ایک دولت مشترکہ (Common Wealth) ہی وجود میں آ جائے۔ پھر عجیب بات ہے کہ علامہ نے اس ضمن میں طہران کا تذکرہ کیا تھا کہ ؎

طہران ہو گر عالمِ مشرق کا جنیوا
شاید کرۂ ارض کی تقدیر بدل جائے!

اللہ تعالیٰ اگر ہمیں عالمِ اسلام کا ایک ''کامن ویلتھ'' قائم کرنے کی توفیق عطا فرمائے تو ہم اس

بلند سطح پر بھی ان احکامِ قرآنیہ پر عمل کرنے کے قابل ہو جائیں گے جو مذکورہ بالا آیات کی روشنی میں ہمارے سامنے آئے ہیں۔

چھ معاشرتی ومجلسی برائیاں
اوران سے بازرہنے کے تاکیدی احکام

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ ۚ وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ؕ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ ۚ وَمَنْ لَّمْ يَتُبْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۱۱﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۫ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ؕ اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲﴾﴾ (الحجرات)

''اے ایمان والو! تم میں سے کوئی گروہ کسی دوسرے گروہ کا مذاق نہ اڑائے' ہوسکتا ہے کہ وہ گروہ ان سے بہتر ہو۔ اور نہ ہی عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں' ہوسکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔ اور نہ ہی تم اپنے آپ کو عیب لگاؤ اور نہ ہی ایک دوسرے کے برے نام رکھو۔ ایمان کے بعد تو برائی کا نام بھی برا ہے اور جو اس سے باز نہیں آئے گا تو (اللہ تعالیٰ کے نزدیک) وہی ظالم ہیں۔ اے ایمان والو! کثرت سے گمان کرنے سے بچو' اس لیے کہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں اور نہ ہی ٹوہ لگایا کرو اور نہ تم میں سے کوئی کسی دوسرے کی غیبت کرے۔ کیا تم سے کوئی شخص اسے پسند کرے گا کہ وہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے؟ پس یہ بات تو تمہیں انتہائی ناپسند ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرو' یقیناً اللہ توبہ قبول کرنے والا (اور) رحم فرمانے والا ہے''۔

سورۃ الحجرات کے درس کے بارے میں تمہیدی گفتگو میں یہ بات عرض کی گئی تھی کہ اس سورۂ مبارکہ کے مضامین کو اگر تین حصوں میں تقسیم کیا جائے تو پہلے اور آخری حصے میں مسلمانوں کی ہیئت اجتماعی اور حیاتِ ملی سے متعلق نہایت اہم اور اساسی و بنیادی باتیں زیر بحث آئی ہیں۔ درمیانی حصے میں مسلمانوں کے مابین اتحاد و اتفاق اور محبت و مؤدت کی فضا کو برقرار رکھنے کے لیے اور اختلاف و افتراق و عداوت کے سدّ باب کے لیے چند احکام دیے گئے ہیں۔ میں نے عرض کیا تھا کہ دو حکم بڑے

ہیں اور چھ ان دو کے مقابلے میں چھوٹے ہیں۔ میری اس بات سے کوئی غلط فہمی راہ نہ پائے' اس لیے جان لیجیے کہ قرآن مجید کی کوئی بات چھوٹی نہیں ہے' لیکن قرآن حکیم کی باتوں کے مابین ایک نسبت و تناسب ممکن ہے۔ چنانچہ اب ہم جن دو آیات (۱۱'۱۲) کا مطالعہ کر رہے ہیں' ان میں وہ چھ احکام بصورتِ نواہی آ رہے ہیں۔

ان چھ احکام کے متعلق ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ وہ مجلسی برائیاں ہیں جو ہمارے یہاں بہت عام ہیں اور انہیں عام طور پر حقیر اور بہت معمولی سمجھا جاتا ہے۔ لیکن ان کی وجہ سے بسا اوقات باہم دل پھٹ جاتے ہیں' رشتہ محبت و مؤدت منقطع ہو جاتا ہے اور نفرت و کدورت دلوں میں بیٹھ جاتی ہے۔ اگر ہم اُمت مسلمہ کو ایک فصیل سے تشبیہ دیں تو ظاہر بات ہے کہ فصیل اینٹوں سے بنی ہوتی ہے اور فصیل کے مضبوط ہونے میں دو چیزیں فیصلہ کن ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ ہر اینٹ پختہ ہو اور دوسرے یہ کہ ان اینٹوں کو باہم جوڑنے والا مسالہ بھی خالص اور مضبوط ہو۔ ان دونوں میں سے کوئی ایک چیز بھی کمزور اور غیر خالص ہوگی تو اس کا نتیجہ فصیل کی کمزوری کی صورت میں نکلے گا۔ ہم نے قرآن حکیم کی ان آیات پر بھی غور کیا ہے جن میں نہایت تاکید کی گئی ہے کہ اُمتِ مسلمہ کے ہر ہر فرد کے سیرت و کردار کو پختہ کیا جائے۔ اور آج ہم ان آیات کا مطالعہ کر رہے ہیں جن میں مسلمانوں کے افراد' اشخاص' کنبوں' خاندانوں' قوموں اور قبیلوں کو جوڑنے والے مسالے کو مضبوط اور خالص رکھنے کے لیے جن چیزوں سے بچنا ضروری ہے' وہ ہمارے سامنے آ رہی ہیں۔

تمسخر و استہزاء سے گریز کا حکم

سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ آپس میں ایک دوسرے کا مذاق نہ اڑاؤ ـــــ ﴿لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ﴾ ـــــ اور ﴿وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ﴾ ـــــ عام طور پر قرآن مجید میں جو احکام آتے ہیں وہ صرف مَردوں سے خطاب کر کے ارشاد ہوتے ہیں۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ احکام صرف مَردوں ہی کے لیے ہوتے ہیں۔ عربی گرامر کا یہ قاعدہ ہے کہ خطاب میں برسبیلِ تغلیب کسی ایک چیز کا ذکر کر دینے سے مراد یہ ہوتی ہے کہ دوسری چیز' جو اس کے تابع ہے وہ بھی مخاطب ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں اکثر و بیشتر احکام صیغۂ مذکر میں دیے گئے ہیں۔ لیکن یہاں ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس حکم کی خواتین کے لیے خاص طور پر تکرار آئی ہے۔ اس تکرار کی حکمت اور وجہ تھوڑے سے غور سے سمجھ میں آ جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ مجلسی خرابی مَردوں کے مقابلے میں عورتوں میں زیادہ ہوتی ہے۔ مَردوں کے سامنے زندگی کے

بہت سے اہم ترین مسائل اور تلخ تر حقیقتیں رہتی ہیں اور ان میں ان کی مشغولیت رہتی ہے' جبکہ خواتین کا دائرۂ عمل چونکہ بالعموم محدود رہتا ہے لہٰذا یہ باتیں ان میں زیادہ رواج پا جاتی ہیں۔ کسی کے لباس پر کوئی فقرہ چست کر دیا' کسی کی شکل وصورت کے بارے میں کوئی استہزائی انداز کا تبصرہ کر دیا۔ کسی کا رہن سہن اور چلن اگر فیشن کے مطابق نہیں ہے تو اس کا تمسخر اڑا دیا گیا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کو اہم قرار دے کر ان پر اس طرح کی پھبتیاں چست کر دینا' ان پر استہزائی اور تمسخر کے انداز میں تبصرے کر دینا' عام طور پر عورتوں کی مجلسی زندگی میں یہ برائی زیادہ پائی جاتی ہے' لہٰذا اس کا یہاں خاص طور پر علیحدہ ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ یہ خرابی مَردوں میں نہیں ہے۔ مَردوں میں بھی یہ برائیاں موجود ہیں' چنانچہ پہلے انہیں خطاب کیا گیا اور اس کے بعد اسے خواتین کے لیے دہرایا گیا۔

اب آپ مزید غور کریں گے تو واضح ہو گا کہ باہم دوستوں میں بھی ایک دوسرے کا تمسخر واستہزاء بسا اوقات رنجش کا سبب بن جاتا ہے اور دوستیاں ٹوٹ جاتی ہیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک مذاق کسی دوست سے دس مرتبہ کیا گیا اور وہ برداشت کر گیا' لیکن کسی وقت اس کا موڈ آف ہوتا ہے تو ایسے میں ہو سکتا ہے کہ وہی مذاق اس کی برداشت سے باہر ہو جائے اور وہ پھٹ پڑے اور یہ پھٹ پڑنا ہو سکتا ہے کہ دیرینہ سے دیرینہ دوستی کے رشتے کو منقطع کرنے کا باعث بن جائے۔ یہ معاملہ خالص افراد کی سطح پر بھی ہو سکتا ہے اور گروہوں' خاندانوں' کنبوں اور قبیلوں کی سطح پر بھی ہو سکتا ہے۔ پس پہلا حکم یہ دیا گیا کہ تمسخر اور استہزاء سے باز رہو۔

اب دیکھئے کہ اس میں اپیل کا ایک بڑا مؤثر انداز بھی موجود ہے' جس سے زیادہ مؤثر اسلوب ممکن نہیں ہے۔ مَردوں کے لیے فرمایا: ﴿عَسٰٓی اَنۡ یَّکُوۡنُوۡا خَیۡرًا مِّنۡهُمۡ﴾ اور عورتوں کے لیے فرمایا: ﴿عَسٰٓی اَنۡ یَّـکُنَّ خَیۡرًا مِّنۡهُنَّ﴾ تم جس کی ظاہری کمزوری یا عیب کو دیکھ کر مذاق اڑا رہے ہو' اس پر فقرے چست کر رہے ہو' اس شخص کے متعلق تمہیں کیا معلوم کہ اس کے دل میں اللہ کی کتنی محبت ہو' اس کے دل میں محبت رسولؐ کا کتنا بڑا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہو' اور اللہ کو تو قدر ان چیزوں کی ہے۔ جیسے ایک حدیث میں الفاظ آئے ہیں:

((اِنَّ اللّٰہَ لَا یَنۡظُرُ اِلٰی اَجۡسَادِکُمۡ وَلَا اِلٰی صُوَرِکُمۡ وَلٰـکِنۡ یَّنۡظُرُ اِلٰی قُلُوۡبِکُمۡ وَاَعۡمَالِکُمۡ)) (١)

(١) صحيح مسلم، كتاب البر والصلة والآداب، باب تحريم ظلم المسلم وخذله رقم 4658

''اللہ تعالیٰ تمہارے جسموں اور تمہاری صورتوں کی طرف نہیں دیکھتا بلکہ اللہ کی نگاہ تو تمہارے دلوں اور تمہارے اعمال پر ہے۔''

لہٰذا ہو سکتا ہے کہ وہ سیرت و کردار اور اللہ اور رسولؐ کی محبت و اطاعت اور فرمانبرداری میں تم سے کہیں آگے ہو' اللہ کے یہاں اس کا رتبہ بہت بلند ہو —— حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ کی جو شکل وصورت تھی' اس کا آپ اندازہ کر سکتے ہیں۔ پھر انؓ کا حال یہ تھا کہ عربی کے بعض تلفظ صحیح ادا نہیں کر سکتے تھے۔ یہ بات مشہور و معروف ہے کہ انؓ سے شین بالکل ادا نہیں ہوتا تھا۔ اذان میں وہ ''اَسھَدُ اَن لا اِلٰہ الا اللّٰہ' اَسھَدُ اَنَّ محمَّدًا رسولُ اللّٰہ'' کہا کرتے' لیکن انؓ کے دل میں اللہ تعالیٰ' آخرت اور رسالت پر جو ایمان تھا اور انؓ کے ریشے ریشے میں اللہ اور اس کے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جو شدید محبت رچی بسی تھی اس کا مقابلہ کون کر سکتا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ امیر المؤمنین' خلیفۃ المسلمین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ انؓ سے سیدنا بلالؓ کہہ کر خطاب فرمایا کرتے تھے۔ تو پہلی بات یہ سامنے آئی کہ کسی کا تمسخر واستہزاء نہ کرو' اور اس کے لیے نہایت مؤثر اپیل کا انداز اختیار کیا گیا ہے۔

عیب جوئی کی ممانعت

دوسرا حکم یہ دیا گیا کہ: ﴿وَلَا تَلۡمِزُوۡۤا اَنۡفُسَكُمۡ﴾ ''خود اپنے آپ کی عیب چینی نہ کیا کرو'' جو تنگ نظر رکھنے والا انسان ہوگا' جس کا اپنا ظرف چھوٹا ہوگا' اس میں یہ بات نظر آئے گی کہ وہ دوسروں کے عیب تلاش کرے گا' عیب چینی کرے گا' عیب جوئی کرے گا' ان کی کسی برائی کو ان کے منہ پر دے مارے گا' دوسروں کی توہین کرنے کو اپنا وطیرہ بنا لے گا۔ اب یہاں دیکھئے کہ کیسا پرتاثیر اسلوب اختیار فرمایا گیا ہے: ﴿وَلَا تَلۡمِزُوۡۤا اَنۡفُسَكُمۡ﴾ کہ تم اگر کسی مسلمان کی عیب جوئی کر رہے ہو' اس پر عیب لگا رہے ہو' اس کے عیب ظاہر کر رہے ہو تو وہ تمہارا اپنا مسلمان بھائی ہے۔ گویا اس طرح تم نے خود اپنے آپ کو عیب لگایا ہے۔ اب اس سے زیادہ مؤثر اپیل کا انداز اور دلنشیں پیرایہ ممکن نہیں ہے۔ جیسے ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اپنے ماں باپ کو گالیاں مت دیا کرو''۔ اس پر کسی نے عرض کیا کہ ''کون شخص اپنے ماں باپ کو گالی دے گا؟'' حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواباً ارشاد فرمایا ''اگر تم کسی کے ماں باپ کو گالی دو گے اور وہ پلٹ کر تمہارے ماں باپ کو گالی دے گا تو درحقیقت یہ تم نے خود اپنے والدین کو گالی دی''۔ اگر یہ بات دل کی گہرائی میں اتر جائے تو ﴿وَلَا تَلۡمِزُوۡۤا اَنۡفُسَكُمۡ﴾ کی بلاغت وحکمت واضح ہو کر سامنے آ جائے گی۔

تحقیر آمیز ناموں سے پکارنے کی ممانعت

تیسرا حکم آیا ﴿وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ﴾ ایک دوسرے کے برے نام' چڑانے والے نام' تحقیر آمیز نام رکھ کران ناموں سے کسی کومت پکارا کرو۔ظاہر بات ہے کہ اس سے انسان کی عزتِ نفس مجروح ہوتی ہے اوراس کا ردِّعمل ہوتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ کمزور ہو' احتجاج نہ کر سکے اور ''قہر درویش بر جانِ درویش'' کے مصداق اسے اندر ہی اندر ضبط رہا ہو۔لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اس کے جذبات مجروح نہیں ہوئے۔ یہی چیز وہ صورت اختیار کر سکتی ہے جیسے دو اینٹوں کے درمیان ان کو جوتوڑنے والا مسالہ کمزور پڑ جائے اوراپنی جگہ چھوڑ دے تو یہ چیز دشمن کے اندر درآنے کا سبب بن سکتی ہے۔لہٰذا فرمایا گیا کہ ایسے تمام رخنوں کو بند رکھنے کا اہتمام کرو۔اس معاملہ میں احتیاط کا دامن تھامے رکھو۔

یہاں پھر دیکھئے کہ انتہائی مؤثر اور دلنشیں پیرایۂ بیان اختیار فرمایا گیا ہے: ﴿بِئْسَ الاِسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ ۚ﴾ ''ایمان کے بعد تو برائی کا نام بھی برا ہے''۔ جب اللہ نے تمہیں ایمان جیسی دولت عطا فرمائی' تمہیں جناب محمد رسول اللہ ﷺ کے دامن سے وابستہ ہونے کا شرف عطا فرمایا' تو یہ چھوٹی چھوٹی باتیں اور پستی کی طرف تمہارا یہ رجحان اس مقام سے مناسبت رکھنے والی چیز نہیں ہے جو اللہ نے تمہیں عطا فرمایا ہے۔

اس ترغیب کے ساتھ ہی اب ترہیب وتہدید اور دھمکی بھی ہے۔ارشاد فرمایا: ﴿وَمَنْ لَّمْ يَتُبْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝۱۱﴾ ''اور جو باز نہیں آئیں گے' رجوع نہیں کریں گے' اللہ کی جناب میں توبہ نہیں کریں گے تو جان لو کہ اللہ کے نزدیک ایسے لوگ ہی ظالم ہیں''۔یعنی ایسے لوگوں کو آخرت میں اپنے ایسے تمام افعال واعمال کی جوابدہی کرنی پڑے گی اور ان کی سزا بھگتنی ہوگی' ان تمام چیزوں کو account for کرنا پڑے گا۔ یہ چیزیں ایسی نہیں رہ جائیں گی جن کا حساب نہ لیا جائے۔

اگلی آیت میں پھر تین احکام بصورتِ نواہی آئے۔قرآن مجید کا اعجاز بیان دیکھئے کہ ان چھ باتوں کو دو آیتوں میں تقسیم کیا' تین پہلی آیت میں اور تین دوسری آیت میں۔لیکن پہلی آیت میں وہ تین باتیں آئی ہیں جو رُودَررُو ہوتی ہیں۔ظاہر بات ہے کہ طنز سامنے کیا جائے گا' طعنہ سامنے دیا جائے گا' تمسخر واستہزاء سامنے ہی کیا جائے گا' تب ہی تو اس سے لذت حاصل ہوگی۔اسی طریقہ سے کسی کو برے نام سے پکارنے کا معاملہ بھی علی الاعلان ہوگا۔

بدگمانی سے بچنے کی تاکید

اگلی آیت میں ان تین برائیوں کا بیان آ رہا ہے جن کا اخفاء کے ساتھ یا پیٹھ پیچھے ارتکاب ہوتا ہے۔ارشاد ہوا: ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِیْرًا مِّنَ الظَّنِّ﴾ ''اے اہل ایمان' گمان کی کثرت سے بچو''۔یعنی خواہ مخواہ کسی کے بارے میں ایک گمان قائم کر لینا' کسی کے بارے میں خواہ مخواہ دل میں کوئی برا خیال بٹھا لینا' خواہ مخواہ کسی کے بارے میں دل میں یہ رائے قائم کر لینا کہ اسے مجھ سے دشمنی ہے' اسے مجھ سے کد ہے' جبکہ اس کے لیے کوئی دلیل اور بنیاد موجود نہ ہو۔اسی طرح خواہ مخواہ کسی کے بارے میں کسی اور اعتبار سے سوئے ظن قائم کر لینا' اس سے روکا گیا ہے۔یہاں بھی اپیل کا انداز دیکھئے' ارشاد ہوا: ﴿اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ﴾ ''یقیناً بعض گمان گناہ ہوتے ہیں۔'' ہوسکتا ہے کہ تمہارا کوئی گمان درست ہو لیکن یہ غلط بھی تو ہوسکتا ہے۔گمان تو گمان ہی ہے' علم تو نہیں ہے۔لہٰذا تم نے بغیر کسی دلیل اور بغیر کسی بنیاد کے کسی مسلمان بھائی کے بارے میں کوئی برا خیال اپنے دل میں بٹھا لیا ہے' کوئی غلط رائے قائم کر لی ہے تو یہ گناہ ہے۔اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کی پکڑ ہوگی اور تمہیں اس پر سزا بھگتنی پڑے گی۔

تجسس کی ممانعت

دوسری بات فرمائی ﴿وَّلَا تَجَسَّسُوْا﴾ کسی کی ٹوہ میں رہنے اور تجسس سے منع کیا جا رہا ہے جیسے مکھی بیٹھنے کے لیے گندگی تلاش کرتی ہے' ایسے ہی بعض حضرات پست ذہنیت رکھنے والے لوگوں کا یہ ایک ذوق اور مشغلہ ہوتا ہے کہ اس ٹوہ میں لگے رہیں کہ اس گھر میں کیا ہو رہا ہے؟ ان دو بھائیوں کے تعلقات ٹھیک ہیں تو اس کی کیا وجہ ہے؟ ان دو دوستوں میں بڑا گہرا قلبی تعلق ہے' ایسا کیوں ہے؟ کہیں کوئی بات سامنے آئے جس سے ان کا کوئی اختلافی معاملہ ہمارے علم میں آ جائے۔اس تجسس اور ٹوہ کے وطیرے سے روکا گیا۔بلکہ احادیث میں نبی اکرم ﷺ نے یہ تعلیم دی ہے اور تلقین فرمائی ہے کہ اگر تمہارے کسی بھائی کا کوئی عیب بغیر اس کے کہ تمہارا اس کو جاننے کا ارادہ تھا' تمہارے علم میں آ جائے تو حتی الامکان اس کی پردہ پوشی کرو۔اگر دنیا میں تم اپنے کسی مسلمان بھائی کے عیب کی پردہ پوشی کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہاری آخرت میں پردہ پوشی فرمائے گا۔اس تلقین' اس تعلیم اور اس اخلاقی ہدایت کو سامنے رکھیں تو ایک مسلم معاشرہ میں برکات ہی برکات نظر آئیں گی۔

غیبت کی شناعت

اس آیت میں تیسری اور آخری بات فرمائی: ﴿وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ؕ﴾ ''اور ایک دوسرے کی غیبت نہ کیا کرو''۔ کسی کے پیٹھ پیچھے' کسی کی عدم موجودگی میں اس کی برائی بیان کرنا غیبت ہے جبکہ نیت اس کی توہین وتذلیل کی ہو یعنی اس کے بارے میں بری بات کو اس ارادے سے لوگوں تک پہنچانا اور پھیلانا تاکہ لوگوں کی نگاہ میں اس کی وقعت نہ رہے۔ اسی آیت مبارکہ میں اس غیبت کی مذمت بڑے شدید انداز میں بیان ہوئی۔ ارشاد ہوا: ﴿اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ ؕ﴾ ''کیا تم میں سے کوئی شخص اس کو پسند کرے گا کہ اپنے مُردہ بھائی کا گوشت کھائے' پس اسے تو تم بہت ناگوار سمجھتے ہو!'' اب دیکھئے کہ اس میں مناسبت کیا ہے؟ جو شخص فوت ہو چکا ہے' وہ اپنی مدافعت نہیں کرسکتا۔ آپ جہاں سے چاہیں اس کی بوٹی اڑالیں۔ اسی طرح جو شخص موجود نہیں ہے وہ اپنی عزت کی حفاظت نہیں کرسکتا۔ وہ اپنی صفائی اور مدافعت میں کچھ کہہ نہیں سکتا' ہوسکتا ہے کہ آپ کو کوئی مغالطہ ہوا ہو' ہوسکتا ہے کہ آپ اس کے بارے میں جو بات کہہ رہے ہیں وہ غلط ہو' اگر وہ موجود ہوگا تو وضاحت کرسکے گا' لیکن اگر وہ موجود نہیں ہے تو اپنی عزت کی حفاظت کرنے سے قاصر ہے' جیسے ایک مردہ لاش اپنے جسم کی حفاظت نہیں کرسکتی۔ اگر آپ نے اپنے کسی غیر موجود مسلمان بھائی کی کوئی برائی بیان کی ہے تو یہ غیبت ہے اور درحقیقت یہ اخلاقی سطح پر بالکل ایسے ہی ہے جیسے آپ کسی مردہ بھائی کی لاش سے بوٹیاں نوچ نوچ کر کھا رہے ہوں۔

چند استثناءات

البتہ یہ بات ذہن میں رکھئے کہ یہ تینوں چیزیں وہ ہیں جن میں کچھ استثناءات ہیں۔ بعض قرائن اور ظاہری شواہد کی بنیاد پر کسی کے متعلق بدگمانی دل میں پیدا ہوسکتی ہے۔ ایسی صورت میں ضروری ہوگا کہ جلد از جلد اس کے متعلق اپنی استعداد کے مطابق تحقیق کرلی جائے۔ اسی طرح حکومت تفتیش اور صحیح صورتِ حال معلوم کرنے کے لیے تجسس کرسکتی ہے۔ وہ یہ جاننے کے لیے تجسس کا ایک مستقل شعبہ اور محکمہ قائم کرسکتی ہے کہ ملک میں غیر ملک کے جاسوس تو سرگرم عمل نہیں ہیں۔ علاوہ ازیں وہ خود بھی دوسرے ممالک میں جاسوسی کا کوئی نظام قائم کرے تو یہ غلط نہ ہوگا' کیونکہ اس مقصد کے پیچھے ملک کی سلامتی کی مصلحت کارفرما ہوتی ہے۔ مزید یہ کہ کسی خاندان میں آپ اپنی اولاد کا رشتہ کرنا چاہتے ہیں' یا کسی خاندان سے آپ کے بیٹے بیٹی کے لیے رشتہ آیا ہے تو آپ صحیح معلومات حاصل کرنے کے لیے

تجسس یا بالفاظِ دیگر تحقیق و تفتیش کر سکتے ہیں۔

اسی طرح اس نیت اور ارادے کے بغیر کہ اپنے کسی بھائی کی عزت پر حملہ کرنا مقصود ہو' اگر کسی مسلمان کی کوئی برائی بیان کرنے کی ناگزیر ضرورت پیش آ جائے تو اس کا شمار غیبت میں نہیں ہوگا۔ مثلاً حضور ﷺ نے فرمایا کہ اگر آپ کے کسی بھائی کا کہیں رشتہ طے پا رہا ہے اور وہاں کی کوئی غیر مناسب بات آپ کے علم میں ہے اور آپ اپنے اس دینی بھائی کی خیر خواہی کے جذبے کے تحت اسے وہ بات بتا رہے ہیں تو یہ غیبت شمار نہیں ہوگی۔ مزید برآں جہاں واقعتاً کوئی تمدنی ضرورت ہو تو کسی کی غیر موجودگی میں اس کی کسی بری بات کو' جو فی الواقع اس میں ہو' بیان کر دینا غیبت کی تعریف سے خارج ہو جائے گا۔

آیت کے آخر میں ارشاد ہوا: ﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيْمٌ ۝۱۲﴾ ''اور (ہر حال میں) اللہ کی نافرمانی سے بچو (اگر خطا ہو جائے تو اس کے حضور میں توبہ کرو)۔ یقیناً اللہ نہایت معاف کرنے والا' رحم فرمانے والا ہے''۔ کسی بندۂ مؤمن سے خطا ہو جائے تو اس کے لیے صحیح ترین رویہ یہ ہے کہ وہ اس پر پشیمانی کا اظہار کرے اور اللہ کی جناب میں رجوع کرے اور اس سے توبہ اور معافی کا طلب گار ہو۔ وہ اللہ تعالیٰ کو نہایت معاف فرمانے والا' توبہ قبول کرنے والا اور رحم فرمانے والا پائے گا۔

بہرحال ان دو آیات میں چھ نواہی بیان ہوئے۔ تمسخر و استہزاء سے بچنا' عیب جوئی اور عیب چینی سے بچنا' ایک دوسرے کے برے نام رکھنے سے بچنا' سوئے ظن سے اجتناب کرنا' تجسس اور غیبت سے بچنا۔ اگر ان نواہی کو ملحوظ رکھا جائے تو ایک مسلم معاشرے میں افراد کو ایک دوسرے سے کاٹنے یا گروہوں' خاندانوں اور کنبوں کے درمیان رشتۂ محبت اور اخوت و مؤدت کو منقطع کرنے کے لیے جو رخنے پیدا ہو سکتے ہیں' ان سب کا سدِّ باب ہو جائے گا۔

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ۭ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ۝۱۳﴾

''اے لوگو! ہم نے تمہیں پیدا کیا ایک مرد اور ایک عورت سے اور تمہیں قوموں اور قبیلوں کی شکل میں تقسیم کیا تاکہ باہم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ یقیناً اللہ کے ہاں تم میں سے سب سے زیادہ باعزت وہ ہے جو سب سے زیادہ خدا ترس اور پرہیزگار ہے۔ یقیناً اللہ (سب کچھ) جاننے والا ہے (اور) باخبر ہے''۔

آپ کو یاد ہوگا کہ اس سورۂ مبارکہ کے پہلے حصے میں اسلامی ہیئت اجتماعیہ' خواہ وہ ریاست کی صورت

میں ہو خواہ معاشرہ کی شکل میں ہو' اس کی دو اساسات کا ذکر تھا ـــــ ایک دستوری اور قانونی اساس کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کے دائرے کے اندر اندر رہو' اس سے تجاوز نہ کرو ـــــ اور دوسری ایک قلبی اور جذباتی بنیاد' یعنی آنحضور ﷺ کی مرکزی شخصیت سے مضبوط تعلق' آپؐ سے انتہائی درجے کی قلبی محبت' آپؐ کا ادب واحترام اور آپؐ پر بحیثیت رسول پختہ ایمان۔ اس آخری حصے میں انسان کی ہیئت اجتماعیہ سے متعلق پھر نہایت اہم باتیں سامنے آ رہی ہیں۔

مساواتِ انسانی کی دو بنیادیں

اب جو آیت زیرِ مطالعہ ہے اس کے ضمن میں سب سے پہلے تو یہ بات نوٹ کیجیے کہ یہاں خطاب کا انداز بدل گیا۔ یعنی ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ کی بجائے ﴿يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ﴾ آیا' جبکہ اس سے پہلے اس سورۃ میں پانچ مرتبہ خطاب کے لیے يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا کے الفاظ آئے۔ معلوم ہوا کہ وہاں خطاب صرف اہل ایمان سے تھا۔ یہاں جو خطاب کے الفاظ بدل گئے ہیں تو وہ یوں نہیں بدلے' بلکہ اس لیے بدلے ہیں کہ اس آیت کا جو مضمون ہے وہ ایک آفاقی حقیقت (Universal Truth) اور تمام انسانوں کے مابین ایک قدر مشترک ہے' اس سے قطع نظر کہ وہ مشرق کے ہوں یا مغرب کے ہوں' گورے ہوں یا کالے ہوں' مسلمان ہوں یا یہودی' عیسائی' بدھ' سکھ اور پارسی ہوں' یا مشرک اور دہریے ہوں۔ دنیا کے تمام انسانوں کے درمیان دو چیزیں مشترک ہیں جنہیں اس آیۂ مبارکہ میں بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ خطاب فرمایا گیا: ﴿يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ﴾ یعنی ''اے بنی نوع انسان ـــــ اے لوگو! اب وہ دو مشترک چیزیں بیان فرمائی جا رہی ہیں۔ پہلی چیز ہے ﴿اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ﴾ ''ہم نے تم سب کو پیدا کیا'' ـــــ بنی نوع انسان کے دو یا چار خالق نہیں ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ گوروں کو پیدا کرنے والا کوئی گورا خدا ہو اور کالوں کا خالق کوئی کالا خدا ہو۔ معاذ اللہ ثم معاذ اللہ! ایسا نہیں بھی نہیں کہ مشرق کے رہنے والوں کا خالق کوئی اور ہو اور مغرب والوں کو پیدا کرنے والا کوئی اور ہو۔ ﴿للہ المشرق والمغرب﴾ مشرق ومغرب سب کا اللہ ہی مالک ہے۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ مسلمان کا خالق کوئی اور خدا ہو اور غیر مسلم کا خالق کوئی اور خدا ہو' بلکہ سب کا خالق صرف اللہ تبارک و تعالیٰ ہی ہے۔ جیسا کہ ہم سورۃ التغابن میں پڑھ آئے ہیں کہ: ﴿هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ﴾ ''وہ (اللہ) ہی ہے جس نے تم سب کو پیدا کیا' پھر تم میں کوئی کافر ہے اور کوئی تم میں مؤمن ہے'' ـــــ یوں سمجھئے کہ یہاں وحدتِ خالق اور وحدتِ الٰہ بیان ہوئی۔ یہ وہ

مشترک قدر ہے جو تمام نوعِ انسانی کو ایک رشتے میں منسلک کرتی ہے: ﴿اِنَّا خَلَقْنٰـكُمْ﴾ ''ہم نے تم سب کو پیدا کیا'' یہ پہلی قدرِ مشترک کا بیان ہوا۔

دوسری قدرِ مشترک کیا ہے! وہ ہے: ﴿مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى﴾ ''ایک مرد اور ایک عورت سے''۔ یہ وحدتِ آدم اور وحدتِ حوّا کا ذکر ہوا۔ تمہاری نسلیں کتنی ہی مختلف ہیں' تمہاری رنگتیں کتنی ہی جدا ہیں' تمہارے نقوش' تمہاری شکلیں' تمہاری شباہتیں کتنی ہی مختلف ہیں' تمہاری زبانیں کتنی ہی جدا ہیں' لیکن تم سب اصل میں ایک ہی نسل ہو' تم سب کے سب آدم اور حوّا کی اولاد ہو۔ پس یہ دو مشترک قدریں ہیں جو تمام نوعِ انسانی کو ایک وحدت کے رشتے میں پروئے ہوئے ہیں۔ اور چونکہ یہ دو چیزیں وہ ہیں جو تمام انسانوں سے متعلق ہیں' لہٰذا یہاں خطاب ﴿یٰۤـاَیُّـهَا النَّاسُ﴾ سے ہوا۔

قوموں اور قبیلوں کی تقسیم تعارف کے لیے ہے

اس کے بعد ایک بڑی اہم حقیقت ہے جس کی طرف اشارہ ہو رہا ہے۔ وہ یہ کہ قوموں اور قبیلوں کی جو تقسیم بالفعل موجود ہے وہ بھی ہماری پیدا کردہ ہے۔ یعنی یہ تقسیم بھی اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہی کی طرف سے ہوئی ہے۔ ہمارے ہاں اکثر و بیشتر بڑا افراط وتفریط کا معاملہ ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ ہم کبھی جوش میں آ کر اس تقسیم وتفریق کی بالکل نفی کر دیتے ہیں' جبکہ قرآن مجید اس کو تسلیم کر رہا ہے۔ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ قومی خصائص بھی ہوتے ہیں' قبیلوں کی بھی اپنی چند خصوصیات ہوتی ہیں۔ یہ تمام چیزیں واقعی اور فطری ہیں۔ زبانوں کا فرق تو وہ حقیقی ہے۔ اسی طرح شکل وشباہت کا فرق ہے' چہروں کے نقوش جدا ہیں' رنگتوں میں فرق ہے۔ کوئی گورا ہے' کوئی کالا ہے' کوئی گندمی اور زردرُو ہے۔ اس کا مفاد یہ ہے کہ ایک شخص کو دیکھتے ہی ہم پہچان لیتے ہیں کہ یہ چینی ہے یا حبشی ہے۔ وقِس علٰی ھذا —— اس شخص سے کوئی بات نہیں ہوئی' اس سے آپ نے کچھ پوچھا نہیں اور صرف ظاہری رنگ اور نقوش سے پہچانتے ہی آپ نے اس کا سارا جغرافیائی پس منظر بھی جان لیا اور اس کا پورا تاریخی پس منظر بھی آپ کو معلوم ہو گیا۔ یہ ساری چیزیں درحقیقت تعارف اور پہچان کے لیے ہیں۔ چنانچہ فرمایا گیا: ﴿وَجَعَلْنٰـكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ۭ﴾ ''اور ہم نے بنائیں تمہاری قومیں اور تمہارے قبیلے تاکہ ایک دوسرے کو پہچانو'' —— آپ خود سوچیے کہ اگر تمام انسان ایک رنگت کے ہوتے' تمام انسانوں کے نقوش ایک جیسے ہوتے۔ تو کتنی یکسانیت (monotony) ہوتی اور یہ کس قدر اکتاہٹ والی (boring) کیفیت اور کتنی بیزار کن صورت ہوتی۔ اس اختلاف اور فرق وتفاوت میں حسن ہے ۔

گلہائے رنگا رنگ سے ہے زینتِ چمن
اے ذوق اس چمن کو ہے زیب اختلاف سے!

تو اس تقسیم وتفریق اور اختلاف میں جو بہتری کا پہلو ہے اسے سامنے رکھا جانا چاہیے۔ ورنہ سوچیے کہ کتنا پریشان کن معاملہ ہوتا اور کیسے پہچانتے کہ یہ کون ہے! بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ جڑواں اور ہم شکل بھائیوں یا بہنوں کے معاملے میں بڑے مغالطے ہوتے ہیں اور بہت سے لطیفے وجود میں آتے ہیں۔ ان کے مابین تمیز وامتیاز بڑا مشکل ہو جاتا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ یہ فرق وتفاوت اور یہ اختلاف وامتیاز بالکل فطری (natural) ہے اور اس کا ایک مقصد ہے۔ اس کا ایک بڑا تمدنی فائدہ یہ ہے کہ ﴿لِتَعَارَفُوْا﴾ ''تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو''۔ اس کی نفی کرنا اسلام کی رو سے صحیح نہیں ہے۔

عزت وشرف کی واحد بنیاد: تقویٰ

رنگ ونسل کی بنیاد پر انسانوں میں اونچ نیچ کا تصور قائم کرنا کہ فلاں نسل اعلیٰ ہے اور فلاں ادنیٰ' نوعِ انسانی کا فلاں طبقہ بڑھیا ہے اور فلاں گھٹیا—— یہ بالکل غلط نظریہ اور سراسر غلط تصور ہے۔ یہ انسانوں کے درمیان فساد' نفرت اور عداوت پیدا کرنے والا تصور ونظریہ ہے۔ یہ اونچ نیچ اور ادنیٰ کی تقسیم اس فطری فرق و تفاوت کا بالکل غلط استعمال ہے' جسے قرآن حکیم صحیح تسلیم کر رہا ہے کہ: ﴿وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ﴾ ''اور ہم نے تمہاری قومیں اور تمہارے قبیلے بنائے تاکہ تم باہم ایک دوسرے کو پہچانو''—— لیکن ایک بنائے شرف اور بنائے عزت بھی اللہ نے رکھی ہے: ﴿اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ ؕ﴾—— جان لو کہ اللہ کے نزدیک تو تمہارے مابین اونچ نیچ کا معاملہ صرف ایک بنیاد پر ہے اور وہ بنیاد رنگ نہیں ہے' خون نہیں ہے' نسل نہیں ہے' وطن نہیں ہے' زبان نہیں ہے' شکل وصورت نہیں ہے' قومیت نہیں ہے' بلکہ وہ واحد بنیاد ہے تقویٰ' خدا ترسی' پرہیزگاری' نیکوکاری' اعلیٰ سیرت وکردار' اعلیٰ اخلاق اور احسن معاملات۔ اللہ کے نزدیک کوئی اونچا ہے اور ان اوصاف کی بنیاد پر اور کوئی نیچا ہے تو ان کے فقدان کی بناء پر۔ اونچ نیچ اور شرافت ورذالت کے لیے اس کے سوا اللہ تعالیٰ کے یہاں کوئی اور بنیاد نہیں ہے۔

اب اس آیت کے آخری حصے پر نگاہوں کو مرتکز کیجیے۔ فرمایا جا رہا ہے: ﴿اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ﴿۱۳﴾﴾ ''بے شک اللہ تعالیٰ جاننے والا' باخبر ہے۔''—— ان الفاظ کے ذریعہ سے اس حقیقت کو واضح کر دیا گیا کہ تقویٰ تو اگرچہ دل میں ہوتا ہے اور کوئی انسان کسی دوسرے کے دل کو چیر کر نہیں دیکھ سکتا

لیکن اللہ تو باخبر ہے کہ کسی کے دل میں کتنا تقویٰ ہے۔ کوئی شخص بہروپیا ہو' متقیوں جیسی صورت وشکل بنا لے اور لباس پہن لے' نیز محض ریاء وسمعہ کے لیے ظاہری طور پر خوش خلقی اور حسنِ سیرت وکردار کا پیکر بنا پھرے اور اس طرح دنیا میں اپنا کوئی رعب گانٹھ بھی لے' لیکن وہ اللہ کو کوئی دھوکہ نہیں دے سکتا۔ اللہ علیم ہے' خبیر ہے۔ وہ جانتا ہے کہ کون کتنے پانی میں ہے! کون واقعتاً خدا ترس ہے اور کون صرف دکھاوے کے لیے متقی بنا ہوا ہے! جیسے حضور ﷺ نے فرمایا: ((خَشْيَةُ اللّٰهِ فِي السِّرِّ وَالْعَلَانِيَةِ)) یعنی اصل تقویٰ وہ ہے جو خلوت میں بھی ہو جلوت میں بھی ہو۔ اگر اس کے برعکس صورت یہ ہو کہ ع ''چوں بخلوت می روند آں کارِ دیگری کنند'' تو پھر یہ بہروپ ہے' تقویٰ نہیں ہے۔ پس اگر تمہارا اپنا ربّ کے ساتھ تعلق ہے تو اچھی طرح سمجھ لو کہ ربّ تو علیم ہے' خبیر ہے اور اس کی شان تو یہ ہے کہ وہ علیم بذات الصدور ہے اور ﴿وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ﴾ ''اگر تم اپنے جی کی بات ظاہر کرو گے' یا اس کو چھپاؤ گے' اس کا وہ (اللہ) تم سے حساب لے لے گا''۔

زیر مطالعہ آیتِ مبارکہ کے دو رُخ

اب اس پوری آیت کے بارے میں یہ بات نوٹ کیجیے کہ اس کے دو رخ ہیں۔ ایک رخ تو اس مضمون کی طرف ہے جو پچھلے سبق میں آ چکا ہے کہ استہزاء اور تمسخر نہ کرو' کسی کا مذاق نہ اڑاؤ' فقرے چست نہ کرو' کسی کو حقارت کی نگاہ سے دیکھو' کسی کے برے نام نہ رکھو' کسی کی ٹوہ میں نہ لگو' خواہ مخواہ کسی کی بدگمانی سے بچو' کسی کی غیبت نہ کرو' بلکہ مطلوب یہ ہے کہ اسلامی معاشرہ میں باہمی اخوت ہو' محبت ہو' ہمدردی اور دمسازی ہو۔ تو اس کے لیے جو اصول اس آیت میں سامنے آیا وہ بڑی بنیادی اہمیت کا حامل ہے — دیکھئے! حقارت کیوں ہوتی ہے؟ اپنے آپ کو بڑھیا سمجھنے کی وجہ۔ کوئی اپنے آپ کو اعلیٰ نسل کا سمجھتا ہے تو وہ ہر دوسرے کو ادنیٰ نسل کا سمجھے گا۔ اگر کسی کو اپنے کسی خلقی وصف' جیسے رنگت یا اچھی شکل وصورت پر' کوئی غرور پیدا ہو رہا ہے تو وہ ان کی بناء پر دوسروں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھے گا اور ان کا تمسخر واستہزا کرے گا' حالانکہ یہ تمام چیزیں اختیاری نہیں ہیں' یہ تو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہیں — لہٰذا اس آیت میں اس اصل مرض کی جڑ کاٹ دی گئی' غرور کی علت پر تیشہ چلا دیا گیا کہ میں بڑا ہوں' میں اعلیٰ ہوں' میں اونچا ہوں۔ یہی وہ پندار ہے جو دوسرے کو حقیر اور ادنیٰ سمجھنے اور اس کا استہزا وتمسخر کرنے پر ایک دنی الطبع شخص کو آمادہ کرتا ہے۔ لہٰذا اس آیت میں یہ حقیقت بیان کر دی گئی کہ تمام انسان' انسان ہونے کے ناطے ایک ہیں۔ ان کا خالق بھی ایک اور

ان کا جدِّ امجد بھی ایک ہے۔

اس بات کو نبی اکرم ﷺ نے حجۃ الوداع میں بایں الفاظ فرمایا تھا:

((لَیْسَ لِعَرَبِیٍّ عَلٰی عَجَمِیٍّ فَضْلٌ وَلَا لِعَجَمِیٍّ عَلٰی عَرَبِیٍّ فَضْلٌ وَلَا لِاَسْوَدَ عَلٰی اَحْمَرَ فَضْلٌ وَلَا لِاَحْمَرَ عَلٰی اَسْوَدَ فَضْلٌ اِلَّا بِالتَّقْوٰی —— کُلُّکُمْ بَنُوْ آدَمَ وَآدَمَ مِنْ تُرَابٍ))

''نہ کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت ہے اور نہ کسی عجمی کو کسی عربی پر کوئی فضیلت ہے' اور نہ کسی کالے کو کسی گورے پر فضیلت ہے اور نہ کسی گورے کو کسی کالے پر فضیلت ہے۔ بنائے فضیلت صرف تقویٰ ہے۔ تم سب آدمؑ کی اولاد ہو اور آدمؑ مٹی سے تخلیق ہوئے تھے''۔

اس آیتِ مبارکہ کا دوسرا رُخ اس اعتبار سے کہ آپ دیکھیں گے کہ عام طور پر دنیا میں انسانوں کی تقسیم دو طریقوں سے ہوتی ہے۔ ایک افقی (Horizontal) تقسیم ہے اور ایک عمودی (Vertical) تقسیم ہے۔ افقی تقسیم یہ ہے کہ کوئی اونچا ہے' کوئی اس سے بھی اونچا ہے' کوئی اعلیٰ ہے' کوئی ادنیٰ ہے۔ یہ تو ہے درجوں کا تفاوت۔ اور عمودی تقسیم جس سے معاشرے ایک دوسرے سے الگ تھلگ (isolate) ہوتے ہیں' وہ یہ ہے کہ یہ اور سوسائٹی ہے' وہ اور سوسائٹی۔ یہ جرمن سوسائٹی ہے' وہ انگلش سوسائٹی۔ یہ فلاں ریاست ہے اور وہ فلاں ریاست۔ یہ فلاں قومیت ہے' وہ فلاں قومیت —— تو یہ دو تقسیمیں ہیں۔ دنیا میں عام طور پر پہلی تقسیم نسل' رنگ' خون اور وطن کی بنیاد پر ہے۔ اسلام نے اس کی بالکلیہ جڑ کاٹ دی کہ یہ اونچ نیچ اور اعلیٰ و ادنیٰ کی رنگ' نسل' خون اور وطن کی بنیاد پر تقسیم اپنی اصل کے اعتبار سے فساد ہے' فتنہ ہے' انسانیت کی توہین و تذلیل ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک شرف و عزت اور اکرام و اعزاز کا معیار اعلیٰ سیرت و کردار' حسنِ اخلاق' نکوکاری' پرہیزگاری اور خداترسی یعنی تقویٰ ہے۔

اب ہے دوسری عمودی تقسیم —— اور یہ تقسیم اسلام بھی کرتا ہے۔ ایک اسلامی معاشرہ کا بہرحال ایک غیر اسلامی معاشرے سے علیحدہ تشخص ہے۔ ایک اسلامی ریاست ممیّز (demarcate) ہوتی ہے ایک غیر اسلامی ریاست سے۔ یہاں قابل غور بات یہ ہے کہ یہ عمودی تقسیم کس بنیاد پر ہے؟ تو اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ اس تقسیم کی بنیاد نہ نسل ہے' نہ رنگ ہے' نہ خون ہے' نہ قوم و وطن ہے اور نہ ہی زبان ہے۔ یہ بنیاد ہے نظریہ' عقیدہ' خیالات اور اصول —— یعنی یہ اللہ تعالیٰ کی توحید کو ماننے والے ہیں' یہ

محمد رسول اللہ ﷺ کے دامن سے وابستہ ہیں۔ یہ بعث بعد الموت' حشر ونشر' جنت و دوزخ اور محاسبۂ اخروی کو ان تفاصیل کے ساتھ تسلیم کرتے ہیں جن کی خبر دی ہے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب قرآن مجید میں' اور جن کی خبر دی ہے نبی اکرم ﷺ نے اپنے ارشادات وفرمودات گرامی میں —— اسلام کی اصطلاح میں اس تسلیم ویقین کا نام ایمان ہے۔ حاصل گفتگو یہ نکلا کہ اسلام نے اس چیز کی کلی نفی کر دی جو افقی (Horizontal) اور عمودی (Vertical)' دونوں سطحوں پر نوعِ انسانی کو تقسیم کر رہی تھی۔ اسلام میں جو افقی تقسیم ہے وہ ہے تقویٰ یعنی نکوکاری' خدا ترسی اور پرہیزگاری کی بنیاد پر۔ اور عمودی تقسیم یعنی اسلامی معاشرہ کا غیر اسلامی معاشرہ سے علیحدہ اور ممیّز ہونا' وہ ہوگا نظریہ وعقیدہ یعنی ایمان کی بنیاد پر۔

پھر یہ بات بھی پیشِ نظر رکھیے کہ کوئی انسان اپنی چمڑی کی رنگت بدل نہیں سکتا۔ وہ چاہے سو برس سے امریکہ میں رہ رہا ہو' وہ کالا ہی ہے۔ لہٰذا ایک ملک میں رہنے کے باوجود کالوں کا معاشرہ علیحدہ ہوگا' گوروں کا معاشرہ علیحدہ ہوگا۔ اگر کوئی شخص انگلش نسل سے ہے تو وہ جرمن نسل کا شمار نہیں ہو سکتا۔ یہ حدود تو وہ ہیں جن کو انسان cross نہیں کر سکتا' ان کو پھلانگ نہیں سکتا۔ یہ رکاوٹیں (barriers) مستقل ہیں۔ جبکہ نظریے اور خیالات کے barriers تو آناً فاناً ختم ہو جاتے ہیں۔ آج کوئی شخص کلمہ شہادت ادا کرتا ہے تو فی الفور وہ مسلمان معاشرے کا باعزت فرد بن جاتا ہے۔ ایک شخص جو خواہ ہندو سوسائٹی میں شودر ہو' اچھوت ہو' جس کا ہندو معاشرے کے اندر سڑک کے درمیان سے گزرنا بھی ممنوع ہو' اور اس کے کانوں میں اگر وید کے اشلوک پڑ جائیں چاہے اس کی نادانستگی میں پڑے ہوں تو ہندو دھرم کی رو سے اس کے کانوں میں سیسہ پگھلا کر ڈالنا لازم ہو جائے۔ لیکن آج اگر وہ کلمہ پڑھ لے تو وہ سیدزادے کے ساتھ' شیخ الاسلام کے ساتھ' بڑے سے بڑے مسلمان کے ساتھ بھی کاندھے سے کاندھا ملا کر مسجد میں نماز میں کھڑا ہو جاتا ہے' اور یہ نومسلم ہر مسلمان کے ساتھ ایک ہی برتن میں کھانا کھا سکتا ہے اور ایک ہی برتن سے پانی پی سکتا ہے' جبکہ پیدائشی شودر ہندو دھرم میں ہمیشہ ہمیش کے لیے اچھوت اور ناپاک ہی رہتا ہے چاہے وہ تعلیم میں' کردار میں' اخلاق میں پیدائشی برہمن سے کتنا ہی ترقی یافتہ ہو —— ایمان کی تقسیم وہ نہیں ہے جو کہ مستقل بالذات ہو۔ یہ تقسیم تو وہ ہے کہ انسان جب چاہے اس رکاوٹ (barrier) کو عبور کرے اور اسلامی معاشرے میں شامل ہو جائے۔

ایک عالمی ریاست کا قیام: وقت کی اہم ضرورت

اس سلسلے میں ایک اہم بات میں یہ عرض کروں گا کہ اس آیت مبارکہ کی جدید دنیا کے اعتبار سے خاص اہمیت ہے۔ دیکھئے جدید دنیا میں بین الاقوامی اور عالمی سطح پر ایک عجیب dilemma 'ایک عقدۂ لاینحل پیدا ہوگیا ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی نے فاصلے قریباً ختم کر دیے ہیں۔ اب پوری دنیا کی حیثیت ایسی ہے جیسے کسی زمانہ میں ایک شہر ہوتا تھا اور اس کے محلے ہوتے تھے۔ ذرائع ابلاغ و مواصلات اتنے ترقی کر گئے ہیں کہ فاصلے قریباً معدوم کے درجے میں آ گئے ہیں۔ کوئی واقعہ امریکہ میں ہو رہا ہو اسے آپ ٹیلی ویژن پر براہِ راست یہاں بیٹھ کر دیکھتے ہیں۔ لیکن ظاہر اور خارج میں یہ فاصلے اتنے کم ہو جانے کے باوصف دلوں کے فاصلوں میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ دل پھٹے ہوئے ہیں۔ کوئی قدر مشترک موجود نہیں ہے۔ یہاں تک کہ امریکہ میں رہنے والا کالا اور گورا علیحدہ علیحدہ ہیں۔ ان کے دلوں کو جوڑنے والا کوئی رشتہ موجود نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جدید دور کی مادیت اور الحاد نے یہ دونوں بنیادیں منہدم کر دی ہیں۔ نہ وحدتِ خالق والہ باقی رہی' نہ وحدتِ آدم وحوا باقی رہی۔ کوئی تیسری چیز ہے ہی نہیں جو انہیں جوڑ سکے۔ ایک انگریز کو ایک جرمن کے ساتھ کون سی چیز جوڑے؟ ایک چینی کو روسی کے ساتھ کون سی چیز ہے جو جوڑ سکے؟ ایک جاپانی اور ایک ماریطانیہ کے رہنے والے کے مابین کون سی قدر مشترک ہے جو ان کو ایک رشتہ میں منسلک کر سکے؟ یہ ہے وہ dilemma جس سے آج کی دنیا دوچار ہے' جبکہ حالات کا تقاضا یہ ہے کہ نوعِ انسانی ایک وحدت بنے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس وقت اس کی شدید ضرورت ہے کہ نیشنل سٹیٹس ختم ہو جائیں اور ایک عالمی سٹیٹ قائم ہو۔ ورنہ نوعِ انسانی ہلاکت کے سخت خطرے سے دوچار ہے۔ اگر کہیں حادثاتی طور پر عالمی جنگ شروع ہوگئی تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ کیا انجام ہوگا! شاید یہ نوعِ انسانی کی اجتماعی خودکشی بن جائے۔ لیکن اس خطرے کے ادراک و شعور اور اس کے تدارک کے احساس کے باوجود دلوں کو قریب لانے والی انسان کی اپنی سوچ کسی مضبوط' پائیدار اور ٹھوس بنیاد تلاش اور فراہم کرنے میں تاحال ناکام و قاصر رہی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء) کے بعد پہلا تجربہ لیگ آف نیشنز کا کیا گیا اور وہ ناکام ہوا۔ اس لیے کہ جب فکر میں کوئی بنیاد نہیں' دلوں میں جگہ نہیں تو محض ساتھ بیٹھنے اور اپنے اپنے مفادات کی راگنی راگنے اور ان کے تحفظات کے لیے جائز و ناجائز طور پر اس نام نہاد عالمی ادارے کو استعمال کرنے سے مسائل تو حل نہیں ہو جائیں گے' بلکہ وہ تو مزید الجھیں گے اور ان کے نتائج پہلے سے بھی زیادہ خطرناک نکلیں گے' جیسا کہ بیس برس بعد ہی دوسری جنگ عظیم ترین جنگ (۱۹۳۹ء تا

۱۹۴۵ء) کی صورت میں نکلے۔ علامہ اقبال مرحوم نے اس کے بارے میں کہا تھا کہ ؎

بیچاری کئی روز سے دم توڑ رہی ہے
ڈر ہے خبر بد نہ مرے منہ سے نکل جائے!

لیگ آف نیشنز کی ناکامی اور دوسری جنگ عظیم کے بعد تنظیم اقوام متحدہ (UNO) اور اس کی قائم کردہ سلامتی کونسل کا جو تجربہ ہوا ہے' وہ بھی لیگ آف نیشنز سے بہتر ہونے کے بجائے اس سے کہیں زیادہ ناکام ثابت ہوا ہے۔ اسرائیل اور چند دوسرے ممالک جس طریقے سے ان اداروں کے متفقہ فیصلوں کو بھی defy کرتے ہیں اور ٹھوکر مار دیتے ہیں' ان سے پوچھنے اور ان کے خلاف کوئی مؤثر اقدام کرنے کے لیے نہ سلامتی کونسل آمادہ ہے اور نہ UNO کا پورا ادارہ عالمی سطح پر جو ناکامیاں (failures) ہیں اور جو پیچیدگیاں ہیں' ان کا سبب یہی ہے کہ وہ فکر موجود نہیں ہے جو انسان کو انسان کے قریب لا سکے۔ نوعِ انسانی کی یہی ضرورت ہے جو یہ آیتِ مبارکہ پوری کر رہی ہے:

﴿یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ﴾

اب میں کیا مرثیہ کہوں اور کیا ماتم کروں کہ جن کے پاس یہ دولت ہے' ان کے اپنے افلاس کا حال یہ ہے کہ وہ خود ہی منقسم ہیں۔ بقول علامہ اقبال ؎

یوں تو سیّد بھی ہو' مرزا بھی ہو' افغان بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو' بتاؤ تو مسلمان بھی ہو؟

ہم پر مغربی استعمار کا جو سب سے بڑا کاری وار ہوا ہے وہ یہ ہے کہ علاقائی نیشنلزم کے ہلاکت خیز جراثیم انہوں نے ہمارے اندر بھی پیدا کر دیے۔ مثال کے طور پر عربوں کے حال زار پر ایک نگاہ ڈال لیجیے۔ ویسٹرن امپیریلزم نے عربوں میں علاقائی اور وطنی زہر کے جرثومے اس طور پر inject کیے ہیں کہ مصریوں کے لیے اب یہ بات بنائے فخر ہے کہ وہ مصری ہیں' شامیوں کے لیے بنائے فخر یہ نعرہ بن گیا کہ وہ شامی ہیں۔ یہی حال عراق' سعودی عرب اور یمن کا ہے۔ وقس علٰی هذا —— ایک قوم' ایک زبان بولنے والے' اکثر و بیشتر نسل ایک' عظیم ترین اکثریت کا دین ایک' لیکن علاقائی نیشنلزم (Territorial Nationalism) کی جو تنگ گھاٹیاں بنا کر یورپی استعمار نے ان کو چھوڑا تھا تو وہ اس سے نکل نہیں پا رہے۔ اور یہی ہماری ذلت و رسوائی اور نکبت و مسکنت کا اصل سبب ہے۔ کاش! ہم مسلمان خود اپنے معالجہ

کی طرف متوجہ ہو جائیں اور اس آیتِ مبارکہ کو اپنے لیے روشنی کا ایک مینار بنالیں۔ پہلے ہم خود وحدتِ الٰہ و وحدتِ آدم یعنی وحدتِ انسانی کی بنیاد پر ایک ملت بن جائیں۔ بقول علامہ اقبال ؎

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر!

ہم اگر دنیا کو یہ نقشہ دکھلا دیں تو بقیہ نوعِ انسانی کو بھی رہنمائی حاصل ہو سکتی ہے۔

'اسلام' اور 'ایمان'
میں فرق وتفاوت

﴿قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰـكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۴﴾﴾

''یہ بدّو کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے۔ (اے نبی ﷺ) ان سے کہہ دیجیے کہ تم ہرگز ایمان نہیں لائے ہو' بلکہ یوں کہو کہ ہم اسلام لے آئے ہیں (یعنی ہم نے اطاعت قبول کر لی ہے) جبکہ ایمان ابھی تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔ تاہم اگر تم اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرتے رہو گے تو اللہ تمہارے اعمال (کے اجر وثواب) میں کوئی کمی نہیں کرے گا۔ یقیناً اللہ بخشنے والا' رحم فرمانے والا ہے''۔

یہ بات نوٹ فرما لیجیے کہ ایک خاص مضمون کے اعتبار سے یہ قرآن مجید کی اہم ترین آیت ہے' اور وہ خاص مضمون ہے ایمان اور اسلام کا فرق۔ قرآن مجید میں اکثر وبیشتر ''ایمان واسلام'' اور ''مؤمن و مسلم'' ہم معنی اور مترادف الفاظ کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ جو کوئی مؤمن ہے وہ مسلمان ہے اور جو کوئی مسلمان ہے وہ مؤمن ہے۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے انگریزی میں ہم کہتے ہیں:

Call the rose by any name, it will smell as sweet.

اس لیے کہ ایمان ایک باطنی کیفیت ہے جبکہ اسلام اس کا عالمِ واقعہ میں ظہور ہے۔ اب جس شخص میں یہ دونوں چیزیں موجود ہیں' دل میں ایمان بھی ہے' عمل میں اسلام بھی ہے' اسے آپ چاہے مؤمن کہیں'

چاہے مسلم کہہ لیں' کوئی فرق نہیں واقع ہوگا۔لیکن یہاں آپ نے الفاظِ قرآنی اوران کا ترجمہ ملاحظہ کیا کہ اس آیۂ مبارکہ میں ان دونوں کوایک دوسرے کے بالمقابل لایا گیا ہےاور ایک معین گروہ کے دعوائے ایمان کی پرزور نفی کی گئی ہے۔'' لَمْ تُؤْمِنُوْا '' میں نہایت مؤکد نفی ہے' اسی لیے میں نے ترجمہ میں لفظ''ہرگز'' کا اضافہ کیا ہے کہ'' تم ہرگز ایمان نہیں لائے''—— عربی زبان میں فعل ماضی میں نفی پیدا کرنے کے لیے یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ماضی ہی میں ''مَا'' کا اضافہ ہوجائے' جیسے مَا اٰمَنْتُمْ ''تم ایمان نہیں لائے ہو''۔ دوسرا قاعدہ یہ ہے کہ فعل مضارع پر''لَمْ'' داخل کیا جائے ۔ یہ تاکید کے لیے ہوتا ہے۔ لَمْ تُؤْمِنُوْا ''تم ہرگز ایمان نہیں لائے''۔ بات مکمل تھی' لیکن اسے یہ فرما کر مزید مؤکد کیا گیا: ﴿وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ﴾ ''اورابھی ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا''۔ وہ تو صرف تمہاری زبانوں پر ہے۔معلوم ہوا کہ یہاں ایمان کی نہایت مؤکد' نہایت تاکیدی اسلوب سے نفی ہوگئی' بایں ہمہ ان کا اسلام تسلیم کیا جارہا ہے: ﴿وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا...... ﴾ ''البتہ تم کہہ سکتے ہو کہ ہم اسلام لے آئے ہیں (ہم مسلمان ہوگئے ہیں' ہم نے اطاعت قبول کر لی ہے''۔ اس لیے کہ اسلام کے لفظی معنی ہیں to surrender اور to tive up resistance۔یعنی مقابلہ ومقاومت اور مخالفت ومزاحمت چھوڑ کر سر تسلیم خم کر دینا۔اسے فارسی میں کہا جائے گا ''گردن نہادن''۔تو فرمایا گیا کہ یہ بدّو کہہ سکتے ہیں کہ ہم اسلام لے آئے ہیں یعنی ہم نے اطاعت قبول کر لی ہے۔

آگے فرمایا گیا: ﴿وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْـًٔا ؕ﴾ یعنی اگر تم اللہ اوراس کے رسول ﷺ کی اطاعت پر کاربند رہو گے تو تمہارے اعمال قبول کر لیے جائیں گے' ان کے اجر وثواب میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔تمہارا اسلام تسلیم ہے' لیکن اگر تمہارا یہ خیال ہے کہ تم ایمان لے آئے ہو تو یہ تمہارا بڑا مغالطہ ہے' اس کی تصحیح کرلو۔آیت کا اختتام ہوتا ہے ان الفاظِ مبارکہ پر: ﴿اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۱۴﴾ ''یقیناً اللہ نہایت بخشنے والا' بہت رحم فرمانے والا ہے''۔یعنی یہ جو رعایت دی جارہی ہے کہ قلبی ایمان کے بغیر تمہارے اسلام اور تمہاری اطاعت کو قبول کرنے اور تمہاری مغفرت کرنے' تم پر رحم فرمانے کی بشارت دی جارہی ہے' وہ اس کی شانِ غفاری و رحیمی کے طفیل ہے۔اس کی مزید وضاحت ان شاء اللہ آگے آئے گی۔

آیۂ مبارکہ کی تأویل خاص

اب ہم ذرا دو پہلوؤں سے اس آیت پر غور کریں گے۔ پہلے تو ہم اس پہلو سے اس آیت مبارکہ

کو سمجھنے کی کوشش کریں گے جسے تاویل خاص کہتے ہیں' یعنی قرآن مجید کے زمانہ نزول اور اس آیت کے پس منظر کے حوالے سے سمجھا جائے کہ وہ کون لوگ تھے جن سے یہ خطاب ہو رہا ہے۔ اس بات کی تفہیم کے لیے سیرت النبی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے جو مختلف ادوار ہیں' ذرا ان کو ذہن میں لائیے۔ جب تک حضورﷺ مکہ میں تشریف فرما رہے' سب کو معلوم ہے کہ مسلمان کمزور تھے' کفر کا غلبہ تھا۔ جو شخص اسلام قبول کرتا تھا اسے ستایا جاتا تھا' طرح طرح کی ایذائیں پہنچائی جاتی تھیں اور ہر قسم کے تشدد کا نشانہ بنایا جاتا تھا۔ لہٰذا صرف وہی شخص زبان پر کلمۂ شہادت لاتا تھا جس کے دل میں یقین کامل پیدا ہو چکا ہوتا تھا — اتنا پختہ یقین کہ وہ اس کلمۂ حق کی ادائیگی پر اپنی جان کی قربانی دینے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتا تھا — اتنا گہرا یقین کہ وہ اس کلمۂ شہادت کو ادا کرنے پر دنیا کی ہر شے کو تج دینے کے لیے ہر وقت آمادہ ہوتا تھا۔ جب اس درجے میں اس کے دل میں اللہ پر' اس کی توحید پر' حضورﷺ کی نبوت و رسالت پر اور بعث بعد الموت' حشر و نشر' جزا و سزا پر ایمان جاگزیں ہو جاتا تھا تب وہ کہتا تھا: اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰـهَ اِلاَّ اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ — یعنی وہاں ایمان پہلے تھا اور اسلام بعد میں آیا۔ لیکن ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں جب نبی اکرمﷺ تشریف لے آئے تب حالات بدل گئے۔ اب اسلام کے غلبے کے دَور شروع ہوا۔ یثرب جو بعد میں مدینۃ النبی بنا' پہلے ایک ''شہری ریاست'' تھی' پھر یہاں اسلام کا غلبہ بڑھتا چلا گیا۔ لہٰذا جیسے جیسے حالات بدلتے چلے گئے اور اسلام ایک غالب قوت کی حیثیت اختیار کرتا چلا گیا ویسے ویسے مکی دَور والی کیفیت بھی بدلتی چلی گئی۔ اب ان مصائب وشدائد سے سابقہ پیش آنا ختم ہو گیا جن کا سلسلہ مکّہ میں بارہ تیرہ سال جاری رہا تھا۔ اس تبدیل شدہ صورتِ حال کا نتیجہ یہ نکلا کہ کچھ کچے پکے لوگ بھی اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے۔ اب چونکہ کسی تشدد اور جور و تعدی کا کوئی خطرہ موجود نہیں تھا' لہٰذا لوگ جوق در جوق اسلام قبول کرنے لگے۔ اوس وخزرج کے پورے کے پورے قبیلے ایمان لے آئے۔ ظاہر بات ہے کہ چشمِ زدن میں ان کے دلوں میں حقیقی ایمان جاگزیں نہیں ہو جانا تھا' چنانچہ یہی وجہ ہے کہ مدینہ منورہ میں منافقین کی ایک جماعت کا ظہور ہونا شروع ہوا۔

پھر فتح مکہ کے بعد صورتِ حال بالکل بدل گئی۔ اب تو گویا عرب میں سب سے بڑی طاقت رسول اللہﷺ کی تھی۔ جب قریش شکست کھا چکے اور طائف کے دو مضبوط قبائل ہوازن اور ثقیف بھی مغلوب ہو گئے تو اب عرب میں اور کون تھا جو جناب محمدؐ رسول اللہﷺ کے مدّ مقابل آتا۔ لہٰذا تمام

قبائل عرب میں ایک رو چلی۔ سب نے اپنی اپنی جگہ طے کیا کہ نبی اکرم ﷺ سے مقابلہ کرنے اور آپ ﷺ کی مزاحمت کرنے کا اب کوئی فائدہ نہیں ہے' اب ہم آپ ﷺ کی پیش قدمی میں مزاحم نہیں ہو سکتے' لہٰذا خود ہی مدینہ چلیں اور محمد ﷺ کی اطاعت قبول کر لیں —— یہ ہے وہ نقشہ جو آخری پارے کی سورۃ النصر میں آتا ہے کہ:

﴿اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰہِ وَ الۡفَتۡحُ ۙ﴿۱﴾ وَ رَاَیۡتَ النَّاسَ یَدۡخُلُوۡنَ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰہِ اَفۡوَاجًا ۙ﴿۲﴾﴾

کبھی یہ عالم تھا کہ مکہ میں مہینوں میں چند لوگ ہی ایمان لائے ہوں گے اور اب یہ منظر ہے کہ ہزاروں افراد کا نمائندہ وفد دفعتاً آیا اور اس نے اسلام قبول کر لیا' یا بالفاظِ دیگر اطاعت تسلیم کر لی۔ لیکن اس کے معنی یہ تو نہیں ہیں کہ اس اجتماعی فیصلے کے نتیجے میں ان کے دلوں کی کیفیت بھی چشمِ زدن میں بدل گئی ہو۔ لہٰذا اب ایسے لوگ بھی وجود میں آ گئے جو مسلم تو ہیں' جنہوں نے اطاعت قبول کر لی ہے' جو کلمۂ شہادت ادا کر رہے ہیں' لیکن ''مؤمن'' ہونے کی کیفیت ابھی انہیں حاصل نہیں ہوئی۔

یہ بات پیشِ نظر رکھیے کہ جتنے قبائل بھی ایمان لائے ان میں سب کی کیفیت یہ نہیں تھی۔ البتہ کچھ لوگ یقیناً ایسے بھی تھے جن سے یہ خطاب ہو رہا ہے۔ اعراب یعنی بدوؤں کے بارے میں سورۃ التوبۃ کی آیت نمبر ۹۹ میں یہ وضاحت موجود ہے:

﴿وَ مِنَ الۡاَعۡرَابِ مَنۡ یُّؤۡمِنُ بِاللّٰہِ وَ الۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَ یَتَّخِذُ مَا یُنۡفِقُ قُرُبٰتٍ عِنۡدَ اللّٰہِ وَ صَلَوٰتِ الرَّسُوۡلِ ؕ اَلَاۤ اِنَّہَا قُرۡبَۃٌ لَّہُمۡ ؕ سَیُدۡخِلُہُمُ اللّٰہُ فِیۡ رَحۡمَتِہٖ ؕ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۹۹﴾﴾

''اور بدوؤں' بادیہ نشینوں میں بعض ایسے بھی ہیں جو اللہ پر اور یومِ آخر پر پختہ یقین رکھتے ہیں اور وہ اپنا مال خرچ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کے لیے اور رسول (ﷺ) سے دعائیں لینے کا ذریعہ بنانے کے لیے۔ یاد رکھو' ان کا خرچ کرنا بے شک موجبِ قربت ہے۔ اللہ ان کو ضرور اپنی رحمت میں داخل فرمائے گا۔ بے شک اللہ نہایت مغفرت فرمانے والا' بڑا رحم فرمانے والا ہے''۔

یہ آیت مبارکہ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ سب بدو ایسے نہیں تھے۔

تأویل عام کے اعتبار سے ہمارے لیے نوید جاں فزا

اب ذرا اس آیت مبارکہ پر تأویل عام کے اعتبار سے غور کیجیے۔ اب اگر ہم اپنی صورتِ حال پر

غور کریں گے تو ہمیں محسوس ہوگا کہ ہماری عظیم اکثریت کا معاملہ بھی یہی ہے۔ ہم نے اپنے انتخاب (choice) سے تو ایمان قبول نہیں کیا‘ ہمیں دولتِ ایمان سوچ سمجھ کر‘ اپنے فیصلے سے حاصل نہیں ہوئی‘ بلکہ ہمیں تو اسلام وراثتاً مل گیا ہے۔ وہاں فتح مکہ کے بعد ایک رو چلی تھی کہ لوگ فوج در فوج اسلام میں داخل ہو گئے تھے۔ یہاں ایک نسلی تسلسل ہے‘ ایک سلسلہ ہے جو نسل کی وجہ سے منتقل ہو رہا ہے۔ تو ہم میں سے بھی اکثر و بیشتر درحقیقت اس آیت کا مصداق ہیں ۔اِلَّا مَاشَاءَ اللّٰہُ‘ جن کو اللہ تعالیٰ حقیقی وقلبی ایمان وایقان کی دولت نصیب فرما دے۔ اور بہرحال ایسے افراد ہر دور میں موجود رہے ہیں اور آج بھی موجود ہیں‘ لیکن اگر ہم اکثریت کو سامنے رکھ کر غور کریں گے تو معاملہ اسی مقام پر نظر آئے گا کہ اسلام ہے‘ کلمۂ شہادت ہے‘ لیکن دلی یقین والی کیفیت شاذ و نادر ہی نظر آئے گی۔ وہ یقین جس کے بارے میں علامہ اقبال نے کہا تھا ؎

یقیں پیدا کر اے ناداں! یقیں سے ہاتھ آتی ہے
وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری!

تو یہ یقین عنقا ہے۔ یہ وہ شے ہے جو شاذ شاذ ہی نظر آتی ہے۔

اب اگر ہم اس صورتِ حال کو سامنے رکھ کر اس آیت پر مزید غور کریں تو ایک بات ہمارے لیے بڑی امید افزا اور نوید جاں فزا ہے کہ جیسے ان بدوؤں سے کہا گیا کہ اگر تم اپنے سینوں میں جھانکو اور تمہیں محسوس ہو کہ وہ یقین والی بات حاصل نہیں ہے تو بھی مایوس نہ ہو ——— ’’اگر تم اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کی اطاعت پر کاربند ہو گے تو ہم تمہارے اعمال میں کچھ کمی نہیں کریں گے‘‘۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ بہت بڑی رعایت ہے۔ غور کیجیے کہ اگر منطقی اور اصولی طور پر بات سمجھی جائے تو وہ یہ ہوگی کہ ایمان کے بغیر کوئی عمل قبول نہیں ہونا چاہیے‘ لیکن یہاں رعایت دی جا رہی ہے کہ کوئی شخص اپنے دل کو ٹٹولے اور محسوس کرے کہ یقین والی کیفیت موجود نہیں ہے تو بھی مایوس نہ ہو۔ اس حالت و کیفیت میں بھی اگر تم اطاعت پر کاربند رہو گے‘ نافرمانیوں سے بچو گے تو ہم تمہارے اعمال قبول کر لیں گے۔ ان میں کوئی کمی اور کٹوتی نہیں کریں گے۔

اب ذرا غور کیجیے کہ آیت کا اختتام اللہ تعالیٰ کی کن صفات پر ہو رہا ہے! فرمایا: ﴿اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝۱۴﴾ ’’یقیناً اللہ غفور ہے‘ رحیم ہے‘‘۔ یہ اس کی شانِ غفاری کا صدقہ اور اس کی شانِ رحیمی کا مظہر ہے کہ وہ تمہارے ساتھ یہ نرمی برت رہا ہے اور تمہیں یہ رعایت دے رہا ہے کہ ایمانِ حقیقی اور

یقین قلبی میسر نہ ہو تب بھی اگر تم اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرتے رہو گے تو تمہارے اعمال قبول کر لیے جائیں گے، تمہارے اجر و ثواب میں ذرہ برابر کوئی کمی اور کٹوتی نہیں ہوگی: ﴿لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْئًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ؀﴾

جزوی اطاعت کی حقیقت

البتہ اس میں ایک انتباہ بھی ہے کہ اسے کہیں انسان اپنے لیے ایک کھلا لائسنس نہ سمجھ لے، کھلی چھٹی نہ سمجھ بیٹھے۔ اور کہیں ایسا نہ ہو کہ حقیقی ایمان کے حصول کی کوئی کوشش ہی نہ کرے۔ اس لیے کہ از روئے قرآن مغفرت کے لیے کلی اطاعت مطلوب ہوگی۔ جزوی اطاعت، اطاعت نہیں ہے۔ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے بعض احکام کو مان لینا اور بعض احکام کو ترک کر دینا، بعض کو سر آنکھوں پر رکھنا اور بعض کو پاؤں تلے روند دینا، یہ اطاعت نہیں ہے۔ یہ جسارت ہے، یہ ڈھٹائی ہے، یہ گستاخی ہے، یہ اللہ کے ساتھ تمسخر واستہزاء ہے۔ وہ جو کہتے ہیں ''بازی بازی با ریش بابا ہم بازی!'' یہ کھیل تم اللہ کے ساتھ کھیل رہے ہو! یہ مذاق تم اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ کر رہے ہو! نماز پڑھنے کا حکم کس کا ہے؟ اللہ کا! وہ تو ہم پڑھیں گے۔ اللہ ہی کا حکم ہے روزہ رکھو، ہم رکھیں گے، اللہ ہی کا حکم ہے کہ رشوت نہ لو، لیکن اسے ہم نہیں مانیں گے۔ اس کے کیا معنی ہیں؟ یہ کہ اللہ کے بعض احکام کو تو سر آنکھوں پر رکھا اور بعض کو پاؤں تلے روند دیا۔ جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا کہ یہ جسارت ہے، ڈھٹائی ہے، اللہ کی جناب میں بہت بڑی گستاخی ہے۔ اس پر سورۃ البقرۃ کی آیت ۸۵ میں شدید تنبیہ کی گئی ہے۔ فرمایا: ﴿اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ﴾ ''کیا تم ہماری کتاب (اور شریعت) کے ایک حصے کو مانتے ہو اور ایک حصے کو نہیں مانتے؟'' —— سود کی حرمت بھی تو اسی قرآن میں ہے۔ رشوت لینے اور دینے سے منع بھی تو اسی شریعت اسلامی نے کیا ہے جس میں فرض عبادات کا حکم ہے —— یہ رویہ اور وطیرہ اختیار کرنے والوں کے لیے آگے وعید آئی ہے: ﴿فَمَا جَزَاۗءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا﴾ ''پس کوئی سزا نہیں ہے اس شخص کی جو تم میں سے یہ طرزِ عمل اختیار کرے گا سوائے اس کے کہ اسے دنیا کی زندگی میں ذلیل وخوار کر دیا جائے'' ﴿وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ؀﴾ ''اور قیامت کے دن انہیں شدید ترین عذاب میں جھونک دیا جائے گا، اور جان لو کہ اللہ غافل اور بے خبر نہیں ہے اس سے جو تم کر رہے ہو''۔ تم لوگوں کو دھوکہ دے سکتے ہو، تم لوگوں کی زبانیں بند کر سکتے ہو لیکن اللہ سے کوئی چیز چھپا نہیں سکتے۔

تو یہ ہے نہایت زوردار انتباہ۔ کسی وقت کوئی خطا ہو جائے تو وہ بات اور ہے—— جذبات میں مغلوب ہو کر انسان کوئی غلطی کر بیٹھے تو یہ بات اور ہے۔ وہ فوراً رجوع کرے گا' توبہ کرے گا۔ توبہ پر ہماری ان مجالس میں بڑی تفصیل سے گفتگو ہو چکی ہے۔ میں مثال دیا کرتا ہوں کہ آپ راہ چلتے ہوئے کہیں پھسل کر کیچڑ میں گر جائیں تو وہاں پڑے نہیں رہتے' بجلی کی تیزی سے اٹھتے ہیں۔ یہی معاملہ توبہ کا ہے۔ انسان کا پاؤں پھسل سکتا ہے' لغزش ہو سکتی ہے' انسان کسی معصیت میں' کسی گناہ میں' کسی غلط کام میں ملوث ہو سکتا ہے۔ ماحول کے کچھ وقتی اثرات غالب آ جائیں' کسی وقت نفس میں کوئی طوفان آ گیا ہو جس کے باعث آپ کے حواس مختل ہو جائیں' آپ جذبات کی شدت سے مغلوب ہو جائیں اور آپ کوئی غلط کام کر بیٹھیں' تو اگر اللہ کا خوف دامن گیر ہے' خدا ترسی ہے' آخرت کا استحضار ہے تو آپ ہوش میں آتے ہی رجوع کریں گے' پلٹیں گے' ندامت اور پشیمانی کا اظہار کریں گے۔ آپ اپنی خطا کا اللہ کے سامنے اقرار کریں گے' سچے دل سے توبہ کریں گے' گڑگڑا کر اس سے استغفار کریں گے' اس سے عفو کے طالب ہوں گے۔ آپ کی اس روش کے جواب میں آپ کے ساتھ معاملہ یہ ہوگا ؎

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لیے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

وقتی طور پر خطا کا صدور ہو جانا' کوئی گناہ کر بیٹھنا' کسی معصیت کا ارتکاب ہو جانا بالکل دوسری بات ہے' لیکن کسی معصیت پر مستقل ڈیرہ لگا کر بیٹھ جانا' اپنی زندگی میں کسی حرام کام کو مستقل طور پر جاری رکھنا' یہ بالکل وہی بات ہے کہ: ﴿اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ﴾ —— اس وطیرے اور رویے پر جو وعید آئی ہے اس کے تناظر میں آپ نے محسوس کر لیا ہوگا کہ ہم جو یہ سوال کیا کرتے ہیں کہ ؎

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں!

یعنی ہم دنیا میں کیوں ذلیل و رسوا ہو گئے اور اس ذلت و رسوائی میں اضافہ کیوں ہوتا چلا جا رہا ہے؟ تو اس کا جواب سورۃ البقرۃ کی اسی آیت میں موجود ہے۔ یہ اس سبب سے ہے کہ ہم نے شریعت اسلامی کے حصے بخرے کر رکھے ہیں کہ ایک کو مانیں گے' ایک کو نہیں مانیں گے۔ اسی گستاخانہ رویے کی سزا بیان ہوئی: ﴿خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا﴾ ''دنیا کی زندگی میں رسوائی' ذلت اور خواری''۔ یہی سزا ہے

جو ہمیں مل رہی ہے اور اسی رویے کی وجہ سے ہم اپنے آپ کو آخرت کے عذاب کا مستحق بنا چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی شانِ غفاری و رحیمی کے سہارے اگر چھٹکارا مل جائے تو بات دوسری ہے۔

اسلامی معاشرے میں ''ایمان'' اور ''اسلام'' کی اہمیت

اس آیت مبارکہ کے بارے میں اب آخری بات نوٹ کیجیے۔ اپنی جگہ پر اس کا یہ مضمون بہت اہم ہے کہ اس میں اسلام اور ایمان کو علیحدہ کر دیا گیا —— اور اس مضمون کے اعتبار سے یہ آیت قرآن مجید کی چوٹی (Climax) اور ذروۃ السنام ہے —— اب سوال یہ ہے کہ سورۃ الحجرات میں مسلمانوں کی حیاتِ ملی کے جو مضامین آ رہے ہیں' ان سے اس بحث کا ربط و تعلق کیا ہے! اس لیے کہ ہر سورۃ کا جو مرکزی مضمون ہوتا ہے اس سورۃ کی تمام آیات اس کے ساتھ مربوط ہوتی ہیں —— وہ ربط یہ ہے کہ چاہے مسلمانوں کے معاشرے میں شمولیت و شرکت کا معاملہ ہو' چاہے اسلامی ریاست کی شہریت کا معاملہ ہے۔ ایک مسلمان مرد کی شادی ایک مسلمان عورت سے ہو سکتی ہے اور ایک مسلمان عورت کا نکاح صرف ایک مسلمان مرد سے ہو سکتا ہے۔ مسلمان باپ کی وراثت مسلمان اولاد ہی کو منتقل ہو سکتی ہے۔ یہ خالص قانونی مسئلہ ہے۔ اسلامی ریاست کا شہری مسلمان ہو گا۔ اسلام اس شہریت کی بنیاد ہے۔ لہٰذا طے کرنا پڑے گا کہ کون مسلمان ہے' کون نہیں ہے۔ جبکہ جہاں تک ایمان کا تعلق ہے تو وہ ایک باطنی کیفیت ہے' وہ دل میں ہوتا ہے۔ دل میں یقین ہے یا نہیں' اس کا فیصلہ ہم نہیں کر سکتے۔ آج بھی ہمارے پاس کوئی آلہ اور ذریعہ موجود نہیں ہے جس کی مدد سے ہم یہ طے کر سکیں کہ کسی کے دل میں ایمان ہے یا نہیں ہے۔ لہٰذا دنیا میں مسلمان معاشرے میں کسی کی شرکت و شمولیت اور اسلامی ریاست کی شہریت کی بنیاد اسلام ہے' ایمان نہیں ہے۔ البتہ آخرت میں ہمارا جو انجام ہونا ہے اس کی بنیاد ایمان ہے۔

''ایمان'' کی جامع و مانع تعریف

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ حقیقی ایمان کسے کہتے ہیں اور اس کے خصائص کیا ہیں! یہ اس سورۂ مبارکہ کی اگلی آیت کا موضوع ہے' جس کا اب ہم مطالعہ کرتے ہیں۔

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝۱۵﴾

''مؤمن تو بس وہ ہیں جو ایمان لائے اللہ پر اور اس کے رسول (ﷺ) پر' پھر شک میں نہیں

پڑے' اور انہوں نے جہاد کیا اپنے اموال اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں۔ صرف یہی لوگ (اپنے دعوائے ایمان میں) سچے ہیں۔''

یہ آیتِ مبارکہ بھی اپنے مضمون کے اعتبار سے قرآن مجید کا نقطۂ عروج ہے۔ وہ مضمون یہ ہے کہ ایمانِ حقیقی کی تعریف کیا ہے؟ جب یہ واضح ہو گیا کہ ایمان اور ہے' اسلام اور ہے تو فطری طور پر ایک سوال ذہن میں ابھر کر آئے گا کہ ''ایمان'' کسے کہتے ہیں! چنانچہ یہ وہ مقام ہے جسے میں ایمان کی جامع و مانع تعریف قرار دیتا ہوں۔ جامع و مانع تعریف ایک تو اس پہلو سے ہے کہ سیاقِ کلام میں ایمان اور اسلام کا علیحدہ علیحدہ بیان ہوا ہے۔ ویسے ایمان کی کیفیات قرآن مجید میں جابجا بیان ہوئی ہیں۔ ایمان کے ثمرات اور اس کے نتائج کے بارے میں ہم سورۃ التغابن میں تفاصیل پڑھ چکے ہیں' جس کا دوسرا رکوع ایمان کے ثمرات' ایمان کے نتائج' ایمان کے مقتضیات اور ایمان کے مضمرات ہی کے موضوع پر تھا۔ لیکن یہاں یہ دیکھنا ہے کہ سیاقِ کلام کیا ہے! وہ ہے ایمان اور اسلام کا فرق۔ لہٰذا اس پس منظر میں یہ مضمون آ رہا ہے کہ مؤمن تو بس وہ ہیں جن میں وہ دو شرطیں پوری ہو رہی ہوں جو اس آیت مبارکہ میں بیان ہو رہی ہیں —— گویا یہ ایمان کی تعریف (definition) کا مقام ہے دوسرے اس پہلو سے کہ اس آیت مبارکہ کے شروع میں بھی اسلوبِ حصر ہے اور اختتام پر بھی۔ ''حصر'' ایک اصطلاح ہے' اس کو اس مثال سے اچھی طرح سمجھا جا سکے گا کہ ہم ایک جملہ کہتے ہیں ''زید عالم ہے'' اور ایک کہتے ہیں کہ ''زید ہی عالم ہے''۔ اب غور کیجیے کہ ان دو جملوں میں کیا فرق واقع ہوا؟ پہلے جملے ''زید عالم'' میں زید کے عالم ہونے کا اثبات ہوا لیکن کسی دوسرے کے عالم ہونے کی نفی نہیں ہوئی۔ یعنی زید کے علاوہ کوئی اور بھی عالم ہو سکتا ہے۔ جبکہ اس جملے میں کہ ''زید ہی عالم ہے'' زید کے عالم ہونے کا اثبات اور دوسروں کے عالم ہونے کی نفی ہو رہی ہے۔ یعنی زید کے سوا اور کوئی عالم نہیں ہے۔ گویا علم منحصر ہے زید میں۔ اس کو اسلوبِ حصر کہتے ہیں۔ چنانچہ آیت کے شروع میں آیا: ﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ...... ﴾ معنی ہوں گے ''مؤمن تو بس وہ لوگ ہیں'' یا ''مؤمن تو صرف وہ لوگ ہیں''۔ آخر میں بھی اسلوبِ حصر ہے: ﴿اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ﴿۱۵﴾﴾ ''صرف یہی لوگ سچے ہیں''۔ یعنی دعوائے ایمان تو انہوں نے بھی کیا تھا جن کا ذکر پچھلی آیت میں ہوا: ﴿قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ﴾ ایمان کے مدعی اور دعوے دار تو بہت سے ہیں' لیکن اس دعوائے ایمان میں سچے صرف وہ ہیں جو ان شرطوں کو پورا کریں جو اس آیتِ مبارکہ میں بیان کی جا رہی ہیں۔

ایمان اور جہاد کا تعلق

آیت کے اس اوّل و آخر کو سمجھ کر اب آیئے یہ دیکھیں کہ اس آیت کا اصل مضمون اور اصل content کیا ہے!—— آیت پر تھوڑے سے غور سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ایمانِ حقیقی کے دو لوازم ہیں۔ یا اگر بغرضِ تفہیم فقہی اصطلاح استعمال کی جائے تو کہا جائے گا کہ ایمانِ حقیقی کے دو ارکان ہیں۔ دیکھئے کہ ارکانِ اسلام سے ہر مسلمان واقف ہے جو حدیث میں بیان ہوئے ہیں:

((بُنِیَ الْاِسْلَامُ عَلٰی خَمْسٍ شَھَادَۃُ اَنْ لَّا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ وَاِقَامِ الصَّلَاۃِ وَاِیْتَاءِ الزَّکَاۃِ وَالْحَجِّ وَصَوْمِ رَمَضَانَ))(1)

''اسلام کی بنیاد پانچ باتوں پر ہے: کلمۂ شہادت' نماز' زکوٰۃ' حج اور صومِ رمضان۔''

یہ پانچوں کیا ہیں؟ یہ ارکانِ اسلام ہیں؟ اسلام کے ستون ہیں!—— اس اصطلاح کو ذہن نشین کر لیجیے اور دیکھئے کہ اس آیتِ مبارکہ کی رو سے ایمان کے دو ارکان کیا ہیں! پہلا رکن ہے اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) پر وہ ایمان جس میں شکوک وشبہات باقی نہ رہیں۔ یہاں بھی دیکھئے کہ ''ریب'' سے فعل مضارع ''یَرْتَابُوْا'' سے پہلے ''لَمْ'' آیا۔ معنی ہوئے ''ہرگز شک نہ کریں''۔ یعنی شکوک وشبہات کے کانٹے بالکل نکل چکے ہوں۔ معلوم ہوا کہ یہ ہے ''یقین قلبی''—— یہ فکر ونظر یعنی عقیدے کا اخلاص ہوا۔ یہ ہے ایمانِ حقیقی کا پہلا رکن۔ دوسرا رکن عمل سے متعلق ہے اور وہ ہے جہاد فی سبیل اللہ' اپنے اموال اور اپنی جانوں سے۔ پس ایمانِ حقیقی کے دو ارکان ہوئے' ایک ''یقین'' جو قلب میں ہوگا اور دوسرا ''جہاد'' جو عمل میں ہوگا۔

یہاں ایک نکتہ مزید سمجھ لیجیے۔ ایمان مجمل کے الفاظ ہیں:

آمَنْتُ بِاللّٰہِ کَمَا ھُوَ بِاَسْمَائِہٖ وَصِفَاتِہٖ وَقَبِلْتُ جَمِیْعَ اَحْکَامِہٖ اِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ وَتَصْدِیْقٌ بِالْقَلْبِ

ان الفاظ سے معلوم ہوا کہ ایمان کے دو پہلو یا دو درجے ہیں۔ ایک زبان سے اقرار اور دوسرا دل سے تصدیق یا قلبی یقین۔ اب ان میں سے پہلا درجہ یعنی اِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ ایمانِ قانونی یا اسلام کا رکن ہے شَھَادَۃُ اَنْ لَّا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ. یہ تصدیق ہے' testimony ہے۔ ایک شخص زبان سے اقرار کرے کہ میں مانتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور تسلیم کرے کہ حضرت

(1) مسلم کتاب الایمان، باب ارکان الاسلام و دعائمہ العظام

محمدﷺ اللہ کے رسول ہیں' تو اس اِقْـرَارٌ بِـاللِّسَـانِ کی حیثیت اسلام کے رکن کی ہوگی جبکہ تصدیق بالقلب ایمانِ حقیقی کا رکن ہوگا۔

ایمانِ حقیقی کے دو ارکان میں سے پہلے رکن یعنی یقین قلبی پر پہلے بھی گفتگو ہو چکی ہے کہ اس کے کیا آثار ہیں! یقین موجود ہے تو اس کے کیا نتائج وثمرات انسان کے عمل میں ظہور پذیر ہوں گے! ان امور کا ہم سورۃ التغابن میں تفصیل سے مطالعہ کر چکے ہیں۔ لہٰذا اب ہمیں گفتگو کو زیادہ مرتکز کرنا ہوگا دوسرے رکن یعنی جہاد فی سبیل اللہ کے موضوع پر۔ یہ تو معلوم ہو گیا کہ یہ رکن ہے ایمانِ حقیقی کا' یعنی اگر یہ موجود ہے تو حقیقی ایمان موجود ہے اور اگر یہ نہیں ہے تو ایمانِ حقیقی حاصل نہیں ہے۔

''جہاد فی سبیل اللہ'' کی اصل حقیقت

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ جہاد فی سبیل اللہ ہے کیا؟ جہاد کے بارے میں ہمارے یہاں دو بڑے بڑے مغالطے ہیں۔ ایک یہ کہ جہاد کے معنی جنگ کے لیے جاتے ہیں۔ یہ بات صحیح نہیں ہے' اس کی بلند ترین چوٹی جنگ ہے۔ اس کی وضاحت آگے بیان کی جائے گی۔ ویسے جنگ کے لیے قرآن مجید کی اصطلاح قتَال فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ہے ——''جہاد'' کا لفظ ''جہد'' سے بنا ہے' اور جہد کے معنی کوشش کے ہیں۔ جدوجہد کا لفظ ہم بولتے ہیں۔ ''قتال'' کا لفظ ''قتل'' سے بنا ہے' اس کے معنی جنگ کے ہیں۔ دوسرا مغالطہ یہ ہے کہ مسلمان جو بھی جنگ کرے' جہاد ہے۔ یہ گویا بنائے فاسد علی الفاسد ہے' یعنی ایک غلط بات پر ایک اور غلط بات کی بنیاد رکھنا۔ مسلمان کی صرف وہ جنگ قتال فی سبیل اللہ یا جہاد کی چوٹی کے اعتبار سے جہاد فی سبیل اللہ ہو سکتی ہے جس کا مقصد صرف اللہ کے کلمہ کو سربلند کرنا ہو۔ اگر وہ ہوسِ ملک گیری کی غرض سے ہے' اپنے دنیوی اقتدار کی توسیع کے مقصد کے تحت ہے تو وہ قتال یا جہاد فی سبیل اللہ نہیں ہے۔ لہٰذا ان دونوں مغالطوں کو ذہن سے نکال دیجیے اور اب مثبت طور پر سمجھئے کہ جہاد کسے کہتے ہیں!

جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ اس کا مادہ (root) جہد ہے' اور جہد کے معنی کوشش کے ہیں۔ انگریزی میں اسے یوں ادا کریں گے ''to strive for something''۔ یہ جہد ہے —— لیکن مجاہدہ یا جہاد کے الفاظ میں ایک اضافی معنی پیدا ہو جاتے ہیں۔ مجاہدہ وہ ہوگا جہاں جہد' جہد سے ٹکرائے' جہاں کوشش کا کوشش سے مقابلہ ہو۔ عربی زبان میں بابِ مفاعلہ میں جو الفاظ آتے ہیں ان میں اکثر الفاظ میں آپ کو یہ خاصیت ملے گی کہ دو فریق بالمقابل آ کر ایک ہی عمل کر رہے ہوں اور ایک دوسرے کو زیر

کرنا چاہتے ہوں۔ جیسے مباحثہ ہے۔ مباحثہ میں دو فریق ہوتے ہیں' اس کا ایک موقف ہے' دوسرے کا کوئی دوسرا موقف ہے۔ یہ اپنے حق میں دلیل دے گا' وہ اپنے حق میں دلیل دے گا۔ یہ اُس کی دلیل کو کاٹے گا' وہ اِس کی دلیل کو کاٹے گا۔ یہ مباحثہ ہے۔ اسی طرح مقابلہ کے معنی ہیں ایک دوسرے کے سامنے آنا۔ مقاتلہ یا قتال کے معنی ہوئے ایک دوسرے کو قتل کرنے کی کوشش کرنا۔ چنانچہ جہاد یا مجاہدہ یہ ہے کہ جہد' جہد سے ٹکرا رہی ہو' کوششوں کا تصادم ہو رہا ہو۔ فارسی میں اس کو کشمکش اور کشاکش سے تعبیر کریں گے۔ انگریزی میں اس کے لیے struggle بالکل صحیح لفظ ہے۔ struggle یقیناً کسی کے خلاف ہوتی ہے' کسی مزاحمت کے مقابلے میں ہوتی ہے۔ اسی لیے اس کے بعد resistance صلہ یعنی preposition کے طور پر against آتا ہے۔

اب دیکھئے' دنیا میں کیا ہوتا ہے! ایک شخص کا ایک نظریہ ہے' دوسرے کا دوسرا۔ مثال کے طور پر ایک شخص مارکسسٹ ہے' دوسرا شخص مغربی جمہوری سرمایہ دارانہ نظام کا قائل ہے۔ یہ بھی اخلاص کے ساتھ اپنے نظریے کا قائل ہے اور وہ بھی اپنے نظریے میں مخلص ہے۔ ان دونوں کے درمیان تصادم ہو کر رہے گا۔ یہ تصادم پہلے نظریاتی سطح پر ہوگا۔ وہ اپنے نظریئے کی تشہیر کرے گا' یہ اپنے نظریئے کو پھیلائے گا۔ وہ اپنے ہم خیال لوگوں کی جماعت بنائے گا' یہ اپنے ہم خیالوں کی تنظیم بنائے گا۔ پھر ان کے درمیان کشمکش ہوگی۔ جو جیت جائے گا' اس کے نظریہ کے مطابق اس ملک میں نظام قائم ہو جائے گا۔ لہٰذا واقعہ یہ ہے کہ اگر خلوص کے ساتھ کسی نظریہ کو تسلیم کیا گیا ہو تو اس کے لیے جدوجہد اور مجاہدہ ناگزیر ہے۔ اگر نہیں ہو رہا ہے تو یہ قطعی طور پر اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ شخص اپنے نظریے میں مخلص نہیں ہے۔ مخلص اور صاحب کردار انسان ہوگا تو وہ اپنے نظریے کی دعوت و تبلیغ کے لیے جدوجہد کرے گا اور اسی عمل کا نام جہاد ہے۔ پس اگر کسی شخص کو یقین حاصل ہے اللہ پر' اس کی توحید پر' اس کے رسول حضرت محمد ﷺ پر' قرآن پر اور اسلام پر تو لامحالہ اس کے اس یقین کا ظہور اس کے عمل میں اس طریق سے ہوگا کہ وہ اسلام کے لیے جدوجہد کرے گا' محنت کرے گا' کوشش کرے گا۔ اسلام کو پھیلائے گا' ایمان کی دعوت عام کرے گا' ان لوگوں کو جمع کرے گا جو اسلام کے لیے جان اور مال دینے کے لیے تیار ہوں گے۔ وہ اسلامی نظام کے قیام کے لیے struggle کرے گا۔ اگر ایمانِ حقیقی دل میں ہے تو یہ ہو کر رہے گا اور اگر یہ نہیں ہو رہا ہے تو دلی یقین والا ایمان موجود نہیں ہے۔ یہ ہیں معنی اس کے کہ جہاد رکن ہے ایمان کا۔

جہاد فی سبیل اللہ کے مراتب و مراحل

اب ذرا جہاد کے مراتب اور درجات کو بھی سن لیجیے۔ اس کے لیے ایک تین منزلہ عمارت کو ذہن میں رکھیے۔ اس کا پہلا اور اہم ترین درجہ مجاہدہ مع النفس ہے۔ آپ نے اللہ کو مانا ہے‘ رسول ﷺ کو مانا ہے‘ قرآن کو مانا ہے‘ شریعت کو مانا ہے‘ لیکن آپ کا نفس آپ کو کسی اور طرف لے جانا چاہ رہا ہو۔ شریعت نے کہا ہے کہ سود حرام ہے‘ مگر نفس آپ کو ترغیب دے رہا ہے کہ نہیں یہ تو کاروبار کو پھیلانے کے لیے‘ معاشی دوڑ میں آگے بڑھنے کے لیے ناگزیر ہے‘ اس کے بغیر کاروبار محدود رہے گا اور اس کی توسیع ممکن نہیں ہوگی‘ نتیجتاً میں معاشی دوڑ میں بہت پیچھے رہ جاؤں گا۔ اب یہ کشمکش آپ کے باطن میں پیدا ہو گی۔ اسی طرح صبح کا وقت ہے‘ اذان بھی ہوگئی ہے‘ آپ نے سن بھی لی ہے۔ آپ کو معلوم ہو گیا ہے کہ اس وقت حَیَّ عَلَی الصَّلَاۃِ اور حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ کی صدا‘ یہ پکار‘ یہ call اللہ کی طرف سے ہے‘ لہٰذا اب مسجد کا رخ کرنا اور نماز پڑھنا ہے۔ لیکن نفس کہتا ہے کہ نہیں‘ ابھی سوتے رہو‘ ابھی آرام کرو‘ کیوں صبح کی میٹھی نیند کو خراب کرتے ہو! تو اس نوع کی کشمکش ہر شخص کے اندر ہر آن‘ ہر وقت ہوتی رہتی ہے‘ اسے ہر لحظہ ایسی کشمکش سے واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ اس میں اگر آپ اپنے نفس کے ساتھ کشمکش کریں‘ اسے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا مطیع بنائیں‘ تو یہ مجاہدہ مع النفس ہے‘ یہ اپنے اندر کا جہاد ہے۔ اسے نبی اکرم ﷺ نے افضل جہاد قرار دیا ہے۔ حضور ﷺ سے پوچھا گیا: اَیُّ الْجِھَادِ اَفْضَلُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ تو آپؐ نے فرمایا: ((اَنْ تُجَاھِدَ نَفْسَکَ فِیْ طَاعَۃِ اللّٰہِ)) سوال یہ تھا کہ ’’اے اللہ کے رسول ﷺ سب سے افضل جہاد کون سا ہے؟‘‘ جواب میں حضور ﷺ نے فرمایا: ’’یہ کہ تو اپنے نفس سے کشمکش کرے اور اسے اللہ کا مطیع بنائے‘‘۔ بدقسمتی سے جہاد کا یہ تصور ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گیا ہے۔

اندر کی شخصیت سے پھر یہ جہاد باہر نکلے گا تو اب ہوگا ’’مجاہدہ مع الکفر‘‘ —— یعنی نظریاتی سطح پر آپ ایمان کی دعوت دیجیے۔ کفر‘ الحاد‘ مادہ پرستی اور اباحیت کے خلاف تبلیغ‘ تلقین اور وعظ و نصیحت کیجیے اور دلائل و براہین پیش کیجیے۔ نظریاتی سطح پر اسلام و ایمان کی دعوت اور فروغ کا کام کیجیے۔ ظاہر بات ہے کہ ان کاموں میں مال بھی کھپے گا‘ جان بھی کھپے گی اور وقت بھی لگے گا۔ اسی وقت کو صرف کر کے آپ پیسہ کما سکتے ہیں‘ لیکن یہ وقت آپ کو دعوت و تبلیغ میں لگانا ہے۔ یہ جہاد فی سبیل اللہ کی دوسری منزل ہوئی

—— پہلی مجاہدہ مع النفس اور دوسری مجاہدہ مع الکفر۔

تیسری منزل ہے ''مجاہدہ مع الکفار''—— بات اب اگر آگے بڑھے گی تو کشمکش ہوگی۔ کفار اپنے نظریے کا غلبہ چاہتے ہیں اور مؤمن دین کا غلبہ چاہتا ہے! لِتَکُوْنَ کَلِمَةُ اللّٰہِ هِیَ الْعُلْیَا. ان کے مابین پرامن مفاہمت ناممکن ہے' لہٰذا تصادم ہو کر رہے گا۔ لیکن اس تصادم کے بھی مختلف مراحل ہوں گے۔ اس تصادم کا ابتدائی مرحلہ ہوگا صبرِ محض' جسے انگریزی میں Passive Resistance کہتے ہیں۔ مخالفین آپ پر تشدد کریں' آپ کو ستائیں' لیکن آپ اپنے مؤقف پر ڈٹے رہیں' پیچھے نہ ہٹیں اور پھر جواباً ہاتھ بھی نہ اٹھائیں۔ یہ پہلا مرحلہ ہے۔ لیکن جب طاقت اتنی فراہم ہو چکی ہو تو آپ جوابی کارروائی بھی کر سکیں تو اس کو Active Resistance کہیں گے۔ اب آپ بھی اقدام کریں۔ دیکھئے مکہ میں صحابہ ﷺ کو یا حکم تھا! یہ کہ چاہے تمہیں دہکتے ہوئے انگاروں پر لٹا دیا جائے' لیٹ جاؤ۔ تم جوابی اقدام نہیں کر سکتے' اپنی مدافعت میں ہاتھ بھی نہیں اٹھا سکتے۔ لیکن اس کے بعد وہ وقت آیا کہ ہاتھ کھول دیے گئے۔ آیت نازل ہوگئی: ﴿اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا﴾ یعنی آج سے اجازت دی جا رہی ہے ان کو جن پر ظلم کے پہاڑ توڑ دیے گئے تھے کہ وہ اینٹ کا جواب پتھر سے دے سکتے ہیں۔ اور اس تصادم مع الکفار کا آخری درجہ ہے Armed Conflict یعنی مسلح تصادم۔ اور یہ ہے جہاد کی وہ بلند ترین چوٹی' جہاں پہنچ کر جہاد قتال بن جائے گا' جس کے بارے میں الفاظ آئے: ﴿کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِتَالُ﴾ مدینہ منورہ میں وہ وقت آیا کہ حکم آ گیا کہ اب تم پر جنگ فرض کر دی گئی ہے۔

پس یہ جہاد فی سبیل اللہ کے تین مراحل ہیں۔ اس کی غرض و غایت کیا ہوگی؟ اللہ کے دین کا غلبہ' اللہ کے دین کو قائم کرنا۔ وہ نظام جو اللہ تعالیٰ نے دیا' جو اس کے رسول ﷺ نے دیا' جو قرآن نے دیا اسے بالفعل نافذ کر دیا۔ اس کے لیے پہلے مجاہدہ مع النفس ہے۔ یعنی اپنے اندر جو خدا کا دشمن موجود ہے' اسے زیر کرو—— پھر مجاہدہ مع الکفر ہے۔ یعنی نظریاتی سطح پر اسلام و ایمان کی تبلیغ اور نشر و اشاعت کرو۔ پھر مجاہدہ مع الکفار ہے' جس میں صبرِ محض' اقدام اور وقت آنے پر مسلح تصادم کے مراحل ہیں۔

اور یہ بات جان لیجیے کہ نبی اکرم ﷺ نے اللہ کی راہ میں جان دینے کی آرزو رکھنے کو بھی ایمان کا ایک اہم ترین رکن قرار دیا ہے۔ یہ بات ٹھیک ہے کہ جنگ ہر وقت نہیں ہوتی۔ لیکن اگر دل میں حقیقی ایمان موجود ہے تو یہ تمنا موجود رہنی چاہیے کہ کاش میری زندگی میں وہ وقت آئے کہ خالصتاً قتال فی

سبیل اللہ کا مرحلہ آئے اور میں اس میں اپنی گردن کٹا کر اللہ تعالیٰ کی جناب میں سرخرو اور سبکدوش ہو جاؤں۔ حضورﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ مَّاتَ وَلَمْ يَغْزُ وَلَمْ يُحَدِّثْ بِهٖ نَفْسَهٗ مَاتَ عَلٰى شُعْبَةٍ مِّنَ النِّفَاقِ))

''جس شخص کی موت اس حال میں واقع ہوئی کہ نہ تو اس نے اللہ کی راہ میں جنگ کی اور نہ ہی اس کے دل میں آرزو پیدا ہوئی تو اس شخص کی موت ایک نوع کے نفاق پر واقع ہوئی''۔

اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں کو شوقِ شہادت سے معمور فرمائے۔

جہاد شروع میں تو مجاہدہ مع النفس سے ہوتا ہے لیکن اس کی آخری منزل وہی قتال فی سبیل اللہ ہو گی۔ یہ نگاہ سے اوجھل نہ ہونے پائے۔ اگرچہ اس کی کچھ شرائط ہیں' وہ پوری ہوں گی تو آپ وہاں پہنچیں گے' لیکن یہ آرزو دل میں رہنا کہ ہماری زندگی میں وہ مرحلہ بھی آئے' ایمان کی شرط لازم ہے۔ اگر یہ نہیں تو ایمان نہیں ہے۔

پس ایمان کے دو رُکن ہیں جو اس آیت مبارکہ کے حوالے سے ہمارے سامنے آئے۔ اب آپ جمع کر لیجیے۔ جب اسلام اور ایمان دونوں یکجا ہو جائیں گے تو گویا اقرار باللسان بھی ہوگا اور تصدیق بالقلب بھی۔ نماز' روزہ' حج اور زکوٰۃ اسلام کے ارکان کی حیثیت سے ہوں گے' جبکہ شک وشبہ سے مبرا ایمان دل میں اور جہاد فی سبیل اللہ بالنفس وبالمال عمل میں' یہ ایمان کے ارکان کی حیثیت سے ہوں گے' اور اس طرح گویا ایک بندۂ مؤمن کی شخصیت مکمل ہو جائے گی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی اس نقشے پر پورا اترنے کی توفیق عطا فرمائے۔

ایمان کا راستہ

﴿قُلْ اَتُعَلِّمُوْنَ اللّٰهَ بِدِيْنِكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَىْءٍ عَلِيْمٌ ﴿١٦﴾ يَمُنُّوْنَ عَلَيْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا ؕ قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَىَّ اِسْلَامَكُمْ ۚ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِيْمَانِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿١٧﴾ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿١٨﴾﴾...... صدق اللہ العظیم

''کہیے! کیا تم اللہ پر جتلانا چاہتے ہو اپنا دین' حالانکہ اللہ تو جانتا ہے جو کچھ ہے آسمانوں میں اور جو کچھ ہے زمین میں' اور اللہ تو ہر شے کا علم رکھتا ہے۔ وہ آپ پر احسان دھر رہے ہیں کہ وہ اسلام

لے آئے۔ کہیے: مجھ پر اپنے اسلام کا احسان نہ دھرو' بلکہ اللہ تم پر احسان جتلاتا ہے کہ اس نے تمہیں ایمان کی راہ سجھائی اگر تم فی الواقع سچے ہو۔ یقیناً آسمانوں اور زمین کی ہر چھپی چیز اللہ کے علم میں ہے' اور اللہ دیکھ رہا ہے جو کچھ تم کر رہے ہو''۔

فتح مکہ کے بعد ایمان لانے والوں میں زیادہ تعداد اعراب یعنی بدّ وؤں کی تھی۔ ان میں سے اکثر کی کیفیت ایک علاقائی محاورے ''تھوتھا چنا باجے گھنا'' یعنی ''خالی برتن زیادہ کھڑکتا ہے'' کے مصداق تھی۔ چنانچہ جن کے دل میں ایمان نہیں تھا وہ کچھ زیادہ ہی بڑھ چڑھ کر اپنے ایمان و اسلام کا اظہار کرتے اور آنحضورﷺ پر احسان جتاتے تھے۔ خاص طور پر وہ لوگ جو لڑے بھڑے بغیر ایمان لے آئے تھے اضافی حقوق کا مطالبہ کرتے کہ دیکھئے حضورؐ! نہ تو ہم نے آپ سے جنگ کی' نہ کبھی آپ کی مخالفت کی بلکہ ہم پُر امن طور پر اسلام لے آئے' لہٰذا ہمارا حق دوسروں کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہے۔ ہمیں صدقات میں سے بھی حصہ ملنا چاہیے اور ہماری رعایت زیادہ ہونی چاہیے۔ اس آیت میں انہی زیادہ بڑھ چڑھ کر باتیں بنانے والوں کے بارے میں قدرے سرزنش کے انداز میں فرمایا: ﴿قُلۡ اَتُعَلِّمُوۡنَ اللّٰهَ بِدِيۡنِكُمۡ ؕ﴾ کہ اے نبیؐ! ' آپ ان سے پوچھیے کہ تم کس کو بتانا چاہتے ہو کہ تم اسلام لے آئے ہو؟ کیا تم اللہ کو اپنے دین و ایمان کی اطلاع دینا چاہتے ہو؟ اسے جتلانا چاہتے ہو کہ تم ایمان لے آئے ہو! ﴿وَاللّٰهُ يَعۡلَمُ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الۡاَرۡضِ ؕ﴾ ''حالانکہ اللہ تو جانتا ہے جو کچھ کہ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے''۔ اگر تمہارے دل میں ایمان ہے' اگر تم واقعی صاحبِ ایمان ہو تو کیا کوئی چیز اللہ کی نگاہوں سے پوشیدہ اور اس کے علم سے باہر ہو سکتی ہے! ﴿وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَىۡءٍ عَلِيۡمٌ ۝﴾ ''اللہ تو ہر شے کا جاننے والا ہے''۔ اس کا علم ہر شے کو محیط ہے۔

اصل میں وہ اپنے ایمان کا احسان رسول اللہﷺ پر دھرتے تھے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿يَمُنُّوۡنَ عَلَيۡكَ اَنۡ اَسۡلَمُوۡا ؕ﴾ ''اے نبی! یہ آپ پر احسان دھر رہے ہیں کہ یہ اسلام لے آئے ہیں''۔ چونکہ صدقات کی تقسیم کا معاملہ آپؐ کے ہاتھ میں تھا' لہٰذا اپنے اسلام لانے کا احسان آپؐ پر دھرتے تھے تاکہ صدقات وخیرات میں سے زیادہ سے زیادہ حصہ مل سکے!

نوٹ کیجیے' یہاں ایمان اور اسلام کو پھر الگ اصطلاحات کی شکل میں لایا جا رہا ہے اور اس اعتبار سے یہ مقام پورے قرآن مجید میں امتیازی حیثیت کا حامل ہے کہ اسلام اور ایمان کو علیحدہ علیحدہ بھی کیا گیا لیکن اس آیت میں ان دونوں کے ربط کو بڑی خوبصورتی سے واضح بھی کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ آیت

کے پہلے حصے میں اسلام کا آنحضورﷺ پر احسان جتانے کے حوالے سے ان کے طرزِ عمل پر گرفت فرمانے کے بعد کہ: ﴿یَمُنُّوۡنَ عَلَیۡکَ اَنۡ اَسۡلَمُوۡا ؕ قُلۡ لَّا تَمُنُّوۡا عَلَیَّ اِسۡلَامَکُمۡ ۚ﴾ ''بلکہ اللہ تم پر احسان دھرتا ہے (اس کا احسان مانو) کہ اس نے تمہیں ایمان کا راستہ دکھا دیا ہے اگر تم (اپنے دعوائے اسلام میں) سچے ہو''۔ یعنی ایک تو وہ لوگ تھے جنہوں نے دھوکہ دینے کی نیت سے کلمہ پڑھا' یہاں ان کی بات نہیں ہو رہی' اگر تم نے دھوکے کی نیت کے بغیر اسلام کا کلمہ زبان سے ادا کیا ہے تو گویا کہ اللہ کا احسان مانو کہ تمہیں اللہ اس راستے پر لے آیا ہے کہ جس کی اگلی منزل ایمان ہے۔ اب تم ایمان تک پہنچ سکتے ہو' اس تک رسائی حاصل کر سکتے ہو۔ اس لیے کہ جو شخص اس سڑک پر آ گیا اب گویا کہ اس کے لیے آسان ہے کہ وہ ایمان کی منزل تک رسائی حاصل کر لے۔ ''ہدایت'' کے مختلف درجات کو ذہن میں رکھیے کہ راہ دکھا دینا بھی ہدایت کا ابتدائی درجہ ہے اور راہ پر لے آنا بھی ہدایت ہی کا اگلا درجہ ہے۔ یہاں دونوں اعتبارات سے ترجمہ کیا جا سکتا ہے: ﴿بَلِ اللّٰہُ یَمُنُّ عَلَیۡکُمۡ اَنۡ ہَدٰىکُمۡ لِلۡاِیۡمَانِ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ﴿۱۷﴾﴾ ''کہ رسولؐ پر اپنے ایمان واسلام کا احسان دھرنے کی بجائے اللہ کا احسان مانو کہ اس نے تمہیں ایمان کی راہ پر ڈال دیا' اگر تم فی الواقع اپنے دعوائے اسلام میں سچے ہو''۔ بقول شاعر ؎

''منّت منہ کہ خدمتِ سلطاں ہمی کنی
منّت شناس ازو کہ بخدمت بداشتت''

یہاں نوٹ کیجیے کہ پہلے لفظ ''اسلام'' کے حوالے سے گفتگو ہے: ﴿یَمُنُّوۡنَ عَلَیۡکَ اَنۡ اَسۡلَمُوۡا ؕ قُلۡ لَّا تَمُنُّوۡا عَلَیَّ اِسۡلَامَکُمۡ ۚ﴾ اور پھر ﴿بَلِ اللّٰہُ یَمُنُّ عَلَیۡکُمۡ اَنۡ ہَدٰىکُمۡ لِلۡاِیۡمَانِ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ﴿۱۷﴾﴾ میں ایمان کی راہ پر ڈالنے کا ذکر اللہ تعالیٰ کے احسان کے طور پر کیا گیا ہے۔ اس طرح ''اسلام'' اور ''ایمان'' کو دو علیحدہ علیحدہ اصطلاحات کے طور پر بیان کر کے ان کے باہمی ربط کو بھی واضح فرما دیا ہے۔

آگے چلیے' فرمایا: ﴿اِنَّ اللّٰہَ یَعۡلَمُ غَیۡبَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ؕ﴾ یہ اس سورۂ مبارکہ کی اختتامی (concluding) آیت ہے۔ ''اللہ تعالیٰ تو آسمانوں اور زمین کی ہر چھپی شے کا جاننے والا ہے''۔ ﴿وَ اللّٰہُ بَصِیۡرٌۢ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۸﴾﴾ ''اور اللہ دیکھ رہا ہے جو کچھ تم کر رہے ہو''۔ اس میں ایک طرح کی دھمکی بھی مضمر ہے کہ ہم دیکھ رہے ہیں تمہارے اعمال کو' تمہارے سارے کرتوت ہماری نگاہ میں ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ مخلص اہل ایمان کے لیے تسلی کا سامان بھی ہے کہ تمہاری قربانیاں' تمہارا ایثار اور

تمہارے اعمالِ صالحہ سب ہماری نگاہ میں ہیں‘ ہم ان سب سے بے خبر نہیں ہیں۔ جیسا کہ آنحضور ﷺ سے تسلی آمیز انداز میں فرمایا گیا: ﴿فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا﴾ ”اے نبیؐ! آپ ہماری نگاہوں میں ہیں“۔ اس اعتبار سے ہر صاحبِ ایمان کے لیے یہ الفاظ گویا کہ ہمت افزائی کا موجب ہیں کہ: ﴿وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝١٨﴾ لیکن جن کے دلوں میں روگ ہے ان کے لیے یہی الفاظ کلمۂ تہدید کا درجہ رکھتے ہیں۔ یہ دھمکی آمیز الفاظ ہیں کہ اللہ جانتا ہے جو کچھ کہ تم کر رہے ہو“۔

اللہ تعالیٰ ہمیں ایمانِ حقیقی سے بہرہ اندوز فرمائے اور اس کے جو اضافی ارکان ہیں‘ ارکان اسلام پر مستزاد یعنی یقین قلبی اور جہاد فی سبیل اللہ‘ ان کے تقاضوں کو پورا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ ربّ العالمین OO

تنظیمِ اسلامی

مروجہ مفہوم کے اعتبار سے

نہ کوئی سیاسی جماعت نہ مذہبی فرقہ

بلکہ ایک اصولی

اسلامی انقلابی جماعت

ہے جو اولاً پاکستان اور بالآخر ساری دنیا میں

دینِ حق

یعنی اسلام کو غالب یا بالفاظ دیگر

نظامِ خلافت

کو قائم کرنے کیلئے کوشاں ہے!

امیر: حافظ عاکف سعید حفظہ اللہ

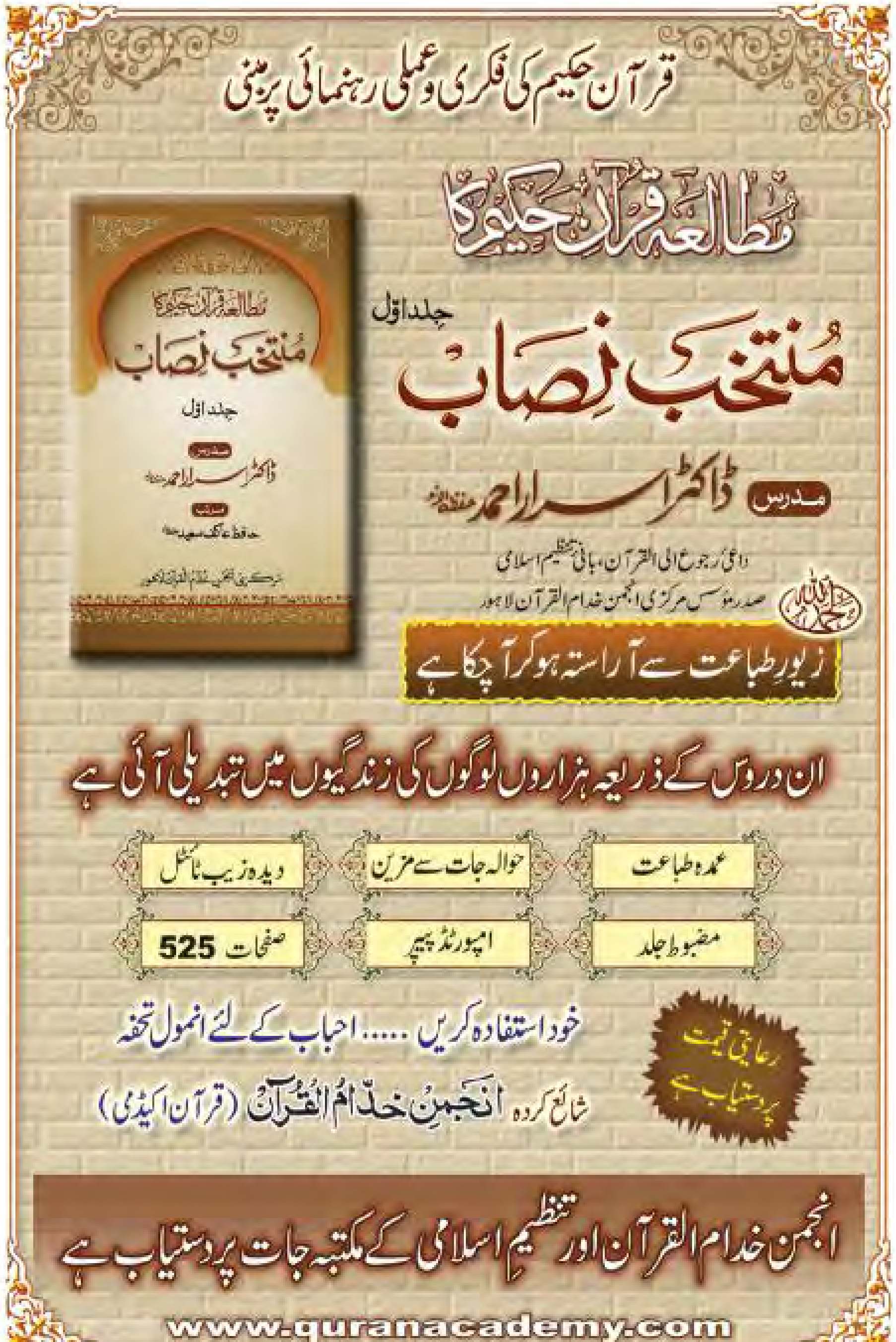

قرآن حکیم کی فکری و عملی رہنمائی پر مبنی
مُطالعہ قرآنِ حکیم کا
مُنتخب نصاب
جلد اوّل
مدرس ڈاکٹر اسرار احمد
داعی رجوع الی القرآن، بانی تنظیم اسلامی
صدر مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر آ چکا ہے
ان دروس کے ذریعہ ہزاروں لوگوں کی زندگیوں میں تبدیلی آئی ہے
عمدہ طباعت
حوالہ جات سے مزین
دیدہ زیب ٹائٹل
مضبوط جلد
امپورٹڈ پیپر
صفحات 525
خود استفادہ کریں ..... احباب کے لئے انمول تحفہ
رعایتی قیمت پر دستیاب ہے
شائع کردہ انجمنِ خدام القرآن (قرآن اکیڈمی)
انجمن خدام القرآن اور تنظیم اسلامی کے مکتبہ جات پر دستیاب ہے
www.quranacademy.com

مطالعہ قرآن حکیم کا

مُنتخب نِصاب

بانی: ڈاکٹر اسرار احمد

مرکزی انجمنِ خدام القرآن لاہور